ہم اپنے دل کی گہرائیوں سے

ملک و ملت کے عظیم رہنما اور سرفروش مجاہد

حضرت مولانا حفظ الرحمن صاحب رحمۃ اللہ علیہ

کی عظیم الشان خدمات اور مجاہدانہ کارناموں پر
خراج تحسین و عقیدت پیش کرتے ہیں

بیڑی نمبر

788

نایاب بیڑی فیکٹری۔ لال باغ - مرادآباد

جنوب مشرق میں مولانا آزاد میڈیکل کالج
کی پرشکوہ عمارت ہے۔
اُس عظیم اور تاریخ آفریں عہد کی یادگار
جس سے برسوں مجاہد ملت کا جسم و جاں
کا تعلق رہا۔ وہ خطیب اعظم جس کی گرج
سے کبھی قصر استبداد کے ستون ڈھل جاتے
تھے لیکن ۱۹۴۷ء کی قیامت خیز تباہی
کے بعد سراسیمہ مسلمانوں کو اس کی دلآویز
خطابت میں میٹھی لوریاں سنائی دیں۔
اور وہ زمانہ کی ستم ظریفیوں کو بھلا کر
ایک مرتبہ بھرپور لگن کے ساتھ وطن عزیز
کی تعمیر نو میں لگ گئے۔



قبرستان مہندیان کا زیر تعمیر دروازہ، پس منظر میں مولانا آزاد میڈیکل کالج کی عمارت ہے

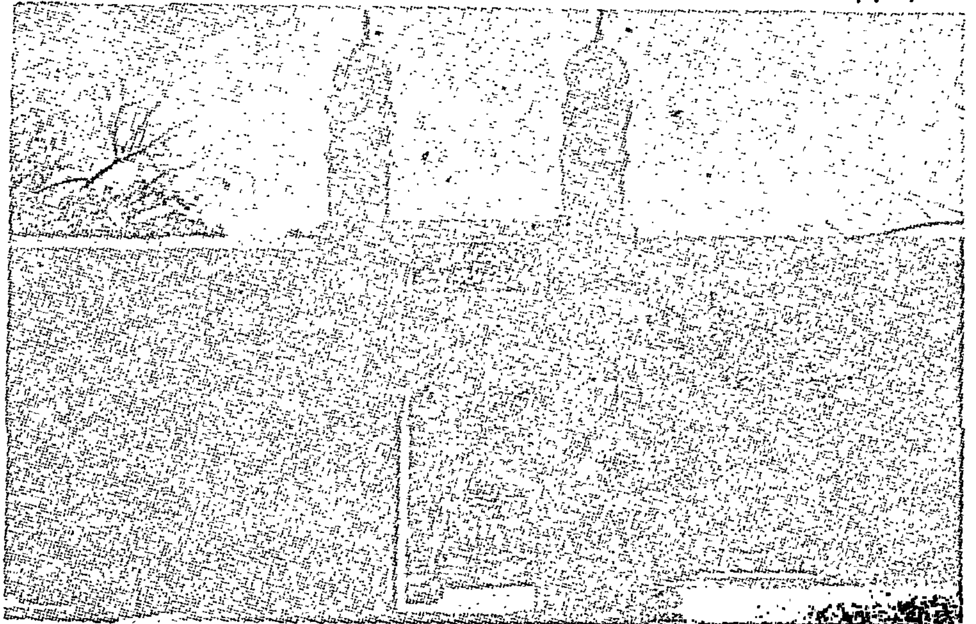
اس پرآشوب دور میں مولانا آزاد اور عام مسلمانوں کا معتبر رابطہ مجاہد ملتؒ ہی تھے مولانا آزادؒ مجاہد ملتؒ سے حالات سنتے اور پھر باہمی مشورہ سے آئندہ کے لئے لائحہ عمل تیار کرتے۔

مولانا آزاد کی صحیح رہنمائی مجاہد ملت کی بھرپور کوششوں کے ساتھ ٹھکانے لگی۔ اور ایک عظیم قوم گرتے گرتے سنبھل گئی۔

گیا تھا۔ دہلی کا مشہور خونی دروازہ جہاں بہادر شاہ ظفر کے جگر پاروں کو سولی دی گئی

مغرب میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی کی وہ مسجد ہے جو نہ جانے کتنے محدثین اور علماء حق کی سجدہ گاہ رہی ہے یہیں حضرت شاہ صاحب رح کا مدرسہ تھا۔ مسجد کے باہر اردو کے مشہور شاعر حکیم مومن خان مومن کا مزار ہے۔ شمال میں میر درد درود ہے۔ خواجہ میر درد علیہ الرحمۃ کی یادگار رہا شمال کی طرف کچھ اور آگے بڑھ کر پرانی دہلی کا وہ تہذیبی شہر ہے جو مجاہد ملت رح کا گویا دوسرا وطن ہو گیا تھا۔ دہلی کی مجلسی زندگی کے آپ ہی روح رواں تھے۔

جنوب میں حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رح۔ شاہ ولی اللہ صاحب رح
شاہ عبدالعزیز صاحب رح
شاہ عبدالقادر صاحب رح
شاہ رفیع الدین صاحب رح
شاہ عبدالغنی صاحب رح
اور
اُن دوسرے محدثین اور بزرگوں کے مزارات ہیں جو ان علماء حق کے اخلاف اور صحیح معنی میں نمونۂ اسلاف تھے۔
وَحَسُنَ أُولَٰئِكَ رَفِيقًا



مسجد و درگاہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رح کا بیرونی دروازہ

ح

مجاہدِ ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب رح اپنے علم و فضل اور عظیم الشان دینی و ملی خدمات کے اعتبار سے علمائے حق کے عظیم اور تاریخی سلسلۂ ولی اللہی کی آخری کڑی تھے جس کے ہاتھوں سرزمین ہند پر دو صدیوں سے حق و صداقت کے پرچم سربلند رہے ہیں ۔ اس سلسلۂ مبارکہ کے علماء میں قرونِ اولیٰ اور بزرگانِ سلف کی سی ہمہ گیری ہوتی تھی ۔ یہ ہی نفوسِ قدسی اپنے دور میں علم و عمل زہد و تقویٰ جہد و ریاضت، تدبر و فراست، ہمدردی خلق و فریاد رسی، جرأت ایمانی ایثار اور اشاعتِ دین کے علمبردار رہے ہیں ۔ یہ دین اور دنیا دونوں ہی کی ذمہ داریاں محسوس کرتے اور ہر قسم کی افراط و تفریط سے دامن بچاتے ہوئے خود کو اِنّی جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃ کا صحیح مصداق بناتے اور انسانیت کی اس معراج کو چھوتے جہاں فرشتے بھی سر جھکاتے ہیں ۔

مجاہدِ ملت سلسلۂ ولی اللہی کی روایات کا مجسم تھے ۔

اس گوہرِ آب دار کے ترشے ہوئے پہلوؤں میں شاہ ولی اللہ رح کا تفکر، شاہ عبد العزیز رح کا تقویٰ، شاہ عبد القادر رح کی بے باکی، شاہ رفیع الدین کی سلامت روی، شاہ اسمٰعیل شہید رح کا جذبۂ جہاد اور سید احمد شہید رح کی استقامت جھلکتی تھی کردار کی جامعیت نے انہیں ہر طبقۂ خیال میں ممدوح و مقبول بنا دیا تھا یہاں تک کہ ان کی بزم میں وہ مختلف الخیال جو دن رات آپس میں لڑتے جھگڑتے بھی رہتے تھے ۔ اکثر یک جا ہو جاتے تھے ۔ اور ایک دوسرے سے خندہ پیشانی سے ملتے تھے آپ کی بزم میں ہندو مسلمان، بلکہ عیسائی سب ہی ہوتے اردو والے بھی اور ہندی والے بھی ۔ احناف کے علماء بھی اور اہلِ حدیث حضرات کے بھی ۔ دیوبند کے بزرگ بھی ہوتے اور اجمیر شریف وغیرہ کے سجادے بھی ۔ دینی تقدس کے حامل شیوخ و اکابر بھی ہوتے، اور دنیاوی فضل و کمال کے ستون ۔ بڑے بڑے تاجر ۔ لیڈر ۔ فلاسفر ۔ پروفیسر ۔ وکلاء اور بیرسٹر بھی ۔

مجاہدِ ملت سلسلۂ ولی اللہی کے دیگر بزرگوں کے ساتھ آغوشِ رحمت میں ـــ!

صبا کیسی کہاں کے پھول ہاں آندھی جب آتی ہے ۔ چڑھا جاتی ہے چادر گرد کی گورِ غریباں پر

غرضیکہ سلسلۂ ولی اللہی کے آخری نشان، ایک بوریا نشین کی محفل تھی جہاں بیک وقت اپنے پرائے چھوٹے بڑے ۔ امیر و غریب سب ہی کو یکساں سکونِ قلب و نظر حاصل ہوتا تھا یہی بوریا نشین جو قوم کا رہبر بھی بنا تو ۔

"سید القوم خادمہم" کی زندہ تصویر بن کر ـــ!

آئے عشاق گئے، وعدۂ فردا لے کر ۔ اب انہیں ڈھونڈ چراغِ رخِ زیبا لے کر

رحمہ اللہ و اسکنہ فسیح جناتہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
مادہائے مزین بتاریخ
۱۹۶۲ء
۱۳۸۲ھ

تذکرہ جاوید بحقائق ومعارف
۱۳۸۲ھ
۱۹۶۲ء

جید عظیم مجاہد نمبر
۱۳۸۲ھ

بیادگار مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب علیہ رحمۃ اللہ القدوس
۱۳۸۲ھ ۱۹۶۲ء = ۳۳۴۴

ادارۂ ترجمان الحق روزنامہ الجمعیۃ دہلی
۱۹۶۲ء

مجاہد اعظم نمبرہ طیب
۱۳۸۲ھ

قدیم ایڈیٹر محمد عثمان فارقلیط
۱۹۶۲ء

کتبہ العاصی محمد عثمان
۱۳۸۲ھ

مادہائے مزین بتاریخ	تذکرہ جاوید بحقائق ومعارف	جید عظیم مجاہد نمبر	بیادگار مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب علیہ رحمۃ اللہ القدوس
۱۳۸۲ھ	۱۹۶۲ء	۱۳۸۲ھ	۱۳۸۲ھ ۱۹۶۲ء = ۳۳۴۴

ادارۂ ترجمان الحق روزنامہ الجمعیۃ دہلی	قدیم ایڈیٹر محمد عثمان فارقلیط	مجاہد اعظم نمبرہ طیب	کتبہ العاصی محمد عثمان
۱۹۶۲ء	۱۹۶۲ء	۱۳۸۲ھ	۱۳۸۲ھ

تاریخ وداعی
۱۳۸۲ھ

ابیات وحضرت مبارک تاریخی
۱۹۶۲ء

ریحان جلیل مجلس دارالعلوم دیوبند و مسلم یونیورسٹی علیگڑھ
۱۹۶۲

مقبول الہند جناب
مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب
۱۹۶۲ء

برّد مضجعہ الولی العلیم
۱۳۸۲ھ

کل من علیہا فان ویبقیٰ وجہ ربک ذی الجلال والاکرام (البدیع) ۱۹۶۲ء ○ (الاو) کل نفس ذائقۃ الموت ۱۹۶۲ء

ان اللہ المحصی لیرفع العلم برفع العلماء ۱۳۸۲ھ ● موت عالم القوم موت العالم ۱۳۸۲ھ

اما کان قیس هلکه هلک واحد — ولکنه بنیان قوم تهدما
۱۳۸۲ھ

گئے حضرت مجاہد ملت ۱۹۶۲ء ❖ جان رحمت میں واصل جنت ۱۳۸۲ھ

ہے اکسٹھ سال چھ ماہ بیس دن عمر مجاہد کل
۶۱ برس ۶ مہینہ ۲۰ دن

تری دس جنوری انیس سو اک میں ولادت ہے
۱۰ جنوری ۱۹۰۱ء

ولادت سال ہجری ہے مگر تیرہ سو اٹھارہ
۱۳۱۸ھ

ہیں دن بائیس ہزار و چار سو اور پھر تراسی کل
۲۲۴۸۳

دریغا دو اگست انیس سو باسٹھ میں رحلت ہے
۲ اگست ۱۹۶۲ء

ہے تیرہ سو بیاسی میں تری فرقت سے دل پارہ
۱۳۸۲ھ

ناالائق خادم جمعیت پورہ معروف ۱۹۶۲ء ...... عثمان اعظم گڈھی مدرس مدرسہ معروفیہ پورہ معروف

۱۳۸۲ھ ۱۹۶۲ء = ۳۳۴۴

عکس تحریر

مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ کے ایک مکتوب کا عکس ملاحظہ فرمائیے۔

یہ مکتوب حضرت مولانا نے ۱۵ دسمبر ۱۹۴۲ء کو بحالت اسیری، راولپنڈی جیل سے حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب (موجودہ جنرل سکریٹری جمعیۃ علماء ہند) کے نام ارسال فرمایا تھا۔ اس وقت کی قانونی پابندیوں اور حکومت کے تعاقب اور سخت گیری کے باعث اس مکتوب میں حضرت مولاناؒ نے اپنا مقصد کچھ اشاروں میں ظاہر فرمایا ہے "الہ آباد کی کل ہند کمپنی" سے مراد آل انڈیا کانگریس کمیٹی ہے جس کا صدر دفتر اس زمانہ میں الہ آباد میں تھا۔ "ایجنٹ" سے مراد ممبر اور "ڈیوٹی" کا اشارہ گرفتاری کی طرف ہے۔

آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے ان دنوں کسی اعلان کے ذریعہ اپنے تمام ممبران کی خواہ وہ اس وقت جیل میں ہوں یا پہلے سزایاب ہو چکے ہوں، فہرست اور حالات زندگی طلب کئے تھے۔ حضرت مولانا بھی اے آئی سی سی کے ایک سرگرم رکن تھے۔

بائیس سال پرانا، مجاہد ملت رحمۃ اللہ علیہ کا یہ اصل مکتوب جس کا کاغذ بھی اب کافی بوسیدہ ہوگیا ہے ہمیں ایک عزیز دوست اور مجاہد ملت کے ایک مخلص جان نثار جناب عبدالسلام صاحب ہاشمی مرادآبادی سے دستیاب ہوا۔

ہاشمی صاحب کے دلی شکریہ کے ساتھ حضرت مولانا کی یہ تحریر "مجاہد ملت نمبر" کے صفحات کی زینت بنائی جا رہی ہے۔

"سید انیس الحسن"

۸ فروری ۱۹۶۳ء

۷۸۶

از راولپنڈی جیل

معظم و محترم مولانا محمد میاں صاحب زاد مجدکم

السلام علیکم و رحمۃ اللہ۔ مزاج گرامی

امید کہ آپ مع متعلقین بخیر ہونگے، اور سب برادر احباب بھی عافیت سے ہونگے

اس وقت یہ عریضہ اس لئے لکھ رہا ہوں کہ اخبارات میں شائع ہوا ہے کہ الہ آباد کی "کل ہند کمپنی" نے یہ اعلان کیا ہے کہ جو ایجنٹ کمپنی کے اعلان وقت سے ڈیوٹی پر لگے ہیں اُن کی بھی فہرست اور جو اس سے قبل ڈیوٹی پر جا چکے ہیں اُن کی بھی فہرست مع حالات زندگی صدر دفتر میں بھیجدی جائے، میں چونکہ آپ کے ضلع سے کمپنی کا ایجنٹ بنا کر آیا ہوں اس لئے آپ براہ کرم بحیثیت انچارج مرادآباد میرے متعلق صدر دفتر کو اطلاع کر دیں، اگرچہ شخصی تعارف کے اعتبار سے اس کی مطلق ضرورت نہیں لیکن ضابطہ کے طور پر آپ کے ضلع کے ایجنٹوں کی فہرست میں ضرور نام شمار ہونا چاہئے۔

امید کہ آپ بسہولت بہ عنقریب ملاقات کرنے کے قابل ہو سکو گے

سب کو بہت سلام مسنون۔ خصوصاً قاری صاحب کو بہت نیاز مندانہ سلام

خادم ملت
محمد حفظ الرحمٰن کان اللہ لہ
۱۵ دسمبر ۴۲ء

بگرامی خدمت معظم و محترم حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب ارشاد جامعہ قاسمیہ

مرادآباد شاہی مسجد (یوپی)

مجاہد ملت کی یاد میں

از

جناب سرورش صدیقی

گزری وہ زندگی کہ عبادت کہیں جسے
پائی وہ موت تونے شہادت کہیں جسے

روزِ ازل تجھے وہ سعادت نصیب ہو
خلقِ خدا کے درد کی دولت کہیں جسے

بے شبہ جلوہ گر تیرے قول و عمل میں تھی
ہم اہلِ دل وطن کی محبت کہیں جسے

باطل کے سامنے نہ تیرا سر کبھی جھکا
یہ وہ ادا تھی جانِ صداقت کہیں جسے

مانندِ برق تھا تری رگ رگ میں موجزن
وہ ولولہ، کہ جوشِ حمیت کہیں جسے

تیرا شعار خدمتِ خلقِ خدا رہا!
خدمت بھی وہ کہ روحِ طریقت کہیں جسے

تونے صحیفۂ دل گیتی سے چن لیا
وہ ایک حرف، حرفِ محبت کہیں جسے

اک وضعِ خاص تیری سیاست میں تھی نہاں
ہر رنگ میں نمودِ شرافت کہیں جسے!

تجھکو تیرے شیوخ نے بخشا تھا یقیں
وہ علم، اہلِ دل کی امانت کہیں جسے

وہ دل ملا تجھے جو سراپا گداز تھا!
پروانۂ چراغ رسالت کہیں جسے

آیا تھا تیری شکل میں اک مردِ باخدا
درویش در لباس شریعت کہیں جسے

تقدیم — اور — تعارف

روزنامہ الجمعیۃ دہلی کی زندگی میں نہایت ہی اہم، قیمتی اور بے مثال پیش کش "مجاہد ملت نمبر" جو اس کے مربی اور سرپرست اعلیٰ - مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمن صاحب قدس اللہ سرہ العزیز - کی تابناک زندگی کا یادگار مرقع اور ہماری تاریخ کا ایک سنہرا ورق ہے، اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے ۔

وطن عزیز کے گوشہ گوشہ میں جس اشتیاق اور اضطراب کے ساتھ الجمعیۃ کے اس خاص نمبر کا انتظار کیا گیا ہے، ہمیں اس کا پورا احساس — اور اعتراف ہے ۔

بلاشبہ اس نمبر کی ترتیب اور تیاری میں ہمارا کافی وقت صرف ہوا اور آپ کو بھی معمول سے زیادہ انتظار کی زحمت گوارا کرنی پڑی لیکن آج ہم پورے اعتماد کے ساتھ آپ کو یقین دلا سکتے ہیں کہ اس تمام تاخیر کا باعث ہماری کوئی کوتاہی اور تساہل نہیں بلکہ خود اس عظیم الشان نمبر کی رفعتِ قدر اور تاریخی اہمیت ہے، جس کا احساس اس پورے عرصہ میں مسلسل اشتغال و انہماک کے ساتھ ہمارے ذہنوں پر چھایا رہا ہے۔ شروع ہی سے دل کا تقاضا یہ تھا کہ حضرت مجاہد ملت رحمۃ اللہ علیہ کی علم و عمل سے بھرپور، حاوی اور مصروف ترین مجاہدانہ زندگی کے روشن نقوش جمع کئے جائیں اور ان کا کوئی تذکرہ مرتب ہو تو ہر لحاظ سے اس قدر مکمل - جامع اور شایانِ شان ہو کہ کم از کم اپنا ضمیر مطمئن ہو سکے اور حضرت مولانا علیہ الرحمۃ کی مجاہدانہ زندگی کے تمام پہلو، ان کی دور آفریں خدمات و مساعی جمیلہ - اور قائدانہ افکار و اعمال کی ایک تصویر سامنے آسکے - ساتھ ہی اپنی افادیت اور ظاہری و معنوی محاسن کے لحاظ سے اتنا بلند پایہ اور باوقار ہو کہ حضرت مجاہد ملت رحمۃ اللہ علیہ کی ذاتِ اقدس سے اپنی نسبت کو نباہ سکے ۔

بحمد اللہ - تقریباً چھ ماہ کی شبانہ روز محنت اور مسلسل کاوش کے بعد آج ہم اپنے اس فرض سے سبکدوشی کی سعادت حاصل کر رہے ہیں اور اپنے محدود وسائل اور اپنی بے مایہ صلاحیتوں کے ساتھ اس عظیم نمبر کی تکمیل و تزئین کے لئے ہم جتنا کچھ کر سکتے تھے، اس کا نتیجہ اب آپ کے سامنے ہے اور اس کا اندازہ آپ ہی فرمائیں گے کہ ہمیں اپنے ارادوں اور کوششوں میں کہاں تک کامیابی حاصل ہو سکی ہے۔

نشاندہی کے طور پر یہ عرض کر دینا بے محل نہ ہوگا کہ اس نمبر کی ترتیب و تدوین میں ہم نے شروع ہی سے اس کا التزام کیا ہے کہ :-

(۱) حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی اولوالعزم شخصیت، ملکی و ملی خدمات، قائدانہ افکار و اعمال جلیلہ پر ملک بھر کے مسلم و غیر مسلم ہر طبقہ اور ہر خیال کے ارباب علم و فضل اور احباب و مخلصین کے قلبی تاثرات اور مشاہدات پورے اہتمام اور جستجو کے ساتھ حاصل کر سکیں. چنانچہ مسلسل کاوش اور تقاضوں کے بعد جتنے بھی مقالات و مضامین ہم حاصل کر سکے وہ نمبر کے صفحات میں شاملِ اشاعت کر دیئے گئے ہیں۔

(۲) حضرت مجاہد ملت سے تعلق خاطر رکھنے والے جن احباب نے از خود بھی اپنے مقالات ارسال کئے، جہاں تک ہو سکا ان کو بھی ہم نے نظر انداز نہیں کیا ہے۔ صرف دو مقالے ضرور محفوظ رکھے گئے۔ ان میں سے ایک مقالہ ہمارے مخلص اور فاضل رفیق مولانا شرقی العثمانی نائب صدر جمعیۃ علماء بھوپال کا ہے اور دوسرا مضمون عزیز دوست اور مجاہد ملت رح کے مخلص فدائی سید عبد السلام صاحب ہاشمی مرادآبادی کا ۔

اول الذکر فاضلانہ مضمون میں مولانا شرقی عثمانی صاحب نے مجاہد ملت رح کی ہمہ گیر خدمات کا یکجائی اجمالی خاکہ پیش کیا ہے لیکن چونکہ وہ تمام عنوان تفصیل کے ساتھ دوسرے مضامین میں آچکے ہیں اس لئے تکرار بیان کو غیر ضروری سمجھتے ہوئے اپنے خلوص تعلق اور اس اعتماد کے ساتھ اس مضمون کو محفوظ کر لیا گیا کہ مولانا شرقی عثمانی صاحب ہماری اس جرأت کو معاف فرمائیں گے ۔

دوسرے مضمون میں رفیق مکرم ہاشمی صاحب نے حضرت مجاہد ملت رح کے تین پارلیمنٹری الیکشنوں کی سرگذشت بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کی ہے اور چونکہ

ہاشمی صاحب نے خود بھی ان تینوں موقعوں پر بڑی تندہی کے ساتھ حضرت مولانا کی انتخابی مہم کو سر کیا تھا' اس لئے ان کا حق تھا اور واقعۃً بڑی محنت سے اُنھوں نے اپنی یادداشتوں کو ترتیب دیا۔ لیکن نتیجہ میں مضمون کی طوالت اتنی بڑھ گئی کہ نمبر کے عام طلبگار شاید اس کو بار سمجھتے' اس لئے اپنے ایک دوست کی وقتی ناگواری کا رسک لینا اور پھر اس کو منا لینا ہمیں آسان معلوم ہوا۔

(۳) ترتیب کے لحاظ سے اس نمبر کے مضامین حسب ذیل پانچ حصوں میں پھیلے ہوئے ہیں

عـ۱ الجمعیۃ کے ادارتی مقالہ کے بعد زعمائے ملک و ملت کے مختصر پیغامات اور تاثرات ہیں۔

عـ۲ مجاہد ملت رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت' سوانح اور اُن کے فکر و کردار پر مختلف مقالات کا سلسلہ ہے جس میں مخدوم حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب اور راقم السطور کے طویل مضمون بھی ہیں اور خاص طور پر مجاہد ملتؒ کی قلمی خدمات پر مولانا شاہ معین الدین احمد صاحب (صفحہ ۱۵۳)، مولانا قاضی زین العابدین صاحب (صفحہ ۱۶۹)، حافظ عفران احمد صاحب (صفحہ ۲۰۲) اور خواجہ عبدالحیٰ صاحب (صفحہ ۲۱) کے مقالات بھی۔ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی گھریلو زندگی' بچپن اور نوعمری کے حالات پر مولانا مقبول احمد صاحب سیوہاروی (صفحہ ۱۹۵)، مولانا مفتی جمیل الرحمٰن صاحب (صفحہ ۱۹۹) اور شاکر جلیل صاحب صدیقی (صفحہ ۲۰۱) کے مقالات بھی اسی باب میں شامل ہیں۔

عـ۳ حضرت مجاہد ملت رح کے افکار و عزائم کا آئینہ' اُن کی کچھ یادگار تقریریں۔ بیان اور بعض مکاتیب ہیں۔

عـ۴ اُردو صحافت نے حضرت مولاناؒ کی شخصیت اور کردار پر جو تاثرات اپنے اداریوں میں شائع کئے' ایک جگہ جمع کر دیئے گئے ہیں۔

عـ۵ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے رفقاء کار اور مخلصین کے عام مقالات ہیں۔

اس نمبر کے ظاہری اوصاف میں کتابت و طباعت کا پورا اہتمام نمایاں ہے۔

(الف) ضخامت کے لحاظ سے صفحات چار سو سے زائد ہیں لیکن باریک اور بھرپور کتابت کے بل پر بلا مبالغہ کتابی معیار کے دو ہزار صفحات کا مواد اس میں سمو دیا گیا ہے۔

(ب) کاغذ بھی بہت قیمتی' گلیز اور پائیدار استعمال کیا گیا ہے کہ تادیر باقی رہ سکے۔

(ج) پروف ریڈنگ اور تصحیح کے اہتمام میں بھی کوئی کوتاہی نہیں کی گئی ہے

(د) طباعت بھی اتنی ستھری اور روشن ہے کہ انشاء اللہ قارئین کرام کو کوئی شکایت محسوس نہ ہوگی۔

(ھ) ترتیب و تدوین میں اس کا بھی اہتمام کیا گیا ہے کہ ہر مضمون از اول تا آخر مسلسل ایک ہی جگہ سما جائے۔ کسی بھی مضمون کے ٹکڑے نہ ہوں کہ اس کا بقیہ تلاش کرنے کے لئے ورق گردانی کی نوبت آئے۔

(و) ٹائٹل کے نقش و نگار بھی اس حقیقت کی تعبیر ہیں کہ مجاہد ملت رحمۃ اللہ علیہ اپنے بعد خدمت و عمل کے وہ نقوش باقی چھوڑ گئے ہیں جو زندگی کی تاریکیوں اور نزاکتوں میں آنے والی نسلوں کے لئے مشعل ہدایت اور سامانِ بصیرت ہوں گے (انشاء اللہ)

آخر میں ہم انتہائی احسان مند اور شکر گذار ہیں اُن تمام رہنماؤں اور حضرات مقالہ نگار، شعراء کرام اور اصحابِ علم و فن کے جنھوں نے اپنی کاوش فکر و قلم سے ہمیں ممنون فرمایا اور اُن تمام دوستوں کے جنھوں نے کسی بھی طور سے اس عظیم نمبر کی تکمیل میں ہمارا ہاتھ بٹایا۔ اپنے ادارہ اور پریس کے رفقاء کار کے لئے شکر گذاری کا اظہار تو شاید رسمی بات ہو، مگر واقعہ یہ ہے کہ قدم قدم اُن کے تعاون ہی سے یہ ایک بڑا کام انجام پا سکا ہے۔

خدا کرے کہ یہ تمام محنت اور کوشش خلقِ خدا کے کام آئے۔ عنداللہ مقبول ہو اور ان صفحات کے پڑھنے والے حضرت مجاہد ملت رحمۃ اللہ کو اور اُن کے خدام کو اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں۔

سید انیس الحسن
جنرل منیجر الجمعیۃ دہلی

یکم شوال المکرم ۱۳۶۲ھ
۲۶ر فروری ۱۹۶۳ء

فہرست

قطعات = تاریخی مادے

منظومات

اداریہ

(مولانا) محمد عثمان فارقلیط

بے نظیر مجاہد...... بے بدل قائد

گزارشِ احوالِ واقعی

(سبحانک لا علم لنا الا ما علمتنا)

فن سوانح نگاری دوسرے فنون کی طرح آج کل بہت ترقی کر گیا ہے اور اہلِ قلم نے جو اس فن میں مرتبہ اختصاص رکھتے ہیں اس کے نوک پلک خاصے درست کر لئے ہیں۔ مگر یہ فن جس قدر مقبول اور قابل قدر ہے، اسی قدر نازک بھی ہے، کیوں کہ پڑھنے والوں کی اکثریت ان شخصیتوں سے جن کے حالات وہ مطالعہ میں لانا چاہتی ہے بذات خود متعارف نہیں ہوتی۔ بلکہ اس کے مرتبہ یقین کا زیادہ تر اعتماد سوانح نگار کی دیانت داری، اصابت، غیر جانب داری اور بیساختہ واقعہ نگاری پہ ہوتا ہے اور وہ ان ہی رنگوں سے متاثر ہوتی ہے جو وقائع نگار کے قلم سے ان کی زندگی کے نقشوں میں بھر دیئے جاتے ہیں۔ اگر پڑھنے والے محتاط اور زیرک ہوئے تو وہ ایسی تحریروں سے دروغ برگردنِ راوی کہہ کر گزر جاتے ہیں۔ اگر سادہ لوح ہوئے تو وہ عقیدت کے سہارے ہر رطب و یابس کو قبول کر لیتے ہیں اور ان کی قوت استنباط و استخراج میں کجی اور گمراہی پیدا ہو جاتی ہے اس لئے اگر ایک طرف سوانح نگار کا فرض ہے کہ وہ اپنے ہیرو کو دنیا کے سامنے بلا کم و کاست پیش کرے اور اپنی رنگین عینک کو اتار کر رکھ دے۔ وہاں پڑھنے والوں کے لئے بھی ضروری ہے کہ وہ توہمات کا شکار نہ ہوں اور سریع الاعتقادی سے اپنا دامن بچائیں اور اچھی باتوں کو قبول کرتے ہوئے غیر امکانی اور بعید القیاس باتوں کو رد کر دیں۔ فبشر عبادی الذین یستمعون القول فیتبعون احسنہٗ

ہمیں ان ابتدائی سطور میں حضرت مجاہد ملت نور اللہ مرقدہٗ کے بارے میں کچھ لکھنا نہیں ہے۔ اس کے لئے آپ کے سامنے پوری کتاب زندگی پیش کی جا رہی ہے یہاں صرف یہ بتانا ہے کہ اس نمبر میں حضرت مولانا مرحوم کی زندگی اور ان کے یادگار زمانہ کارناموں اور خدمات کا جو نقشہ پیش کیا گیا ہے۔ ان میں اشارات کی نوعیت کیا ہے، اور تفصیلات کو کس ڈھنگ سے پیش کیا گیا ہے اور کن گوشوں پر حقائق کی روشنی ڈالی گئی ہے اور کن پہلوؤں کو قارئین کے اختیار تمیزی پر چھوڑا گیا ہے اور آپ کو ان تمام پہلوؤں پر کس نقطۂ نگاہ سے غور کرنا اور کن طریقوں سے ان کا جائزہ لینا ہے، لکھنے والوں نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے اور انھیں جو کچھ معلوم تھا اسے وقف عام کرنے میں بخل سے کام نہیں لیا ہے۔ اب یہ کام پڑھنے والوں کا ہے کہ وہ بھی اپنے ذوق اور تعلق خاطر کا جائزہ لیں اور اس خصوصی شمارہ کی قدر افزائی فرماتے ہوئے مجاہد ملت کے اس مشن کو پورا کرنے کی کوششیں کریں، جس پر انھوں نے اپنی صحت اپنے آرام، اپنے اوقات اور اپنی جان تک کو قربان کر ڈالا اور اسی کے عشق میں اپنی جان شیریں جان آفریں کے سپرد کر دی۔ رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً

اگر یہ کلیہ درجہ وثوق کو پہنچ چکا ہے کہ انسان کا علم اور دنیا کی ہر چیز اضافی ہے اور اشیاء کی شناخت میں تعرف الاشیاء باضدادہا کا اصول کار فرما ہے تو اس کلیہ سے اشخاص اور شخصیتیں بھی مستثنیٰ نہیں ہو سکتیں چنانچہ زندگی کے واقعات اضافی حیثیت سے بعض کے نزدیک بڑے اہم ہوتے ہیں۔ بعض کے خیال میں معمولی اہمیت رکھتے ہیں اور بعض کے نقطہ سے ان میں کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ مسلم یونیورسٹی کے بانی سر سید احمد خاں مرحوم و مغفور نے اپنی بے مثال قربانیوں اور

ان تھک لگن کے باعث اپنی جو شخصیت بنائی تھی وہ بھی ان ہی سہ گانہ خانوں کے اندر تقسیم ہو گئی ہے ایک طبقہ صحیح معنے میں ان کو ریفارمر تسلیم کرتا ہے، دوسرا بین بین راہ اختیار کرتا ہے اور تیسرا انھیں کوئی اہمیت دینے کے لئے تیار نہیں ہے آپ اس انداز فکر کو خواہ مبالغہ کا نام دیں یا تنقیص کا یا پھر اسے اضافی اصول کی طرف لوٹائیں حقیقت اپنی جگہ باقی رہے گی کہ ہر شخص کا ہر شخص کے نزدیک محبوب اور معیوب ہونا ضروری نہیں، درجات کا تفاوت ہر شخص کے علم اور مزاج کے مطابق ہوتا ہے، البتہ تاریخ میں بعض ایسی شخصیتوں کا پتہ لگتا ہے جو تھوڑے بہت تفاوت کے ساتھ سب کے نزدیک عقیدت کی تکیہ گاہ رہی ہیں، اور جن کے سامنے مخالفین اور موافقین کا سر احترام کے لئے جھکتا رہا ہے۔ ان میں سے ایسی ایک شخصیت مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم و مغفور کی ہے کہ مخالفوں نے بھی ان کی عظمت کا اعتراف کیا اور عقیدت مندوں نے بھی ان کی راہ میں اپنی آنکھیں بچھائیں۔ اگر آپ اجازت دیں تو ہم ان ہی شخصیتوں میں مجاہد ملت کو بھی شمار کر سکتے ہیں۔ ماننے والوں نے ان کو زندگی میں بھی مانا اور وفات کے بعد بھی ان کی خوبیوں کے معترف رہے جنھوں نے زندگی میں تیور بدلے وہ بھی ان کی خدمات سے انکار نہ کر سکے اور وفات کے بعد انھیں محسوس ہوا کہ قوم و ملت کی ایک بہت بڑی اور قیمتی امانت ہاتھ سے نکل گئی۔ ہم نے زندگی میں تجربہ کیا کہ شدید مخالفت کے باوجود لوگوں کو کہتے ہی بنی کہ کیا کریں مقابلہ میں کوئی دوسرا دکھائی بھی نہیں دیتا۔ وہ غنیمت ہے اور ملت ابھی بے سہارا نہیں ہوئی ہے۔

تاریخی شخصیتیں کبھی یک رخی اور یک طرفہ نہیں ہوا کرتیں، ان کے بننے میں دو عوامل برابر کام کرتے رہے ہیں۔ ایک یہ کہ خود ان کے اندر بننے کی صلاحیتیں بدرجہ اتم موجود تھیں ان کے بنانے میں ان کی ذہانت، ذکاوت، قوت عمل، خلوص، لگن، ایثار اور قربانی نے بڑا کام کیا اور وہ خادم بن کر مخدوم بنیں، دوم انھیں آنکھوں پر بٹھانے کے لئے عقیدت مندوں کا ایک طبقہ ہمیشہ موجود رہا اور اس نے ان کے مشن کو کامیاب بنانے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگائی۔ اگر کسی وقت ایسا ہوا کہ شخصیت تو اپنی تمام ضروری شرائط کے ساتھ وجود میں آ گئی، مگر حامیین اور انصار کا طبقہ پیدا نہ ہو سکا، اس حالت میں یا تو اس عظیم شخصیت کو وقت کا انتظار کرنا پڑا یا ناکامی میں بقیہ ایام گزار دیئے یا پھر کوئی ایسی شخصیت وجود میں آئی جس کے استقبال کے لئے عقیدت مندوں کی فوج تو تیار ہو گئی، لیکن وہ خود طبل تہی بلند بانگ و درباطن ہیچ کا مصداق ثابت ہوئی۔ نہ وہ اپنا کوئی مشن لے کر آئی، نہ اس نے اپنی صلاحیتوں کا کوئی ثبوت بہم پہونچایا، نہ اس کے اندر قوت عمل کی کوئی رمق پائی گئی، نہ اس پر اخلاص و ایثار کی کوئی تہمت لگی۔ اس کے اندر نہ ظاہری اوصاف پیدا ہو سکے اور نہ باطنی اوصاف کی روشنی چمک سکی۔ اتفاقات نے عقیدت مندوں کا ایک گروہ پیدا کر دیا جس نے اپنے "رہنما" کے پر لگائے، مگر اسے اڑنے اور بلندی پر پہنچنے کے قابل نہ بنا سکے۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ پیری مریدی کا بازار تو چلا اور عام رسوم میں ایک اور رسم کا اضافہ ہوا۔ مگر جس شخص کو اڑنے کی کوشش کی گئی تھی وہ اپنا کوئی قابل ذکر کارنامہ تاریخ کے حوالے نہ کر سکا، خلاصہ یہ کہ امامت اور قیادت کا مسئلہ مہاجرین اور انصار سے زیادہ مشابہت رکھتا ہے۔ جس طرح مہاجرین کے لئے انصار کا وجود ضروری ہے۔ اسی طرح ایک قائد و رہنما کے لئے ان حاملین کی ضرورت ہے جو اس کے مشن کی صداقت پر اپنے عمل سے شہادت دیں اور اس کے پیغام کو لے کر آگے بڑھیں اور اس کے لئے اپنا سب کچھ قربان کر دیں۔ اگر کسی قائد کا کوئی صحیح مخاطب نہیں تو اہم سے اہم شخصیت بھی وہ مقبولیت حاصل نہیں کر سکتی، جو اسے انصاف کی رو سے حاصل ہونی چاہئے۔ جب ہم اس نقطۂ نظر سے حضرت مجاہد ملت کی شخصیت پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے قوم کے اندر کبھی یتیمی کی زندگی نہیں گزاری اور قوم نے کبھی ان کو تنہا نہیں چھوڑا۔ ذرا ہندوستان کے طول و عرض کا جائزہ لیجئے اور انگلی رکھ کر بتائیے کہ کوئی مقام ایسا بھی ہے جہاں مرحوم کا فیض نہ پہنچا ہو یا وہ ان کی خدمات سے محروم رہ گیا ہو۔ کلکتہ سے مالا بار تک اور کشمیر سے راس کماری تک ملک کا چپہ چپہ مرحوم کی خدمات کے لئے زیر بار احسان ہے اور ملک کا ہر گوشہ ان کی قربانی اور ایثار پر مجسم شہادت ہے۔ اگر قدرت نے مجاہد ملت کو بے پناہ قوت عمل دی تھی، تو اسی قدرت نے خدمات کا دائرہ بھی اتنا وسیع کر دیا تھا کہ اس پر ان کی قیادت کا شامیانہ آسانی سے پھیل سکا اور وہ اپنی رہنمائی کا بھرپور مظاہرہ کر سکے۔

جہاں تک مجاہد ملت کی عوامی قیادت کا تعلق ہے اس میں کسی وقت بھی دو رائیں نہیں ہو سکتیں، لیکن جن لوگوں کو آپ سے کم و بیش تعلق خاطر رہا ہے اور جن کو ہم متوسلین اور عقیدت مندوں میں شامل کر سکتے ہیں ان انھیں ہم آسانی کے لئے تین خانوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

پہلے خانہ میں وہ لوگ ہیں جنھوں نے مجاہد ملت کو بہت ہی قریب سے دیکھا ہے آپ کی معیت میں شب و روز گزارے ہیں، ان کے مزاج میں دخل حاصل کیا ہے یا مزاج شناسی میں مہارت حاصل کی ہے اور وہ اس حد تک قریب رہے ہیں کہ ان کی حرکات و سکنات کو دیکھ کر اندازہ لگا لیتے تھے کہ کچھ عرصہ کے بعد ان کا کردار کیا ہوگا اور وہ کن خطوط پر سوچ کر کن سے نتائج اخذ کریں گے یا جو اس حد تک مزاج شناس ہیں کہ ان کی برہمی اور خوش باشی سے پتہ لگا لیتے تھے کہ ان کا ذہن کن مسائل کے

گردگھوم رہا ہے اور وہ آئندہ کیا قدم اٹھانے والے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے متوسلین کی تعداد بہت کم ہوگی۔ مگر یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے صحیح معنے میں ان کی خدمات اور خدمات کے لئے ان کی تڑپ کا مشاہدہ کیا ہے اور جو بلاخلاف شرعی کہہ سکتے ہیں کہ سارے ملک میں مولانا کا وجود بے بدل ہے اور ان کی قیادت کو چیلنج کرنے والا ابھی تک پیدا نہیں ہوا ہے۔

دوسرے خانہ میں وہ لوگ نظر آتے ہیں جو توسل اور تعلق کے اعتبار سے بین بین ہیں۔ ایسے لوگ مجاہد ملت سے متعارف بھی ہیں، انھیں اپنا دوست اور بزرگ بھی سمجھتے ہیں۔ اگر موقع ملا تو خدمت میں حاضری بھی دے دی، راہ میں ملاقات ہوگئی تو سلام وکلام بھی کر لیا۔ ضرورت پڑی تو ان کے مشوروں سے بھی فائدہ اٹھایا۔ علالت میں عیادت کے لئے بھی آگئے۔ تشریف آوری پر ہوائی اڈہ اور اسٹیشن پر بھی چلے گئے، خطوط کے ذریعے بھی گاہے گاہے راہ و رسم کو زندہ رکھا۔

تیسرے خانہ کے وہ لوگ ہیں جنھوں نے مجاہد ملت کا صرف نام سنا، یا ان کی کوئی تقریر پڑھ لی، یا کوئی بیان مطالعہ میں آگیا۔ یا کبھی کسی جلسہ میں شرف نیاز حاصل کر لیا اور مصافحہ کی نوبت آگئی یا عمر میں ایک دو دفعہ کسی کام کی خاطر بات چیت کرنے کے لئے خدمت میں حاضر ہوگئے۔

اب یہ بات بالکل عیاں ہے کہ مجاہد ملت کے بارے میں ان میں سے ہر شخص کے تاثرات قدرے مختلف ہوں گے اور پھر ان کے نتائج اور فیصلوں میں بھی اختلاف ہوگا اور ان کے طرز عمل میں بھی تنوع پیدا ہو جائے گا۔ لیکن اس اختلاف کے باوجود ان کا یہ احساس مشترک ہوگا کہ قوم و ملت کو ان کی سخت ضرورت ہے اور انھیں اس میدان میں ان کے سوا کوئی نظر نہیں آتا۔ مرحوم جن علوم سے بہرہ ور تھے اور اس سلسلہ میں آپ نے جو کتابیں تصنیف کیں ان کی قدر و قیمت سے صرف اہل علم ہی واقف ہو سکتے ہیں لیکن قدرت نے آپ کو جو قوت عمل بخشی تھی اور خدمات کا جو جذبہ آپ کو حرکت میں لا رہا تھا اسے دیکھنے کے لئے صرف آنکھوں کی ضرورت تھی اور ہر آنکھ والے نے دیکھا کہ مولانا کا وجود سراپا جہاد تھا جو آپ کو حرکت و عمل کے لئے سیماب وار مضطرب رکھتا تھا۔ اور دن رات کے اٹھارہ گھنٹے اسی خدمت اور عمل میں صرف ہوتے تھے۔ اگر دفتر میں ہیں تو نزدیک اور دور کے لوگ مشورے لے رہے ہیں۔ کوئی اپنی بپتا سنا رہا ہے۔ کسی جگہ سے کوئی وفد آیا ہوا ہے اور آپ گھنٹوں ان کے ساتھ مشوروں میں مشغول ہیں۔ کہیں تار روانہ کئے جا رہے ہیں، کہیں حکام کو فون کیا جا رہا ہے۔ کسی کو چٹھی لکھی جا رہی ہے۔ کہیں سے فوری بلاوا آیا ہے اور آپ روانگی کے لئے تیار بیٹھے ہیں۔ کبھی پنڈت نہرو سے ملاقات کا وقت مقرر کیا جا رہا ہے اور کبھی وزیر داخلہ سے بات چیت کے لئے چل کھڑے ہوئے ہیں۔ اگر کہیں مسلمانوں کے خلاف یورش ہوئی تو بے چینی کے آثار فوراً نمایاں ہوگئے اور چلنے کے لئے تیاری شروع کر دی۔ نہ کھانے پینے کی سدھ اور نہ سونے اور آرام لینے کی فرصت۔ یہ وہ باتیں ہیں جن سے وہ لوگ بھی انکار نہیں کر سکتے جنھیں مولانا سے اختلاف تھا۔ اور جو مختلف وجوہ سے آپ کا ساتھ نہ دے سکے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مجاہد ملت کی شب و روز کی سرگرمیاں نظروں کے سامنے تھیں اور جن کو ہر شخص باٹھوں سے چھو کر بھی دیکھ سکتا تھا۔ منطق سے استدلال میں شکوک پیدا کئے جا سکتے ہیں۔ مگر مشاہدہ کی تکذیب نہیں کی جا سکتی۔

مجاہد ملت کی زندگی کے خفی اور جلی نقوش آپ کو آنے والے اوراق میں نظر آئیں گے۔ ہم یہاں مرحوم کی ذہنی نفسیات سے متعلق صرف دو باتوں پر توجہ دلانا چاہتے ہیں۔ یعنی آپ کی بے مثل ذکاوت اور ذہن ثاقب اور اس کے ساتھ ہی قوت فیصلہ اور استقامت رائے۔ مجاہد ملت کے سیلان ذہن کا یہ حال تھا کہ بات کی تہ کو فوراً پہنچ جاتے تھے، جہاں کسی نے کوئی بات چھیڑی آپ کا ذہن اس کی انتہا کو پہنچا۔ نہ صرف یہ کہ آپ کو ذہن کی رسائی میں ملکہ تھا بلکہ قوت فیصلہ میں بھی کمال حاصل تھا۔ بات چھیڑتے ہی اس کی تہ کو پہنچ جانا اور فوراً قوت فیصلہ سے کام لینا اور عموماً اس فیصلہ کا مصاب اور درست ہونا ایک ایسی خداداد نعمت تھی جو قدرت نے آپ کو نہایت فیاضی سے عطا کی تھی۔ اگر کسی نے کوئی واقعہ بیان کیا تو ختم ہونے سے پہلے ہی سمجھ لیا کہ واقعہ کی کڑی کہاں سے ٹوٹی ہے اور بیان کرنے والے نے کون سی بات چھپائی ہے اور کیوں چھپائی ہے۔ چنانچہ جرح کرنے کے بعد ان کے سیلان ذہن کی داد دینی پڑتی تھی۔ اور وہ ہی ظاہر ہوتا تھا جیسے آپ ابتدا ہی میں محسوس کر چکے تھے۔ بہت کم ایسا ہوا ہے کہ کوئی شخص آپ کو دھوکا دینے میں پورے طور پر کامیاب ہوگیا ہو۔ مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ ہم نے بہت دھوکے کھائے اور اکثر حالات میں ان کی سزا بھی بھگتی۔ مگر اب ایک مدت سے ہم نے دھوکہ سے بچنے کا گر معلوم کر لیا ہے اور ہمیں ابتدا ہی میں معلوم ہو جاتا ہے کہ کہنے والے کا مقصد کیا ہے اور وہ کن باتوں کو چھپا کر ہم سے غلط کام لینا چاہتا ہے۔ ایک بار راقم الحروف کی موجودگی میں ایک صاحب تشریف لائے اور انھوں نے مولانا کو واقعہ سنایا کہ میں فلاں مقام سے ایک بس میں سوار ہوا۔ جب وہ ایک خاص جگہ پہنچی تو کالج کے ہندو طلبا نے اس کا محاصرہ کر لیا اور مسلمان مسافروں کو اتار کر خوب پیٹا اور کسی ہندو مسافر کو ہاتھ نہیں لگایا۔ یہ صاحب چاہتے تھے کہ مولانا اس

حادثہ کی اطلاع ضلع کلکٹر کو دے دیں اور اس سے واقعہ کی تحقیقات کا مطالبہ کریں۔ مولانا نے سنتے ہی دریافت کیا کہ جب مسلمان مسافروں کی پٹائی ہو رہی تھی تو آپ کہاں تھے؟ وہ بولے، میں بھی وہیں موجود تھا اور اپنا چشم دید واقعہ بیان کر رہا ہوں۔ مولانا نے پھر پوچھا کہ آپ کو کہاں کہاں چوٹ آئی وہ بولے کہ خیریت رہی کیونکہ مجھ پر کسی نے ہاتھ نہیں اٹھایا۔ مولانا فوراً سمجھ گئے کہ یہ معاملہ فرقہ وارانہ نہیں ہے۔ یہ رقابت اور آپس کی دشمنی کا معاملہ ہے چنانچہ آپ بار بار پوچھتے رہے کہ جب ہندو طلباء نے صرف مسلمانوں ہی کو پیٹا تو آپ بھی تو مسلمان ہیں پھر آپ کیسے بچ گئے؟ اس کے جواب میں وہ صاحب بہت گھبرائے۔ اور مولانا خاموش ہو گئے۔ لیکن تین چار روز کے بعد ایک صاحب کے ذریعہ معلوم ہوا کہ مسلمانوں کے دو فریق میں مقدمہ بازی چل رہی تھی۔ ایک فریق نے اپنے تعلقات کی بناء پر کالج کے کچھ لڑکوں کو بتایا کہ دوسرے لوگ کچہری میں حاضر ہونے کے لئے فلاں بس سے فلاں روز چلیں گے، تم ایک خاص جگہ جمع ہو جانا اور ان لوگوں کی ذرا اچھی طرح مرمت کر دینا۔ چنانچہ طلباء نے ایسا ہی کیا لیکن مولانا کو بتایا گیا کہ یہ واقعہ فرقہ وارانہ نوعیت کا ہے۔ اس لئے آپ ضلع کلکٹر کو خبر کر دیں۔ اور ان سے تحقیقات کا مطالبہ کریں۔ لیکن جب اصل حقیقت کا پتہ چلا تو مجاہد ملت کی ذہنی رسائی کی داد دینی پڑی۔ اور خود مولانا نے فرمایا کہ یہ پہلا تجربہ نہیں۔ اس قسم کے تجربے آئے دن پیش آتے ہیں اور ہم بھی سمجھ لیتے ہیں کہ اصل حقیقت کیا ہے۔

خاص طور پر ۱۹۴۷ء کے بعد سے حضرت مولانا مرحوم کی زندگی اس قدر عوامی اور مشغول ترین زندگی رہی کہ بیک وقت ملک و ملت کی بیسیوں ذمہ داریاں تنہا ان کے کاندھوں پر تھیں۔ کتنے ہی اجتماعی اور انفرادی مسائل سے ہر روز ان کو نمٹنا پڑتا تھا۔ ان کی درد مند طبیعت یہ گوارا نہیں کر سکتی تھی کہ اہم سے اہم ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ وہ کسی چھوٹے سے چھوٹے کام کو بھی بربنائے مصروفیت نظر انداز کر دیتے۔ واقعہ یہ ہے کہ زندگی کے آخری پندرہ سولہ برس انھوں نے جس تندہی اور دل سوزی کے ساتھ خدمت و عمل کی راہوں میں گزارے، انسانی کردار میں اس کی مثالیں بہت ہی کم مل سکیں گی۔

کاموں کے مسلسل ہجوم اور مشاغل کی گراں باری نے جس طرح ان کی تندرستی کو گھلایا اس کا ایک قدرتی نتیجہ یہ بھی تھا کہ زندگی کے اس حصہ میں آ کر مزاج میں تیزی اور لب و لہجہ میں کچھ کرختگی پیدا ہو گئی تھی۔ بعض وقت ملنے والوں کو یہ انداز طبع کچھ اجنبی سا محسوس ہوتا تھا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ عوامی زندگی کے ہنگاموں میں رہتے ہوئے شب و روز کے تجربوں نے مولانا مرحوم کو اس مقام تک پہنچا دیا تھا کہ رد و قدح کے بغیر وہ کسی شکایت و روایت کو قبول نہ کریں۔ مولانا مرحوم کی جرح و تشریح اکثر اصحاب معاملہ کو راست گفتاری پر مجبور کر دیا کرتی تھی۔ پھر جب معاملہ کی صحیح صورت حال ان کے علم میں آ جاتی تھی تو پوری دل سوزی اور درد مندی کے ساتھ وہ صاحب معاملہ کی بھرپور مدد اور امکانی کوشش سے دریغ نہ فرماتے۔ اور جب تک اپنے مقدور بھر کوشش نہ کر لیتے چین سے نہیں بیٹھتے تھے۔

اب آپ آئندہ اوراق میں حضرت مجاہد ملت نور اللہ مرقدہٗ کی کتابِ زندگی ملاحظہ فرمایئے، جن اہلِ قلم اور علم دوست حضرات نے مرحوم کی زندگی کے کسی گوشہ پر قلم اٹھایا ہے اور اس کے ذریعہ معلومات کے موتی بکھیرے ہیں ان کی تابناکی مدتوں تک باقی رہے گی۔ اور پڑھنے والے ان سے برابر فائدہ اٹھاتے رہیں گے۔ ہم ان تمام ارباب قلم کے ممنون اور متشکر ہیں کہ انھوں نے ہمیں اپنے رشحات قلم کی اشاعت کا موقع دیا۔ اور ہم انھیں قارئین کرام کی خدمت میں پیش کرنے کے قابل ہو سکے۔ ہم ان کی نگارشات کے بارے میں اس کے سوا کیا کہہ سکتے ہیں کہ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ

ناسپاسی اور افسوسناک فروگذاشت ہوگی اگر ہم یہاں جنرل منیجر اخبار الجمعیۃ جناب مولانا انیس الحسن صاحب بی، اے و فاضل عربی کو خلوص اور مسرت کے ساتھ خراج تحسین پیش نہ کریں، درحقیقت اس شاہکار کو ایڈٹ کرنے ترتیب دینے اور کتابت و طباعت کی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کا سہرا آپ ہی کے سر ہے۔ فاضل محترم نے جس انہماک اور شب و روز کی ان تھک مساعی سے اس مجموعہ کو مرتب کیا اور اپنی نگرانی میں اول سے آخر تک جملہ مراحل طے کئے اس کے لئے ادارہ الجمعیۃ آپ کی خدمت میں ہدیۂ تشکر و امتنان پیش کرتا ہے۔ اگر اس مجموعہ کی ترتیب و اشاعت میں آپ کی مخلصانہ مساعی کو دخل نہ ہوتا تو وہ اس شان کے ساتھ منظر عام پر کبھی نہ آ سکتا۔ فاضل محترم کو حضرت مجاہد ملت کی بارگاہ میں خدمت اور معیت کا جو شرف حاصل رہا ہے اور سفر و حضر میں ساتھ رہنے سے جو مرتبہ اختصاص آپ کو حاصل ہے اس کا یہی تقاضہ تھا کہ یہ ہدیۂ خلوص ترتیب پا کر اور زینت طبع سے آراستہ ہو کر قارئین کرام کے ہاتھوں میں پہنچے اور مجاہد ملت کی یاد کو مدتوں تک دلوں میں تازہ رکھے اور ان کی ملی، قومی اور علمی خدمات کی یاد دلاتا رہے۔ دعا ہے کہ خالق ارض و سماوات اس مجموعہ کو بابرکت بنائے، اور اسے قبولیت عامہ کی سند بخشے ! آمین۔

ایک حادثۂ فاجعہ کی

صدائے بازگشت

مجاہدِ ملّت حضرت مولانا محمّد حفظ الرّحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ

کو

رہنمایانِ وطن اساطینِ اُمّت اور عالمِ اسلام

کا

خراجِ عقیدت

عنوانِ تکمیلِ حیات

شاعرِ انقلاب علامہ انور صابری صاحب

اے ولی اللہؒ کے عنوانِ تکمیلِ حیات
حادثہ اِس دور کا غمناک ہے تیری وفات

دین و ملّت کے مجاہد، مردِ جانبازِ وطن
عشق و اخلاص و وفائے دل کی شمعِ انجمن

اے حسین احمدؒ کے بازوئے جوانِ زندگی
تیرا مرنا درحقیقت ہے زیانِ زندگی

دیدۂ آزادی تنویرِ ایمانی تھا تو
سر سے پا تک پیکرِ ایثار و قربانی تھا تو

روحِ ایماں تھی ترے آئینۂ کردار میں
تیری جرأت کا تھا پَرتو سینۂ احرار میں

نقرئی سکّوں پہ تو نے قوم کو بیچا نہیں
غربت و افلاس سے باہر قدم رکھا نہیں

قرنِ اوّل کی ادائیں تھیں ترے انداز میں
تھا اضافہ توشۂ کونینؐ کے اعجاز میں

جوش میں بھی ہوش کا احساس رہتا تھا تجھے
غیرت و ناموسِ حق کا پاس رہتا تھا تجھے

عمر بھر حسنِ عمل تیرا بھلا سکتے نہیں
داغ تیری یاد کا دل سے مٹا سکتے نہیں

راقم صابری

ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب

نائب صدر جمہوریۂ ہند

مولانا حفظ الرحمٰن (صاحبؒ) مرحوم کی وفات' پورے ہندوستان کے لئے ایک سخت سانحہ ہے بعض مرنے والے ایسے ہوتے ہیں کہ ان کے مرنے کے بعد ان کی جگہ پُر کرنا بڑا دشوار ہوتا ہے۔ مولانا حفظ الرحمٰن مرحوم کا شمار انھیں میں کرنا چاہیئے۔ انھوں نے اپنی مجاہدانہ زندگی کی ساری صلاحیتیں ہندوستانی قومی تعمیر کے لئے وقف کردی تھیں۔ ان کی حساس اور فرض شناس شخصیت نے مذہب و ملت کا فرق و امتیاز کبھی روا نہ رکھا۔ وہ ہر اس تحریک کے ساتھ تھے جو مظلوموں اور بیکسوں کی حمایت میں اُٹھائی گئی ہو جب کبھی اور جہاں کہیں انھیں مظلوم کی چیخ سنائی دی تو وہ بیتاب ہو گئے، اور غم گساری کے لئے پہنچ گئے اور جو بھی بن پڑا کیا۔ کبھی حکام کو متوجہ کیا، کبھی مالی اور طبی امداد کیلئے سامان فراہم کیا اور کبھی بڑی جرأت اور بے باکی سے حق اور صداقت کو اپنے اہلِ وطن کے سامنے پیش کیا۔

مولانا مرحوم کی سیاسی زندگی سنہ ۱۹۱۹ء سے شروع ہوئی۔ انھوں نے خلافت اور سوراج کی تحریکوں میں حصہ لیا اور متحدہ قومیت اور حریت و آزادی کے پیغام کے ساتھ اپنی زندگی کو وابستہ کیا اور یہ وابستگی آخر دم تک برقرار رہی۔ ان کی زندگی صلہ و ستائش سے ہمیشہ بے نیاز رہی۔ جو کچھ کیا اسے فرض سمجھ کر کیا۔ قید و بند کے مصائب برداشت کئے تو فرض سمجھ کر۔ آزاد رہ کر جو سختیاں جھیلیں، وہ بھی فرض سمجھ کر۔ ان کی ذات ہندوستان کے مختلف فرقوں کے درمیان اتصالی کڑی کے مثل تھی۔ وہ قومی اتحاد اور یک جہتی کے زبردست علمبردار تھے۔ انھیں پورا یقین تھا کہ جب تک اہلِ ملک میں جذباتی ہم آہنگی اور ہمدردی و موانست نہ پیدا ہو اس وقت تک آزادی کی برکتیں عام نہیں ہو سکتیں اور نہ وہ حریت و اخوت کے اصول جڑ پکڑ سکتے ہیں' جن پر ہندوستانی دستور کی شاندار عمارت تعمیر کی گئی ہے۔

افسوس' صد افسوس کہ وہ ہم سے رخصت ہو گئے۔ لیکن کیا وہ واقعی ہم میں نہیں ہیں؟

نہیں' وہ ہزاروں ساتھیوں کے سینوں میں محبت اور عقیدت کے روپ میں ہزاروں بے یاروں' بے مددگاروں، بے شمار یتیموں، بیواؤں کے دلوں میں ایک سہارے کی یاد کی شکل میں لاکھوں ہم قوموں کے ذہنوں میں خوف کے وقت جرأت، بے سروسامانی میں ہمت اور ہر حال میں خلوص اور صداقت کے علم کی صورت میں' زندہ رہیں گے۔ ایسے لوگ مرتے نہیں۔ موت ان کے لئے حیاتِ جاوداں کا دروازہ ہوتی ہے۔ ان کی روح اپنے پیدا کرنیوالے کے حضور میں پہنچ گئی ہے۔ اس کی رحمتوں اور برکتوں کی بارش اس پر ہو۔

ذاکر حسین

جمہوری تار سے

السیّد جمال عبدالناصر

صدر متحدہ عرب جمہوریہ

مولانا حفظ الرحمٰن جنرل سکریٹری جمعیۃ علماء ہند کی خبر وفات میں نے گہرے رنج و غم کے ساتھ سُنی۔ بلاشبہ ہم ایک جیّد عالم دین سے محروم ہوگئے۔ انھوں نے اسلام کی جو خدمات انجام دی ہیں وہ ہمیشہ زندہ رہیں گی۔ خدائے پاک سے میری دعا ہے کہ انھیں اپنی رحمتوں سے نوازے، اور آپ کو جو سخت نقصان پہنچا ہے، اس کی تلافی کرے،

ڈاکٹر ریاض العطر

کلچرل اٹیچی
سفارت خانہ متحدہ عرب جمہوریہ

(اپنی اور علماء متحدہ عرب جمہوریہ کی جانب سے، ایک تحریری بیان میں)

حضرات السادۃ الافاضل ! انہ لیعز علینا ان نجتمع الیوم لتأبین شخصیۃ عزیزۃ علیٰ نفوسنا بعد ان کانت الیٰ عہد قریب ملئ السمع والبصر۔ تشع بنور عرفانہا وایمانہا ووطنیتہا علی انحاء الہند خاصۃ والعالم الاسلامی عامۃ۔

کان الفقید الکریم طوال حیاتہ داعی سلام ومحبۃ وتعاون بین جمیع الطوائف فی القارۃ الہندیۃ فاستحق عن جدارۃ احترام کل من لازمہٗ او اتصل بہ او عمل معہ۔

ولقد کان لی شرف اللقاء بالراحل الکبیر فی مناسبات مختلفۃ فلمست منہ صدق العزیمۃ والوفاء و الایمان بربہ ووطنہ۔ لم تتخل عنہ ھٰذہ المثل مطلقًا بتغییر الظروف والاحوال بل ظل عاملا لارساء قواعد ھذہ المثل ونشر رسالتہا بکل ما وسعہٗ الجہد حتیٰ اٰخر لحظۃ فی حیاتہ۔

کان مولانا حفظ الرحمٰن علیہ رحمۃ اللّٰہ عالما دینیا واسع الافق یعمل لدینہ بقدر ما عمل لدنیاہ وخلف وراءہٗ سجلا حافلا بالصفحات البیضاء فی الجہاد والقیم الاخلاقیہ جدیرۃ بان یحتذی بہا وان یعمل لہا زملاءہٗ ومحبوہ واتباعہ و عارفوا فضلہ حتی یحافظوا علی غرسہ وتراثہ الذی ترکہ من بعدہ۔ ومع شعورنا بالالم لہول الفاجعۃ التی اصابت الشعب الہندی الصدیق وجمعیۃ علماء الہند بفقد ھٰذہ الشخصیۃ الفذۃ العاملۃ فی میدان المحبۃ والسلام والجہاد الوطنی فانہ لا یسعنی الا ان اعرب بالنیابۃ عن علماء الجمہوریۃ العربیۃ المتحدۃ خاصۃ واخوانکم ھناک عامۃ عن عظیم الاسف والالم لہذا الخسارۃ الفادحۃ۔ واللّٰہ نسأل ان یسکن الفقید الجلیل فسیح جناتہ وان یسبغ علیہ رحمتہ وان یعوضنا فی فقدہ عوضا لصابرین وان ینزلہ منزلۃ الصدیقین والشہداء والابرار کما اتوجہ الی اسرۃ الفقید الکریم بالعزاء وان یلہمہم اللّٰہ الصبر والسلوان وسلام علی الفقید یوم لقی ربہ ویوم ان یلتقی معہ فی جنۃ الخلد۔ والسلام علیکم و رحمۃ اللّٰہ وبرکاتہٗ۔

Riyaz

ڈاکٹر راجندر پرشاد

سابق صدر جمہوریہ ہند

کیمپ حیدر آباد -
مورخہ ۱۳ر اگست ۶۲ء

حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب مرحوم جمعیۃ علمائے ہند کے ایک بلند پایہ رکن تھے - ہماری قومیت کی ایک جیتی مثال تھے اور میرے اُن عزیز دوستوں میں تھے جن کے ساتھ بارہا کام کرنے کا مجھے اتفاق ہوا تھا -
مثل ہے کہ عوام کی یاد داشت بہت کمزور ہوتی ہے اور اسے اپنے سچے خادموں کو بھی بھولتے دیر نہیں لگتی -
الجمعیۃ کا خاص نمبر مولانا مرحوم کی یاد کو محفوظ رکھنے میں کامیاب ہو، یہی میری تمنا ہے - فقط

راجندر پرساد

مسز ارونا آصف علی (ترجمہ انگریزی سے)

مجھے ۱۹۳۰ء سے مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سے واقفیت اور ملاقات کا شرف حاصل رہا ہے، کیونکہ جب آصف علی صاحب مرحوم اور مولانا آزادؒ یہاں پر جمع ہوا کرتے تھے، مولانا حفظ الرحمٰن صاحب بھی اکثر تشریف لایا کرتے تھے -

ایک ایسے ہندوستان کی تعمیر کے لئے جس میں جمہوری اور غیر مذہبی استواری کے ساتھ ہر فرقہ اور ہر فرد ملت کو مساوی حقوق اور مواقع حاصل ہوں - مولانا نے جس طرح اپنی زندگی وقف کی، وہ ایک روشن حقیقت ہے -

میں تو دعا ہی کر سکتی ہوں کہ خدا کرے ان کی مثالی زندگی نئی نسلوں میں بھی ایسا ہی عزم اور حوصلہ پیدا کر سکے، اور ان کے لئے مشعل راہ ہو -

"ارونا آصف علی"

مسز اندرا گاندھی (خاص مکتوب کے ذریعہ)

مولانا کی وفات سے ہم سب کو دلی صدمہ پہنچا، مولانا صاحب کی بیماری کا مجھے علم تو تھا، لیکن یہ گمان نہ تھا کہ اُن کا وقت اتنا قریب آگیا ہے، علاج کرانے کے بعد انھوں نے میرے والد (پنڈت جواہر لال نہرو) سے کہا تھا کہ اب میں اچھا ہوں -

مولانا صاحب نے اپنی تمام زندگی ملک اور قوم کی خدمت میں گزاری، وہ بڑے حوصلے والے - روشن خیال اور بلند اخلاق انسان تھے - ان کی وفات سے ملک کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا ہے -

نتھریک غم
اندرا گاندھی

شری جواہر لال نہرو وزیر اعظم ہند

مولانا کے انتقال سے مجھے بڑا دُکھ ہوا ہے۔ مولانا کو میں کب سے جانتا ہوں، کچھ کہہ نہیں سکتا تیس برس سے زیادہ سے جانتا ہوں، یا شاید پینتیس چالیس برس سے جانتا ہوں، بالکل یاد نہیں۔ ہم لوگ شروع میں دونوں یوپی کانگریس کمیٹی کے ممبر تھے۔ اکثر ملا کرتے تھے، چھوٹی کونسل کے ممبر بھی رہے، وہاں اُن سے ملاقاتیں ہوا کرتی تھیں۔
سب مسئلوں پر بات چیت ہوا کرتی تھی، جب انگریزی حکومت سے مقابلے ہوتے تھے تو ہمارا معمولی کام رُک جاتا تھا، صرف مقابلہ ہوتا رہتا تھا، جیل جانے اور آنے کا کام رہتا تھا، ہم پھر آکر ملتے تھے تو اس سلسلے کو شروع کر دیتے تھے۔ میں ان سے بہت ملتا تھا۔ اہم مواقع پر ملنے جلنے اور بات کرنے سے ایک دوسرے کو خوب سمجھنے لگے تھے۔ میرے دل میں ان کی بہت قدر تھی، بہت محبت تھی، وہ بہادر سپاہی تھے، بہادر نیتا تھے، جو کہتے تھے اس میں وزن ہوتا تھا، ان کی بات غور طلب ہوتی تھی، ایسے آدمی کا گزر جانا سخت رنج و غم کی بات ہے۔ ایک تو یہی کہ ایک دوست اور ساتھی گزر گیا۔ وہ ایسے آدمی تھے کہ پیچیدہ مسائل کو حل کرنے میں مدد کرتے تھے۔ ان کی وفات سے مجھے کافی دھکا لگا ہے۔ ہلکے ہلکے سارے بزرگ گزرتے جاتے ہیں ان کے کاموں کا بوجھ نوجوانوں کے کندھوں پہ آپڑا ہے۔ دنیا کا اس طرح ہی دستور ہے۔ دستور کیسا بھی ہو، رنج تو ہوتا ہی ہے اور رنج ہونا بھی چاہیئے۔
ابھی وہ امریکہ سے واپس آئے تھے، تب میں مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سے ملا تھا، مجھ سے بڑے اطمینان سے انھوں نے کہا تھا کہ ڈاکٹروں نے ان کو اچھا کر کے بھیجا ہے، ہاں کافی کمزور تھے۔ میں نے انھیں مبارکباد دی۔ شکر ہے کہ اچھے ہو گئے، سوچتا تھا کہ ہلکے ہلکے طاقت آجائیگی۔ ابھی کمزور ہیں۔ ایک روز میں نے سنا کہ وہ گزر گئے۔ بڑا افسوس ہوا! اس بات کو برداشت کرنا ہی ہوتا ہے۔ مناسب ہے کہ جمع ہوں۔ رنج و غم کا اظہار کریں۔ لیکن کچھ غور کریں کہ کیسا آدمی تھا، اس کا کیا طریقہ تھا کیا کر گیا۔ ہمیں چاہیئے کہ اس سے کچھ سیکھیں اسکے راستہ پر چلیں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آہ مولانا حفظ الرحمٰن

از ڈاکٹر سید محمود صاحب ایم پی

مولانا حفظ الرحمٰن کے متعلق کچھ بھی لکھنے کے لئے میرا قلم نہیں چلتا۔ وہ رُکتا ہے۔ میرا دل قابو میں نہیں آتا، اور نہ دماغ میں سکون پیدا ہوتا ہے کہ میں مولانا حفظ الرحمٰن کے متعلق چند سطریں لکھ سکوں۔ آں محترم کے کئی تقاضوں سے مجبور ہو کر کئی بار کچھ لکھنے کے لئے بیٹھا، مگر قلم نہ چلا اور کچھ نہ لکھ سکا۔ ممکن ہے آنجناب نے نوٹس لیا ہو کہ میں نے نہ تو کوئی تعزیت نامہ بھیجا نہ اخباروں میں کوئی بیان شائع کرایا۔ البتہ جمعیۃ کے دفتر میں جو مرحوم کے ایثار و قربانیوں کا جولانگاہ تھا آنا چاہتا تھا مگر میرے محترم محمد میاں صاحب اور حضرت مفتی صاحب نے اس کا بھی موقع نہ دیا جب ان کو معلوم ہوا کہ میں آنا چاہتا ہوں، وہ بزرگان خود ہی تشریف لائے۔ میں کیوں آنا چاہتا تھا؟ تاکہ اس جگہ کو پھر دیکھوں، جہاں حضرت مفتی کفایت اللہ۔ حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی۔ حضرت مولانا احمد سعید کیسے کیسے کارنمایاں کر چکے تھے۔ اور اب اُس گروہ کا آخری شخص (عمر کے لحاظ سے نہیں، بلکہ کام کے لحاظ سے) کیا کچھ نہ کر کے مسلمان قوم کو بے یار و مددگار چھوڑ کر دنیا سے چل بسا! اُس جگہ کو دیکھ کر مسلمانوں کی بے کسی و بے بسی پر چند قطرات آنسو کے بہاؤں، اور دریافت کروں کہ اے دفتر جمعیۃ، تیرے سب کارکن یکے بعد دیگرے چل بسے، اب تو بتلا حفظ الرحمٰن جیسا انہمک کام کرنے والا۔ ایسا بے لوث۔ ایسا مخلص۔ ایسا سچا۔ ایسا بے دھڑک کارکن۔ ایسا نڈر انسان جو اپنا دِل خدمتِ خلق و خدمتِ اسلام کے جوش میں نوکِ سناں پر رکھ دیتا تھا، تو اب کہاں سے لائے گا۔

حفظ الرحمٰن کو مجاہد ملت کا خطاب قوم نے عطا کیا تھا لیکن یہ بات لوگوں کو نہیں معلوم کہ اس خاندان میں کتنے ہی مجاہد تھے، انکے خالہ زاد بھائی ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری پیدائشی مجاہد تھے۔ ان کی عمر نے وفا نہ کی اور اوائل میں ولایت سے واپسی کے چند برس بعد بھوپال میں قضا کر گئے۔ علی گڈھ میں طالب العلمی کے زمانہ میں انھوں نے اور ان کے دوست و ساتھی تصدق احمد خاں شیروانی نے بڑے بڑے کارنمایاں انجام دیئے۔

مولانا کے دو بڑے بھائی بھی اُس زمانہ میں علیگڈھ میں پڑھتے تھے۔ فخرالدین اور بدرالدین بدرالدین بھی عبدالرحمٰن اور تصدق احمد خاں شیروانی کے گروہ میں شامل تھے۔ مولانا حفظ الرحمٰن اُس وقت بہت کم سن رہے ہوں گے لیکن میں اُن کے نام سے اُسی وقت سے واقف تھا۔ اور ان کے تیزی و ذہانت کے قصے بدرالدین سے سُنتے تھے۔ طلباء کے اس چھوٹے سے گروہ نے عبدالرحمٰن کی سرکردگی میں سیاسی حیثیت سے علی گڈھ کالج میں ایک انقلاب برپا کر دیا تھا۔ ایک خفیہ سوسائٹی بنائی تھی اور انگریزوں کو ہندوستان سے کیونکر نکالا جائے۔ اس پر ہفتہ وار بحث ہوا کرتی تھی ۱۹۰۷ء کی مشہور اسٹرائک کا سرکردہ یہی گروہ تھا۔ عبدالرحمٰن بہت اچھے مقرر تھے۔ اس اسٹرائک نے جو پانچ ماہ تک قائم رہی مسلمانوں کو سیاست کی طرف متوجہ کیا۔ تمام طلبا نے یونین کلب کی ایک ڈبیٹ میں ہندوستان کے تقریباً جملہ مسلمان لیڈران کی موجودگی میں اعلان کیا کہ اب ہم نوجوان اپنے لیڈروں کی انگریز نواز پالیسی سے بغاوت کرتے ہیں۔ اب ہم انگریزوں کی غلامی برداشت نہیں کر سکتے۔ اس ڈبیٹ میں ڈاکٹر سید حسین (مشہور مقرر و صحافی) جو اس وقت علیگڈھ کے طالب العلم تھے، کی تقریر معرکتہ الآرا تھی۔ ایک بار ہم لوگوں نے عبدالرحمٰن کی سرکردگی میں سر سید کی قبر پر جا کر حلف اُٹھایا تھا اور قسم کھائی تھی کہ ہم انگریزوں کو ملک سے نکالے بغیر چین نہ لیں گے۔ آپ نے دیکھا کہ حفظ الرحمٰن کس خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ جس کا ہر فرد طالب العلمی ہی سے زیادہ مجاہد تھا۔ اور اس خاندان کے ایک فرد عبدالرحمٰن نے ہندوستان کے لئے اپنے زمانہ طالب العلمی میں کیا کیا کارنمایاں کئے تھے۔

جس خاندان کی یہ دیرینہ Tradition رہی ہو مولانا حفظ الرحمٰن کا تعلق اسی خاندان سے تھا۔ مجھے اُن کے طالب العلمی کے حالات معلوم نہیں ہیں لیکن اپنے زمانۂ طالب العلمی میں بھی انھوں نے کارہائے نمایاں ضرور کئے ہوں گے۔

یہ لکھنے سے میرا یہی مطلب تھا کہ مولانا حفظ الرحمٰن سے میرا گہرا اور ذاتی تعلق تھا۔ وہ ایک بڑی سوجھ بوجھ کے انسان تھے۔ بلکہ اُن کو سیاسی زبان میں ایک مدبر کہا جا سکتا ہے۔ وہ بہت ذہین و طباع تھے اور بات کی تہ کو جلد اور آسانی سے پہنچ جاتے تھے۔

مسلم کنونشن کے وقت مجھے ان کو بہت نزدیک سے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ جس دانشمندی اور ہوشیاری سے انھوں نے اس کی کارروائی کو چلایا اور کامیاب بنایا وہ ان کی مدبرانہ تدبیروں کی دلیل ہے۔ کنونشن سے ملک کو بڑے بڑے فوائد پہونچ سکتے تھے اور پہونچے، لیکن افسوس ہے کہ ہمارے پریس نے اتنا غیر معمولی شور مچایا کہ مسلمانوں نے اپنا دردِ دل سنا کر وہ سب کچھ مان لیا تھا جو ۱۹۳۷ء سے انھوں نے اس وقت تک تسلیم نہیں کیا تھا۔

(۱) سکولرزم کو مسلمانوں نے کبھی مانا ہی نہ تھا۔ مسلم کنونشن میں انھوں نے نہ صرف اسے تسلیم کیا بلکہ کام کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔

(۲) دو نیشن تھیوری مسٹر جناح نے ان کے دلوں میں راسخ کر دی تھی، لیکن کنونشن میں انھوں نے اکثریت سے مل کر کام کرنا ضروری بتلایا اور اس نظریہ سے ۱۹۳۷ء کے بعد مسلمانوں کے ایک بڑے اجتماع نے انکار کیا۔

(۳) مسٹر جناح یہاں سے یہ فرما کر تشریف لے گئے تھے کہ یہاں کے مسلمانوں کو وہ Written off کر کے جاتے ہیں۔

اس کے مطلب یہ ہوئے کہ ہندوستانی مسلمانوں کو ہندو زندہ رہنے نہیں دیں گے اور ہم ان کو گویا دریا برد کر کے یا سمجھ کے جاتے ہیں، دس برس بعد جب مسلمان پہلی بار جماعتی حیثیت سے مل کر بیٹھے اور تقریریں اور اپنے مسائل پر غور و خوض کیا تو معلوم ہوا کہ بجائے دریا برد ہونے کے ان کی آوازوں میں قوت ہے۔ ان کے دماغ صحیح طور پر سمجھنے اور کام کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ کیا دنیا پر اس سے یہ ثابت نہیں ہوا کہ ہندوؤں پر مسٹر جناح نے غلط الزام لگایا تھا اور ہندوؤں نے مسلمانوں کو بجائے دریا برد کرنے کے ان کو کافی طور پر طاقت ور رہنے دیا۔ کاش ہمارا ملکی پریس اس نکتہ کو سمجھتا کہ اکثریت کو اس کنونشن نے کتنا فائدہ پہونچایا۔ لیکن فرقہ پرستی نے اس ملک سے اس کی مدبرانہ عقل و فلسفہ و منطق کا ورثہ کم از کم عارضی طور پر تو ضرور ختم کر دیا ہے۔

(۴) اگر کنونشن میں کچھ گرم تقریریں ہوئیں، وہ تو ایک برادرانہ شکایات تھیں۔ لیکن اس سے بھی ملک کو باہر کے ملکوں میں بڑا فائدہ پہونچا۔ یہ صحیح ہے کہ وہ گرم تقریریں نہ پاکستان، نہ مصر اور نہ کوئی دوسرا ملک برداشت کر سکتا تھا۔ وزیر اعظم نہرو نے اس کو برداشت کر کے دنیا پر یہ ثابت کر دیا کہ ہندوستان واقعتاً ایک سکولر ملک ہے، اور صحیح معنوں میں ڈیموکریٹک ملک ہے۔

اور بہت سے فوائد ملک کو حاصل ہوئے لیکن سب کو گنانا طویل ہوگا۔ کیا یہ فوائد جو ملک کو حاصل ہوئے وہ کم ہیں؟ پریس کی غیر معمولی شورش کا نقصان یہ ہوا کہ مسلمان جو آگے کاموں کے لئے بالکل مستعد و تیار ہو گئے تھے اور کنونشن میں ولولوں کے ساتھ کام کرنے کے ریزولیوشن پاس کئے تھے، مایوس ہو کر اور مشتبہ ہو کر گھر بیٹھ رہے۔ اگر یہی منشا تھا کہ وہ ملک کا کام نہ کرنے پائیں تو اس میں ضرور کامیابی ہوئی۔ اس سلسلہ میں جو باتیں وزیر اعظم سے منسوب کی گئیں انھوں نے ہرگز وہ باتیں نہیں کہیں۔ اُن کے بعض جوابات کو چھوڑ دیا گیا، اور بعض کو بالکل مسخ کر کے چھاپا گیا۔

مولانا حفظ الرحمن کی بڑی خواہش تھی کہ ایک انگریزی اخبار ۲۵ لاکھ کے سرمایہ سے نکالا جائے۔ افسوس کہ یہ ضروری کام رہ گیا اور ان کی یہ خواہش پوری نہ ہوئی۔ دیکھتا ہوں کہ مسلمانوں کو ان کی موت کا بڑا قلق و صدمہ ہے اور ہونا چاہیے کیا میں اُن کا ایک شریک کار ہونے کی حیثیت سے یہ تجویز پیش کر سکتا ہوں کہ مرحوم کی یادگار میں مسلمان انگریزی کا ایک روزانہ اخبار ۲۵ لاکھ کے سرمائے سے نکالنے کی سعی کریں۔ اگر اس کی خاطر خواہ تائید ہوئی اور تمام اخباروں نے اس میں دل کھول کر حصہ لیا تو میں ملک کے سربرآوردہ مسلمانوں سے مشورہ کر کے سب کی طرف سے ایک اپیل شائع کرنے کی کوشش کروں۔

تاریخ وفات حسرت آیات
علامۂ دوراں مولانا حفظ الرحمن
طاب ثراہٗ

چلے دنیا سے حضرت حفظِ رحماں
خدا کی رحمتیں ہوں اُن پہ نازاں
مثیل اُن کا کہاں عالم میں دیکھا!
تھے فخرِ جملہ اقران و اماثل
خطابت کا دیا وہ زورِ حق نے
کہ تھے ہمپایۂ سحبان وائل
اعزّا و احبّا اس الم سے
پڑے ہیں خاک پر جوں مرغ بسمل
ظفر کو سالِ رحلت کی ہوئی فکر
ندا آئی خطیب خلد منزل

۱۳ ھ ۸۲

(از ظفر الاسلام ابن مولانا ارشد شیرکوٹی

ہز ایکسلنسی الشیخ یوسف الفوزان سفیر سعودی عرب

وزارة الخارجية
السفارة العربية السعودية
بالهند

حضرت الاخ الكريم الاستاذ انيس الحسن المحترم
السلام عليكم ورحمة الله وبركاته

وبعد فقد تلقيت خطابكم المؤرخ ٢٢/٨/١٩٦٢ء فيما يتعلق بوفاة الطيب الذكر المرحوم مولانا حفظ الرحمن، وعزم جريدتكم (الجمعية) على اصدار عدد ممتاز للافاضة فى حياة المرحوم باعماله ونشاطه الذى قام به فى شتى الميادين، ومما لا يرتاب فيه ان حياة المرحوم متسعة فى شتى المجالات الدينيه منها والسياسية والخلقيه، تتطلب درسا وتعمقا وتمحيصا كل شعبة منها مادة قائمة بذاتها، اذ بها عبر لمن يعتبر - هذا وليس فى ارفاق الكلمة المطلوبة فى الموضوع - وختاما تقبلوا تحياتى وتمنياتى ودمتم.

المخلص
(دستخط) يوسف الفوزان

حزن

دانه اسى وحزن على وفاة المرحوم مولانا حفظ الرحمن

لاريب بان وفاة المرحوم مولانا حفظ الرحمن كانت فادحة كبرى بالنسبة للهند عامة، ولمسلمى الهند بصورة خاصة -

اذ فقد لا مسلموا الهند وهم اشد ما يكونون حاجة لقيادة حكيمة ذات رزانة ومرونة يتصف صاحبها بالجرأة والثبات على المبدء -

فلقد عرف الفقيد رحمه الله بحماسته الوطنية وغيرته الدينيه واتساع افق تفكيره ونضوج آرائه ولقد اتسم بالنزاهة والتجرد من الاطماع والاغراض والمآرب الذاتية - كما ان صلابته وصراحته كانت مثالاً من امثلة الرجولة الحقة - وبوفاته طويت صفحة بيضاء ناصعة فى الجهاد الوطنى والدينى - كان رحمه الله وغفرله أثناء مرضه مثال المؤمن الصابر المحتسب - اذ ابدا جلدا وصبرا ينم عن عميق ايمانه، بالرغم مما عاناه من الاوجاع المبرحة وآلام الداء العضال الذى اودى اخيرا بحياته -

اكرم الله مثواه وتغمده برحمته (وانا لله وانا اليه راجعون)

"يوسف الفوزان"

پروفیسر ہمایوں کبیر منسٹر گورنمنٹ آف انڈیا (ترجمہ از انگریزی)

مولانا حفظ الرحمٰن!

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی وفات نے ہندوستان کو جنگ آزادی کے ایک جانباز مجاہد سے محروم کر دیا ہے۔ مولانا مرحوم نے نوعمری ہی سے خود کو آزادیٔ وطن کے عظیم مقصد کے لئے وقف کر دیا تھا۔ اُن کی پرورش قدیم روایات اور ماحول میں ہوئی اور ضمیر کی آزادی۔ بنی نوع انسان سے ہمدردی اور مخالفین کے ساتھ تحمل و برداشت کا سلوک جو اسلامی تعلیمات کا جوہر پاکیزہ ہے اوّل دن ہی سے اُن کے قلب و نظر میں سما گیا تھا۔ اور دن بدن اُس کا رسوخ بڑھتا ہی گیا یہاں تک کہ اس جوہر مصفّیٰ نے مولانا کو ایک بے مثل و ممتاز انسان بنا دیا۔

وطن دوستی کا جذبہ مولانا مرحوم کو براہ راست مقدس مذہبی تعلیمات سے ملا تھا۔ اسلام واضح الفاظ میں ہمیں یہ تعلیم دیتا ہے کہ انسانیت کے رشتہ میں انسان برابر ہیں اور بندگی صرف خدا واحد ہی کے لئے ہے۔ بے شک حکومت اور ریاست کے ساتھ وفاداری کا بھی ایک مقام ہے۔ لیکن صرف اس حد تک کہ ریاست یا حکومت زندگی کی بنیادی قدروں کو سنبھالے رکھنے کا ایک وسیلہ ہے۔ اس ذہنی اور مذہبی پس منظر کے ساتھ یا ناگزیر تھا کہ مولانا مرحوم ایک بیرونی اقتدار کے خلاف علم بغاوت بلند کرتے۔ وطن کی محبت اُن کے لئے ایک مذہبی عقیدہ تھی اس پر مزید حریت پسندی کا ولولہ ــــ ذہن و جذبات کی اس یگانگت نے انہیں غلامی اور مظلومیت کا ناقابل تسخیر مخالف بنا دیا

اپنی سیاسی زندگی میں مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ مولانا آزادؒ سے بہت متاثر ہوئے تھے اور مولانا آزادؒ کا قطعی خیال یہ تھا کہ ہندوستان کی آزادی ملک کے تمام فرقوں کی متحدہ جدوجہد ہی سے حاصل ہو سکتی ہے۔ مولانا آزادؒ سے پہلے بعض مسلم زعماء کا رجحان یہ تھا کہ مسلمانوں کا مفاد حکمران طاقت سے مل کر چلنے اور اس کی دوستی ہی میں ہے۔ مولانا آزاد رحمۃ اللہ علیہ نے اس خیال کی برملا تردید کی اور یہی تلقین کی کہ ملک کی ملی جلی زندگی میں مسلمان اپنا صحیح موقف تب ہی حاصل کر سکیں گے کہ وہ بھی دوسروں کے ساتھ ساتھ استخلاص وطن کی تحریک میں حصہ لیں۔ مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ نے بھی اسی رائے کو اپنایا۔ دوسروں کو بھی یہی مشورہ دیا اور خود بھی برادران وطن کے دوش بدوش تحریک آزادی میں شریک رہے۔

مولانا آزاد رحمۃ اللہ علیہ کی طرح مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ بھی ہندوستان کی آزادی کو نہ صرف مسلمانان ہند کے لئے بلکہ پورے عالم اسلام کی آزادی اور خوشحالی کے لئے ضروری جانتے تھے چنانچہ انہوں نے اپنی تقریروں میں بار بار اس خیال کو دُہرایا کہ مغربی ایشیا اور شمالی افریقہ میں بھی مسلمانوں کی پریشانی کا ایک بڑا سبب ہندوستان پر برطانوی اقتدار و حکمرانی ہے۔ ہندوستان کے آزاد ہونے کے بعد مغربی ایشیا کو بھی برطانیہ اپنے پنجۂ اقتدار میں نہ رکھ سکے گا، اور مغربی ایشیا کے ممالک اپنے استقلال اور آزادی سے ہمکنار ہو سکیں گے۔

اسی پیش بینی اور یقین کے ساتھ انہوں نے ہندوستان کے مطالبۂ آزادی کو پورے عالم اسلام کی آزادی اور خوشحالی کا مطالبہ قرار دیا۔ اور اسی نظر سے دیکھا کچھ لوگوں کا آج بھی یہ خیال ہے کہ مسلمانوں کا قدیم تعلیمی سسٹم اُن کے اندر رجعت پسندی اور محدود دائرہ فکر و نظر پیدا کرتا ہے۔ لیکن مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ کی زندگی اس خیال کی ایک مستقل تردید تھی۔ اُن کی تمام تر تعلیم و تربیت اُن ہی پُرانے مدرسوں میں ہوئی تھی۔ اس کے باوجود انہوں نے وسعت قلبی اور صحتمند جدید افکار و نظریات کو اپنانے کی وہ لچک دکھلائی جو اپنی مثال آپ ہے۔ وہ آج کے مغربی افکار و رجحانات کو سمجھنے اور قبول کرنے میں جس حوصلہ مندی اور فراخدلی کا مظاہرہ کرتے تھے، مجھے خود اُن کی اس حیرت انگیز صلاحیت کا بارہا تجربہ ہوا۔ وہ اسلام کی بنیادی قدروں کو موجودہ فلسفہ اور سائنس کے مشاہدات کا ہم آہنگ دیکھنے کی جستجو میں رہتے تھے۔ اور ان دونوں میں رشتہ اشتراک و امتزاج ڈھونڈ نکالنے کا ملکہ مولانا کو اپنے بہت سے معاصرین سے کہیں زیادہ حاصل تھا۔

اِن تمام امتیازی اوصاف و کمالات کے ساتھ مولانا مرحوم کی جدائی ملت مسلمہ کے لئے ایک بہت ہی حسرتناک محرومی ہے جس نے اُن کے رفقا کار اور ساتھیوں پر ایک عظیم الشان مقصد کی تکمیل کا بڑا بوجھ ڈال دیا ہے۔ مولانا مرحوم کی شخصیت کا ایک بہت ہی قوی اور نمایاں عنصر اُن کی بے باک حق پرستی اور دلیری بھی تھی۔ زیر دستوں کی مدد کے لئے جب وہ کمربستہ ہوتے تو پھر اقتدار کے ساتھ تصادم ہی کیوں نہ ہو، وہ کسی شکوہ اور افسوس کے بغیر، بے محابا نتائج و عواقب کا سامنا کرنے کے لئے تیار رہتے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی متحمل مزاج بھی اس درجہ کے تھے کہ اپنے مخالف نقطۂ نظر کو اگر وہ معقول ہو قبول کرتے انہیں دیر نہیں لگتی تھی۔ اُن کا بنیادی یقین یہ تھا کہ انسان کے کردار و عمل کی قیادت ہمیشہ فہم و بصیرت کے ہاتھوں میں رہنی چاہیئے نہ کہ جوش و جذبات کے ہاتھوں میں کسی فرد یا قوم کی بڑائی، حق پرستی۔ بے باکی اور تحمل ہی میں مضمر ہوتی ہے اور اس لحاظ سے مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ کی وفات نہ صرف مسلمانان ہند بلکہ تمام ہی باشندگان وطن کے لئے نقصان عظیم ہے۔

شری لال بہادر شاستری (ہوم منسٹر)

(ٹاؤن دہلی کے تعزیتی جلسے میں تقریر)

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کا کل انتقال ہوگیا۔ میرا اُن کا ۳۰، ۳۲ سال کا ساتھ تھا۔ یوپی میں میرا اُن کا ساتھ رہا، پھر دلی آنے کے بعد میرا اُن کا ساتھ رہا، ہمارے ساتھی ایک ایک کر کے اُٹھتے جاتے ہیں، ابھی ٹنڈن جی اور مسٹر بی سی رائے کا انتقال ہوا تھا اب مولانا بھی چل دیئے۔ اسی طرح ہم بھی ایک دن چلے جائیں گے۔ لیکن یہ دیکھ کر دکھ ہوتا ہے کہ جو چلا جاتا ہے اُس کی جگہ لینے کے لئے کوئی دوسرا سامنے نہیں آتا۔

ابھی ابھی کچھ لوگوں نے کہا کہ مولانا گاندھی جی کے اصولوں پر چلتے تھے۔ گاندھی جی اس ملک میں آئے انھوں نے انگریزوں کے خلاف لڑائی لڑی، ان کے ساتھ مل کر، ان کے بتائے ہوئے اصولوں کو اپنا کر، ان پر چل کر بہت سے لوگ لیڈر بن گئے۔ چھوٹے چھوٹے آدمی لیڈر بن گئے۔ ان کا ڈھنگ اُن کا طریقہ ایسا ہی تھا۔

لیکن میں آپ سے ایک اور بات کہنا چاہتا ہوں، اور وہ یہ کہ لیڈر دولت سے نہیں بنتا۔ بہت سا پڑھ لکھ جانے سے نہیں بنتا، حکومت کا وزیر بن جانے سے نہیں بنتا، لیڈر تو پیدا ہوتا ہے اور مولانا ایسے ہی لیڈر تھے۔ ابھی آپ نے سنا کہ مولانا شروع ہی سے لوگوں کی خدمت کے کاموں میں حصہ لیتے تھے تو ان میں وہ بات شروع ہی سے تھی جو ایک پیدائشی لیڈر میں ہوتی ہے۔

مجھے یاد نہیں پڑتا کہ اس ۳۲، ۳۳ سال کی مدت میں کبھی ایسا ہوا ہو کہ کوئی جلسہ ہو کوئی موقع ہو اور مولانا اس میں شامل ہوں، اور انھوں نے سب کی توجہ اپنی طرف نہ کھینچ لی ہو۔ ان کی شخصیت ہی کچھ ایسی تھی، جہاں وہ بیٹھے ہوں، تھوڑی ہی دیر میں وہ سب کی توجہ اپنی طرف کھینچ لیتے تھے۔ میں نے ان کو کانگریس کے جلسوں میں دیکھا، یوپی اسمبلی میں دیکھا، پھر یہاں پارلیمنٹ میں اور کانگریس ورکنگ کمیٹی کے سامنے دیکھا، وہ اپنی بات سے اپنی سچائی اور بردباری سے لوگوں کو متاثر کرتے تھے۔

مولانا ہمارے لئے بڑا سہارا تھے، ملک کے لئے مشکل مشکل مسئلوں میں ان کی رائے کا ایک وزن تھا، اس لئے کہ ۱۹۴۷ء سے پہلے تک تو ان کے سامنے ایک ہی سوال تھا۔ ملک کو آزاد کرانے کا، لیکن اس کے بعد سے ان کے سامنے ملک کی ترقی اور ملک کے اتحاد کا سوال سب سے زیادہ رہتا تھا۔

اس ملک میں کبھی کبھی ایسی باتیں ہو جاتی تھیں جن سے مولانا کو بہت دُکھ پہنچتا تھا۔ میں آپ کو بتاؤں وہ کیا باتیں تھیں جن سے مولانا بہت دکھی ہوتے تھے۔ یہی باتیں کہ کبھی ہم یہاں لڑ بیٹھے، کبھی وہاں دنگا فساد کر دیا۔ جب لاٹھی اور خنجر کا استعمال ہوتا ہے تو کون ہندوستانی ہے جس کے دل پر چوٹ نہ لگتی ہو۔

مولانا کو ایسی باتوں سے بہت دُکھ ہوتا تھا، وہ ناراض ہوتے تھے، غصہ بھی ہوتے تھے مگر سنجیدگی اور بردباری کے ساتھ ان باتوں کو سوچتے تھے، ان کو دور کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ ان کے اندر ایسے واقعات سے کوئی تلخی پیدا نہیں ہوتی تھی۔ وہ بے چین ہوتے تھے اور غلط باتوں کے خلاف پوری قوت سے آواز اُٹھاتے تھے مگر بردباری کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔

جبلپور میں ایسا ہی دنگا فساد ہوا، مولانا وہاں گئے۔ اپنی آنکھوں سے وہاں کی باتیں دیکھ کر آئے، وہ بہت دکھی تھے، انھوں نے کانگریس ورکنگ کمیٹی کے سامنے ملک کے لیڈروں کے سامنے، وہ باتیں بڑے دکھ کے ساتھ بیان کیں جو وہ دیکھ آئے تھے میں آپ کو بتاؤں کہ کانگریس ورکنگ کمیٹی کے اس جلسہ میں اُس صوبے کے چیف منسٹر صاحب بھی موجود تھے، لیکن مولانا نے اپنی زبان سے ایک لفظ بھی ایسا نہیں کہا جو غصہ لئے ہوئے نفرت لئے ہوئے یا سخت ہو، ان میں یہ بڑی خوبی تھی کہ وہ بڑی سے بڑی تکلیف میں بھی اپنی زبان سے سخت لفظ نہ نکالتے تھے۔

بہت سی باتیں جو انھوں نے بیان کیں، اُن کے بارے میں جب ان کو ایسی باتیں بتائی گئیں جو ان کے علم میں نہیں تھیں تو انھوں

نے اپنی بات پر اصرار نہیں کیا۔ انھوں نے فوراً کہا تہ یہ باتیں میں نوٹ کئے لیتا ہوں میں ان کی تحقیق کر دوں گا، اور آپ کو بتاؤں گا کہ اصل بات کیا ہے، لیکن یہ جو میں اپنی آنکھ سے دیکھ کر آیا ہوں اس کے بارے میں میں نہیں مان سکتا" یہ ان کی سچائی کی بات تھی۔ اسی طرح وہ ہر معاملہ میں ہماری مدد کیا کرتے تھے وہ ہمارے لئے ایک بڑا سہارا تھے۔

باتیں تو بہت سی ہیں۔ لیکن وقت نہیں ہے۔ اگر کبھی وقت ملا تو میں تفصیل سے آپ کو بتاؤں گا کہ مولانا میں کیا خوبیاں تھیں ان کی باتیں کیسی ہوتی تھیں۔ یہاں میں ایک بات کا ذکر کرتا چلوں۔

انھوں نے دہلی میں انڈین مسلم کنونشن بلایا، میرا خیال یہ تھا کہ ابھی حالات ایسے نہیں ہیں کہ وہ اس طرح کا ایک کنونشن بلائیں۔ چنانچہ میری رائے ان کی رائے سے الگ تھی۔ اور اکثر ایسا ہوتا کہ ہماری رائے ان کی رائے کے مطابق نہ ہوتی لیکن مولانا کی رائے میں ایک وزن ہوتا تھا ہمیں ان کی رائے ماننی پڑتی تھی، وہ اپنی بات کو بہت صفائی سے جرأت سے، اور دلیلوں کے ساتھ پیش کرنے کے عادی تھے۔ چنانچہ ایک دن رات کو ۱۱ بجے وہ مجھ سے ملنے آئے۔ ایک گھنٹہ تک ہم دونوں باتیں کرتے رہے اور انھوں نے اپنے دلائل سے مجھے رائے بدلنے پر مجبور کر دیا میں ان کی بات سے متفق ہو گیا چنانچہ میں صبح سویرے ہی اٹھ کر سب سے پہلے آپ کے ملک کے وزیر اعظم صاحب کے پاس گیا، اور میں نے ان کو بتایا کہ رات ایک گھنٹہ تک مولانا سے میری بات چیت ہوئی ہے۔ میں نے پنڈت جی کو وہ باتیں سنائیں اور میں نے کہا کہ اب میں اس حق میں ہوں کہ مسلم کنونشن ہونی چاہئے۔ چنانچہ پنڈت جی نے بھی اس رائے سے اتفاق کیا اور وہ کنونشن ہوا۔

مولانا ایک زبردست مقرر تھے۔ میں یہاں کسی کی شان میں گستاخی کرنا نہیں چاہتا اور میری رائے اگر غلط ہے تو میں معافی چاہتا ہوں لیکن میں کہوں گا کہ اس ملک میں ایک تو مولانا ابوالکلام آزاد تھے جو بہت اچھی تقریر کرتے تھے ان کا نام ہی ابوالکلام تھا، لیکن ان کے بعد میں نے گزشتہ ۳۰۔۴۰ برس میں مولانا حفظ الرحمٰن سے زیادہ اچھی اور سلجھی ہوئی تقریر کرنے والا نہیں دیکھا۔ ایک دفعہ مجھے ان کے ساتھ فرخ آباد کے ایک جلسہ میں شرکت کرنے کا موقع ملا۔ کوئی ۲½، ۳ لاکھ انسانوں کا مجمع تھا۔ مولانا تقریر کرنے کھڑے ہوئے۔ ان کی آواز کے اوپر اٹھنے کے ساتھ مجھے یوں معلوم ہوتا تھا جیسے سارا مجمع اوپر اٹھ رہا ہے، ان کی آواز کے اتار کے ساتھ یوں لگتا تھا جیسے سارا مجمع نیچے گر رہا ہے مجھے تھوڑی دیر بعد یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ یہ شخص اس ۳ لاکھ کے مجمع سے جو چاہے کرا سکتا ہے۔ اسی طرح جب وہ پارلیمنٹ میں بولتے تھے تو پورے ہاؤس میں سکون اور خاموشی سے ان کی تقریر سنی جاتی تھی۔ اس کا خاص اثر ہوتا تھا۔ جنوبی ہند کے ممبران بھی جو ان کی زبان نہ سمجھ سکتے تھے۔ سکون اور خاموشی سے ان کی تقریر سنتے تھے اور ان کے لب و لہجہ اور آواز کے اتار چڑھاؤ سے ہی متاثر ہوتے تھے۔

اس ملک میں بڑے بڑے لیڈر آج بھی موجود ہیں، لیکن بات جو مولانا میں تھی وہ میں کسی میں نہیں پاتا، ایک طرف تو مولانا ملک کے بڑے بڑے مسائل میں اپنی رائے دیتے تھے، اور اونچی سے اونچی سطح پر کام کرتے تھے۔ دوسری طرف مولانا ایسی سادگی کے ساتھ زندگی گزارتے تھے کہ غریب سے غریب اور کمزور آدمی مولانا تک آسانی سے پہنچ سکتا تھا۔ وہ سب کی بات سنتے تھے۔ اور فوراً اس کی مدد کے لئے تیار ہو جاتے تھے۔ وہ روزانہ ہی مجھ کو یا تو کسی معاملے سے متعلق خط لکھتے تھے۔ پارلیمنٹ میں مجھ سے آکر ملتے تھے۔ وہ کسی ایک ہی فرقے کے لوگوں کے کام لے کر میرے پاس نہ آتے تھے۔ بلکہ جس فرقہ کا بھی آدمی ان کے پاس پہنچ جاتا تھا، اور اپنی مصیبت کا حال ان کو سناتا تھا اس کا ساتھ دینے کے لئے وہ تیار ہو جاتے تھے، وہ صحیح معنوں میں غریبوں، کمزوروں، بیکسوں اور مظلوموں کا سہارا تھے۔ ان کے ہمدرد تھے ان کے کام آتے تھے۔ یہ لوگ ان تک آسانی کے ساتھ پہنچ سکتے تھے۔

کسی کام کے کرنے کے سلسلے میں ہماری بھی اپنی دقتیں ہوتی ہیں۔ وہ جب کسی کام کے لئے کہتے تو میں ان کے سامنے اپنی دقتیں بیان کرتا، ان کو بھی وہ غور سے سنتے، اور پھر جلد ہی ایک نتیجہ پر پہنچ جاتے وہ کہتے "اچھا یہ تو آپ کے ایڈمنسٹریشن کی مجبوریاں ہیں، میں انھیں مانتا ہوں، لیکن فلاں بات کا کوئی تعلق آپ کے ایڈمنسٹریشن سے نہیں ہے اسے تو ٹھیک ہو جانا چاہیئے" اور ہمیں ان کی بات ماننی ہی پڑتی، ان کی بات میں اتنا وزن ہوتا تھا۔

اب میں سوچتا ہوں کہ ایسے لیڈر کہاں ہیں۔ آج ہمیں مولانا حفظ الرحمٰن جیسے لیڈروں کی ضرورت ہے۔ ایسے لیڈروں کی ضرورت ہے جو ان کی طرح سوچ سکیں۔ ان کی طرح اپنی بات منوا سکیں، غریبوں مظلوموں، بیکسوں کے بلا تفریق مذہب و ملت کام آسکیں۔ برائیوں پر ان کے دل دکھی ہوں۔ لیکن ان کے اندر تلخی نہ پیدا ہو، میں نہیں جانتا کہ اب مولانا جیسی سنجیدگی ذہانت، تدبر، اور بردباری رکھنے والے لوگ پیدا ہوں گے یا نہیں۔ میں تو صرف یہ جانتا ہوں کہ آج ہمیں ایسے ہی لوگوں کی ضرورت ہے، میں نوجوانوں سے کہوں گا کہ وہ مولانا کی طرح بننے کی کوشش کریں۔ درحقیقت مولانا کا انتقال نہیں ہوا ہے، بلکہ مظلوموں اور بے کسوں کا سہارا اٹھ گیا ہے۔

ایک بے لاگ و بے داغ زندگی!

(مسٹر صادق علی ایم پی جنرل سکریٹری آل انڈیا کانگریس کمیٹی)

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب اپنی عظیم شخصیت رکھتے تھے۔ مختلف پیچیدہ اور اہم مسائل جو ملک کے سامنے آتے رہے اُن پر مولانا اپنی قطعی اور واضح رائے رکھتے تھے۔ اپنی رائے وہ ہمیشہ پوری صفائی اور بے خوفی کے ساتھ ظاہر کیا کرتے تھے۔ کبھی کسی اجتماع یا میٹنگ میں کسی اظہار خیال کے وقت اُنہیں ہرگز یہ فکر نہیں ہوتا تھا کہ گرد و پیش کے لوگ میری اس رائے سے کہاں تک اتفاق کرسکیں گے۔ جرأتمندی کوئی ایسا وصف نہیں ہے جو آسانی سے حاصل ہوسکے بلکہ اس کے لئے بے لاگ اور بے داغ زندگی کی ضرورت ہوتی ہے اور ایک سلجھے ہوئے طریق فکر کی۔ اب جہاں تک مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی زندگی کا تعلق ہے اس کے بے داغ اور بے لاگ ہونے میں تو دو رائے ہو ہی نہیں سکیں۔ رہا طریقِ فکر، وہ اُن کو براہِ راست اسلامی تعلیمات نے بخشا تھا۔ اسلام، اُسکے بنیادی اصولوں اور عقیدوں سے مولانا کو گہری واقفیت ہی نہ تھی بلکہ وہ اپنی عملی زندگی کو اس کے مطابق ڈھال چکے تھے۔ جو انسان اپنے مذہب کا تنگ اور محدود نظریہ رکھتا ہو اور پھر اس پر عمل پیرا ہونا چاہے تو وہ اپنے لئے بھی اور دوسروں کے لئے بھی مصیبت بنتا ہے۔ لیکن مولانا اپنے مذہب کا بہت ہی روشن اور تابناک تصور رکھتے تھے اور اس کی شہادتیں اُن کی نجی اور عوامی زندگی میں قدم قدم پر ملتی ہیں۔

مولانا صاحب آزادی وطن کی گھمسان جنگ میں مدتوں رہے اور اس کے لئے اُنہوں نے بڑی بہادری کے ساتھ کام کیا۔ اُن کا جوش عمل اور کمال خطابت دسیوں نہیں ہزاروں کو اس میدان تک کھینچ کر لایا۔ وہ یقیناً ایک عملی انسان اور مجاہد تھے اور اپنی اس خصوصیت سے وہ دوسروں کے لئے بھی نمونہ عمل تھے۔ وہ جو کچھ سوچتے اور محسوس کرتے تھے وہ اسلامی روایات کا عین تقاضہ ہوتا تھا اور سیکولر نقطۂ نظر کا ایک صحیح نشان۔

اجتماعات اور میٹنگوں میں مولانا مرحوم کو دیکھنے کا مجھے بارہا موقعہ ملا۔ وہ جب بھی بولتے تھے پوری قوت اور جوش کے ساتھ بولتے تھے لیکن اُن کے خیالات و افکار میں کوئی ایسا جھول نظر نہیں آتا تھا جس پر قوم پرورانہ نقطۂ نظر سے یا عقلی طور پر کوئی معقول اعتراض کیا جاسکے۔ ہندوؤں سکھوں اور عیسائیوں میں بھی اُن کے احباب اور قدردان کچھ کم نہیں تھے اور وہ سب اُن کی جرأت حق گوئی کا پورا احترام کرتے تھے

یقیناً اُنہیں یہ فخر حاصل تھا کہ وہ دوسرے بہت سے دعویداروں کے مقابلہ میں کہیں زیادہ اپنے ملک کی واقفیت رکھتے تھے۔ وہ بے پناہ سفر کرتے تھے اور شاید ہی اس ملک کا کوئی گوشہ ایسا ہو جہاں وہ نہ گئے ہوں یا جہاں اُن کے احباب اور قدردانوں کا حلقہ نہ ہو۔ اس میں شک نہیں کہ مولانا مرحوم مسلمانوں کی مجبوریوں اور مشکلات پر اپنی قوت فکر و عمل کا بڑا حصہ صرف کرتے تھے لیکن اس کا محرک کچھ تاریخی اسباب و عوامل تھے اور یہ جذبہ بھی کہ وہ ہندوستان میں سچی جمہوریت کی بنیادیں استوار کرنا چاہتے تھے۔ اپنے ادر مسلک میں وہ کبھی دائمی اور مستقل اقلیت کے قائل تھے نہ اکثریت کے۔ وہ تو ایک ایسے ماحول کے آرزومند تھے جہاں ذات پات یا نسل و علاقہ کی حدبندیوں کے بغیر انسان ـــ مرد عورت ـ آزادی کی فضا میں سانس لے سکے۔ آبرومندی سا تھ رہ سکے اور مختلف صلاحیتوں کو نشوونما کے مواقع فراہم ہوں۔ اپنے متعلق کسی بڑائی کا احساس انہیں کبھی نہیں ہوا۔ اپنے احباب کے حلقہ میں وہ ہمیشہ ایک شریف، متواضع، ملنسار اور سچا دوست ہوتے تھے اور دکھ درد میں ہمیشہ دوسروں کے کام آتے۔ ایک ایسا انسان جب کبھی اس دنیا کے منظر سے اُٹھ جاتا ہے، اس کے پیچھے ایک بڑا خلا اور بہت سے دلوں میں درد پیدا ہو کر ہی دیر تا دیر قائم رہتا ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ آج مولانا کے بعد جو خلا پیدا ہوا ہے وہ بھی کبھی پر ہوسکتا ہے یا نہیں۔ لیکن دلوں کا درد تو دلوں کے ساتھ ہی جائے گا۔

(ترجمہ از انگریزی)

مسٹر عظیم حسین ۔ سفیر ہند، مقیم قاہرہ

ترجمہ انگریزی سے

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کو ایک ایسے قوم پرور مسلمان لیڈر کی حیثیت سے جس نے ملک کے لئے بیش بہا خدمات انجام دیں، میں مدت سے جانتا تھا، لیکن اُن سے پہلے پہل ملاقات کا موقعہ مجھے آزادیٔ ہند سے کچھ ہی پہلے ملا تھا۔
آزادیٔ ہند سے پہلے بھی اور اس کے بعد بھی وہ پاکیزہ شعور جو ہندوستان میں بلا امتیاز مذہب ملت ایک ترقی پذیر اور مستحکم قومیت کو بروئے کار لانے کے لئے کوشاں رہا ہے، مولانا کی ذات اسی پاکیزہ شعور کا سرچشمہ تھی۔ ایک مخلص قوم پرور رہنما کی حیثیت سے انھوں نے ہمیشہ اپنے فرقہ کو برادران وطن کے دوش بدوش جنگ آزادی میں حصہ لینے کی تلقین کی اور اس عظیم مقصد کے لئے خود بلا خوف ملامت اُنھوں نے ایثار و فدائیت کا اعلیٰ کردار پیش کیا۔ آزادیٔ ہند کے ساتھ ساتھ تقسیم ہند کے عواقب مسلمانوں اور غیر مسلموں سب ہی کے لئے اپنی بھیانک شکل میں سامنے آئے۔
اس موقعہ پر بھی نادر آف دی نیشن مہاتما گاندھی کے بتائے ہوئے بنیادی اصولوں پر مضبوطی سے قائم رہتے ہوئے، انتہائی بہادری اور جانفشانی کے ساتھ مولانا نے مسلسل جدوجہد کی کہ اُن مصائب و آفات کو کم سے کم کیا جا سکے، جن کا سامنا پاکستان سے آئے ہوئے پناہ گزینوں کو بھی تھا اور خود اُن مسلمانوں کو بھی جنھوں نے اپنے وطن عزیز میں ہی رہنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ایسے نازک مرحلے میں بسا اوقات مولانا کو غلط سمجھا گیا۔ لیکن مولانا کی اصول پسندی اور اُس عقیدہ کی سچائی پر تب بھی کسی کو شک و شبہہ کی گنجائش نہ ہوئی جو دستور ہند کا بنیادی تخیل ہے اور ایک متحدہ ترقی پذیر سیکولر ہندوستان کی تخلیق کا داعی۔

"ایم اے حسین"

شری بھیم سین سچر گورنر آندھرا پردیش :۔ (ترجمہ انگریزی سے)

مجھے یہ معلوم کر کر خوشی ہوئی کہ الجمعیۃ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی یاد عزیز میں ایک خصوصی شمارہ پیش کر رہا ہے۔ یقیناً الجمعیۃ کی کوشش اس جانباز حامیٔ وطن کی خدمت میں تحسین و اعتراف کا ایک شایان شان ہدیہ ہے۔ جس نے اپنی پوری زندگی وطن کے مفاد و سربلندی کے لئے وقف کر دی۔
مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے ہمارے ملک کی آزادی کی خاطر بڑی سرفروشی اور اولوالعزمی کے ساتھ جہاد حریت میں حصہ لیا۔ اور اس راہ میں عظیم الشان قربانیاں پیش کیں۔ پھر تقسیم ہند کے بعد وحشتناک ہنگاموں کے دور میں اُنکی جدوجہد اور کھری زندگی، ہندوؤں، مسلمانوں، سب ہی کیلئے ایک مشعل راہ بن کر سامنے آئی جس نے قوم کو سچائی کی صراط مستقیم دکھلائی اور اس نے قومی استحکام و یکجہتی کا ایک قابل قدر نمونہ ہمیں عطا کیا۔
مولانا موصوف عربی و فارسی کے ایک جلیل القدر عالم اور اسلام کے ایک بیباک ترجمان بھی تھے، وہ ایک بےمثال خطیب بھی تھے۔ ان کی تقریریں ہمیشہ اثر انگیز اور سبق آموز ہوتی تھیں۔ وہ غریبوں کے دوست اور مظلوموں کے ایسے ہمدرد تھے جو ہر وقت ان کی خدمت کے لئے مستعد رہتا۔
آنے والی نسلیں مولانا کے نام کو مادر وطن کے اس عظیم فرزند کے طور پر ہمیشہ یاد رکھینگی جنکی وطن دوستی اور ہمدردی خلائق چھوٹے چھوٹے جھگڑوں اور کشمکشوں سے ہمیشہ بے داغ اور وراء الوراء رہی۔ یقیناً ان کی وفات نے قومی زندگی میں ایک ایسا خلا پیدا کر دیا ہے، جس کا پُر ہونا شاید ممکن نہیں۔ خدا کرے کہ اُنکی روح کو ابدی و سرمدی راحتیں نصیب ہوں۔

"بھیم سین سچر"

شری پرتاپ سنگھ کیرون (وزیر اعظم پنجاب)

مدیر محترم!

یہ امر موجب اطمینان ہے کہ جمعیۃ علماء ہند کا ترجمان روزنامہ "الجمعیۃ" مولانا حفظ الرحمن صاحب ایم پی مرحوم، جنرل سکریٹری جمعیۃ علماء ہند کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے ایک نمبر شائع کر رہا ہے۔ مولانا مرحوم کی ذات ستودہ صفات کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ آپ کا شمار ان چند برگزیدہ شخصیتوں میں ہوتا ہے جو عمر بھر اپنے عقیدے پر قائم رہے۔ شروع میں ہی مولانا مرحوم نے حب الوطنی، خدمت خلق، رواداری اور مساوات کی جو راہ اختیار کی وہ آخری دم تک اس پر پورے عزم اور استقلال سے گامزن رہے۔ سخت سے سخت ناموافق حالات میں بھی انکے پائے استحکام میں لغزش نہیں آئی۔ ان کی شخصیت فرقہ دارانہ تعصبات کے سخت اندھیرے میں روشنی کے ایک تابندہ مینارہ کا کام دیتی تھی۔ گو دنیوی طور پر وہ ہم سے ہمیشہ کے لئے علیحدہ ہوگئے ہیں، مگر ان کے کردار کی صفات ہمیشہ ہماری رہبری اور آنیوالی نسلوں کو نیک اصولوں کی پیروی کی تلقین کرتی رہیں گی۔

میں ان کی یاد میں شائع ہونے والے اس خاص نمبر کی کامیابی کا دل سے خواہاں ہوں۔

دستخط: پرتاپ سنگھ (کیرون)

بیرسٹر نور الدین احمد (میئر دلی کارپوریشن)

حضرت مولانا حفظ الرحمن رحمۃ اللہ علیہ سے میری واقفیت کم و بیش بیس سال سے تھی اور ۱۹۵۲ء سے تو میں نے انھیں بہت قریب سے دیکھا اور ان کے ساتھ مختلف اداروں میں کام کرنے کا موقع ملا۔ مولانا مرحوم جو کام بھی ہاتھ میں لیتے تھے، نہایت خلوص اور ایمانداری کے ساتھ اسے پورا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ تقسیم ہندوستان کے بعد ان کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد تھا کہ اس ملک کے لوگوں میں یگانگت، محبت اور رواداری پیدا کریں اور اس سلسلے میں جو محنت انھوں نے کی وہ محتاج بیان نہیں، مولانا سچے معنوں میں ایک محب وطن اور محب قوم انسان تھے۔ چونکہ مسلمانوں کو تقسیم کے بعد متعدد دشواریوں اور مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا، اس لئے مولانا مرحوم نے مسلمانوں کی مدد کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ اگر ہندوؤں پر بھی مصیبتیں پڑتیں تو مجھے یقین ہے کہ وہ انکی بھی مدد میں کوئی دریغ نہ کرتے۔ مولانا کی یہی خصوصیت تھی جس نے مجھے ان کا دلدادہ کیا۔ مولانا کی انصاف پسندی، صاف گوئی اور جرأت تو مشہور رہی ہیں۔ ان کی زندگی اور موت دونوں شاہد ہیں کہ انھوں نے خدمت خلق کو ذاتی آرام اور آسائش پر ہمیشہ ترجیح دی۔ اور اپنے فرائض کی ادائیگی میں کبھی فروگذاشت نہ کی۔ مولانا کی بے وقت وفات سے ملک و قوم کو عظیم نقصان پہنچا ہے اور فی الحال مولانا کی جگہ پر ہونے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی، لیکن رب العالمین مسبب الاسباب ہے آج کوئی لہلہاتی ہوئی کھیتی کل تھی ہے تو کل اللہ تعالیٰ اسی خشک اور مردہ زمین کو پھر زندہ کردیتا ہے ہماری یہی دعا ہے کہ خداوند تعالیٰ ہمیں مولانا کا نعم البدل عطا فرمائے اور مولانا کی روح مبارک کو اپنے آغوش رحمت میں لے لے۔

نور الدین

کچھ تعزیتی پیغام اور

"مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی وفات حسرت آیات ہماری تاریخ کا زبردست حادثہ اور ایک عالمگیر سانحہ تھا۔ جس کے اثر و اضطراب نے بیک لمحہ ہزاروں لاکھوں نہیں بلکہ کروڑوں دلوں کو زخمی کیا۔ کون اندازہ کر سکتا ہے کہ ہندوستان و پاکستان کی وسعتوں بلکہ دور دراز ممالک تک جن کتنے مسلم و غیر مسلم انسانوں کے دل اس بے مثل شخصیت کی دائمی جدائی سے مجروح اور آنکھیں اشک بار ہوئی ہوں گی۔

جوں ہی ریڈیو اور اخبارات کے ذریعہ خبر وفات نشر ہوئی حضرت مولانا مرحوم و مغفور کے احباب، متوسلین، قدردانوں اور عقیدت مندوں کے تعزیتی پیغامات، بیانوں، تاروں اور مراسلوں کا ایک سیلاب امڈ آیا جس کا سلسلہ کئی ماہ تک برابر جاری رہا۔ ہندوستان کے گوشہ گوشہ، شہر شہر، قصبہ قصبہ اور بستی بستی کے مسلم عوام و خواص، جمعیۃ علماء کی ہزاروں شاخوں اور رفقاء جماعت ہی کے تعزیتی خطوط اور تاروں کی تعداد کئی ہزار تک پہنچتی تھی۔ خیال تھا کہ مجاہد ملت نمبر میں یہ تمام پیغامات نہ سہی کم از کم ان کے بھیجنے والوں کی فہرست ضرور شریک اشاعت کر دی جائے کہ اس طرح حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی مقبولیت و ہر دلعزیزی کا ایک لازوال نقش باقی رہ سکے۔ اس خیال کے ساتھ جب فہرست مرتب کی گئی تو اندازہ ہوا کہ "مجاہد ملت نمبر" کے محدود صفحات میں سما سکنے کی بجائے وہ خود ایک ضخیم اور مستقل کتاب کا سرو سامان ہے، مجبوراً اس خیال کو ترک کرنا پڑا۔ اب پیش نظر صفحات میں صرف چند خطوط اور تار شریک اشاعت کئے جا رہے ہیں جو اس اندوہناک حادثۂ فاجعہ کی صدائے بازگشت کہے جا سکتے ہیں

"انیس الحسن"

بخشی غلام محمد صاحب وزیر اعظم کشمیر (بذریعہ تار)

"مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی وفات نے انتہائی دلی صدمہ پہنچایا۔ وہ ایک باشعور، قوم پرور رہنما اور سیکولرزم کے فداکار وکیل تھے ان کی جدائی بلاشبہ قوم و وطن کے لئے ایک بے اندازہ اور ناقابل تلافی نقصان ہے میری دلی تعزیت ان کے اہل و عیال کو ضرور پہنچا دیجئے"

شری آچاریہ کرپلانی (بذریعہ تار)

"دل کے گہرے غم کے ساتھ مولانا کی وفات کی خبر سنی وہ ایک مثالی شخصیت تھے۔ آج ہم ایک جانباز مجاہد اور فدائے وطن ہستی سے محروم ہوگئے۔ خدا کرے کہ اس عظیم قومی نقصان کی کسی طرح تلافی ہو سکے"

ہر ہائی نس والی بھوپال (بذریعہ تار)

"مولانا کی اچانک وفات سے دلی صدمہ پہنچا۔ یہ غم ہم سب ہی کے لئے ہے۔ اس محرومی میں دلی تعزیت اور ہمدردیاں قبول کیجئے"

فضیلۃ الشیخ مولانا محمد بدر عالم۔ مدینہ منورہ

(حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب کے نام اپنے مکتوب کے ذریعہ)

مَنْ شاءَ بعدكَ فليمُتْ فعليكَ كنتُ احاذر

میرے علم میں اس وقت تمام ہند میں مسلمانوں کے سب سے بڑے خیر خواہ اور ہمدرد، مجاہد عالم، رفیق محترم مولانا حفظ الرحمٰن صاحب غفر اللہ لہ و اعلیٰ درجاتہ فی علیین تھے۔ اپنے غم کا کیا اظہار کروں۔ بستر علالت پر پڑا ہوا اس الم سے کروٹیں بدل رہا ہوں۔ موجودہ دور میں مولانا جیسی ہستی کا فقدان ایک ناقابل تلافی نقصان ہے

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَيَبْقَىٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ

ہز ہولی نس ملّا طاہر سیف الدین بمبئی (بذریعہ تار)

"مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی خبر وصال دلی رنج وغم کے ساتھ سنی ان کی عظیم الشان خدمات کے تذکرے تا دیر باقی رہیں گے اور آئندہ نسلوں کو بے لوث خدمت وعمل کا سبق دیں گے۔ ان کی فیملی تک دلی ہمدردیاں پہنچا کر ممنون فرمایئے"

شیخ الازہر الشیخ محمود شلتوت جامع ازہر قاہرہ (مصر)

(بذریعہ تار)

"مولانا حفظ الرحمٰن کی وفات پوری ازہر یونیورسٹی کے لئے باعث قلق وملال ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو ان کی خدمات کا اجر جزیل بخشے جو انھوں نے اسلام کی سربلندی کے لئے انجام دیں اور ان کے تمام پس ماندگان، متوسلین ورفقاء کار کو صبر جمیل سے نوازے"

موتمر اسلامی۔ مکہ مکرمہ، الشیخ محمد صالح القزاز (بذریعہ تار)

مولانا حفظ الرحمٰن کا حادثۂ وصال دلی رنج وغم کا باعث ہے۔ آج مسلمانان ہند کے جذبات غم کا ہمیں پورا احساس ہے کہ ایک مخلص رہنما جس نے مسلمانان ہند کی ان تھک خدمت کی۔ آج دنیا سے رخصت ہوگیا۔

مفتی اعظم کشمیر (مولانا بشیر الدین صاحب) بذریعہ تار

"حضرت مولانا کی وفات سے دل ٹوٹ کر رہ گیا۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے اور ہم سب تہی دستان قسمت کو ان کا نعم البدل بخشے۔ واقعہ یہ ہے کہ مولانا مرحوم کی وفات نے امت مسلمہ کو ایک جوہر نایاب سے محروم کر دیا ہے"

فرنگی محل لکھنؤ (مولانا ناصر میاں لکھنوی) — بذریعہ تار —

"مولانا حفظ الرحمٰن کی وفات ایک بے اندازہ قومی وملی نقصان ہے اور ان کا صدمہ عالمگیر ہے"

خان بہادر محمد جان صاحب۔ کلکتہ۔ (بذریعہ تار)

"مولانا مرحوم کے انتقال سے دل کو ناقابل برداشت صدمہ پہنچا ہے"

مسٹر محمد صادق وزیر تعلیم کشمیر (بذریعہ تار)

"مولانا کی جدائی سے انتہائی صدمہ پہنچا ہے

میری جانب سے تعزیت قبول کیجئے"

شری جگموہن داس وزیر مدھیہ پردیش (بذریعہ تار)

"مولانا کی وفات سے دل انتہائی بے چین ہے۔ آج ملک اپنے ایک بے مثال فدائی سے محروم ہوگیا۔ میں بھی اس غم میں شریک ہوں"

شورش کاشمیری ایڈیٹر چٹان لاہور (بذریعہ تار)

"مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کے وصال سے دل پر جو بجلی گری ہے ناقابل بیان ہے۔ ان کی وفات ایک بے مثل عالم دین، عظیم رہنما، مجاہد حق اور مسلمانان ہند کی آخری امید کی موت ہے"

مولانا اسماعیل گارڈی۔ جوہانسبرگ (جنوبی افریقہ) (بذریعہ تار)

"مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی خبر وفات ایک جانکاہ صدمہ ہے۔ اُن کی جدائی نہ صرف مسلمانان ہند بلکہ عالم اسلام کا زبردست نقصان ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو اپنی بے اندازہ رحمتوں سے نوازے"

جمعیۃ علماء ٹرانسوال (جنوبی افریقہ) (بذریعہ تار)

"ریڈیو پر مجاہد ملت کے وصال کی دلخراش خبر سنی۔ آہ ہم سب ایک عظیم سرپرست سے محروم ہو گئے۔ دعاء مغفرت کرتے ہوئے اللہ سے آپ کے لئے صبر وسکون کے طلب گار ہیں"

جمعیۃ علماء برما (رنگون سے تار کے ذریعہ)

"مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی وفات سے برما کے مسلمان اور جمعیۃ علماء برما کو دلی صدمہ پہنچا۔ اس غم میں ہم آپ کے ساتھ ہیں"

پورٹ حج کمیٹی بمبئی (بذریعہ تار)

"پورٹ حج کمیٹی کے ارکان، چیرمین اور اسٹاف اس عظیم حادثہ میں مسلمانان ہند کے شریک غم ہیں۔ مولانا کی وفات سے ہندوستان اور مسلمانان ہند کو بے اندازہ نقصان پہنچا ہے۔ ان کی یاد ہمارے دلوں سے کبھی محو نہ ہو سکے گی۔

پرنس ملا یوسف نجم الدین صاحب (بمبئی)

"ایک عرصہ سے مولانا حفظ الرحمٰن صاحب

ساتھ مجھے بیحد گہرا تعلق ہے دل اور دماغ کی دوسری اعلیٰ صفات کے ساتھ ساتھ جو انھوں نے ایک اعلیٰ ترین مقصد زندگی کے لئے صرف کیں۔ ان کی سب سے نمایاں اور ممتاز صفت جو میں نے محسوس کی وہ سخت سے سخت خطرات میں بھی حیرت انگیز قوت عمل اور جرأت مندی تھی۔ نہایت انہماک، بے باکی اور استقلال کے ساتھ انھوں نے عمر بھر خدمت گذاری کا سلسلہ قائم رکھا اور کبھی اپنے آرام و راحت بلکہ صحت تک کی پرواہ نہ کی۔ یہ ان کی اتنی بڑی قربانی ہے جو ہمیشہ یاد رہے گی۔ جماعت کے ساتھ ان کے دوستانہ روابط ہمارے ذہنوں پر ہمیشہ نقش رہیں گے۔

یوسف نجم الدین

ہز ہائی نس نواب صاحب آف محمد گڑھ

مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کی خبر اچانک سن کر جو قلبی صدمہ ہوا ہے وہ بیان سے باہر ہے۔ آج پوری امت کے لئے ماتم کا دن ہے سمجھ میں نہیں آتا کس کے ساتھ ہمدردی کی جائے اور کس کے پاس تعزیت کے لئے جایا جائے جب کہ خود ہی مستحق ہمدردی ہیں اور پوری امت کو تعزیت کا حق پہنچتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ ایک شفیق باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا جو ہر برے وقت ہمارے لئے سینہ سپر ہو جایا کرتا تھا۔ ہندوستانی مسلمانوں کی ملی عمارت جن ستونوں پر قائم ہے افسوس کہ ان میں سے آج ایک سب سے مضبوط اور زبردست ستون گر گیا۔ الٰہی ہمارے شہید مجاہد کو اپنی آغوش رحمت میں لیلے۔ اس کی مغفرت فرما کے تو اس سے راضی ہو جا۔ اور اپنی بے شمار نعمتوں، رحمتوں اور محبتوں سے اس کو راضی کر دے، مگر بار الٰہا ہم کو بھی برداشت کی قوت عطا فرما کہ ہمارے سردار کے بچھڑنے پر ہمارے قدم ڈگمگا نہ جائیں اور ہم صحیح راستہ سے پرے نہ ہٹ جائیں۔ آمین (محمد کامل)

شیخ طریقت افغانستان

حضرت الحاج مولانا شاہ عبدالسلام صاحب مجددی

کابل

مرگ صاحبدل جہانی را دلیل کلفت است　　　شمع چوں خاموش گردد داغ محفل میشود

عندلیب گلشن علم و عرفان و مجاہد باعزم و وجدان حضرت مولانا حفظ الرحمن علیہ الرحمۃ والغفران، صاحب چناں شخصیت بلند و مقام ارجمندی بود کہ تاریخ ہندوستان نام نامی و کارنامہ ہائے گرامی او را بخط زرین ثبت خواہد نمود۔ مولانا آں عالم باہوش و دکار چناں مقام برجستہ علمی و اجتماعی را حائز بود کہ نظیر آں امروز در عالم اسلام کمتر نظر میرسد مولانا در پرتو افکار عالی و خیالات بلند اجتماعی خود آنقدر بکار درماندہ مسلمین ہمت گماشت کہ اخیراً گوہر گرانبہائے حیات و نقد گرامی عمر خود را درین راہ صرف و ایثار نمود

مولانا فروغ دیدہ اہل نظر و آئینہ حسن ارباب فضل و ہنر بود۔ مولانا از غم مسلمانان در دل سوزی و در سر شوری داشت۔ مولانا تمام امید قوت و جدیت تمام و پرتو ایمان قوی و عزم راسخ دائرہ صحنہ عمل گردیدہ و مخصوصاً در ساحہ ہائے اجتماعی و تہذیبی و اخلاقی چناں کامیابیہائے شایانی بدست آوردہ بود کہ تا دیری آں خاطرہ ہا از خاطرہا محو نخواہد گردید۔

فقیر مجددی چہار سال قبل وقتی کہ بعرس مبارک حضرت قبلہ روحانی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ بہند آمدہ بودم در دہلی با مولانا ملاقات نمودہ از صحبت پرقیمت شان محظوظ گردیدہ بودم شخصیت مولانا را آنقدر برازندہ و روحیہ عالی شانرا باندازہ بلند یافتہ بودم ہیچ قوۃ مانع طرز عمل و اجرائے نظریات شان شدہ نمی توانست

مولانا از کمال عشق و محبتی کہ با علائے اسلام داشت حیات جاودانی را اکتساب نمودہ و اخیراً در آں مقبرہ آسودہ کہ آں را رشک روضہ بہشت برین میتوان خواند یعنی در جوار آں بزرگان عظام و محدثین کرام مثل حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب و حضرت شاہ ولی اللہ صاحب و حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب جا گزید کہ امیدست ببرکت ایں علمائے دین و اکابر مسلمین احوال اخروی او سعادت قرین باشد۔ اللّٰھم اغفر لھم وارحمھم

چوں جناب الحاج مولانا سید انیس الحسن صاحب جنرل منیجر اخبار الجمعیۃ در ضمن دعوت نامہ تحریر نظریات فقیر را راجع بحضرت مولانا مطالبہ فرمودہ بودند اینک با امتثال امر شان مختصراً چند سطری نوشتم باتقدیم احترامات

عبدالسلام المجددی اثیم

کابل۔ افغانستان دار الامان وات۔

آہ مولانا حفظ الرحمٰن

(حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحب مدظلہ مہتمم دارالعلوم دیوبند)

مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی وفات کا یہ عظیم ترین المیہ کسی ایک فرد یا خاندان یا ایک شہر یا ایک ملک کا نہیں بلکہ پورے عالم اسلام کا صدمہ ہے مولانا حفظ الرحمٰن کی ذات گرامی اپنی قابلیت و مقبولیت کے لحاظ سے بلا امتیاز مذہب و ملت ہندوستان گیر شخصیت تھی دارالعلوم دیوبند کی اس چار دیواری میں ان کی علمی استعداد اور فکری نشو و نما کا آغاز ہوا۔ فراغت کے بعد اکابر نے مولانا موصوف کی قابلیت کی رفعت مندانہ کیفیات کو دیکھ کر آپ کو دارالعلوم میں معین المدرسی کی خدمات سپرد فرمائیں۔ نتیجہ توقع کے مطابق ثابت ہوا کہ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے دارالعلوم کی ممتاز تدریس میں بہت جلد اکابر کی نظروں میں اعتماد قابلیت اور طلبہ کی نظروں میں محبوبیت و مقبولیت پیدا کر کے بلند تر مقام پیدا کر لیا اور اس کے بعد دارالعلوم میں آپ کا پورا زمانہ قیام اسی مقبولیت اور امتیاز کے ساتھ بسر ہوا۔ برنام بٹ مدراس کی دینی درسگاہ سے جب امتیازی اوصاف تدریس رکھنے والے، بلند فکر عالم کیلئے خصوصی طلب آئی تو قدرتاً اکابر کی نگاہ انتخاب مولانا حفظ الرحمٰن صاحب پر پڑی۔ طبعی اطاعت شعاری کی بنا پر آپ نام بٹ مدراس تشریف لے گئے اور جس انہماک و قابلیت سے آپ نے وہاں تدریسی اور تعلیمی خدمات انجام دیں ان پر دائمی نقوش اعتراف و اقرار آج بھی ثبت ہیں اور ہمیشہ رہیں گے۔ اس کے کچھ عرصہ بعد اپنے محبوب اساتذہ کرام کے ساتھ جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں خدمت تدریس انجام دینے کی نوبت آئی۔ ڈابھیل کے طویل قیام اور ہر علم و فن کی کتب پڑھانے کے بعد ان کی علمی اور تدریسی قابلیت علماء میں مسلم ہو گئی۔ یہاں تک کہ دارالعلوم دیوبند کے ایک موقر اور ذی رائے فرزند کی حیثیت سے مولانا موصوف کو دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کا رکن بنایا گیا اور اصابت رائے اور معاملہ فہمی کی ان عظیم صلاحیتوں سے دارالعلوم تقریباً ۲۲ سال منتفع رہا۔

علمی اور تدریسی ذوق کیساتھ دور آغاز سے مولانا مرحوم سیاسی دماغ بھی رکھتے تھے جو جذبۂ عمل اور فعالیت سے بھرپور تھا آپ کی سیاسی خدمات کا آغاز جمعیۃ علماء ہند کے پلیٹ فارم سے ہوا یہاں آپ نے بڑی تیزی کیساتھ اپنے فکر رسا۔ معاملہ فہمی۔ وقت شناسی۔ اور استقلال و ثبات قدمی کا لوہا منوا لیا جسکے نتیجہ میں آپ ورکنگ کمیٹی میں لئے گئے اور پھر آپ کی پُرتاثیر فعال شخصیت نے اپنا واجبی خراج اعتراف اس طرح وصول کر لیا کہ جمعیۃ علماء ہند کے سالانہ اجلاس لاہور میں آپ کو باتفاق رائے "ناظم اعلیٰ" بنا دیا گیا اس ذمہ دارانہ منصب پر آنے کے بعد آپ کی ذمہ دارانہ خدمات کا آغاز بھی تھا اور ساتھ ہی ایک غیر معمولی امتحان بھی لیکن زیادہ وقت گزرنے نہیں پایا کہ آپ کی مدبرانہ روش اور زعیمانہ صلاحیتیں بروئے عمل آگئیں اور سیاسی رہنمائی میں ملک گیر انداز پر آپ صف اول کے لیڈروں میں پہنچ گئے نتیجۃً برطانوی عہد میں آپ کو اپنی رہبرانہ صلاحیتوں کی قیمت قید و بند کی صورت میں ادا کرنی پڑی اور بالآخر اپنے ہمعصر صف اول کے زعما کے دوش بدوش جنگ آزادی لڑ کر وطن کو آزاد کرایا۔ لیکن بخت و وقت کو یہ منظور نہیں تھا کہ آپ کا فکر و عمل اور جہاد ختم ہو۔ ۱۹۴۷ء میں آفتاب آزادی طلوع ضرور ہوا لیکن اس کا افق خونی شفق سے رنگین تھا اور ایک شہر سے دوسرے میں نہیں بلکہ قاسم جان اسٹریٹ سے لال قلعہ تک جانے کے لئے بھی خاک و خون میں تڑپتی ہوئی لاشوں کو عبور کرنا ناگزیر تھا۔ یہ مجاہد ملت کا ہی حوصلہ مردانہ تھا کہ اس قتل و غارتگری کے پرآشوب دور میں اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر قیام امن کی مساعی میں سرفروشانہ حصہ لیا اور اپنی بے مثال سعی کے نتیجہ میں لاکھوں کی جانوں مالوں اور آبروؤں کے محافظ بنے اور خطرناک منزل پہ بھی اپنی جان کی کوئی قیمت نہیں سمجھی۔

ع خدا رحمت کرے اس صادق پاکیزہ طینت پر

غرضیکہ مجاہد ملت کی زندگی ہر ہر حیثیت سے ناقابل فراموش ہے آج دارالعلوم اور اس کی جماعت اپنے اس جلیل القدر فرزند کی دائمی جدائی پر سوگوار ہے۔ آج مظلوم اپنے پشت پناہ کے اٹھ جانے پر غم آگین ہیں۔ آج ملک کے اہل علم ایک بابصیرت و بالغ نظر عالم کے رخصت ہو جانے پر غم نصیب ہیں آج ارباب سیاست ایک صاحب فراست کے اپنے درمیان نہ رہنے پر اشک فشاں ہیں۔ آج تحریر و خطابت کی محفلیں سونی ہیں آج تصنیف و تالیف کی مجلس پر سکوت طاری ہے لیکن اب یہ سوگواری نہ ہمارے حق میں کارآمد ہے نہ ان کے حق میں آج وہ اس کے ضرورت مند ہیں کہ آپ ان عظیم خدمات کے صلہ میں اپنے اوپر ان کے حق کو پہچانیں اور اس کو ادا کریں اور وہ یہی ہے کہ ایصال ثواب کی کثرت کی جائے اور ہر ہر موقع پر ایصال ثواب پر آپ مولانا مرحوم کو یاد رکھیں آخیر میں میں انہی کلمات کے ساتھ مولانا مرحوم کے متعلقین اور اعزا کی خدمت میں اپنی شرکت غم کیساتھ تعزیت مسنونہ و تلقین صبر کی عرضداشت و اجر جزیل کی دعا پیش کرتا ہوں۔

مولانا داؤد غزنوی۔ لاہور (پاکستان)

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کے سانحۂ ارتحال کی خبر مجھے ایک سفر سے واپس آنے کے بعد ہوئی۔ اس خبر سے بےحد صدمہ ہوا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

مولانا اپنے علم وفضل کے لحاظ سے ملک کے ممتاز ترین علماء میں سے تھے، اسلامی غیرت وحمیت اور اس کے لئے جاں نثاری میں قابل رشک مقام رکھتے تھے۔ ان کی خدمات علماء کی تنظیم اور ان کے مقام کو بلند کرنے میں بےمثال تھیں تقسیم سے پہلے اور تقسیم کے بعد وہ اسلام کے نڈر بہادر سپاہی بھی تھے اور کمانڈر بھی تھے۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، کہ تقسیم کے بعد وہ مسلمانوں کا تنہا سہارا تھے۔ انھوں نے اسمبلی کے اندر اور اسمبلی کے باہر جس جرأت اور بےباکی سے مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے آواز بلند کی آج اس کا کوئی بدل نظر نہیں آتا۔ وہ حسن اخلاق، مروت، ہمدردی، ایثار نفسی اور تحمل وبردباری کے مجسمہ تھے

ان کے فراق پر آنکھیں اشکبار ہیں، دل حزیں وغمگسار ہے۔ لیکن رضا بالقضاء کا تقاضہ یہی ہے کہ ہم اپنے رفیق قدیم کی جدائی پر انا للہ وانا الیہ راجعون کہیں اور ان کے حق میں دعا کریں۔

اللھم اغفر لہ وارحمہ وعافہ واعف عنہ واکرم منزلہ ووسع مدخلہ واغسلہ بالماء والثلج ... ونقہ من الخطایا کما نقیت الثوب الابیض من الدنس وبدلہ دارا خیرا من دارہ واھلا خیرا من اھلہ وزوجا خیرا من زوجہ وادخلہ الجنۃ واعذہ من عذاب القبر ومن عذاب النار۔

اللہ تعالیٰ ان کے بچوں اور تمام پسماندگان کا محافظ وناصر اور مربی ہو۔

مولانا عبدالحامد بدایونی صدر جمعیۃ علماء پاکستان

سیوہارہ ضلع بجنور کی سرزمین قابل فخر ہے جس نے مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب جیسا عالم پیدا کیا۔ جاننے والے اچھی طرح جانتے ہیں کہ مولانا حفظ الرحمن صاحب فراغت وتکمیل علوم عربیہ کے بعد ہی قومیات، مذہبیات کی تحریکات میں پورے جوش کے ساتھ شریک ہوگئے۔ تحریک خلافت، آزادی جزیرۃ العرب میں انھوں نے انتہائی سرگرمی کے ساتھ خدمات انجام دیں اس تحریک میں جو لوگ شریک ہوئے ان کے اندر مودت ومحبت کے رجحانات ومیلانات نمایاں طور پر پیدا ہوگئے، چنانچہ مجھے یاد ہے کہ جب ہماری اور مولانا کی پہلی ملاقات سیوہارہ خلافت کے ایک جلسہ خصوصی میں ہوئی۔ اس دن سے تا قیام پاکستان وہ جب ملے انتہائی اخلاص ومحبت سے ملے۔ سیاسیات میں اگرچہ ان کی ہماری دو جداگانہ راہیں اور منزلیں تھیں، مگر مولانا نے کسی وقت بھی تعلقات میں فرق نہ آنے دیا۔

مولانا حفظ الرحمٰن بہترین خطیب ومقرر تھے، انکی تقاریر میں جوش وولولہ، خطابت، علمی مواد ہوتا، ہر ذوق کا سامان ہوتا۔ سیاسی تقاریر کے علاوہ میں نے چند تقاریر سیرت نبویہ پر بھی سنیں، بلاشبہہ یہ تقاریر یادگار حیثیت رکھتی تھیں۔ کاش اس زمانے میں ٹیپ ریکارڈ ہوتے تو یہ ریکارڈ کی جاتیں۔

مولانا اگرچہ شروع سے لیکر آخر تک کانگریسی رہے، لیکن انکے اندر مذہبی تڑپ ملت اسلامیہ کی ضرورتوں کا احساس مسلمانوں کی تباہی بربادی کے تاثرات زیادہ سے زیادہ موجود تھے، وہ جہاں اسمبلی کے اندر مسلمانوں کے معاملات پر آزادی کے ساتھ بولتے وہیں حکومت کی بنچوں میں بیٹھ کر کلمہ حق بلند فرماتے۔ پورے ہندوستان میں جہاں کہیں بھی مسلمانوں پر کوئی آفت آتی، مولانا حفظ الرحمٰن مضطربانہ انداز میں موقعہ واردات پر پہنچکر مصیبت زدوں کی امداد واعانت فرماتے۔ مولانا کی یہ خدمات جلیلہ تاریخ فراموش نہیں کر سکتی۔ اسلامیان ہند کیطرح پاکستان کے علماء بھی مولانا مرحوم کو فراموش نہیں کرسکتے۔ اللہ تعالیٰ انکو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔

مجاہد ملت نے جس ہمت جرأت اور دانائی سے فرقہ پرستی کا مقابلہ کیا اسکی نظیر نہیں ملتی

حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی ناظم ندوۃ المصنفین دہلی کا اظہار غم!
تعمیر کے ہر مرحلہ پر ان کی یاد ستائے گی

حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب نے مجاہد ملت کی وفات پر ایک بیان میں فرمایا کہ مولانا کی جدائی ملکی اور ملی سانحہ کے علاوہ میرے لئے ایک ہولناک شخصی حادثہ ہے۔ گذشتہ بیالیس سال سے ہمارے تعلقات اتنے گہرے وسیع اور پُرخلوص تھے کہ ان کا بیان الفاظ کے قالب میں سما نہیں سکتا۔ ایسے روابط کی مثالیں بے شبہ کمیاب ہیں ۱۹۲۰ء اور ۱۹۲۱ء تحریک ترک موالات اور آزادی کی جدوجہد کے ہنگامہ خیز سال تھے۔ ہم دونوں ایک ہی وقت میں استخلاص وطن کی اس تحریک میں شامل ہوئے اور اس مقدس اجتماعی تقریب سے ایک دوسرے سے اس طرح وابستہ ہوگئے کہ یہ تعلقات بہت جلد اخوت و مودت کے نہایت عمیق رابطہ میں ڈھل گئے۔ ایک ساتھ پڑھے، ایک ساتھ پڑھایا۔ اور زندگی کی ہر منزل میں ایک دوسرے سے کچھ اس طرح رفاقت رہی کہ فرق من و تو ہی باقی نہ رہا۔ اس وقت بیالیس سال کی اس لطیف و نفیس رفاقت کا نقشہ آنکھوں میں گھوم رہا ہے۔ اور بے شمار واقعات حافظے کی لوح پر ابھر رہے ہیں۔ مرحوم عظیم سیاست داں، زبردست عالم دین اعلیٰ درجہ کے مصنف اور بے مثال خطیب تھے۔ عزم و ہمت اور بیباکانہ جرأت حق میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے، بے لوث خدمت خلق ان کی زندگی کا طرۂ امتیاز بلکہ خاص مشن تھا اور رات دن اس کام میں لگے رہتے تھے۔ ۱۹۴۷ء کے انقلاب سے پیہم فرقہ پرستی کا انھوں نے جس ہمت، جرأت اور حکمت و دانائی سے مقابلہ کیا اس میں ان کا کوئی سہیم و شریک نہیں تھا۔ ان کی بے پناہ خدمات اور غیر معمولی قابلیت کا ملک کے تمام ہی طبقوں میں زبردست اثر تھا۔ وہ مظلوموں اور بے سہاروں کی پناہ تھے۔ جہاں تک جمعیۃ علماء ہند کا تعلق ہے اس کے یتیم ہونے میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں۔ ایسی جامع کمالات شخصیت کا بدل اب مشکل ہی سے مل سکے گا اور قومی و ملی تعمیر کے ہر مرحلے پر ان کی یاد بری طرح ستائے گی۔ اللہ تعالیٰ اس ہمدم دیرینہ غمگسار کی دائمی جدائی کا غم سہنے کی توفیق مرحمت فرمائے۔ آمین

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا دامت برکاتہم

مظاہر العلوم، سہارن پور

مکرم محترم، مد فیوضہم، بعد سلام مسنون۔

کل کے تار کی رسید تو مولانا محمد میاں صاحب کے کارڈ پر اسی وقت لکھ چکا تھا۔ اس حادثہ پر قلق اور رنج جتنا بھی ہو، قرین قیاس ہے، بالخصوص اس وجہ سے کہ جرأت اور بیباکی سے حکام کے سامنے مسلمانوں پر مظالم کو پیش کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ اللہ تعالیٰ ہی مولانا مرحوم کو ان سب مساعی جمیلہ کا، جو انھوں نے مسلمانوں کی فلاح و بہبود بالخصوص ۱۹۴۷ء کے حوادث میں کیں کہ یہ ناکارہ خود بھی اس وقت دہلی ہی میں موجود تھا اور خود دیکھتا تھا۔ اللہ تعالیٰ ہی اپنی شایانِ شان بہترین جزائے خیر عطا فرمائے۔ غالباً آپ کے علم میں تو یہ بات ضرور ہوگی۔ کہ اس ناکارہ کے یہاں تعزیتی ریزولیوشن وغیرہ کوئی وقعت نہیں رکھتے۔ میرے نزدیک جانے والے کے لئے اور پسماندہ دوستوں کے لئے کام آنے والی چیز دعاء مغفرت اور ایصال ثواب ہے

کل سے جب حادثہ کی اطلاع سنی، مدرسہ کے علاوہ خصوصی احباب سے بھی یہی فرمائش کر رہا ہوں کہ ہر حافظ کم از کم قرآن پاک اور ناظرہ خواں تین مرتبہ سورہ یٰسین اور جو ان پڑھ ہوں وہ کم سے کم تین مرتبہ قل ھو اللہ پڑھ کر ضرور بخشیں، بندہ کے نزدیک مولانا کے احسانات علی المسلمین کا اگر کوئی بدلہ ہے تو یہی ہے۔

محمد زکریا، یکم ربیع، جمعہ ۸۲ھ

مولانا حفظ الرحمٰن ہندوستان کی تاریخ کا ایک روشن باب تھے

علیگڈھ یونیورسٹی کا حضرت مجاہد ملت کو خراج عقیدت

(نعن بیتی قرارداد)

حضرت مولانا حفظ الرحمٰن مرحوم کے انتقال پر ملال پر اپنے رنج و غم کا اظہار کرنے کے لئے مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کے طلباء اساتذہ ممبران کورٹ اور جملہ کارکنان کا ایک جلسہ یونین ہال میں منعقد ہوا۔ اسی روز یونیورسٹی میں تعطیل کر دی گئی تھی۔ جلسہ کی صدارت پرو چانسلر نواب صاحب چھتاری نے فرمائی۔ اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے نواب چھتاری۔ جناب عبد المجید خواجہ۔ اور مسلم یونیورسٹی اسٹوڈنٹس یونین کے سکریٹری بصیرت احمد صاحب نے حضرت مولانا کو خراج عقیدت پیش کیا۔ بعد میں وائس چانسلر کرنل بشیر حسین صاحب زیدی نے مندرجہ ذیل قرارداد پیش کی جو متفقہ طور پر جلسے نے کھڑے ہوکر پاس کی۔

"مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کے طلباء، اساتذہ۔ ممبران کورٹ اور جملہ کارکنوں کا یہ جلسہ حضرت مولانا حفظ الرحمٰن کی وفات پر انتہائی رنج و الم اور ان کے پسماندگان سے دلی ہمدردی کا اظہار کرتا ہے۔ مولانا جنگ آزادی کے عظیم مجاہد۔ روشن خیال عالم اور بلند پایہ خطیب تھے۔ انھوں نے جنگ آزادی کے راستہ میں قید و بند کی ہر تکلیف کو بے نیازی کے ساتھ برداشت ہی نہیں کیا بلکہ انھیں جرأت اور پامردی کے ساتھ دعوت بھی دی۔ وہ بجنور کے ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتے تھے جو علم و فضل میں ہمیشہ ممتاز رہا ہے۔ خلافت اور کانگریس کی تحریک کے سلسلہ میں مولانا کی قربانیاں اور اُترپردیش اور ہندوستان کی تاریخ میں یادگار ہیں۔ وہ ہندوستانی قومیت کے زبردست حامی تھے۔ ملک کی تقسیم کے بعد جس طرح انھوں نے ہندوستانی قومیت اور جمہوریت کے تصور کو اس ملک میں قائم کرنے کی جدوجہد کی وہ ہندوستان کی تاریخ کا ایک نہایت روشن باب ہے۔ ۱۹۴۷ء سے لیکر اپنے آخری لمحوں تک مولانا نے ان مقاصد کیلئے صحیح معنوں میں جہاد جاری رکھا۔ مولانا کی علمی خدمات نہایت گرانقدر ہیں۔ علمی اداروں کی خدمت اور اساتذہ کی بہبودی کے لئے انھوں نے اپنی ذات سے جو کچھ کیا وہ انجمنیں اور جماعتیں نہ کر سکیں۔ وہ ایک بڑے روشن خیال بزرگ تھے۔ جس کا ایک بڑا روشن ثبوت یہ ہے کہ انھوں نے دیوبند کے تصور کو علیگڈھ کے تصور پر اور علی گڈھ کے تصور کو دیوبند پر کبھی مسلط نہیں کیا وہ جہاں پرانے علوم کا احترام کرتے تھے وہاں مغربی علوم کی ضرورت اور اہمیت کے معترف اور انکے ماہرین کے سچے قدردان بھی تھے۔ انکی رواداری اور وسیع المشربی میں چھوٹے بڑے کا سوال نہیں تھا۔ وہ امیر غریب، عالم اور جاہل سب کے غمخوار تھے۔ البتہ وہ ہر قسم کی غلامی اور ہر قسم کے استبداد کے سخت دشمن تھے اور انکے خلاف جہاد کرنے میں اپنی جان و مال کی کبھی پرواہ نہیں کرتے تھے۔

مولانا مسلم یونیورسٹی کے ساتھ کئی حیثیتوں سے وابستہ تھے۔ وہ یونیورسٹی کورٹ کے ممبر اور ایگزیکٹیو کونسل کے رکن تھے۔ انھوں نے اس ادارہ کی زبردست خدمات انجام دیں۔ مولانا کی وفات ہندوستان کیلئے، ہندوستانی مسلمانوں کیلئے اور علمی، ادبی اور سیاسی جماعتوں کیلئے ایک عظیم سانحہ ہے۔ خدائے عزّوجل سے دعا ہے کہ وہ حضرت مولانا کی مغفرت فرمائے اور ان کے پسماندگان اور اقربا کو صبر جمیل عطا فرمائے۔"

ایک عظیم قومی اور ملی سانحہ

حضرت مولانا عبدالوہاب صاحب آروی صدر آل انڈیا اہلِ حدیث کانفرنس

مجاہد ملت حضرت مولانا محمد حفظ الرحمان صاحبؒ کا وصال ایک عظیم ملی سانحہ ہے۔ مولانا ایک متبحر عالم دین اور فقید المثال اور بلند پایہ مفکر اور جہادِ حریت کی صفِ اول کے سپاہی تھے غیر ملکی اقتدار و استبداد کے خلاف انیسویں صدی کے اوائل میں جہادِ حریت کا جو پرچم شہیدین حضرت مولانا سید احمد صاحب بریلویؒ حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحب دہلوی نے بلند کیا اور اس سلسلہ میں سر دھڑ کی بازی لگائی۔ اس مقدس تحریک کو ان کے بعد بھی علماء ربانیین نے جاری رکھا اور احوال و ظروف کے تغیر و تبدل کے ساتھ اپنے اپنے طور پر کام کرتے رہے۔ اس سلسلے میں حضرت مولانا ولایت علی عظیم آبادیؒ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب دیوبندیؒ حضرت مولانا عبدالعزیز صاحب رحیم آبادیؒ حضرت مولانا محمد صاحب منگل کوٹھیؒ حضرت مولانا ابو الکلام آزادؒ مفتی اعظم حضرت مولانا محمد کفایت اللہ صاحب دہلویؒ حضرت مولانا عبید اللہ صاحب سندھیؒ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ کے اسمائے گرامی خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔ مجاہد ملت حضرت مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحبؒ کا تعلق بھی اسی متبرک جماعت سے تھا۔

۱۹۱۹ء میں اجتماعی طور پر وطنی تحریک ایک نئے دور میں داخل ہوئی، اور مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ بھی پوری قوت کے ساتھ اس میں شامل ہو گئے اور اس سلسلے میں قید و بند کی مسلسل صعوبتیں برداشت کرتے رہے۔ اس کے نتیجہ میں ملک آزاد ہوا مگر ساتھ ہی ملک تقسیم بھی ہو گیا۔ اور اس کے نتیجے میں ملک کے دونوں حصوں ہندو پاک میں ہوش ربا فسادات، قتل و غارت گری کا بازار گرم ہوا خصوصاً دار السلطنت دہلی میں "خونِ مسلم" کی جو ارزانی ہوئی۔ اس نے ملک کے سب سے بڑے سیاسی لیڈر گاندھی جی کو بھی بے چین کر دیا۔ مسلمان بے حد خوف زدہ اور ہراساں تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دہلی مسلمانوں سے بالکل خالی ہو جائے گی۔ اور سیکولر حکومت کا ڈھانچہ پارہ پارہ ہو جائے گا۔ ایسے وقت میں ملک و ملت کا جو بطل جلیل مسلمانوں کی پاسبانی اور سیکولرازم کی آبرو بچانے کے لئے میدان میں آیا وہ مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ تھے۔ اس کام میں مولانا کا کوئی شریک و سہیم نہیں۔ مسلم رہنماؤں میں ایک طبقہ تو وہ تھا جس کے پیش نظر ملک کا اجتماعی مفاد رہا اور اسی کی تکمیل میں وہ مصروف تھا۔ دوسرا گروہ وہ تھا جس کی تگ و دو مسلم مفاد تک محدود رہی لیکن مجاہد ملت کا شمار ان معدودے چند رہنماؤں میں ہے جنھوں نے بیک وقت ملکی اور ملی دونوں مفادوں کے لئے کام کیا۔ اور اللہ تعالیٰ نے ہر ہر قدم پر کامیابی عطا فرمائی۔ مولانا فرماتے تھے کہ ملک میں جمہوری نظام اسی وقت کامیاب ہو سکتا ہے جب ملک کی اقلیتیں مطمئن ہوں۔

مولانا آزادؒ کے بعد ملت کا آخری سہارا مجاہد ملتؒ کی ذات تھی۔ جبلپور، ساگر کے خونی واقعات ہوں یا بھوپال، مبارک پور، علیگڑھ، میرٹھ کے بھیانک فسادات، سب جگہوں کے مظلوم اور ستم زدہ مسلمان مولانا کے پاس پہونچتے تھے۔ اور مولانا خود فساد زدہ علاقوں میں پہونچ کر ایک طرف تو مسلمانوں کی ہر طرح کی امداد کرتے اور دوسری طرف مقامی اور مرکزی حکومتوں کو داد رسی کے لئے مجبور کرتے تھے۔

آخر میں مجاہد ملت کا ایک بہت بڑا کارنامہ انڈین مسلم کنونشن ہے۔ ملک کی آزادی کے بعد ہندی مسلمانوں کا اپنی نوعیت کا یہ پہلا اجتماع تھا جس میں ہر طبقہ اور ہر مکتب خیال کے مسلمانوں نے ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو کر اپنے جائز اور مناسب مطالبات کو حکومت کے سامنے پیش کیا حکومت کے بعض مقتدر افراد جن کو اس وقت تک سیکولرازم کے صحیح مفہوم پر غور کرنے کا موقع نہیں ملا تھا، اس اجتماع پر چونکے اور بعض مسلم رہنماؤں نے بھی نکتہ چینی کی مگر مجاہد ملت نے اس کی کوئی پرواہ نہیں کی۔ وہ بار بار فرمایا کرتے تھے کہ "جب ہم نے آزادی سے قبل مسلم فرقہ پرستی سے جنگ کی ہے تو آزادی کے بعد ہندو فرقہ پرستی سے لڑنا بھی ہمارا ہی کام ہے"

اللہ تعالیٰ نے مجاہد ملت کو علم و فضل، استقامت و عزیمت، جرأت و بصیرت اور اخلاص و ایثار کی نعمتوں سے نوازا تھا اور انھوں نے اپنی تمام صلاحیتوں کو ملک و ملت کی از سر نو تعمیر کے لئے وقف کر دیا تھا خصوصاً ملت ہندیہ کو اُن کی رہنمائی کی سخت ضرورت تھی مگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہر شخص کے لئے ایک وقت مقرر ہے۔ وہ علیم و خبیر ہے۔ اپنی مصلحتوں کو خوب جانتا ہے۔ مولانا کے انتقال سے نہ صرف جمعیۃ علماء ہند یتیم ہو گئی بلکہ پوری ملت ان کے لئے سوگوار ہے۔ اور مولانا کا انتقال ملک و ملت کے لئے ایک بڑا سانحہ ہے۔

یہ چیز ہمارے لئے یقیناً باعث طمانیت ہے کہ جمعیۃ علماء ہند کے قائم مقام ناظم اعلیٰ حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب اور حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی نے ایک طویل عرصہ تک مجاہد ملت کی معیت و رفاقت میں کام کیا ہے۔ یقین ہے کہ یہ حضرات مجاہد ملتؒ کے نقش قدم پر چلیں گے۔ اور ان کی قیادت میں جمعیۃ علماء قوم و ملت کے تقاضوں کو پورا کرتی رہے گی۔

مجاہد ملت رح سے میری آخری ملاقات امریکہ جانے سے قبل حافظ محمد ابراہیم صاحب کی کوٹھی پر ہوئی۔ مجھے معلوم تھا کہ ڈاکٹر صاحبان کی ہدایت ہے کہ مولانا کے پاس زیادہ دیر بیٹھ کر گفتگو نہیں کی جائے۔ میرے ساتھ حافظ عبد السلام صاحب (سکندر آباد ضلع بلند شہر) اور جناب حاجی محمد صالح صاحب (کوٹھی حاجی علی جان) بھی تھے۔ تقریباً دس منٹ کے بعد جب ہم لوگوں نے اجازت چاہی تو مولانا نے آبدیدہ ہو کر فرمایا کہ اتنی جلدی کیا ہے، ابھی کچھ دیر اور بیٹھئے مجھے سکون مل رہا ہے۔ پانچ منٹ کے بعد پھر اجازت چاہی تو فرمایا کہ جب تک دہلی میں قیام رہے کبھی کبھی آجایئے۔ اس کے بعد دو تین مرتبہ ملاقات کے لئے گیا چار پانچ دن کے بعد مولانا بغرض علاج امریکہ تشریف لے گئے۔ مرض کی نوعیت معلوم کر کے تشویش تو ضرور پیدا ہوگئی تھی مگر یہ اندازہ نہیں تھا کہ مولانا عنقریب ہم لوگوں سے جدا ہو جائیں گے۔ امریکہ سے واپسی کے بعد متعدد دفعہ ارادہ ہوا کہ مولانا کی عیادت کے لئے دہلی جاؤں۔ مگر اپنی علالت کسی طویل سفر کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ انتظار تھا کہ صحت اور کچھ قوت ہو جائے تو مولانا سے ملاقات کروں۔ یکایک دہلی ریڈیو سے یہ ہوش ربا خبر ملی کہ مجاہد ملت ہمیشہ کے لئے ہم سے رخصت ہوگئے۔ انا للہ الخ دعا ہے کہ مولائے کریم مجاہد ملت رح کی روح کو اپنے آغوش رحمت میں جگہ دے اور ان کی وفات سے ملت کو جو نقصان عظیم پہنچا ہے اپنے فضل و کرم سے اس کی تلافی فرمائے۔ آمین ثم آمین

ھُوَ الغَفُورُ الرَّحِیمُ القَدِیرُ

۱۹ ۶ ۶ ۲

قطعۂ سالِ وصالِ مقبولِ وطن مجاہدِ ملت علیہ الرحمۃ

۲ ۶ ۶ ۹ ۱

زعیمِ قوم و وطن آنکہ حفظِ رحمٰن بود — ملیکِ علم و کمال و سیاستِ علیا

بجاں نثاریٔ ملت مجاہدِ ملت — بسر فروشیٔ قوم و وطن دُر یکتا

قویم جادۂ حق و عدالت و انصاف — انیسِ بے کس و مظلوم با خلوص و صفا

ستونِ حریتِ ملک شیرِ ہندوستاں — زہے مدبرِ اعظم مفکرِ اعلا

حیاتِ او ہمہ بے لوث بے غرض بیباک — فنا دتشِ بخروش و بجوشِ ہوش ادا

حیاتِ اُو ہمہ سرگرم کارِ یکجہتی — گذاشت نقشِ قدم رہبرانِ قومی را

زہے خطیب و خوش واعظِ لطیف و فصیح — بر اتباعِ نظیرش شہادتِ عقلا

بعزم و ہمتِ راسخ بجوشِ ایمانی — کسے ندید چناں شیرِ ملتِ بیضا

بدردمندیٔ امت فدا نمود حیات — بجاں سپاریٔ ملت نمونۂ شہدا

از ارتحال جگرسوز حسرت و افسوس — یتیم و بے کس و حیراں بماند خلقِ خدا

بغیرِ ساقیٔ ملت چہ لطفِ مے خانہ — بماند ہیچ مے و جام و ساغر و مینا

بسالِ سانحۂ جاں گداز راغب گفت
غروبِ شدہ علم و فنون از دنیا

---

۱ ۹ ۶ ۶ ۲

(حکیم نور العین حسن راغبؔ لیکچرار طبیہ کالج علیگڑھ)

ایک عظیم رہنما اور مجاہد کی سبق آموز زندگی



جس نے ــــــ

اپنی پوری متاعِ زندگی ہمدردیٔ عوام اور خدمتِ خلق کی راہوں میں لٹائی۔

جس کے ــــــ

ایثار و کردار، ریاضتوں اور قربانیوں نے ملک و ملت کو سربلندی بخشی۔

جس کے ــــــ

عزم و ہمت نے ۴۷ء کے طوفانِ حوادث کا رُخ پھیر دیا۔

جس نے ــــــ

ملک کے گوشہ گوشہ کی خاک چھان کر آزاد ہندوستان میں ملتِ اسلامیہ کو نئی اور باعزت زندگی سے روشناس کرایا اور عزتِ نفس، خودداری اور وطن پروری کی شاہراہ دکھائی۔

جمعیۃ علماء ہند کا خراج عقیدت

تعزیتی قرارداد

" مورخہ ۲۸ اکتوبر ۶۲ء "جمعیۃ علماء ہند کا یہ اجلاس اپنے عزیز ترین رفیق و رہنما مجاہد ملت حضرت مولینا محمد حفظ الرحمٰن صاحبؒ ناظم اعلیٰ جمعیۃ علماءٔ ہند کی وفات حسرت آیات پر قلب پُر درد اور جگر پُر سوز کے ساتھ اظہارِ قلق کرتا ہے۔ حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ کو جس طرح قدرت نے علم و فضل کی دولت سے نوازا تھا علمی بصیرت، فکرِ رسا، تعمقِ نظر، ادبی ذوق اور تحقیق و تفتیش کا وہ شوق عطا فرمایا تھا جس نے آپ کو بہترین مصنّف بنایا، فصاحت و بلاغت اور خطابت کی وہ بے نظیر قدرت عطا فرمائی تھی کہ آپ ملک کے بے مثال خطیب تھے۔ آپ کو وہ فراست عطا فرمائی تھی جو مومن کامل کی شان ہے۔ آپ کو وہ سوجھ بوجھ اور سیاسی تدبّر عطا ہوا تھا جس نے آپ کو ملک کا ممتاز رہنما اور ملک کی اعلیٰ سیاست کا ایک رُکن بنا دیا تھا، آپ کو وہ حوصلہ وہ ہمّت اور وہ جراءت نصیب ہوئی تھی کہ حق و باطل کے ہر ایک معرکے میں آپ کا قدم آگے رہتا تھا۔ معاملہ فہمی اور رسائی فکر کا وہ جوہر آپ کو میسّر تھا جو ہر پیچیدہ معاملہ کی گتھی کو آسانی سے سلجھا دیتا تھا صاف گوئی اور راست بازی نے آپ کا وزن اتنا بڑھا دیا تھا کہ ہر مخالف اور موافق کی گردن آپ کے احترام کے سامنے خم تھی اور نہ صرف دوست بلکہ دشمن بھی آپ کے اعلیٰ کردار کے مدّاح تھے، ان تمام اوصاف اور کمالات سے بڑھ کر قدرت کے دستِ کرم نے آپ کو ملک و ملّت کا وہ درد عطا فرمایا تھا کہ آپ کا ہر نفس سوز و گداز تھا اور آپ کی حیاتِ طیّبہ کا ہر لمحہ سرتاسر جہاد بن گیا تھا اسی بنا پر آپ کو صحیح معنی میں مجاہد ملت کہا گیا اور اتنا کہا گیا کہ یہ خطاب آپ کے اسم مبارک کا جزو بن گیا۔ آپ کی زندگی کا ایک معتدبہ حصّہ درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں صرف ہوا۔ آپ نے حیاتِ باشعور کے میدان میں قدم رکھا تو سیاسی ذوق آپ کا ہم نفس تھا، جس نے آپ کو جنگِ آزادی کا جانباز کمانڈر بنا دیا۔ جس کا اقدام تحریک آزادی کے ہر موڑ پر فاتحانہ رہا اور جب ہندوستان آزاد ہو گیا تو اسی جذبہ اور احساس نے آپ کی تمام صلاحیتوں کو ملک و ملّت کی تعمیر میں منہمک کر دیا اسی جذبہ اور قوّتِ عمل کے ساتھ آپ انڈین نیشنل کانگریس کے ممتاز ممبر اور ہند پارلیمنٹ کے ایک باوقار رکن رہے لیکن ذوق و احساس کی ان تمام رنگینیوں میں جو جماعت آپ کو سب سے زیادہ محبوب تھی وہ جمعیۃ علماء ہند تھی۔ جس کے لئے جد و جہد کی تمام سرگرمیاں اس وقت سے وقف تھیں جب سے نظام جمعیۃ علماء ہند کا وجود ظہور پذیر ہوا، اور جب سے آپ نے سن شعور کی پہلی منزل میں قدم رکھا تھا۔ اس چالیس سالہ دور میں حفظ الرحمٰن جمعیۃ علماء ہند کے تھے اور جمعیۃ علماء ہند حفظ الرحمٰن کی۔

تقریباً ۱۸ سال تک آپ کی سربراہی نظامت علیا جمعیۃ علماء ہند کی قباپوش رہی۔ اس عرصہ میں آپ کا قابل قدر تاریخی کارنامہ یہ ہے کہ جمعیۃ علماء ہند کی افادیت کو آپ نے پورے ہندوستان کے لئے عام اور نو آزاد ملک کی پُر آشوب سیاست میں اس کا موقف سب سے بُلند کر دیا۔

آپ کے یہی اعلیٰ کمالات ہیں کہ آج ہند و بیرون ہند کے تمام سیاسی سماجی اور مذہبی حلقے آپ کی وفات پر صفِ ماتم بچھائے ہوئے ہیں۔ اور ہر شاہ و گدا رنج و الم میں شریک ہے۔

جمعیۃ علماء ہند اپنی عظمت و وقار کے اس علَم بردار اعلیٰ کی وفات پر جتنا بھی افسوس اور ماتم کرے کم ہے۔

بیشک جمعیۃ علماء ہند آج سوگوار ہے اور حضرت مجاہد ملّت مرحوم کے پسماندگان کے سوگ میں شریک ہے۔ مگر اس کا احساس کا یہ ہے کہ حضرت مرحوم کی صحیح یاد اور آپ کے ساتھ سچی ہمدردی یہ ہے کہ اس مشن کی تکمیل کی جائے، جس کے لئے حضرت نے اپنی زندگی وقف کی، انتہا یہ کہ ان ہی سرگرمیوں میں حیات عزیز کو قربان کر دیا۔

دعا ہے کہ اللہ تعالےٰ مجاہد ملّت کو عباد مقربین کے زمرہ میں شامل فرما کر اپنی بے شمار نعمتوں سے نوازے۔ آپ کے تمام پسماندگان کو دین اور دنیا کی برکتیں عطا فرمائے۔



مجاہدِ ملّت کے چند کارنامے

تحریکِ آزادی اور تعمیر و ترقی کے ہر ایک موڑ پر قائدانہ اقدام

از حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب ناظم عمومی جمعیۃ علماء ہند

تقریباً سات ماہ گذر گئے جب مجاہد ملت رخصت ہوئے تھے۔ بڑے سے بڑا زخم اس عرصہ میں مندمل ہوجاتا ہے مگر جو زخم مجاہد ملت کی مفارقت سے پڑگئے ہیں وہ مندمل تو کیا ہوتے، اُن کی ٹیس میں بھی فرق نہیں آیا ہے۔ جیسے ہی مجاہد ملت کا خیال آتا ہے۔ دل قابو میں نہیں رہتا، تو قلم کس طرح قابو میں رہ سکتا ہے۔ لہٰذا اس طویل بیان میں جہاں جہاں انتشار محسوس ہو آپ اسے نظرانداز فرمائیں مضطرب کا اضطراب قابل معافی ہوتا ہے۔ البتہ اس منتشر مضمون میں بہت کچھ تاریخی مواد مل جائیگا اگر آپکو تاریخ سے دلچسپی ہے تو آپ اس کی قدر کریں گے

محمد میاں

سبحان الذی یقضی فی عبادہ بما یشاء کیف یشاء والصلوٰۃ والسلام علی رسولہ خاتم الانبیاء الذی علمنا الرضاءَ بالقضاء۔

ہم سمجھتے ہیں کہ ہم بھی ,, صاحب قلم" ہیں۔ مگر ہمارا قلم کیا ہے؟ ایک بے حقیقت کھلونا۔ اوپر سے نیچے گرجائے تو ریزہ ریزہ ہوجائے ذرا سی نمی سے حرفوں کی نمود ختم۔ کہیں بے احتیاطی سے رکھا جائے تو کیڑے چاٹ جائیں۔

ایک قلم وہ ہے جسے قلم تقدیر کہتے ہیں۔ سارا جہان ادھر سے اُدھر ہوجائے مگر کیا مجال کہ نوشتہ تقدیر کا ایک حرف بھی بدل سکے

یہ ناکارہ سمجھ رہا تھا کہ جب تک وہ زندہ ہے مجاہد ملت کو دامت برکاتہٗ اور مدظلہ العالی ہی لکھتا رہے گا اور جب یہ فقیر حقیر پیوند خاک ہوچکے گا تو ایک عرصہ کے بعد وہ وقت آئے گا کہ مجاہد ملت کے لئے لحد اور تابوت کی ضرورت ہوگی۔ اور ان کے واسطے رحمۃ اللہ، غفر اللہ لہٗ قدس اللہ سرہٗ اور نور اللہ مرقدہٗ جیسے الفاظ استعمال کئے جائیں گے۔

میری عمر اگرچہ تقریباً تین سال کم تھی مگر اپنی اور مولانا کی صحت اور جسمانی قوتی کا موازنہ کرتا تھا تو یہ اندازہ صحیح ہی معلوم ہوتا تھا۔ مگر یہ نہیں معلوم تھا کہ قلم تقدیر کچھ اور لکھ چکا ہے اور حد امکان کی آخری سے آخری کوشش بھی اس میں کوئی تبدیلی نہیں کرسکتی۔

ہاں قلم تقدیر کا ہم پلہ ایک اور قلم ہے۔ وہ ہمارے ہاتھ میں تو نہیں رہتا۔ البتہ ہمارے ساتھیوں کے ساتھ ہر وقت اس کو جنبش دینے میں مصروف رہتے ہیں۔ یہ ہمارے ساتھی وہ واجب الاحترام فرشتے ہیں جنھیں عرف میں ,,کراماً کاتبین" کہا جاتا ہے جو ہمارے ہر ایک قول اور فعل کو لکھتے رہتے ہیں۔

ما یلفظ من قول الا لدیہ رقیب عتید

بیشک مشیت ایزدی اور رحمت خداوندی کی بوندیں بسا اوقات اس تحریر کے خراب یا کمزور حصوں کو مٹا بھی دیتی ہیں۔ یمحو اللہ ما یشاء ویثبت مگر جو حرف باقی رہیں گے وہ ایسے اٹل اور ایسے پائیدار ہوں گے کہ صورِ اسرافیل بھی ان کو نہ مٹا سکے گا۔

یہ وہ نوشتہ ہوگا جو قیامت کے روز اصحاب یمین کے داہنے ہاتھ میں دیا جائے گا اور حضرت مجاہد ملت جیسے خوش نصیب اُس کو دیکھتے ہی

خوشی سے پکاریں گے۔

هَاؤُمُ اقْرَؤُا كِتَابِيَه

آئیے آئیے پڑھئے یہ میری دستاویز

اور اگر ہم دنیا کے اصطلاحی الفاظ استعمال کریں تو شاید با محاورہ ترجمہ یہ ہو۔ آئیے۔ ملاحظہ کیجئے۔ یہ سپاسنامہ جو مجھے دیا گیا ہے۔

یہ حقیر فانی جو یہ سطریں لکھ رہا ہے امید ہے کہ یہ بھی باقی رہیں گی کیونکہ ان میں اس تحریر کا مواد ہے جو قیامت کے روز مجاہد ملت کو پیش کی جائے گی جو انشاء اللہ قابل فخر سپاسنامہ کی شان رکھے گی۔

خود مجاہد ملت رحمۃ اللہ علیہ کو اس تحریر کا بہت خیال رہا کرتا تھا چنانچہ غالباً ۱۹۴۸ء کا واقعہ ہے جب دو قومی نظریہ کا آتش فشاں پھوٹا ہوا تھا اور ہر طرف خون کی ندیاں بہہ رہی تھیں۔ میں نے ایک بیان دینا چاہا۔ بیان اپنی جگہ صحیح تھا مگر اس کا نتیجہ یہ ہو سکتا تھا کہ اشتعال میں اضافہ ہو اور کچھ اور خون خرابہ ہو جائے۔

حضرت مجاہد ملت سے میں نے تذکرہ کیا۔ فرمایا۔ ہرگز نہیں۔ خون کے دھبوں سے خدا نے ہمارا دامن پاک رکھا ہے۔ آپ یہ دھبہ کیوں لگاتے ہیں۔

چند کارنامے

احادیث مقدسہ میں "اغاثۃ ملہوف" کے بہت فضائل بیان فرمائے گئے ہیں یعنی مظلوم اور مصیبت زدہ کی فریاد رسی اور امداد۔ اس میں وہی پیش پیش ہوگا جس کا دل پُردرد اور جگر پُرسوز ہو۔ ۱۹۴۷ء کے ہنگامی دور میں اور اس کے بعد جو واقعات پیش آتے رہے انھوں نے مجاہد ملت کے اس وصف کو اتنا نمایاں کر دیا ہے کہ آپ کی ذات ہمدردی اور فریاد رسی کی زندہ جاوید مثال بن گئی ہے۔

ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات

یہ خاص وصف جو بلا مبالغہ لاکھوں مظلوموں کے زخموں کا مرہم ثابت ہوا جس نے بیشمار مصیبت زدوں کی جانیں بچائیں دیکھنے والوں نے اس کے "چکنے چکنے پات" اسی وقت دیکھ لئے تھے جب تقریباً ۵۰ سال پہلے ریلوے اسٹیشن کانٹھ کے قریب ایکسپریس کے ہولناک تصادم کا حادثہ پیش آیا تھا۔ اس حادثہ میں کئی بوگیاں چکنا چور ہو گئی تھیں۔ مولانا فرمایا کرتے تھے کہ اس ایکسپریس کا گارڈ جس کو مولانا ذاتی طور پر بھی جانتے تھے اس طرح چور چور ہو گیا تھا کہ اس کو فقط سیٹی کے نشان سے شناخت کیا جا سکا تھا۔

اس حادثہ میں ختم ہونے والوں کی لاشیں دور تک پھیلی ہوئی تھیں انہیں کے بیچ میں وہ نیم جان زخمی بھی تھے جن کی کراہ سے دل لرزتے اور رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ لاشوں تک پہنچنا۔ ان کو اٹھانا۔ زخمیوں کی مدد کرنا بڑے دل گردہ کا کام تھا۔ پکی عمر کے آدمی بھی اس کی ہمت نہیں کر سکتے تھے۔ قصبہ کانٹھ جس کے اسٹیشن کے قریب یہ حادثہ پیش آیا حضرت مجاہد ملت کے وطن عزیز "سیوہارہ" سے تقریباً سات میل کے فاصلہ پر ہے۔

وہ کیا جذبہ تھا جس نے اٹھارہ یا انیس سالہ حفظ الرحمن کو جو قانوناً بالغ بھی نہیں تھا اس پر آمادہ کیا کہ اپنے قصبہ سے سات میل چل کر جائے حادثہ پر پہنچے اور بڑے آدمیوں کے زمرہ میں شامل ہو کر وہ کام کرے جو بڑوں کے لئے بھی سبق آموز ہوں' مزدوروں کی طرح لاشیں اٹھائے اور تڑپنے والے زخمیوں کی تیمار داری کرے اور جب تک اس کام سے پوری طرح فراغت نہ ہو جائے۔ اپنے مکان واپس نہ آئے۔

کچھ لاشوں کو جلایا گیا۔ کچھ کو دفنایا گیا۔ یہ سب کچھ مولانا حفظ الرحمن صاحب کی آنکھوں کے سامنے ہوا۔

یہ جذبہ جس نے اس بچپن میں اس نوخیز بہادر کو اس والہانہ خدمت پر آمادہ کیا۔ نشان تھا اس سوز اور اس درد کا جو فطرت نے مجاہد کو عطا ہوا تھا۔ وہ بڑھتے بڑھتے یہاں تک بڑھا کہ تمام ستم رسیدہ مظلوموں اور کمزوروں کا درد قلب مجاہد کا درد بن گیا۔ بقول شاعر

سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

تحریکات کا دور جدید۔ اور مجاہد ملت کی مجاہدانہ زندگی کا آغاز

آزادیٔ ہند کی تحریک اگرچہ بہت پہلے سے شروع ہو چکی تھی اور اگر یہ دعویٰ کیا جائے کہ جیسے ہی یورپ کے بنیوں نے دوکانداری کو حکمرانی کی شکل دی' آزادی کی تحریک شروع ہو گئی تھی' تو واقعات اس دعوے کا بھی ناقابل تردید ثبوت پیش کر دیں گے۔ مگر اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ پچھلی جنگ عظیم (۱۹۱۳ء تا ۱۹۱۸ء) کے بعد تحریک آزادی نے ایک ایسی صورت اختیار کی جو پہلے کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں

تھی۔ جب دلیش باپو گاندھی جی نے "ستیہ آگرہ" کا راستہ اختیار کیا اور عدم تشدد و آہنسا یا مقاومت بالصبر کی طاقت کو جنگ آزادی کا حربہ قرار دیا۔ جب وہ تجویزیں جو خفیہ انجمنوں میں منظور کی جاتی تھیں برملا اسٹیجوں پر پیش کی جانے لگیں اور مقابلہ کے وقت میدان جنگ کو نوجوں سے پاٹ دینے کے بجائے رضاکاروں سے جیل خانوں کو بھرا جانے لگا

یہ پروگرام جنگ آزادی کے پہلے طریقوں سے اتنا مختلف تھا کہ عام طور پر اسی کو تحریک آزادی کا آغاز قرار دیا گیا۔

بیسویں صدی عیسوی کا بیسواں سال (۱۹۱۹ء) ہمیشہ آزاد ہندوستان کی تاریخ میں "صبح صادق" تسلیم کیا جائے گا۔ کیونکہ اسی ۱۹۱۹ء کے مارچ میں ستیہ گرہ کی تجویز منظور کی گئی۔ اسی سال جمعیۃ علماء ہند کے نظام جدید کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ اور اسی سال جلیانوالہ باغ کا وہ مشہور حادثہ پیش آیا جس میں تقریباً ڈیڑھ ہزار ہندوستانیوں نے جنگ آزادی کی مردہ تحریک میں اپنے مظلوم و معصوم خون کے انجکشن سے جان ڈالی اور ایک کامیاب تحریک کی آبیاری کی۔

سیوہارہ کے قریب ٹرین کا حادثہ اسی سال یا اس سے ایک سال پہلے پیش آیا تھا۔

جو نوخیز نوجوان اکسپریس کے حادثہ میں ہمدردانہ ایثار و فدائیت کے جوہر دکھا کر ہر ایک صاحب بصیرت کو حیرت زدہ کر چکا تھا، ناممکن تھا کہ جلیانوالہ باغ کا حادثہ سن کر اس کی رگ حمیت میں جوش نہ آتا اور عواقب و نتائج سے بے پرواہ ہو کر خدمت خلق اور آزادی ملک کے میدان میں مردانہ وار قدم نہ بڑھاتا۔

چنانچہ یہ خود ساختہ والنٹیر جس نے ایکسپریس کے حادثہ میں اپنے مونڈھوں پر لاشیں اٹھائی تھیں، جب جنگ آزادی کا بگل بجا تو وہ خدمت خلق اور ہمدردی ملت کے میدان میں سب سے آگے تھا۔

مولوی مقبول احمد صاحب سیوہاروی اس دور کے چشم دید شاہد اور مجاہد ملت کے رفیق ہیں ان کا مضمون اسی نمبر میں شائع ہو رہا ہے اس میں ان ابتدائی سالوں کی تفصیل موجود ہے۔ ہم بنظر اختصار اس حصہ کو حذف کرتے ہیں۔

مختصر یہ کہ ابھی تک مولانا حفظ الرحمٰن صاحب جو درجات عربی کے طالب علم تھے پوری طرح تحصیل نہیں کر سکے تھے کہ جنگ آزادی نے دلوں میں تڑپ پیدا کی۔ جن جانبازوں اور سرفروشوں نے آگے بڑھ کر ہتکڑیوں

ایک رہنما کی حیثیت سے سب سے پہلا کارنامہ

جمعیۃ علماء ہند کے پلیٹ فارم سے مسلمانوں کو جنگ آزادی میں شرکت کی دعوت

حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب اور ان کے رفقاء اور احباب کے حالات سے واقفیت رکھنے والے اگر یہ خیال کریں کہ آپ کی وہ مخصوص سوسائٹی جس کی رہنمائی حافظ محمد ابراہیم صاحب موجودہ وزیر حکومت ہند اور مولینا بشیر احمد صاحب (بھٹہ) مرحوم کیا کرتے تھے وہ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی ساخت اور پرداخت اور ان کے فطری جوہر کو نکھارنے میں مددگار ثابت ہوئی تو یہ خیال بڑی حد تک صحیح ثابت ہوگا۔ مگر ۱۹۲۹ء میں پہلے گاندھی جی کے ساتھ ڈانڈی کے مارچ میں شریک ہونا۔ وہاں پہونچکر نمک بنانا اور پھر جمعیۃ علماء ہند کے ہونے والے اجلاس میں شرکت۔ کانگریس کی تجویز پیش کرنا۔ یہ اقدامات اس سوسائٹی کی رہنمائی اور اس کے اثر سے نہیں تھے بلکہ خود آپ کی فراست و بصیرت اور آپ کی جرأت مندانہ فطرت کے مدبرانہ تقاضے تھے کیونکہ آپ اس زمانہ میں سیوہارہ، نگینہ اور دہلی سے تقریباً ایک ہزار میل کے فاصلہ پر ڈابھیل ضلع سورت کے جامعہ اسلامیہ میں مدرس عربی کی حیثیت سے مقیم تھے

جہاں تک ہمیں معلوم ہے ڈابھیل کے اس ..... ماحول میں آپ کے خیالات سے متاثر ہونے والے یا آپ کی ہمنوائی کرنے والے صرف ایک رفیق تھے یعنی مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی (ناظم اعلیٰ ندوۃ المصنفین دہلی) لہٰذا اس موقعہ پر جو کچھ مجاہد ملت نے سوچا وہ خود انہیں کا فکر تھا اور جو اقدام کیا وہ خود مجاہد ملت کا فیصلہ تھا۔

جمعیۃ علماء ہند کا اجلاس ۱۹۲۹ء میں قصبہ امروہہ ضلع مرادآباد میں ہو رہا تھا۔ احقر اس زمانہ میں مرادآباد کی مشہور درسگاہ جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مرادآباد میں درس و تدریس کی خدمات انجام دے رہا تھا مرادآباد ضلع کا صدر مقام ہے اور قصبہ امروہہ مرادآباد سے تقریباً اٹھارہ میل کے فاصلہ پر ہے اس لئے مرادآباد کے حضرات بھی اس اجلاس کے داعی اور ذمہ داروں میں شامل تھے۔ مگر احقر اس وقت تک صرف ایک مدرس تھا۔ جس کو اس کے اکابر۔ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ (سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند) اور حضرت الاستاذ مولانا اعزاز علی صاحب (سابق شیخ الفقہ والادب دارالعلوم دیوبند) نے چند ماہ پہلے مدرسہ حنفیہ آرہ۔ شاہ آباد (صوبہ بہار) سے منتقل کر کے یہاں بھیجا تھا۔

البتہ جذبۂ صادق نے اس احقر کو حضرت مولانا سید فخر الدین احمد صاحب مدظلہ العالی اور حضرت مولانا قاری عبداللہ صاحب مرحوم کی پارٹی کا ایک رکن یا ایک رضاکار بنا دیا تھا اور اس بنا پر اس اجلاس سے احقر کا تعلق صرف وزیٹر یا تماشائی کا نہیں تھا۔ بلکہ یہ حیثیت ہوگئی تھی کہ ایک مبصر کی طرح قریب سے قریب ہو کر حالات کا جائزہ لے سکے

ابھی اجلاس میں تقریباً دو ہفتے باقی تھے کہ اخبارات نے اپنے لاکھوں ناظرین کو آگاہ کر دیا کہ

"جمعیۃ علماء ہند کے اجلاس امروہہ میں مولانا حفظ الرحمٰن صاحب تحریک آزادی میں شرکت سے متعلق تجویز پیش کریں گے۔
(جہاں تک یاد پڑتا ہے تجویز کے الفاظ بھی اخبارات میں شائع کر دیئے گئے تھے)

گردش لیل ونہار کے نتائج بھی عجیب وغریب ہوا کرتے ہیں۔ تحریک آزادی میں شرکت کی تجویز جو اس وقت آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کی باعزت زندگی کے لئے بنیادی حیثیت رکھتی ہے ۱۹۲۹ء کے ماحول میں انوکھی، اجنبی، بھیانک اور بعض حلقوں میں نفرت انگیز اور وحشت آفرین تھی۔ کیونکہ آٹھ نو سال کے واقعات نے ہندوستان کی فضا کچھ ایسی بنا دی تھی کہ آزادی غیر متوقع ہی نہیں رہی تھی بلکہ ایک بڑا طبقہ وہ تھا جو تحریک آزادی کو خودکشی کے مرادف سمجھنے لگا تھا۔

وہ کثیر تعداد جو تحریک خلافت ۱۹۱۹ء تا ۱۹۲۲ء میں سرگرم رہ چکی تھی۔ وہ آزادی کی حامی تھی مگر اس کے سامنے بھی ایسی معقول وجوہات تھیں جن کی بنا پر وہ اب تحریک آزادی میں شرکت کے لئے کچھ شرائط ضروری سمجھتی تھی۔

مہاتما گاندھی نے ۱۹۲۲ء میں جب کہ تحریک شباب پر تھی اور بہت بڑی اکثریت کامیابی کو یقینی سمجھتی تھی "چوری چورہ" کے واقعہ سے متاثر ہو کر تحریک کو ختم کر دیا تھا۔

مہاتما گاندھی کے اس عمل سے جو شکوک پیدا ہوئے تھے تقریباً چالیس سال گذر گئے ان کا ازالہ نہیں ہو سکا۔

اعتراض کرنے والے تو گاندھی جی کی نیت پر بھی شک ظاہر کیا کرتے تھے کہ مسلمانوں کی پیش قدمی گاندھی جی کو پسند نہیں تھی۔ لیکن خود گاندھی جی نے جو وجہ بیان کی وہ بھی سی۔ آر۔ داس جیسے لیڈروں کو مطمئن نہیں کر سکی۔

گاندھی جی نے تحریک کی بنیاد "اہنسا" اور عدم تشدد پر رکھی تھی گاندھی جی کا عذر یہ تھا کہ "چوری چورہ" میں چھ کانسٹبلوں کو قتل کر کے عوام نے ظاہر کر دیا ہے کہ "اہنسا" کی تحریک چلانے کی صلاحیت ابھی ان میں پیدا نہیں ہوئی ہے۔

اب مولانا آزاد کا تبصرہ ملاحظہ فرمایئے۔ مولانا آزاد تحریر فرماتے ہیں

"گاندھی جی کے علاوہ اور سب لیڈر (خود مولانا موصوف بھی) جیل میں تھے۔ گاندھی جی نے چورہ چوری کے حادثہ کی وجہ سے تحریک کو معطل کر دیا۔ سیاسی حلقوں میں اس کا شدید ردعمل ہوا اور سارے ملک میں شکست کی فضا پیدا ہوگئی ...... مسٹر سی آر داس کو یقین تھا کہ تحریک بند کرنے میں گاندھی جی نے ایسی غلطی کی ہے جس سے شدید نقصان ہوگا، اس نے سیاسی کام کرنے والوں کی ہمتیں پست کر دی ہیں کہ اب پبلک میں جوش برسوں تک پیدا نہ کیا جا سکے گا۔"

مختصر یہ کہ ایک طبقہ وہ تھا جو اگرچہ تحریک آزادی کا حامی تھا مگر اس کو گاندھی جی کی قیادت پر اعتماد نہیں تھا اسے خطرہ تھا کہ یہ مہاتما اپنے مخصوص عقیدے کی وجہ سے کسی بھی مرحلہ پر بلا استصواب و بلا مشورہ تحریک بند کرنے کی پرانی غلطی دوبارہ لوٹا سکتے ہیں۔

اس کے علاوہ یہ بھی ظاہری اور قدرتی حقیقت تھی کہ انگریزی حکومت چونکہ اس تحریک کا نشانہ تھی تو لازمی بات تھی کہ انگریزی حکومت اور انگریز اپنے جملہ ذرائع عوام کو تحریک آزادی سے برگشتہ کرنے میں صرف کرتے چنانچہ ان کا یہ عمل پوری قوت سے جاری تھا۔

مختصر یہ کہ ۱۹۲۹ء میں چند طبقے وہ تھے جو تحریک کے مخالف تھے اور ان کی کوشش یہ تھی کہ اگر ممکن ہو تو وہ زبانیں کھینچ لی جائیں اور وہ حلقوم ذبح کر دیئے جائیں جن سے نعرۂ آزادی بلند ہو۔

(۱) انگریز۔
(۲) انگریزوں اور اُن کی حکومت کے بہی خواہ
(۳) وہ طبقہ جو تحریک خلافت کی ناکامی سے اتنا مایوس ہو گیا تھا کہ اب اس جدوجہد کو عبث اور بیکار محض سمجھتا تھا۔
(۴) وہ طبقہ جو اگرچہ محب وطن اور حریت پسند تھا، تحریک آزادی کے

لئے قربانیاں بھی پیش کر سکتا تھا لیکن شرکت تحریک سے پہلے چند شرطیں تسلیم کرا لینی ضروری سمجھتا تھا

ان سب کے برخلاف صرف ایک جماعت وہ تھی جو آزاد ہندوستان میں ہر ایک فرقہ اور ملت کی باوقار زندگی کیلئے ایک فارمولے کی ضرورت تو ضرور محسوس کرتی تھی لیکن اب جبکہ جنگِ آزادی شروع ہو رہی ہے اور انگریز اور اُس کے تمام ہوا خواہ اس کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور صرف کر رہے ہیں اور یہ بات قطعاً ناممکن ہے کہ اس پُر آشوب فضا میں کوئی فارمولا متفقہ طور پر طے ہوجائے اور یہ بات قطعاً ممکن ہے بلکہ یقینی ہے کہ مسٹر جناح نے اگر ۱۴ نکات پیش کئے ہیں تو جیسے ہی ان ۱۴ نکات کی منظوری کا وقت آئے اسی شدومد سے ۱۴ نکات کا کوئی دوسرا فارمولا اُبھر کر سامنے آجائے اور جب یہ چکر چل رہا ہو تو انگریز کی موجودگی میں آزادی کی جنگ کبھی شروع نہیں ہو سکے گی اور اگر شروع ہوگی تو مسلمان اُس میں شرکت نہیں کر سکیں گے جو نتیجہ کے لحاظ سے مسلمانوں کی سیاسی موت ہوگی ۔

اس جماعت میں وہ رہنما شریک تھے جن کو نیشلسٹ اور قوم پرور کہا جاتا تھا اور ان میں بھاری اکثریت علماء کرام کی تھی ۔ ان حضرات کے گہرے غور و فکر نے ایک اور سوال بھی ان کے سامنے رکھا تھا ۔

سوال یہ تھا کہ گذشتہ چند سال کے واقعات نے اگرچہ مسلمانوں کو تحریکِ آزادی سے الگ کر دیا ہے اور مہاتما گاندھی کی شخصیت بھی اُن میں اس درجہ مقبول نہیں رہی ہے مگر یہی تحریک ہندوؤں کے بڑے حلقہ میں جڑ پکڑ چکی ہے اور گاندھی جی نے اس حلقہ میں یہ مقبولیت حاصل کر لی ہے کہ وہ صرف اونچے درجہ کے رہنما یا لیڈر نہیں رہے بلکہ اُن کا شمار ہندوستان کے رشیوں میں ہونے لگا ہے یہاں تک کہ نام سے زیادہ "مہاتما" کا خطاب مقبول اور زبان زد ہو چکا ہے ۔

مہاتما گاندھی اپنی اس مقبولیت کی طاقت کے ساتھ تحریک شروع کر چکے ہیں اور ہندوستان کا ہر ایک شہر اور ہر ایک حلقہ اس سے متاثر ہو چکا ہے ۔ تو کیا مسلمانوں کے مستقبل کے لئے یہ درست ہوگا کہ وہ محض تماشائی رہیں یا انگریز کے دست و بازو بن جائیں ۔

جمعیۃ علماء ہند کا بھی اجلاس جس کا تذکرہ پہلے آچکا ہے، اسی اجلاس کی سبجکٹ کمیٹی میں مولانا سید سلیمان صاحب جیسے دیدہ ور مفکر نے تقریر فرماتے ہوئے کہا تھا ۔

انقلاب کی تحریک جب شروع ہو جاتی ہے تو تاریخ کی شہادت یہی ہے کہ وہ بے نتیجہ ختم نہیں ہوتی - بے شک اس کو مختلف حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ نیست و نابود معلوم ہونے لگتی ہے لیکن اس کی خاک میں چھپی ہوئی چنگاریاں پھر دہکتی ہیں اور شعلہ بن کر مخالف طاقتوں کو نذرِ آتش کر دیتی تھیں ۔ اب کیا مسلمان یہ پسند کریں گے کہ مخالفِ انقلاب طاقتوں کا ضمیمہ بن کر وہ بھی نذرِ آتش ہو جائیں یا ساحل پر کھڑے ہوئے طوفان کا تماشہ دیکھتے رہیں اور جب طوفان ختم ہو تو وہ اپنی سیاسی حیثیت بھی ختم کر چکے ہوں اور اُن کا شمار بھی اُنہیں پسماندہ قوموں میں ہو جن کے لئے ہندوستان میں نفرت و حقارت کی پالیسی ہمیشہ کے لئے طے ہو چکی ہے ۔

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تقریر میں فقہی نقطۂ نظر سے روشنی ڈالی اور اُن چند علماء کی تردید کی جو انگریزوں کو "اولی الامر" کی حیثیت دیکر اُن کے خلاف "سول نافرمانی" کی تحریک کو ناجائز قرار دے رہے تھے جن کی پشت پناہ ایک نواب صاحب اور چند سر صاحبان تھے جو علماء دیوبند سے اپنے پُرانے تعلقات کا واسطہ دیتے ہوئے اسی لئے شریکِ اجلاس ہوئے تھے کہ معاذ اللہ گمراہ مولویوں کو راہِ راست پر لائیں ۔

بھاؤ تاؤ اور لین دین کے نظریہ سے آپ قوم پرور مسلمانوں اور علماء کرام کے حق میں جو چاہیں فیصلہ کریں مگر حریت پسندی، عزتِ نفس، خودداری اور باوقار مستقبل کے جذبات کا تقاضا یہی تھا جس کی دعوت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے دی تھی ۔ یہی سبب ہے کہ جو "حوصلہ مند" عمل کے وقت لیت و لعل کے عادی نہیں تھے اُن کا تعلق خواہ کسی بھی مذہبی فرقہ اور مکتبۂ خیال سے تھا وہ جمعیۃ علماء کے ساتھ ہو گئے تھے ۔

اب یہ کہنا تو قطعاً غلط ہوگا کہ ابو القاسم مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب کی تجویز نے حضرات علماء کو جنگِ آزادی میں شرکت کی طرف متوجہ کیا کیونکہ اگر مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب تحریک نہ کرتے تب بھی جمعیۃ علماء ہند کا فیصلہ یہی ہوتا ۔ البتہ یہ درست ہے کہ مولانا مرحوم کے اس اقدام نے حضرت علامہ مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب - حضرت علامہ مولانا انور شاہ صاحب کاشمیری - حضرت علامہ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مہتمم

دار العلوم دیوبند، حضرت مولانا ابوالکلام آزاد، ابوالمحاسن مولانا محمد سجاد صاحب نائب امیر شریعت صوبہ بہار حضرت علامہ مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی سحبان الہند حضرت مولانا احمد سعید صاحب رحمہم اللہ جیسے اکابر اور مشاہیر کی موجودگی میں نوجوان مولانا حفظ الرحمٰن کو قائدانہ حیثیت دیدی اور غالباً اسی وقت سے آپ کو جمعیۃ علماء ہند کی مجلس عاملہ کا رکن بنا لیا گیا

اس موقع پر یہ عرض کر دینا بھی ایک تاریخی انکشاف ہے کہ جلسہ عام میں جس نے اس تحریک کی تائید کی وہ ہندوستان کے مشہور خطیب حضرت مولانا عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری رحمۃ اللہ تھے جن کی شعلہ بار تقریر نے جس کا سلسلہ تقریباً تین گھنٹہ تک جاری رہا تھا بہت سے دلوں کی دنیا بدل دی۔ جن میں سے ایک خود یہ راقم الحروف بھی ہے کہ پہلے صرف ایک گوشہ نشین مدرس تھا اور اب جنگ آزادی کا سپاہی بن گیا جس کو قید و بند اور دار و رسن کے خواب آنے لگے۔

جامعہ اسلامیہ ڈابھیل سے تعلق اور علیحدگی

مجاہد ملت مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب نے تمام تعلیم خود اپنے وطن قصبہ سیوہارہ میں اور کچھ عرصہ جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مراد آباد میں حاصل کی۔ فراغت کے بعد آپ حضرت علامہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے حلقہ درس حدیث میں داخل ہونے کے لئے دیوبند تشریف لے گئے جہاں آپ نے دورۂ حدیث مکمل کیا۔ اسی ایک سال کے مختصر قیام میں حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند کی بصیرت و فراست نے آپ کو دار العلوم دیوبند کے لئے منتخب کر لیا تھا۔ چنانچہ فراغت کے بعد ہی آپ کو حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب نے پہلے مدراس بھیجا جہاں کسی مدرسہ میں درس کے ساتھ تبلیغ اور مناظرہ کی خدمت بھی آپ کے سپرد کی گئی اور جب آپکی قابلیت کے جوہر میدان میں کھل کر سامنے آ گئے ...... تو اگلے سال آپ کو دار العلوم دیوبند میں معین المدرسین کی حیثیت سے خدمت تدریس سپرد کر دی۔ مگر جب کچھ دنوں بعد دار العلوم دیوبند میں تحریک اصلاح نے قوت اختیار کی تو آپ بھی حضرت علامہ کشمیری، حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی، حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب وغیرہ اساتذہ دار العلوم کے ناراض گروپ کے ساتھ ڈابھیل تشریف لے گئے۔ تقریباً تین سال وہاں جامعہ اسلامیہ میں قیام رہا اور جب ۱۹۲۹ء میں جنگ آزادی کا بگل بجا تو جیسے ہی آپ نے جنگ آزادی میں شرکت کی تحریک پیش کی جامعہ اسلامیہ ڈابھیل سے علیحدگی کا بھی تہیہ کر لیا۔ چنانچہ اس اجلاس سے چند ماہ بعد آپ گرفتار ہوئے اور میرٹھ سنٹرل جیل میں محبوس کر دیئے گئے

اس موقع پر آپ کو حضرت مولانا ابوالکلام آزاد سے تعلقات بڑھانے اور فیض صحبت حاصل کرنے کا موقع ملا کیونکہ وہ بھی اسی جیل خانہ اور اسی احاطہ میں تھے مگر وہ بیرک میں نہیں رہتے تھے بلکہ ایک چھولداری میں ان کا اسپیشل انتظام تھا "رکھ رکھاؤ" اور عزلت پسندی جو مولانا آزاد کے مزاج پر غالب تھی وہ یہاں بھی کارفرما تھی۔ اس لئے خاص اوقات ہی میں مولانا سے ملاقات ہوا کرتی تھی۔ اگرچہ علمی مذاکرہ اور سیاسی بحث و نظر کے باعث وہ خاص خاص ملاقاتیں بھی کیمیا کا اثر رکھتی تھیں۔

میرٹھ کے مشہور وکیل پیارے لال شرما جو اپنے اخلاق و کردار، تہذیب و شرافت میں اپنی مثال آپ تھے جو ۱۹۳۷ء میں جب کانگریس نے پہلی مرتبہ منسٹری سنبھالی تو یوپی میں وزیر تعلیم بھی بنائے گئے تھے وہ بھی اسی جیل میں تھے۔

حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کے رات دن کے رفیق، ہم نفس اور ہمدم مولانا بشیر احمد صاحب بھٹہ تھے جن کو قدرت نے اسی جیل خانہ اور اسی بیرک میں اس لئے رکھا تھا کہ رات دن ہنستے رہیں اور دوسروں کو ہنساتے رہیں۔ افسوس اب یہ سب وفات پا چکے۔ آن قدح بشکست و آن ساقی نماند
اب کوئی ایسا بھی نہیں رہا جس سے کچھ مزید حالات معلوم کئے جاسکیں۔

۱۹۲۹ء سے ۱۹۳۲ء تک
جنگ آزادی کے مختلف دور

۱۹۲۶ء میں گاندھی جی کے ڈانڈی مارچ۔ اور نمک سازی کی تحریک سے جنگ آزادی کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا وہ گاندھی اروِن پیکٹ کے بعد مارچ ۱۹۳۱ء میں عارضی طور پر ملتوی کیا گیا۔ اس پیکٹ کے نتیجہ میں جتنے سیاسی قیدی جیلوں میں تھے سب رہا کر دیئے گئے۔ حضرت مولانا سید فخر الدین احمد صاحب موجودہ صدر جمعیۃ علماء ہند و شیخ الحدیث دار العلوم دیوبند اور ان کا خادم یہ راقم حروف اور ہمارے بہت سے ساتھی جو اکتوبر ۱۹۲۹ء میں گرفتار کئے گئے تھے اس عام رہائی سے بہرہ اندوز ہوئے کیونکہ ہماری سزا ایک سال کی تھی اور ابھی تقریباً نصف مدت ہی ختم ہوئی تھی مگر مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب اس سے بہرہ یاب نہیں ہوئے کیونکہ وہ ہم

سے چند ماہ پہلے گرفتار ہوئے تھے، اور ان کی مدت سزا چھ ماہ تھی جو غالباً ۱۹۲۹ء کے آخر میں ختم ہو چکی تھی۔

مگر یہ رہائی پائیدار نہیں ثابت ہوئی۔ گول میز کی تجویز جو خداوندان برطانیہ کے پیش نظر تھی اور مقصود یہ تھا کہ گاندھی جی کو اس میں شریک کیا جائے جب تک یہ مقصود پورا نہیں ہوا۔ یہ صلح قائم رہی اور جب یہ کانفرنس ناکام رہی تو ابھی گاندھی جی ہندوستان لوٹنے بھی نہیں پائے تھے کہ نئے وائسرائے لارڈ ولنگڈن کی حکومت نے داروگیر کی تیاریاں شروع کر دیں اور گاندھی جی کی واپسی کے بعد ابھی تین ماہ بھی نہیں گذرے تھے کہ حکومت نے گرفتاریاں شروع کر دیں اور اس طرح تحریک دوبارہ زندہ ہو گئی۔

اس مستقبل کا اندازہ قوم پرور طبقہ اور جنگ آزادی کے رہنماؤں کو پہلے سے تھا چنانچہ وہ بھی اس عرصہ میں خاموش نہیں رہے۔ بلکہ تیاریاں کرتے رہے۔

جمعیۃ علماء ہند کا ادارۂ حربیہ

"تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کو اس موقع پر یہ بات خاص طور سے نوٹ کر لینی چاہیئے کہ جمعیۃ علماء ہند نے جب ۱۹۲۹ء میں جنگ آزادی میں شرکت طے کی تھی تو ساتھ ہی یہ بھی طے کر لیا تھا کہ اس کا پلیٹ فارم علیحدہ ہوگا۔ اس کے رضاکاروں کا نظام بھی علیحدہ رہے گا۔ گرفتاریوں کا پروگرام بھی جمعیۃ علماء ہند اپنے ارکان اور کارکنوں کے لئے علیحدہ بنائیگی اور اگر مقدمات وغیرہ کے سلسلہ میں مصارف کی ضرورت ہوگی تو اُن کا انتظام بھی جمعیۃ علماء اپنے طور پر کریگی۔ کانگریس یا کسی اور پارٹی کی طرف نظر نہیں اُٹھائے گی۔ اب ۱۹۳۲ء میں جب تحریک میں دوبارہ جان پڑی تو اس کو زندہ رکھنے کے لئے غذا کی ضرورت تھی۔ پروگرام کے مطابق سول نافرمانی کرتے ہوئے گرفتار ہوجانا تحریک کی غذا تھی۔

مگر اس مرتبہ اس غذا کا فراہم کرنا کانگریس اور "جمعیۃ علماء" دونوں کے لئے مشکل ہو رہا تھا۔ کیونکہ اوّل تو مسلسل تین سال گزر جانے کے بعد کارکنوں کے جوش عمل میں اضمحلال پیدا ہو جانا ایک قدرتی امر تھا اس کے علاوہ ولنگڈن گورنمنٹ نے اس مرتبہ تحریک شروع ہونے سے پہلے ہی صف اوّل کے تمام لیڈروں کو گرفتار کر لیا تھا۔ مزید برآں ضبطی جائداد اور گرفتاریوں کے سلسلہ میں بھی حکومت کی پالیسی پہلے سے نہایت زیادہ سخت ہو گئی تھی۔ ان تمام حالات کی بنا پر اگرچہ کام بہت مشکل ہو گیا تھا مگر ان حالات کا تقاضا یہی تھا کہ تحریک کی رگوں اور پٹھوں میں تقویت کے انجکشن اس پردہ داری کے ساتھ لگائے جائیں کہ سی آئی ڈی کی نظر تفتیش اُن ڈاکٹروں تک نہ پہونچ سکے جو انجکشن کی سوئیاں ہاتھ میں لئے ہوں۔

عام طور پر پروگرام یہ ہوا کرتا تھا کہ ہفتہ میں ایک یا دو مرتبہ رضاکاروں کے جتھے بھیجے جاتے تھے جو برسر عام قانون کی خلاف ورزی کرتے تھے اور گرفتار کرلئے جاتے تھے۔ عام طور پر دفعہ ۱۴۴ نافذ رہتی تھی۔ رضاکاروں کے جتھے خلاف قانون نعرے لگاتے تھے۔ جو جماعتیں خلاف قانون قرار دیدی جاتی تھیں اُن کا پرچم لہراتے یا اُن کا لٹریچر تقسیم کرتے تھے اور جب وہ جلوس بنا کر چلتے تھے تو دفعہ ۱۴۴/۱۸۸ کی خلاف ورزی بھی ہو جاتی تھی پولیس کی کوشش یہ رہتی تھی کہ وہ یہ معلوم کرے کہ رضاکاروں کا جتھا کہاں سے روانہ ہوگا۔ تاکہ روانگی سے پہلے ہی ان کو گرفتار کرلے اور یہ نہ ہو سکے تو جیسے ہی جتھہ روانہ ہو فوراً گرفتار کرلے تاکہ شہر میں خلاف قانون اقدام کا مظاہرہ نہ ہو سکے۔

پورے ملک میں سول نافرمانی اور خلاف ورزی قانون کے اس نظام کو زندہ رکھنے کے لئے ایک مستقل نظام کی ضرورت تھی چنانچہ کانگریس نے جنگی کونسل قائم کر دی تھی اور جمعیۃ علماء ہند نے اپنے اس نظام کے لئے عربی کا لفظ "ادارہ حربیہ" منتخب کیا تھا۔

وہ زمانہ بھی عجیب تھا۔

جمعیۃ علماء ہند کے صدر مفتی اعظم حضرت مولانا محمد کفایت اللہ صاحب اور ناظم اعلیٰ سحبان الہند حضرت مولانا احمد سعید صاحب تھے مگر وہ ڈاکٹر جس کو بہت سے انجکشن دیئے گئے تھے۔ ابو المحاسن مولانا سجاد صاحب (نائب امیر شریعت صوبہ بہار) تھے۔ رحمہم اللہ "ادارۂ حربیہ" کے کلید بردار یہی حضرت تھے۔

جمعیۃ علماء ہند کے دفتر سے علیحدہ محلہ بلی ماران کی ایک تاریک گلی میں ایک مکان لے لیا گیا تھا۔ حضرت مولانا سجاد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا قیام اسی مکان میں رہتا تھا جس کا علم دفتر کے لوگوں میں سے بھی غالباً صرف قاضی اکرام الحق صاحب کو تھا جماعت کے جو حضرات اسی ادارہ کی ضرورت سے حضرت موصوف سے ملاقات کرنا چاہتے تھے تو قاضی اکرام الحق صاحب ہی اُن کے رہبر بنتے تھے۔

ہمیں یہاں یہ عرض کرنا ہے کہ حضرت مولانا سجاد صاحب کے دست راست

اور "نفس ناطقہ" یہی رفیق محترم مجاہد ملت رحمۃ اللہ علیہ تھے جن کو نظام رضاکاران کا ناظم اعلیٰ یا کمانڈر بنایا گیا تھا اور ان کا کام یہ تھا کہ ملک میں گھوم پھر کر تحریک کا جائزہ لیں اور اس نظام کو کامیاب بنائیں۔

وہ وقت یاد آتا ہے۔ احقر مدرسہ شاہی میں ملازم تھا۔ اور فاضل وقت اور لمبا اوقات رخصت لیکر مدرسہ کا بھی وقت اسی تماشے میں صرف کیا کرتا تھا۔

مرادآباد میں خفیہ طریقہ سے مجاہد ملت رح کی تشریف آوری کا پروگرام پہونچا۔ چند ساتھیوں کے ساتھ احقر استقبال کے لئے اسٹیشن پر حاضر ہوا۔

آجکل دہلی جنکشن سے ایک پاسنجر دس بجکر دس منٹ پر مرادآباد جاتا ہے۔ یہی پاسنجر اس زمانہ میں بھی تقریباً اسی وقت دہلی سے روانہ ہوتا تھا اور تقریباً ساڑھے تین بجے مرادآباد پہونچا کرتا تھا۔ مجاہد ملت اسی ٹرین سے مرادآباد پہونچنے والے تھے۔ چنانچہ ٹھیک وقت پر پہونچے۔ مگر حسب معمول سادہ لباس میں ملبوس کھدر کی شیروانی بھی کسی قدر بوسیدہ تھی۔ کچھ ظرافت پسند دوستوں نے عرض بھی کیا کہ کمانڈر صاحب کو تو فوجی لباس میں ملبوس ہونا چاہیئے۔ مجاہد ملت رحمۃ اللہ علیہ کا خاموش تبسم اس کا جواب تھا۔ مگر اس زمانہ میں ایسے عہدوں کی عمر بہت کم ہوتی تھی۔ " اگر ماند شبے ماند شبے دیگر نمی ماند" چنانچہ چند روز بعد ہی مجاہد ملت گرفتار کر لئے گئے۔ مقدمہ چلا۔ لیکن مقدمہ کامیاب نہیں ہوا۔ یعنی حضرت مجاہد ملت پر جرم ثابت نہ ہو سکا۔ اس مرتبہ مجاہد ملت رہا ہوگئے۔ البتہ اس اثناء میں احقر گرفتار ہوگیا۔

حضرت مجاہد ملت رحمۃ اللہ علیہ کے تذکرہ میں خصوصاً اس موقع پر اپنا تذکرہ مناسب نہیں ہے۔ کیونکہ مجاہد ملت رح کی حیثیت اس وقت آل انڈیا ہو چکی تھی۔ وہ کانگریس میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ممبر تھے اور نظام جمعیۃ علماء ہند میں وہ آل انڈیا جمعیۃ علماء ہند کی مجلس عاملہ کے ممبر اور آل انڈیا جمعیۃ علماء ہند کے ادارۂ حربیہ کے افسر انچارج یا کمانڈر تھے اور احقر کی حیثیت صرف یہ تھی کہ مدرسۂ شاہی مرادآباد کا مدرس اور جمعیۃ علماء شہر مرادآباد کا ناظم تھا۔ اس موقع پر لفظ لیڈر استعمال کرنا درست ہو تو مختصر تعبیر یہ ہے کہ احقر مقامی لیڈر تھا اور مجاہد ملت آل انڈیا لیڈر تھے۔ مگر خوش قسمتی سے ایک مرتبہ جیل کاٹ چکا تھا اس بنا پر ایک خاص امتیاز حاصل ہوگیا تھا۔

دوسرا امتیاز یہ تھا کہ احقر کو جمعیۃ علماء ہند کا نواں ڈکٹیٹر نامزد کیا جا چکا تھا۔ اس کی تشریح یہ ہے کہ اس زمانہ میں کانگریس خلاف قانون جماعت قرار دی جا چکی تھی۔ اور جمعیۃ علماء ہند کو اگرچہ انگریزی ڈپلومیسی نے خلاف قانون جماعت قرار نہیں دیا تھا (تاکہ خود انگریزی حکومت کے عمل سے اس کے اس دعوے کی تردید نہ ہو جائے کہ مسلمان تحریک آزادی میں شریک نہیں ہیں) مگر عمل جمعیۃ علماء ہند کے ساتھ ایسا ہی تھا جیسا کسی خلاف قانون جماعت کے ساتھ ہو سکتا ہے۔ اس کے دفتر پر پولیس کے چھاپے پڑتے رہتے تھے۔ نمایاں کارکنوں کو گرفتار کر لیا جاتا تھا وغیرہ وغیرہ۔

بہرحال کانگریس اور جمعیۃ علماء ہند دونوں نے اس زمانہ میں مجلس عاملہ اور صدر سکریٹری وغیرہ کے عہدے ختم کر کے "ڈکٹیٹرشپ" قائم کر دی تھی۔ ڈکٹیٹر ہی نظام چلاتا تھا اور جب وہ گرفتار ہو جاتا تھا تو اپنی گرفتاری کے وقت اپنے جانشین ڈکٹیٹر کا اعلان کر دیتا تھا۔

ایسے حضرات کی فہرست خفیہ طور پر پہلے سے تیار کر لی گئی تھی جو ڈکٹیٹر بنائے جائیں اور اُن کی ترتیب بھی مقرر کر دی گئی تھی۔ جہاں تک یاد آتا ہے حضرت علامہ مولانا محمد کفایت اللہ صاحب مفتی اعظم ہند پہلے ڈکٹیٹر تھے۔ پھر شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی (رحمہما اللہ) سحبان الہند حضرت مولانا احمد سعید صاحب غالباً تیسرے ڈکٹیٹر تھے اور یہ بھی خیال آتا ہے کہ وہ پہلے گرفتار ہو چکے تھے اس لئے اُن کا نام ڈکٹیٹروں کی فہرست میں نہیں آسکا تھا بہرحال احقر کو اپنے متعلق یہ بات یاد ہے کہ وہ جمعیۃ علماء ہند کا نواں ڈکٹیٹر تھا۔ (اس زمانہ کا تمام ریکارڈ پولیس کے چھاپوں اور باقی ماندہ دیمک کی نذر ہو چکا لہذا بختہ بات عرض کرنی مشکل ہے) علاوہ ازیں ایسی باتیں ریکارڈ میں رکھی بھی نہیں جاتی تھیں ان کو یا تو ذہنوں میں محفوظ رکھا جاتا یا انفرادی یادداشتوں میں۔ اور یہ شرف غالباً احقر کے لئے ہی مخصوص تھا کہ ساتھ ساتھ اتر پردیش کانگریس کمیٹی (جو اس زمانہ میں کانگریس کمیٹی صوبجات متحدہ تھی) اس کا بھی ڈکٹیٹر احقر ہی تھا۔

بہرحال حضرت مجاہد ملت رح کے تذکرہ میں اپنا تذکرہ مناسب نہیں تھا مگر یہ ایک تاریخی حقیقت سپرد قلم کرنی تھی کہ اس زمانہ میں کانگریس اور جمعیۃ علماء دونوں کی طرف سے گرفتاری کے لئے "ڈکٹیٹرشپ کا نظام قائم کیا گیا تھا۔ اس تاریخی انکشاف کے علاوہ ایک خاص لطیفہ بھی یہاں دلچسپی پیدا کریگا۔ لطیفہ ملاحظہ فرمایئے۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے اس نظام کی کلید حضرت ابوالمحاسن

مولانا سجاد صاحب رحمۃ اللہ کے دست مبارک میں تھی موصوف کی
ہدایت اس احقر کے لئے یہ تھی کہ ہر ہفتہ جمعہ کی صبح کو مراد آباد سے چل کر
دہلی پہونچا کرے اور نماز جمعہ کے بعد جامع مسجد میں تقریر کرکے واپس
ہوجایا کرے۔

چند جمعے اس طرح گذرے۔ مراد آباد سے تقریباً ۵ بجے صبح کو
گاڑی چلتی تھی (جیسا کہ آجکل بھی چلتی ہے) احقر اس ٹرین سے تقریباً
ساڑھے دس بجے دہلی پہونچتا تھا۔ اسٹیشن پر ہی کوئی صاحب موجود ہوتے
جو احقر کو احتیاط سے طے کردہ مقام پر پہونچا دیتے تھے۔ پھر اسی احتیاط سے
رقیبوں کی نظروں سے بچاتے ہوئے جامع مسجد پہونچاتے اور تقریر کے
فوراً بعد اسی احتیاط سے کسی صاحب کی رہنمائی میں صوبہ دہلی کی حدود
سے باہر پہونچا دیتے تھے۔ پولیس جب تلاش کرتی تو اس کو اپنی ناکامی پر
کافی جھنجلاہٹ ہوا کرتی تھی۔

جمعہ کا دن تھا۔ احقر حسب ہدایت مراد آباد سے دہلی پہونچا۔ اس
روز پولیس پوری طرح چوکنی تھی اور احقر کی گرفتاری کا سامان اس نے
مکمل کر رکھا تھا۔ حضرت مولانا سجاد صاحب کو اس کا علم تھا۔ مولانا
موصوف نے نماز جمعہ کے لئے احقر کو خفیہ راستوں سے روانہ فرمایا
تو احقر کے رہبر قاضی اکرام الحق صاحب کو تاکید کردی کہ نماز کے بعد
جنوبی دروازہ سے احقر کو نہ نکالیں۔ اس طرف پولیس چوکی ہے اور آج
چوکی کے علاوہ بھی پولیس کا انتظام ہے بلکہ شمالی دروازہ کے سامنے تانگہ تیار
رکھیں اور اسی راستہ سے نکال کر لائیں۔ اس طرف پولیس نہیں ہوگی۔

قاضی اکرام الحق صاحب سہو و نسیان کے پرانے مریض ہیں یہاں
بھی وہ اس ہدایت سے ایسے غافل ہوگئے کہ خاص طور پر ممنوعہ راستہ
ہی پر تانگہ کا انتظام کیا۔ یعنی جنوبی پھاٹک سے ہی احقر کو لیکر آئے جہاں
پولیس کی چوکی ہے پھر راستہ بھی چاوڑی بازار کے علاوہ چاندنی چوک کی طرف
کا اختیار کیا۔ چنانچہ جیسے ہی کوتوالی کے سامنے تانگہ پہونچا۔ سی آئی ڈی کے
سب انسپکٹر نے جو جامع مسجد سے ہی تانگہ کے پیچھے لگ لیا تھا اور اطمینان
سے اپنی سائیکل پر ہمارے پیچھے پیچھے چلا آرہا تھا۔ اس سب انسپکٹر نے
تانگہ رکوالیا اور احقر کو پورے اعزاز کے ساتھ تانگہ سے اتار کر حوالات
میں پہونچا دیا۔

اس حوالات میں مولانا منت اللہ صاحب موجودہ امیر شریعت صوبہ بہار
صبح سے قیام پذیر ہوچکے تھے اور چند ساتھی اور بھی تھے جو اسی روز یا اگلے
روز آئے۔

غالباً اگست کا مہینہ تھا۔ شدید گرمی۔ حوالات سب طرف سے بند۔
کہیں نہ روشن دان نہ کھڑکی صرف ایک جانب میں دروازہ کے دو طرف
جنگلے تھے۔ مگر سامنے چوڑا برآمدہ تھا جس کی وجہ سے یہ جنگلے بھی ہوا سے
ناآشنا رہتے تھے۔

پیشاب۔ پاخانہ کے لئے صبح کو ۹ بجے ایک گھنٹہ کے لئے کھولا جاتا تھا باقی ۲۳
گھنٹہ اسی کمرہ میں بند رہتے تھے۔ یہیں وضو بھی کیا جاتا تھا۔ پانی نکلنے کی
کوئی نالی نہیں تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وضو کا پانی کمرہ ہی میں بھرتا رہا حسن اتفاق
یہ تھا کہ کمرہ میں ڈھال کافی تھا پانی اسی ڈھال میں رہتا تھا۔ رفتہ رفتہ صورت
یہ ہوگئی کہ کمرہ کے نصف حصہ میں پانی بھر گیا اور نصف حصے میں ہمارے چھ
یا سات ساتھیوں کے بستر تھے اور پرلطف بات یہ تھی کہ اسی تھانہ "کوتوالی"
کے سب انسپکٹروں میں ایک بزرگ سید اصغر حسین صاحب بھی تھے جو احقر
کے چچازاد برادر محترم تھے۔ ان کو صدمہ تھا کہ میرا بھائی (محمد میاں) کانگریس
کے چکر میں آکر گمراہ ہوگیا۔

افسوس اب ان کی بھی وفات ہوگئی۔ اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔

ایک ہفتہ کے بعد ہمیں حوالات سے نجات ملی اور ۶ ماہ کے لئے دہلی میں
داخلہ ممنوع قرار دیدیا گیا۔

اگست کے مہینہ میں اس حبس بے جا کا اثر یہ ہوا کہ تمام ساتھیوں کو کچھ
عوارض لاحق ہوگئے احقر کو پیچش ہوگئی۔

احقر دہلی سے رہا ہوکر دیوبند پہونچا جہاں والدہ صاحبہ اور احقر کے
متعلقین تھے۔ پھر فوراً ہی مراد آباد چلا گیا۔ جہاں صوبہ یوپی کانگریس
کمیٹی کے ڈکٹیٹر کی حیثیت سے گرفتاری کا پروگرام طے تھا۔ سی آئی ڈی
احقر کی تفتیش میں رہی ہوگی اور ممکن ہے اس کو حیرت ہوئی ہو جب احقر
دفعتاً مراد آباد کے چوک بازار میں اس حالت میں نمودار ہوگیا کہ ایک ہاتھ
میں کانگریس کا جھنڈا تھا دوسرے میں جمعیۃ علماء ہند کا۔

ایک عزیز دوست پنجابی سوداگر حافظ محمد شفیع صاحب نے آگے
بڑھ کر سنہری ہار گلے میں ڈالا جس کو احقر نے منظور کیا۔ کیونکہ ہار پہننے
اور پہنانے کے لئے اس سے بہتر وقت کوئی نہیں ہوسکتا تھا۔ چند منٹ
بھی نہیں گذرے تھے کہ حاضرین کے اجتماع نے جلوس کی شکل اختیار کرلی
اور اب یہ جلوس جس کی قیادت محمد میاں کر رہا تھا جس کے دونوں ہاتھ اس
طرح گھرے ہوئے تھے کہ ایک میں ایک جھنڈا تھا اور دوسرے میں دوسرا

اور گلے میں قرآن شریف) امروہہ گیٹ کی طرف بڑھنے لگا ابھی تقریباً ایک فرلانگ چلا تھا کہ پولیس کے دستے نے آکر محاصرہ کر لیا۔ احقر کو گرفتاری کا حکم سنا کر اپنی تحویل میں لے لیا اور مجمع کو منتشر کرنے کے لئے لاٹھی چارج شروع کر دیا۔

احقر حوالات میں پہونچا تو تھوڑی دیر بعد حافظ شفیع الدین صاحب بھی وارد ہوئے۔ جرم یہ تھا کہ کانگریس اور جمعیۃ کے ڈکٹیٹر کو ہار کیوں پہنایا تھا۔ پھر ابھی انگریزی حساب سے یہ تاریخ ختم نہیں ہوئی تھی یعنی رات کے بارہ نہیں بجے تھے کہ مرادآباد کانگریس کے تمام سربراہ جن کی تعداد سترہ تھی گرفتار کر کے احقر کے ساتھی بنا دیئے گئے۔

چند روز مقدمہ ہوا، چھ ماہ کی سزا بامشقت کلاس "سی" اور مشقت میں احقر اور موجودہ کیبن ڈپٹی منسٹر یو پی (دادو دیال کھنہ) کو چکی دی گئی۔ لیکن حکیم انتظار احمد صاحب وغیرہ نے (جو گرفتاری سے محفوظ تھے) فوراً دوڑ دھوپ شروع کر دی۔ یوپی کے گورنر صاحب رخصت لے کر یورپ گئے ہوئے تھے اور ان کی جگہ نواب احمد سعید خاں صاحب آف چھتاری۔ فرائض گورنری انجام دے رہے تھے۔ منسٹر وغیرہ اس زمانہ میں برائے نام ہوتے تھے۔ جملہ اختیارات گورنر ہی کو ہوا کرتے تھے۔ بہرحال نواب صاحب کو جیسے ہی توجہ دلائی گئی احقر اور دادُ دیال کھنہ اور چند ساتھیوں کا درجہ سی کے بجائے "بی" کر دیا۔ تیسرے ہی دن اس کے آرڈر آ گئے اور ہمیں جس طرح (سی کلاس) سے نجات ملی۔ چکی کی مشقت سے بھی نجات مل گئی۔

گھنٹہ گھر پر خلاف قانون کانگریس کا جلسہ اور مجاہد ملت کی شرکت

۱۹۳۲ء میں تحریک کی حالت پر گفتگو ہو رہی تھی احقر نے اس سے ناجائز فائدہ اٹھایا اور حضرت مولانا کے تذکرہ میں اپنے تذکرہ کا بھی پیوند لگا دیا۔ ناظرین محترم اس جرأت کو معاف فرمائیں اس کا کفارہ یہ ہے کہ حضرت مجاہد ملت رحمۃ اللہ علیہ کی حیات طیبہ کا ایک نہایت عجیب واقعہ پیش کیا جا رہا ہے۔ امید ہے کہ ناظرین کرام محظوظ ہوں گے۔

انڈین نیشنل کانگریس کمیٹی اور اس کی تمام شاخیں خلاف قانون تھیں کہیں کوئی اجلاس نہیں ہو سکتا تھا۔ مگر اس کے باوجود کانگریس نے طے کیا کہ اس کا سالانہ اجلاس حسب معمول ہوگا۔

صدر کا انتخاب کیا گیا۔ تاریخ مقرر کی گئی۔ وقت بھی مقرر کر دیا گیا اور نہایت دلچسپ بات یہ ہے کہ اجلاس کا مقام دہلی کا گھنٹہ گھر تجویز کیا گیا جو چاندنی چوک جیسے مصروف مقام پر تھا جو اس زمانہ میں دہلی کا سب سے زیادہ پُررونق بازار تھا جہاں سے چند قدم کے فاصلہ پر دہلی کا سب سے بڑا تھانہ کوتوالی ہے۔

انڈین نیشنل کانگریس کمیٹی کا یہ اجلاس حکومت اور کانگریس دونوں کے لئے وقار اور عزت کا سوال بن گیا تھا۔ حکومت کی طے کردہ پالیسی یہ تھی کہ یہ اجلاس نہیں ہوگا۔ اس نے اپنی پالیسی کو کامیاب بنانے کے لئے پورے ہندوستان کی سی۔آئی۔ڈی کو سرگرم بنا دیا تھا۔ ریلوے اسٹیشنوں پر سی آئی۔ ڈی ویٹنگ روم میں سی۔آئی۔ڈی۔ ٹرین کے ڈبوں میں سی آئی ڈی کہ اے آئی سی سی کے ممبر سفر نہ کر سکیں۔ دہلی کے گلی کوچوں میں سی آئی ڈی کے جتھے موجود۔ دہلی کے چپہ چپہ پر سی آئی ڈی کی نظر۔

اجلاس کے مقررہ وقت میں چند منٹ باقی رہ گئے تھے۔ گھنٹہ گھر کے آس پاس نہ میز کرسیاں تھیں نہ فرش فروش۔ نہ رضاکار اور والنٹیر نہ کوئی ممبر۔ سی۔آئی۔ڈی مطمئن ہو گئی کہ پالا مار لیا اور کانگریس کو شکست فاش دے دی۔

لیکن دیکھتے ہی دیکھتے اسی پولیس اور سی آئی ڈی کی آنکھوں کے سامنے آس پاس کی گلیوں کوچوں سے اے آئی سی سی کے ممبروں کی آمد شروع ہوئی اور ایک جھپکے میں اُن کی اتنی تعداد اکٹھی ہو گئی کہ باوردی اور بے وردی پولیس جو وہاں موجود تھی اپنی تعداد کو ناکافی سمجھنے لگی۔ مزید پولیس بلانے کے لئے کوتوالی کی طرف آدمی دوڑائے۔

آل انڈیا کانگریس کے ممبران جو دفعتہً یہاں برآمد ہو گئے تھے انھوں نے ٹھیک گھنٹہ گھر کے نیچے اپنا اجلاس شروع کر دیا۔ انقلاب زندہ باد۔ ہندوستان آزاد۔ مہاتما گاندھی کی جے ہو۔ کانگریس زندہ باد۔ یہ سب نعرے خلاف قانون تھے۔ یہاں پہلے یہ نعرے اتنی زور سے لگائے گئے کہ آسمان گونج گیا۔

پھر صدر نے حلف نامہ آزادی پڑھا۔ تجویز آزادی پیش کی جو بالاتفاق منظور ہوئی۔ پھر جلسہ بخیر و خوبی ختم کر دیا گیا۔ ابھی پولیس پہونچنے نہیں پائی تھی کہ یاران شاطر اور ممبران چست و چالاک اپنا کام پورا کر کے منتشر بھی ہو چکے تھے۔

پولیس پہونچی تو میدان خالی تھا۔ لاکھوں روپیہ جو اس اجلاس

کے روکنے کی تدبیروں پر صرف ہوا تھا بیکار ہو گیا اور سی آئی ڈی کا کام ختم ہونے کے بجائے پہلے سے زیادہ بڑھ گیا۔ رسوائی۔ بدنامی اور ناکامی انعام میں ملی۔

اس قصہ کو پیش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ یارانِ تیزگام اور ممبران شاطر جنھوں نے اپنی بہترین ہوش مندی۔ حاضر جوابی چستی اور پھرتی سے اس اجلاس کو کامیاب بنایا۔ ان میں ہمارے محترم مجاہد ملت بھی تھے۔ رحمۃ اللہ۔

مجاہد ملت دہلی کس طرح پہونچے

اس زمانہ میں مجاہد ملت کا دہلی قیام نہیں تھا۔ غالباً آپ اپنے وطن عزیز سیوہارہ سے تشریف لائے تھے۔ سیوہارہ میں پولیس کو بھی یقین رہا کہ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب ممبر اے آئی سی سی۔ یہیں قیام فرما ہیں۔ مگر آپ نے کھدر کے لباس کو گٹھڑی میں باندھا۔ لٹھے کا پاجامہ۔ ولایتی کپڑے کی شیروانی زیب تن کی۔ جے پوری صافہ جے پوری انداز میں سر پر باندھا عمدہ چھڑی ہاتھ میں۔ بقول قاضی اکرام الحق صاحب۔ ایک نواب کی شان سے دہلی کے اسٹیشن پر اُترے۔ قاضی اکرام الحق صاحب اسٹیشن پر موجود تھے یہ مولانا کو دیکھ کر اُن کی طرف بڑھنے لگے تو فوراً اشارہ سے روک دیا۔ گیٹ پر سی۔ آئی۔ ڈی موجود تھی۔ مگر اس کو سیوہارہ سے روانگی کی اطلاع نہیں ملی تھی اور اس وقت جو ایک داڑھی والا مولوی نما نوجوان نوابی شان سے اس کے سامنے سے گذر رہا تھا۔ اُس کے متعلق یہ وہم و گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ یہ وہی حفظ الرحمٰن ہوگا جو ہمیشہ کھدر میں ملبوس رہتا ہے،

تحریک کی انتہا

تحریک کا جو سلسلہ ۱۹۲۹ء کے اواخر میں شروع ہوا تھا ۳۵ء میں اس کا خاتمہ تو نہیں ہوا البتہ اس کا رُخ بدل گیا۔

انڈیا ایکٹ ۳۵ء میں بہت کچھ اختیارات مرکزی اسمبلی اور صوبائی کونسلوں کو دیدیئے گئے تھے۔ مگر مکمل آزادی کا مطالبہ ابھی بہت کچھ تشنہ تھا۔ کانگریس نے اپنی پُرانی تاریخ دُہرائی۔ ۲۲ء والا یہ سوال پھر سامنے آیا کہ ایکٹ کو اپنا کر اس کے بموجب وزارتیں بنائی جائیں یا نہیں۔ ایکٹ پر عمل درآمد کے لئے انتخابات کی ضرورت تھی کیونکہ انتخابات کے بعد ہی کونسلیں اور مرکزی اسمبلی قائم ہو سکتی تھی۔ یہی وہ زمانہ ہے جب مسلم لیگ جمعیۃ علماء ہند سے بغلگیر [illegible] اس نے کانگریس کے سامنے بھی نیاز مندی کا اظہار کیا۔ کیونکہ اس عرصہ میں اگرچہ حریت پسند مسلمانوں پر اعتراضات کئے جاتے رہے تھے مگر مسلم لیگ کے قائد خصوصاً مسلم لیگ کے قائد اعظم جناح صاحب یہ دیکھ رہے تھے کہ تحریک نے صرف ہندوؤں ہی کو نہیں بلکہ مسلمانوں کو بھی بہت زیادہ متاثر کر دیا ہے اور انتخابات اگرچہ جداگانہ ہیں مسلمان نمائندوں کا انتخاب صرف مسلمان ہی کریں گے لیکن پھر بھی وہ سمجھتے تھے کہ قوم پرور مسلمانوں نے اگر اپنا محاذ الگ بنا لیا تو مسلم لیگ کے لئے مقابلہ مشکل ہوگا۔

چنانچہ مسٹر جناح جمعیۃ علماء ہند کی طرف اس قدر لپکے کہ بلا کسی دعوت کے خود جمعیۃ علماء ہند صوبہ دہلی کے اجلاس عام میں جو دہلی میں ہو رہا تھا تشریف لانے کی خواہش ظاہر کی۔ یہ بدخلقی علماء کرام میں نہیں تھی کہ اجلاس عام کا دروازہ ایک جماعت کے سربراہ پر بند کر دیتے۔ چنانچہ پُرتپاک خیر مقدم کیا گیا۔

مسٹر جناح کے اس اقدام کا اثر یہ ہوا کہ انھوں نے مسلمانوں کے قوم پرور طبقہ کو لیگ کی طرف کھینچ لیا اور ان کو اس کا موقع نہیں دیا کہ وہ الیکشن کے لئے علیحدہ محاذ قائم کریں۔ اور جب قوم پرور مسلمانوں سے رابطہ قائم ہوا تو کانگریس سے بھی عملی طور پر تعاون کا رشتہ قائم ہو گیا۔ اس وقت مسٹر رفیع احمد قدوائی مرحوم کانگریس کی طرف سے یو۔پی میں الیکشن کے انچارج تھے اور چودھری خلیق الزماں صاحب جو قوم پرور مسلمانوں میں شمار ہوتے تھے لیگ کی طرف سے انچارج تھے۔ ان دونوں میں شخصی اور ذاتی طور پر گہرا رابطہ تھا اور جماعتی حیثیت میں نجی طور پر یہ طے تھا کہ جہاں مسلم حلقوں میں کانگریس کسی مسلمان کو کھڑا کرے گی وہاں مسلم لیگ نہیں کھڑا کریگی گویا آپس میں عملی طور پر مقابلہ نہ کرنے کا معاہدہ ہو گیا تھا

اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مسٹر جناح مرحوم کی یہ تدبیر کامیاب رہی اور جب انتخابات ختم ہوئے تو قوم پرور مسلمانوں کا کوئی پلیٹ فارم نہیں تھا ———— اب۔ پلیٹ فارم صرف دو رہ گئے تھے:۔ کانگریس اور مسلم لیگ۔

ان جماعتوں اور پارٹیوں کا اتحاد یا عملی تعاون کیوں ختم ہوا۔ یہ ایک طویل داستان ہے اور موضوع کلام سے غیر متعلق ہے۔

حضرت مجاہد ملتؒ سے تعلق رکھنے والی بات تو یہ ہے کہ اس دور میں مجاہد ملتؒ جماعت کے ایک نمایاں اور ممتاز فرد کی طرح کام کرتے

رہے لیکن جماعت میں آپ کی حیثیت رہنما کی ابھی نہیں ہوئی تھی۔ بلکہ اس سلسلہ میں پیش پیش محترم مولانا بشیر احمد صاحب (بھٹہ) رحمۃ اللہ تھے۔ البتہ اتنا عرض کرنا ضروری ہے کہ وہ نقطۂ نظر جو مجاہد ملت رحمۃ اللہ کی مساعی جمیلہ کا محور و مرکز بن گیا۔ اس کا آغاز اسی دور میں ہوا تھا۔ یعنی دو قومی نظریہ کا آغاز اسی دور میں ہوا جس کو برطانوی سامراج کی حمایت اور تائید حاصل تھی اور جبکہ تقریباً چالیس سال پہلے سے یعنی جب سے ہندوستانیوں کو لوکل باڈیز میں کچھ اختیارات سپرد کئے گئے تھے تو انگریز بہادر نے جداگانہ انتخاب کا دستور قائم کرکے ذہنوں میں علیحدگی پسندی اور تفریق کے جراثیم پیدا کردیئے تھے۔ یہ مسموم ذہن دو قومی نظریہ کی تائید کے لئے پہلے سے آمادہ تھے۔ چنانچہ جیسے ہی ایک قوم یا دو قوم کی بحث شروع ہوئی بہت تیزی کے ساتھ تمام ہندوستانی دو پارٹیوں میں تقسیم ہوگئے۔

یہ کہنا صحیح نہیں ہوگا کہ صرف مسلمانوں ہی نے اس کو قبول کیا بلکہ ہندوؤں کی اکثریت بھی اگرچہ زبان سے نہیں کہتی تھی مگر دل سے اس کی حامی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ہندو پریس نے مطالبہ تقسیم کو جو ۱۹۴۲ء تک ایک لغو خیال تصور کیا جاتا تھا اتنی اہمیت دی کہ وہ نہ صرف ایک معقول مطالبہ سمجھا جانے لگا۔ بلکہ غیر معمولی جذبات کی پشت پناہی اس کو حاصل ہوگئی۔

یہ اکثریت کانگریس سے باہر ہندو مہاسبھا، راشٹریہ سیوک سنگھ اور جن سنگھ کی صورت میں نمودار ہوئی اور کانگریس کے اندر اس کا ظہور اس وقت ہوا جب کانگریس ہائی کمانڈ کو بھی اس کی رضاجوئی کے لئے مطالبہ تقسیم کے سامنے جھکنا پڑا۔ بیشک روپ جدا جدا تھے مگر ذہنیت ایک ہی تھی۔ کانگریس میں انگریزی سامراج سے جلد ہی چھٹکارا پانے کو بہانہ بنایا گیا کہ اگر اس وقت مطالبہ تقسیم منظور نہ کیا جاتا تو آزادی پندرہ سال پیچھے پڑجائیگی ہندو مہاسبھا اور جن سنگھ وغیرہ نے ہندو اسٹیٹ کو نصب العین قرار دیکر اس ذہنی یکسانیت کا ثبوت دیا۔

اس موقعہ پر اس بے موسم اظہارِ حقیقت کا مقصد صرف یہ ہے کہ نظریہ دو قوم جیسے ہی سامنے آیا فوراً ایک ایسا محاذ قائم ہوگیا جو جنگ آزادی کے محاذ سے کہیں زیادہ سخت تھا۔

جنگ آزادی انگریزوں سے تھی۔ جن کی حمایت کا دائرہ انگریزوں تک محدود تھا یا ان گنے چنے افزاد تک جو جذبۂ حریت سے بیگانہ تھے اور صرف اپنی زندگی بنانا ان کا نصب العین تھا اس کے برعکس دو قومی نظریہ کا محاذ وہ تھا جہاں خود اپنوں سے مقابلہ تھا۔ یہاں تک کہ بہن بھائی جیسے عزیز و اقارب تو عموماً اس نظریہ کی بنا پر ایک دوسرے کے حریف ہوگئے تھے اور ایسی نظیریں بھی بے شمار تھیں کہ ماں باپ اور اولاد بھی دو محاذوں پر تقسیم ہوکر ایک دوسرے کے مقابل آگئے تھے۔

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ کا یہ مشہور ارشاد جس نے عام محاورہ کی حیثیت حاصل کرلی اسی موقع پر صادر ہوا تھا۔

دہلی کے ایک جلسہ میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ نے فرمادیا تھا کہ "قومیں اوطان سے بنتی ہیں" غالب خیال یہ ہے کہ برطانیہ کا ڈپلومیٹک حلقہ پشت پر تھا اور اسی کے ایما پر یہ سوال حضرت شیخ الاسلامؒ سے کیا گیا تھا۔ چنانچہ جیسے ہی حضرت موصوف کی زبان مبارک سے یہ جملہ صادر ہوا اگلے ہی دن سے اس کی تردید اس قوت سے شروع کردی گئی کہ جیسے کوئی گولے بارود کا میگزین آگ کی ایک چنگاری کا منتظر تھا۔

بہرحال شیخ الاسلامؒ کے اس جملہ کو مجاہد ملت رحمۃ اللہ علیہ نے غالباً اپنی زبان سے کبھی نہیں دہرایا۔ لیکن ایک قومی نظریہ کی حمایت اسی شد و مد سے شروع کردی جو ایک مجاہد کی شان ہوسکتی ہے۔

دو قومی نظریہ کا ثمرۂ تلخ تقسیم ہندوستان اور مطالبہ پاکستان تھا چنانچہ جیسے جیسے دو قومی نظریہ کی حمایت بڑھتی رہی تقسیم ہند کا مطالبہ مضبوط ہوتا رہا۔

حدیث شریف میں "فراست مومن" کو بہت اہمیت دی گئی ہے۔ فرمایا گیا ہے یہ نورِ حق کا پرتو ہوتی ہے۔ مومن نورِ خداوندی کی روشنی میں مستقبل کو دیکھ لیتا ہے۔

۱۹۴۰ء سے لیکر ۱۹۴۷ء تک کے پُرآشوب ہنگامی دور میں جس بے جگری، والہانہ سرگرمی اور بے انتہا جرأت و ہمت کے ساتھ جان کی بازی لگاکر حضرت مجاہد ملت قدس اللہ سرہٗ العزیز نے تقسیم ہند اور پاکستان کی مخالفت کی وہ آپ کے کمال ایمان اور مکمل نور فراست کی دلیل ہے۔

قوم پرور مفکرین کی نظر ان غیر معمولی خطرات پر تھی جو تقسیم ہند کے نتیجہ میں ہندوؤں سے کہیں زیادہ مسلمانوں کو پیش آنے والے تھے۔ چنانچہ وہ بیشمار کتابچے اور پمفلٹ جو اس زمانے تقسیم ہند کی مخالفت میں شائع کئے گئے تھے وہ اس کی دلیل ہیں۔ لیکن ان متوقع خطرات نے ان کی قوتِ عمل

میں صرف اتنی ہی حرکت پیدا کی تھی جیسی کسی موہوم خدشہ کی صورت میں ہو سکتی ہے۔

لیکن یہ دو بزرگ جن میں سے ایک شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی تھے اور دوسرے ہمارے یہی مجاہد ملت جن کی یاد میں یہ نمبر شائع کیا جا رہا ہے۔

معلوم ہوتا تھا کہ وہ قتل عام اور لاکھوں کروڑوں انسانوں کی تباہی اور بربادی جو تقسیم کے وقت پیش آئی دن کی روشنی میں ان کی نگاہوں کے سامنے تھی۔ گویا تقریباً آٹھ سال پہلے سے یہ حضرات اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ دہلی کے گلی کوچوں میں گولیوں کی بوچھاڑ ہو رہی ہے، مسلم کشتگان کے پشتے جگہ جگہ لگے ہوئے ہیں۔ مشرقی پنجاب، راجستھان اور یو۔پی کے ان علاقوں سے جو مشرقی پنجاب کی سرحدوں سے ملے ہوئے ہیں مسلمانوں کا اخراج ہو رہا ہے۔ اخراج کو کامیاب بنانے کے لئے خون مسلم سے ہولی کھیلی جا رہی ہے جائدادیں تباہ کی جا رہی ہیں، مال و اسباب لوٹا جا رہا ہے۔ با عفت و عصمت خواتین کی لرزہ خیز بے حرمتی کی جا رہی ہے۔ دینی ادارے منہدم اور مسجدیں قیام گاہ بلکہ خرگاہ اور اصطبل بنائی جا رہی ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ اور دوسری طرف پاکستانی علاقوں میں ہندو اور سکھوں کے ساتھ بھی سب کچھ کیا جا رہا ہے۔

صرف اتنی بات ہی نہیں تھی کہ ان دونوں بزرگوں نے جلسوں میں تقریریں کر دیں۔ اور تقسیم ہند کی تردید و مذمت میں۔ پاکستان پر ایک نظر۔ پاکستان کیا ہے۔ جیسے کتابچے لکھ کر شائع کرا دیئے بلکہ ایک اضطرابی کیفیت تھی جو ان دونوں بزرگوں پر طاری تھی جس نے رات کی نیند اور دن کا چین و آرام حرام کر دیا تھا۔

۱۹۳۹ء سے لیکر ۱۵ راگست ۱۹۴۷ء تک آٹھ سالہ دور اسی اضطراب میں گذرا بیشک اس عرصہ میں تحریک آزادی کے بھی یہ دونوں حضرات علمبردار رہے اور اس سلسلہ میں ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۴ء کے نصف تک قید فرنگ میں اسیر و نظر بند بھی رہے۔ مگر یہ اضطراب ہر ایک حالت میں بدستور رہا۔

اور حد سے زیادہ تکلیف دہ بات یہ تھی کہ وہی مخالف تھے وہی جانی دشمن اور درپے آزار تھے جن کے لئے یہ سب کچھ اضطراب، پریشانی سرگردانی اور بے چینی تھی۔

۱۹۴۲ء ۔ کوئٹ آف انڈیا کی تجویز

۱۹۴۲ء کا آغاز انتہائی خطرناک حالات میں ہوا تھا۔ ہٹلر کی فوجیں اسٹالن گراڈ تک دندنا رہی تھیں۔ اس کے نئے حلیف "جاپان" کی آبدوز کشتیوں نے سنگاپور کے قریب برطانوی بحری بیڑے کے سب سے بڑے جنگی جہاز کو (غالباً پرنس آف ویلز نام تھا) غرق کر دیا تھا۔ اس کے ہوائی جہاز کلکتہ تک تاخت کرنے لگے تھے۔ ادھر اندرون ہند کانگریس کی تحریک آزادی کی چنگاریاں سلگ سلگ کر شعلہ بن رہی تھیں۔ انہیں حالات میں بمبئی میں انڈین نیشنل کانگریس کا اجلاس طے کیا گیا۔

اب کانگریس کی طرف سے اجلاس کو کامیاب بنانے اور حکومت کی طرف سے ناکام بنانے کی کوششیں شد و مد سے جاری ہو گئیں۔ کمزور آدمیوں کے پتے ان تیاریوں کی خبر سے ہی پانی ہوتے تھے جو حکومت کی طرف سے اجلاس کو ناکام بنانے کے لئے کی جا رہی تھیں۔

مسلح پولیس اور فوج تیار۔ مشین گنیں اور ٹینک تیار۔ ممکن ہے جلیانوالہ باغ کی تاریخ دہرا دی جائے۔ یا قصہ خوانی بازار کی طرح اجلاس کانگریس کو مشین گنوں اور ٹینکوں کا نشانہ بنا دیا جائے۔ ان خبروں کو سننے کے بعد اس اجلاس میں شرکت کی ہمت وہی کر سکتا تھا جو سربکف اور کفن بردوش ہو۔ پھر چپہ چپہ پر سی۔آئی۔ڈی مسلط تھی۔ اس کی آنکھوں میں دھول جھونکتے ہوئے سیوہارہ سے روانہ ہو کر بمبئی پہونچنا آسان نہ تھا۔ مگر جس کو پوری قوم مجاہد ملت کا خطاب دینے والی تھی اس کے لئے کوئی مشکل نہیں تھی۔ وہ انہیں حالات میں سیوہارہ سے روانہ ہو کر بمبئی پہونچا۔

غالباً اس مرتبہ علی بہادر خاں صاحب کے یہاں قیام فرمایا۔

کانگریس اگرچہ ۱۹۳۲ء میں خلاف قانون قرار دی جا چکی تھی مگر اس مرتبہ ابھی تک خلاف قانون جماعت unlawful assembly نہیں قرار دی گئی تھی۔ مگر جس تجویز کو منظور کرنے کے لئے یہ اجلاس کیا جا رہا تھا اس کا علم حکومت کو بھی تھا۔ حکومت جانتی تھی کہ تجویز میں ہندوستان خالی کرو Quit India کا مطالبہ کیا جائے گا اس تجویز کے منظور ہونے کے بعد کانگریس کو اگر کسی مصلحت کے خلاف قانون نہ بھی قرار دیا جائے لیکن ہمہ گیر اور عالمگیر جنگ کے اس خطرناک دور میں "ہندوستان خالی کرو" کا مطالبہ سراسر بغاوت ہے اور اس کو پاس

کرنے والے باغی۔

چنانچہ حکومت کو اس میں تامل نہیں تھا کہ جو ممبر بھی اس اجلاس میں شریک ہوگا وہ باغیانہ سرگرمی کا مرتکب ہوگا اور اس کو گرفتار کر لینا ضروری ہوگا۔ سوال صرف یہ تھا کہ گرفتار کرنے کی ذمہ داری کون لے بمبئی کی حکومت اس کے لئے تیار نہیں تھی کہ بمبئی جیسے شہر میں سیکڑوں ممبروں کو گرفتار کرکے طوفان برپا کرے۔ پھر جیل خانوں میں ان کی نازبرداری کا فرض غیر محدود مدت تک انجام دیتی رہے۔

لہذا سرکاری پالیسی یہ قرار پائی کہ گرفتار کرنے کا تلخ فرض دوسرے صوبوں کی حکومتیں انجام دیں یعنی جو ممبر جس صوبہ کا ہو اُسی صوبہ کی حکومت اُس کو گرفتار کرے۔

اس پالیسی کے طے ہونے کے بعد مجاہد ملت رح کے لئے بھوپال یا بھرت پور تک تو پہونچنا آسان تھا لیکن جیسے ہی ٹرین حدود یوپی میں داخل ہو گرفتاری لازمی تھی۔ لیکن آپ کو اس ذمہ داری کا بھی شدید احساس تھا جو مجلس عاملہ جمعیۃ علماء ہند کے رکن رکین اور روح رواں کی حیثیت سے آپ پر عائد ہوتی تھی۔

صدر جمعیۃ علماء ہند شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ چند ماہ پیشتر سے ایک تقریر کے سلسلہ میں گرفتار ہو چکے تھے جو آپ نے بچھراؤں میں جمعیۃ علماء ضلع مرادآباد کی کانفرنس میں کی تھی۔

حضرت مولانا محمد کفایت اللہ صاحب نقاہت اور ضعف دماغ کے مرض میں مبتلا تھے اور سحبان الہند مولانا احمد سعید صاحب پر دل کے دورے پڑ رہے تھے جن کی وجہ سے بہت نحیف اور کمزور ہو گئے تھے۔

ضابطہ کے لحاظ سے منصب نظامت مولانا عبدالحلیم صاحب صدیقی کے حوالہ تھا۔ مگر مولانا صدیقی کو کسی بیدار مغز مشیر کی ضرورت تھی جو اس موقع کے مناسب غیر معمولی جرأت سے کام لیکر جمعیۃ علماء ہند کو اس کے فرض کی طرف متوجہ کرسکے۔

مجاہد ملت سے بڑھ کر بیدار مغز کون ہو سکتا تھا۔ جس کی بیدار مغزی کا ثبوت یہ ہے کہ اس کو عائد ہونے والے فرض کا احساس اُن سے بہت زیادہ تھا جو آئینی طور پر جماعت کی طرف سے ذمہ دار تھے۔

مجاہد ملت کے لئے قید و بند باعث تشویش نہیں تھی۔ البتہ ان کو تشویش یہ تھی کہ کہیں یہ گرفتاری اُن کے پروگرام میں رخنہ انداز نہ ہو جائے اس لئے آپ نے بمبئی سے روانگی کا پروگرام خفیہ رکھا اور غالباً وضع بھی ایسی اختیار کرلی کہ راستہ میں شناخت نہ ہوسکیں۔

۸ر اگست ۱۹۴۲ء کو انڈین نیشنل کانگریس نے "کوئٹ انڈیا" کی تجویز پاس کی اسی روز شب کو حضرت مولانا ابوالکلام آزاد صدر کانگرس پنڈت جواہر لال نہرو اور ورکنگ کمیٹی کے تمام ممبر گرفتار کر لئے گئے۔ اسی افراتفری میں مجاہد ملت بھی بمبئی سے روانہ ہوگئے اور موقعہ بموقعہ راستہ میں قیام کرتے ہوئے سیوہارہ پہونچے۔ سیوہارہ اسٹیشن پر اترنا احتیاط کے خلاف تھا لہذا کسی اور اسٹیشن پر آپ اُتر گئے اور خفیہ طور سے سیوہارہ میں پہونچے سیوہارہ یوپی میں ہے۔ صوبائی حکومت کو آپ کی تلاش تھی اس لئے آپ کو بہت احتیاط کرنی پڑی۔

اگست کے مہینہ میں بارشیں ہوا کرتی ہیں اس وقت بارش کا سلسلہ جاری تھا۔ جو چشم رقیب کے لئے گھونگٹ بنا رہا۔ آپ نے دو تین روز سیوہارہ میں قیام کیا۔ پھر دہلی پہونچنے کا ارادہ کرلیا تاکہ اس کام کی تکمیل کرسکیں جس کے لئے گرفتاری سے بچنے کی صورت اختیار کی جارہی تھی۔ سیوہارہ اسٹیشن سے سوار ہونا بھی مخدوش تھا۔ اس لئے آپ نے دیہاتی وضع اختیار کی۔ آپ تنہا روانہ ہونے والے تھے مگر آپ کے ایک نوجوان عزیز حاجی محمد ایوب صاحب بی اے۔ اصرار کرکے آپ کے ساتھ ہولئے اور شاید "کانٹھ" کے اسٹیشن سے آپ ٹرین میں سوار ہوکر دہلی پہنچے (چند سال بعد انہیں حاجی محمد ایوب صاحب سے مجاہد ملت کی صاحبزادی منسوب ہوئیں۔ بیماری میں خصوصاً امریکہ سے واپسی کے بعد حاجی صاحب کے بڑے صاحبزادے اقبال سلمہٗ ایسے باسلیقہ خدمت گذار رہے کہ مجاہد ملت ان سے بہت خوش تھے)

دہلی چند روز کے واسطے آپ کے لئے پناہ گاہ بن سکتی تھی۔ کیونکہ آپ کا وارنٹ گرفتاری یوپی گورنمنٹ نے جاری کیا تھا۔ جب تک وہ یوپی سے منتقل ہوکر دہلی پہونچے آپ دہلی میں گرفتاری سے محفوظ تھے اس فرصت سے آپ نے فائدہ اٹھایا اور دہلی پہونچتے ہی مجلس عاملہ جمعیۃ علماء ہند کی ہنگامی میٹنگ طلب کرائی۔ ۲۷، ۲۸ر اگست ۱۹۴۲ء ۳، ۴ر شعبان ۱۳۶۱ھ کو دہلی میں مجلس عاملہ کا اجلاس ہوا۔ صدر جمعیۃ علماء ہند یعنی شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی اس سے تقریباً دو ماہ پہلے ۲۵ر جون ۱۹۴۲ء کو گرفتار ہو چکے تھے۔ آپ کی غیر موجودگی کے باعث اس اجلاس کی صدارت سحبان الہند حضرت مولانا احمد صاحب (نائب صدر جمعیۃ علماء ہند) نے فرمائی۔

مجلس عاملہ نے انڈین نیشنل کانگریس کے اقدام کی حمایت کرتے ہوئے ایک تجویز منظور کی۔ اور طے یہ کیا گیا کہ اس کو کثیر تعداد میں طبع کرا کر ملک کے گوشہ گوشہ میں پہونچایا جائے۔

خلاف قانون تجویز کا طبع کرانا خود ایک خطرناک مرحلہ تھا اور اس کو پورے ملک میں تقسیم کرنا اور چپہ چپہ پر پہونچانا اس سے کہیں زیادہ سخت مرحلہ تھا۔ یہ خدمت مولانا عبدالماجد صاحب دہلوی مرحوم اور احقر کے سپرد ہوئی۔ دہلی سے مشرقی ہندوستان کے آخری کنارہ تک تقسیم کرنا اور پہونچانا احقر کے ذمہ کیا گیا۔ اور پنجاب اور فرنٹیر میں اس کو پھیلانا مولانا عبدالماجد صاحبؒ کے سپرد کیا گیا۔ جنوبی ہند کے لئے بھی دفتر نے کوئی انتظام کیا ہوگا احقر کو اس کا علم نہیں ہو سکا۔

اس زمانہ میں احقر کا تعلق مدرسہ شاہی مرادآباد سے تھا مستقل سکونت مرادآباد ہی میں رہا کرتی تھی۔ مگر "بجرم عشق حریت" ۸ راگست کو رفقاء محترم حافظ محمد ابراہیم صاحب (موجودہ وزیر مرکزی حکومت) مولانا قاری عبداللہ صاحب مرحوم۔ مولانا محمد اسمٰعیل سنبھلی ایم۔ ایل۔ اے کو مرادآباد سے گرفتار کیا گیا۔ تو احقر نے فوراً ہی روپوش ہو جانا ضروری سمجھا۔

چنانچہ پولیس گرفتاریوں میں مصروف تھی اور احقر تاریک اور غیر معروف گلیوں کوچوں میں ہوتا ہوا مرادآباد سے نکل رہا تھا۔ میرے نسبتی بھائی حافظ سادات حسن صاحب ازراہ ہمدردی احقر کے ساتھ ہولئے۔ ہم دونوں نے ۸ میل پا پیادہ طے کر کے قصبہ حکیم پور پہنچے جب چند گھنٹہ بعد دہلی جانے والا پسنجر حکیم پور پہونچا تو احقر اس سے روانہ ہوا۔ لیکن ٹرین میں زیادہ دیر تک بیٹھنا بھی مناسب نہیں تھا۔ لہذا سمبھاولی اسٹیشن پر اتر گیا اور موضع دیٹھ میں جو اسٹیشن سمبھاولی سے تقریباً تین میل کے فاصلہ پر ہے اپنے ماموں زاد بھائی مولانا سید محمد اعلیٰ صاحب صدر مدرس مدرسہ اعزازیہ قصبہ "دیٹھ" کے یہاں دو تین روز قیام کیا۔ پھر کچھ پا پیادہ اور کچھ بس سے سفر کرتے ہوئے دہلی پہونچنا چاہتا تھا کہ جمنا کے پل پر راستہ روک دیا گیا کہ شہر میں کانگریسیوں نے فساد برپا کر رکھا ہے۔

فساد کا تماشہ میں خود بھی جمنا پار سے دیکھ رہا تھا۔ کیونکہ پیلی کوٹھی کو جس میں ریلوے کا ریکارڈ تھا آگ لگا دی گئی تھی اور اس کے شعلے آسمان سے باتیں کر رہے تھے یہ شعلے جمنا پار بلکہ شاہدرہ سے نظر آ رہے تھے۔

اس وقت جمنا برج سے واپس ہو کر غازی آباد پہونچا۔ پھر غازی آباد سے دہلی پہونچنے کی داستان طویل ہے۔ مختصر یہ کہ مجاہد ملتؒ جیسے ہی دہلی پہونچے احقر بھی کسی صورت سے دہلی پہونچ گیا۔

مجاہد ملت، "ندوۃ المصنفین" کے رفیق تھے۔ ندوۃ المصنفین قرول باغ کی ایک کوٹھی میں تھا۔ مجاہد ملت یہاں قیام فرمایا کرتے تھے۔ آپ اس وقت بھی وہیں فروکش ہوگئے۔ مگر احقر کا قیام دفتر ہی میں رہا۔ اور ۱۷ ر ۱۸ ر اگست کو مدعو خصوصی کی حیثیت سے مجلس عاملہ کے اجلاس میں شرکت کرنے کے بعد حسب ہدایت اراکین مجلس عاملہ، مجلس عاملہ کی تجویز اور اعلان کے بنڈل لیکر کلکتہ کی طرف روانہ ہو گیا۔

جگہ جگہ ہڑتالیں ہو رہی تھیں۔ پولیس اور فوج کی گولیاں موت کی بارش برسا رہی تھیں۔ ریل کی پٹریاں اکھاڑی جا رہی تھیں۔ ٹیلیفون اور ٹیلیگراف کے تار کاٹ کر نظام حکومت خصوصاً ریلوے کے نظام کو معطل کیا جا رہا تھا۔ اور بارش کی مسلسل جھڑیوں نے جس طرح پولیس اور سی آئی ڈی کے کام کو دشوار کر دیا تھا مسافروں کے لئے بھی صعوبتیں پیدا کر دی تھیں

بہرحال ان حالات کو انگیز کرتے ہوئے دہلی سے روانہ ہو کر مغلسرائے تک تو رسائی ہو گئی لیکن مغلسرائے کے بعد سفر کی تمام صورتیں ناممکن ہو گئیں کیونکہ ریلوے کی پٹریاں تو تحریک کی نذر ہو گئی تھیں اور عام راستوں اور سڑکوں کو سیلاب نے ناقابل عبور بنا دیا تھا۔ مجبوراً احقر جونپور واپس ہوا اور محترم حاجی ولی محمد صاحب مرحوم کے ایک مکان میں گوشہ نشین ہو کر اس لٹریچر کو مختلف صورتوں سے ہندوستان کے گوشے گوشے میں پہونچانے کا انتظام کیا۔

مجاہد ملت کا وارنٹ گرفتاری یوپی سے منتقل ہو کر دہلی پہونچا اور مجاہد ملت کو ندوۃ المصنفین قرول باغ دہلی سے گرفتار کر لیا گیا۔ جہاں آپ روزانہ اس کے منتظر رہا کرتے تھے۔

حسن اتفاق! آپ ضلع مرادآباد کی طرف سے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ممبر تھے۔ لہذا آپ کا وارنٹ بھی مرادآباد سے آیا اور گرفتار کر کے آپ کو مرادآباد پہونچا دیا گیا۔ جہاں شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی۔ عالیجناب حافظ محمد ابراہیم صاحب، مولانا محمد اسمٰعیل صاحب، مولانا قاری عبداللہ صاحب مرحوم اور دوسرے چند خصوصی رفقاء پہلے سے موجود تھے۔ چند روز بعد رمضان شریف آگیا تو جیل خانہ کی بارگ تراویح گاہ

بن گئی۔ شیخ الاسلام تراویح پڑھاتے تھے اور مولانا حافظ قاری عبد اللہ صاحب سماعت کیا کرتے تھے۔ (رحمہما اللہ)

(تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو علماء حق جلد دوم)

اس مرتبہ تحریک کے پروگرام میں یہ بات بھی داخل تھی کہ جہاں تک ممکن ہو گرفتاری سے بچکر باہر کام کیا جائے۔ احقر اس سفر سے واپس ہو کر مرادآباد پہونچا۔ اور بظاہر اپنے آپ کو کامیاب سمجھتا تھا کہ گرفتار نہیں ہوگا اگرچہ میرے بعض مخلص کانگریسی دوستوں کی خواہش یہی تھی کہ محمد میاں گرفتار ہو جائے اور خواہش کی بنیاد یہ تھی کہ دو سال پہلے احقر کی تصنیف "علماء ہند کا شاندار ماضی" جب ضبط ہوئی اور احقر ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کے ماتحت گرفتار ہوا۔ پھر مقدمہ چلا تو میں نے کورٹ میں ایک بیان دیا تھا جس کو میں خود تو اخلاقی جرأت سمجھتا تھا۔ مگر بعض دوستوں نے اس کو معافی سے تعبیر کیا۔ کیونکہ اس بیان کے بعد بھی اگرچہ سزا ہوئی مگر صرف تابرخاست عدالت۔ اور عدالت بھی فیصلہ سنانے کے بعد فوراً ہی برخاست ہوگئی تو گویا سزا نہیں ہوئی بلکہ سزا کا نام ہوا احقر کے اس بیان کی حقیقت یہ تھی کہ میں نے ان الفاظ سے معذرت کی تھی جو فی الواقع سنجیدگی کے معیار سے گرے ہوئے تھے مثلاً انگریزوں کو "سفید فام درندہ" کہا تھا۔ قابل اعتراض صرف یہ الفاظ نہیں تھے۔ بلکہ کتاب میں ایسے مضامین بہت سے تھے جن کو باغیانہ کہا جا سکتا تھا۔ پولیس نے کتاب کے تقریباً نصف حصہ پر نشانات لگا رکھے تھے۔ ان کے جوابات کا مجموعہ بھی اچھی خاصی کتاب بن گیا تھا جو بعد میں دیمک کی نذر ہوگیا۔ مگر اس زمانہ میں مجسٹریٹوں کی ہمدردیاں بھی عموماً گرفتار ہونے والوں کے ساتھ ہوتی تھیں۔ مجسٹریٹ نے اس معذرت کی بنیاد پر سزا میں تخفیف کردی۔ بہرحال ان کانگریسی دوستوں کا خیال یہ تھا کہ احقر گرفتار ہو جائے تو یہ دھبہ دھل جائے گا۔ بالآخر دوستوں کی خواہش پوری ہوگئی۔ اور عجیب وغریب صورت سے یہ خواہش پوری ہوئی۔

واقعہ یہ ہے کہ احقر اس زمانہ میں گرفتار شدہ احباب اور بزرگوں کی جانب سے موقع بموقع سرکلر جاری کرتا رہتا تھا۔ ایک سرکلر جو سراسر باغیانہ تھا۔ اس کو پشاور میں کالج کے طلبہ نے پشتو میں ترجمہ کرکے شائع کیا اور اس پر احقر کا نام بھی لکھ دیا۔ فرنٹیر کی پولیس نے وہ سرکلر یوپی بھیجا۔ تو اب بقول انسپکٹر پولیس، یوپی کی پولیس کے لئے چشم پوشی ناممکن ہوگئی۔

بہرحال اکتوبر میں احقر بھی گرفتار ہوا۔ احقر خوش تھا کہ رات دن کی دوڑ دھوپ سے نجات ملی جیل خانہ میں کچھ آرام کا موقعہ ملے گا۔ اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ حضرت شیخ الاسلام جیسے مرشد مربی اور حضرت مجاہد ملت رحمۃ اللہ علیہ جیسے رفیق مخلص کی معیت میسر آئے گی۔

جیل خانہ میں پہونچا تو ہندو اور مسلمان سب دوستوں نے بڑی مسرت سے احقر کا استقبال کیا۔ مگر مجاہد ملت کی یہ ادا کبھی فراموش نہیں ہو سکتی کہ آپ نے نہایت خفگی کے ساتھ احقر کا استقبال کیا۔

" یہاں پہونچے بغیر چین نہیں آئی۔ کیا خرابی تھی اگر باہر ہی رہتے۔ یہ حرکتیں نہ کرتے۔ اب باہر کا تمام کام چوپٹ ہو جائے گا"

عتاب آمیز لہجہ میں اس قسم کے جملے ادا کرتے ہوئے مجاہد ملت نے احقر کا استقبال کیا۔ مگر یہ عتاب بھی کس قدر شفقت آمیز تھا۔ نہ صرف احقر کے حق میں شفقت۔ بلکہ جماعت اور جماعتی کاموں کے حق میں شفقت پھر یہ ادا کہ جس سے زیادہ تعلق اسی پر زیادہ عتاب۔ ان سب چیزوں نے اس عتاب میں وہ لذت پیدا کردی کہ جو دوسروں کی پر تکلف مسرت میں نہیں تھی۔

یہ غضبناک ادا چند سکنڈ کی تھی۔ پھر ایسا اتفاق ہوا کہ سب ساتھی بچھڑ گئے۔ صرف یہ خادم ہی ساتھ رہا جس کی آمد پر ناراضگی ظاہر کی تھی۔

حضرت شیخ الاسلام کی یہ معیت ایک کیمیا تھی۔ ایک پارس کی پتھری تھی۔ جو پیتل کو طلاء خالص بنا سکتی تھی ہم نے کوشش کی کہ طلاء خالص نہ بن سکیں تو کم از کم کھوٹا سونا ہی بن جائیں۔ کسی صورت سے سونے کا رنگ روپ تو نصیب ہو جائے۔ چنانچہ درس قرآن کا سلسلہ شروع کیا۔ مگر یہ درس صرف ایک ہفتہ ہونے پایا تھا کہ حضرت شیخ الاسلام قدس اللہ سرہٗ العزیز کو مرادآباد سے نینی جیل منتقل کر دیا گیا۔ حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کی اس مفارقت کو "برق خرمن سوز" سے تعبیر کرنا صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ "برق" تو آن کی آن میں قلب وجگر سب ہی کو ٹھکانے لگا دیتی ہے۔ نہ جگر رہتا ہے نہ سوز جگر۔ نہ دل رہتا ہے نہ دل کا درد و اضطراب۔ مگر اس مفارقت سے قلب وجگر اس طرح مجروح ہوئے کہ ان کی ٹیس عرصہ تک مرغ نیم بسمل کی طرح تڑپاتی رہی۔

حضرت شیخ الاسلام رخصت ہوئے تو کم وبیش ہر ایک رفیق کی حالت یہ تھی کہ ضبط مشکل ہو رہا تھا۔ سب کے سامنے رونا بھی وقار کے خلاف تھا تو کونوں میں چھپ چھپ کر دل کی بھڑاس نکالتے تھے اور اس طرح روتے تھے

شاید بیوہ عورتوں کو بھی اس کی نقل اتارنی مشکل ہو۔

حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کے علاوہ باقی رفقاء کچھ پہلے چھوٹ چکے تھے۔ کچھ بعد میں۔ پھر صرف مجاہد ملت رہ گئے اور آپ کے ساتھ یہ خادم۔ لیکن ہمارا قیام بھی مرادآباد میں زیادہ دیر نہیں رہا۔ غالباً جنوری ۱۹۴۳ء میں احقر اور مجاہد ملتؒ اور ہمارے رفیق داؤدیال کھنہ (موجودہ وزیر حکومت اترپردیش) کو بریلی سنٹرل جیل منتقل کر دیا گیا۔

مجاہد ملت کا غیر معمولی ثبات واستقلال

اس زمانہ میں حکومت نے سیاسی قیدیوں کے لئے پیرول کی صورت منظور کی تھی۔ یعنی "کچھ مدت کے لئے عارضی رہائی" بعنوان دیگر "جیل خانہ کی زندگی سے رخصت"

احقر کے والد ماجد اس زمانہ میں بیمار تھے۔ حضرت مجاہد ملت نے اصرار کر کے رخصت (پیرول) کی درخواست دلوائی۔ اگرچہ وہ والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کی وفات سے تقریباً تین ہفتہ بعد منظور ہوئی۔

پھر دوسری مرتبہ اسی طرح کچھ خانگی ضرورتوں کی بنا پر اصرار کر کے رخصت دلوائی۔ اگرچہ وہ چند روز بعد ہی منسوخ ہوگئی۔ کیونکہ مہاتما گاندھی نے ۲۲ روز کا برت رکھ لیا تھا اور حالت ایسی نازک ہوگئی تھی کہ حکومت کو خطرہ ہوگیا تھا کہ جاں بر نہ ہو سکیں گے۔ جیسے ہی یہ خطرہ پیدا ہوا پولیس کے پاس تاروں کے ذریعہ یہ احکام پہنچے اور پیرول والوں کی رخصت فوراً منسوخ کر دی گئی۔

بہر حال حضرت مجاہد ملت نے دو مرتبہ اصرار کر کے احقر کو رخصت دلوائی۔ اور یہ احقر کی کمزوری تھی کہ حضرت موصوف کے اصرار کو قبول کر لیا۔ مگر اس کے برعکس خود حضرت مجاہد ملت کی حالت یہ تھی کہ پیرول کے لئے کسی کے بھی اصرار کو قبول نہیں کیا۔ حالانکہ مجاہد ملت کو احقر سے کہیں زیادہ یہ حق پہنچتا تھا۔ کیونکہ اول تو خود مجاہد ملت کی صحت بہت خراب تھی۔ آپ کو دردسر کا دورہ ہوتا تھا۔ دورہ اتنا سخت ہوتا تھا کہ کئی کئی گھنٹے تڑپتے ہوئے گذر جاتے تھے پھر استفراغ ہوتا تھا۔ اس کے بعد سکون ہوا کرتا تھا۔ رمضان شریف میں کئی دفعہ دورہ پڑا اور عید کی تو پوری رات تڑپتے ہوئے گذر گئی۔ اس عارضہ کی بنا پر باسانی پیرول مل سکتا تھا۔ اس سے بھی زیادہ قوی عذر یہ تھا کہ آپ کی بڑی صاحبزادی علیل تھیں جو بعد میں تپ دق میں مبتلا ہو کر وفات پا گئیں۔ جیل میں مرض کی خبریں آتی رہتی تھیں۔ خود مولانا فرمایا کرتے تھے کہ ان کو صاحبزادہ سے زیادہ صاحبزادیوں سے انس ہے باہر کے دوستوں نے بھی اور جیل کے ساتھیوں نے بھی بے انتہا اصرار کیا۔ خود احقر نے استدعا اور التجا کی تمام صورتیں ختم کر دیں مگر "مجاہد ملت" کا خطاب غالباً بامعنی نہ ہوتا اگر مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کا پارۂ استقلال اتنا مضبوط نہ ہوتا کہ آپ نے کسی طرح بھی گوارا نہیں کیا کہ خود اپنی زبان سے یا اپنے قلم سے باہر آنے کی استدعا کریں۔

یہ رہائی عارضی ہی ہوتی۔ مگر لفظ رہائی تو درخواست میں لکھا جاتا جو مجاہد ملت کو کسی طرح گوارا نہیں تھا۔

مجاہد ملت کا یہ استقلال سبق آموز تھا اور بجا ہوگا اگر احقر کو ملامت کی جائے کہ اتنے قریب اور شب و روز کا ساتھی رہتے ہوئے بھی یہ سبق نہ یاد کر سکا۔

واقعات بہت ہیں۔ مگر نہ وقت میں گنجائش ہے نہ نمبر کے صفحات میں اتنی وسعت ہے کہ مزید واقعات لکھے جائیں۔ لہٰذا اب موضوع بدلتے ہیں

اجلاس سہارنپور اور مجاہد ملت
باضابطہ ناظم اعلیٰ

۱۹۴۲ء میں اجلاس لاہور کے وقت بھی حضرت مجاہد ملت رحمۃ اللہ علیہ کو جمعیۃ علماء ہند کا ناظم اعلیٰ بنانے کی تجویز منظور ہوئی تھی اور اس ناکارہ سے بھی اس وقت وعدہ لے لیا تھا کہ رفیق کار رہے گا۔ اسی طرح کا وعدہ حضرت شیخ الاسلام قدس اللہ سرہٗ العزیز نے بھی احقر سے اس وقت لیا تھا جب جماعت کی اکثریت حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ سے اصرار کر رہی تھی کہ جمعیۃ علماء ہند کی صدارت منظور فرمائیں۔ لیکن مجاہد ملت رحمۃ اللہ علیہ کے ناظم اعلیٰ بننے کی یہ تجویز اس وقت بروئے کار نہیں آسکی۔ کیونکہ کچھ دنوں بعد سیاسی حالات نے تمام تر توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔ یہاں تک کہ گرفتاریوں کا سلسلہ شروع ہوا۔

دو سال بعد ۱۹۴۴ء کے روز و شب گذر رہے ہیں۔ جرمنی کی جنگ جو پانچ سال پہلے شروع ہوئی تھی دم توڑ رہی ہے۔ ہٹلر کی خودکشی اور ہیروشیما (جاپان) پر ایٹم بم داغے جانے کا وقت قریب آرہا ہے۔ کامیابی کی روشن توقعات نے برطانوی دماغ کی گرہیں بھی کھول دی ہیں۔ اب وہ مابعد جنگ کی مشکلات کو آسان کرنے کے لئے ہندوستان کے معاملہ میں

کوئی فیصلہ کرنا چاہتا ہے۔ لہذا گرفتاران بلا کی رہائیوں کا سلسلہ شروع کیا جارہا ہے۔ اپریل میں سب سے حقیر (صغیر زدہ) محمد میاں کو رہا کیا گیا مئی میں مجاہد ملت رہا کئے گئے اور ۲۶ ر اگست ۱۹۴۴ء ۶ ر رمضان ۱۳۶۳ھ کو شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب کو فوری آرڈر دیدیا گیا کہ وہ نینی جیل سے باہر تشریف لے جائیں۔

یہ حضرات باہر تشریف لائے تو ضرورت محسوس کی گئی کہ جمعیۃ علماء ہند کا اجلاس عام منعقد کیا جائے۔ دو سال سے زیادہ گذر چکے تھے حالات میں بھی غیر معمولی تبدیلی ہوگئی تھی۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ زمانہ کچھ اس طرح کروٹیں لے رہا تھا کہ بالکل نئے قسم کے مستقبل کی روشنی نظر آرہی تھی۔

بہرحال سہارنپور کی درخواست منظور کی گئی اور ار جمادی الاولیٰ ۱۳۶۴ھ ۵۔۶ر مئی تا ۷ر مئی ۱۹۴۵ء کو بڑی شان کے ساتھ جمعیۃ علماء ہند کا اجلاس سہارنپور میں ہوا۔ حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی صدر اور مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب ناظم اعلیٰ منتخب کئے گئے۔

احقر کا نام زبانوں پر آیا تو احقر نے اسٹیج پر کھڑے ہوکر معذرت کرنی چاہی۔ مگر سیدی شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے جو اسٹیج پر تشریف فرما تھے خلاف معمول احقر کا دامن جھٹک کر کھینچا اور احقر کو نیچے بٹھا دیا۔ اب بجز تسلیم و رضا چارہ ہی کیا تھا "قہر درویش برجان درویش"۔

سہارنپور میں جلوس اور مجاہد ملت شہسوار

مجلس استقبالیہ جس کے رکن رکین مولانا محمد منظور النبی صاحب تھے جناب صدر کے جلوس کی تیاری کرچکی تھی۔ لیکن جناب صدر (حضرت شیخ الاسلام) کسی طرح تیار نہیں ہوئے تو مجاہد ملت رحمۃ اللہ نے دلداری کے لئے شرکت منظور کرلی۔ اب مجلس استقبالیہ کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ ناظم اعلیٰ کی سواری کے لئے گھوڑا تجویز کیا تھا۔ نہایت عمدہ شوخ چشم گھوڑا سواری کے لئے پیش کیا گیا۔

اچھا ہوا محمد میاں کو قابل التفات نہیں سمجھا گیا ورنہ محمد میاں کو گھوڑے کی سواری سے معذرت ہی کرنی پڑتی۔ اور مولوی کی پول کھل جاتی مگر مجاہد ملت کی شان دوسری تھی۔ آپ نے معذرت نہیں کی۔ آپ سوار ہوئے اور ایسی آن بان سے سوار ہوئے کہ معلوم ہوتا تھا کہ آپ پرانے شہسوار ہیں۔

مشق مجاہد ملت کو نہیں تھی۔ مگر خدا نے غیر معمولی جرأت بخشی تھی مشہور مقولہ ہے۔ ہمت مرداں مدد خدا۔

ہمیں بھی اس موقعہ پر حضرت شاہ شرف الدین بو علی قلندر رحمۃ اللہ علیہ (پانی پتی) کا شعر یاد آگیا جو انھوں نے حضرت خواجہ مخدوم جلال الدین کبیر الاولیاء (رحمۃ اللہ علیہ) کو دیکھ کر موزوں فرمایا تھا۔ جب مخدوم صاحب جوانی کے زمانہ میں گھوڑے پر سوار حضرت قلندر صاحب کے سامنے سے گذرے تھے تو حضرت قلندر صاحب نے فرمایا تھا۔

گلگوں لباس کردہ و سوار سمند شد
یاراں حذر کنید کہ آتش بلند شد

۱۹۴۵ء اور ۱۹۴۶ء کے عام انتخابات

اجلاس سہارنپور سے کچھ دنوں بعد ہی الیکشن کا وقت آگیا جو نہ صرف وزارتوں اور منسٹریوں کے حق میں فیصلہ کن تھا بلکہ قوم و ملت کے حق میں برہان و فرقان سمجھا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ کچھ من چلے جوانوں نے دیواروں پر جلی حروف سے لکھ دیا تھا

جس طرح معرکۂ پانی پت فیصلہ کن تھا
یہ الیکشن بھی فیصلہ کن ہوگا۔

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب جس طرح شیر برطانیہ کے مقابلہ میں شیر ببر تھے وہ اپنوں کے مقابلہ میں گربہ مسکین بننا پسند کرتے تھے۔ چنانچہ دیوبندی۔ بریلوی۔ اہل حدیث جیسے اختلافات میں پڑنا کبھی پسند نہیں کیا۔ مگر یہاں صورت کچھ ایسی تھی کہ اپنوں کے مقابلہ میں بھی مجاہد ملت کو شیر بننا پڑا۔ یعنی جس طرح انگریزی سامراج کے مقابلہ کے لئے آپ جاں باز و سربکف تھے ایسی ہی اس فرقہ واریت کے مقابلہ میں بھی (جسکو آج مسلم فرقہ واریت کہا جاتا ہے) آپ کو سرفروشانہ جد و جہد کرنی پڑی۔

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی شان بہت بلند و بالا ہے اپنے زمانہ کی کسی چیز کو صحابۂ کرام کے کسی معاملہ سے تشبیہ دینا بے ادبی ہے مگر سمجھنے اور سمجھانے کے لئے یہ عرض کرنا غیر مناسب نہ ہوگا کہ دو نظریات کے حامیوں میں جس قوت اور شدت سے اس زمانہ میں مقابلہ ہوا اس سے مشاجرات صحابہ کی ایک گھٹیا سی مثال سامنے آگئی۔

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی قدس اللہ سرہٗ العزیز نے مستند حوالوں سے اپنے رسالہ "پاکستان کیا ہے؟" میں ثابت کیا تھا کہ ہندوستان کی تقسیم انگریز کا طے کردہ منصوبہ ہے۔ آج جبکہ ۱۹۶۲ء ختم ہو رہا ہے اور ہماری آزادی کے پندرہ سال پورے ہو رہے ہیں ہندوستان اور پاکستان اپنے غیر معمولی ذرائع کے باوجود پسماندہ، مفلوج اور برطانیہ اور امریکہ کے دست نگر ہیں۔ جبکہ اسی عرصہ میں ہمارا پڑوسی ملک "چین" دنیا کی زبردست طاقت بن چکا ہے۔

اگر ہم ہندوستان و پاکستان کی اس پسماندگی کی علت معلوم کرنا چاہیں تو شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ الزام قطعاً ثابت ہو جاتا ہے کہ تقسیم کا مطالبہ ہمارے اپنے احساس و فکر کا نتیجہ نہیں بلکہ انگریزی ڈپلومیسی کا شاہکار تھا جس نے اپنے مطلب کی بات ہماری زبان سے کہلوائی۔

لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اپنی ہی جماعت اور اپنی ہی ملت کے بہت سے بزرگ جن کی حق پسندی، صاف گوئی اور دیانت پر شک و شبہ نہیں کیا جا سکتا تھا وہ اس کو صحیح معنی میں اسلامی حکومت کا سنگ بنیاد سمجھتے تھے جس پر خلافت راشدہ کے نمونہ کی سیاسی عمارت قائم کی جا سکتی تھی۔ اس جماعت کے نزدیک پاکستان ایک پُرتقدس تصور رکھتا تھا۔ جس کو کامیاب کرنے کی سرگرمیوں میں سب کچھ قربان کر دینا اسلامی حمیت و غیرت کا تقاضا اور ہر ایک غیور و خوددار مسلمان کا فرض تھا۔

غور فرمایئے۔ کس قدر فرق تھا ان دونوں نظریوں میں۔ ایک تقسیم ہند کو انگریز کی پُرفریب سیاست کا شاہکار سمجھتا تھا۔ مسلمانوں کے لئے تباہ کن ہندوستانی قومیت کے لئے مرض لازوال۔ اور دوسرے کے خیال اور عقیدہ میں پاکستان ایک پُرتقدس تصور تھا جسکو الہام سبحانی اور القاء ربانی کہنے میں بھی اس کو تامل نہیں ہوتا تھا۔

ہر ایک فریق پوری صداقت اور دیانتداری کے ساتھ اپنے اپنے نظریہ پر جما ہوا تھا۔ اس کی حمایت میں جان قربان کر دینے کو شہادت اور مخالفت کرنے والوں کی پوری پوری مخالفت کو اپنا فرض سمجھتا تھا۔

ارباب علم کا فتویٰ اس صورت میں یہی ہوگا کہ جو صاحبان سچائی اور دیانتداری کے ساتھ جس نظریہ کے بھی حامی تھے ان میں سے کسی ایک کو خطاء اجتہادی میں مبتلا تو قرار دیا جا سکتا ہے۔ گنہگار کسی کو نہیں کہا جا سکتا۔

مجاہد ملت مولانا محمد حفظ الرحمن صاحب ان صاحب بصیرت علماء میں سے تھے جن کی دوررس نظر انگریزی ڈپلومیسی پر تھی۔ وہ اس فریب نظر سے آگاہ تھے جو ایک تباہ کن تصور کو پُرتقدس ظاہر کر رہا تھا وہ اس سے بھی واقف تھے کہ فرقہ واریت کا مہلک مرض خود مسلمانوں کے لئے وبال جان بن جائے گا۔

وہ ایسی سیاست کے حامی تھے جو مرکز کو قوی اور ضرورتمند کو بے نیاز کر دے۔ وہ پاکستانی نظریہ کے فلسفہ کو ملت اسلامیہ کے حق میں بہت بڑی خیانت قرار دیتے تھے کیونکہ اس کا مفاد صرف یہ تھا کہ دولت مند کی دولت میں اضافہ ہو جائے، رہے وہ ضرورتمند جو امداد کے محتاج تھے جن کی ضرورت پوری کرنے کے لئے اقلیت اور اکثریت کا یہ تمام ہنگامہ برپا تھا۔ یعنی وہ مسلمان جو اقلیت میں تھے ان کی دشواریوں اور پریشانیوں کا کوئی حل اور کوئی علاج پاکستان کے حامیوں کے پاس نہیں تھا۔

اس کے علاوہ مجاہد ملت کی نظر ان نتائج پر بھی تھی جو اس وقت رونما ہو سکتے تھے۔ جب تقسیم ہند کا نظریہ بروئے کار آتا جیسا کہ وہ پیش آئے بلکہ تصور سے زیادہ ہیبتناک صورت میں پیش آئے۔

ان وجوہات کی بنا پر مجاہد ملت نے اپنے دونوں مقتدار (شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی اور امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد رحمہما اللہ) کا دست راست اور اپنے دوسرے بزرگوں اور رفقاء کار کا بہترین ترجمان بن کر وہ کردار پیش کیا جو صاحب العزیمت، عالی حوصلہ، شجیع اور بہادر مجاہد پیش کر سکتا ہے جس کو نہ لومۃ لائم کا خوف ہو۔ نہ دار و رسن کی دہشت اس کے دل میں ہو۔

ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں آپ پہونچے اور اس وارفتہ مخلوق کو جو جذبات کے خونیں سیلاب میں بہہ رہی تھی اس کی وارفتگی کے نتائج سے آگاہ کیا۔

اسی زمانہ کا وہ واقعہ ہے کہ شیخ الاسلام قدس اللہ سرہ العزیز کے ساتھ آپ ملتان سے واپس ہو رہے تھے۔ لاہور سے پنجاب میل کے فسٹ کلاس میں آپ حضرت شیخ کے ساتھ سوار ہوئے۔

لاہور ریلوے کے لیگی عناصر نے ریلوے کے ٹیلیفون کو نہایت غلط اور افسوسناک مقصد کے لئے استعمال کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ امرتسر جالندھر اور لدھیانہ وغیرہ یعنی پنجاب کے جن جن اسٹیشنوں پر میل

ٹھیرنے والا تھا وہاں آبرو باختہ لوگوں کا ہجوم اکٹھا ہوگیا اور انھوں نے شرمناک نعروں سے آگے بڑھ کر آپ کے ڈبہ پر اینٹ پتھر برسائے۔ اللہ تعالےٰ ان کا محافظ تھا کہ ان دونوں بزرگوں کا بال بیکا نہیں ہوا۔ مجاہد ملت کے صرف ایک ہاتھ پر معمولی سا خراش آیا۔ البتہ کھڑکیوں کے شیشے چکنا چور ہوگئے۔ اور جب لکڑی اور جالیوں والی کھڑکیاں چڑھادی گئیں تو وہ بھی جگہ جگہ سے ٹوٹ گئیں۔

اسی زمانہ میں مسلم پارلیمنٹری بورڈ قائم کیا گیا جو جمعیۃ علمار ہند خدائی خدمتگار، مجلس احرار اسلام وغیرہ جماعتوں پر مشتمل اور لیگ کے مقابلہ میں ان جماعتوں کا متحدہ محاذ تھا۔ جس کے ٹکٹ پر جگہ جگہ امیدوار کھڑے کیے گئے (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو علمار حق جلد دوم)

یہ سرفروشانہ جدّوجہد پانسہ تو نہیں پلٹ سکی۔ مسلم حلقوں میں عموماً کامیابی مسلم لیگ ہی کو ہوئی۔ پھر بھی تقریباً تیس سیٹیں یو۔ پی بہار وغیرہ میں بورڈ کے امیدواران کو حاصل ہوئیں اور جب دونوں کے اعداد و شمار حاصل کیے گئے تو مسلمانوں کے ۳۵ فیصدی ووٹ پاکستان کے خلاف قوم پرور (نیشنلسٹ) مسلمانوں کو ملے تھے۔

یہ تھی سیاست کے اس موڑ پر مجاہد ملت کی قائدانہ جدّوجہد

جُرم کیا تھا؟

میرے احباب اور بزرگ یہ تلخ نوائی معاف فرمائیں کہ اس دور میں ایک بڑا ظلم جمعیۃ علمار ہند پر کیا جاتا رہا۔

برطانوی مشنری جمعیۃ علمار ہند کے خلاف کام کر رہی تھی اور اس کو ایسا ہی کرنا چاہیئے تھا کیونکہ جمعیۃ علمار ہند اس کی حریف تھی اور ہندوستان سے اُس کا نام و نشان مٹانا چاہتی تھی۔

یہ مشنری پروپیگنڈے کی تمام طاقت دو باتوں پر صرف کر رہی تھی اول یہ کہ کانگریس ہندوؤں کی جماعت ہے اور آزادی کا مطالبہ ہندوؤں کا ہے مسلمان اس کے حامی نہیں ہیں۔

دوسرے یہ کہ جمعیۃ علمار ہند اور قوم پرور مسلمان فریب خوردہ ہیں۔ یہ کوئی مثبت پالیسی نہیں رکھتے۔ صرف کانگریس کی ہمنوائی ان کا نصب العین ہے۔

جمعیۃ علمار ہند اور قوم پرور مسلمانوں کی اتنی طاقت نہیں تھی کہ برطانوی پروپیگنڈے کا مقابلہ کامیابی کے ساتھ کر سکتے۔ خصوصاً ایسی صورت میں کہ مسلمانوں کی اکثریت کو اس پروپیگنڈے نے نہ صرف متاثر بلکہ مسحور بنا دیا تھا، لامحالہ جمعیۃ علمار ہند کی آواز "نقارخانہ میں طوطی کی صدا" بنکر ناکام ہوتی رہی۔

لیکن واقعہ یہ ہے کہ جمعیۃ علمار ہند پاکستان کا بہترین بدل تلاش کر چکی تھی اور ایک ایسا فارمولا منظور کر چکی تھی کہ وہ کامیاب ہو جاتا تو ملک کی طاقت میں یہ رخنہ نہ پڑتا کہ ایک ہی ملک کے دو حصے جن کے متعلق اب یہ کہا جا رہا ہے کہ کسی بھی حصہ کا کامیاب دفاع اور تحفظ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ان دونوں کی فوجی کمان ایک نہ ہو۔ یہ دو حصے ایک دوسرے کے مقابلہ میں تیر و ترکش سنبھالے ہوئے ہیں اور مالیہ کا بڑا حصہ جو تعمیر و ترقی یا کسی بیرونی طاقت کے مقابلہ پر دفاعی طاقت کے مضبوط بنانے میں صرف ہوتا، اپنے ہی ہاتھ پاؤں کے بجائے پر صرف ہو رہا ہے۔ اور یہ صورت کہ بھارت کی مسلم اقلیت غضبناک اکثریت کے شکنجہ میں کسی ہوئی بے یار و مددگار واویلا کر رہی ہے، یہ افسوسناک صورت بھی پیش نہ آتی۔ غور فرمایئے جمعیۃ علمار ہند کے فارمولے کے اہم اجزا یہ تھے۔

۱۔ صوبے خود مختار ہوں

۲۔ مرکز کو صرف وہی اختیارات ملیں جو تمام صوبے متفقہ طور پر مرکز کے حوالے کر دیں اور جن کا تعلق تمام صوبوں سے یکساں ہو۔

۳۔ ان مشترک اختیارات کے علاوہ جن کی تصریح مرکز کے لئے کر دی گئی ہو، باقی تمام مصرحہ کردہ اور غیر مصرحہ اختیارات صوبوں کے حوالے ہوں۔

۴۔ مرکز کی تشکیل ایسے تناسب سے ہو کہ اکثریت اقلیت پر زیادتی نہ کر سکے۔ مثلاً پارلیمنٹ کے ممبروں کی تعداد کا تناسب یہ ہو۔

ہندو ۴۵ مسلمان ۴۵۔ دوسری اقلیتیں ۱۰

۵۔ جس مسئلہ کے متعلق مسلم ممبران کی اکثریت فیصلہ کر دے کہ اس کا تعلق مذہب سے ہے، وہ پارلیمنٹ میں پیش نہ ہو سکے۔

اس فارمولے کا مفاد یہ ہوتا۔

(الف) اہم پورٹ فولیو (قلمدان وزارت) کی تقسیم مساوی طور پر ہوتی

(ب) صوبہ سرحد، صوبہ سندھ، صوبہ بلوچستان اور اگر کشمیر کو ایک صوبہ کی حیثیت دی جاتی تو صوبہ کشمیر، مذہبی، معاشی، تہذیبی اور تمدنی

امور میں قطعاً خود مختار ہوتے ۔

(ج) پورا صوبہ پنجاب ۔ راولپنڈی سے لیکر ضلع سہارنپور کی سرحد تک ۔

(د) پورا صوبہ بنگال جس کا دار الحکومت کلکتہ کا عظیم شہر ہوتا ۔ مسلم اکثریت کے زیر اقتدار رہتا ۔

(ہ) صوبہ دہلی اور صوبہ آسام کی سیاست اور حکومت میں مسلمانوں کا حصہ تقریباً مساوی ہوتا ۔ کیونکہ ان دونوں صوبوں میں مسلمان ۴۴ - ۳۵ فی صدی تھے ۔

(و) ہندوستان کے باقی صوبوں میں مسلمان لاوارث یتیم کی طرح نہ ہوتے ۔ کیونکہ :۔

۱۔ ملازمتوں اور اسمبلیوں میں ان کا حصہ حسب سابق ۳۰ یا ۳۳ فی صدی ہوتا ۔

۲۔ وزارتوں میں ان کی موثر شمولیت ہوتی ۔

۳۔ مذہبی اور تمام فرقہ وارانہ امور میں ان کو حق استرداد حاصل ہوتا ۔

۴۔ وہ ایسے مرکز کے ماتحت ہوتے جس میں ان کی تعداد مساوی ورنہ کم از کم ۳۳ فیصدی ہوتی ۔ اور تمام فرقہ وارانہ امور کی باگ ڈور ان کے ہاتھ میں ہوتی ۔ کیونکہ اسمبلی ۔ پارلیمنٹ یا کیبنٹ ۔ مسلم ممبران کی موافقت کے بغیر کوئی فیصلہ صادر نہ کر سکتی ۔

اس فارمولے کو اس پُر آشوب دور میں مسلمانوں کی اکثریت نے یا تو سنا ہی نہیں اور اگر سنا تو جذبات میں اس درجہ وارفتہ تھے کہ سمجھنے کی کوشش نہیں کی ۔ بہرحال "مضیٰ ما مضیٰ" اب اس داستان پارینہ سے کیا فائدہ ، مگر مجاہد ملت رحمۃ اللہ کے حالات کے تذکرہ میں اس کا تذکرہ ضروری ہے ۔ تاکہ کل نہیں تو آج اندازہ ہو سکے کہ مخالفت کرنے والے کہاں تک حق پر تھے اور مجاہد ملت کی سرفروشانہ جانفشانی کس مقصد کے لئے تھی ۔

جمعیۃ علماء ہند کا فارمولا ایک مثبت فارمولا تھا اور جمعیۃ علماء ہند کے ارکان کو اس پر اتنا وثوق اور یقین تھا کہ وہ ہر ایک کے سامنے اس کو پیش کر سکتے تھے ۔ چنانچہ وزارتی مشن آیا تو جمعیۃ علماء ہند کے نمائندہ حضرات نے اس کو نہ صرف یہ کہ پیش کیا بلکہ اس پر مشن کی پسندیدگی بھی حاصل کی ۔

مولانا آزاد مرحوم نے اپنی مشہور کتاب (انڈیا ونس فریڈم) میں واضح کر دیا ہے کہ ان کا پیش کردہ فارمولا" وزارتی مشن" نے منظور کر لیا تھا یہی وہ فارمولا ہے جس کو مولانا آزاد نے پیش فرمایا تھا ۔ مزید تفصیل چند سطروں کے بعد ملاحظہ فرمائیں ۔

وزارتی مشن کی آمد اور جمعیۃ علماء ہند کی نمائندگی

ابھی صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات تمام ہندوستان میں مکمل نہیں ہوئے تھے کہ ۲۳ مارچ ۱۹۴۶ء کو وزارتی مشن کراچی پہونچ گیا ۔ لارڈ پیتھک لارنس وزیر ہند، سر اسٹیفورڈ کرپس اور جنرل الیگزینڈر، وفد کے ارکان تھے ۔ ایک ہفتہ آرام کرنے کے بعد یا تازہ حالات کے پورے مطالعہ کے بعد یکم اپریل سے مشن نے ہندوستانی لیڈروں سے ملاقات شروع کی

کل ہند مسلم پارلیمنٹری بورڈ کے صدر کی حیثیت سے شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ کو دعوت دی گئی تھی ۔ اور چونکہ مسلم پارلیمنٹری بورڈ کے ساتھ دوسری جماعتیں بھی اشتراک عمل کئے ہوئے تھیں لہذا جناب صدر کو اجازت دی گئی تھی کہ وہ مزید تین افراد کو اپنے ساتھ لے آئیں ۔ چنانچہ عبدالمجید صاحب خواجہ مرحوم (صدر آل انڈیا مسلم مجلس) شیخ حسام الدین صاحب ، صدر آل انڈیا مجلس احرار اسلام شیخ ظہیر الدین صاحب صدر آل انڈیا مومن کانفرنس ۔ ان تینوں جماعتوں کے سربراہوں کی حیثیت سے اور جناب حافظ محمد ابراہیم صاحب (مرکزی وزیر برقیات) ترجمان کی حیثیت سے حضرت شیخ الاسلام کے ساتھ تشریف لے گئے ۔

اس نمائندہ جماعت کو ایک ایسے صاحب بصیرت سیاسی کھلاڑی کی بھی ضرورت تھی جو نمائندگان پریس کی شوخیوں کا جواب بھی دے سکے ۔ اس کی حاضر جوابی دوسری پارٹیوں کے نکتہ چینیوں کو خاموش کر سکے ۔ پُرمغز و مدلل خطابت ہر ایک دل کو مٹھی میں لے سکے ۔ ایسی شخصیت جوان اوصاف کی حامل ہو، مولانا محمد حفظ الرحمن صاحب کی شخصیت تھی ۔ لہذا آپ کو بھی اس نمائندہ وفد میں شریک کیا گیا ۔

۱۶ اپریل ۱۹۴۶ء کو ۴ بجے شام سے سوا پانچ بجے تک مشن سے ملاقات ہوئی ۔ جمعیۃ علماء ہند کا فارمولا وزارتی مشن کے سامنے پیش کیا گیا وزارتی مشن نے اس فارمولے سے یہاں تک دلچسپی لی کہ مقررہ وقت یعنی (نصف گھنٹہ) سے زائد ۴۵ منٹ فارمولے کے مضمرات اور اس کے مفادات کو سمجھنے سمجھانے پر صرف کر دیئے ۔

حضرت مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مشہور کتاب (انڈیا ونس فریڈم) میں ایک فارمولے کا تذکرہ کیا ہے جس کو وزارتی مشن

خاص طور پر پسند کیا تھا اور اسی کی بنیادوں پر اپنا اعلان مرتب کیا تھا مولانا آزاد نے اس کتاب میں اس فارمولے کو اگر منسوب کیا ہے تو صرف اپنی جانب لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ جمعیۃ علماء ہند کا فارمولا تھا جو جمعیۃ علماء ہند کے اجلاس لاہور (مارچ ۱۹۴۲ء) میں مرتب کیا گیا۔ اور اجلاس سہارنپور (مئی ۱۹۴۵ء) میں اس کی مزید توثیق اور تشریح کی گئی تھی۔

سیاسیات سے دلچسپی رکھنے والے اخبار بیں طبقہ کو تقریباً سولہ سال پہلی یہ بات فراموش نہیں ہوئی ہوگی کہ مذکورہ بالا ملاقات سے ایک ماہ بعد ۱۶ مئی ۱۹۴۶ء کو وزارتی مشن نے جو سفارشات پیش کیں وہ انہیں لائنوں اور انہیں خطوط پر تھیں جن کی طرف جمعیۃ علماء ہند کا فارمولا اشارہ کر رہا تھا۔

وزارتی مشن نے پاکستان کی تردید کرتے ہوئے نظریۂ پاکستان کو ہندوستان کے لئے مضرت رساں قرار دیا تھا۔

ان سفارشات کی بنیاد پر ۲ ستمبر ۱۹۴۶ء کو عارضی حکومت کا قیام عمل میں آیا تو کیبنٹ کے ۱۴ ممبروں میں پانچ مسلمان تھے یعنی $\frac{1}{3}$ سے کچھ زیادہ اور مالیات کا اہم ترین محکمہ نواب زادہ لیاقت علی خاں کے سپرد کیا گیا تھا۔

مگر بخت واژگون نے پھر پلٹا کھایا۔ لیگ کی طرف سے ردِ عمل تو لازمی تھا۔ لیکن برطانوی ایجنٹوں کی دورخی پالیسی نے اس کی نوعیت میں خون ریزی بھی شامل کردی۔ انتہا یہ کہ تقسیم کا سوال پھر شدت سے سامنے آیا اور اس مرتبہ کانگریس کی غیر معمولی اکثریت بھی تقسیم کی حامی بن گئی۔

سیاست کا یہ دور بھی نہایت پُر پیچ تھا اور عجیب بات یہ ہے کہ اس کے متوقع نتائج کسی ایک فیصلہ پر متحد کرنے کے بجائے ہر ایک فریق کے لئے متضاد دلائل مہیا کر رہے تھے۔

مثلاً یہ بات مشہور ہے کہ سردار پٹیل جو اس عارضی حکومت میں وزیر داخلہ بنائے گئے تھے ان کو اس سے سخت تکلیف ہوئی کہ وہ اپنے اختیارات سے ایک چپراسی کا تقرر بھی نہیں کر سکتے۔ چپراسی کے لئے بھی وزیر مال نواب زادہ لیاقت علی خاں کی منظوری کے محتاج ہیں۔ (جنھوں نے پارلیمنٹ سے ایک ایسا میزانیہ منظور کرا لیا تھا جس نے ہندوستان کے سرمایہ داروں کو سراسیمہ کر دیا تھا۔)

اس ایک واقعہ سے قوم پرور مسلمانوں کی یہ دلیل مضبوط ہو رہی تھی کہ متحدہ ہندوستان میں مسلمان ایک فیصلہ کن پوزیشن اختیار کر سکتے ہیں بلکہ ایسی حیثیت اختیار کر سکتے ہیں کہ اکثریت ان کی دست نگر بن جائے۔

اور اسی ایک واقعہ نے سردار پٹیل جیسے ہندوازم کے حامیوں کو یہ سبق دیدیا تھا کہ تقسیم ضروری ہے۔ کیونکہ سیاسی اقتدار میں اگر مسلمانوں کی شرکت رہی تو ان کو ہندوازم کے چمکانے اور من مانی کارروائی کرنے کی کھلی چھٹی نہیں مل سکے گی۔

فرقہ پرستی کہاں تھی

کہا جاتا ہے کہ مسٹر جناح اور اُن کے ساتھی مسلم رہنماؤں کی ذہنیت فرقہ پرست تھی۔ مگر سردار پٹیل جیسے قوم پرست نے جس ذہنیت کا ثبوت پیش کیا اس کے لئے بھی فرقہ پرستی کے علاوہ کوئی اور عنوان نہیں ہو سکتا۔ الفاظ میں اگر تبدیلی کی جائے تو سردار پٹیل کی ذہنیت کے لئے "زہریلی سامپرداکتا" کا لفظ استعمال کیا جائیگا۔

بہرحال سیاست کا یہ وہ نازک موڑ تھا جس کی نظیر شاید ہندوستان کی پوری تاریخ میں نہ مل سکے۔

انڈین نیشنل کانگریس کو عام طور پر کامیاب تصور کیا جاتا ہے بیشک وہ اس لحاظ سے کامیاب رہی کہ انگریز کو ہندوستان بدر کر کے سیاسی اقتدار کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ لیکن اگر کسی بااصول جماعت کی کامیابی کا مدار اصول کی کامیابی پر رکھا جائے تو صحیح بات یہ ہے کہ کانگریس ناکام رہی کیونکہ اس کے دونوں اصول یعنی پورے ہندوستان کا اتحاد۔ اور بلا تفریق مذہب و ملت تمام ہندوستانیوں کی قومیت کا اتحاد۔ یہ دونوں اصول پاش پاش ہو گئے۔

مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ میں کانگریس کا عذر یہ تھا۔

> "حالات نے ہر ایک دماغ کو مجبور کر دیا ہے کہ جو حل بھی موجودہ اُلجھاؤ کو ختم کر سکتا ہو اس کو تسلیم کر لے۔ کانگریس کے سامنے یہ سوال نہیں تھا کہ کوئی نصب العین منظور کیا جائے بلکہ سوال یہ تھا کہ گومگو اور غیر اطمینانی کی موجودہ تباہ کن حالت باقی رہے یا سب سے پہلی فرصت میں اس کو ختم کر دیا جائے۔"

کانگریس متحدہ ہندوستان کے نظریہ سے جُدا نہیں
ہوئی لیکن وہ حق خودارادیت کو بھی تسلیم کرچکی تھی
کہ جو علاقے یونین میں شامل نہ ہونا چاہیں، انھیں مجبور
کرنے کے وہ خلاف ہے۔"

یہ دماغوں کی مجبوری کیا تھی۔ یہ وہی فرقہ داریت تھی جو دونوں پلیٹ فارموں پر رقص کر رہی تھی۔ جس کا افسوس ناک اثر یہ تھا کہ ۳ جون ۱۹۴۷ء کو تقسیم ہند کی اسکیم کا اعلان ہوا۔ اور ۱۴ جون تک کانگریس اور مسلم لیگ (ہندوستان کی دونوں بڑی جماعتوں نے) اس کے حق میں منظوری صادر کردی۔

جمعیۃ علماء ہند اور مسئلہ تقسیم

لیکن تاریخی نوشتوں میں یہ صداقت اور اصول پسندی سنہری حرفوں سے درخشاں رہنی چاہیئے کہ اس بدترین بحرانی دور میں جبکہ مولانا ابوالکلام آزاد جیسا سنجیدہ اور دانشمند مدبر بھی ہر ایک دماغ کو مجبور پا رہا تھا، جو پلیٹ فارم اس مجبوری سے مستثنیٰ رہا وہ جمعیۃ علماء ہند کا پلیٹ فارم تھا۔ اور ممبران کانگریس میں جو رہنما اس مجبوری سے محفوظ رہا، وہ مجاہد ملت حفظ الرحمٰن تھا۔

ابھی تقسیم ہند کا اعلان نہیں ہوا تھا۔ صرف ارباب بصیرت اراکین جمعیۃ علماء ہند نے اس کے آثار سیاسی فضا میں محسوس کئے تھے کہ اسی احساس کی جمعیۃ علماء ہند نے اپنے اجلاس لکھنؤ مورخہ ۱۰ مئی ۱۹۴۷ء میں تقسیم کی مضرتیں ظاہر کرتے ہوئے اس سے بیزاری کا اظہار کیا اور جب ۳ جون کو تقسیم ہند کا باضابطہ اعلان کر دیا گیا تو ۲۴ جون ۱۹۴۷ء کو جمعیۃ علماء ہند کی مجلس عاملہ نے دوبارہ بیزاری کا اظہار کیا اور سختی سے تقسیم ہند کی مخالفت کی۔

مجاہد ملتؒ کی استقامت اور جرأت

۱۴ جون ۱۹۴۷ء کو کانسٹی ٹیوشن ہاؤس دہلی میں کانگریس کا اجلاس ہوا جس میں تقسیم ہند کی تجویز پیش کی گئی۔ تجویز پیش کرنے والے پنڈت ولبھ پنت وزیر اعظم یوپی تھے اور تائید کرنے والے ہندوستان کے بہترین مُدبّر اور خطیب امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد تھے۔ کانگریس ہائی کمانڈ جو ہندوستان کی سب سے اونچی شخصیتوں کا مجموعہ تھا تجویز کا حامی تھا۔

اجلاس میں شریک ہونے والے ممبروں میں سے ممکن ہے بہت سے ممبر اس تجویز کے حامی نہ ہوں۔ مگر اول تو ہائی کمانڈ کی مخالفت کسی بھی موقع پر آسان کام نہیں خصوصًا ایسی صورت میں کہ پوری فضا ایک رنگ میں رنگی ہوئی ہو اس کی مخالفت میں صرف وہی شخص آواز اٹھا سکتا ہے جو " لا یخافون فی اللہ لومۃ لائم " کا پیکر اور اس کا صحیح مصداق ہو اور جس کی صداقت پسندی ہر ایک مرعوبیت سے آزاد ہو۔

مجاہد ملت جب تقسیم ہند کو ملک اور ملت دونوں کے لئے جُرم عظیم سمجھتے تھے تو آپ نے قطعًا گوارا نہیں کیا کہ کسی بھی نوع سے اس جُرم عظیم کی حمایت کریں۔

مجاہد ملت اپنا رشتہ اپنے مالک حقیقی سے جوڑے ہوئے تھے اُن کو یقین تھا کہ انہیں اس کی بارگاہ میں جواب دہی کرنی ہے۔ وہ سمجھتے تھے اور صحیح سمجھتے تھے کہ کلمہ حق کے اعلان اور اظہار کے موقع پر سکوت بھی جُرم ہے۔

جمعیۃ علماء ہند کے ممتاز ارکان میں سے صرف مجاہد ملت آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ممبر تھے۔ آپ نے وہ فرض جو جمعیۃ علماء ہند کے ناظم عمومی ہونے کی حیثیت سے آپ پر عائد تھا۔ اور جس کو نہ صرف جماعتی بلکہ ملی اور قومی تقاضا اور حق و صداقت کا مطالبہ تصوّر کرتے تھے اس کو پوری جرأت اور استدلال و خطابت کے بہترین سلیقہ کے ساتھ ادا کیا۔

عجیب اتفاق ہے کہ اے۔ آئی۔ سی۔ سی کے تقریبًا چھ سو ارکان میں سے اس تجویز کی مخالفت کی توفیق صرف ایسے دو ممبروں کو ہوئی جو آپس میں بہت سی باتوں میں ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ مگر اس مسئلہ میں متحد ہو گئے تھے۔

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کے علاوہ دوسرے ممبر جنھوں نے تقسیم کی اس تجویز کی مخالفت کی تھی ہندو تہذیب کے مشہور علمبردار "پرشوتم داس ٹنڈن" تھے۔

بیشک جمعیۃ علماء ہند کی تجویز۔ اظہار بیزاری اور اظہار برأت پھر اجلاس کانگریس میں کانگریس کی تجویز کی مخالفت کامیاب نہیں ہوسکی لیکن مجاہد ملت اور اُن کے علاوہ جمعیۃ علماء ہند کے معزز ارکان کو اس بات کا اطمینان ہے کہ وہ اس تباہ کن اور خونریز تقسیم کی ذمہ داری سے محفوظ رہے اور خون بے گناہ کا کوئی دھبہ اُن کے دامن پر نہیں لگ سکا۔

❁ ❁ ❁ ❁ ❁ ❁

۱۹۴۷ء اور مجاہد ملت رحمۃ اللہ

۱۹۴۷ء کے ہنگامہ میں لاکھوں مسلمان ترک وطن کر کے چلے گئے پھر بھی ساڑھے تین کروڑ مسلمان (جو اب خدا کے فضل سے ۶ کروڑ اور ایک قول کے مطابق آٹھ کروڑ ہوگئے ہیں) باقی رہ گئے۔ اس طرح اگر مجاہد ملت رحمۃ اللہ علیہ بھی ہندوستان میں رہ گئے اور پاکستان نہیں گئے تو کوئی قابل تذکرہ بات نہیں ہے۔ قابل تذکرہ وہ انقلاب ہے جو مجاہد ملتؒ نے ان رہنے والے مسلمانوں کے ذہنوں، ان کے حوصلوں اور ارادوں میں برپا کیا۔ قابل تذکرہ وہ تعمیر ہے مجاہد ملتؒ جس کے معمار اول بنے۔

۱۹۴۷ء کے وہ لرزہ خیز ہنگامے جن سے صرف انسانوں کے دل ہی نہیں لرزتے بلکہ انسانیت کی نگاہیں نیچی اور شرافت کی گردن جھک جاتی ہے۔ ان کا فراموش ہوجانا ہی بہتر ہے۔ ان کی یاد تازہ کرنا نہ ملک کے لئے مفید ہے نہ قوم وملت کے لئے۔ لیکن کسی "مجاہد" کی حیات عزیز کے خدوخال نمایاں کرنے کے لئے اگر ان کی طرف کچھ اشارے کرنے پڑیں تو وہ تاریخ کی ایک ضرورت ہوگی۔ جس سے نظر پھیر لینا بھی درست نہیں بلکہ درحقیقت تاریخ کے حق میں ناقابل معافی خیانت اور جرم ہے بیشک ہم اس تاریخ سے سبق بھی لے سکتے ہیں اور تاریخ کا اصل منشا یہی ہے کہ ماضی کی خرابیوں سے سبق لیکر مستقبل کو بہتر بنائیں۔

۱۹۴۷ء کا سب سے بڑا المیہ مشرقی اور مغربی پنجاب کی تبادلہ آبادی کا فیصلہ تھا جو چند چوٹی کے لیڈروں اور برطانوی ایجنٹوں نے اس طرح کیا کہ ان کروڑوں انسانوں کو اس کی خبر تک نہیں تھی جو اس خونیں فیصلہ سے تباہ وبرباد ہونے والے تھے۔

سرکاری فیصلوں کا نفاذ اخلاق اور رحم وکرم کی شعاعوں سے نہیں ہوا کرتا۔ رائفلوں، مشین گنوں اور ٹینکوں کی گرج اور توپوں کے دھماکے اس کے نفاذ کی خبر دیا کرتے ہیں جو ساتھ ساتھ انسانی خون کی ارزانی کا بھی اعلان کردیتے ہیں۔

تبادلۂ آبادی کے نتیجہ میں ہند اور پاکستان کی اقلیتوں کی واسطہ ایسی بھیڑ سے پڑا جن سے نہ دید شنید تھی نہ جان پہچان۔ ان کی زبان جدا۔ ان کی معاشرت علیحدہ۔ جو اپنے اپنے وطن میں تباہ وبرباد ہوکر اور زیادہ تر وہ تھے جو اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کی تڑپتی ہوئی لاشوں کو چھوڑ کر یہاں آئے تھے۔ بہت سوں کی بہنیں اور بیٹیاں جدا ہوگئی تھیں۔ کتنے ہی وہ تھے جو اپنی رفیقۂ حیات کی بے عزتی سے مضطرب اور بے چین تھے۔ ان کے دماغ جوش انتقام سے کھول رہے تھے۔ آنکھیں سرخ۔ چہروں پر درندگی کی وحشت برس رہی تھی۔

فوجوں کی تقسیم نے اس وحشت انگیز اور بربریت نواز بھیڑ کو جس کی تعداد لاکھوں تھی جگہ جگہ مسلح بھی کردیا اور حکومت کو اگر وہ امن قائم کرنا چاہے تو بے دست وپا بنایا تھا۔ یہی حالت پولیس کی بھی ہوئی۔ وہ خود بخود تقسیم ہوگئی۔ دہلی کی پولیس میں مسلمانوں کی تعداد ایک ہزار کے قریب تھی۔ اس نے سب سے پہلے اپنی جان کی فکر کی۔ اور بے پناہوں کی پناہ بننے کے بجائے پناہ گزینوں کے کیمپ میں جاکر پناہ گزین بن گئی۔

پاکستانی اقلیتوں نے ہندوستان پہونچکر مسلمانوں کو الٹی میٹم دیا۔ "پاکستان بنانے کے ذمہ دار تم ہو۔ اب تمہارے لئے یہاں پناہ نہیں ہے۔" ہندوستان کے فرقہ پرستوں نے ان کی تائید کی۔ بہت سی ریاستیں جو کانگریس گورنمنٹ کی بحالی اور مضبوطی کو اپنے لئے پیغام فنا سمجھتی تھیں فرقہ پرستوں کی ہمنوا بن گئیں۔ اب ان کے پاس نہ سرمایہ کی کمی تھی نہ اسلحہ کی۔

ان قیامت خیز اور طوفان انشاں حالات نے پورے صوبہ دہلی اور مغربی یوپی کے تقریباً ایک درجن اضلاع اور راجستھان کے ان تمام علاقوں کو جو پاکستانی سرحد سے ملتے تھے جن میں الور اور بھرت پور کو خاص شہرت حاصل ہوئی، تباہی اور بربادی کے اس سیلاب کی نذر کردیا۔ جو مغربی پنجاب، سندھ اور فرنٹیر وغیرہ سے امنڈ امنڈ کر آرہا تھا۔

خود مسلمانوں کی حالت یہ تھی کہ وہ سب لیڈر اور رہنما جن کے بل بوتے پر پاکستان کے حامیوں نے گذشتہ دس سال تک آسمان سر پر اٹھائے رکھا تھا، ایک ایک کرکے رخصت ہو چکے تھے۔

پاکستان کا ہر ایک حامی نہ صرف مصیبت زدہ اور مایوس تھا بلکہ اپنے آپ کو مجرم سمجھ رہا تھا۔

غداری کا ایک عام الزام، پاکستانی شرنارتھیوں اور ہندوستانی فرقہ پرستوں کی گرجتی ہوئی کرخت آوازوں کے ساتھ ان کے سر تھوپا جارہا تھا۔

ان حالات میں تمام قوم پرور مسلم رہنماؤں کے سامنے خود اپنے متعلق

ایک سوال تھا:۔

وہ ہندوستان میں رہیں تو کس حیثیت سے۔ خود ان کی پوزیشن کیا ہو۔ اور عام مسلمانوں کی پوزیشن کیا ہو۔ بالخصوص ان مسلمانوں کی پوزیشن کیا ہو۔ جو پاکستان کے حامی تھے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی۔ حضرت علامہ مولانا محمد کفایت اللہ صاحب مفتی اعظم ہند امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد۔ سحبان الہند حضرت مولانا احمد سعید صاحب اور ان سے وابستہ حضرات نے سب ہی نے ان سوالات کو عزم و ہمت اور بلند حوصلہ کے ساتھ حل کیا۔ مگر جہاں تک دہلی کا تعلق ہے جو دارالسلطنت ہونے کی وجہ سے اور اس بنا پر کہ اصل تعداد سے کئی گنا زیادہ تعداد جوش انتقام سے بپھرے ہوئے پناہ گزینوں کی یہاں ہو گئی تھی ان ہنگاموں کا سب سے بڑا مرکز بن گیا تھا) دہلی کے متعلق بلاخوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ عوامی لیڈر کی حیثیت سے سب سے زیادہ جرأت اور ہمت کے ساتھ جس نے ان سوالات کو حل کیا۔ اور نہ صرف حل کیا بلکہ جس نے حل کردہ منصوبہ کو کامیاب بنانے کے لئے، جان کی بازی لگا کر شب و روز کے ہر ایک لمحہ کو اپنی جد و جہد سے زندہ جاوید بنا دیا۔ وہ یہی مرد مجاہد تھا جس کو اس کی قوم نے بجا طور پر مجاہد ملت کا خطاب دیا۔ رحمۃ اللہ۔

"ہندوستان ہمارا وطن ہے۔ یہ ہماری روایات کا مخزن اور ہماری تہذیب و ثقافت کا گہوارہ ہے۔ اس کی در و دیوار پر ہماری ہزار سالہ تاریخ کے نشانات کندہ ہیں۔ اگر پنڈت جواہر لال نہرو کو یہاں رہنے کا حق ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ انہیں جیسا ہمارا حق بھی اس سرزمین میں نہ ہو۔

وطن عزیز پر بہت سے حوادث آتے ہیں۔ ایک حادثہ وہ تھا کہ برطانوی سامراج یہاں مسلط تھا۔ ایک حادثہ وہ تھا کہ مسلمانوں میں فرقہ واریت کا بھوت ناچ رہا تھا۔ ایک حادثہ یہ ہے کہ ہندو فرقہ واریت کا دیو حملہ آور ہو رہا ہے۔

اگر ہم نے اپنی تمام مجبوریوں اور لاچاریوں کے ساتھ برطانوی سامراج کے مظالم کا مقابلہ کیا۔ اگر ہم مسلم فرقہ واریت کے مقابلہ میں سینہ سپر ہو گئے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم ہندو فرقہ پرستی کے مقابلہ میں مرد بہادر نہ بنیں اور مرعوب ہو کر وطن عزیز کو خیرباد کہہ دیں۔

ہمیں یہیں رہنا ہے اور باعزت طور پر ان تمام حقوق کے ساتھ رہنا ہے جو ایک باعزت شہری کو حاصل ہو سکتے ہیں۔

بیشک ہم مظلوم ہو سکتے ہیں مگر غلام نہیں بن سکتے۔ اگر ہم نے برطانیہ کی غلامی برداشت نہیں کی تو ہم اکثریت کی غلامی بھی برداشت نہیں کر سکتے۔ ہم آزاد شہری کی حیثیت سے یہاں رہیں گے۔ اور نہ صرف حفظ الرحمٰن۔ ابوالکلام نہ صرف قوم پرور مسلمان۔ بلکہ وہ کروڑوں مسلمان جو ہندیونین میں ہیں سب باعزت شہری کی حیثیت سے رہیں گے۔

پاکستان بن چکا۔ اس کی حمایت اور مخالفت کا سوال بھی ختم ہو گیا اب ہندیونین کے تمام مسلمان ایک کشتی میں سوار ہیں۔ ایک کی تکلیف سب کی تکلیف۔ ایک کی ذلت سب کی ذلت۔

یہ تھے وہ تصورات اور جذبات جن کو مجاہد ملت نے اپنایا اور جن کے لئے اپنی تمام کوششیں اور صلاحیتیں وقف کر دیں۔

مجاہد ملت رحمۃ اللہ علیہ خود فرمایا کرتے تھے کہ ۴ ستمبر ۴۷ء کو مسجد فتحپوری میں گولا پھینکا گیا وہ دہلی میں قیامت خیز طوفان کا آغاز تھا۔ اسی وقت اپنے اور اپنے خدا کے درمیان یہ عہد کر لیا تھا کہ مخالفت و موافقت کے تمام قصے ختم ہو گئے۔ اب ہر مظلوم۔ ہر پریشان حال۔ ہر مصیبت زدہ کی امداد فرض ہے۔ خواہ وہ کوئی ہو۔ اور اس کا سابق کردار کچھ رہا ہو۔

"ٹاؤن ہال۔ امن کمیٹی کا سنٹر تھا۔ امن کی کوششیں کرنے والے ہندو مسلمان یہاں جمع ہوتے تھے۔

ایک روز جب خونریزی کا دور شباب پر تھا ٹاؤن ہال کے چاروں طرف مسلمانوں کی لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ بلوائیوں کے ہجوم کے سامنے پولیس اور فوج بھی گویا ہتھیار ڈالے ہوئے تھی۔ ہندو دوستوں نے بڑے اصرار سے کہا:۔

مولانا آپ اور آپ کے ساتھی ہمیشہ قوم پرور رہے ہیں ہماری ندامت کی کوئی انتہا نہیں رہے گی اگر آپ صاحبان پر آنچ آئی۔ یہ جنونی ہجوم کسی کے بس کا نہیں ہے یہاں ہمارے تمام حفاظتی انتظامات ناکام ہو چکے ہیں۔ اوکھلے میں ایک کیمپ بنایا گیا ہے۔ وہاں یہ ہجوم نہیں پہونچ سکتا۔ وہاں فوجی دستے لگا دیئے

گئے ہیں۔ آپ اور آپ کے ساتھی وہاں تشریف لے چلیں۔ آپ حضرات کی بڑی مہربانی ہوگی۔"

غور فرمائیے۔ اس نازک وقت میں جب موت سامنے کھڑی تھی ہندو دوستوں کی یہ اپیل کس قدر موثر ہو سکتی تھی۔ آپ خود اپنے دل سے پوچھئے کیا آپ اس وقت اس اپیل پر لبیک نہ کہتے۔؟

اس وقت مجاہد ملت کے ساتھ سحبان الہند حضرت مولانا احمد سعید صاحب اور دوسرے رفقاء بھی تھے۔ مگر سب سے پہلے جس نے تڑخ کر جواب دیا وہ مجاہد ملت کا حوصلہ عالی تھا۔ آپ نے فرمایا۔

" ہمارے لئے اس سے زیادہ شرم اور بزدلی کی بات کوئی نہیں ہو سکتی کہ خود اپنے وطن میں ہم پناہ گزیں بن کر رہیں۔ بیشک یہ سخت آزمائش ہے مگر ہمیں ڈٹ کر اس بحران کا سامنا کرنا ہے"

یا تن رسد بجاناں یا جان ز تن برآید

مجاہد ملت نے اپنے اس عزم کو عملی جامہ کس طرح پہنایا، وہ محتاج بیان نہیں۔ ہندوستان کا بچہ بچہ اس کا شاہد ہے۔

اس موقعہ پر امام الہند حضرت مولانا ابوالکلام آزاد نے جس تدبر سے فریضۂ قیادت انجام دیا اس سے انکار نہیں ہے۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ مسلمانوں کے تحفظ کے لئے بار بار ان کو اپنے دولتکدہ سے نکل کر دہلی کی گلیوں اور کوچوں میں گھومنا پڑا۔ لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سیلاب اور طوفان کے منجدھار میں چٹان بن کر جس نے اپنے عمل اور کردار سے دوسروں کو استقلال و استقامت کا سبق دیا،

جس کی ثابت قدمی نے دہلی میں اس وقت تقریباً ڈیڑھ لاکھ مسلمانوں کو باقی رکھا۔ اور نہ صرف دہلی بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس کے استقلال کا اثر ہندیونین کے گوشہ گوشہ تک پہونچا۔ کیونکہ اگر دہلی اور مغربی یوپی اور راجستھان کے سرحدی اضلاع مسلمانوں سے خالی ہو جاتے تو پھر یہ طے کرنا مشکل ہے کہ وہ سیلاب جو ان سرحدوں سے ٹکرا کر ختم ہو گیا کہاں تک پہونچتا۔

اس زمانہ میں یوپی کے مغربی اضلاع (سہارنپور، مظفر نگر وغیرہ) تک پہونچنا مجاہد ملت کے لئے ناممکن تھا۔ آپ ایک لمحہ کے لئے بھی دہلی نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ ان اضلاع میں جس نے درس استقلال و استقامت دیا وہ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی (شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند و صدر جمعیۃ علماء ہند) کا ظل ہمایوں تھا۔ قدس اللہ سرہما العزیز۔

مجاہد ملت کا حُسن تدبر اور گاندھی جی

آگ کی بھٹی سونے کا کھرا کھوٹا نکھارتی ہے اور مصائب کی بھٹی انسان کے جوہر اُبھار دیتی ہے۔

مجاہد ملتؒ کو اللہ تعالیٰ نے تین جوہر ایسے عطا فرمائے تھے جنھوں نے صرف مجاہد ملت ہی کو نہیں اُبھارا۔ بلکہ پوری ملت کو اُبھار دیا اور اس کا سر اونچا کر دیا۔

تدبر۔ یعنی تقاضا وقت کو برمحل اور عین وقت پر پہچاننا۔ اس کی تہہ تک پہنچ جانا۔ پھر دفع مضرت کے لئے بروقت تدبیر سوچنا۔

جراءت:۔ یعنی بلا جھجک تقاضا وقت کے بموجب عملی اقدام

خطابت:۔ یعنی اپنے خیال اور اپنے مقصد کو استدلال کی پوری طاقت کے ساتھ اس طرح پیش کرنا کہ مخاطب لامحالہ متاثر ہو جائے۔ ورنہ کم از کم جواب دینے کی طاقت مفلوج اور مرعوب ہو جائے۔

مجاہد ملت اور ان کے رفقاء کرام کا تعارف گاندھی جی سے پہلے سے تھا۔ اور جیسے ہی اس ہنگامی دور میں ۹ ستمبر ۱۹۴۷ء کو گاندھی جی نواکھالی اور کلکتہ سے واپس ہو کر دہلی پہونچے، مجاہد ملت کا حسن تدبر تھا کہ آپ نے پُرانے تعلقات کو صرف تازہ ہی نہیں کیا بلکہ ان کو پختہ کیا اور ایسا اعتماد حاصل کیا کہ حکومت کے سربراہوں کو بھی گاندھی جی کا اتنا اعتماد حاصل نہیں تھا۔

گاندھی جی فی الحقیقت امن چاہتے تھے اور ابھی تین ہفتہ بھی نہیں ہوئے تھے کہ بنگال کے فسادات کو جن کا سلسلہ چند ماہ سے چل رہا تھا اور ہزاروں معصوم جانیں اس کی نذر ہو چکی تھیں اس طرح ختم کر دیا تھا کہ دنیا حیرت زدہ ہو گئی تھی۔

گاندھی جی ۹ ستمبر کو دہلی پہونچے۔ فرقہ پرستوں نے ان کی مخالفت اتنی شدت سے کی کہ پرارتھنا کی مجلسوں میں گاندھی جی کو ترمیم کرنی پڑی مجاہد ملت جو خود فرقہ پرستی کے مقابلہ میں برسر آزما تھے، گاندھی جی کے دست راست بن گئے

مجاہد ملت کو سحبان الہند حضرت مولانا احمد سعید صاحب کی رفاقت

حاصل تھی۔ بلکہ عجیب و غریب حقیقت یہ تھی کہ حضرت سحبان الہند جو چند سال سے قلب کے مرض میں مبتلا تھے نقل و حرکت سے معذور ہو کر تقریباً گوشہ نشین ہو گئے تھے۔ مجاہد ملت نے ان کو کنج عزلت سے نکالا۔ بلا شبہ سحبان الہند کا خود اپنا جذبہ اور اُن کے قلب بیمار کی بھی تڑپ تھی کہ انھوں نے مجاہد ملت کی دعوت پر لبیک کہا اور ضعف و نقاہت کے باوجود مولانا کا ساتھ دینے کے لئے گوشہ عافیت سے نکل آئے۔

جمعیۃ علماء ہند کے دفتر کے پاس اس وقت تک کوئی گاڑی نہیں تھی۔ احاطہ کالے صاحب کے مشہور تاجر حافظ محمد نسیم صاحب نے یہ خدمت اپنے ذمہ لی۔ روزانہ صبح کو اپنی گاڑی لیکر جمعیۃ علماء ہند کے دفتر میں رونق افروز ہو جایا کرتے تھے اور مجاہد ملت حافظ صاحب موصوف کے ساتھ سحبان الہند کے یہاں پہونچکر اُن کو ساتھ لیتے۔ دہلی کے بہت پرانے اخبار نویس۔ سیّد محمد صاحب جعفری، سابق ایڈیٹر روزنامہ ہمدرد۔ و روزنامہ "ملت" بھی سحبان الہند کے یہاں موجود ہوتے، اُن کو چوتھا رفیق بناتے۔ اس طرح ان چار رفقاء کا پہلا کام یہ ہوتا کہ مہاتما گاندھی کے یہاں پہونچکر صحیح صحیح حالات بلاکم و کاست روزانہ پیش کر دیتے

گاندھی جی کے تدبر، نیک نفسی، صداقت پسندی اور دور اندیشی میں کس کو شبہ ہو سکتا ہے۔ انھوں نے اپنے طور پر بھی ان حضرات کے بیانات کو پرکھا۔ اور جب ہر طرح صحیح اور درست پایا تو ان کو اتنا اعتماد ہو گیا کہ حکومت ہند کے ہوم منسٹر سردار پٹیل کی شخصیت بھی اس کو ختم نہ کر سکی۔

حکومت ہند نے کبھی اپنی زبان سے یہ بات نہیں کہی مگر کم از کم راجدھانی کا ہر ایک باخبر انسان جانتا تھا کہ ممبران کیبنٹ کے جذبات ایک دوسرے سے مختلف اور ایسے متضاد ہیں جن کے باعث نہ صرف یہ کہ امن و امان کا مسئلہ بہت پیچیدہ ہو گیا ہے۔ بلکہ گاندھی جی کی امن پرورانہ کوششیں بھی ناکام ہو رہی ہیں۔

ایک دفعہ مجاہد ملت نے دہلی کے ڈپٹی کمشنر مسٹر رندھاوا سے (جسکو مسلمانوں کے حق میں ۱۹۴۷ء کا لارڈ کیننگ کہنا درست ہے) ہنگاموں اور فسادات کے متعلق شکایتیں کیں اور مہاتما گاندھی اور پنڈت نہرو کا نظریہ اور ان کی منشاء سمجھانے کی کوشش کی تو مسٹر رندھاوا نے فوراً تیوری بدل کر جواب دیا:۔

"ہمارا تعلق سردار پٹیل سے ہے اور وہ ہمارے کاموں سے مطمئن ہیں"۔

تاہم گاندھی جی کا اثر و رسوخ بھی معمولی نہیں تھا۔ اس کا اثر یہ تھا کہ تمام لاچاریوں اور بے بسیوں کے باوجود جمعیۃ علماء کے کارکن اس طرح حاوی تھے کہ دہلی ایڈمنسٹریشن کے افسر طنزاً کہا کرتے تھے کہ دہلی میں حکومت جمعیۃ علماء کی ہے۔

میوانیوں کا مسئلہ

مجاہد ملت نے فرقہ واریت کے مقابلہ میں گاندھی جی کا دست راست بن کر صرف دہلی کی آتشیں فضاء کو سرد کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ دہلی سے متصل راجستھان اور مشرقی پنجاب کے مسلمانوں کو بھی محفوظ رکھنے اور اُن کو مطمئن کرنے کی مسلسل کوشش کرتے رہے۔

افسوس اس زمانہ میں جمعیۃ علماء سے تعلق رکھنے والا ہر ایک چھوٹا بڑا اس درجہ مصروف اور منہمک تھا کہ کسی کو بھی ڈائری لکھنے کی توفیق نہیں ہوئی۔ احقر نے چند بار یہ سلسلہ قائم کرنا چاہا۔ مگر ایک طرف واقعات کی کثرت اور دوسری جانب جماعتی فرائض کی انجام دہی کی کوشش۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ڈائری لکھنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ تاہم بہت سے واقعات علماء حق جلد دوم اور "مختصر تذکرہ خدمات جمعیۃ علماء ہند" میں درج کر کے شائع کرا چکا ہوں۔

بہرحال یہ بات کسی ڈائری کے اندراج یا کسی شخص کی تصدیق و شہادت کی محتاج نہیں ہے کہ الور اور بھرتپور کی ریاستوں کی کھلی ہوئی پالیسی یہ تھی کہ وہ اپنی ریاستوں سے مسلمانوں کا نام و نشان ختم کر دیں۔ ان مسلمانوں میں زیادہ تعداد "میوانیوں" کی تھی۔ جن کی مردم شماری ان ریاستوں میں تقریباً چھ لاکھ تھی۔ ان ریاستوں کی سرحدیں مشرقی پنجاب کے ضلع گوڑگانوہ سے ملتی ہیں۔ اس ضلع میں بھی کئی لاکھ میوانی آباد تھے۔ جن کی کافی تعداد اب بھی موجود ہے (امید ہے کہ ۱۹۶۱ء کی مردم شماری میں ان کی تعداد دو لاکھ سے بھی بڑھ گئی ہوگی)

الور۔ بھرتپور اور ضلع گوڑگانوہ کے اس علاقہ میں جس کو "موات" کہا جاتا ہے، تقسیم سے پہلے کس طرح مسلمان میو اور ہندو جاٹ ایک دوسرے سے برسر پیکار رہے اور پھر کس طرح اُن میں ایسی حیرت انگیز صلح ہوئی کہ ۱۹۴۷ء کے فسادات کا آتش فشاں بھی اس میں جنبش پیدا نہ کر سکا۔ اس کی دلچسپ تفصیل علماء حق جلد دوم اور "مختصر تذکرہ

خدمات جمعیۃ علماء ہند" حصہ دوم میں ملاحظہ فرمائی جائے۔

یہاں اس کا دہرانا ممکن نہیں ہے۔ یہاں یہ عرض کرنا ہے کہ جب الور اور بھرتپور کی ریاستیں میواتیوں اور عام مسلمانوں کے جبراً اخراج کا فیصلہ کرچکی تھیں ان علاقوں میں میواتیوں کو باقی رکھنا ... ایک عظیم الشان کارنامہ ہے جس کو تاریخ کبھی فراموش نہیں کرسکتی۔

بیشک میواتیوں کی تقریباً نصف تعداد ترک وطن کرگئی تھی، مگر باقی ماندہ میواتی جو اس وقت تین لاکھ سے کم نہیں تھے، اپنی ثابت قدمی اور مضبوطی کے باوجود کسی پشت پناہ اور دست گیر کے محتاج تھے بالخصوص ایسی حالت میں کہ الورا اور بھرتپور کی ریاستوں کے علاوہ مشرقی پنجاب میں بھارگو گورنمنٹ اور مرکز میں سردار پٹیل ہوم منسٹر کا منصوبہ یہ تھا کہ "راجدھانی" (دہلی) سے ملے ہوئے علاقہ کو شدھ کرلیا جائے اس محفوظ علاقہ پر مسلمان کا سایہ بھی نہ پڑسکے۔

جغرافیائی لحاظ سے اس علاقہ میں خشک پہاڑیاں موجود ہیں اور وہ بہت سے موقعوں پر میواتیوں کی پناہ گاہ بن جاتی ہیں مگر اس موقع پر وہ بھی پناہ نہیں دے سکیں۔ ان کو ان پہاڑیوں سے بھی زیادہ مضبوط کوہ استقلال کی ضرورت تھی۔

بلا خوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ مجاہد ملت کی عظیم الشان شخصیت ان لاکھوں مسلمانوں کے لئے وہ کوہ استقلال ثابت ہوئی جس کی ان کو ضرورت تھی۔ مجاہد ملت نے کبھی خود ان علاقوں کا دورہ کرکے اور کبھی اپنے رفیقوں کو بھیج کر صرف اطمینان کا پیغام نہیں پہونچایا بلکہ آپ نے سب سے بڑا کام یہ کیا کہ ان کی اہمیت مہاتما گاندھی کے ذہن نشین کرائی اور ان کو اس درجہ متاثر کیا کہ گاندھی جی نے میواتیوں کی حفاظت اور اجڑے ہوئے میواتیوں کو ان کی جگہ آباد کرانا، اپنی زندگی کا ایک نصب العین بنا لیا۔

اس سے زیادہ حیرت انگیز بات کیا ہوسکتی ہے کہ مشرقی پنجاب کی حکومت الورا اور بھرتپور کی ریاستیں اور سردار پٹیل کی منسٹری جن کے اخراج کا فیصلہ کرچکی تھی، ان کے متعلق مہاتما گاندھی نے کانفرنس کے کھلے اجلاس میں فرمایا۔ میواتی بھارت کی ریڑھ کی ہڈی اور ہمارے ملک کا گاڑھا خون ہیں میں کبھی برداشت نہیں کرسکتا کہ وطن کا گاڑھا خون اس کے بدن سے نکالدیا جائے

مجاہد ملت نے ایک طرف ان میواتیوں کو کانفرنس میں جمع ہونے کا مشورہ دیا۔ گھاسیرہ مقام پر ان کی کانفرنس ہوئی جس میں پنجاب کے چیف منسٹر مسٹر بھارگو بھی شریک ہوئے اور مجاہد ملت، مہاتما گاندھی کو بھی اس کانفرنس میں لے گئے۔ اس موقع پر بھارگو کی تقریر میواتیوں کو کیا خود مہاتما گاندھی کو بھی مطمئن نہ کرسکی۔ لیکن گاندھی جی نے حکومت کے ذرائع سے علیحدہ ہوکر اپنے خاص ورکروں کو اس علاقہ میں لگایا۔ جو کئی سال تک یہاں کام کرتے رہے۔ گاندھی جی کے مشہور چیلے ونوبا بھاوے نے بھی گاندھی جی کے حکم سے اس علاقہ کا دورہ کیا۔ جو مسلمان دہشت اور رعب کی وجہ سے ہندو ہوگئے تھے ان کی چوٹیاں کٹوائیں۔

بہرحال یہ سب کچھ ہوا مگر اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ یہ سب کچھ نتیجہ تھا، مجاہد ملت حضرت مولانا محمد حفظ الرحمن صاحب کی اس سعی بلیغ اور جدوجہد مشکور کا جس کا کچھ اشارہ ہم اوپر کرچکے ہیں۔

پانی پت

پانی پت میں آباد تقریباً نیتالیس ہزار مسلمان بھی اسی حالت میں تھے کہ وہاں کی حکومت (وہی بھارگو گورنمنٹ) ان کے اخراج کا فیصلہ کئے ہوئے تھی اور وہ خود اس فیصلہ کو منظور کرنے کے لئے آمادہ نہیں تھے۔

مجاہد ملت یہاں بھی غالباً دو مرتبہ گاندھی جی کو لیکر گئے اور ان کے لئے فضا ہموار کرنے کی کوشش کی مگر کہنا پڑتا ہے کہ ان میں وہ استقلال نہیں تھا جس کا مظاہرہ میواتیوں نے کیا اور یہ بھی حقیقت ہے کہ میواتیوں کو اپنے پڑوس کی حمایت حاصل ہوگئی پانی پت کے مسلمان اس سے محروم رہے۔ اس بنا پر یہاں مجاہد ملت کی کوشش اور گاندھی جی کی نصیحتیں کامیاب نہیں ہوسکیں۔

اسپیشل ٹرینوں کا انتظام

دہلی کے علاوہ یوپی وغیرہ دوسرے صوبوں کے ہزاروں بلکہ تقریباً ایک لاکھ مسلمان جو نہ دہلی والوں سے زیادہ واقف تھے نہ یہاں کی چور گلیوں اور کوچوں کی ان کو خبر تھی۔ وہ اپنے آپ کو جب حوادث کی اس طوفانی بارش میں گھرا ہوا پاتے تو اپنی موت سے زیادہ غریب الوطنی اور اپنے عزیزوں سے جدائی کا صدمہ ان کے ہوش گم کردیتا تھا۔ مجاہد ملت نے اصرار کرکے حکومت کی طرف سے اسپیشل ٹرینوں کا انتظام کرایا۔ جب یہ لوگ اپنے اپنے مقامات پر پہونچے تو ان کو حضرت یونس علیہ السلام کا قصہ یاد آگیا کہ کس طرح اللہ تعالیٰ نے ان کو شکم ماہی سے صحیح سالم نکالا تھا۔

اس طرح کے بہت سے واقعات ہیں جن میں سے ہر ایک واقعہ تاریخ کا ایک باب ہے۔ لیکن "علماء حق جلد دوم" اور "مختصر تذکرہ خدمات جمعیۃ علماء ہند" جو اسی موضوع پر مستقل کتابیں ہیں۔ جب ان کتابوں کے دامن ان تمام واقعات کو نہیں سمیٹ سکے تو ان کالموں میں ان کی گنجائش کہاں نکل سکتی ہے۔ واقعات کی تفصیل کے بجائے ایک بنیادی نقطہ کو پیش کردینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ جو مجاہد ملت کے حوصلہ وسیع اور نظر بلیغ کی اعلیٰ مثال اور بہترین شہادت ہے۔

جدوجہد کی مختلف صورتیں اور بنیادی نقطۂ نظر

مضمون غیر معمولی طوالت اختیار کرچکا ہے۔ ناظرین کرام اور خود مجاہد ملت نمبر کے ترتیب دینے والے احباب کو اس کی طوالت کی شکایت ہوگی۔ مگر ہمیں اس طوالت پر بھی تنگیٔ دامن کی شکایت ہے۔

مجاہد ملت نے کارپردازان حکومت کے دروازوں پر دستک دیکر کس طرح ان کو آرام گاہوں سے نکالا۔ ان کی بے نیازی اور بے اعتنائی ختم کرکے کس طرح ان کو امداد و اعانت پر آمادہ کیا۔ بیشمار خاندان جو منتشر محلوں میں موت کے موہنہ میں پھنس گئے تھے ان کو انہیں بے نیاز ممبروں کے ذریعہ تباہی کے جہنم سے کس طرح نجات دلائی۔

بارہا ایسا ہوا کہ پولیس فورس فراہم نہ ہوسکی تو بنام خدا اس جہنم میں کود پڑے اور زندگی سے مایوس انسانوں کو یاس و ناامیدی کی ظلمت سے نکالا اور محفوظ مقامات پر پہونچایا۔

مجاہد ملت کا یہ عزم۔ رفقاء اور ساتھیوں پر بھی اثر انداز ہوتا اور خطرات میں گھرے ہوئے مایوس انسانوں میں وہ حوصلہ پیدا کردیتا تھا کہ وہ خود اپنے عزم و ہمت سے اپنی حفاظت کرتے اور حملہ آوروں کی آنکھوں میں دھول جھونکتے ہوئے اس طوفان سے صحیح سالم ساحل اطمینان پر پہونچ جاتے تھے۔ خدا جانے کتنے ہزار انسان مجاہد ملت کی اس کرامت یا عزم کی برکت سے زندہ اور محفوظ رہنے میں کامیاب ہوگئے۔

یہ سب باتیں صحیح ہیں اور مجاہد ملت مرحوم کے کارناموں کے سنہرے ابواب ہیں۔ مگر ہم یہاں ان کی تفصیل پیش نہیں کرسکتے۔ ہمیں یہاں یہ ذہن نشین کرانا ہے کہ مجاہد ملت کا منتہائے نظر صرف یہ نہیں تھا کہ مسلمانوں کی جانیں بچ جائیں اور اُن کے مال محفوظ رہ جائیں۔ بلکہ آپ کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ مسلمان اپنے وطن میں مساویانہ حیثیت سے باعزت شہری بن کر رہیں، یعنی جس طرح وہ اپنے جان و مال، عزت و آبرو کی طرف سے مطمئن ہوں اسی طرح ان کو اپنی تہذیب، اپنے مذہب اور اپنے مذہبی مراسم کی طرف سے بھی اطمینان ہو۔ کہ یہ سب محفوظ ہیں اور ان کو آزادی ہے کہ جس کام کو وہ مذہبی کام سمجھتے ہوں، اُس کو آزادی کے ساتھ کرتے رہیں جس طرح پہلے کیا کرتے تھے۔

مذہبی کاموں کے بارے میں مجاہد ملت رحمہ نے اپنے عقیدہ اور مسلک کو معیار نہیں بنایا۔ بلکہ خود عمل کرنے والوں کے جذبات و خیالات کو معیار قرار دیا۔ کیونکہ یہاں سنت یا بدعت کا سوال نہیں تھا بلکہ سوال تھا۔ شہری حقوق کی بحالی کا جس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان جس کام کو اپنا شہری حق سمجھتے ہیں اس کی اُن کو آزادی ہو۔

یہ کام مصلحین اور مبلغین کا ہے کہ وہ غلط رسومات کا انسداد کریں حکومت اس بارہ میں مفتی اور مصلح کی حیثیت نہیں اختیار کرسکتی، ورنہ پھر مذہب کے صحیح کاموں میں بھی دخل اندازی کی نوبت آسکتی ہے

اس نقطۂ نظر کے نتیجہ میں یہ بات تو ظرافت ہی قرار دی جائے گی کہ تازیہ بنانے والوں کو بھی تازیہ بنانے کی نہ صرف آزادی حاصل ہوئی بلکہ حکومت نے اہتمام کیا کہ حسب سابق تازیے بنائے جائیں اور باضابطہ جلوس نکلیں۔ بہرحال یہ حرکت ایک طرح کی ظرافت تھی البتہ یہ بات ایک بڑے طبقہ کے نزدیک قدر سے دیکھی جائے گی کہ جو عرس بند ہوگئے تھے یا اُس خطرناک دور میں جبکہ دہلی کے گلی کوچوں سے بھی امن اور اطمینان مفقود ہوگیا تھا جن عرسوں کا امکان ختم ہورہا تھا حکومت نے خاص اہتمام و انتظام کرکے ان کو جاری کرنے کا موقع دیا

قطب صاحب، خواجہ غریب نواز اور حضرت مجدد صاحب کی درگاہیں۔

اس سلسلہ کی کڑی وہ عظیم الشان خدمت ہے جو ہندوستان کی مرکزی خانقاہوں اور درگاہوں کے متعلق اللہ تعالےٰ کے فضل و کرم سے انجام پذیر ہوئی۔

عرس کے متعلق علماء دیوبند کا مسلک کچھ بھی ہو، مگر اکابر اولیاء اللہ

سے ان کی عقیدت کسی سے کم نہیں ہے بلکہ ان کا دعویٰ یہ ہے کہ صحیح عقیدت علماء دیوبند ہی کو ہے۔ بہرحال یہاں اس بحث کا موقع نہیں ہے یہاں تو یہ عرض کرنا ہے کہ یہ تین درگاہیں جو نہ صرف ہندوستان بلکہ پوری دنیا اسلام کی نظر میں مرکزی حیثیت رکھتی ہیں، اس دور پُرآشوب کی تباہ کاریوں کی زد میں آ چکی تھیں۔

یہی سرہند اور بسی جو حضرت مجدد صاحبؒ کے مرکز ارشاد رہے تھے جن کا تذکرہ محبت اور قلبی تعلق کی چاشنی لئے ہوئے مکتوبات میں بار بار آیا ہے، چونکہ ریاست پٹیالہ میں واقع تھے جس کا نمبر مشرقی پنجاب میں سب سے بڑھا ہوا تھا اس لئے یہ دونوں عظیم الشان قصبے ان بدترین حالات کو برداشت کر چکے تھے جو مشرقی پنجاب میں پیش آئے تھے۔

یہ درست ہے کہ شاہ افغانستان نے پنڈت نہرو کو حضرت مجدد صاحبؒ کی بارگاہ کے بارے میں تار دیا تھا۔ اسی طرح اجمیر شریف کی حفاظت کے متعلق بیرونی ممالک سے پنڈت جی کے نام تار موصول ہوئے تھے جن کی بنا پر حکومت ہند نے ان کی حفاظت کا خاص انتظام کیا جس سے یہ درگاہیں محفوظ رہ گئیں، پھر اگرچہ سرہند اور بسی سے کلی طور پر مسلمانوں کا تخلیہ ہو گیا اور اجمیر شریف کے تمام مسلمان حالات کی شدت سے مجبور ہو کر منتشر ہو گئے۔ البتہ وہاں خدام صاحبان نے فی الواقع بڑی ہمت وجرأت کا ثبوت دیا کہ خطرات کے بے پناہ ہجوم کے وقت بھی ان حضرات نے حضرت خواجہ غریب نواز کے آستانہ کو نہیں چھوڑا اور یہ بھی درست ہے کہ حضرت مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ کے اثر ورسوخ نے کافی دستگیری کی لیکن عوامی لیڈر کی حیثیت سے جس نے سجادہ نشین اور خدام صاحبان کی خبرگیری کی اور ہمتیں بندھائیں، وہ مجاہد ملت ہی تھے۔ رحمۃ اللہ۔

سرہند شریف تو حضرت مجاہد ملت اس دور میں تشریف نہیں لے گئے، وہاں کی حاضری تو احقر سے متعلق فرمائی تھی۔ مگر اجمیر شریف بار بار خود تشریف لے گئے۔ پھر درگاہ بل وغیرہ میں حضرات خدام کی کافی ترجمانی کی۔ بلکہ ایک عرصہ تک البسار ہا کہ نظم کے ذمہ دار گویا مجاہد ملتؒ ہی تھے۔ اجمیر کے حضرات، مجاہد ملت ہی سے مطمئن تھے۔ ہر موقع پر مجاہد ملت سے مشورہ لیتے۔ ہدایت حاصل کرتے۔ اور انہیں ہدایات پر عمل پیرا ہونے کو کامیابی کا ذریعہ سمجھتے تھے۔

ان تینوں درگاہوں میں قطب صاحب (یعنی درگاہ شریف حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی اوشی رحمۃ اللہ علیہ) کی بارگاہ معلی کا معاملہ سب سے زیادہ پیچیدہ اور دشوار تھا۔ کیونکہ خاص اس دور میں کہ پناہ گزینوں کا ٹڈی دل دہلی کی طرف بڑھ رہا تھا، اس کو محفوظ رکھنے کا انتظام نہیں کیا گیا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پورا قصبہ مہرولی جہاں یہ درگاہ ہے شرنارتھیوں کا شہر بن گیا تھا۔ کوئی ایک گھر بھی مسلمان کا نہیں رہا تھا۔ خانقاہ شریف کا کونہ کونہ شرنارتھیوں سے بھرا ہوا تھا۔ تقریباً ایک ہزار افراد خانقاہ میں رہتے تھے۔ درگاہ کو خالی کرانے کی کوشش گویا مہرولی میں بسنے والے ایک لاکھ شرنارتھیوں سے ٹکر لینی تھی۔

سردار پٹیل کی ڈیوڑھی پر بار بار حاضری دی گئی۔ چیف کمشنر اور ڈپٹی کمشنر (رندھاوا) سے بار بار التجائیں کی گئیں۔ مگر سب بے سود رہیں۔

بالآخر مہاتما گاندھی ...... کا دامن پکڑا گیا۔ غیر مناسب نہ ہوگا اگر کہا جائے کہ ان کو شیشہ میں اتارنے کی کوشش کی گئی۔ اور احقر کو اس شہادت کے قلمبند کرنے میں بھی تامل نہیں ہے کہ اس موقع پر سحبان الہند حضرت مولانا احمد سعید صاحبؒ کی شیریں کلامی نے بڑا کام کیا۔

یہ پہلے گذر چکا ہے کہ گاندھی جی کے یہاں روزانہ صبح کو جانا۔ ان حضرات کا معمول تھا۔ حضرت مولانا احمد سعید صاحبؒ اس حاضری کے وقت حضرت قطب صاحب کی کچھ باتیں ایسے انداز سے دلنشیں پیرایہ سے فرماتے تھے کہ مہاتما گاندھی کے دل میں اتر جاتی تھیں۔ چنانچہ گاندھی جی اتنے متاثر ہو چکے تھے کہ جب ۹ جنوری ۱۹۴۸ء سے گاندھی جی نے مرن برت رکھا تو برت کھولنے کی آٹھ شرطوں میں سے ایک شرط یہ بھی تھی کہ قطب صاحب رحمۃ اللہ کی خانقاہ مکمل طور پر خالی کرائی جائے۔ جب گاندھی جی کی شرط کامیاب ہو گئی اور خانقاہ خالی ہو گئی۔ تو اتفاق سے عرس میں چند روز باقی رہ گئے تھے۔ عرس میں شرکت کی خواہش گاندھی جی نے بھی کی اور ان حضرات نے بھی اس کو حالات کے لحاظ سے مناسب اور بہتر سمجھا (اس شرکت کی دلچسپ تفصیل مختصر تذکرہ خدمات جمعیۃ علماء ہند کے حصہ دوم میں ملاحظہ فرمائیے۔)

✤ ✤ ✤ ✤

شیرازہ بندی مسلم پراگندہ

نصب العین کی وضاحت ۔ نظریاتی یکجہتی کی کوشش اور احساس کہتری کا مداوا

وطن دوستی، قوم پروری، اور حقوق شہریت میں مساویانہ حیثیت حاصل کرنے کے جس بلند نظریہ کے ساتھ دہلی میں کام کیا گیا اور جس طرح مسلمانان دہلی کے ذہنوں کو احساس کہتری سے محفوظ رکھا گیا۔ ضرورت تھی کہ انہیں جذبات اور نظریات پر ہندیونین کے مسلمانوں کو متحد کیا جائے اور قیامت خیز ہنگاموں نے جو خوف وہراس عام مسلمانوں میں پیدا کردیا ہے جس کے نتیجہ میں وہ احساس کہتری میں مبتلا ہوتے جارہے ہیں اور عین ممکن ہے کہ وہ اپنے متعلق غلامی کا فیصلہ کرلیں۔ ضرورت تھی کہ اس پست احساس کی کائی ان کے ذہنوں سے صاف کی جائے۔

جو فرقہ وارانہ رجحانات برطانیہ کی اس بنیادی پالیسی "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" سے پیدا ہوئے تھے جن کو پائیدار کرنے کے لئے پچاس سال پہلے سے جداگانہ انتخاب کا طریقہ، پھر تقسیم ہند کا مطالبہ ایجاد کیا گیا تھا۔ تقسیم کے بعد اگر ایک طرف وہ جن سنگھ، ہندو مہا سبھا اور راشٹریہ سیوک سنگھ کے وجود اور ترقی کا سبب بنے ہوئے تھے تو دوسری جانب ان رجحانات نے ان مسلمانوں کو نہ صرف مایوسی میں مبتلا کردیا تھا بلکہ ایک تاریک چوراہے پر کھڑا کردیا تھا جو ان رجحانات کے حامی رہے تھے کیونکہ اب نہ صرف تصورات کی دنیا بدل گئی تھی بلکہ بدقسمتی یہ تھی کہ وہ ٹہنیاں ہی ٹوٹ کر گر گئی تھیں جن کی پھونگلوں پر آشیانہ کے تنکے رکھے گئے تھے

ان مسلمانوں کے لئے ایسی روشنی کی ضرورت تھی جو گم گشتہ راہ کی سراسیمگی ختم کرکے ایک معین راستہ کی نشان دہی کرسکے۔

اس میں شک نہیں کہ ہندیونین کے تقریباً ساڑھے تین کروڑ مسلمانوں کی اس عمومی حالت کے احساس نے سب سے پہلے حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کو متحرک بنایا۔ چنانچہ آپ نے پورے ہندوستان کے ممتاز مسلم رہنماؤں کی ایک خصوصی کانفرنس ۳۱ر نومبر ۱۹۴۷ء کو دہلی میں طلب کی۔ جبکہ ۱۵ر نومبر ۱۹۴۷ء کو کانگریس کا اجلاس دہلی میں ہونے والا تھا جس میں فرقہ واریت اور فرقہ وارانہ تنظیمات کے خلاف تجویز منظور ہونے والی تھی۔

اس کے بعد کل ہند پیمانہ پر ایک عام کانفرنس لکھنؤ میں طلب فرمائی جو آزاد کانفرنس کے نام سے اب تک مشہور و معروف ہے۔ مگر جہاں تک عملی جدوجہد اور انتظامات کا تعلق ہے چونکہ مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب نے دست راست بلکہ پیکر عمل بن کر کام کیا۔ اس لئے ان دونوں کانفرنسوں کی کامیابی کا سہرا بھی مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی شخصیت ہی کو آراستہ کرتا ہے۔ نومبر ۱۹۴۷ء کو فسادات کا دور شباب تو نہیں کہا جاسکتا مگر دہلی میں خون مسلم کی کوئی قیمت اب تک بھی نہیں قائم ہوئی تھی خاص انتظام کے بغیر گلیوں اور کوچوں میں کوئی شخص اپنی جان پر کھیل کر ہی گذر سکتا تھا۔

دہلی جنکشن اب بھی غیر محفوظ تھا۔ خود پلیٹ فارموں پر سخت سے سخت جانی اور مالی حادثے پیش آجاتے تھے دہلی کے پرخطر حدود میں داخل ہونے سے پہلے آنے والے مدعوئین کا اس طرح استقبال کرنا کہ وہ حفاظت کے ساتھ اپنے تجویز کردہ قیام گاہ پر پہونچ سکیں یا قیامگاہ سے چل کر بحفاظت تمام کانفرنسوں میں شرکت کرسکیں۔ پھر اس پریشانی کے دور میں فرائض مدارات انجام دینا بہت ہی خطرناک اور پریشان کن خدمت تھی۔ جس کو نہایت بلند آہنگی اور خوش اسلوبی کے ساتھ مجاہد ملت نے اپنے مخلص رفقاء کی مدد سے انجام دیا

جمعیۃ علماء ہند کے کچھ رضاکاروں کو اسپیشل پولیس کی حیثیت دیدی گئی تھی۔ ان کو بندوقیں بھی دیدی گئی تھیں۔ یہ مسلح دستہ حضرت مجاہد ملت کے زیرکمان ہر ایسے موقع پر فرائض حفاظت انجام دیتا تھا۔ انتہا یہ کہ قبرستان تک مسلمانوں کا پہونچنا مشکل ہوتا تھا تو یہی دستہ جنازہ کے ساتھ جاتا تھا۔ ہفتہ میں دو تین بار اس دستہ کو جنازہ پہونچانے کی ڈیوٹی لامحالہ انجام دینی پڑتی تھی۔

یہ رضاکار اور کچھ اور ساتھی غازی آباد بھیجدیئے گئے تھے۔ آنے والے مہمانوں کو غازی آباد اتار لیا جاتا تھا اور وہاں سے جیپ کار یا موٹروں کے ذریعہ محفوظ راستوں سے نکال کر قیام گاہوں پر پہونچایا جاتا تھا۔

لکھنؤ میں یہ کانفرنس (آزاد کانفرنس) ۲۷ر دسمبر ۱۹۴۷ء کو ہونے والی تھی۔ دہلی کی اس وقت یہ حالت تھی کہ صرف ریلوے جنکشن پر ہزاروں شرنارتھی پورا پورا اثاث البیت لئے ہوئے قیام پذیر تھے۔ اثاث البیت کے انباروں نے تمام پلیٹ فارموں کو گودام بلکہ خطرناک گھاٹیاں بنا رکھا تھا

پلیٹ فارم پر گذرنا ہر ایک کے لئے مشکل تھا۔ مگر خاص طور پر مسلمانوں کے لئے حد درجہ مخدوش تھا۔ خنجر زنی کے واقعات رات دن ہوتے رہتے تھے لکھنؤ کانفرنس میں دہلی سے نمائندگان کی بڑی تعداد جانے والی تھی تو اس وقت مولانا آزاد رحمۃ اللہ علیہ کی جدوجہد نتیجہ خیز ثابت ہوئی کہ ان کے لئے اسپیشل ٹرین کا انتظام کیا گیا۔ پولیس کا ایک دستہ ٹرین کے ساتھ کیا گیا۔ دہلی جنکشن کے جس پلیٹ فارم سے یہ اسپیشل روانہ ہونے والی تھی وہاں پولیس کا خاص انتظام کیا گیا۔ ان تمام انتظامات کو مولانا آزاد کے اثر و رسوخ نے آسان کیا مگر ضرورتوں کا نقشہ تیار کرنے والے پھر اس میں عمل اور کردار کا رنگ بھرنے والے مجاہد ملت تھے۔ (رحمۃ اللہ) دہلی کے علاوہ اور علاقوں میں یہ دشواریاں نہیں تھیں، چنانچہ ہندوستان کے گوشہ گوشہ سے تقریباً ایک لاکھ مدعوئین اور ارکان و نمائندگان نے اس کانفرنس میں شرکت کی۔

حضرت مولانا آزاد کی تقریر صدارت یقیناً ایک تاریخی تقریر تھی۔ مگر جس نے مسلمانوں کے دلوں سے خوف و ہراس دور کر کے اعلیٰ نصب العین کی روشنی دکھائی اور ایک بلند ترین مقصد کا عزم اُن کے ذہنوں میں برانگیختہ کیا وہ مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی تقریر تھی اسی بنا پر کامیابی کا کریڈٹ آپ کو دیا گیا۔

اسناد کانفرنس لکھنؤ

بہرحال ۲۷، ۲۸ دسمبر ۱۹۴۷ء کو یہ کانفرنس لکھنؤ میں کی گئی۔ سہمے ہوئے مسلمانوں نے اس کانفرنس کو پیغامِ زندگی تصور کیا اور ملک کے تمام گوشوں سے سفر کر کے اس کانفرنس میں شریک ہوئے۔ مسلمانوں کا اس سے بڑا اجتماع نہ اس سے پہلے کبھی دیکھا نہ اس کے بعد آج تک دیکھا گیا۔ یہ کانفرنس اصولی اور بنیادی طور پر اس بات کی ضمانت تھی کہ مسلمانوں کا دامن فرقہ واریت سے پاک ہے اور وہ ملک کی مشترک سیاست میں حصہ لے کر ترقی پذیر عنصر کی حیثیت سے ملک کی خدمت کے لئے آمادہ ہیں۔

اس کانفرنس میں فرقہ واریت کے خطرات سے ملک کو آگاہ کیا گیا صوبائی حکومتوں سے فرقہ واریت کو ختم کرنے کا مطالبہ کیا گیا کہ وہ فرقہ پرور عناصر سے اپنے نظام کو پاک کر کے غیر فرقہ وارانہ جمہوریت کو کامیاب کرنے کی طرف تیزی اور مستعدی سے قدم بڑھائیں۔ اس کانفرنس کا عظیم الشان کارنامہ یہ تھا کہ مسلمانوں کے دامن سے ان تمام دھبّوں کو دھویا گیا جو فرقہ پرستوں کی طرف سے لگائے جا چکے تھے۔ اس کے بعد خوف و ہراس اور احساس کمتری کے باقی رہنے کے کوئی معنیٰ نہیں تھے۔

مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی تقریر

کانفرنس کے آخری اجلاس میں جمعیۃ علماء ہند کے ترجمان مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے کانفرنس کی کارگذاری اور تجاویز پر تبصرہ کرتے ہوئے تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ جو ولولہ انگیز اور تاریخی تقریر فرمائی وہ الجمعیۃ کے اسی نمبر میں آپ کے ملاحظہ سے گذرے گی۔

مسلمانانِ ہند کے ایک لاکھ نمائندوں نے جب یہ تقریریں سنیں اور کانفرنس کی دو روزہ کی کارگذاری کا مشاہدہ کیا، اس کی تجاویز پر غور و خوض کیا تو پھر صرف وہی شخص خوف زدہ اور ہراساں رہ گیا جو بزدل تھا۔ یا جس کے دل میں کھوٹ تھی۔ جمعیۃ علماء ہند کے ارکان نے پورے ملک میں دورے کر کے کانفرنس کے حیات بخش فیصلوں کو ہر سننے والے کان تک پہونچایا اور ان کروڑوں مسلمانوں کو جو مستقبل سے مایوس ہو چکے تھے اطمینان بخش روشنی سے آشنا کیا۔

مجاہد ملت معمار سیکولرزم

اگر جمہوریت کا تقاضا یہ ہے کہ ہر ایک باشندہ ملک شہری حقوق میں مساوی درجہ کا مالک ہو ہر ایک فرد کو رائے اور فکر کی آزادی حاصل ہو۔ مذہبی آزادی کے ساتھ اس کو یہ بھی حق ہو کہ اپنے کلچر، اپنی تہذیب و تمدن اور اپنی روایات کو زندہ رکھ سکے، جہاں تک ممکن ہو ترقی دے سکے۔ تو ہندوستان جیسے ملک میں جہاں مختلف مذہبوں کے ماننے والے مساویانہ شہری حقوق کے مستحق ہوں جمہوریت کا لازمی تقاضا یہ بھی ہوگا کہ نظام حکومت سب مذہبی ہو یا لا مذہبی اور لادینی ہو۔ جب کہ ایک ہی مذہب کے ماننے والوں میں بہت سے فرقے اور بہت سے مکتبہ خیال موجود ہوں تو "سب مذہبی نظام حکومت" ناممکن العمل بھی ہوگا اور اتحاد و یک جہتی پیدا کرنے کے بجائے تقسیم در تقسیم اور انتشار در انتشار پیدا کر دیگا۔

وطنی اور ملکی امور میں یکجہتی صرف اسی صورت میں پیدا ہو سکتی ہے کہ مذہبیات سے الگ حکومت اور ریاست کا تعلق صرف ملکی امور سے ہو مذہبی معاملات میں حکومت قطعاً غیر جانبدار رہے، نہ کسی مذہب کی پشت پناہ بنے، نہ کسی کی مخالف۔ لادینی حکومت کا یہی مطلب ہے جس کو سیکولر حکومت کہا جاتا ہے۔

مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب جو آزادی سے پہلے مسلم فرقہ واریت کے مقابلہ پر سینہ سپر رہے اور خاص ۱۹۴۷ء کے ہنگامی حالات میں ہندو فرقہ واریت کے مقابلہ میں سینہ تان کر کھڑے ہو گئے۔

پھر جیسے جیسے فسادات کے آتش فشاں شعلہ بار ہوئے مجاہد ملت کی سرگرمیاں ان کے مقابلہ میں بڑھتی رہیں۔ یہاں تک کہ وہ شعلے سرد پڑے اور وہ سیلاب پایاب ہوا۔ ظاہر ہے وہ ہندیونین میں سیکولرزم ہی کے حامی ہو سکتے تھے۔ ۱۹۴۹ء اور ۱۹۵۰ء میں جب ہندوستان کا دستور اساسی منظور کیا جا رہا تھا۔ فرقہ پرست طاقتوں کی پوری کوشش یہ تھی کہ جب اسلامی حکومت کے نام پر پاکستان بنایا گیا ہے تو لامحالہ ہندیونین میں ہندو حکومت ہو۔

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کانسٹی ٹیوٹ اسمبلی کے باقاعدہ ممبر نہیں تھے[۱]۔ صرف ایک سب کمیٹی کا ممبر آپ کو بنا لیا گیا تھا۔ مگر آپ کی تمام سرگرمیاں ان کو کمک پہونچانے میں صرف ہوتی رہیں جن کو بانی سیکولرزم کہا جا سکتا ہے یعنی دیش باپو۔ گاندھی جی۔ مولانا ابوالکلام آزاد۔ اور پنڈت جواہر لال نہرو وزیر اعظم حکومت ہند۔

اس ماحول میں کہ فرقہ واریت شباب پر تھی اور ہر طرف فرقہ وارانہ جذبات کا دیو رقص کر رہا تھا۔ سیکولرزم کو دستور اساسی کی بنیاد قرار دینا ایک ایسی عجیب بات تھی جس کے لئے مذہب کی زبان میں کرامت کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ یعنی ظاہری اسباب کا تقاضا یہ تھا کہ ہندوازم کامیاب ہو مگر جو نتیجہ ظہور پذیر ہوا وہ اس کے خلاف اور قطعاً غیر متوقع تھا۔

سیکولرزم کا تصور کامیاب ہو سکا یا نہیں۔ یہ ایک مستقل مسئلہ ہے۔ اگر پندرہ سال گذر جانے کے بعد بھی ناکام ہے تو اس کے اسباب پر بحث کی جا سکتی ہے۔ مگر جہاں تک مجاہد ملتؒ کی مساعی کا تعلق ہے ان کی درخشاں پیشانی داغدار نہیں ہو سکتی۔ بلکہ حالات کی ناسازگاری اس کو اور زیادہ آبدار بنا دیتی ہے۔

جب نظریات کا تصادم ہو تو اس کا اثر قومی کردار پر بھی پڑتا ہے چنانچہ ایک طرف سیکولرزم کے بانی اور معمار صاحبان کی کوششیں سیکولرزم کو کامیاب بنانے میں صرف ہوتی رہیں تو دوسری جانب فرقہ پرست جماعتوں نے جہاں موقع ملا مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی۔

مسلمانوں کی مظلومانہ تباہی اور بربادی کا صدمہ مجاہد ملت سے زیادہ کس کو ہو سکتا ہے۔ مگر ہر موقع پر ایک اور صدمہ بھی آپ کے دل و دماغ کو متاثر کرتا رہا۔ یعنی ہر ایک ہنگامہ اور فساد سیکولرزم کی تحریک کے خلاف ایک حملہ ہوتا تھا جس سے منزل دور ہو جاتی تھی۔ مجاہد ملت جیسے با احساس مسافر کے لئے دوری منزل کا صدمہ بھی کچھ کم نہیں تھا۔ چند سال یقیناً ایسے گذرے کہ وہ جذبات جو ۱۹۴۷ء میں مشتعل ہو چکے تھے وہی ان ہنگاموں کا سبب ہوتے تھے لیکن ۱۹۵۲ء کے الیکشن میں جب ملک کے عوام نے ۹۵ بلکہ ۹۹ فیصدی ووٹ غیر فرقہ پرست سیاسی جماعتوں کو دیکر یہ ثابت کر دیا کہ ملک کے عام باشندے اپنا مذہب کچھ بھی رکھتے ہوں وہ فرقہ پرستی کے حامی نہیں ہیں تو اس کے بعد فرقہ وارانہ فسادات کی ذمہ داری عوام پر نہیں ڈالی جا سکتی تھی۔ بلکہ معقولیت پسندی کا تقاضا یہی تھا کہ فرقہ وارانہ ہنگاموں کا ذمہ داران مٹھی بھر غلط کار لیڈروں اور ان کے ساتھیوں کو قرار دیا جائے جو بنیادی طور پر سیکولرزم کے مخالف ہیں اور اپنی غلط حرکتوں سے عوام کو گمراہ کر کے ہنگاموں کی آگ بھڑکاتے ہیں۔

چنانچہ مجاہد ملت رحمۃ اللہ علیہ نے حکومت کے سربراہوں کو بارہا اس طرف توجہ دلائی۔ بعض سربراہوں سے اس سلسلہ میں تلخ کلامی تک کی نوبت آئی۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اس وقت یعنی ۱۹۵۳ء ۱۹۵۴ء میں اگر صوبائی حکومتوں کے سربراہ معقولیت پسندی سے کام لیتے اور اگر مجاہد ملت کے درد دل کا ایک شمہ بھی ان کو میسر ہوا ہوتا تو وہ نتیجہ یقیناً سامنے نہ آتا جو ۱۹۵۹ء میں قوم کا سرطان بن کر سامنے آیا۔

ہمیں افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ صوبائی حکومتوں کے بہت سے ذمہ داروں اور بعض مرتبہ مرکزی حکومت کے بھی بعض ذمہ داروں کی ذہنیت اسی رنگ میں رنگی رہی جو فرقہ پرست جماعت اور اس کے پریس کا خاص مشن تھا۔ انتہا یہ کہ ان خونیں ہنگاموں کو بھی جو ملک کے گوشہ گوشہ میں ہوتے رہے قوم پرستی ہی قرار دیا۔ بہت سے بہت لفظ "جارحانہ" کا اضافہ کر دیا (یعنی فرقہ پرستوں کی ہنگامہ آرائیاں قوم پرستی ہی کا تقاضا ہیں فرق صرف یہ ہے کہ یہ جارحانہ قوم پرستی ہے) جبکہ مظلوم مسلمان کی آہ وزاری کو بھی فرقہ واریت اور نہ صرف فرقہ واریت بلکہ پاکستانی ذہنیت کا شاخسانہ قرار دیا جاتا رہا۔

مجاہد ملت کا ظرف وسیع اور حوصلۂ عالی یقیناً اپنی مثال آپ تھا کہ باوجودیکہ سربراہوں کی یہ مسموم ذہنیت مجاہد ملت کے لئے رات دن کی کڑھن تھی تب بھی سیکولرزم کی حمایت میں اٹھا ہوا قدم تیز سے تیز تر

[۱] غالباً حضرت مولانا محمد میاں صاحب کو یہ سطریں تحریر فرماتے ہوئے سہو ہو گیا۔ مجاہد ملتؒ دستور ساز اسمبلی کے باقاعدہ ممبر مسٹر رضوان اللہ کی سیٹ پر جولائی ۱۹۴۹ء میں منتخب ہوئے تھے اور اسمبلی کے اختتام تک باقاعدہ ممبر رہے اس سے پہلے مئی ۱۹۴۹ء میں وہ یوپی اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے تھے لیکن دستور ساز اسمبلی میں آجانے کی وجہ سے ہی انھوں نے یوپی کی ممبری سے استعفا دیدیا تھا۔ انیس الحسن۔

ہو رہا تھا اور نا ممکن تھا کہ کوئی لغزش اس قدم میں آسکے۔

لیکن چند سال بعد ہی ذمہ داران حکومت کی اس چشم پوشی کا نتیجہ سامنے آگیا۔ جب ۵۹ء میں انھوں نے دیکھا کہ خود اُن کا ماحول اُن کے خلاف ہو چکا ہے اور کارپردازان حکومت کی اکثریت فرقہ واریت کی وبا میں مبتلا ہو چکی ہے۔

۱۹۴۷ء کے وقتی ہنگاموں کے بعد جو فسادات گذشتہ پندرہ سال میں ہوئے اُن کا شمار مشکل ہے۔ ہر فساد کے موقع پر جمعیۃ علماء ہند کی طرف سے وفود بھیجے جاتے تھے اور ستم رسیدہ مسلمانوں کی امداد کی جاتی تھی مگر ان وفود میں خود مجاہد ملت شریک نہیں ہوا کرتے تھے بلکہ اہم موقع پر احقر کو بھیج دیا کرتے تھے۔ ورنہ اور ساتھیوں کو مامور فرما دیتے تھے۔

مگر ۵۹ء میں رمضان شریف کے ایام میں مبارکپور اور بھوپال میں جو ہنگامے ہوئے اُن کا جائزہ لینے کے لئے خود مجاہد ملت نے سفر فرمائے۔

روزہ میں مجاہد ملت کی ریاحی تکلیفیں بڑھ جاتی تھیں۔ مگر ان سفروں کے لئے نہ روزہ عذر بن سکا نہ ریاحی تکلیف راستہ روک سکی جو ان ایام میں کلکتہ گیا ہوا تھا۔

ابتدا میں احقر کا خیال یہی رہا کہ چونکہ احقر مرکز سے دور ایک ہزار میل کے فاصلہ پر جمعیۃ کے ضروری کام میں مصروف ہے اس لئے ان سفروں کی زحمتیں خود مجاہد ملت نے برداشت کی ہیں۔ مگر بعد میں احقر کو محسوس ہوا کہ احقر کی غیر حاضری نہیں بلکہ ان فسادات کی عجیب و غریب نوعیت نے حضرت مجاہد ملت کو مضطرب کر دیا ہے اور آپ نے خود بہ نفس نفیس مقابلہ کا عزم کر لیا۔

۵۰ء کے ہنگاموں میں مراد آباد وغیرہ میں بھی بعض موقعوں پر یہ ثابت ہوا تھا کہ مقامی حکام اور پولیس نے مظلوموں کے بجائے ظالموں کا دست و بازو بن کر کام کیا ہے مگر واقعات کچھ اس قسم کے تھے کہ حکام کی اس غلط کاری کا عذر قابل تسلیم ہو سکتا تھا۔ لیکن مبارکپور اور بھوپال کے ہنگاموں نے کھلے طور پر ظاہر کر دیا کہ فرقہ واریت کی وبا سرکاری حلقوں کو بھی یہاں تک متاثر کر چکی ہے کہ بدامنی کے زمانہ میں پولیس بھی وہ کر تی ہے جو فرقہ وارانہ جماعتوں کے والنٹیر اور رضاکار کر سکتے تھے۔

مجاہد ملت کانگریسی حلقوں میں بہت کافی مقبولیت رکھتے تھے۔ کانگریس ان کو الیکشن کے موقع پر ٹکٹ دیا کرتی تھی۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ یہ مقبولیت اور کانگریسی حلقوں میں محبوبیت امیدواروں کی عملی طاقت کو کمزور اور ان کی قوت گویائی کو سلب کر دیتی ہے لیکن مجاہد ملت کی ہمت عالی اس کمزوری سے پاک تھی۔ آپ نے خاموشی کے بجائے بے پناہ خطابت سے کام لیا۔ مبارکپور اور بھوپال وغیرہ کے ہنگاموں پر وہ بیانات دیئے جنھوں نے ان ریاستوں کے چیف منسٹروں کو چراغ پا کر دیا۔ اُن کے جوابی بیانات نے مجاہد ملت اور چیف منسٹروں کے درمیان ایسا محاذ قائم کر دیا جس کو توڑنے کے لئے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی مجلس عاملہ کو بھی دخل دینا پڑا۔

ورکنگ کمیٹی کے اجلاس میں ایک طرف مجاہد ملت تھے اور دوسری جانب مدھیہ پردیش اور یوپی کے چیف منسٹر اور اُن کے حامی۔ مگر صداقت انصاف اور حقیقت پسندی نے حضرت مجاہد ملت کی قوت خطابت میں استدلال کی وہ بے پناہ طاقت پیدا کر دی تھی جس نے صرف ان چیف منسٹر صاحبان کو لاجواب ہی نہیں کیا بلکہ پوری ورکنگ کمیٹی کو مجاہد ملت کی حمایت پر مجبور کر دیا۔

یہ درست ہے کہ جمعیۃ علماء ہند کی جماعتی طاقت، اس کی مجلس عاملہ کی تجاویز، وہ متعدد میمورنڈم جو مرکزی حکومت کے ارکان اور کانگریس کے ہائی کمانڈ کو بار بار پیش کئے گئے تھے حضرت مجاہد ملت رح کی پشت پر تھے مگر یہ بھی درست ہے کہ مسلمانوں بالخصوص جمعیۃ علماء ہند کی خوش نصیبی تھی کہ مجاہد ملت کی پر شوکت خطابت اور نا قابل تسخیر قوت استدلال ان کو میسر آئی تھی۔ آج اس قوت و طاقت کے فقدان پر جس قدر ماتم کیا جائے کم ہے۔

کنونشن کی تجویز

یہ صورت حال کہ سرکاری عملہ بھی فرقہ واریت کے زہر سے متاثر ہو چکا تھا، پورے ملک کے لئے باعث تشویش تھی۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ اس کا احساس صرف مسلم اقلیت کو تھا جو فرقہ پرستی کی تباہ کاریوں سے آئے دن متاثر ہوتی رہتی تھی۔ اور یہ فرقہ پرستی صرف فسادات کی صورت میں ہی ظہور پذیر نہیں ہوتی تھی بلکہ ملازمت۔ لوکل باڈیز۔ اسمبلی اور پارلیمنٹ وغیرہ سرکاری اداروں میں نمائندگی۔ کاروباری سلسلہ میں لائسنس وغیرہ غرض سماجی، سیاسی اور کاروباری زندگی کا ہر ایک شعبہ اس سے متاثر ہو رہا تھا۔ چند ماہ تک جمعیۃ علماء ہند کے پیش نظر یہ رہا کہ مسلمانوں اور صاف دماغ سلجھی ہوئی ذہنیت رکھنے والے ہندو رہنماؤں کا کنونشن کیا جائے۔ پھر مشترک نمائندگی کے ذریعہ حکومت کو اس خطرناک صورت حال سے آگاہ کر کے اس کے علاج کا مطالبہ کیا جائے۔

لیکن ایک عبرت انگیز دشواری اس مشترک کنونشن کے راستہ میں سنگ گراں بنی رہی۔ دشواری یہ تھی کہ جن ہندو رہنماؤں کو صاف دماغ سمجھا جاتا ہے ان کو ان حالات کا علم تک نہیں جن میں مسلمانوں کا تن من گھل رہا ہے۔ کیونکہ اُن کے معلومات کا ذریعہ اخبارات ہوتے ہیں اور انگریزی یا ہندی وغیرہ کے جو اخبارات اُن کے سامنے آتے ہیں وہ گویا قسم کھا چکے ہیں کہ مسلمانوں کے مصائب کا تذکرہ نہیں کریںگے اور وہ کا وہ پریس جو مسلمانوں کا پریس کہلاتا ہے مسلمانوں کے حالات اور اُن کے مصائب کا شکوہ ضرور کرتا رہتا ہے مگر غیر مسلم تو کیا خود مسلمانوں کا اونچا طبقہ بھی اُردو کے اخبارات پڑھنا پسند نہیں کرتا دوسرا ذریعہ معلومات ریڈیو ہے تو وہ ہندی اور انگریزی پریس سے بھی زیادہ محتاط یا سنگدل۔ کیا مجال مسلمانوں کے شکوہ شکایت کا کوئی ایک حرف بھی اس کی زبان پر آجائے۔ ایسے غیر مسلم رہنماؤں کو کنونشن میں دعوت دینے سے پہلے ضروری تھا کہ فرداً فرداً ہر ایک سے ملکر یا انگریزی پمفلٹوں کے ذریعہ مسلسل پروپیگنڈہ کر کے پہلے اُن کو آشنا درد کیا جائے پھر کنونشن میں شرکت کی دعوت دی جائے۔ بلا شبہ اس وقت ہی نہیں بلکہ ہمیشہ مسلمانوں کے ایک انگریزی روزنامہ کی ضرورت شدت سے محسوس ہوتی رہی۔ لیکن اپنی کم ہمتی اور بے بضاعتی کا شکوہ کیا جائے یا اہل ثروت مسلمانوں کی لاپرواہی کا (یہ خود ایک بحث طلب موضوع ہے) یہ شدید اور اہم ضرورت پوری نہیں ہوئی۔ بیشک بعض غیر مسلم رہنما مثلاً دہلی کے وہ غیر مسلم رفیق اور ساتھی جن سے رات دن کا واسطہ رہتا ہے وہ واقف بھی تھے ان کو دعوت دینا بھی سہل تھا اور اُن کی شرکت بھی یقینی تھی مگر بد قسمتی سے وہ پہلے ہی سے مسلم نوازی میں بدنام ہو چکے ہیں۔

یہ مسئلہ ابھی زیر بحث تھا کہ اُجین میں جمعیۃ علماء ہند کے اجلاس عام کا وقت آگیا۔

مجاہد ملت رحمۃ اللہ علیہ نے اس اجلاس عام سے ہی کنونشن کا مقصد پورا کرنا چاہا۔ چنانچہ جمعیۃ علماء ہند کے اراکین کے علاوہ اور بھی بہت سے مسلم رہنماؤں کو شرکت کی دعوت دی۔ ایک حد تک یہ مقصد پورا بھی ہوا۔ چنانچہ اس اجلاس میں کھل کر موجودہ حالات پر بحث ہوئی جس کی بنا پر مدھیہ پردیش کے پریس نے (جہاں یہ اجلاس ہوا تھا) بہت کافی کیچڑ اچھالی۔ فرقہ پرستی کا آخری حربہ جو اس پریس کے پاس تھا اُس کو پوری چالاکی اور ہوشیاری سے استعمال کیا اور جمعیۃ علماء ہند کے اجلاس کو فرقہ پرستی کا نشان قرار دیا وغیرہ وغیرہ۔

لیکن اس اجلاس کے چند روز بعد ہی جبل پور کا حادثہ مسلمانوں کے حق میں بھونچال بن کر رونما ہوا۔ مجاہد ملت رح نے پہلے ایک وفد جبل پور بھیجا پھر وہ خود تشریف لے گئے۔ حالات کا معائنہ کیا اور واپس آنے کے بعد پارلیمنٹ میں وہ تقریریں کیں جن سے نہ صرف ہندوستان کے ایوان سیاست میں ہلچل پڑ گئی بلکہ پارلیمنٹ کی صدا پوری دنیا میں گونج گئی۔

ہندوستان کے مسلمان جو پہلے اخبارات کی زبان سے جبل پور ساگر وغیرہ کے ناتمام حالات سُن رہے تھے اور ہندوستان کے دوسرے فسادات کی طرح اس کو بھی ایک بڑے پیمانہ کا ہنگامہ تصور کر رہے تھے۔ جب انھوں نے مجاہد ملت کی پارلیمنٹ کی تقریریں پڑھیں تو گویا ان کی شکستہ پائی تیزگامی سے بدل گئی۔ تن نیم جان میں نئی زندگی کی روح مضطرب ہو گئی اور لاکھوں روپیہ سے مالی امداد کر کے اپنی بیداری کا ثبوت دیا۔ مگر یہ مسئلہ پھر بھی باقی رہ گیا کہ ارباب اقتدار کو اجتماعی طور پر اپنی شکایتوں سے کس طرح آگاہ کیا جائے، اس کا ذریعہ کنونشن ہو سکتا تھا۔ لہٰذا کنونشن کا مسئلہ پھر اُبھر کر سامنے آیا اور غیر مسلم رہنماؤں کی شرکت سے چونکہ مایوسی تھی۔ لہٰذا مجلس عاملہ جمعیۃ علماء ہند نے یہی طے کیا کہ صرف مسلمانوں کا کنونشن کیا جائے۔

مجلس عاملہ جمعیۃ علماء ہند کے اجلاس مورخہ ۴ اپریل ۱۹۶۱ء نے کنونشن کی تجویز پاس کرتے ہوئے تمام مکاتب خیال کے مسلمانوں سے شرکت کی اپیل کی اور کنونشن کے انتظامات کی ذمہ داری مجاہد ملت کے سپرد کر دی (رحمہ اللہ) (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو تذکرہ خدمات جمعیۃ علماء ہند م۴)

مجلس عاملہ کی تجویز کے بعد جیسے ہی مجاہد ملت رحمۃ اللہ علیہ نے اخبارات میں کنونشن کا اعلان کیا۔ تو جیسا کہ خطرہ تھا اس سے بھی زیادہ بھیانک صورت میں غیر مسلم پریس کی یورش شروع ہو گئی۔ حد سے زیادہ تکلیف دہ رویہ ان دوستوں کا تھا جو پہلے کنونشن کے لئے مصر تھے اور جیسے ہی یہ شورش شروع ہوئی وہ حملہ آوروں کے ساتھ ہو گئے۔ اور کنونشن کے خلاف بیانات دینا شروع کر دیئے۔

کچھ دوستوں نے پنڈت نہرو وزیر اعظم حکومت ہند کے پاس باقاعدہ ڈپوٹیشن لیجا کر کنونشن کے نقصانات پنڈت جی کے ذہن نشین کرانے کی کوشش کی

سمپورنانند جی چیف منسٹر یوپی اور اجیت پرشاد جین جیسے کانگریسی لیڈروں کی دلیل یہ تھی کہ اس کنونشن سے فرقہ پرستی کو شہ ملے گی۔ وہ بھی اس کا جواب دیں گے (یعنی آج تک فرقہ پرست طاقتیں خاموش اور قطعاً غیر متحرک تھیں اور اب ان میں حرکت پیدا ہو گئی) ایک ایسا لیڈر جو آج تک مقبول اور واجب الاحترام ہی رہا ہو اس پر جب سب طرف سے اعتراضات کی بوچھار ہو تو بہت مشکل ہے کہ اس کا قدم لغزش سے محفوظ رہے مگر مجاہد ملت کی لیڈری مصنوعی نہیں تھی بلکہ آپ کی لیڈری لازمی ثمرہ تھی جذبات صادق اور اُن مخلصانہ کوششوں کا جو مجاہد ملت کی فطرتِ ثانیہ بن گئی تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے اخلاص۔ صداقت پسندی اور بے پناہ قوتِ عمل کے ساتھ وہ جرأت اور وہ استقامت بھی عطا فرمائی تھی کہ گرد و پیش کی زیادہ سے زیادہ مخالفت بھی آپ کو متاثر نہیں کر سکتی تھی۔ اور واقعہ یہ ہے کہ جس کی پوری زندگی "محاذ" پر گذری ہو۔ وہ کسی حملہ سے کیسے مرعوب ہو سکتا ہے۔

تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اس موقعہ پر آنریبل حافظ محمد ابراہیم صاحب (وزیر برق و آب) نے بھی غیر معمولی جرأت و استقامت کا ثبوت پیش کیا۔ آپ جس طرح پہلے دن کنونشن کے حامی تھے آپ کی حمایت میں اگر فرق آیا تو صرف یہ کہ 'حمایت' صرف زبانی نہیں رہی بلکہ عملی ہو گئی آپ نے سرکاری حلقوں کی غلط فہمی کو دور کر کے اُن کے اندر بھی حمایت کا جذبہ پیدا کیا

مجاہد ملت کی وفات سے تیسرے روز کارپوریشن کی طرف سے جلسہ تعزیت کیا گیا تو لال بہادر شاستری وزیر داخلہ حکومت ہند نے اپنی تقریر میں مجاہد ملت کی قوتِ خطابت کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ کنونشن کے متعلق ہماری رائے نہیں تھی۔ چنانچہ مجاہد ملت سے ایک شب کو تفصیلی گفتگو کی گئی اگرچہ ہم مطمئن نہیں ہو سکے مگر مجاہد ملت کو جواب بھی نہیں دے سکے۔

بہرحال مجاہد ملت نے صرف استقلال و استقامت سے ہی نہیں بلکہ حسنِ تدبیر سے ایک طرف پریس کو ہموار کیا۔ انگریزی زبان پر عبور نہ رکھنے کے باوجود انگریزی اخبارات کے نامہ نگاروں' بیرونی ممالک کے نمائندوں کو مطمئن کر دینا آسان بات نہیں ہے۔ مگر مجاہد ملت نے کنونشن کے سلسلہ پر پریس کانفرنس کی تو پہلی تقریر نے ہی ہر ایک کو متاثر کر دیا۔ پھر سوالات کے برمحل اور معقول جوابات نے 'نامہ نگاروں کے اطمینان کو گرویدگی کا رنگ دیدیا۔ اسی طرح صدر کانگریس سنجیوا ریڈی سے گفتگو کر کے انہیں اس درجہ مطمئن کر دیا کہ مخالفت کرنے کے بجائے انہیں کہنا پڑا کہ مسلم کنونشن سے جمہوریت اور قومی یکجہتی کے مقصد کو تقویت پہونچے گی۔

بہرحال مسلم کنونشن ہوا۔ اور جس شان سے ہوا اُس کا علم صرف شرکاءِ کنونشن کو نہیں بلکہ ہر اُس صاحب بصیرت انسان کو ہے جو اخباری دنیا سے واسطہ رکھتا ہے۔

جس طرح دینی تعلیم کے سلسلہ میں (بمبئی کنونشن منعقدہ ۱۹۵۲ء) تاریخ کا ایک عجوبہ تھا کہ مختلف مکاتب خیال کے علماء اور نمائندگان نے اس میں شرکت کر کے دینی تعلیم کے سلسلہ میں اتحادِ نظر اور وحدتِ خیال کی ایسی مثال قائم کی جس کی نظیر تاریخ میں نایاب ہے اسی طرح اس کنونشن نے اُن سب کو جو سیکولرزم کے حامی تھے ایک مرکز پر متحد کر کے ثابت کر دیا کہ خوف زدہ مرعوب اور پست ہمت کرنے کی پندرہ سالہ کوششوں کے باوجود اس تن مجروح میں قوتِ مقابلہ باقی ہے اور بہترین قیادت کی یہ برکت ہے کہ اس حقیقت کے باوجود کہ "تن ہمہ داغ داغ شد" وہ اپنے زخموں سے بے پرواہ میدانِ زندگی میں آگے قدم بڑھانے کی کوشش کر رہا ہے۔

مسلم کنونشن ایک پیغام

مسلم کنونشن جس طرح مسلمانوں کے لئے ایک پیغام تھا کہ جبل پور اور ساگر جیسے مہلک اور جاں گسل حوادث کے باوجود بزدلی اور پست ہمتی حرام ہے۔ بیشک وہ مظلوم ہیں۔ وہ مظالم کا شکوہ اور مظلومیت کا مظاہرہ کر سکتے ہیں مگر طوقِ غلامی کے لئے اپنی گردنوں کو خم نہیں کر سکتے۔

اسی طرح وہ پورے ہندیونین اور اس کے سکولر نظام حکومت کے لئے ایک پیغام تھا کہ جمہوریت اسی وقت کامیاب ہو سکتی ہے کہ اس کا ہر عضو زندہ ہو اور وہ حیاتِ نو کی اُمنگوں کے ساتھ متحرک بن سکے۔

وہ قومی یکجہتی اور جذباتی ہم آہنگی کے نصب العین کے لئے بھی ایک نشان تھا کہ گلہائے رنگارنگ کو شاداب رکھ کر ہی گلدستہ کی شیرازہ بندی ہو سکتی ہے۔ مرجھائے ہوئے پھولوں کی گڈی کو گلدستہ نہیں کہا جا سکتا۔

بین الاقوامی دنیا کے گلدان میں اگر آپ اپنا گلدستہ سجانا چاہتے ہیں تو آپ کی پہلی کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ ہر ایک پھول شگفتہ اور ہر کلی مسکراتی ہوئی ہو۔ مرجھائے ہوئے پھولوں کا گلدستہ گلدان

میں سجایا نہیں جاتا بلکہ خس وخاشاک کی طرح اس کو کوڑے پر پھینک دیا جاتا ہے۔

ملک کا پریس اگر تعصب کی گندگی سے پاک ہوتا۔ اگر اس میں یہ حوصلہ ہوتا کہ وہ مجاہد ملتؒ کے منشا اور مسلم کنونشن کے صحیح مقصد کو سمجھ سکے تو کنونشن کے ان مقاصد کی اشاعت وہ خود کرتا۔ مگر جس پریس کی تنگ نظری وزیر اعظم حکومت ہند کی تقریروں میں بھی کتر بیونت کرتی رہتی ہو، اس کا یہ حوصلہ کہاں تھا کہ وہ کنونشن کے مقاصد کی اشاعت صحیح طور پر کرتا۔ پھر اس کو اجیت پرشاد جین اور سمپورنانند جیسے " بدنام کنندگان نکونامے چند" کے بیانات کا بہانہ مل گیا۔ جنھوں نے مسلم کنونشن کو فرقہ واریت کا نشان بنا کر فرقہ پرستوں کو شہ دینی شروع کردی۔ فرقہ پرست رہنما خاموش تھے۔ وہ خود مسلم کنونشن کو اپنی ترقی کا سبب نہیں سمجھ رہے تھے مگر ملک اور قوم کے ان نیم طبیبوں نے بلاوجہ مسلم کنونشن پر تنقید کر کے بہانہ تلاش کرنے والوں کے لئے بہانہ مہیا کرنے کی خدمت اپنے ذمہ لے لی

کسی کام کو شروع کرنے کے بعد ناتمام چھوڑ دینا مجاہد ملت کی فطرت کے خلاف تھا۔ جب آپ نے محسوس کیا کہ تنگ نظر پریس اور اس کے تعصب پرست سرپرست کنونشن کو اس طرح مشتبہ بنا کر اس کی افادیت کو ختم کر دیں گے تو پھر آپ نے خود بنفس نفیس یہ عزم کیا کہ ملک کے گوشہ گوشہ میں پہونچکر کنونشن کا پیغام وہ خود پہونچائیں گے۔ چنانچہ پورے ہندوستان کے دورہ کا آپ نے پروگرام بنالیا۔ اسی اثنا میں رانچی میں ایک ہنگامہ ہوگیا۔ وہاں سے تاروں کا تانتا بندھ گیا کہ مجاہد ملت خود تشریف لائیں۔

مرض کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا اور جب خلاف معمول تقریباً ایک ماہ تک کھانسی اور حرارت کی شکایت رہی تو ایکسرے کرایا گیا۔ ڈاکٹر عبدالعلیم صاحب نے فوٹو کا ایکسرے دیکھ کر، مجاہد ملت کے رفیق خاص مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب سے "کینسر" کا خطرہ بھی ظاہر کیا۔ مگر اتفاق سے چند روز بعد اطباء کی عام دواؤں سے افاقہ محسوس ہونے لگا۔ حتیٰ کہ مجاہد ملت چلنے پھرنے اور تقریریں کرنے کے قابل ہوگئے تو پھر آپ کے رفقاء نے اس خطرہ کو اہمیت نہیں دی اور خود مجاہد ملت کی یہ طبیعت نہیں تھی کہ ایسے خطرات سے متاثر ہوکر اپنے پروگراموں کو موقوف کریں۔ چنانچہ آپ رانچی تشریف لے گئے۔

مسلم کنونشن کے بعد مقبولیت کا دامن اور بھی زیادہ وسیع ہوگیا تھا چنانچہ آپ کی تقریر سننے کے لئے پورے صوبہ بہار سے لوگ کھنچ کھنچ کر رانچی پہونچے۔ حکومت بہار کے منسٹر بھی تقریر سننے کے ایسے ہی مشتاق تھے چنانچہ مجاہد ملت کی تقریباً نوے منٹ کی تقریر نے پورے مجمع پر جادو کا اثر کیا۔ بالخصوص منسٹر صاحبان بہت کافی متاثر ہوئے۔

رانچی سے واپسی کے بعد آپ بمبئی تشریف لے گئے اور واپسی اس وقت ہوئی جب ۱۹۶۲ء کے الیکشن کے لئے امیدواروں کی نامزدگیوں کا اکھاڑا دہلی میں جما ہوا تھا اور جمعیۃ علماء ہند کے دفتر میں ہر وقت جم غفیر جمع رہتا تھا۔ پھر جیسے ہی ٹکٹ تقسیم ہوچکے اور امیدواروں کی یورش ختم ہوئی مجاہد ملتؒ نے آندھرا کے دورہ کا قصد فرمالیا جس کا تقاضا بہت عرصہ سے تھا۔

اب مرض میں اضافہ ہوگیا تھا اور ایک معمولی سی تشویش یہ پیدا ہونے لگی تھی کہ خلاف معمول اس مرتبہ طبیعت بحال نہیں ہوتی۔ عارضی افاقہ کے بعد پھر اسی طرح مضمحل ہوجاتی ہے۔

آندھرا سے واپسی کے بعد گرتی ہوئی صحت کا تقاضا یہ تھا کہ مجاہد ملت آرام فرماتے۔ مجاہد ملت خود بھی آرام کرنے کی ضرورت محسوس کر رہے تھے۔ مگر آپ نے آرام کرنے کا پروگرام یہ بنایا تھا کہ حلقہ انتخاب کا ایک مرتبہ دورہ کر چکنے کے بعد آپ آرام فرمائیں گے اور آپ کے رفقاء الیکشن کی خدمات انجام دیں گے۔

۲۳ جنوری ۱۹۶۲ء کو بمبئی میں سنٹرل حج کمیٹی کی میٹنگ ہونے والی تھی۔ مجاہد ملت کا پروگرام یہ تھا کہ ۲۲ جنوری کو اپنے حلقہ انتخاب کا دورہ پورا کرنے کے بعد دہلی پہونچیں گے پھر فوراً ہی رات کے ہوائی جہاز سے بمبئی روانہ ہوجائیں گے۔ چنانچہ اسی پروگرام کو کامیاب کرنے کے لئے آپ ۲۲ کی شام کو دہلی جنکشن پر پہونچے۔ اس سفر میں متعدد بار دورے پڑچکے تھے۔ ایک روز تو تقریر کے بعد ایسی بے ہوشی ہوئی کہ نبضیں چھوٹ گئیں۔ لیکن جیسے ہی ہوش آیا پروگرام کی تکمیل کے لئے کمربستہ ہوگئے۔

مختصر یہ کہ ۲۲ کی شام کو مرادآباد سے واپس ہوئے اسٹیشن پر پہنچے تو کمزوری کا یہ عالم تھا کہ اٹھنا بیٹھنا مشکل تھا۔ مگر اس کے باوجود آپ نے ہوائی جہاز کے اڈے پر پہونچنے کی کوشش شروع کردی تاکہ اگلے روز بمبئی میں حج کمیٹی کی میٹنگ میں شرکت کرسکیں جس کے آپ "چیرمین" تھے۔ اس ارادہ سے آپ مکان سے باہر آکر کار میں بیٹھ بھی گئے۔ مگر آپ کے احباب بالخصوص شیخ محمد احمد صاحب وکیل نے کمزوری کا یہ عالم دیکھا تو پورا اصرار کر کے سفر ملتوی کرادیا۔

اگلے روز مجاہد ملت جوشی سپتال میں تشریف لیگئے جہاں چار سال پہلے

ہرنیا کا آپریشن آپ نے کرایا تھا۔ اس کے بعد یہی ہسپتال آپ کے متعلقین کا گویا گھریلو ہسپتال بن گیا تھا۔ ہسپتال کے انچارج ڈاکٹر "پانڈے" مجاہد ملت" سے اتنے متاثر تھے کہ مجاہد ملت کی خوشنودی اور اُن کی خدمت کو اپنی خوش نصیبی سمجھتے تھے۔

بہرحال ۲۰ر کو آپ ڈاکٹر جوشی کے ہسپتال میں تشریف لے گئے اور ہسپتال کے انچارج ڈاکٹر پانڈے نے آپ کا معائنہ کیا تو معلوم ہوا کہ پھیپھڑوں میں پانی بہت بھرا ہوا ہے۔ فوراً مجاہد ملت کو ہسپتال کے اسپیشل کوارٹر میں قیام کرنے پر مجبور کیا اور پانی نکالنے کا انتظام شروع کر دیا۔

احقر بھی اتفاق سے باہر تھا۔ ۲۲ کی شب کو ۸ بجے مجاہد ملت دہلی پہونچے اور ۲۳ر کی صبح کو ۷½ بجے احقر دہلی پہونچا۔ تقریباً ۹ بجے دفتر میں گیا تو معلوم ہوا کہ مجاہد ملت مکان پر ہیں اور آرام فرما رہے ہیں۔ احقر نے آرام میں خلل اندازی مناسب نہیں سمجھی۔ اپنے غریب کدہ پر جا کر کچھ کام میں مشغول ہو گیا۔ تقریباً ۱۲ بجے قاضی اکرام الحق صاحب نے مکان پر پہونچکر احقر کو اطلاع دی کہ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب جوشی ہسپتال میں تشریف لے گئے ڈاکٹر صاحب نے واپس نہیں آنے دیا اور وہیں قیام کا انتظام کر دیا ہے۔

ظہر بعد احقر ہسپتال پہونچا تو معلوم ہوا کہ پھیپھڑوں سے ۱۰۵ اونس پانی نکالا جا چکا ہے۔ کئی روز بعد اس وقت مجاہد ملت سے ملاقات ہوئی تھی۔ عام انداز مجاہد ملت کا یہ تھا کہ ذرا سی بات پر برافروختہ ہو جاتے تھے اس ظاہر برافروختگی سے معلوم ہوتا تھا کہ مزاج میں تحمل اور برداشت نہیں ہے لیکن خود احقر کو معلوم ہے کہ بہت سی باتیں جو انتہا درجہ ناگوار خاطر ہوتی تھیں ان کی برداشت اس طرح کرتے تھے کہ کسی کو ناگواری کا وہم و گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ لوگ ہمیں احمق بناتے ہیں اور ہم جان بوجھ کر احمق بنتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ جماعت کے ذمہ دار کے لئے تحمل اور برداشت اور ایک لازمی چیز ہے۔ بہرحال یہ قوت برداشت مرض کی حالت میں خاص طور پر نمایاں ہوئی تھی۔

اس روز جب احقر حاضر ہوا تو ۱۰۵ اونس پانی نکل چکا تھا اس کا اثر طبیعت پر لامحالہ ہوگا۔ مگر ملاقات کے وقت کسی تاثر کو ظاہر نہیں ہونے دیا۔ کروٹ لینے کے وقت غیر اختیاری طور پر کراہ نکل گئی۔ تو پھر خود ہی فرمایا کہ جہاں سے پانی نکالا گیا ہے وہاں ٹیس ہو رہی ہے۔

مولانا وحید الدین صاحب قاسمی جو دفتر ہی سے ساتھ گئے تھے ان سے احقر نے علیحدگی میں دریافت کیا تو مولانا موصوف نے بتایا کہ پانی ابھی اور باقی ہے پرسوں کو نکالا جائے گا۔ البتہ پانی کے ساتھ کچھ خون بھی آیا ہے ڈاکٹر صاحب کو تشویش ہے کہ خون کیوں آیا۔

احقر کو اسی روز حضرت مولانا موصوف کے الیکشن کے سلسلہ میں امروہہ وغیرہ جانا تھا۔ چنانچہ احقر شب کو روانہ ہو گیا ۲۵ کو دوبارہ ۵۴ اونس پانی نکالا گیا۔ تو کینسر" نمایاں ہوا۔ فوراً حافظ محمد ابراہیم صاحب' وزیر حکومت ہند جو حضرت مولانا کے خالہ زاد بھائی بھی ہیں' بہنوئی بھی اور سمدھی بھی' ان کو اطلاع دیکر "بمبئی" بذریعہ ہوائی جہاز پہونچانے کا انتظام کیا گیا۔

سفر بمبئی۔ کینسر سفر امریکہ اور مرض الوفات کے حالات شاید کوئی اور صاحب تحریر فرمائیں احقر تو مجاہد ملت کی قوت برداشت کے سلسلہ میں ایک اور حیرت انگیز واقعہ لکھنے کے بعد اس طویل مضمون کو ختم کر رہا ہے۔

مرض الوفات کے زمانہ میں سیکڑوں بلکہ ہزاروں بزرگوں۔ دوستوں اور ارادتمندوں نے مجاہد ملت سے ملاقات کی ہے لیکن زندگی کے آخری دن تک کبھی کسی نے یہ محسوس نہیں کیا کہ حضرت مجاہد ملت کسی درجہ میں بھی اپنی زندگی سے مایوس ہیں۔

یکم اگست کی شام کو بعد عصر بار بار کچھ ایسی غنودگی سی طاری ہو رہی تھی کہ خود احقر کو ایک مرتبہ خطرہ ہوا۔ چنانچہ نبض پر ہاتھ رکھ کر احقر نے دیکھا۔ نبض کی رفتار نہایت سست تھی۔ خاص اسی حالت میں بمبئی کے مشہور لیڈر یسین نوری صاحب آ گئے۔ احقر نے اُن کو اشارہ کیا کہ وہ توقف کریں مگر وہ سمجھ نہیں سکے۔ جیسے ہی مولانا کے کان میں آواز پڑی کہ یسین صاحب کھڑے ہیں فوراً چونک کر آنکھ کھولی اور ایسی بشاشت اور خندہ پیشانی سے گفتگو کی کہ احقر خود حیران ہو گیا۔ آواز نہایت کمزور پست تھی' مگر انداز میں وہی شگفتگی تھی جو دوستوں سے ملاقات کے وقت ہوا کرتی تھی۔ پھر نماز مغرب کے بعد جبکہ سفر آخرت میں چند گھنٹے باقی رہ گئے تھے دیر تک اس پر گفتگو کرتے رہے کہ علاج تبدیل کر دیا جائے پھر خود ہی فیصلہ کر کے فرمایا کہ مولوی وحید سے کہدو کہ وہ بریلی چلے جائیں اور حکیم صدیق صاحب کو لے آئیں۔ بہرحال زندگی کے آخری دن کے آخری لمحات تک گفتگو یا کسی بھی انداز سے مایوسی کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ

جیسے ہی کینسر کی تشخیص ہوئی مولانا اپنی زندگی سے مایوس ہو چکے تھے ۔ چنانچہ جب ابتدا مرض میں ٹاٹا میموریل ہسپتال بمبئی میں زیر علاج تھے احقر کو ایک طویل خط تحریر کرایا ۔ احقر ان ایام میں امروہہ مقیم تھا ۔ احقر کے ہمنام اور مجاہد ملت کے چہیتے دوست سید محمد میاں صاحب رضوی کی معرفت وہ طویل گرامی نامہ احقر کو موصول ہوا ۔ اس میں الیکشن کے متعلق تو ایک دو سطر میں ہی مضمون تھا کہ احقر محمد میاں کو جملہ معاملات سپرد ہیں اور سید محمد میاں صاحب رضوی مولانا (مرحوم) کی طرف سے جنرل ایجنٹ ہیں ۔ باقی تمام خط میں علاج کی تفصیل تھی اور اسی مکتوب گرامی میں اشارۃً مایوسی کا اظہار بھی تھا ۔

جب مجاہد ملت بمبئی سے واپس آ چکے اور ڈاکٹروں نے یہ اطمینان دلا دیا کہ ایسا عمل کیا جا چکا ہے کہ چھ ماہ تک مرض نہیں بڑھیگا اس وقت کی بات ہے کہ احقر ایک روز تنہائی میں گفتگو کر رہا تھا اور چاہتا تھا کہ مایوسی دور کرے تو بگڑ کر احقر کی سخن گستری کی تردید کی اور اپنے مکتوب کا حوالہ دیا کہ میں آپ کو پہلے ہی خط میں اشارہ کر چکا ہوں آپ سمجھے نہیں ۔

ایک طرف یہ مایوسی ۔ اور خاتمہ زندگی کا یقین اور دوسری طرف یہ ضبط و تحمل کہ آخری دن کے آخری لمحات تک کسی بھی دیکھنے والے کو مایوسی کا احساس نہیں ہوتا تھا ۔ اس کو مجاہد ملت کی کرامت ہی کہا جا سکتا ہے ۔ کرامت کے علاوہ اور کوئی لفظ نہیں ہے جس سے اس کیفیت کی تعبیر ہو سکے ۔

اس پوری مدت میں صرف ایک روز ایسا ہوا کہ آنکھوں میں آنسو ڈبڈبانے لگے ۔

یہ امریکہ جانے سے پہلے کا واقعہ ہے کہ صبح کے وقت خواب دیکھا کہ حافظ صاحب کی کوٹھی کے اسی کمرہ میں جہاں مولانا قیام فرما تھے ایک کالا سانپ ہے اور دو نیولے ہیں ایک چھوٹا اور دوسرا بڑا ۔ کالا سانپ کہہ رہا ہے کہ میں موت ہوں اور بڑا نیولا کہہ رہا ہے کہ میں ہندوستان والوں کی دعا ہوں اور چھوٹا نیولا کہہ رہا ہے کہ میں بیرون ہند کے مسلمانوں کی دعا ہوں ۔ اور ہم اس لئے موجود ہیں کہ اس سانپ کو باہر نکالیں ۔ مولانا نے فرمایا کہ تم کس طرح لے جاؤ گے ۔ کمرے کے تمام دروازے بند ہیں تو نیولوں نے جواب دیا کہ جب ہم لیجانا چاہیں گے تو بند دروازے ہمارے راستہ میں رکاوٹ نہیں ڈال سکتے ۔ جب یہ الفاظ آپ فرما رہے تھے تو آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا رہے تھے ۔ مگر پھر فوراً قضاء مبرم اور قضاء غیر مبرم کی بحث شروع ہو گئی اور مجاہد ملت نے اس بحث میں شد و مد سے حصہ لیا ۔ بہرحال :

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا ۔" رحمۃ اللہ

مجاہد ملت کی زندگی کے دوسرے رُخ

مضمون نے بڑھتے بڑھتے کتاب کی طوالت اختیار کر لی پھر بھی مجاہد ملت کے کارناموں کا صرف وہی حصہ ضبط تحریر میں آ سکا جس کا تعلق انقلابی اور سیاسی مساعی سے تھا ۔ درس تدریس ۔ تصنیف و تالیف ۔ تحریر و خطابت جیسے ممتاز کمالات کے متعلق ایک حرف بھی نہیں لکھا جا سکا ۔ اس کمی کو امید ہے دوسرے حضرات پورا کریں گے ۔

سیاسی اور انقلابی خدمات کے سلسلہ میں بعض ایسے کارنامے باقی رہ گئے جن کی تفصیلات کا احقر کو علم نہیں ہو مثلاً ڈانڈی مارچ ۔ یا آغاز تحریک (۱۹۲۱ء) کے زمانہ کی گرفتاری وغیرہ کیونکہ اس دور میں احقر کو شرف رفاقت حاصل نہیں تھا ۔ خاص وہ دور جس میں شب و روز رفاقت کی سعادت حاصل رہی اس دور کے بھی بہت سے نہایت اہم اور ضروری کارنامے باقی رہ گئے جن کی تفصیل کے لئے سیکڑوں صفحات کی ضرورت ہے ۔ مثلاً :-

(۱) مجاہد ملت کی زندگی کا اہم باب وہ خدمات ہیں جن کا تعلق ریلیف سے ہے یہ باب اتنا وسیع ہے کہ اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے ۔ صبح سے شام بلکہ رات کے گیارہ بجے تک مجاہد ملت کا دروازہ ہر ایک ضرورت مند کے لئے کھلا رہتا تھا اور پورے ہندوستان کے گوشہ گوشہ سے لوگ اپنی ضرورتیں لیکر آتے تھے جن کی ضرورت جمعیۃ علماء کے راستے سے پوری ہو سکتی اُن کے لئے جمعیۃ علماء کا لیٹر فارم اور اس کی مہریں کام میں لائی جاتیں ۔ جن معاملات کا تعلق جمعیۃ علماء سے نہیں ہو سکتا تھا اُن کے لئے ممبر پارلیمنٹ کا لیٹر فارم اور اس کی مہر استعمال کی جاتی ۔ جہاں زبانی گفتگو کی ضرورت ہوتی وہاں زبانی جہاں ٹیلیفون کام دیتا اس کے لئے ٹیلیفون ۔ غرض صرف مجاہد ملت ہی نہیں بلکہ جمعیۃ علماء کا پورا دفتر مجاہد ملت کے احترام میں ہمہ وقت انہیں کاموں میں مشغول رہتا تھا ۔ جن کا تعلق ریلیف سے تھا ۔ غالباً ۱۹۴۸ء کا واقعہ ہے ۔ گرمیوں کا موسم تھا ۔ حضرت مجاہد ملت لو کے طمانچوں اور آفتاب کی تمازت سے بچکر دفتر کے تاریک کمرے میں آرام فرما تھے کہ دہلی کے ایک لکھ پتی سوداگر گھبرائے ہوئے آئے ۔ کہ ۱۵ لاکھ انکم ٹیکس کے لازم کر دیئے گئے

ہیں اور اگر ادائیگی نہیں کی گئی تو کارخانہ بند کردیا جائے گا جس سے ساکھ
خراب ہو جائے گی ۔ اول تو اتنی بڑی رقم کمر توڑ رہی ہے پھر ساکھ بھی گرگئی
تو سب کچھ تباہ ہو جائے گا ۔ ضرورت ہے کہ فوراً پنڈت نہرو کے ذریعہ اسٹے
آرڈر حاصل کیا جائے ۔ مجاہد ملت کے کانوں میں جیسے ہی یہ فریاد پڑی اپنا
آرام بھول گئے ۔ پنڈت جی سے ٹیلیفون پر اجازت حاصل کی اور دہکتے ہوئے
دوپہر کی لپٹوں میں چار میل طے کرکے پنڈت جی کی خدمت میں حاضر ہوئے
پنڈت جی عام طور پر انکم ٹیکس کے معاملہ میں کوئی سفارش نہیں
سنتے ۔ مگر اس واقعہ سے اتنے متاثر ہوئے کہ فوراً ہی ان کو مہلت دلوادی
اور جب اُن صاحب نے نظر ثانی کی درخواست کی تو پندرہ لاکھ کے صرف
ڈھائی لاکھ رہ گئے ۔

۲ر دسمبر ۱۹۶۲ء کو میواتی صاحبان کی کانفرنس ضلع الور (راجستھان)
کے مشہور قصبہ تجارہ میں ہوئی تھی ۔ آنریبل حافظ محمد ابراہیم صاحب نے
بھی اس کانفرنس میں شرکت فرمائی ۔ نواب محمد امین خاں صاحب آف
لوہارو مجلس استقبالیہ کے صدر تھے ۔ معزز مہمان کا استقبال کرتے ہوئے
استقبالیہ کے ذمہ دار رکن ولی محمد خاں صاحب وکیل نے جمعیۃ علماء بالخصوص
مجاہد ملتؒ کی خدمات کا ذکر کیا ۔ پھر خود اپنے متعلق فرمایا کہ میری یہ آزادی
مجاہد ملتؒ کا طفیل ہے ۔ کچھ مخالفوں نے مجھے قتل کے مقدمہ میں جکڑ دیا
تھا ۔ مجاہد ملت نے شہادت دی کہ اس وقت میں دہلی میں اُن کی خدمت
میں حاضر تھا ۔ یہی شہادت میری برارت کا ذریعہ بن گئی ۔

اس قسم کے انفرادی معاملات، طرح طرح کے مقدمات، ملازمتوں
برخاستگی ۔ ترقی ۔ تنزل، طلبہ کے اسکالرشپ یا مثلاً کسی یونیورسٹی یا کالج
میں داخلہ ۔ پاکستان جانے آنے والوں یا تلاشی کے وقت کسی قابل اعتراض
چیز کی برآمدگی وغیرہ کے متعلق سیکڑوں بلکہ ہزاروں معاملات ہیں جو مجاہد
ملت کی نظر توجہ سے کامیاب ہوئے

اگر دفتر میں کوئی رجسٹر ہوتا تو اس کے سیکڑوں صفحات پُر ہو جاتے
مگر مجاہد ملت نے رجسٹر کے اندراج کے بجائے اپنے نامۂ اعمال میں ان کا
اندراج کافی سمجھا ۔ اور اسی کی وہ کوشش کرتے رہے کہ اُن کا صحیفۂ اعمال
زیادہ سے زیادہ مزین اور آراستہ ہو ۔ امید ہے کہ یہ کوشش کامیاب
ہوئی ہوگی اور حضرت مجاہد ملت کا صحیفۂ اعمال صدیقین اور شہداء کے اعمال
ناموں کے ہم پلہ ہوگا ۔ (انشاء اللہ)

بہت سے ایسے معاملات بھی تھے جن کی نوعیت انفرادی تھی مگر پھر
ان کی حیثیت "نظیر" کی ہوگئی جس سے بیشمار خلق خدا کو فائدہ پہونچا ۔

(۲) مثلاً حاجی محمد دین صاحب کا کیس انفرادی تھا ۔ انھوں نے
۵۴ ہزار کی ایک جائداد کراچی میں ایک صاحب سے خریدی تھی ۔ یہ
صاحب جب پناہ گزین بن کر ہندوستان پہونچے تو انھوں نے اپنے کلیم میں
اس جائداد کا تذکرہ کردیا ۔ کسٹوڈین کو بہانہ مل گیا اور ان کی تقریباً
۶۰ لاکھ کی جائداد جو دہلی میں تھی ضبط کرلی ۔ قانون کے الفاظ اسی
طرح کے تھے کہ اگر کسی نے کوئی بھی فائدہ پاکستان میں حاصل کیا ہے تو
اس کی جائداد ہندوستان میں نکاسی قرار دی جائے گی ۔

اگر کسی شرنارتھی کی ضبط شدہ جائداد کا کوئی حصہ پاکستان میں
کسی نے پاکستانی ہونے کی حیثیت سے حاصل کرلیا ہے تب تو ہندوستان میں
اس کی جائداد ضبط کرلینا کسی درجہ پر معقول ہوسکتا تھا ۔ مگر اس کیس میں
حاجی محمد دین صاحب نے پاکستانی کی حیثیت سے کوئی جائداد نہیں حاصل کی تھی
بلکہ ایک خریدار کی حیثیت سے خریدی تھی، اور قیمت بھی مناسب ادا کی تھی ۔

بہر حال یہ کیس چلا ۔ کسٹوڈین کا فیصلہ اول سے لیکر آخر تک ایک ہی
رہا " سرا چھرو رام " جنرل کسٹوڈین نے نظر ثانی کے بعد فیصلہ بحال رکھا ۔
بالآخر کیبنٹ نے حاجی صاحب کے حق میں فیصلہ صادر کیا جس پر اچھرو رام
صاحب نے برافروختہ ہوکر استعفاء دیدیا ۔ اس واقعہ نے ہندوستان میں
خاص شہرت حاصل کرلی ۔ پھر کیبنٹ کا فیصلہ ایک نظیر بن گیا جس سے خدا
جانے کتنے مظلوموں کو فائدہ پہونچا ۔

یہ درست ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس کیس
میں دلچسپی لی ۔ مگر جس نے مولانا آزاد اور پنڈت نہرو کو دلچسپی لینے پر مجبور
کیا وہ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی (قدس اللہ
سرہٗ العزیز) صدر جمعیۃ علماء ہند کی شخصیت تھی یا مجاہد ملت رحمۃ اللہ علیہ
کی جدوجہد ۔ جو مسلسل جاری رہی ۔

کسٹوڈین کے قانون میں جو ترمیمات ہوئیں ان کی تفصیل مشکل
بھی ہے اور طویل بھی ۔ صرف اتنی بات آسانی سے لکھی بھی جاسکتی ہے
اور اس کا سمجھ لینا بھی آسان ہے کہ مجاہد ملت کی غیر معمولی جدوجہد کا
نتیجہ یہ ہوا کہ ترمیمات کے بعد اس کالے قانون کا نقصان صرف ایک چوتھائی رہ گیا ۔

شروع میں نکاسی جائدادوں کا قانون نافذ ہوا تو پورے ہندوستان
میں کہرام مچ گیا کیونکہ اس کی نوعیت ایسی تھی کہ تمام ہی صاحب جائداد مسلمان

اس کی زد میں آسکتے تھے ۔ چنانچہ اسی وسیع پیمانہ پر کسٹوڈین نے ۔
دست درازی شروع کردی ۔

مجاہد ملت کے سامنے معاملات آئے تو آپ فی الواقع بے چین ہوگئے راحت و آرام سب ختم ہوگیا ۔ دن رات وکلا سے مشورے ۔ بار بار ماہران قانون کا جمعیۃ علماء ہند کے دفتر میں اجتماع ۔ ان سے بحث مباحثہ شیخ محمد احمد صاحب آجکل "ایڈوکیٹ" ہیں ۔ اس وقت تک وکالت پاس نہیں کی تھی ۔ مگر قانون پر نظر بہت گہری تھی ۔ وہ حضرت مجاہد ملت کا دست راست تھے ۔

مختصر یہ کہ یکے بعد دیگرے ترمیمات منظور کرا کر اس قانون کے دامن کو اتنا تنگ کردیا کہ شاید ایک چوتھائی معاملات بھی اس کی زد میں نہیں آسکے ۔ تین چوتھائی معاملات ان ترمیمات کی رو سے ختم ہوگئے ۔

(۳) ملازمتوں کے سلسلہ میں جن لاکھوں مسلمانوں نے عارضی پاکستان لکھوادیا تھا جب وہ چھ ماہ بعد پاکستان کے بجائے ہندوستان میں ملازمت کے خواہاں ہوئے تو سخت دشواری پیش آئی ۔ قانون بنانے والوں اور رول طے کرنے والوں کو قانون یا رول بنانے کے وقت اس کا وہم و گمان بھی نہ ہوگا ۔

دشواری یہ پیش آئی کہ مسلمان تو ہزاروں کی تعداد میں پاکستان سے واپس آگئے مگر جو شرنارتھی پاکستان سے آکر ان کی جگہ پر تعینات ہوئے تھے اُن میں سے ایک بھی پاکستان واپس نہیں ہوا ۔ اب عارضی پاکستان والے محروم رہ گئے ۔

ریلوے میں یہ ستم ظریفی بھی کی گئی تھی کہ محض مسلمان ہونے کی بنا پر پاکستانی قرار دیدیا ۔ این ۔ ڈبلیو ۔ آر میں عموماً یہی کیا گیا تھا ۔

جودھپور سے ایک لائن سندھ جاتی تھی ۔ یہاں اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ کیا گیا کہ سب مسلمانوں کو یک قلم برخاست کردیا گیا حالانکہ ان میں سے بہت سے وہ تھے کہ انھوں نے نہ عارضی پاکستان لکھوایا تھا نہ مستقل ۔

ان ہزاروں بلکہ تقریباً ایک لاکھ ملازموں کے حق میں پالیسی تبدیل کرانا مجاہد ملت رحمۃ اللہ علیہ کا خاص کارنامہ تھا ۔

جو جگہیں خالی تھیں وہاں مسلمان لے لئے گئے اور جن مسلمانوں کو اس وقت جگہ نہیں مل سکی اُن کے متعلق یہ طے کردیا گیا کہ خالی جگہ پر پہلے اُن کو لیا جائے گا ۔

(۴) وہ منظر کبھی بھی فراموش نہیں ہوگا جب دوپہر کے وقت سکھ نما پنجابیوں کی ایک جماعت دفتر میں دفعتاً پہونچ گئی ۔ یہ پندرہ سولہ آدمی تھے ۔ اردو سے ناواقف ۔ ان سے گفتگو شروع ہوئی تو کچھ دیر تک یہی رہا کہ "زبان یار من ترکی و من ترکی نمی دانم" مگر پوری توجہ سے کام لیا گیا تو اُن کا مطلب سمجھ میں آگیا کہ

"وہ مسلمان ہیں، ضلع پٹیالہ کے دیہات کے باشندے محض جان بچانے کے لئے یہ وضع اختیار کر رکھی ہے ۔ اب مطالبہ یہ ہے کہ اس طرح اپنے ضمیر کے خلاف دو سال زندگی گذار چکے ہیں آئندہ یہ صورت باقی نہیں رکھنا چاہتے ۔ ان کے لئے انتظام کیا جائے کہ وہ مسلمان بن کر آزادی سے زندگی گذار سکیں اور یہ ممکن نہ ہو تو اُن کو پاکستان پہونچا دیا جائے"

مجاہد ملتؒ کی جرأت اور پنڈت جواہر لال نہرو وزیر اعظم حکومت ہند کی شرافت اس کی مستحق ہے کہ مسلمانان مشرقی پنجاب کی تاریخ میں ہمیشہ سنہری حروف سے لکھی جائے کہ مجاہد ملت نے ایک لمحہ کی تاخیر بھی گوارا نہیں کی سب سے پہلی فرصت میں پنڈت جی سے ملاقات کر کے صورت حال پیش کی ۔ پنڈت جی نے یہ تو گوارا نہیں کیا کہ وہ وفادار ہندوستانیوں کو پاکستان کے حوالہ کریں البتہ ایک سرکلر جاری کردیا کہ جو لوگ ۱۹۴۷ء سے پہلے مسلمان تھے وہ اب بھی مسلمان ہی ہیں ۔ وہ آزادی سے اپنے اسلام کا اظہار کرسکتے ہیں اُن پر کوئی قانونی پابندی نہیں اور نہ کوئی شخص یا جماعت اُن کی مذہبی آزادی میں رکاوٹ ڈال سکتی ہے ۔

یہ سرکلر دیہات کے پٹواریوں اور چوکیداروں تک پہونچایا گیا ۔ کچھ دنوں بعد احقر مولانا لقاء اللہ صاحب وغیرہ کے ساتھ مشرقی پنجاب کے دیہات میں گیا تو دیہات کے مسلمانوں کو اس پس منظر کا تو علم نہیں تھا البتہ اس سرکلر کا ان کو علم تھا ۔ جب ہم نے اُن سے حالات دریافت کئے تو انھوں نے بتایا کہ ہم چھپ چھپ کر نمازیں پڑھتے رہے اپنے مذہبی مراسم انجام دیتے رہے اور جب مذہبی آزادی کا اعلان ہوا تو ہم نے بھی پردہ اٹھا دیا ۔

اللہ تعالےٰ مجاہد ملت رحمۃ اللہ علیہ کی خدمات قبول فرمائے اور امید ہے کہ ایسا کارنامہ جس کا متعدی اثر ہزاروں مسلمانوں تک پہونچا اور اُن کی آنے والی نسلیں بھی اس کارنامہ کی رہین منت رہیں گی انشاءاللہ ۔ یہ کارنامہ مجاہد ملت کے صحیفۂ اعمال کا روشن اور درخشاں باب ہوگا ۔

تعمیری خدمات

ہنگامی حالات نے جس کی زندگی کے ہر ایک لمحہ کو ہنگامہ بنا دیا ہو

اس کے لئے بہت ہی مشکل ہے کہ کوئی تعمیری خدمت انجام دے سکے۔ جس کے لئے سکون، اطمینان اور خاموشی ضروری ہے۔ مگر مجاہد ملت کی زندگی میں یہ تضاد موجود تھا کہ ہنگامی حالات کی انتہائی مصروفیت اور انہماک کے باوجود تعمیر ملت کے فرائض سے وہ غافل نہیں ہوتے تھے۔

ابھی ۱۹۴۷ء کا پرآشوب دور ختم نہیں ہوا تھا کہ لکھنؤ میں ۲۹، ۳۰ دسمبر کی تاریخیں آزاد کانفرنس کے لئے طے کر دی گئیں۔ وسط دسمبر میں احقر چند ضرورتوں سے دہلی سے باہر گیا ہوا تھا۔ غالباً ۲۰ دسمبر کو سہارنپور میں مجاہد ملت کا تار پہونچا۔ اور احقر خطرناک راستے طے کرتا ہوا خدا کے فضل سے دہلی پہونچ گیا۔ یہاں مجاہد ملت روزنامہ الجمعیۃ کے جاری کرنے کا عزم فرما چکے تھے اور احقر کو اسی لئے طلب فرمایا تھا کہ بلا توقف روزنامہ جاری کر دیا جائے۔ چنانچہ ۲۲ دسمبر ۱۹۴۷ء سے یہ روزنامہ پھر جاری ہو گیا جو ۹ سال پہلے برطانوی حکومت کے ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کی نوازشوں کا شکار ہو چکا تھا۔ فرق یہ ہوا کہ پہلے سہ روزہ تھا اور اس مرتبہ مجاہد ملت کے حوصلہ عالی نے اس کو روزنامہ قرار دیا۔

روزنامہ الجمعیۃ کی اشاعت دہشت زدہ صامت و ساکت فضا میں پہلی آواز تھی جس نے پھر زندگی کی لہر دوڑائی اور ملت اسلامیہ کی نشاۃ ثانیہ کے لئے صبح صادق ثابت ہوئی۔

الجمعیۃ پریس بھی اسی طرح مجاہد ملت کے عزم راسخ کا طفیل ہے جیسے ہی روزنامہ الجمعیۃ جاری ہوا تھا مولانا موصوف کی فرمائش یہ بھی تھی کہ پریس بھی قائم کیا جائے۔ مگر احقر کو پریس کی مشکلات کا تجربہ تھا۔ مجلس عاملہ میں پریس کا تذکرہ آیا تھا تو حضرت مولانا ابو الکلام آزادؒ جو پریس کے پرانے زخم خوردہ تھے انھوں نے فرمایا کوئی انتظام کرنے والا ہو تو پریس کامیاب ہو سکتا ہے۔ پھر مجلس عاملہ نے کمیٹی بنا دی کہ پریس کے امکانات پر غور کر کے فیصلہ کرے۔ اس کی رپورٹ بھی مخالف ہی رہی۔ جب یہ سب صورتیں مجاہد ملت کے منشاء کو پورا نہ کر سکیں تو آپ نے فرمایا کہ نفع نقصان تو بعد کی بات ہے۔ میرا منشاء تو یہ ہے کہ جمعیۃ علماء ہند کی ایک جائداد ہو جائے۔ مجاہد ملت کے اس جذبہ کی حمایت سب ساتھیوں نے کی اور الحمد للہ الجمعیۃ پریس وجود میں آگیا۔

اسی طرح انگریزی اخبار کے متعلق بھی مجاہد ملت کی آرزو ساتھیوں کے دلوں میں اُمنگ پیدا کرتی رہی اور ایک مرتبہ ہفتہ وار اخبار "میسیج" جاری کر دیا گیا۔ جس کے لئے مجاہد ملت اور ان کے رفقاء نے بمبئی سے تقریباً ستر ہزار روپیہ اور مالی گاؤں سے تقریباً بارہ ہزار روپیہ فراہم کئے تھے، مگر افسوس اس کی مشکلات پر قابو نہ پایا جا سکا۔ اور تقریباً پانچ سال جاری رکھ کر بند کرنا پڑا۔

دینی تعلیم کا مسئلہ

مجاہد ملت رحمۃ اللہ علیہ جس طرح سیکولرزم کے بہت بڑے حامی اور اس کی کامیابی کے لئے سرگرم جد و جہد کو اپنا فرض سمجھتے تھے وہ پہلے دن سے اس کے تقاضے سے کبھی غافل نہیں رہے کہ سیکولر حکومت اور لازمی تعلیم کے منصوبہ کے جھمیلے میں دین و ایمان کا باقی رہنا اس پر موقوف ہے کہ مسلمان دینی تعلیم کے فرض کو اپنی جماعتی زندگی کا نصب العین بنالیں اور انفرادی طور پر نہیں بلکہ جماعتی قوت کے ساتھ اپنی کوششیں اس مقصد عظیم کے لئے وقف کر دیں۔

مجاہد ملت کی یہ تحریک اور اس سلسلہ میں جمعیۃ علماء ہند کی تجویزیں (جن کا سلسلہ انقلاب سے چند ماہ بعد یعنی ۳ فروری ۱۹۴۸ء سے شروع ہو گیا تھا) اُس وقت "ملا گردی" کی ایک شاخسانہ سمجھی گئیں۔ مگر جب بار بار تقریروں، مضامین اور رسالوں کے ذریعہ اس طرف مسلمانوں کی توجہ منعطف کرائی جا رہی تھی تو ایک احساس پیدا ہوا۔ اور اب یہ سوال سامنے آیا کہ دینی تعلیم کا انتظام خود مسلمان کریں یا حکومت سے مطالبہ کیا جائے کہ وہ اس کی ذمہ داری اپنے سر لے۔

یہ سوال اتنا بڑھا کہ نہ صرف خصوصی اجتماعات بلکہ عام مجلسوں کا موضوع بحث بن گیا۔ اب ضرورت محسوس کی گئی کہ مسلمانوں کا ایک کنونشن طلب کیا جائے اور اس کنونشن میں اس موضوع پر بحث کر کے کسی متفقہ فیصلہ پر پہنچنے کی کوشش کی جائے۔

ایک طرف موجودہ حالات میں دینی تعلیم کی غیر معمولی اہمیت کے احساس کو عام کرنا اور دوسری جانب دینی تعلیم کی ذمہ داری کے سوال کو حل کرنا اس دینی تعلیمی کنونشن کا مقصد تھا، جس کے لئے مجاہد ملت کی تجویز کے بموجب بمبئی کا مقام تجویز کیا گیا اور پھر مجاہد ملت ہی کی کوششوں نے اس کو اس درجہ کامیاب بنایا کہ اس کو بے نظیر کنونشن سمجھا گیا۔

تاریخ کوئی ایسی مثال آسانی سے نہیں پیش کر سکتی کہ سُنی شیعہ۔ اور شیعوں کے مختلف گروہ۔ ان کے علاوہ اہل حدیث، مہدوی، آغا خانی وغیرہ سب فرقے ایک پلیٹ فارم پر سر جوڑ کے بیٹھے ہوں اور پورے اتفاق اور یک جہتی کے ساتھ ایک فیصلہ کیا ہو۔ یہ مجاہد ملت کے اخلاص اور آپ کے جذبۂ صادق کی برکت تھی کہ دسمبر ۱۹۵۴ء کے کنونشن نے یہ مثال قائم کر دی۔ جزاہ اللہ احسن ما یجازی بہ عبادہ الصالحین

عمر بگذشت و حدیث درد ما آخر نہ شد
شب آخر شد کنوں کوتہ کنم افسانہ را

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

محمد میاں ۲۲ رجب ۱۳۸۲ھ – ۲۰ دسمبر ۱۹۶۲ء

مجاہد ملت حضرت مولانا محمد حفظ الرحمٰن صدیقی سیوہاروی رحمتہ اللہ علیہ

اپنے

افکار و اعمال کے آئینہ میں

*

قِفا نبك من ذكرىٰ حبيبٍ و منزلٖ

(از:- انیس الحسن)

۴۶ء، ۱۹۴۵ء کو گزرے ہوئے اٹھارہ انیس برس ہوگئے۔ وہ زمانہ ہندوستان میں سیاسی کش مکش کے انتہائی بحران کا زمانہ تھا۔ ایک طرف کانگریس کی تحریک آزادی اپنی آخری منزل میں قدم رکھ چکی تھی۔ دوسری طرف مسلم لیگ کا مطالبہ پاکستان اپنے عروج و شباب پر تھا۔ پورے ملک کی فضائیں سیاسی چرچوں سے گونج رہی تھیں۔ پھر دہلی کو تو ملکی زندگی کے ہر معاملہ میں ہی مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ سیاسی کش مکش کا جو تلاطم یہاں بپا تھا اس کا اندازہ دشوار نہیں۔ آئے دن ملک بھر کے صف اول کے رہنماؤں اور لیڈروں کی آمد و رفت، جلسے، جلوس، مخالف و موافق تقریریں، بیانات، ایک طوفان تھا جس نے فضا کو سر پہ اٹھا رکھا تھا۔ مسلمانوں کے درمیان لیگی قائدین میں مرحوم نواب زادہ لیاقت علی خاں، مسٹر جناح اور حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی اور قوم پرور رہنماؤں میں امام الہند مولانا آزاد، مفتی اعظم حضرت مولانا محمد کفایت اللہ، شیخ الاسلام حضرت مدنی، سحبان الہند حضرت مولانا احمد سعید، بطل حریت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا نورالدین بہاری قدس اللہ اسرارہم اور بیرسٹر آصف علی صاحب مرحوم کی تقریریں، کانفرنسیں، جلسے، جلوس تمام سرگرمیوں اور دلچسپیوں کا مرکز بنے ہوئے تھے

اپنے اساتذہ کرام اور علماء ذوی احترام کے اثر سے عربی و دینی مدارس کی فضا ان دنوں عام طور پر کانگریس، جمعیۃ علماء اور مجلس احرار کی پُرجوش ہم نوا تھی۔ میں نے بھی ان ہی دنوں مدرسہ عالیہ فتح پوری دہلی میں درس نظامی اور مشرقی علوم کے مروجہ نصاب کی تکمیل کی تھی۔

قوم پرور رہنماؤں اور بزرگان جمعیۃ سے قلبی تعلق اور ان کے جلسوں، جلوسوں میں شرکت کا شوق اسی ماحول کی بخشش تھی۔ دوسرے بزرگوں کے ساتھ ساتھ حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی بھی کئی دلآویز تقریریں ان دنوں سننے کا موقع ملا۔ خاص طور پر "یوم فلسطین" کے موقع پر برطانی حکومت کے مسلم آزار رویہ پر تنقید کرتے ہوئے لب لہجہ کی پوری پوری قوت اور جوش کے ساتھ مولانا مرحوم کے یہ الفاظ گویا آج تک کانوں میں گونج رہے ہیں۔

"برٹش اقتدار کو یہ گھمنڈ ہے کہ اس کی حدود سلطنت میں سورج غروب نہیں ہوتا ہے، لیکن میں آج فلسطین کانفرنس کے اس اسٹیج سے پکار کر برطانوی سامراج کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ وہ اس گھمنڈ میں نہ رہے۔ یہ سورج، سورج نہیں ہے بلکہ دست قدرت کی وہ ٹارچ ہے جو رات دن برٹش استبداد اور آمریت کا تعاقب کر رہی ہے کہ آج کہاں یہ نہتے انسانوں پر ستم ڈھا رہے ہیں اور آج کہاں اپنی غلامی کا جال غریبوں کے سر پر پھینک رہے ہیں۔"

ان ہی دنوں (۱۹۴۵ء میں) دہلی میں ایک آل پارٹیز مسلم کانفرنس ہوئی تھی۔ اس کی سبجیکٹ کمیٹی میں کسی تجویز کی تائید میں مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ نے تقریر کی پرجوش انداز بیان کے ساتھ ساتھ اس وقت ان کے جس امتیاز پر میں سب سے زیادہ حیران ہوا، وہ زبان کی طلاقت اور روانی تھی۔ مولانا کی تقریر کیا تھی، الفاظ و کلمات کی ایک بوچھار تھی یا ایک موسلا دھار بارش ــــ صف اول کے مقرروں میں یہ وصف مولانا مرحوم کا امتیاز تھا۔ ان ہی دنوں کچھ دوستوں سے سنا کہ شارٹ ہینڈ کے مشاق رپورٹر بھی جس تقریر کو نوٹ کرنے سے عاجز آجاتے تھے وہ صرف مولانا حفظ الرحمٰنؒ کی تقریر ہوتی تھی۔ ان کی طلاقت زبان اور تیز رفتاری کے سامنے شارٹ ہینڈ کی ٹیکنیک بھی مات کھاتی تھی۔ آزادی ہند سے پہلے پہلے حضرت مولانا کی جتنی بھی تقریریں سنیں۔ ان میں یہ خصوصیت نمایاں نظر آئی۔ آزادی کے بعد اگرچہ جوش خطابت اور رقت بیان میں

فرق نہیں آیا لیکن زبان کی اس تیز یلغار اور رفتار میں ضرور کچھ فرق آ گیا تھا اور اس کی وجہ ظاہر ہے کہ آزادی سے پہلے ایک بیرونی اقتدار کا مقابلہ تھا۔ طبیعت میں ایک سیلابی جوش تھا اور بے چین اُمنگ۔ آزادی کے بعد حالات و ماحول نے غیر متوقع طور پر جو رنگ بدلا اس میں نہ جذبات کا وہ تلاطم باقی رہا نہ امنگوں کا وہ جوش و خروش

بہر حال مجاہد ملت رحمۃ اللہ علیہ کو شروع شروع دیکھ کر اور سن کر یہ ہی تاثر تھا جو میرے دل و دماغ میں ان کی عقیدت و گرویدگی کا نقش بنا۔ اس وقت یہ گمان بھی نہ تھا کہ عنقریب ہی ان کے ساتھ اتنا قریبی تعلق ہو جائے گا کہ ان کے جیتے جی سترہ برس مسلسل رات و دن، سفر میں اور حضر میں سایہ کی طرح ساتھ رہنے اور دست و بازو بن کر ان کی شفقت و رہنمائی میں کام کرنے کی سعادت میسر آئے گی۔

ادھر آل پارٹیز مسلم کانفرنس میں شریک تمام قوم پرور مسلم نمائندوں نے یہ طے کیا کہ آنے والے انتخابات میں ایک مشترکہ "مسلم پارلیمنٹری بورڈ"، کی قیادت میں صوبائی اور مرکزی اسمبلیوں کی ہر ہر سیٹ پر مسلم لیگ کے خلاف قوم پرور مسلم نمائندے الیکشن لڑیں، تاکہ دستوری لحاظ سے ان کی رائے کا وزن ہندوستان کے مستقبل کا فیصلہ کرنے میں اثر انداز ہو سکے۔ جمعیۃ علماء ہند کے مرکزی دفتر میں مسلم پارلیمنٹری بورڈ کا دفتر قائم ہو گیا۔ مرحوم و مغفور مولانا بشیر احمد صاحب بھٹہ اس کے کنوینر تھے مولانا عبد اللہ مصری کا قیام ان دنوں جمعیۃ کے دفتر ہی میں تھا اور مسلم پارلیمنٹری بورڈ کے پبلسٹی سیکشن کی کچھ ذمہ داری ان کے سپرد تھی۔ اکتوبر، نومبر ۴۵ء میں مولانا مصری ہی داعی ہوئے اور مجھے ان کے ساتھ بورڈ کے پبلسٹی ورک میں شریک ہو جانے کا موقع ملا۔ اسی زمانہ کے مطبوعہ رسائل و لٹریچر سے الجمعیۃ بک ڈپو کی بنیاد پڑی جس کے نگراں حضرت مولانا محمد میاں صاحب تھے۔ آہستہ آہستہ انتخابات کی وقتی مہم سمٹتی گئی۔ لیکن دوسری طرف مرکزی جمعیۃ کے کام کا پھیلاؤ بڑھنے لگا جمعیۃ اس وقت تمام قوم پرور مسلم جماعتوں کا محور و مرکز بن چکی تھی۔ ادھر تحریک آزادی ہند اور ملک کے مستقبل کے فیصلے تدبیروں اور گفتگوؤں کی آخری منزل میں تھے۔ گاندھی جناح اور لیگ کانگریس گفتگوؤں، لارنس مشن، کرپس مشن، لارڈ ویول مشن کے سین یکے بعد دیگرے تیزی سے گزر رہے تھے۔ ان تمام مراحل میں قوم پرور مسلمانوں کی نمائندگی جمعیۃ ہی کے ذریعہ انجام پا رہی تھی۔ تاریخ کا مصروف ترین اور فیصلہ کن دور تھا اور اس میں جمعیۃ کا سیاسی کردار ایک اہم پارٹ ادا کر رہا تھا۔ جمعیۃ کا مرکزی دفتر جس کے سرپرست اعلیٰ حضرت مجاہد ملت رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے مدار المہام مولانا سید محمد میاں صاحب تھے شبانہ روز سرگرمیوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ اس سے پہلے دفتر کی سرگرمیاں مقابلۃً محدود تھیں۔ لیکن اب بڑھتے ہوئے کاموں کے ساتھ ساتھ مزید کارکنوں کی بھی ضرورت سامنے آئی۔ چنانچہ مولانا سید محمد میاں صاحب نے پارلیمنٹری بورڈ کا کام سمٹنے کے ساتھ ہی مجھے مرکزی جمعیۃ کا پبلسٹی سیکشن سپرد کر دیا اور اس طرح میرا تعلق براہ راست مرکزی دفتر سے ہو گیا۔

حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کا قیام ان دنوں قرول باغ میں تھا۔ دن ندوۃ المصنفین کے سلسلۂ تصنیف و تالیف میں گزار کر روزانہ عصر کے بعد دفتر جمعیۃ میں تشریف لایا کرتے تھے اور دیر گئے رات تک رہ کر دن بھر کی ڈاک دیکھتے اور اہم معاملات و مشاغل کی تکمیل فرمایا کرتے تھے۔ کاموں کا سلسلہ دن بدن تیزی کے ساتھ بڑھ رہا تھا ایک عظیم سیاسی انقلاب ملک کے دروازوں پر دستک دے رہا تھا۔ جمعیۃ علماء ہند کی نظامت عمومی جیسی اہم ذمہ داری کو سنبھالے ہوئے مجاہد ملتؒ کی شخصیت، ان حالات میں تیزی کے ساتھ ابھرتی جا رہی تھی خط و کتابت اور دوسرے مشاغل کا سلسلہ بھی تیزی کے ساتھ بڑھ رہا تھا یہاں تک کہ بہت ہی جلد مولانا موصوف کو ایک معاون کار کی ضرورت شدت سے محسوس ہونے لگی۔ اور بالآخر اگست ۴۷ء سے انھوں نے اپنی خط و کتابت اور دوسرے دفتری مشاغل میں ہاتھ بٹانے کے لئے میرا کچھ وقت حضرت مولانا محمد میاں صاحب سے کہہ کر اپنے لئے حاصل کر لیا۔ اس وقت سے دستور یہ رہا کہ دن بھر کی ڈاک روزانہ شام کو میں حضرت مولانا کی خدمت میں پیش کرتا۔ اہم خطوط کے جواب وہ خود تحریر فرمایا کرتے یا مجھے املا کرا دیا کرتے۔ باقی خطوط کے لئے زبانی ہدایات دے دیتے کہ یہ جواب لکھ دینا۔ پھر خود جوابات کو دیکھ کر دستخط فرمایا کرتے اور ڈاک روانہ کر دی جاتی۔ اس کے علاوہ وقتاً فوقتاً بیانات و پیغامات کی مسودہ ترتیب، اسفار اور پروگراموں کی تنظیم بھی میرے سپرد رہتی۔ چند ہی روز کے تجربہ کے بعد حضرت مولانا کو میری کارگزاری پر اتنا اعتماد اور اطمینان ہو گیا کہ انھوں نے اپنی انتہائی عدیم الفرصتی اور آئے دن کے اسفار کے باعث ہی ڈاک کی پوری ذمہ داری مجھے تفویض فرما دی۔ آنے والے برسوں میں مسلسل ان کی مصروفیتوں کا جو حال رہا اس میں بہت ہی کم اس کا موقع ملتا تھا کہ وہ کسی دن کی پوری ڈاک یہاں تک کہ گھریلو اور ذاتی خطوط بھی لفظ بلفظ خود پڑھ لیتے یا سن لیتے۔ ورنہ عام طور پر صبح، دوپہر، شام کی کسی بھی فرصت میں وہ بیٹھ جاتے۔ خطوط کا ماحصل سن کر جواب نوٹ کرا دیتے۔ مجھے بھی شب و روز ساتھ رہنے اور مستقل طور پر اس خدمت کو انجام دیتے ہوئے ان کے مزاج، ان کے انداز فکر اور انداز تحریر کا اتنا تجربہ ہو گیا تھا کہ ان کے چند اشارے تفصیل و تعبیر سے بے نیاز کر دیتے تھے۔ خود مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو بھی اتنا اطمینان تھا کہ پھر میرے لکھے ہوئے کسی جواب کو انھوں نے کبھی خود پڑھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ میں خطوط لکھ کر سامنے رکھ دیتا اور وہ قلم برداشتہ دستخط کرتے چلے جاتے۔

مولاناؒ کے دوسرے اہم کاموں، مثلاً ان کے اسفار اور پروگراموں کی ترتیب متعلقہ مقامات کو ان کی اطلاع ۔ ان کے مشاغل کی تعیین اوقات اور یادداشت دہلی میں رہتے ہوئے ان کے مختلف اپوائنٹ منٹس کا اہتمام وغیرہ وغیرہ ان تمام امور کے ساتھ ساتھ ان کی مراسلت کا سلسلہ مستقل طور پر میرے سپرد تھا اور بحمد اللہ میں نے ۴۹ء سے مسلسل یہ خدمت انجام دی ۔ میری نو عمری اور ناتجربہ کاری یقیناً اس کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی کہ ایک ملک گیر حیثیت رکھنے والی ذمہ دار شخصیت، صفِ اول کے سیاسی رہنما، بلند پایہ عالمِ دین اور ساتھ ہی صاحبِ فکر و قلم فاضل ادیب و مصنف کی اہم سے اہم خط و کتابت، احتیاط اور ذمہ داری کی جو نزاکتیں اپنے ساتھ لئے ہوتی ہے، اس اہم ذمہ داری کو سنبھالتا اور نباہ سکتا ۔ پھر بھی اگر میں نے اس خدمت کو سنبھالا اور بارہ تیرہ سال مسلسل اس طور پر انجام دیا کہ اس پورے عرصہ میں مولانا مرحوم کے اعتماد و اطمینان کو کبھی شکایت اور ناامیدی کا موقع نہیں مل سکا تو یہ بھی حقیقتاً خود حضرت مولانا کی ہی کرامت تھی ۔

بہرحال ۴۶ء سے حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ جو وابستگی مجھے حاصل ہوئی، مولاناؒ کی زندگی بھر نہ صرف قائم رہی بلکہ ان کے بے اندازہ اعتماد، محبت اور شفقت نے اس وابستگی کو دفتری اور رسمی حدود سے کہیں بڑھ کر ایک ایسے گہرے تعلق میں تبدیل کر دیا تھا جو کسی ایک گھر اور خاندان کے روابط اور قرابت داری میں بھی ہر جگہ نظر نہیں آتا ۔ مجھے جب کبھی انھوں نے کہیں سے کوئی تحریر بھیجی تو "برادرِ عزیز" کے شفقت بھرے خطاب ہی سے شروع کی پھر تیرہ برس مسلسل شب و روز ان کے ساتھ گزارنے، ان کے کاموں میں شریک رہنے اور نہ صرف دہلی کے قیام میں بلکہ دہلی سے باہر ملک کے کونے کونے تک ان کے اسفار اور دوروں ۔ بری، بحری اور ہوائی سفروں میں ساتھ رہنے کی جو سعادت میسر آئی، اس کی بدولت جہاں اور بہت کچھ دیکھنے، سیکھنے، سمجھنے کا موقع ملا وہاں سب سے زیادہ خود حضرت مولانا کی شخصیت، ان کے افکار و عزائم، ان کے اعمالِ جلیلہ اور مقاصدِ عالیہ کو دیکھنے اور سمجھنے کی بھی وہ سعادت حصہ میں آئی جو میرے لئے زندگی کا ایک قیمتی سرمایہ اور سامانِ صد بصیرت و موعظت ہے ۔

آج جب کہ مجاہدِ ملت رحمۃ اللہ علیہ رفیقِ اعلیٰ کے حضور میں پہنچ چکے ہیں اس پوری مدت میں ان کے ساتھ گذاری ہوئی زندگی نگاہوں میں سمائے ہوئے قلم برداشتہ قلب و ذہن کے کچھ نقوش " مجاہدِ ملت نمبر " کے سپرد کر رہا ہوں ۔ اگرچہ یہ بھی ان کے احسان و کرم، شفقت و نوازش اور محبت بھرے سلوک کا بس ایک دھندلا سا نشان ہے یا ایک بے مایہ اعتراف اور بس ۔

دل کا تقاضہ تو یہ ہی تھا کہ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی پوری زندگی اور سوانحِ حیات پر از اول تا آخر اپنے علم و مشاہدہ کے مطابق ایک مفصل مضمون لکھوں ۔ لیکن قبل اس کے کہ میں کچھ کام شروع کرتا، کچھ دوسرے حضرات اور بالخصوص مخدوم حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب کے ارادوں سے واقفیت ہو گئی ۔ یقیناً یہ حق مجھ سے کہیں زیادہ مولاناؒ کے ان پرانے رفقاءِ کار کو پہنچتا ہے کہ ان کی زندگی اور کارہائے نمایاں پر، ان کے اوصاف و کمالات کے ہر ہر پہلو پر قلم اٹھائیں اور حضرت مولانا کا ایک مبسوط و یادگار تذکرہ آنے والی نسلوں کے لئے باقی چھوڑ جائیں ۔

چنانچہ اسی نمبر میں حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب کا جو جامع مقالہ آپ کے پیشِ نظر ہے اور ساتھ ہی مولانا مقبول سیوہاروی صاحب اور حضرت مجاہدِ ملتؒ کی تصنیفی زندگی اور اس کے ثمراتِ طیبہ پر مولانا قاضی زین العابدین صاحب کے مقالات حضرت مجاہدِ ملت رحمۃ اللہ علیہ کی سوانحِ حیات کے دورِ اول پر کافی روشنی ڈالتے ہیں ۔ لیکن حضرت مولانا کی زندگی کا دوسرا زریں دور جو تقریباً آزادیٔ ہند سے شروع ہوتا ہے اور جو شاید مشیتِ الٰہی میں بھی ان کی تخلیق کا اہم مقصد تھا اس پر بہت کچھ لکھا جانے کے باوجود یقیناً اس کا مستحق ہے کہ اس پر زیادہ سے زیادہ کام کیا جائے اور بکھرے ہوئے نقوش کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر سمیٹا جائے

اسی خیال سے آنے والے صفحات میں حضرت مولاناؒ کی سوانحِ حیات اور شخصیت و کردار کا مختصر خاکہ پیش کیا جا رہا ہے اور اس کے بعد ان کے افکار و اعمالِ جلیلہ خاص طور پر ۴۷ء میں اور اس کے بعد ان کی عظیم الشان خدمات پر اختصار و احتیاط کے ساتھ روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے ۔

شخصیت اور کردار

شکل و شباہت

ایک سیدھے سادے انسان کا تصور کیجیے۔ گندمی رنگ۔ اوسط درجہ کا بدن نکلتا ہوا قد، کتابی چہرہ جس پر سادگی بھی برستی ہو، اور علم و فضل کا وقار بھی، فکر و تدبر سے معمور کشادہ پیشانی۔ آنکھوں میں ایک حسین چمک، بھاری بھاری فلسفیانہ بھویں (جنھیں دیکھ کر ایک دوست جارج برنارڈ شا کی بھوؤں سے تشبیہ دیا کرتے تھے) چہرہ پر گھنی داڑھی۔ آواز میں گرج اور گفتار میں بے ساختگی بس یہی حلیہ تھا مولانا حفظ الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا۔

وضع قطع

وضع قطع میں سادگی بھی تھی اور استقامت بھی۔ لباس ہمیشہ سادہ، سفید کھدر کا کرتہ۔ اسی کا کسی قدر تنگ مہری کا پاجامہ۔ کھدر کی ہی شیروانی سردیوں میں عموماً کسی عمدہ کپڑے کی اور گرمیوں میں سادہ سفید کھدر کی اونچی باڑ کی ٹوپی جس کا تراش ان کا خود ایجاد مخصوص تراش تھا۔ جوتا ہمیشہ عمدہ پہننے کے شوقین تھے۔ کبھی کھلا ہوا (نیوکٹ) پمپ اور کبھی جے پوری۔

افتادِ طبع

خوراک بہت معمولی اور سادہ ہوتی تھی۔ اور مقدار میں بھی بہت کم۔ سادہ تندوری روٹی ہو اور معمولی دال، سبزی یا گوشت کی ترکاری، یہی ان کی پسندیدہ غذا تھی۔ وقت پر جو کچھ بھی میسر آجائے چند منٹ میں دس پانچ لقمے لیے اور بس فارغ ہو گئے کھانے پینے کے ذوق اور دعوتوں کے اہتمام سے وہ تقریباً ناآشنا ہی رہے۔ احباب و مخلصین بڑے ارمانوں سے دعوت کرتے۔ مگر ان کی دعوت کرنے والے ہمیشہ مایوس ہی رہتے۔ دسترخوان پر کتنی ہی مرغن اور مکلف غذائیں سجاتے۔ مگر مولانا کا ہاتھ جب اٹھتا تو کسی معمولی کھانے کی طرف اور اتنی جلدی فارغ ہو جاتے کہ ساتھ کھانے والوں کے لیے بھی بڑی دشواری ہوتی اچار اور ترشی انھیں بہت مرغوب تھی۔ اپنی تندرستی سے بے فکر اور اصولِ صحت سے بے نیاز، کھانسی و نزلہ کی حالت میں بھی اپنی مرغوب کھٹائی اور ترشی کے استعمال سے کبھی باز نہیں رہتے تھے۔ سردیوں میں رس کی کھیر (رساول) کے بہت شوقین تھے۔ پھلوں میں ان کو خربوزہ کا بے حد شوق تھا۔ صبح شام چائے کے پابند تھے وہ بھی بہت ہلکی جس میں دودھ بھی کم ہوتا اور مٹھاس بھی برائے نام۔ گرمیوں میں تیز برف کا پانی انھیں پسند تھا۔ پھلوں میں آم سے بھی کافی رغبت رکھتے تھے۔ کئی برس سے احباب کے اصرار پر یہ معمول ہو گیا تھا کہ آموں کے موسم میں اپنے رفقاء سمیت کاندھلہ جاتے تھے اور وہاں بڑی پر رونق محفل رہتی تھی۔ ادھر نئی دہلی میں ہر سال انڈیا گیٹ کے قریب آموں کی ایک محفل جما کرتی تھی جس میں چالیس پچاس بے تکلف احباب کا اجتماع ہوا کرتا تھا۔ اس کے اہتمام میں مولانا فقیہ الدین، حاجی محمد صالح، سلطان یار خاں صاحب وکیل اور ہم رفقاء دفتر شریک رہتے تھے۔

لباس اور خوراک کی طرح اپنے رہن سہن میں بھی بے حد سادگی پسند۔ اور تکلفات سے بہت دور تھے۔ دفتر جمعیۃ میں ہمیشہ فرش پر بچھی ہوئی چاندنی یا چٹائی ہی ان کی مسند تھی۔ یا رات میں ایک کھرّا پلنگ اور ایک تکیہ۔ سونے میں تنہائی پسند تھے یہاں تک کہ ریل کے سفر میں بھی ہمیشہ ان کی فرمائش یہ ہوتی کہ کوپے (یعنی فرسٹ کلاس کا وہ کمپارٹمنٹ جس میں صرف دو برتھ ہوتی ہیں) سیٹ حاصل کی جائے۔ کار میں ہمیشہ اگلی سیٹ پر بیٹھتے۔

غرضکہ سادگی ان کے مزاج کا وہ عنصر تھی جو ان کے لباس، خوراک، وضع قطع، رہن سہن اور زندگی کے تمام ہی پہلوؤں پر چھائی ہوئی تھی۔ مزاج کی دوسری خصوصیت تیز رفتاری تھی۔ یہ وصف بھی ان کے ہر کام میں نمایاں نظر آتا۔ بولتے بھی تیز، چلتے بھی تیز کیسا ہی اہم سے اہم سوال ہو یا کوئی پیچیدہ مسئلہ۔ انھیں نہ فیصلہ کرتے دیر لگتی نہ جواب دیتے۔ مخاطب کے منشا کو سمجھنے اور اس کے رجحان کا اندازہ لگانے میں بھی سبقت لے جاتے تھے۔ رفتار کی تیزی ان کے ہر عمل میں نمایاں رہتی۔ یہاں تک کہ نماز پڑھنے اور قرآن حکیم کی تلاوت میں بھی۔ لکھنے پڑھنے اور تقریر و خطابت میں بھی ان کی رفتار ہمیشہ تیز رہی۔

خدمات کا جذبہ اور کاموں کی دھن

کام کی لگن اور دھن مولانا مرحوم کو حد سے زیادہ تھی۔ سکون اور فرصت سے نہ ان کی زندگی کبھی آشنا ہوئی نہ انھیں کبھی اس کی جستجو ہوئی۔ کاموں کے ہجوم میں گھرا رہنا ہی انھیں راس آتا تھا اور خود بھی وہ کبھی چین سے بیٹھنا پسند نہیں کرتے تھے۔ جس وقت سے انھوں نے اپنے ہوش و حواس کی زندگی میں قدم رکھا تھا۔ آخر تک تقریباً پینتالیس برس وہ مسلسل لگن، دھن انہماک و عمل، بے شمار تحریکوں اور خدمت گزاریوں میں اس طرح مصروف رہے کہ آج بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ مولانا مرحوم نے اپنی عمر کی تھوڑی مہلت میں جو کام انجام دے لئے۔ دوسرے انسانوں کے لئے وہ کئی عمروں اور صدیوں کے کام تھے۔

ان کی مصروفیتوں اور ہجوم مشاغل کا صحیح اندازہ تو درحقیقت وہی کر سکتے ہیں جنھیں زندگی میں ان سے قریب رہنے کا موقع ملا ہے۔ کوئی تذکرہ نگار لکھنا چاہے بھی تو ان کی مصروف ترین زندگی اور بھرپور سرگرمیوں کو آخر کہاں تک لکھ سکتا ہے۔ ان کی لگن اور دھن کا حال ہی کچھ عجیب تھا۔ دفتر جمعیۃ کے اندرونی کمرے میں بیٹھے

ہیں ۔ ذمہ دار شخصیتوں سے گفتگو ہو رہی ہے اور وہیں سے باہر اپنے کاموں میں لگے ہوئے کارکنوں کو چھوٹے سے چھوٹے معاملات میں ہدایت دیتے جا رہے ہیں۔ دفتر میں کوئی ملکی یا غیر ملکی مہمان آنے والا ہے تو مدارات اور تواضع کے ہر اہتمام میں خود شریک ہیں۔ مہمان کو پانچ بجے آنا ہے۔ قاضی اکرام الحق صاحب اپنے کمرے میں پڑے بے خبر سو رہے ہیں۔ ۴ بجتے ہی مولانا خود جا کر قاضی جی کو جگا رہے ہیں کہ آپ ابھی تک سو رہے ہیں نہ پھل فروٹ آئے، نہ چار پانی کا انتظام ہوا۔ قاضی جی نے ایک کروٹ لی اور پھر...... حضرت ابھی تو چار ہی بجے ہیں۔ ابھی جاتا ہوں۔ سب کچھ ہو جائے گا۔ آپ فکر نہ کیجئے اور مولانا مسکراتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف چل دیئے۔

جمعیۃ کا کوئی سالانہ اجلاس ہو یا کوئی مقامی کانفرنس، مختلف ذمہ داریاں مختلف کارکنوں کے سپرد ہیں اور وہ انجام بھی دے رہے ہیں۔ مگر مولانا کی فکرمندی کا یہ حال ہے کہ گویا سب کچھ انھیں کی ذمہ داری ہے کبھی مہمانوں کی قیام گاہیں دیکھ رہے ہیں ابھی اسٹیج اور پنڈال کی بناوٹ کو جانچ رہے ہیں۔ روشنی اور پانی کے انتظامات کرا رہے ہیں یا کھانے اور ناشتہ کی تفصیلات کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہے ہیں اور پھر تھوڑی ہی دیر میں اجلاس کے زیر غور مسائل، تجاویز اور تقریروں کے پروگرام مرتب کرا رہے ہیں کبھی کانفرنس میں شرکت کے لئے مولانا کسی سفر پر جانے والے ہیں۔ چند دوسرے رفقا بھی ساتھ ہوں گے، سب کی سیٹوں کا انتظام۔ پھر راستہ میں کھانے وغیرہ کا بندوبست۔ گزرتے ہوئے اسٹیشنوں پر چاء، ناشتہ کی جستجو، ہر چیز کا فکر مولانا کو ہے اور اس کی تکمیل کے لئے وہی سب سے آگے آگے دوڑ رہے ہیں۔

جمعیۃ کے تو وہ ناظم عمومی تھے ہی مگر افتاد طبع اور ذوق عمل نے انھیں پورے قافلۂ امت کا منتظم عمومی بنا دیا تھا اور سچ یہ ہے کہ ان ہی کی تنہا ذات تھی جو گزشتہ پندرہ برس میں تو گویا تمام ہی قومی اور ملی سرگرمیوں کا محور بن کر رہ گئی تھی۔ پھر خوبی یہ کہ اپنی تمام تر ذمہ داریوں اور بے اندازہ مصروفیتوں پر بھی وہ کبھی شکوہ مند نہیں ہوئے۔ بلکہ حوصلہ مند طبیعت ھل من مزید کی متقاضی اور آمادۂ کار ہی رہتی تھی۔ دہلی میں ہوں یا کہیں باہر سفر میں، چھوٹے سے چھوٹے ذاتی کاموں، اپنی پریشانیوں، سفارشوں اور مشوروں کے لئے عوام و خواص کی ایک بھیڑ ہر وقت ان کے ارد گرد رہتی تھی۔ اور مولانا ہر ایک کا معاملہ خود سنتے اور معاملہ کے مختلف پہلوؤں پر تفصیل سے بات کر کے جواب بھی دیتے اور جد و جہد بھی فرماتے۔ اس طرح ان کے قیمتی اوقات کا کافی حصہ چھوٹے چھوٹے شخصی اور جزوی معاملات پر صرف ہو جاتا۔ اور یہ معمول ہی بن گیا تھا۔ یہاں تک کہ ان سے قریب رہنے والے ہم جیسے خدام بھی بعض اوقات یہ محسوس کرتے اور مولانا سے کہتے بھی رہتے کہ آپ کا قیمتی وقت زیادہ اہم اور وسیع کاموں پر صرف ہونا چاہئے۔ چھوٹے چھوٹے گھریلو جھگڑوں اور معاملوں کو تو آپ اپنے دوسرے خدام پر چھوڑ دیں۔ لیکن وہ اپنی طبیعت سے مجبور تھے اور کبھی بھی نہ اپنے اوقات کے تحفظ کے لئے آمادہ ہو سکے نہ اپنی ملاقاتوں میں انھوں نے کبھی دیر رو رہنا گوارا کیا۔ دفتر جمعیۃ میں بیٹھتے تب اور سفر میں کہیں جاتے تب، ہمیشہ کھلے بندوں عوام سے قریب رہتے کہ ہر صاحب معاملہ بآسانی اور براہ راست ان تک پہنچ سکے۔ زندگی کے آخری تیرہ برس وہ مسلسل دستور ساز اسمبلی اور پارلیمنٹ کے ممبر رہے۔ پارلیمنٹ کے ممبروں کو نئی دہلی میں پارلیمنٹ ہاؤس کے قریب ہی کم خرچ پر سرکاری بنگلے رہائش کے لئے دیئے جاتے ہیں۔ جہاں کافی سکون اور آرام کی رہائش میسر آتی ہے۔ مولانا سے بھی بارہا کہا گیا۔ لیکن انھوں نے کبھی بھی پرانے شہر کی گلی قاسم جان کو چھوڑ کر نئی دہلی میں رہنا پسند نہیں کیا اور ہر بار یہی جواب دیا کہ یہاں تو ہر ضرورت مند دن رات کے کسی بھی حصہ میں وقت بے وقت مجھ تک پہنچ جاتا ہے۔ میں نئی دہلی میں رہنے لگوں تو ان غریبوں کو وہاں تک پہنچنا دشوار ہو جائے گا۔ میں یہ گوارا نہیں کر سکتا۔ یہ حال تھا ان کے جذبۂ خدمت اور کاموں کی دھن کا!

زندگی کے آخری سال جنوری ۱۹۶۲ء میں جب کہ ان کی صحت کافی گر چکی تھی اور مرض اندر ہی اندر پل رہا تھا۔ سخت سردی کے دنوں میں، انتہائی نزلہ، کھانسی بخار اور پلورسی کی حالت میں انھوں نے کانپور اور امروہہ میں جمعیۃ کی کانفرنسوں میں شرکت فرمائی۔ اور اسی حال میں اپنے حلقۂ انتخاب کے دیہات و قصبات کا دورہ کیا اور اسی حالت میں پندرہ دن کے شبانہ روز سفر کے بعد ۲۲ جنوری ۶۲ء کو شام کے آٹھ بجے مراد آباد سے دہلی واپس پہنچے۔ اگلے روز بمبئی میں سنٹرل حج کمیٹی کی میٹنگ تھی اور رات ہی کے ہوائی جہاز سے مولانا بمبئی جانے والے تھے ۱۰ ½ بجے مولانا کو ہوائی اڈہ پہنچنا تھا۔ ساڑھے آٹھ بجے مولانا گھر پہنچے، عشاء کی نماز پڑھی اور بمبئی کے لئے سامان سفر تیار کرایا۔ ادھر میں ملنے کے خیال سے پہنچ گیا۔ قاضی اکرام الحق صاحب بھی دروازہ پر موجود تھے۔ ۹ بجے مولانا باہر آئے تو یہ حالت تھی کہ ۱۰۲ ڈگری بخار تھا۔ کھانسی دم نہیں لینے دیتی تھی۔ پھیپھڑوں میں پانی بھرا ہوا تھا اور سانس بھی بہت تکلیف کے ساتھ چل رہا تھا۔ اپنی گرم چادر گلے میں لپیٹے ہوئے نہایت مضمحل اور نڈھال چہرہ پیلا اور ناتوانی سے بے حال۔ مگر اس حال میں بھی دن بھر کے سفر کے بعد اب رات بھر ہوائی جہاز کے سفر کے لئے آمادہ و عازم۔ یہ حال دیکھ کر میں نے اور قاضی اکرام صاحب نے باصرار گزارش کیا کہ اس وقت سفر کا ارادہ ملتوی کر دیجئے۔ مولانا نے سختی سے انکار کیا اور سامان کار پر رکھنے کے لئے شفیق کو بھیج ہی دیا۔ سامان کار پر جا رہا تھا اور ہم لوگ مولانا کو گھیرے کھڑے تھے۔ ادھر سے محمد احمد صاحب ڈرکس بھی آ گئے۔ حالت دیکھ کر حیران۔ انھوں نے بھی سفر ملتوی کرنے پر بہت زور دیا۔ سامان

کا پروگرام رکھا جا چکا تھا مولانا فرما رہے تھے: "حجاج کے بعض اہم معاملات درپیش ہیں۔ ضروری میٹنگ ہے، وہاں سب کو انتظار ہوگا بمبئی سے واپس آکر دو چار روز آرام کروں گا اس وقت تو مجھے جانا ہی ہے"۔ لیکن جب ہمارے اصرار نے انھیں بالکل مجبور ہی کر دیا تو بادل ناخواستہ سفر کا ارادہ ملتوی کیا اور گھر واپس ہوئے۔ اگلے روز ہم سب مولانا کو ان کے معالج ڈاکٹر پانڈے کے پاس لے گئے اور مرض کی گہرائی کا اندازہ ہوا۔ اور اسی وقت سے، زندگی بھر کی تھکن اپنے ساتھ لے کر مولانا بستر علالت پر گرے اور اسی علالت میں دنیا سے رخصت ہوگئے۔ اس دن کے بعد دفتر جمعیۃ میں جو عمر بھر ان کی سرگرمیوں کا مرکز رہا مولانا کو آنا نصیب ہی نہ ہوا۔

خلوص و ایثار

کی اس مجاہدانہ زندگی کا اندازہ کیجئے اور پھر ساتھ ہی یہ دیکھئے کہ اس تمام بھاگ دوڑ، مسلسل خدمت و عمل، رات دن کی سرگرمیوں اور انتھک محنتوں سے مولانا نے خود اپنے لئے کیا حاصل کیا۔ ظاہر ہے کہ وہ اعلیٰ درجہ کے خطیب تھے، صاحب فکر و قلم، بلند پایہ مصنف تھے۔ ملک گیر شہرت و مقبولیت کا اعلیٰ مقام حاصل تھا، حکومت و اقتدار کے دائروں میں اونچی سے اونچی شخصیتوں سے ان کے برابر کے تعلقات تھے۔ اگر کسی درجہ میں بھی انھیں اپنا اور اپنی راحت و منفعت کا خیال ہوتا تو وہ اپنے لئے کیا کچھ نہ حاصل کر سکتے تھے۔

لیکن انھوں نے اپنے لئے، جو زندگی اختیار کی وہ غریبی اور بے سروسامانی کی زندگی تھی۔ زندگی بھر کرایہ کے مکان میں رہے اپنے بیٹے اور بیٹیوں کا مستقبل بنانے کے لئے بھی وہ اپنے وسائل کبھی کام میں نہ لاسکے۔ نہ ان کے لئے اپنے بعد کوئی اثاثہ چھوڑ کر گئے۔ اپنی بھرپور صلاحیتوں اور زندگی بھر کی محنتوں اور کاوشوں کا پورا سرمایہ انھوں نے صرف کیا تو صرف ملک و وطن کی خدمت اور قوم و ملت کی خوش حالی اور سربلندی کے لئے۔ پارلیمنٹ کے ممبر ضرور رہے، مگر سچ یہ ہے کہ ان کی رکنیت پارلیمنٹ بھی سراسر دوسروں ہی کے کام آئی۔

قومی اور وطنی خدمت کی سعادتیں دوسروں کو بھی میسر آئی ہیں۔ مگر بے غرضی اور خلوص و ایثار کا یہ مقام صرف مولانا ہی کو نصیب ہوا کہ وہ ملک کے گوشہ گوشہ تک پہنچے اور کوئی نہیں کہا جا سکتا جو عوام سے اتنا قریب رہا ہو۔ لیکن اکثر رات دن کے جماعتی رفقاء کار کو بھی آج تک یہ معلوم نہیں کہ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی اولاد بھی ہے۔ بحمد اللہ ان کا بیٹا بھی ہے اور بیٹیاں بھی۔ ان کے ہمہ گیر تعارف اور بے پناہ اثر و رسوخ کی فیض رسانیوں میں جس کا کوئی حصہ نہ تھا وہ صرف ان کی اپنی ذات تھی اور اپنی اولاد۔ اپنے اسفار یا اپنی مجلسی اور جماعتی سرگرمیوں میں انھوں نے اپنے بیٹے تک کو ساتھ رکھنا اور متعارف کرانا کبھی گوارا نہیں کیا۔

کئی بار ذہن میں یہ سوال ابھرا کہ ایسے بلند پایہ اور صاحب بصیرت عالم اور ایسے اکابر کے صحبت یافتہ ہوتے ہوئے یہ کیوں نہیں ہوا کہ مولانا کم از کم بڑھاپے کی اس زندگی میں تو رات دن کی بھاگ دوڑ اور مشاغل کے ہجوم و ہنگامہ سے کنارہ کش ہو کر تسبیح و مصلیٰ سنبھال کر کسی گوشہ میں بیٹھ گئے ہوتے۔ آخر اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کا وہ بھی ایک راستہ ہے۔ پھر زیادہ سوچا تو اس کی توجیہہ خود ہی ذہن میں آنے لگی کہ مولانا خلوص و ایثار کی جن بلندیوں پر فائز تھے وہاں عزلت نشینی کا ایسا تصور بھی عملاً دشوار ہی تھا کہ آخر "فکرِ خویش" کا جو داعیہ اس کا محرک ہوتا ہے، مولانا کے خلوص کا لبریز پیمانہ اس کی آمیزش بھی گوارا نہیں کر سکتا تھا۔

استغناء و بے غرضی

طبیعت کے استغنا کا یہ حال تھا کہ زندگی کے اس دور میں تو بڑے بڑے دولتمند، تاجر، نواب اور اصحاب اختیار ان کے احترام میں دوزانو رہتے تھے۔ اپنے ہاں دعوتوں پر بلاتے۔ بڑے بڑے قیمتی ہدیے پیش کرنا چاہتے۔ مگر مولانا کی بے نیازی اور بے رخی نے کبھی کسی کو موقع ہی نہ دیا۔ جمعیۃ علماء کی انھوں نے عمر بھر خدمت ہی نہیں کی بلکہ چار چاند لگا دیئے۔ اٹھارہ برس اس کے سربراہ رہے اور اپنی بھرپور صلاحیتیں اس کی آبیاری پر صرف کیں۔ لیکن کبھی کسی قسم کا کوئی معاوضہ، کوئی الاؤنس، آنریریم یا کسی طرح کی کوئی منفعت اس سے حاصل نہیں کی۔ اپنی کتابوں کی آمدنی ہی ان کا کسب و معاش تھا۔

کانگریس کے حلقوں میں بھی ان کا جو مقام تھا وہ ظاہر ہے۔ کانگریس ٹکٹ پر انھوں نے تین بار پارلیمنٹ کے الیکشن لڑے (۱۹۵۲ء میں حلقہ بلاری اور ۱۹۵۷ء و ۱۹۶۲ء میں حلقہ امروہہ ضلع مراد آباد سے) مگر پیش کش اور اصرار کے باوجود انھوں نے کبھی کانگریس کے انتخابی فنڈ سے کوئی امداد قبول کرنا گوارا نہیں کیا۔

ہمدردیٔ خلائق

مخلوق خدا کی ہمدردی ان کے رگ و پے میں سمائی ہوئی تھی۔ بلا استثناء و بلا امتیاز ہر کس و ناکس، اپنے اور بیگانے، مسلم اور غیر مسلم سب کی خدمت ان کا عزیز ترین شغل تھا اور دن رات کا بیشتر حصہ اسی میں گزرتا تھا۔ کوئی سرکاری یا غیر سرکاری ملازمت کا خواہاں ہے، کوئی وظیفہ اور امداد کے لئے سرگرداں۔ کسی کو کالج کے داخلہ میں دشواری پیش آرہی ہے تو کوئی امتحان میں دو چار نمبروں سے رہ گیا ہے۔ کوئی اپنے پرمٹ کی میعاد میں توسیع چاہتا ہے۔ کوئی اپنی مقدمہ بازی کے لئے وکیل سے فیس میں رعایت کے لئے کوشاں ہے۔ کسی کو مکان یا دکان کی ضرورت ہے تو کوئی بجلی اور پانی کا کنکشن لینا چاہتا ہے۔ کسی کی فصل اور کھیتی خراب ہوگئی ہے اور پورا لگان دینے کے قابل نہیں ہے۔ تو کسی کی بیٹی جوان بیٹھی ہوئی ہے اور کوئی مناسب رشتہ نہیں آرہا ہے، غرضیکہ

صبح سے شام تک انسانی زندگی کے صدہا کام تھے جن کے لئے لوگ بے تکلف مولانا ہی کی مدد، مشورہ اور سفارش کا سہارا لیتے تھے اور مولانا مرحوم ہر ضرورتمند کے لئے وہ سب کچھ کرتے جو ان کے امکان میں ہوتا کسی سرکاری افسر کو ٹیلی فون کر رہے ہیں کسی کو سفارشی خط لکھ کر دے رہے ہیں کسی کو اپنے ساتھ لے جا کر اس کا کام کرا رہے ہیں اور کسی کے لئے بالواسطہ و بلاواسطہ سفارشیں کرا رہے ہیں۔ خاص طور پر تقسیم ہند کے بعد تو سرکاری حلقوں میں ان کی قدر و منزلت اور ایک عوامی رہنما ہونے کے لحاظ سے یا پارلیمنٹ کے رکن کی حیثیت سے ان کے اثر و رسوخ پر لوگوں نے گویا جھولنا شروع کر دیا تھا۔ مولانا کی طبعی شرافت اور ہمدردیوں کا دامن بھی اس قدر وسیع تھا کہ جس نے بھی ان کے سایہ میں سر چھپانا چاہا انھیں نہ راستہ چلتے کسی ضرورت مند کی مدد سے گریز تھا نہ آدھی رات گئے کسی کے آنے پر کوئی ناگواری۔ بعض اوقات تو بڑی بڑی اونچی شخصیتیں بھی اپنے کاموں کے لئے ان ہی کی مدد اور سفارش ڈھونڈتی تھیں۔ آج کون اندازہ کر سکتا ہے کہ کتنے ہزار خاندان ہیں جن کی معاش اور پرورش میں بڑا دخل مولانا ہی کی کوششوں کو تھا اور کتنے گھر ہیں جن میں آج چراغ بھی جل رہا ہے تو اس کی بتی مولانا ہی کے ہاتھوں نے بٹی ہے۔

قلب کی وسعت اور عالی ظرفی

میں ان کے پایہ کے انسان ہزاروں نہیں۔ لاکھوں میں بھی شاید دو چار ہی مل سکیں۔ یوں تو ہر وقت ہی ان کے وسعت قلبی کے مشاہدات آنکھوں سے گزرتے رہتے تھے اور ہم خدام کار کے ساتھ تو ان کا سلوک، مہر و شفقت کا تو ذکر ہی کیا کہ ان کے جیتے جی افسر و ماتحت کا کوئی امتیاز کبھی درمیان میں حائل ہی نہیں ہوا۔ لیکن اس کا خاص منظر اس وقت سامنے آتا تھا جب وہی لوگ جنھوں نے مولانا کی دلآزاری اور بے وجہ مخالفت و ایذا رسانی میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی تھی۔ ہر طرح سے مجبور ہو کر اپنی کسی ضرورت کے لئے ندامت اور شرمساری کے ساتھ ان تک پہنچتے اور مولانا اپنی شفقت اور محبت سے اس طرح ان پر چھا جاتے اور ان کی مدد کرتے کہ ان کی ندامت اور شرمساری کا بوجھ بھی سر سے اتر جاتا۔ انتقام اور عداوت کے تو گویا نام سے بھی وہ ناآشنا تھے۔ ان کی زندگی کے دیکھنے والے اس حقیقت کے گواہ ہیں کہ عمر عزیز کے کسی ایک لمحہ میں بھی مولانا کی زبان سے اپنے سخت سے سخت مخالفین بلکہ معاندین کے لئے بھی کلمۂ خیر کے سوا کوئی حرف نہیں نکلا۔ ہندوستان کی تقسیم اور پاکستان کے نظریہ کی انھوں نے ہمیشہ کھلم کھلا مخالفت کی اور اصولی طور پر مولانا کبھی بھی اس کو تسلیم نہ کر سکے۔ لیکن پاکستان بن گیا تو اس کے بعد جب بھی کسی نے ذکر کیا تو پوری جرأت قلب و نظر کے ساتھ انھوں نے یہی کہا کہ اب جب کہ وہ ایک ملک بن چکا ہے۔ ہماری آرزو یہی ہے کہ وہ خوش حال ہو اور اسے استحکام نصیب ہو۔ یہ ان کے قلب کی وسعت ہی تھی کہ ٹھیٹھ کانگریسی ہونے اور عقیدتاً دیوبندی مکتب فکر سے پختہ وابستگی کے باوجود انھوں نے اپنی نفع رسانی اور خدمت گزاریوں میں کبھی کوئی امتیاز روا نہیں رکھا۔ بلکہ بعض بعض مواقع پر تقاضائے حالات وہ خدمات بھی خود انجام دیں جن سے وہ کوئی نظریاتی لگاؤ نہیں رکھتے تھے۔ مثلاً ۱۹۴۷ء میں دہلی کی تباہی کے بعد محرم کے تعزیوں اور بزرگان دین کے مزارات پر عرسوں کا سوال آیا تو مولانا نے خود اس کا اہتمام کیا۔ کہیں کہیں خود شریک بھی ہوئے۔ قوالیاں بھی کرائیں اور عرسوں کی مروجہ رسوم سب ہی پوری کرائیں یہ کہہ کر کہ اگرچہ ہم تعزیوں اور عرسوں کے اس رواج کے خلاف ہیں، تاہم یہ بھی برداشت نہیں کر سکتے کہ ملکی حالات کے دباؤ سے مجبور ہو کر مسلمان بادل ناخواستہ ان منکرات کو چھوڑیں اپنے عقیدہ اور مسلک پر مضبوطی سے قائم رہتے ہوئے جہاں تک خدمت و عمل کا تعلق ہے۔ ان کی دردمندیوں کے سایہ میں دارالعلوم دیوبند اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا ایک ہی درجہ تھا۔ جدید و قدیم، مقلد اور غیر مقلد۔ شیعہ اور سنی، خوجے اور بوہرے، مسلم لیگی اور کانگریسی بلکہ مسلم اور غیر مسلم ہر انسان کی خدمت وہ اپنا حق سمجھتے تھے عقیدہ اور مسلک کا اختلاف ان کو کسی کی خدمت سے باز نہیں رکھتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان تمام حلقوں میں یکساں طور پر ان کو احترام اور اعتماد کی نظر سے دیکھا جاتا تھا اور کسی بھی گروہ نے ان کو اپنے لئے غیر اور اجنبی محسوس نہیں کیا۔

رواداری اور اعتماد

ان کی شرافت نفس کا قدرتی نتیجہ یہ بھی تھا کہ دوسروں کے ساتھ بے انتہا رواداری، احترام اور اعتماد کا معاملہ کرتے تھے۔ ہمیشہ ہر معاملہ میں دوسروں کا احترام ملحوظ رکھتے اور ہر موقع پر دوسروں کو آگے بڑھانے کی کوشش کرتے تھے اپنے ساتھیوں اور کارکنوں پر حد درجہ اعتماد کرتے۔ کسی سے شکایت کا موقع بھی ملتا تو وقتی ناگواری کا اظہار ضرور کرتے۔ مگر دلی تعلق میں کبھی بال برابر فرق نہ آنے دیتے۔

جرأت حق اور مقام عزیمت

مولانا مرحوم کے افکار و کردار کا سب سے اہم اور جوہری وصف ان کی جرأت حق اور استقامت و عزیمت تھی۔ ان کی پوری زندگی اس وصف کمال کا ایک مسلسل اور شاندار مظاہرہ رہی ہے۔ اہم سے اہم اور نازک معاملات میں بھی جب وہ اپنی کوئی رائے قائم کرتے، تو کسی خوف، کسی اندیشہ اور کسی لالچ کی پرچھائیں بھی اس پر نہیں پڑ سکتی تھی۔ ہر معاملہ کو کھلے دل سے اپنے اور اپنے خدا کے درمیان سوچنا اور فیصلہ کرنا اور فیصلہ کر لینے کے بعد اس پر پختگی کے ساتھ جم جانا، یہی ان کا صحیح موقف تھا۔ ان کی زندگی میں بارہا ایسے موقعے بھی آئے جہاں ان کی جرأت و

حوصلہ اور ثبات فکر و نظر کے لئے بڑی آزمائشیں درپیش تھیں۔ مگر ان کے کردار میں کوئی تزلزل راہ نہ پا سکا۔ چند برس پہلے ہی ایک صاحب نے گاندھی جی کی پرارتھنا پر شرعی نقطۂ نظر سے فتویٰ چاہا۔ اگرچہ عام طور پر فتویٰ لکھنے سے مولانا ہمیشہ بچتے تھے اور دوسرے علمائے کرام پر محول کر دیتے تھے۔ لیکن جب یہ خاص سوال سامنے آیا تو مولانا نے پوری اہمیت کے ساتھ فوراً اس کا جواب خود لکھا اور بہت صاف لفظوں میں مسلمانوں کے لئے یہ پرارتھنا شرعاً ناجائز قرار دی۔ یہ سوال حقیقتاً ایسا تھا کہ مولانا تو خیر پکے کانگریسی اور گاندھی جی کو لیڈر ماننے والوں میں سے تھے۔ اگر کسی غیر کانگریسی عالم کے سامنے بھی رکھا جاتا تو ملک کے حالات اور گردوپیش میں بہت مشکل ہوتا کہ اس صفائی اور جرأت کے ساتھ اس پر نکیر کا فیصلہ دے دیتا۔

۵۰ء کا واقعہ مجھے یاد ہے۔ مولانا جنوبی ہند کے سفر میں تھے۔ ایک ایسے مقام پر جہاں خالص مسلمانوں کا (اور وہ بھی مسلم لیگی) اجتماع تھا کسی نے کشمیر کے متعلق سوال کیا۔ ایک منٹ کے تامل کے بغیر مولانا نے اپنی صاف اور قطعی رائے ظاہر کر دی اور فرمایا کہ ہماری خواہش تو یہی ہے کہ کشمیر کا ہندوستان کے ساتھ الحاق ہو، تاکہ ہندوستان کی حدود میں کم از کم ایک ریاست خالص مسلم اکثریت کی نظر آسکے اور اس سے ہندوستانی مسلمانوں کا وزن بڑھ سکے۔

آپ آخری دنوں میں مسلم کنونشن کا معاملہ بھی مولانا کی جرأت فکر و عمل کی ایک مثال بن گیا۔ کیونکہ وزیر اعظم ہند پنڈت نہرو تک شروع میں اس کے خلاف تھے لیکن مولانا کے لئے یہ بھی کوئی پریشانی کی بات نہیں تھی۔ کسی نے پوچھا کہ پنڈت جی کی قطعی مخالفت کے بعد بھی کیا آپ کنونشن ضرور بلائیں گے۔ مولانا نے پوری مضبوطی کے ساتھ جواب دیا کہ ہم نے جو فیصلہ کیا ہے وہ خوب سوچ سمجھ کر کیا ہے۔ پنڈت جی کی رائے بھی اس کے خلاف ہے تو ہو۔ ہم ان کی مخالفت کے ڈر سے کنونشن کا خیال ترک کر دیں، یہ ممکن نہیں۔

مقام علم و فضل

سیاسی اور جماعتی ذمہ داریاں مولانا کے وقت عزیز پر اس طرح چھا گئی تھیں کہ عوام کے سامنے زیادہ تر ان کی عملی زندگی رہی۔ لیکن حقیقتاً اپنی دینی بصیرت اور علم و فضل کی گہرائی میں بھی ان کا مرتبہ بہت بلند تھا۔ جس کا اندازہ ان کی فاضلانہ اور محققانہ تصانیف سے ہوتا ہے۔ خاص طور پر قصص القرآن اور اسلام کا اقتصادی نظام جو اپنے موضوع پر اردو میں پہلی کتابیں ہیں مولانا کی علمی عظمتوں کے روشن نقوش ہیں اپنی گفتگوؤں میں جب کبھی کسی دینی اور خالص علمی مسئلہ پر ان سے بحث و تمحیص کا موقع ملتا تھا خواہ مسئلہ فقہی ہو یا تفسیر و حدیث کا کوئی عنوان۔ مولانا کے فاضلانہ تبصرے سامعین پر ان کی وسعت نظر اور ذہانت و ذکاوت کا سکہ جما دیتے تھے۔

انداز فکر

تب و نظر کے وہی ممتاز اوصاف جن کا اوپر تذکرہ ہوا۔ مولانا کے افکار و رجحانات کے بنیادی عوامل تھے ان کے انداز فکر میں جرأت حق، خلوص نیت، وسعت قلبی اور استقامت و عزیمت کے جوہر صاف جھلکتے تھے۔ زندگی اور اس کے تقاضوں کو مثبت اور ایجابی نقطۂ نظر سے دیکھنا، ہر حال میں ناامیدی اور مایوسی سے گریز۔ حوصلہ مندی اور تحمل و برداشت کے ساتھ وقت کی نزاکتوں سے گزر جانا، صحت مند شعور اور خودداری کے احساس کے ساتھ اپنے دین اور دنیا کی خدمت گزاری۔ اپنے وطن کی بے لوث محبت اور عام انسانی ہمدردی، یہی مولانا کے بنیادی افکار تھے اور عمر بھر اپنی تقریروں، تحریروں اور قول و عمل سے یہی پیغام انھوں نے دیا۔

حب وطن

وطن کی محبت مولانا مرحوم کے لئے جزو ایمان تھی۔ انھوں نے ایک طرف خود وطن عزیز کی آزادی اور آزادی کے بعد اس کی تعمیر و ترقی سربلندی و خوش حالی۔ عزت و نیک نامی کی خاطر اپنی جان کی بازی لگا کر وہ سب کچھ کیا جو ایک سچے وطن پرور کا کردار ہو سکتا ہے اور دوسری طرف اپنے برادران ملت کو ہمیشہ یہی نصیحت کی کہ وہ وطن عزیز کی خدمت میں کسی سے پیچھے نہ رہیں۔ اپنی تقریروں میں برملا فرمایا کرتے تھے کہ وطن کی محبت کا نعرہ ہم کسی کی خوشامد یا نمود و نمائش کے لئے نہیں بلند کرتے ہیں۔ بلکہ یہ ہمارا دین و ایمان ہے۔ ہمیں یہ سبق اسوۂ رسول کریم سے حاصل ہوا ہے۔ ہندوستان ہمارا وطن ہے ہمارا اس کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اس کی خوش حالی ہماری خوش حالی اور اس کی بربادی ہماری اپنی بربادی ہے۔ سرزمین ہند پر ہمارا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا کسی دوسرے ہندوستانی کا۔ ہم یہاں اجنبی یا تماشائی نہیں ہیں۔ اس دیس کو بنانے میں دوسروں کے ساتھ ساتھ ہم نے بھی اپنی جان کھپائی ہے۔ کسی کے دکھاوے اور خوشنودی کے لئے نہیں، بلکہ اپنا فرض سمجھ کر۔ ہم اپنے اس فریضۂ وطنی اور اس کے تقاضوں سے کبھی غفلت کے روادار نہیں ہو سکتے۔

مجاہد ملتؒ زندگی کے مختلف ادوار میں

مختصر تذکرہ اور سوانح نگاری کے لحاظ سے دیکھا جائے تو حضرت مولاناؒ کی زندگی مشاغل و مہمات کے تین دوروں میں پھیلی ہوئی نظر آتی ہے۔

زندگی کا پہلا دور

جو زیادہ تر مدرسہ فیض عام سیوہارہ، کچھ جامعہ قاسمیہ مرادآباد اور پھر دارالعلوم دیوبند میں گزرا۔ دارالعلوم کے قیام میں مولانا مرحوم کو خاتم المحدثین حضرت علامہ محمد انورشاہ کشمیری رحمۃ اللہ سے شرف تقرب و تلمذ حاصل ہوا۔ یہ تعلق ان کی عظیم شخصیت کے بنانے والے عوامل میں سنگ بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس دور کے خاص رفقاء حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی، حضرت مولانا محمد بدر عالم میرٹھی (مقیم حال، مدینہ منورہ) اور مولانا سعید احمد اکبرآبادی ہیں۔

فراغت کے بعد کچھ عرصہ دارالعلوم ہی میں تدریس کا شغل رہا۔ پھر مدراس سے ایک فرمائش پر حضرت علامہ انورشاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت مجاہد ملت کو مدراس بھیج دیا۔ وہاں پیرامیٹ میں کم و بیش سال بھر درس و تبلیغ کی خدمت انجام دی۔ یہیں سے حضرت مولانا کی فکری اور قلمی کاوشوں نے انگڑائیاں لینی شروع کیں چنانچہ جنوبی ہند کے اس قیام میں دو مختصر رسالے "حفظ الرحمٰن لمذہب النعمان" اور "مالابار میں اسلام" تالیف کئے (یہ رسالے اب نایاب ہیں) مولانا مرحوم ذکر کیا کرتے تھے کہ مدراس کے قیام میں جو مشاہرہ مجھے حاصل ہوتا تھا۔ اسی کو جمع کرکے میں نے ۲۴ء میں حجاز مقدس کا سفر کیا اور حج و زیارت سے بہرہ مند ہوا۔ حج سے واپس آکر جلد ہی اپنے استاذ محترم حضرت شاہ صاحب کے ہمراہ ڈابھیل ضلع سورت چلے گئے۔ جہاں بڑے پیمانہ پر جامعہ ڈابھیل کی تشکیل عمل میں آئی۔ حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اور حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب کے ساتھ ساتھ تقریباً تین برس (۲۸ء تا ۳۱ء) حضرت مجاہد ملتؒ نے بھی وہاں درس و تدریس کی خدمت انجام دی۔ سیرت رسول کریمؐ جو ذوق و مطالعہ اور بیان و تقریر میں زندگی بھر مولانا موصوف کا خاص سبجیکٹ (موضوع) رہا ہے ڈابھیل کے قیام میں اسی عنوان پر مولانا نے ایک مختصر مگر جامع اور سلیس کتاب مرتب کی جس کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں ڈابھیل اور مدراس کے قیام میں ہر آٹھویں، دسویں روز اپنے مستقر کے آس پاس دیہات و قصبات میں وعظ و تقریر کا سلسلہ بھی رہتا تھا۔ گویا خطابت و تقریر کی خداداد صلاحیت ان فرصتوں میں اپنا نکھار حاصل کر رہی تھی۔ کم و بیش تیس سال کے اس عرصہ میں عمر کے ساتھ ساتھ مولانا مرحوم کے فطری اوصاف کمال بھی تربیت پاکر تکمیل و شباب کی منزل میں قدم رکھ چکے تھے۔ اب وہ ایک مستقل شخصیت۔ ایک بلند پایہ اور صاحب بصیرت عالم دین۔ ایک فطری خطیب و مقرر اور صاحب فکر مصنف بن کر افق پر نمودار ہو رہے تھے۔ قدرت کا ہاتھ آہستہ آہستہ ان کو اس منصب بلند کی طرف لے جا رہا تھا جو ان کی زندگی کا منشا تخلیق تھا۔

کانگریس کی وطنی تحریک میں سرگرمیوں کا آغاز

مولانا مرحوم کی قومی اور جماعتی سرگرمیوں کا آغاز یوں تو ۱۹۱۹ء ہی سے ہو گیا تھا جبکہ ملک میں تحریک خلافت کا غلغلہ تھا اور آزادی ہند کی تحریک بھی وسیع پیمانہ پر ملک بھر میں منظم ہو رہی تھی۔ جمعیۃ علماء ہند کی تاسیس بھی ان ہی دنوں عمل میں آئی۔ مولانا مرحوم کی جماعتی جدوجہد اسی زمانہ سے شروع ہوئی۔ اور اسی سلسلہ میں وہ سب سے پہلی بار ۲۲ء میں گرفتار بھی ہوئے تھے۔ لیکن کانگریس پلیٹ فارم سے مولانا مرحوم کی سرگرمیوں کا سلسلہ زیادہ تر ڈابھیل کے قیام ہی سے شروع ہوا۔ حضرت مفتی صاحب سے معلوم ہوا کہ ان ہی دنوں جب گاندھی جی نے ڈانڈی مارچ کی تحریک شروع کی اور نمک پر محصول کے بائیکاٹ کا پروگرام پیش کیا۔ ان دنوں گاندھی جی کا قیام دھراشٹر میں تھا۔ مولانا مرحوم اور حضرت مفتی صاحب ڈابھیل سے چل کر دھراشٹر پہنچے اور گاندھی جی سے ملے اور تحریک میں اپنی پوری خدمات پیش کیں۔ گاندھی جی ان حضرات کے جذبات اور تعاون کی پیشکش سے بہت متاثر ہوئے۔ ساتھ ہی کہا کہ میں نے سنا ہے کہ حضرت پیغمبر اسلام (ص) کی کوئی ایسی ہدایت ہے کہ نمک، پانی اور گھاس رفاہ عام کی چیزیں ہیں اس لئے اسلام میں بھی ان کو سرکاری محصول سے مستثنیٰ رکھا گیا ہے، کیا یہ صحیح ہے۔ مولانا مرحوم نے اور حضرت مفتی صاحب نے اس کی تصویب کی۔ اور ساتھ ہی حضور سرور کائناتؐ کی حدیث مبارک بمعہ اردو ترجمہ لکھ کر گاندھی جی کو دی۔ جس کو دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئے۔ ان ہی دنوں بارڈولی میں سردار پٹیل نے کانگریس کے کارکنوں کا ایک بڑا اجتماع کیا تھا۔ جہاں یہ طے کیا گیا کہ عدم ادائیگی ٹیکس کی بنا پر پبلک کی جو جائدادیں برٹش حکومت ضبط کرکے سستے داموں نیلام کر رہی ہے عوام کو ان کی خرید سے باز رکھنے اور نیلام کے بائیکاٹ کی ترغیب دی جائے۔ اسی موقع پر حضرت مفتی صاحب (مولانا عتیق الرحمٰن صاحب) نے اسلامی نقطہ نظر سے اپنا مشہور فتویٰ صادر کیا تھا۔ جس میں ضبط شدہ جائدادوں کو نیلام میں خریدنے کی شرعی ممانعت کا حکم تھا۔ کیوں کہ برٹش حکومت کی طرف سے جائیدادوں کی ضبطی ایک صریح

ظلم تھا۔ اور یہی ضبط شدہ جائداروں کو خریدنا شرعاً ظلم و عدوان کی تائید اور تقویت کے حکم میں آتا تھا۔ مفتی صاحب کا یہ فتویٰ سورت کے مشہور مسلم گجرات پریس میں چھپا اور اس کی پاداش میں فتویٰ کے ساتھ ساتھ پریس بھی ضبط کر لیا گیا تھا۔ حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب پہلے ہی گرفتار ہو چکے تھے۔ مفتی صاحب کی گرفتاری کے احکام لے کر سپرنٹنڈنٹ پولیس مفتی صاحب کے پاس پہنچا۔ لیکن اس سے چند گھنٹے پہلے گاندھی اروِن پیکٹ ہو چکا تھا۔ اس لئے تمام وارنٹ واپس لے لئے گئے۔

بہر حال ان دونوں بزرگوں کی سیاسی سرگرمیوں سے اُس وقت جامعہ ڈابھیل کے منتظمین کو بڑی پریشانی لاحق ہوگئی تھی۔ اِن حضرات نے بھی اس کو محسوس کیا۔ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب تو جیل ہی میں تھے۔ مفتی صاحب بھی چند ماہ کے بعد مستعفی ہو کر وطن واپس آگئے۔ اس طرح ڈابھیل کا تعلق منقطع ہو گیا اور رہائی کے بعد مولانا بھی واپس ڈابھیل نہ گئے۔

دوسرا دور

۱۹۳۱ء میں جیل سے رہائی کے بعد حضرت مولانا نے امروہہ پہنچ کر جمعیۃ علماء ہند کے اس معرکۃ الآرا اجلاس میں شرکت کی جہاں سے جمعیۃ کے حلقوں میں ان کی قائدانہ دور کا آغاز ہوا۔ اس اجلاس میں حضرت مفتی اعظم مولانا محمد کفایت اللہؒ، حضرت شیخ مدنیؒ، حضرت مولانا احمد سعید صاحبؒ جیسے اکابر ملت شریک تھے اور جنگ آزادیٔ وطن میں جمعیۃ کے موقف کی تعیین کا اہم سوال درپیش تھا۔ مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی (جو اس وقت ملک کے مشہور لیڈر تھے) ان کی رائے کے خلاف مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے پوری قوت اور جوش کے ساتھ اپنا نقطۂ نظر پیش کیا کہ جمعیۃ کو آزادیٔ وطن کی راہ میں کھلے بندوں انڈین نیشنل کانگریس کا ساتھ دینا چاہیئے اور بلا شرط تعاون کرنا چاہیئے۔ مولانا مرحوم کی اس تحریک، زور بیان اور قوت استدلال نے علماء و افاضل کے اس مجمع کو بے حد متاثر کیا اور اس کی تائید میں بطل حریت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی ولولہ انگیز تقریر کے بعد آخر کار یہی اجلاس کا فیصلہ قرار پایا۔

۱۹۳۲ء کے شروع میں انجمن تبلیغ الاسلام کی دعوت پر (جس کے سرپرست حضرت مولانا آزادؒ تھے) مجاہد ملتؒ کلکتہ تشریف لے گئے۔ ڈھائی سال وہاں قیام رہا درس قرآن حکیم خاص شغل تھا۔ مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب پہلے ہی کلکتہ پہنچ چکے تھے۔ یہاں روزانہ صبح کو دفتر تبلیغ سراج بلڈنگ میں اور عشاء کے بعد مسجد جمال الدین میں درس قرآن حکیم کا سلسلہ جاری رہا۔ کلکتہ کی وسیع آبادیوں میں ان دونوں بزرگوں کی تقریروں نے بہت ہی جلد اپنا سکہ جما دیا۔ نئے اور دلنشین انداز میں قرآن حکیم کے مطالب و معارف کے بیان میں جو امتیاز ان کو حاصل تھا اس کی شہرت دور دور تک پھیلی اور آج تک وہاں کے لوگ ذکر و بیان کی ان مجلسوں کو یاد کرتے ہیں۔

اسی دوران میں مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کو مولانا آزاد مرحوم سے بہت قریب رہنے کا موقع ملا اور ان کی رفاقت نے مولانا کے سیاسی ذوق و لگن کو اور بھی دوآتشہ کر دیا۔ آنجہانی شری سبھاش چندر بوس نے کلکتہ سے ان ہی دنوں کانگریس کے حلقوں میں ماس کنٹریکٹ کی تحریک چلائی۔ مجاہد ملتؒ اور مفتی صاحب نے بھی اس میں سرگرمی کے ساتھ حصہ لیا۔

خرابیٔ صحت کے باعث کلکتہ سے واپسی کے بعد مجاہد ملتؒ کچھ عرصہ امروہہ میں مقیم رہے اور وہاں کے دو عربی مدارس کے اہتمام و نگرانی کی خدمت انجام دیتے رہے اس کے بعد ۱۹۳۸ء میں حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب کے ساتھ ندوۃ المصنفین دہلی کی بنیاد ڈالی اور اس کی ساخت و پرداخت میں مشغول ہو گئے۔ بحمد اللہ اس ادارہ کی معیاری علمی خدمات آج پورے ملک کے سامنے آچکی ہیں اور اس کا شمار ہندوستان کے نامور علمی اداروں میں ہوتا ہے۔ غرض یہ کہ ۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۷ء تک حضرت مولانا کی مصروف زندگی کا یہ دوسرا دور کہا جا سکتا ہے جو زیادہ تر سیاسی ہنگاموں، آزادیٔ وطن کی خاطر مسلسل جد و جہد، سفروں اور جلسوں میں، کچھ قید و بند میں اور ذاتی مشغلوں کے لحاظ سے تصنیف و تالیف میں گزرا۔ مولانا مرحوم کی جلیل القدر علمی تالیفات قصص القرآن، اسلام کا اقتصادی نظام وغیرہ اسی دور کی قیمتی یادگاریں ہیں۔ تالیفات کا بیشتر حصہ سفروں میں مدون ہوا یا جیلوں میں۔

زندگی کے اس دوسرے دور سے گزرتے ہوئے مولانا مرحوم کی شخصیت ایک طرف جہاں تنہا اپنی شاندار تقریروں اور سحر آفریں خطابت کے ذریعہ اپنی فاضلانہ اور محققانہ تالیفات کے ذریعہ اور دوسری طرف چوتھائی صدی سے مسلسل اپنی سیاسی سرگرمیوں اور تحریک آزادی کے ایک نہایت مؤثر و فعال کیریکٹر کی حیثیت سے ملک بھر میں شہرت و تعارف کی بلندیوں پر پہنچ چکی تھی اور ان کا شمار صف اول کے ارباب فکر و بصیرت اور سیاسی رہنماؤں میں ہونے لگا تھا۔

تحریک آزادی اور ملکی سیاست میں قائدانہ رول

علم و فضل کے اعلیٰ محاسن۔ فاضلانہ تصنیف و تالیف اور خطابت و تقریر کی ممتاز صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ مجاہد ملت رحمۃ اللہ علیہ کے خمیر میں سیاست و تدبر کا ذوق

حریت پسندی کے جذبات اور خدمتِ ملک و ملت کی بے مثال لگن بھی گوندھی ہوئی تھی۔ یہی اوصافِ کمال ان کی شخصیت کے جوہری عناصر تھے۔ جن کی آب و تاب ان کی زندگی کے ہر دور میں نمایاں رہی ہے۔ خدمتِ ملک و ملت نوعمری ہی سے ان کا محبوب مشغلہ رہا۔ نوجوان ہی تھے کہ وطنی سیاست اور تحریکِ آزادی میں انھوں نے نہایت بے باکی اور اولوالعزمی کے ساتھ حصہ لینا شروع کیا جس وقت وہ دارالعلوم دیوبند میں تھے ملک کی فضائیں خلافت اور انقلاب انقلاب کی صداؤں سے گونج رہی تھیں۔ مولانا مرحوم اسی وقت سے ایک سرگرم سیاسی کارکن بن گئے اور قدم بقدم تحریکوں میں گرم جوشی کے ساتھ حصہ لینے لگے۔ سیاست سے وابستگی اور تحریکِ آزادیٔ وطن میں شرکت ان کے لئے گویا ایمان و عقیدہ کا درجہ رکھتی تھی۔ اسی لئے کوئی خوف، کوئی فکر، کوئی لالچ اور کوئی بھی طاقت زندگی کے آخری سانس تک ان کے سیاسی مشاغل اور سرگرمیوں میں حائل نہ ہوسکی، بلکہ اس کے برعکس واقعہ یہ ہے کہ اپنے اسی عشق و لگن کے ہاتھوں انھوں نے اپنی نوعمری، جوانی اور بڑھاپے کے ہر عیش و راحت اور مفاد و منفعت کو بے دریغ قربان کیا۔ سعی و عمل کی اس دشوار گذار اور صبر آزما زندگی کو اپنا کر انھوں نے عمر بھر اپنے ضمیر کے اطمینان کے سوا کوئی انعام حاصل نہیں کیا۔ درس قرآن حکیم اور تصنیف و تالیف (جس کی اعلیٰ صلاحیتوں سے وہ بہرہ مند تھے) ان کا پسندیدہ شغل تھا سیاسی سرگرمیوں کی بدولت اس کا رابطہ بھی قائم نہ رہ سکا۔ بڑی حسرت کے ساتھ فرمایا کرتے کہ "کاش میرے حالات مجھے اس کا موقع دیں کہ اپنے اصل کام (یعنی درس قرآن حکیم اور تصنیف و تالیف) کی طرف لوٹ سکوں۔ افسوس کہ ہنگامی مصروفیتوں نے میرا تمام وقت مجھ سے چھین لیا ہے۔"

سیاست کی تیز رفتاری اور ہنگامی تقاضے کچھ اس طرح ان کے دامن سے لپٹ چکے تھے کہ کبھی جم کر اپنے اس محبوب مشغلہ سے وابستہ نہ ہوسکے۔ بار بار گرفتاری اور نظربندی کے مواقع پیش آتے رہے۔ کبھی چھ مہینے کبھی سال بھر کبھی دو سال، جیلوں میں گزارے۔ مجموعی طور پر لگ بھگ پانچ سال وہ تحریکِ آزادی میں نظربند رہے۔ سب سے آخری بار "کوئٹ انڈیا" (ہندوستان چھوڑدو) کی مشہور تحریک ۱۹۴۲ء میں گرفتار ہوئے۔ تقریباً دو سال نظربند رہ کر ۱۴ جولائی ۱۹۴۴ء کو بریلی سنٹرل جیل سے رہا ہوئے اور ۱۸ جولائی کو دہلی پہنچ کر پھر اپنے مشاغل میں مصروف ہوگئے۔ بار بار کی گرفتاری اور نظربندی محض سیاسی سرگرمیوں اور تحریکِ آزادیٔ وطن میں جرأتمندانہ شرکت کی پاداش تھی۔ جس نے مولانا مرحوم و مغفور کی صحت پر بھی بہت برا اثر کیا۔ دوسرا مرض مراد آباد جیل ہی سے ان کے حصہ میں آیا تھا۔ اپنے گھربار، متعلقین یہاں تک کہ اولاد کی ساخت پرداخت اور دیکھ بھال کے لئے بھی بہت ہی کم ان کو مہلت مل سکی۔ عام انسانی زندگی کے لئے یہ آزمائشیں کچھ آسان نہیں ہیں، لیکن مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے بطیب خاطر ایثار و ابتلاء کی اس زندگی کو اپنایا اور اس کے ہر تقاضے کو حوصلہ مندی کے ساتھ پورا کیا۔ شروع ہی سے وہ انڈین نیشنل کانگریس کے سرگرم رکن اور اس کی تمام انقلابی تحریکوں میں پیش پیش رہے۔ کچھ عرصہ یوپی کانگریس کی ایگزیکیٹیو میں شریک رہے ۱۹۳۶ء سے مسلسل آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے رکن رکین رہے۔ کانگریس کی جانب سے مئی ۱۹۴۶ء میں ہاپوڑ، خورجہ سیٹ پر بلامقابلہ یوپی اسمبلی کے ممبر۔ پھر جولائی ۱۹۴۶ء میں مسٹر رضوان اللہ کی خالی کردہ نشست پر دستور ساز اسمبلی کے ممبر اور ۴ جنوری ۱۹۵۰ء کو بلامقابلہ ہند پارلیمنٹ کے ممبر منتخب ہوئے۔

آزادیٔ وطن کے بعد کانگریس ٹکٹ پر ہی جنوری ۱۹۵۲ء میں حلقہ بلاری ضلع مراد آباد سے اور پھر ۱۹۵۷ء میں اور ۱۹۶۲ء میں حلقہ امروہہ سے ہند پارلیمنٹ کے الیکشن لڑے اور ہر مرتبہ معاندین کی انتہائی زورآزمائیوں کے باوجود اپنے حلقہ سے مسلم و غیر مسلم ووٹروں کے بھرپور اعتماد اور کثیر تعداد ووٹوں کے ساتھ کامیاب ہوئے سب سے آخری الیکشن (فروری ۱۹۶۲ء) کے موقع پر وہ اپنی علالت کے باعث حلقۂ انتخاب میں خود نہ جا سکے۔ پھر بھی الیکشن کے نتیجہ میں سخت مقابلہ کے باوجود انھیں شاندار کامیابی حاصل ہوئی۔

جمعیۃ علماء ہند سے تعلق

حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی سیاسی و عملی سرگرمیوں کا دوسرا محور وہ جماعتی زندگی تھی جس کی قیادت و زعامت حاملین امانت دین و مصلحین امت علماء حق کے سپرد تھی اور جو "جمعیۃ علماء ہند" کے نام سے عوام و خواص میں متعارف ہے۔ مولانا مرحوم یوں تو ابتداء ہی سے جمعیۃ علماء کے رفیق کار رہے۔ لیکن ڈابھیل سے واپسی کے بعد سے وہ جمعیۃ علماء کے ساتھ بہت زیادہ مربوط ہوگئے تھے۔

۱۹۳۰ء میں جمعیۃ علماء کے اجلاس امروہہ میں مولانا مرحوم نے اہم ترین کردار پیش کیا اور آپ ہی کی تجویز اس اجلاس کا ماحصل تھی۔ جمعیۃ کی تاریخ میں اجلاس امروہہ کا یہ فیصلہ ایک انقلابی فیصلہ تھا جس نے جمعیۃ علماء کو انڈین نیشنل کانگریس کے شانہ بشانہ اپنی جماعتی قوتوں کے ساتھ براہ راست تحریکِ آزادی سے مربوط کر دیا۔ آنے والے برسوں میں جمعیۃ علماء ہند نے حریتِ وطن کے ہر محاذ پر جس جرأت و استقامت کے ساتھ اپنا قیمتی کردار پیش کیا اس کی پشت پر اس انقلابی فیصلہ کی قدریں ہمیشہ کارفرما ہیں

حضرت مجاہد ملتؒ اس کے بعد مسلسل جمعیۃ کی ورکنگ کمیٹی کے رکن رکین اور اس کی قیادت میں شریک کار رہے یہاں تک کہ ۱۹۴۲ء میں جمعیۃ کے تیرھویں سالانہ اجلاس (منعقدہ لاہور ۔ ۲۰ تا ۲۲ مارچ ۔ بصدارت حضرت شیخ مدنیؒ) میں جمعیۃ کی نظامت عامہ کا اہم ترین منصب آپ کے سپرد کر دیا گیا۔ اس اجلاس میں حضرت مولانا آزادؒ بھی

شریک تھے اور یہیں مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کو "مجاہد ملت" کا خطاب دیا گیا۔

اجلاس امروہہ (۱۹۳۸ء) سے اجلاس لاہور (۱۹۴۲ء) تک جمعیۃ علماء ہند کی عملی سرگرمیوں میں جہاد آزادی کا تسلسل اتنا غالب رہا کہ اس دور کی تاریخ میں جمعیۃ کی دوسری اصلاحی اور تعمیری خدمات زیادہ نمایاں نہ ہو سکیں۔ یوں بھی یہ عرصہ تحریک آزادی کے انتہائی شباب کا دور تھا، قدم قدم پر اور حلقوں اور کارکنوں کو اس عرصہ میں بیرونی اقتدار سے مسلسل تصادم اور کش مکش کے باعث قدم قدم پکڑ دھکڑ، قید و بند، تعاقب و نگرانی کا سامنا رہا۔

مارچ ۱۹۴۲ء میں مجاہد ملتؒ نے جمعیۃ کی نظامت عامہ سنبھالی لیکن چند ہی مہینوں کے بعد "کوئٹ انڈیا" تحریک پورے ملک میں برپا ہو گئی اور دوسرے قائدین حریت کے ساتھ ساتھ حضرت مولانا بھی نظر بند کر دیئے گئے۔

دو سال کے بعد جب ۴ جولائی ۱۹۴۴ء کو آپ رہا ہو کر آئے تو ملک انقلاب آزادی کے دروازے پر کھڑا تھا اور دہلی اور لندن میں ہندوستان کے مستقبل کے خاکے تیار ہو رہے تھے۔ سب سے اہم کام اس فیصلہ کن مرحلہ پر ملک کے مستقبل سے متعلق جمعیۃ کے نقطۂ نظر کی وضاحت اور اس کی پیروی تھی۔

مجاہد ملتؒ نے وقت کے اس اہم تقاضہ کو محسوس کرتے ہوئے جمعیۃ مرکزیہ کا چودھواں سالانہ اجلاس مئی ۱۹۴۵ء میں بصدارت حضرت شیخ مدنیؒ منعقد کرایا۔ ستمبر ۱۹۴۵ء میں دہلی میں آل پارٹیز مسلم کانفرنس بلائی اور اس کے متفقہ فیصلہ کے مطابق مسلم پارلیمنٹری بورڈ کی تشکیل عمل میں لائی گئی۔ پھر مئی ۱۹۴۶ء میں جمعیۃ مرکزیہ کا دوسرا اہم اجلاس لکھنؤ میں منعقد کرایا اور لندن سے آنے والے مختلف وفود کے سامنے بھی اور خود کانگریس کے ارباب حل و عقد پر بھی جمعیۃ علماء کے موقف کی پوری وضاحت فرمائی، خاص طور پر آزادی کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی وحدت کو برقرار رکھنے پر پورا زور دیا اور آخر تک اس کے لئے کوشاں رہے یہاں تک کہ ۹ جون ۱۹۴۷ء کو جب کانسٹی ٹیوشن کلب نئی دہلی میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی تقسیم ہند کے فارمولے پر اپنی منظوری صادر کرنے کے لئے جمع تھی۔ پنڈت پنتھ نے اس کی تحریک اجلاس میں پیش کی اور مولانا آزادؒ نے بھی تائید میں تقریر کرتے ہوئے بتقاضائے حالات تقسیم کو منظور کر لینے کا مشورہ دیا، اس وقت بھی مجاہد ملت رح نے بھرے اجلاس میں تقسیم ہند کی پوری قوت کے ساتھ مخالفت کی اور فرمایا!

"حالات کے جس دباؤ اور جن الجھنوں کے باعث آج ہندوستان کی تقسیم کو منظور کر لینے کا مشورہ دیا جا رہا ہے، میں اپنے لیڈروں کے پورے احترام کے ساتھ یہ کہوں گا کہ ہندوستان کی تقسیم کا نتیجہ اس سے کہیں زیادہ خطرناک ہوگا اور آج اگر کانگریس کے اسٹیج پر تقسیم ہند کی اسکیم منظور کر لی گئی تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم آج اپنی پوری تاریخ اور ہمیشہ کے اپنے یقین و اعلان پر خود اپنے ہاتھ سے خط تنسیخ کھینچ کر اٹھیں گے اور دو قومی نظریہ کے سامنے سرنگوں ہو جائیں گے" (مجاہد ملتؒ)

جو ہونا تھا وہ ہوا، تاریخ کا ورق پلٹا۔ لیکن مولانا مرحوم کے یہ کلمات بھی تاریخ کی ایک قیمتی امانت بن گئے۔

تیسرا دور

مجاہد ملت رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی عزیز زندگی کا پہلا دور تعلیم و تعلم، تبلیغ دین، خدمت خلق، وعظ و بیان کے دینی مشاغل میں گزارا۔ دوسرے دور میں ان کا تمام ہی وقت سیاسی سرگرمیوں، دوروں اور تقریروں، اسارت و نظربندی اور تحریک آزادی وطن کو اپنی بھرپور صلاحیتوں سے آگے بڑھانے میں گزرا۔ اس دوران میں سکون و فرصت کے کچھ لمحات کبھی کبھی میسر آئے تو وہ تصنیف و تالیف کے فاضلانہ شغل میں گزر رہے۔

۱۹۴۷ء میں تحریک آزادی کامیابی کے ساتھ اپنی آخری منزل کو پہنچی۔ ہندوستان برطانوی اقتدار کی گرفت سے آزاد ہوا۔ اور تاریخ نے وطن عزیز کو ایک عظیم انقلاب اور ایک نئے دور کی گود میں دے دیا مگر تاریخ کا یہ واقعہ بھی کتنا عجیب ہے کہ ہندوستان کی جنگ آزادی جتنی پر امن اور پرسکون فضاؤں میں لڑی گئی اس کا خاتمہ اتنا ہی تیز و تند اور اعصاب شکن ثابت ہوا۔ کاش ہندوستان کی وسیع افق پر سیاسی انقلاب اور اقتدار و اختیار کی تبدیلی "طلوع فجر" کی طرح رونما ہوتی۔ کہ اس کے کیف آور لمحات اور حیات بخش پیغام سے ملک کے در و دیوار جگمگا اٹھتے۔ اس کے برعکس یہاں آزادی کی صبح "صبح محشر" بن کر نمودار ہوئی جس کے دامن میں انقلاب کی ہولناکیاں تھیں اور قہر و غضب کا وہ طوفان جو پچھلی چوتھائی صدی سے ملک میں پھیلی ہوئی کش مکش، جذبات و نظریات کے تصادم اور فرقہ وارانہ ہوسناکیوں کا انجام یا ردعمل تھا۔ اس لحاظ سے ہندوستان کی تاریخ میں یہ وقت اتنا نازک اور بھیانک دور بن کر سامنے آیا کہ بڑے بڑے ارباب فکر و تدبیر کے ہوش و حواس کھو گئے۔ یہی تاریک اور بھیانک دور تھا جس میں حضرت مجاہد ملتؒ کی عزیمت اور استقامت کے تابناک جوہر مشعل راہ بن کر چمکے اور ملک و ملت کے کھوئے ہوئے قافلوں کی دستگیری ان کے حصہ میں آئی۔ مولانا موصوف اس وقت ملکی سیاست و قیادت کا اہم ترین جزو تھے اور صف اول کے رہنماؤں میں اعتماد و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ کمال علم و فضل کے ساتھ ساتھ جہد و عمل کے

میدانوں میں بھی وہ اپنی جوہری صلاحیتوں کا اتنا شاندار اور اولوالعزم کردار پیش کر چکے تھے کہ اب ملک و ملت کے اہم سے اہم مسائل میں ان کی رائے اور رہنمائی کا انتظار کیا جاتا تھا۔ ایک فاضل اور نامور مصنف، سحر آفریں خطیب اور بے لوث رہنما کی حیثیت سے ان کی شہرت و مقبولیت ایک ہمہ گیر حقیقت بن چکی تھی۔ اپنی اس ممتاز اور وقیع حیثیت اور عظیم کردار کے ساتھ مجاہد ملتؒ نے اپنی زندگی کے تیسرے دور میں قدم رکھا اور اس دور میں وہ کارہائے نمایاں انجام دیئے جو انہی کا حصہ تھے۔ جن کی مثالیں دیکھنے کے لئے گردش روزگار کو صدیوں انتظار کرنا پڑتا ہے اور جن کو بلا مبالغہ انسانی تاریخ کا ایک سنہرا ورق قرار دیا جا سکتا ہے۔ حضرت مولاناؒ کی زندگی میں سعی و عمل کا یہ تیسرا دور سب سے زیادہ تابناک اور زریں دور تھا جو آزادی وطن (۱۹۴۷ء) سے شروع ہو کر ۱۹۶۲ء میں اس وقت تک جاری رہا کہ حضرت موصوف اپنی اہمیت و افادیت کی انتہائی بلندیوں پر پہنچ کر "رفیق اعلیٰ" سے جا ملے۔

مجاہد ملتؒ نے اس دور میں جمعیۃ علماء کے اسٹیج سے جو عظیم الشان، ہمہ گیر اور دوررس آفریں خدمات انجام دیں حقیقت یہ ہے کہ وہ بجائے خود ایک مستقل تاریخ ہیں۔ کسی مختصر تذکرہ کے ضمن میں ان کا شمار بڑی ناقدری اور ناانصافی کی بات ہے۔ اسی لئے ہم آئندہ صفحات میں ان بے بہا خدمات کے صرف عنوان پیش کر رہے ہیں کہ مجاہد ملت نمبر کے صفحات اس کے بغیر مکمل بھی نہیں ہو سکتے۔ یہ مولانا مرحوم کی عالی ظرفی تھی کہ انھوں نے کاموں کا تمام بوجھ اپنے اوپر سنبھالتے ہوئے بھی ان خدمات کا کریڈٹ کبھی خود نہیں لیا اور ہمیشہ جمعیۃ علماء ہی کے سر پر سہرا باندھا۔ اس لئے کہ جمعیۃ علماء ہی ان کی سرگرمیوں اور دلچسپیوں کا محور تھی۔ انفرادیت اور انانیت کے تصور سے بھی ان کو گریز تھا۔ وہ صرف جماعتی زندگی کے قائل تھے اور ان کا یہ عقیدہ بھی اسلام کی سچی تعلیم اور اسوۂ رسول کریم کے عین مطابق تھا۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اس پورے دور میں جمعیۃ کے رفقاء کار کا تعاون اور اعتماد مولانا کو قدم قدم حاصل رہا۔ لیکن فکری اور عملی قیادت اور پہل اور اقدام (INITIATIVE) کا جوہر خاص حضرت مولانا ہی کی ذات گرامی تھی۔

اسفار

مولانا مرحوم نے زندگی کا ایک بڑا حصہ سفروں میں گزارا۔ عام طور پر ان کے سفر جمعیۃ علماء کے تنظیمی سلسلہ، جلسوں، کانفرنسوں، وفود اور اہم ترین جماعتی مسائل و مہمات کے لئے ہوتے تھے۔ وعظ و تقریر اور خالص دینی تقریبات میں شرکت کے لئے یا کبھی کبھی کانگریس کے قومی مسائل اور انتخابی سرگرمیوں کے لئے ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک بے تکان سفر کرتے تھے۔ آج ہندوستان کی کوئی ریاست اور کوئی اہم شہر بلکہ قصبہ بھی ایسا نہیں ہے جہاں مولانا نہ گئے ہوں۔ زندگی کے آخری پندرہ برسوں میں تو ان کے مشاغل و مہمات کا بڑا حصہ سفروں ہی میں طے ہوتا تھا۔ ریل، موٹر، ہوائی جہاز تو عام سواریاں ہیں ہی مولانا نے بسا اوقات بحری جہازوں، کشتیوں اور بیل گاڑیوں میں بھی سفر کئے۔ ایک مرتبہ سرپور کاغذ نگر سے واپسی میں دوسرے روز مولانا کو بھوپال پہنچنا تھا۔ وقت اتنا تنگ ہو گیا تھا کہ صرف ایک ٹرین (جی، ٹی ایکسپریس) ہی باقی تھی۔ مگر وہ کاغذ نگر ٹھہرتی نہ تھی۔ مولانا نے طے کیا کہ بلہارشاہ جا کر صبح سویرے جی، ٹی پکڑنا ہے، پھر بلہارشاہ تک کے لئے کوئی سواری نہیں تھی۔ بالآخر ایک مال گاڑی میں گارڈ کے ساتھ کھلے صحن پر آدھی رات سے صبح تک سفر کیا۔ میں اور حافظ محمد جمیل الرحمن صاحب (جنرل سکریٹری جمعیۃ مدھیہ پردیش) ساتھ تھے۔ مال گاڑی حسب معمول اسٹیشن سے ایک میل دور یارڈ میں پہونچ کر رک گئی۔ وہاں سے سامان سفر ہم لوگوں نے خود لادا کچھ مولانا نے سنبھالا کچھ میں نے اور حافظ صاحب نے۔ صبح پانچ بجے کا وقت، ہم لوگ رات بھر کی نیند آنکھوں میں لئے ہوئے۔ اندھیرے میں لائنوں اور سگنل کے تاروں سے الجھتے سنبھلتے مشکل اسٹیشن پہنچ پائے۔ سفر کی ایسی صعوبتیں مولانا کے لئے رات دن کا معمول بن گئی تھیں۔ نہ کبھی اکتاتے نہ شکوہ مند ہوتے

اپنی زندگی میں دو مرتبہ (۱۹۴۸ء اور ۱۹۵۶ء) مولانا نے زیارت حرمین شریفین کے لئے حجاز مقدس کا سفر کیا۔ ۲۴ دسمبر ۱۹۵۳ء کو سنٹرل مسلم ایسوسی ایشن آف ایسٹ افریقہ کی دعوت پر مشرقی افریقہ کے مشہور شہر نیروبی (کینیا) تشریف لے گئے۔ اور ۲۶، ۲۷ دسمبر کو وہاں مسلمانان افریقہ کے ایک نمائندہ اجتماع میں شرکت فرمائی اور اپنے قیمتی مشوروں سے اجتماع کی رہنمائی فرمائی۔ وہاں سے واپسی میں دارالسلام، یوگنڈا، ٹانگانیکا اور عدن میں چار ہفتے بغرض سیاحت گزارتے ہوئے ۲۸ جنوری ۱۹۵۴ء کو دہلی واپس پہنچے۔

آخری دنوں اپنے علاج معالجہ کی غرض سے امریکہ کا سفر کیا۔ ۱۶ اپریل ۱۹۶۲ء کو دہلی سے پرواز کی اور پونے تین ماہ سیاٹل میں زیر علاج رہ کر ۱۲ جولائی کو علی الصباح دہلی واپس پہنچے۔ اگر صحت اور تندرستی مہلت دیتی تو امریکہ سے واپسی میں وہ امریکہ کے اہم مراکز اور پھر لندن، فرینک فورٹ اور قاہرہ ٹھہرتے ہوئے واپس آنا چاہتے تھے۔ افسوس کہ یہ خواہش پوری نہ ہو سکی۔

یو، پی، بہار، راجستھان، مدھیہ پردیش، گجرات و مہاراشٹر کی ریاستیں تو آئے دن ان کے اسفار کی گویا آماجگاہ تھیں۔ لیکن خاص طور پر ۱۹۵۲ء اور ۱۹۵۳ء

میں مولانا نے جنوبی ہند کے جو دورے کئے۔ اپنی خصوصیات، بے پناہ مقبولیت، محبت سے بھرپور استقبال اور مولانا کے ساتھ عوام و خواص کی والہانہ عقیدت کے وہ یادگار مناظر تھے جو مولانا کے رفیق سفر کی حیثیت سے مجھے ہمیشہ یاد رہیں گے۔ پہلے دورہ کرناٹک (رائدرگ، بیجاپور، باگل کوٹ، رایا درگ، بلاری، ہوسپیٹ، دھارواڑ، بیلگام، باچاپور، ہلیال، ہبلی، سرسی، جوگ فال اور آخر میں بھٹکل) کا اہتمام رفیق مکرم مولانا محی الدین منیری ایڈیٹر البلاغ بمبئی نے کیا تھا جو خود بھٹکل کے رہنے والے ہیں۔

منیری صاحب نے بڑی سلیقہ مندی اور کمال نظم کے ساتھ پروگرام ترتیب دیا تھا۔ ایک ہفتہ میں ساڑھے تین ہزار میل کا سفر مکمل کر کے سفر کے حسن انتظام اہتمام سے مولانا بھی بے حد متاثر تھے اور ان مقامات میں عوام و خواص کو مولانا کی قائدانہ بصیرت سے استفادہ کا بھی بہت موقع ملا

دوسرا سفر مولانا نے جنوبی ہند میں پہلی بار جمعیۃ کی تنظیم کے لئے فرمایا تھا۔ پونا، شولاپور، نیتالی، مدراس، میسور، بنگلور، کورگ، اور مالابار تک تشریف لے گئے تھے۔ اس دورہ کے تاثرات ان ہی دنوں حیدرآباد کے ایک اخبار نے ان الفاظ میں شائع کئے تھے۔

"حیدرآباد ۲۳ر جنوری ۵۳ء - ہندوستان ہمارا وطن ہے اور اس سرزمین پر بسنے والے ایک مسلمان کو بھی شہریت کے وہ تمام حقوق حاصل ہیں جو کسی غیر مسلم کو اپنے وطن کی تعمیر اور ترقی کے لئے ہمیں بھی اپنی پوری صلاحیتوں کو کام میں لانا ہے اور ملک کو خوش حال بنانا ہے۔ اس ملک میں ایک باعزت شہری اور سچا مسلمان بن کر اپنی زندگی گزارنی ہے اور اپنی نسلوں کے لئے بھی اسی احساس کا ترکہ و وراثت باقی چھوڑنا ہے۔ یہ ہے جمعیۃ علماء کا وہ پیغام جو حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب ناظم عمومی جمعیۃ علماء ہند کے ذریعہ جنوبی ہند کی فضا میں گونج اٹھا ہے اور جس نے مسلمانوں میں فکر و عمل کی نئی امنگیں پیدا کر دی ہیں۔

تقسیم ہند کے بعد ہندوستان کی جنوبی ریاستوں کے لئے یہ پہلا موقع تھا کہ حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی آواز نے مسلمانوں میں بیداری اور زندگی کی ایک نئی لہر پیدا کی اور تقسیم ملک کے بعد سے مسلمانان جنوب میں جو انتشار، عام احساس کمتری و بے نوائی پیدا ہو گیا تھا، مولانا موصوف کے اس دورہ کے بعد وہ انتشار و احساس ختم ہو کر ان میں پھر اجتماعی زندگی اور اپنے وطن میں اپنے مقام و موقف کا احساس پیدا ہوا۔ حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب جو کئی سال سے مسلمانان جنوب کے پیہم اصرار پر اس کوشش میں تھے کہ وہ ملک کے نئے حالات میں شمالی ہند کے بعد جنوبی ہند میں بھی مسلمانوں کو ان کا موقف و مقام بتلائیں۔ اور انھیں اجتماعی زندگی کی دعوت دیں یہاں موصول شدہ اطلاعات کے مطابق حضرت مولانا اپنے اس دورہ میں بمبئی و حیدرآباد کے بعد آندھرا، مدراس، بنگلور اور میسور تک گئے۔

خاص طور سے آندھرا، مدراس اور بنگلور و میسور کے جن مقامات میں مولانا محترم تشریف لے گئے، ہر جگہ کے مسلمانوں نے انتہائی جوش و ولولے کے ساتھ مولانا کا استقبال کیا، اس لئے کہ انھیں کئی سال سے مولانا موصوف کی آمد کا شدید انتظار تھا اور ان کی آواز کو سننے کے لئے وہ بے چین تھے۔ یہ بات مستقبل کے لئے بہت ہی خوش آئند ہے کہ مسلمانان جنوبی ہند میں ملک کے بدلے ہوئے حالات اور وطن و ملت کے جدید تقاضوں کا احساس پیدا ہو گیا ہے اور پچھلے تصورات اور خیالات ان کے ذہنوں سے عام طور پر دور ہو گئے ہیں۔ مدراس و آندھرا سے بھی بڑھ کر بنگلور و میسور کے مسلمانوں میں حالات کا احساس اور اجتماعیت کا جذبہ دیکھنے میں آیا، جو قومی زندگی کی پہلی نشانی ہے۔

بنگلور شہر میں مولانا محترم نے دو روز گزارے لیکن ان دو روز میں بلا مبالغہ ایک ہفتہ کا کام انجام پایا۔ صبح سے شام تک ایک مشین کی طرح مصروف کار رہ کر مولانا محترم نے تقریباً پندرہ اداروں اور مرکزوں کا معائنہ کیا اور ان کے عمائدین سے تبادلۂ خیالات کیا۔ متعدد مقامات پر عام جلسوں میں مبسوط اور بصیرت افروز تقریریں فرمائیں پریس کانفرنسوں میں شریک ہو کر جمعیۃ علماء ہند کے مقاصد و نصب العین کو روشناس کرایا۔ اور مختلف مسائل پر جمعیۃ کے نقطۂ نظر کی وضاحت فرمائی۔ مسلمانوں نے کس طرح اس آواز پر دھیان دیا اور کس طرح مولانا موصوف کے پیغام کو سننے میں گہری دلچسپی کا اظہار کیا۔ اس کا اندازہ اس سے بھی ہو سکتا ہے کہ پروگرام کے ایک ایک دن میں آٹھ آٹھ دس دس سپاس نامے مولانا کو پیش کئے گئے اور ان کے ذریعہ مسلمانوں کے مختلف اداروں نے اپنے اپنے معاملات اور احوال کو مولانا کے سامنے پیش کیا۔ مولانا موصوف سے عام مسلمانوں کی محبت اور استقبال کا یہ عالم تھا کہ بلا مبالغہ ایک ایک دن میں تیس تیس اور چالیس چالیس میر پھولوں کے ہار مسلمانوں نے مولانا کے گلے میں ڈالے اور اپنی پرخلوص عقیدت و محبت کا ثبوت دیا۔ مدراس اور اسی طرح بنگلور و میسور کے مسلمانوں نے مولانا موصوف کی آمد کے اس موقع پر اپنے نہایت کامیاب اور زیادہ سے زیادہ نمائندہ اجتماع بلائے۔ جن میں قدیم و جدید تعلیم یافتہ حضرات، علماء و مشائخ، فضلا و عمائدین، برادریوں کے نمائندے اور مزدور جماعتوں کے سرپنچ بھی شریک ہوئے"

لکھنؤ کانفرنس سے مسلم کنونشن تک

مجاہدِ ملت کی دور آفریں خدمات

(انیس الحسن)

مولانا حفظ الرحمن ـــــ ۱۹۴۷ء میں

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان آزاد ہوا۔ اسی شب کے بارہ بجے پارلیمنٹ ہاؤس نئی دہلی میں انتقال اختیارات کا منشور پڑھا گیا اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے ہاتھوں رسمی تقریبات انجام پائیں۔ اس کے فوراً بعد لارڈ موصوف نے "گورنمنٹ ہاؤس" میں (جو اس وقت تک "وائسرائے ہاؤس" کہلاتا تھا) منعقدہ ایک بڑی بارونق اور بھرپور محفل میں ہندوستان کے نئے گورنر جنرل کا استقبال کیا۔

مولانا حفظ الرحمن صاحب نے خوشی خوشی ان تمام تقریبات میں شرکت کی۔ تماشائیوں میں ہم نفر کے ساتھی بھی ان کے ہمراہ تھے۔ مولانا مرحوم نے آزادی وطن کے لئے جس طرح جان کی بازی لگائی تھی۔ اور جوانی کی تمام امنگیں اس کے لئے قربان کردی تھیں۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو جب ہندوستان کی فضاؤں پر حریت و استقلال کی صبح مقصود نمودار ہوئی تھی۔ اس کی مسرتوں اور طرب آفرینیوں کا پورا لطف بھی کچھ ان ہی کو حاصل ہوا ہوگا اور ان ہی کا حق تھا۔

بہر حال ملک کو آزاد ہونا تھا۔ ایک تاریخ آئی اور آزادی کی رسم پوری ہوگئی۔ آزاد ہندوستان کے جھنڈے لہرانے لگے "آزادی کے ترانوں سے فضائیں گونج اٹھیں۔ یہ سب کچھ ہوا ـــــ لیکن تھوڑی دیر کے لئے ـــــ اور اس کے بعد..... یکایک ـــ ایک سناٹا۔ گھٹا ٹوپ اندھیرا۔ ایک ہیبت ناک منظر اور جان لیوا دہشت گویا اس دھرتی پر بلاؤں کا دیوتا اپنے پورے غیظ و غضب کے ساتھ برس ہی پڑا ہو۔ تاریخ کو شاید انتظار تھا ایک ایسے وقت کا جو ہمیں ۱۵ اگست کی خوشیاں بھلادے وہ وقت بھی کچھ دور نہیں تھا۔ مگر کسے معلوم!

ادھر حضرت مولاناؒ کی چہیتی بیٹی خالدہ مرحومہ ان دنوں مرض دق کی آخری منزل میں تھی۔ تشویشناک حالت کی خبر آتے ہی ۲۵ اگست کو مولانا سیوہارہ تشریف لے گئے۔ چند ہی روز بعد خالدہ کا انتقال ہوگیا۔ غم میں ڈوبے ہوئے دل کے ساتھ مولانا ۳ ستمبر ۱۹۴۷ء کو اس حالت میں دہلی واپس ہوئے کہ گھر کے سب ہی عزیزوں نے روکا، مگر کسی غیبی کشش نے بے اختیار مولانا کو دہلی پہنچا ہی دیا۔ بعد کے حالات نے بتایا کہ مشیت الٰہی کس اہم خدمت کے لئے مولانا کو دہلی لا رہی تھی۔

دہلی، آزاد ہندوستان کی راجدھانی، اس وقت تاریخ کے بدترین دور کے دروازے پر تھی۔ مغربی اور مشرقی پنجاب اس وقت قتل و غارت کی آگ میں جھلس رہے تھے۔ مغربی پنجاب سے برباد قافلے دھڑا دھڑ مشرقی پنجاب کی طرف کوچ کر رہے تھے اور ان کے ساتھ ساتھ وحشت و بربریت کا بے قابو سیلاب، دہلی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ پنجاب سے آنے والے برباد و مجروح پناہ گزینوں کی ٹرینیں دہلی اسٹیشن تک پہونچیں اور یہاں بھی ایک آگ بھڑک اٹھی۔ تین روز تک نہ صرف دہلی اسٹیشن پر قتل عام ہوتا رہا، بلکہ شہر کے اندر بھی کشت و خون کی وہ گرم بازاری ہوئی کہ آناً فاناً نئی دہلی کی وسیع آبادی، پہاڑ گنج، قرول باغ سبزی منڈی، شاہدرہ اور قرب و جوار کے دیہات سے لاکھوں مسلمان اجڑ کر جامع مسجد اور مقبرہ ہمایوں میں پناہ گزیں ہوگئے۔

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب دہلی پہنچے ہی تھے کہ شہر کا یہ بھیانک نقشہ ان کو دیکھنا پڑا ۔ ۸ستمبر سے بہتر گھنٹے کے لئے کرفیو آرڈر نافذ کر دیا گیا۔ پورے شہر پر موت کا سا عالم چھایا ہوا تھا جس میں کوئی آواز آتی تھی تو صرف گولیوں کی یا بے بس مظلوموں کی چیخ و پکار کی ۔ رات بھر خوفناک نعروں کے ساتھ پورے پورے محلوں پر مسلح چڑھائیاں ، دور دور تک آگ کی لپٹیں اور دھوئیں کے غول کے غول ۔ ہر طرف چھرے بازوں اور بے باک لٹیروں کی گویا حکومت قائم ہو گئی تھی ۔ ایک اندازہ کے مطابق چالیس ہزار کے قریب بے گناہ تین چار روز کے اندر اندر موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے ۔ یہ قیامت جن کے سروں سے گذری ان کا تو ذکر ہی کیا ، جو باقی تھے وہ بھی دم بخود پوری مایوسی کے ساتھ اپنی موت کا انتظار کر رہے تھے ۔ اس بھیانک اور ہیبت ناک فضا میں جب کہ بڑے بڑے لیڈروں کے ہوش و حواس جواب دے رہے تھے یہ سوچنا بھی کہ اس سیلاب بلا کو روکنے ، بے گناہوں کو موت کے چنگل سے نکالنے اور ان کے تحفظ کے لئے کوئی قدم اٹھانے کی کوئی گنجائش بھی باقی ہے ، کسی کے بس کی بات نہ تھی ۔ ایک مولانا ہی کا دم تھا ، جو سر سے کفن باندھ کر اٹھے اور بنام خدا ان کی ہمت نے کچھ ساتھی بھی تلاش کر لئے جمعیۃ کا دفتر یکایک ریلیف کیمپ بن گیا ۔ حالات انتہائی سنگین تھے ۔ مگر مولانا مرحوم کی ہمت اور جوش عمل ان سے بھی کچھ سوا تھا ۔ انھوں نے فوراً مقامی ایڈمنسٹریشن کو للکارا ، جمعیۃ اور کانگریس کے باہمت کارکنوں کو جمع کیا اور اصلاح حال کی مؤثر تدبیر شروع کی ۔

گاندھی جی کی آمد

اسی اثنا میں ۹ ستمبر کو گاندھی جی دہلی پہنچ گئے ۔ دہلی اسٹیشن کی حالت ناگفتہ بہ تھی گاندھی جی کو شہر سے چار میل دور شاہدرہ اسٹیشن پر اتار لیا گیا اور وہ برلا ہاؤس نئی دہلی میں مقیم ہوئے ۔

مولانا مرحوم ، پنڈت نہرو ، مولانا آزاد اور سردار پٹیل کو شہر کی حالت سے آگاہ کر ہی چکے تھے ، گاندھی جی کے پہنچتے ہی حضرت مولانا احمد سعید صاحب کو ساتھ لے کر گاندھی جی کے پاس پہنچے اور تمام سرگزشت سنائی ۔ دوسرے روز گاندھی جی کو ساتھ لا کر مقامی پناہ گزینوں کی حالت دکھائی ۔ شہر کے وہ علاقے جہاں سے مسلمانوں کی وسیع آبادیاں نیست و نابود کر دی گئی تھیں ، دکھلائیں ۔ اصلاح حال کی تدابیر ان کے سامنے رکھیں ۔ لاکھوں برباد شدہ مسلمان جو جامع مسجد مقبرہ ہمایوں اور پرانے قلعہ میں پناہ گیر تھے ۔ ان کے لئے کھانے پینے کا ، کپڑوں کا ، بیماروں کی دوا دارو کا اور دوسری ضروریات کا بندوبست کیا ۔ جب تک یہ کیمپ باقی رہے ۔ دن میں کئی کئی بار ان کا چکر لگانا ، پناہ گزینوں کے لئے خوراک اور دوسری ضروریات مہیا کرانا ۔ ہسپتالوں میں جا کر زخمیوں کو دیکھنا ۔ مایوس دلوں کو تسلی دینا ادھر شہر کے باقی ماندہ مسلم محلوں کی حفاظت ۔ راہ گیروں کے ساتھ قتل و غارت کے واقعات کی روک تھام ، صبح سے شام تک ان سینکڑوں امدادی کاموں میں مولانا اس طرح مصروف رہتے کہ تنہا ان کی ذات باقی ماندہ مسلمانوں کی امیدوں کا مرکز بن گئی تھی ۔ جہاں تہاں واقعات کے تسلسل اور خطرات نے بچے ہوئے مسلمانوں کو اپنی گلیوں ، محلوں میں محصور کر دیا تھا ۔ یہاں تک کہ وہ روزمرہ کی ضروریات کے لئے اپنے محلہ سے باہر قدم نہیں نکال سکتے تھے ۔ غیر مسلم علاقوں سے غذائی راشن بیماروں کے لئے دوائیں اور دوسری ضروریات زندگی فراہم کرنا ، کوئی میت ہو جائے تو اس کی تکفین و تدفین کا بندوبست ، زخمیوں کو ہسپتال لانا لے جانا وغیرہ وغیرہ یہ سب کام مدت تک حفاظتی دستوں کی نگرانی میں انجام پاتے رہے ۔ مولانا مرحوم نے اپنے رفقاء کار کو فرداً فرداً ڈیوٹیوں پر لگا رکھا تھا ۔ مولوی فقیہہ الدین ، سلطان یار خاں وکیل ، مسٹر محمد احمد وکیل ۔ شیخ عبدالحق پراچہ ، محمد عثمان آزاد ۔ عنایت الرحمٰن فاروقی اور بعض دوسرے رفقاء نے ان دنوں بڑی تندہی کے ساتھ شب و روز امدادی کاموں میں ہاتھ بٹایا ۔ جمعیۃ کا مرکزی دفتر ان تمام کوششوں کا مرکز بنا رہا اور تمام کاموں کی نگرانی مولانا مرحوم فرماتے رہے ۔

ادھر گاندھی جی ، حکومت کے ذمہ داروں سے بھی زیادہ خود تمام حالات کی نگرانی کر رہے تھے ۔ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب ۔ مولانا احمد سعید صاحب اور دوسرے جماعتی رفقاء کو ساتھ لے کر ہر روز گاندھی جی کے پاس جاتے اور دن بھر کی روداد ان کو سناتے ۔ پنڈت نہرو ۔ ڈاکٹر راجندر پرشاد ، مولانا آزاد ، سردار پٹیل اور بسا اوقات دہلی کے چیف کمشنر و ڈپٹی کمشنر سب وہیں جمع ہوتے اور ضروری ہدایات جاری ہوتیں ۔ دلی کانگریس کے صاف دماغ دوستوں ، بالخصوص چودھری برہم پرکاش ۔ برج موہن ، چودھری شیر جنگ ۔ شریمتی سبھدرا جوشی ، مس مردولا سارا بھائی نے بھی پوری تندہی کے ساتھ حالات کو بہتر بنانے کے لئے دن رات کام کیا ۔ جمعیۃ کے کارکن اپنے اپنے محلوں کے ضروری کاموں کو سنبھالنے میں بڑی جاں بازی کے ساتھ مصروف رہے ۔ ہر روز نئے نئے حوادث اور مشکلات سامنے آتیں اور ان کے لئے تدابیر عمل میں لائی جاتیں ۔ ان تمام سرگرمیوں کا مرکز حکومت کی اعلیٰ سطحوں میں گاندھی جی کی ذات تھی اور مسلمانوں میں مجاہد ملت کا تنہا دم تھا رات دن کی مسلسل اور جان توڑ کوششوں کے بعد بھی کئی مہینے گزر گئے تب جا کر حالات میں بہتری کے آثار پیدا ہوئے ، لیکن قتل و غارت گری کے ہنگامے جوں جوں کم ہوتے گئے مسلمانوں کے لئے زندگی کی نئی نئی الجھنیں سامنے آتی رہیں اور ہر ہر معاملہ کے لئے مستقل جدوجہد کرنی پڑی ۔

جو علاقے مسلمانوں سے بالکل خالی ہوگئے تھے ان کے کچھ مکانوں میں مدفون دفینوں کی برآمدگی کا سوال سامنے آیا۔ چنانچہ بہت معقول پولیس فورس کے انتظام میں یہ دفینے برآمد کرائے گئے۔ ان علاقوں میں واقع مسجدوں، درگاہوں وغیرہ پر ناجائز قبضے ہوگئے تھے۔ بہت سی مسجدوں کو توڑ پھوڑ کر، یا آگ لگا کر برباد کر دیا گیا تھا۔ ان کی حفاظت، مرمت، انخلا اور اصلاح کا معاملہ بڑا پیچیدہ بھی تھا اور خطرناک بھی۔ تاہم ناسازگار حالات میں اس کی جد و جہد بھی شروع کی گئی اور مدتوں مسلسل جاری رہی۔

سینکڑوں مسلمان سرکاری محکموں کے ملازم تھے، جو ان حالات میں گھر سے باہر قدم نہیں رکھ سکتے تھے۔ آہستہ آہستہ ان کو اُن کی ڈیوٹیوں پر پہونچانا، ان کی رکی ہوئی تنخواہیں یا پنشنیں دلوانا بھی ناممکن ہو رہا تھا۔ بالآخر اسپیشل پولیس کی معیت میں آمد و رفت شروع کرائی گئی اور مہینوں یہ معمول جاری رہا۔ دسیوں محکموں میں ایسے لوگوں کے ہمراہ مولانا مرحوم نے کبھی مجھے اور کبھی مولوی فقیہ الدین کو بھیجا۔

ایک اہم سوال یو۔پی اور دوسرے صوبوں کے ان ہزاروں مسلمانوں کا تھا جو دہلی کے ان ناگہانی حالات میں گھر کر رہ گئے تھے اور بے چین تھے کہ کسی طرح اپنے اپنے وطن پہنچ سکیں۔ چنانچہ مولانا مرحوم نے کوشش کر کے اسپیشل ٹرینوں کا انتظام کرایا۔ دہلی کا بڑا اسٹیشن چونکہ خطرات کا گڑھ بنا ہوا تھا اس لئے یہ اسپیشل ٹرینیں نظام الدین اسٹیشن سے چلائی گئیں۔ مگر نظام الدین اسٹیشن تک صحیح سلامت پہنچنا بھی مسلمانوں کے لئے ممکن نہ تھا۔ اس لئے شہر کے مسلم علاقوں میں ملٹری ٹرک مہیا کرائے گئے اور ان کے ذریعہ ہزاروں ہزار خوف زدہ اور پریشان حال مسلمانوں کو نظام الدین لے جا کر اسٹیشن پر سوار کرایا گیا۔ مولانا مرحوم یہ تمام کام اپنے کارکنوں کے سپرد کر کے بھی خود ساتھ ساتھ ضرور رہتے تھے۔ مجھے یاد ہے، ان ہی دنوں جب ایک ٹرک کے ساتھ میں نظام الدین پہنچا تو ایک صاحب جو کسی اونچے گھرانے کے معلوم ہوتے تھے اور اسپیشل ٹرین پر سوار ہونے والے تھے۔ اتفاق سے ان کی بیوی کو اسی وقت وضع حمل کی تکلیف شروع ہوگئی، چہرہ سے بے انتہا پریشانی ظاہر تھی۔ بالآخر انھوں نے مولانا پر اپنی پریشانی کا اظہار کیا۔ مولانا مرحوم نے فوراً ان کو اپنی کار میں ساتھ لیا اور شہر واپس لا کر ان کی بیوی کو خود اسپتال میں داخل کرایا اور کئی روز تک برابر ان کی خیریت طلبی کے لئے ہسپتال جاتے رہے۔

اسی طرح ایک اور ناگہانی صورت حال سامنے آئی۔ وہ یہ کہ مغربی پنجاب سے آئے ہوئے مشتعل اور زخم خوردہ پناہ گزیں جب مسلمانوں کے خالی کئے ہوئے تمام علاقوں اور ان سے لوٹی چھینی ہوئی دکانوں، بازاروں پر قابض ہو چکے تو انھوں نے شہر کے چند باقی ماندہ مسلم محلّوں میں گھسنا شروع کیا۔ عام قتل و غارت گری کے لئے اب حالات میں زیادہ گنجائش نہ تھی تو انھوں نے ڈرا دھمکا کر یا نقد لالچ دے کر ان محلّوں میں مسلمانوں سے مکان اور دکانیں حاصل کرنے کی طرح ڈالی۔ ایسے بدنصیب مسلمانوں کی بھی کمی نہیں تھی جو آسانی سے ان کا شکار ہو جاتے تھے، لیکن یہ صورت حال جاری رہتی تو دہلی، مسلمان کے نام و نشان سے بالکل خالی ہو جاتی۔

مولانا مرحوم نے یہ معاملہ جب گاندھی جی کے سامنے رکھا تو خود گاندھی جی نے اس کا یہ حل تجویز کیا کہ ان مسلم محلّوں کو "مسلم زون" قرار دے دیا جائے اور ان میں غیر مسلموں کی آبادی کو ہر قیمت پر روکا جائے۔ اس تدبیر کی بدولت دہلی کی باقی ماندہ مسلم آبادی کو بڑا تحفظ حاصل ہوا ورنہ خدا ہی جانے آج دہلی کا کیا حال ہوتا۔

ایک طرف دہلی اپنے اس نازک اور بھیانک دور سے گزر رہی تھی۔ دوسری طرف شرپسند فسادی فوجیں دہلی سے متصل ضلع گوڑگانوہ۔ پانی پت، الور، بھرت پور کی مسلم آبادیوں پر یلغار کر رہی تھیں۔ پانی پت کے مسلمان تو پہلے ہی حملہ میں اکھڑ گئے اور سوائے مولانا لقاء اللہ صاحب عثمانی کے سب ہی نے ترک وطن کے ارادہ سے بستر باندھ لئے، لیکن میوات کے سخت جان اپنے وطن میں رہنے کے لئے آخر تک مصیبتوں کا سامنا کرتے رہے۔ مولانا مرحوم ان ہی دنوں گاندھی جی کے ساتھ بار بار میوات بھی گئے اور پانی پت بھی۔ دونوں رہنماؤں نے وہاں کے مسلمانوں کو کافی سمجھایا اور اپنی کوششوں کا یقین دلایا۔

میوات کے مشہور قصبہ گھاسیڑہ میں پنجاب کے چیف منسٹر ڈاکٹر گوپی چند بھارگو بھی اس وقت موجود تھے جب گاندھی جی اور مولانا حفظ الرحمٰن صاحب وہاں پہنچے اور میواتیوں کے بڑے اجتماع کو تلقین کی کہ اپنے وطن میں ہمت کے ساتھ رہیں اور وقتی مصیبتوں کو جرأت مندی کے ساتھ برداشت کریں۔ افسوس کہ پانی پت کے مسلمانوں نے اثر نہ لیا، لیکن میوات کے مسلمانوں نے اسی وقت فیصلہ کیا کہ کچھ بھی ہو، ہم اپنے وطن کو نہیں چھوڑیں گے۔ بحمد اللہ آج تک ہر گونہ مصائب

کے بعد بھی ان کی بڑی تعداد اپنے وطن میں آباد ہے ۔

بہرحال ہماری تاریخ میں جہاں ۱۹۴۷ء کے بھیانک دور کا تذکرہ ہوگا اور آنے والی نسلیں یاد کریں گی کہ دہلی پہ ایک ایسا وقت بھی آیا تھا جب کہ حالات کے غضبناک تیور ایک ہی ضرب میں مسلمانوں کی ہزار سالہ تاریخ کو مٹا دینے پر تلے ہوئے تھے ۔ وہاں مجاہد ملت رحمۃ اللہ علیہ کے عزم و کردار ، مجاہدانہ کارناموں اور دور آفریں خدمات کا تذکرہ بھی تاریخ کا ایک زرین باب بن کر چمکتا رہے گا اور دنیا اس حقیقت کو محسوس کرے گی کہ ہندوستان کی راجدھانی "دہلی" میں ۱۹۴۷ء کی قیامت صغریٰ سے گزر کر مسلمانوں کی نشأۃ ثانیہ اپنے ظاہری اسباب و عوامل میں بڑی حد تک جس اولوالعزم کردار کی مرہون منت ہے وہ صرف "حفظ الرحمٰن" ہی کا کردار تھا جس کے عزم و ثبات نے جس کی بے پناہ جرأت و استقلال نے حوادث کے بڑھتے ہوئے سیلاب کا رُخ پھیر دیا اور جس کی بدولت دہلی میں مسلمانوں کو انتہائی نازک حالات سے گزر کر ایک نئی زندگی نصیب ہوئی - اور ساتھ ہی وطن عزیز کی آبرو اور نیک نامی بھی باقی رہ سکی ۔

واقعہ یہ ہے کہ (عالم اسباب میں) اگر مجاہد ملت کی ذات درمیان میں نہ ہوتی تو نہیں کہا جاسکتا کہ ۱۹۴۷ء کا انقلاب دہلی کی سرزمین پہ اسپین کی تاریخ دُہراتا یا بغداد پہ تاتاری یلغار کی یاد دلاتا اور پھر کون کہہ سکتا ہے کہ پایۂ تخت "دہلی" کا جب یہ حال ہوتا تو اُس کے مرکزی اثرات کہاں کہاں تک پہنچتے اور کیا رنگ لاتے اللہ تعالیٰ مجاہد ملت کو اپنی بے اندازہ بخششوں سے نوازے اور مسلمانانِ ہند کی تاریخ پر ان کے گراں بار احسانات کی جزائے خیر عطا فرمائے کہ ایک ایسے بھیانک دور میں ان کی ذات ملت اسلامیہ کے وجود و حفاظت کا سہارا بنی اور آج دہلی ہی نہیں، پنجاب و میوات ہی نہیں بلکہ وہ تمام علاقے جہاں انقلاب روزگار کی ستم سامانیوں نے مسلمانوں کی قسمت سے کھیلنا چاہا ، اگر پھر زندگی کی توانائیوں سے سرسبز و شاداب نظر آ رہے ہیں تو درحقیقت ان کی آبیاری اور پرورش میں مولانا مرحوم کا خون جگر پیوست ہوا ہے اور ان کی فکری اور عملی صلاحیتوں کا بڑا قیمتی سرمایہ بے دریغ صرف ہوا ہے ۔

لکھنؤ کانفرنس

شمالی ہند میں خونیں حوادث کی اس گرم بازاری اور دور دور تک اس کے مہیب اثرات نے پورے ملک کی زندگی پہ ایک لرزہ اور بحران طاری کر دیا تھا ، خاص طور پہ مسلم اقلیت تو انتہائی دہشت اور سراسیمگی کی گرفت میں تھی ۔ اقلیت و اکثریت میں باہم انتشار اور بے اطمینانی بڑھتی جا رہی تھی اور یہ احساس وسیع پیمانہ پر پھیلتا جا رہا تھا کہ شاید تقسیم کے بعد ہندوستان کے مستقبل میں مسلمانوں کا کوئی موقف نہ ہوگا ۔ یہ جو اسی کا سب سے زیادہ شکار وہ طبقہ تھا جو تقسیم ہند سے پہلے بڑی قوت کے ساتھ مسلمانوں کی دردمندی اور قیادت کا دم بھرتا رہا تھا ۔ بہرحال بددلی ، بے اطمینانی اور مایوسی کے یہ بڑھتے ہوئے احساسات جس طرح مسلمانوں کے حق میں خطرناک تھے اسی طرح ملک کی جمہوری زندگی اور صحت مند تصفیہ کے لئے بھی ان کی سمیت انتہائی ہلاکت آفرین ظاہر تھی ۔ اس صورت حال کا شدید تقاضہ تھا کہ ملک گیر پیمانہ پر کوئی ایسا قدم اٹھایا جائے جو ناخوشگوار حالات میں ملک کو ایک نئی روشنی دکھلائے ، اکثریت و اقلیت میں باہم اعتماد پیدا کر سکے ۔ اور دلوں کے خوف و ہراس کو دور کر کے مسلمانوں کے ماضی اور حال کو مستقبل کے ساتھ جوڑ سکے ۔ وقت کے اس تقاضہ کو پوری قوت کے ساتھ امام الہند مولانا آزاد رحمۃ اللہ علیہ نے محسوس کیا اور آں ہی کے ایما پر ۲۷ ، ۲۸ دسمبر ۱۹۴۷ء کو لکھنؤ میں آزاد مسلم کانفرنس بلائی گئی جس کے پہلے ہی اعلان نے دور دور تک مسلمانوں کی نگاہوں میں امید کی ایک نئی چمک پیدا کی اور بڑی توقعات کے ساتھ جوق در جوق مسلم عوام و خواص اس میں شرکت کے لئے لکھنؤ پہنچ گئے ۔

مقررہ تاریخوں میں یہ کانفرنس اپنی بے مثال کامیابی کے ساتھ منعقد ہوئی اور اس میں مولانا آزادؒ کے قائدانہ خطاب اور مجاہد ملت ولولہ انگیز تقریر (جو صفحہ ۲۳۵ پر درج کی جا رہی ہے) نے حالات سے سہمے ہوئے مسلمانوں کو جرأت مندانہ زندگی اور اعتماد و خودداری کا جو پیغام دیا اور زندگی کے جو عزم اور حوصلے بخشے ، اس نے پورے ملک کی فضا ہی بدل کر رکھ دی اور آج پورے وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ لکھنؤ کے اس تاریخی اجتماع میں ان دونوں بزرگوں نے ملک و ملت کو جو رہنمائی عطا کی ، وہ درحقیقت اس برصغیر میں جمہوری زندگی کا حرف آغاز اور ہندوستان کے مستقبل میں مسلمانوں کے باوقار موقف کا سنگ بنیاد تھا

دینی تعلیم کی ملک گیر تحریک اور اس کی آبیاری

آزاد ہندوستان کی جمہوری زندگی میں ملت اسلامیہ کی حفاظت اور اس پر منڈلاتی ہوئی آفات و مشکلات کے انسداد و مدافعت کی خاطر حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے جہاں دوسرے بے شمار کارہائے نمایاں انجام دیئے، وہاں دین و ملت کی سب سے اہم بنیادی اور تعمیری خدمت جس کی سعادت انہیں نصیب ہوئی وہ دینی تعلیم کی ملک گیر تحریک اور اس کی آبیاری ہے۔

۴۷ء کے سیاسی انقلاب کے بعد اگرچہ فوراً ہی ہنگامی حالات اور ناگہانی مصائب پر سعی و عمل کی بیشتر فرصتیں ضائع ہوتی رہیں تاہم دور اندیش نگاہیں ان حالات میں بھی فکر مستقبل سے غافل نہیں رہیں۔

جمعیۃ علماء نے امام الہند مولانا آزادؒ کی رہنمائی میں ۲۰ مارچ ۴۹ء کے اجلاس دہلی میں پارلیمنٹری سیاسی سرگرمیوں سے کنارہ کشی اختیار کرنے اور اپنی تمام صلاحیتیں تعلیمی اور تہذیبی خدمات کے لئے وقف کرنے کا فیصلہ کیا۔ ادھر ملک کی جمہوری زندگی تیزی کے ساتھ نئے افکار و رجحانات کی طرف بڑھ رہی تھی اور یہ خیال ایک قطعی فیصلہ بنتا جا رہا تھا کہ کروڑوں انسانوں کی اس وسیع آبادی کو جہالت و پس ماندگی سے نکالنے کے لئے دنیوی تعلیم کی عام اور جبری اشاعت بے حد ضروری ہے۔ اس میں شک نہیں کہ رہنمایان وطن کا یہ نظریہ اپنی جگہ بالکل درست بلکہ قابل قدر و تحسین تھا اور وطن عزیز کی اصلاح و ترقی کے لئے اس کی افادیت سے نہ مسلمان انکار کر سکتے تھے نہ غیر مسلم۔ تاہم دنیوی تعلیم کی عام اور جبری ترویج کی تہ میں جو اشکال لازمی طور پر پیش آ رہا تھا وہ یہ تھا کہ جب ملک بھر میں بچوں اور بچیوں کے لئے دنیوی تعلیم حاصل کرنا اور پانچ یا چھ سالہ سرکاری نصاب کی تکمیل ضروری ہو جائے گی اور بلا استثناء ہر بچہ بچی کو تعلیم کی ابتدائی مدت سرکاری اسکولوں میں گزارنی ہوگی اور ساتھ ہی یہ بھی قطعی تھا کہ ملک کے سیکولر جمہوری نظام میں کسی بھی فرقہ اور مذہب کی تعلیم سرکاری نصاب کا جزء نہ ہوگی تو پھر مسلمان بچے جو عام طور پر قرآن حکیم اور دینیات کی تعلیم ٹھیک اسی عمر میں گھروں پر یا مدرسوں میں حاصل کرتے ہیں اس کی گنجائش کیوں کر باقی رہے گی اور ملک بھر میں ان کے لئے کیا بندوبست ممکن ہوگا۔

اس عام اور لازمی اشکال کے ساتھ ساتھ کچھ دور اندیش نگاہوں کو گردش لیل و نہار کے آثار و قرائن میں وہ خطرہ بھی نظر آ رہا تھا جو بہت جلد امر واقعہ بن کر سامنے آنے والا تھا اور بالآخر سامنے آ کر رہا کہ ایک خاص مسموم ذہنیت نے سرکاری نصاب تعلیم کو (سیکولرزم اور دستور ہند کی ہر منشا کے خلاف) اکثریت کے مخصوص مذہبی رجحانات میں رنگنا شروع کر دیا اور ایک خاموش کوشش شروع ہو گئی کہ نصاب تعلیم کے ذریعہ ابتدا ہی سے آنے والی نسل کا ذہن اس طرح ڈھالا جائے کہ اسلامی عقائد و نظریات سے اس کو کافی دور کر دیا جا سکے۔

وطن عزیز کے مستقبل میں پیش آنے والی اس نازک صورت حال کا تدارک اگر ہو سکتا تھا تو صرف اس طور پر کہ پورے ملک میں مسلمانان ہند کے شعور و احساس کو بیدار کیا جائے اور ان کو آمادہ کیا جائے کہ جرأت ایمانی کے ساتھ مستعد ہو کر آگے بڑھیں اور وقت کی نئی آزمائشوں اور ناسازگار حالات میں دین مبین کی مقدس امانت کو اپنے سینوں سے لگائے رکھنے اور اپنی نسلوں کے لئے محفوظ باقی چھوڑنے کی تدابیر میں لگ جائیں۔ اس کے ساتھ ہی ملک گیر پیمانہ پر ایسی کوششیں منظم کی جائیں کہ مسلمان بچے ابتدائی عمر ہی میں (دنیوی لازمی تعلیم کے ساتھ ساتھ بھی) اپنے مذہب اور دینیات کی تعلیم اور عقائد و احکام کا ضروری حصہ حاصل کر سکیں اور دین حق کی روشنی آنے والی نسلوں تک پہنچانے کے قابل ہو سکیں، تاکہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے بعد جس طرح وہ وطن عزیز کے معزز شہری ہوں اسی طرح خدائے واحد کے سچے پرستار اور دین محمدی کے علم بردار بھی بن سکیں۔

اس کے لئے یہ بھی ضروری تھا کہ ایک مختصر اور سہل دینی نصاب مرتب کیا جائے جو کم سے کم وقت میں مسلمان بچوں کو دین کے مبادیات، عقائد، احکام اور اخلاق سے آراستہ کر سکے اور سب سے بڑی ضرورت اس کی تھی کہ بے حسی، تعطل اور انتشار کی عام فضا میں ایک منظم اور وسیع تحریک پھیلا کر مسلمانان ہند میں اتحاد و عمل کی اسپرٹ پیدا کی جائے اور ان کو غفلت و جمود سے نکال کر سعی و اقدام کے لئے بیدار و مستعد کیا جائے۔

انقلاب ۱۹۴۷ء کے بعد ہندوستان کی دستوں میں ملت اسلامیہ کی یہ مخصوص اور بنیادی خدمت اپنے دور رس نتائج اور اہمیت کے لحاظ سے کتنی قیمتی خدمت ہے اس کا پورا احساس شاید مسلمانوں کی آئندہ نسلیں ہی کر سکیں گی بہرحال ایک ایسے وقت میں جب کہ مسلمانانِ ہند کی کوئی تحریک اور تنظیم گردش روزگار کے سامنے قائم نہیں رہ سکی تھی صرف جمعیۃ علماء رہی تھی جو اپنی شاندار روایات اور بے داغ کردار کے ساتھ انقلاب کی زور آزمائی کا مقابلہ کر سکی اور وہی قوت عمل کا ایک خزانہ تھی جو اس بار تنظیم کو اپنے کاندھوں پر اٹھا سکتی تھی اور بالآخر اس نے اس فریضۂ خدمت کو سنبھالا اور ناسازگار حالات میں باحسن وجوہ انجام دیا۔ جمعیۃ کے حلقوں میں اس احساس کو بیدار کرنے والی سب سے پہلی شخصیت حضرت مولانا آزادؒ کی تھی۔ حضرت موصوف نے اپنی بے مثل ذہانت اور دوراندیشی کے ساتھ مجلس عاملہ جمعیۃ علماء ہند میں بیٹھ کر ۱۹۴۸ء ہی سے اس کی سلسلہ جنبانی فرمائی اور رفقاء جماعت کو مشورہ دیا کہ جماعتی مقاصد میں دینی تعلیم کی مہم کو سب سے مقدم رکھ کر آگے بڑھیں۔ چنانچہ اس کامیاب اور مفید رہنمائی کی روشنی میں جمعیۃ نے اپنے سالانہ اجلاس منعقدہ لکھنؤ (اپریل ۱۹۴۹ء) میں دینی تعلیم کی مہم کو اپنا سب سے اہم پروگرام قرار دیا۔ اور اس کے خدام اس مہم کی ساخت و پرداخت میں لگ گئے۔ مجوزہ نصاب کی تدوین و ترتیب کی سعادت اکثر و بیشتر حضرت مولانا محمد میاں صاحب کے حصہ میں آئی اور ملک گیر پیمانہ پر اس مہم کو برپا کرنے کا شرف مجاہد ملت رحمۃ اللہ علیہ کو حاصل ہوا۔ واقعہ یہ ہے کہ تعطل و انتشار کے اس دور میں اپنے اثر و نفوذ کے ساتھ پورے ملک پر اثر انداز ہونے اور مسلمانانِ ہند کو اس خالص تعمیری اور خاموش دینی خدمت کے لئے آمادہ و مستعد کر دینے والی جوہری شخصیت تنہا مجاہد ملتؒ کی ہی شخصیت تھی۔ اپنی ہر دلعزیزی اپنے ملک گیر تعارف و اعتماد، بے نظیر خطابت اور جذبۂ عمل کے ساتھ جب مولانا مرحوم اس مہم کو لے کر اٹھے تو ایک ہی آواز پر ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک مسلمانانِ ہند کے جمود و غفلت نے دم توڑ دیا، ان کے شعور و احساس میں ایک حرکت رونما ہوئی اور ملک کی فضا "دینی تعلیم" کی پکار سے گونج اٹھی۔

حضرت مولانا مرحوم خدمت و عمل کی دوسری ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ اس پیغام کو لے کر ملک میں نکلے تو بہت ہی جلد انھوں نے ایک ملک گیر انقلاب برپا کر دیا۔ مسلمانانِ ہند کے تمام ہی حلقے، مکاتب فکر، امیر و غریب، عوام و خواص یہاں تک کہ خالص جدید تعلیم یافتہ حضرات بھی اس تحریک کی ضرورت اور وقت کے تقاضوں سے آشنا ہو گئے اور ملک کے چپہ چپہ پر مجاہد ملتؒ کی تقریروں اور بیانوں نے ایک ایسا سماں پیدا کر دیا کہ ہر طرف یہاں تک کہ کالجوں اور یونیورسٹیوں کے خالص جدید ماحول سے بھی استعداد و آمادگی کی صدائیں اٹھنے لگیں اور دینی تعلیم کی مہم وقت کی ایک پکار بن گئی، ہر طرف بیداری کی ایک لہر آمادگی عمل اور اس تعمیری مہم سے وابستگی کا مظاہرہ، ان شاندار اجتماعات اور کانفرنسوں میں ہوا جو اس دوران میں جابجا منعقد ہوئیں اور جن کی رہنمائی مجاہد ملتؒ اور دوسرے بزرگانِ جمعیۃ نے فرمائی، خصوصیت سے احمد آباد کی بے مثال دینی تعلیمی کانفرنس جو ۱۹، ۲۰ اکتوبر ۱۹۵۲ء کو حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمن صاحب عثمانی کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ کل راجستھان دینی تعلیمی کانفرنس جے پور جو ۲۳، ۲۴ دسمبر ۱۹۵۲ء کو حضرت مولانا سید محمد شاہد فاخری کی صدارت میں ہوئی۔ الہ آباد کی دینی تعلیمی کانفرنس منعقدہ ۲، ۳ اپریل ۱۹۵۵ء زیر صدارت حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمن صاحب عثمانی۔ بجھورہ ضلع بلیا کی دینی تعلیمی کانفرنس منعقدہ ۲۸ مئی ۱۹۵۵ء بصدارت مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی۔

مشرقی یو۔پی کی دینی تعلیمی کانفرنس منعقدہ خلیل آباد ضلع بستی ۳۱ مارچ ۱۹۵۶ء اور ان سب کے بعد رائے پور (مدھیہ پردیش) دینی تعلیمی کانفرنس منعقدہ ۳، ۴ مئی ۱۹۵۸ء بصدارت سحبان الہند مولانا احمد سعید صاحبؒ جس کا افتتاح وزیر اعظم کشمیر بخشی غلام محمد صاحب نے کیا۔ بمبئی کی دینی تعلیمی کانفرنس منعقدہ ۸، ۹ مارچ ۱۹۵۹ء زیر صدارت دیوان سید عنایت حسین صاحب مرحوم سجادہ نشین آستانہ خواجہ اجمیریؒ (جس میں وزیر اعظم ہند پنڈت جواہر لال نہرو بھی شریک ہوئے) اجین میں مدھیہ بھارت دینی تعلیمی کانفرنس بصدارت مولانا مسعود احمد صاحب صدیقی منعقدہ ۶، ۷ نومبر ۱۹۵۹ء مرہٹواڑہ کی دینی تعلیمی کانفرنس منعقدہ میرج ۲۳، ۲۴ اکتوبر ۱۹۶۰ء اور پالنپور (گجرات) کی دینی تعلیمی کانفرنس منعقدہ ۲۵، ۲۶ جون ۱۹۶۱ء بصدارت مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی۔

یہ اور ان کے علاوہ اور بیسیوں اجتماع جو ملک کے مختلف حصوں میں جمعیۃ کانفرنس کے عنوان سے اس دوران میں منعقد ہوئے۔ ان تمام اہم اجتماعات اور کانفرنسوں میں جس طرح مجاہد ملتؒ نے شرکت فرمائی اور دینی تعلیمی تحریک پر اپنی ولولہ انگیز تقریروں اور دور آفریں پیغام عمل سے مسلمانانِ ہند کے قلوب و اذہان کو متاثر کیا، اسی طرح یہ تمام اجتماع اس عام بیداری، لگن اور تحریک سے گہری وابستگی کے شاندار مظاہرے تھے۔ جو مجاہد ملتؒ کے انقلاب آفریں پیغام نے ایک

خالص تعمیری خدمت کے لئے پورے ملک میں پیدا کردی تھی یقیناً ناسازگار حالات اور بے سروسامانی کے عالم میں اس دینی تحریک کی کامیابی اور تیز رفتار پیش رفت کا محور مجاہد ملت کی عظیم شخصیت اور ان کی ان تھک جدوجہد ہی تھی جس کی بدولت وہ ملک کی ایک زندہ اور پائیدار تحریک بن سکی اور بفضلہ تعالیٰ ملک کے گوشہ گوشہ میں آج ملت اسلامیہ اس کی نفع بخشیوں سے مستفید ہو رہی ہے

دینی تعلیمی کنونشن بمبئی

وحدت فکر و عمل کا ایک تاریخی مظاہرہ

۱۹۴۹ء سے مسلسل اپنے اسفار اور دوروں، تقریروں اور تحریروں کے ذریعہ حضرت مولانا مسلمانان ہند کے شعور، جذبات کو بیدار اور دینی تعلیم کے تقاضوں سے آشنا کرچکے تو ضرورت محسوس ہوئی کہ اس عام بیداری اور آمادگی کو ایک مربوط منظم عملی پروگرام دے کر کام میں لگا دیا جانا چاہئے، چنانچہ مجلس عاملہ جمعیۃ علماء ہند نے اپنے اجلاس بمبئی منعقدہ مارچ ۵۲ء میں کل ہند پیمانہ پر ایک نمائندہ اجتماع بلانے کا فیصلہ کیا کہ فکر و شعور کی وحدت اور ہم آہنگی کے ساتھ مسلمانان ہند کے تمام مکاتب خیال دینی تعلیمی مہم کا ایک دستور کار مرتب کرسکیں اور اس کے مقاصد کو بروئے کار لاسکیں۔ اپنی نوعیت کے اس بے مثال اور تاریخی اجتماع کے اہتمام و انصرام کی ذمہ داری مجاہد ملت رح کے سوا کون نباہ سکتا تھا۔ بمبئی کے رفقاء کرام نے حضرت مولانا کو فراخ دلی کے ساتھ اپنا پورا اعتماد اور تعاون پیش کیا اور بالآخر ۸، ۹ جنوری ۵۵ء کو قیصر باغ ہال بمبئی میں ملت اسلامیہ کا وہ تاریخی اجتماع "کل ہند دینی تعلیمی کنونشن" کے نام سے منعقد ہوا۔ جو ظاہری شان و شوکت حسن انتظام و انصرام کے علاوہ اپنی اثر آفرینی اور افادیت، مکمل نمائندگی بے مثال کامیابی اور وحدت فکر و عمل کے لحاظ سے بھی مسلمانوں کی تاریخ کا ایک بے مثال اجتماع تھا۔ جہاں ملت اسلامیہ کے وہ تمام گروہ حنفی، شافعی، مالکی، مقلد، غیر مقلد، شیعہ، سنی، دیوبندی، بریلوی، خوجے، بوہرے، حسینی فاطمی وغیرہ جدید و قدیم ماحول و مزاج کے اہل علم؛ ماہرین تعلیم، سربراوردہ، اکابر و زعماء جن کے فکر و عمل کے دائرے ہمیشہ جدا جدا رہے ہیں ملک کے گوشہ گوشہ سے آئے اور وحدت کلمہ کی بنیاد پر ایک خالص دینی نصب العین کے لئے سر جوڑ کر بیٹھے اور صفائی قلب و ذہن کے ساتھ دینی تعلیمی مہم کو اپنا کر اٹھے اور اتحاد و عمل کا ایک یادگار نمونہ تاریخ کے حوالے کر گئے۔

کنونشن کا افتتاح صدر جمعیۃ علماء ہند حضرت شیخ مدنی رح نے فرمایا ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب صدر شعبۂ فلسفہ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن کنونشن کے صدر۔ ملا یوسف نجم الدین صاحب صدر استقبالیہ اور الحاج احمد غریب صاحب جنرل سکریٹری مجلس استقبالیہ مہمان داری اور انتظامات کے روح رواں تھے۔ کنونشن نے اپنے غور و فکر کے نتائج ایک کل ہند دینی تعلیمی بورڈ کے سپرد کئے جس کی تشکیل میں پینتالیس نامور زعماء ملت و ماہرین تعلیم شریک ہوئے اور جنرل سکریٹری مجاہد ملت رح بنائے گئے۔

جس وقت بمبئی میں یہ کنونشن منعقد ہو رہا تھا پورے ملک کی نگاہیں اس پر لگی ہوئی تھیں۔ ملک بھر کے مسلم اخبارات اور ارباب صحافت یہاں تک کہ جمعیۃ کے سیاسی مخالفین نے بھی جمعیۃ کی اس تحریک اور مجاہد ملت رح کے اس دور آفریں کارنامہ پر بے اختیار تحسین و آفریں کی صدائیں بلند کیں اور اس کی بے مثل کامیابی پر دلی تہنیت و تبریک کے پیغام بھیجے۔

دینی مدارس اور تعلیمی اداروں کی سرپرستی

اپنے دوسرے اہم قومی و ملی مشاغل اور ہنگامی مصروفیتوں کے ساتھ ساتھ حضرت مولانا حفظ الرحمن صاحب کو عام تعلیمی سرگرمیوں سے بھی مسلسل شغف رہا، وہ خود دینی مدارس کے تعلیم و تربیت یافتہ تھے۔ فراغت کے بعد انھوں نے اپنی زندگی ایک استاذ اور معلم ہی کی حیثیت سے شروع کی تھی۔ ابتداءً دار العلوم

دیوبند میں پھر پیرامیٹ مدراس اور اس کے بعد ڈابھیل، امروہہ وغیرہ میں انھیں علمی خدمت کی کافی سعادت حاصل ہوئی۔ آزادیٔ وطن کے بعد ان کے قیمتی اوقات کا بیشتر حصہ ہنگامی اور وقتی مسائل میں گھرا، لیکن اس دور میں بھی انھوں نے ملت کی جو سب سے اہم تعمیری خدمت انجام دی وہ جمعیۃ علماء کے پلیٹ فارم سے ملک گیر پیمانہ پر دینی تعلیم کی مہم برپا کرنا اور مسلمانوں کی آئندہ نسلوں کو الحاد و بے دینی سے بچا کر ان میں دینی حمیت و شعور اور حرارت ایمانی کا تحفظ و بقا ہی تھا جس کے لئے انھوں نے پورے ملک کے دورے کر کے تحریر و تقریر کے ذریعہ برادران ملت کے شعور کو بیدار کیا اور وقت کے تقاضوں سے روشناس کرایا۔

دہلی کی تعلیم گاہیں

اس اہم بنیادی خدمت کے ساتھ ساتھ وہ موجودہ دینی مدارس اور دوسری تعلیم گاہوں کی ہر ممکن مدد اور سرپرستی بھی برابر فرماتے رہے۔ تقسیم ہند کے بعد دہلی کے مشہور دینی مدارس۔ مدرسہ امینیہ، مدرسہ عالیہ فتح پوری، مدرسہ حسین بخش، مدرسہ مولانا عبدالرب مرحوم نیز فتحپوری مسلم ہائی اسکول، دلی کالج اجمیری گیٹ اور اس کا اینگلو عربک ہائر سکنڈری اسکول، دہلی کی مسلم آبادی کے ساتھ ساتھ ویران ہو کر رہ گئے تھے۔ ان سب مدارس اور تعلیم گاہوں کو نئے سرے سے زندہ کرنے اور باقی رکھنے میں اور ان کی مشکلات کو دور کرانے میں بہت بڑا حصہ حضرت مجاہد ملتؒ کی مسلسل کوششوں کا ہے، وہ بذات خود ان تمام اداروں کی مجالس کے رکن رکین اور مددگار رہے اور اپنی انتہائی عدیم الفرصتی کے باوجود ان کی میٹنگوں میں پوری فکر و اہتمام کے ساتھ شریک ہوئے اور ان کے مسائل کو حل کراتے رہے۔

مدرسہ معینیہ اجمیر

اجمیر کی بربادی کے بعد جہاں درگاہ معلّٰی حضرت خواجہ اجمیریؒ کے تحفظ اور اس کے انتظامات کی اصلاح کے لئے مولانا مرحوم نے بھرپور کوششیں کیں۔ وہاں مدرسہ معینیہ اجمیر کی نشاۃ ثانیہ بھی حضرت مرحوم ہی کی مساعی جمیلہ کے سہارے عمل میں آئی اس مدرسہ کا افتتاح بھی خود حضرت مولاناؒ نے ۱۲ مارچ ۱۹۵۲ء کو اپنے دست مبارک سے فرمایا اور پھر زندگی بھر اس کے معاملات و مسائل میں مدد فرماتے رہے۔

مدرسہ عالیہ کلکتہ

تقسیم بنگال کے ہاتھوں کلکتہ کا مشہور مدرسہ عالیہ جو مقامی اصطلاح میں "کلکتہ مدرسہ" کہا جاتا ہے، ختم ہو گیا تھا۔ مجاہد ملتؒ نے حضرت مولانا آزادؒ وزیر تعلیم حکومت ہند کو توجہ دلا کر حکومت مغربی بنگال پر زور ڈلایا اور کافی جد و جہد کے بعد اس کا اجراء عمل میں آیا۔ مدرسہ کا تمام اثاثہ لٹ چکا تھا۔ از سر نو اس کی زندگی کے تمام سر و سامان مہیا کئے گئے۔ ابتداءً حضرت مولانا کے رفیق خاص "مولانا سعید احمد اکبرآبادی" اس کے پرنسپل رہے۔ بحمداللہ آج مشرقی ہندوستان کا یہ بڑا مدرسہ علوم دینیہ و اسلامیہ کی خدمت گذاری میں مصروف ہے۔

دوسری درس گاہیں

جامعہ قاسمیہ مراد آباد۔ قادری ہائی اسکول سیوہارہ۔ مسلم انٹر کالج اٹاوہ اور دوسری کتنی ہی درس گاہوں کو مسلسل حضرت مولانا کی عظیم شخصیت سے فیض پہنچا، وہ ایسے متعدد علمی اداروں کے رکن مجلس انتظامیہ رہے اور ہمیشہ ان کی مدد و رہنمائی فرماتے رہے۔

مدرسہ عالیہ رام پور، حمیدیہ کالج بھوپال۔ مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ اور بعض دوسری اہم درس گاہیں جو تقسیم ہند سے پہلے سرکاری طور پر مستند و اسلامی درس گاہیں رہیں اور دنیوی تعلیم کے ساتھ ساتھ عربی و فارسی کے مضامین اور دینی علوم بھی ان کے نصاب میں شامل رہے۔ لیکن تقسیم ہند کے بعد متعلقہ ریاستی حکومتوں کے ذمہ داران محکمہ تعلیم مسلسل درپے رہے کہ ان کے نصاب سے اسلامی و مشرقی مضامین خارج ہو جائیں، بلکہ عملاً ان درس گاہوں کے سرکاری استناد (ریکگنیشن) کو ختم کر دیا گیا اور مروجہ امداد روک دی گئی۔ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے اس سلسلہ میں برسوں ریاستی حکومتوں سے مراسلت اور زبانی گفتگوؤں کا سلسلہ جاری رکھا اور بالآخر ان کی قدیم حیثیت کو بڑی حد تک بحال کر دیا گیا۔

دسیوں چھوٹے بڑے دینی مدارس جو ٹونک، ہاپوڑ، بلند شہر، میرٹھ، مظفر نگر، امروہہ، بریلی، شاہجہاں پور، ہردوئی، مبارک پور، غازی پور وغیرہ میں چل رہے ہیں، اپنے معاملات و مشکلات میں حضرت مولانا مرحوم کی شفقتوں سے فیض یاب ہوتے رہے۔ ان مدارس کے سالانہ جلسوں میں بارہا مولانا مرحوم نے شرکت فرمائی، ان کے لئے مالی امداد فراہم کرانے میں بھی کوشش اور سفارش کا بڑا وسیلہ حضرت مولانا ہی کی با اثر شخصیت تھی۔

جامعہ ملیہ دہلی

کے عمائدین و سربراہ بھی ۱۹۴۷ء کے بعد نئے اور الجھے ہوئے حالات میں مجاہد ملتؒ کی ملی درد مندیوں سے جامعہ کے معاملات اور مشکلات میں مدد حاصل کرتے رہے اور بالآخر ان کو جامعہ کی با اختیار "مجلس جامعہ" کا رکن بھی بنا لیا گیا۔ ۱۹۵۹ء و ۱۹۶۰ء میں جبکہ جامعہ ایک اندرونی کشمکش اور الجھن سے گزر رہا تھا حضرت مولاناؒ ہی کی سعی و تدبیر نے اس کے لئے مسیحائی کا کام کیا اور ایک بڑے خلفشار سے جامعہ کو نجات حاصل ہوئی۔

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

جو ہندوستان کی واحد مسلم یونیورسٹی ہے اور ہماری پچھلی ایک صدی کی عظیم الشان علمی امانت ہے۔ لیکن ملکی سیاست میں اس اس کا ماحول، اس کی روایات اور سیاسی رجحانات تقسیم ہند کے بعد ہندوستان کے بدلے ہوئے حالات میں بالکل بے ربط اور اجنبی بن کر رہ گئے تھے۔ تحریک آزادی کے بالکل آخری دنوں میں علی گڑھ اسٹیشن پر قوم پرور ملکی رہنماؤں اور خاص طور پر حضرت مولانا آزادؒ اور خود حضرت مجاہد ملتؒ کے ساتھ جو حوادث پیش آچکے تھے ان کی یاد دلوں میں تازہ تھی۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کی صبح اس عظیم درس گاہ کے لئے خطرات و آزمائش کا پیغام بن کر نمودار ہو رہی تھی۔ مگر یہی دونوں اولوالعزم رہنما تھے جو مسلم یونیورسٹی کے پشت پناہ بن کر سامنے آئے اور ان کی چارہ گری و دستگیری ملک کے نئے حالات میں مسلم یونیورسٹی اور اس کے عزت و وقار کو باقی رکھنے کا وسیلہ ثابت ہوئی۔ مولانا آزادؒ نے محترم ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب (موجودہ نائب صدر جمہوریہ ہند) کو بحیثیت وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی کا سربراہ بنا کر بھیجا۔ ادھر شروع ۱۹۴۷ء ہی سے حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے یونیورسٹی کے معاملات و مسائل سے دلچسپی لینی شروع کی اور ہر موقع پر اس کی مدد و رہنمائی میں پیش پیش رہے۔ یونیورسٹی کے ارباب اختیار نے بھی پورے احترام اور قدر شناسی کے ساتھ حضرت مولانا کے تعاون اور مشوروں کو اپنایا اور یونیورسٹی کی ایگزیکٹو اور کورٹ کے معزز رکن کی حیثیت سے مسلسل ان کی رہنمائی سے فائدہ اٹھایا۔ واقعہ یہ ہے کہ ملک کے تنگ نظر حلقے ۱۹۴۷ء سے مسلسل مصروف کار رہے ہیں کہ اس یونیورسٹی کا نام و نشان تبدیل کر کے اس کی مخصوص حیثیت کو ختم کر دیا جائے۔ حکومت یو پی جس کی حدود کار میں مسلم یونیورسٹی واقع ہے اس کا رویہ شروع ہی سے بہت ہمدردانہ اور دوستانہ نہیں رہا۔ مرکز میں بھی ایک خاص طبقہ آج تک معاند اور نکتہ چین رہا ہے۔ مسلم یونیورسٹی کا نام بدل دینے کی بحثیں تو بارہا چھیڑی جا چکی ہیں۔ لیکن ۱۹۵۹ء و ۱۹۶۰ء میں ہند پارلیمنٹ تک میں مسلم یونیورسٹی کے خلاف کچھ کوششیں صف آرا ہو گئی تھیں۔ اس موقع پر تنہا مجاہد ملتؒ کی ذات تھی جو پارلیمنٹ میں مسلم یونیورسٹی کے دفاع اور مدافعت کیلئے سینہ سپر ہوئی۔ انھوں نے پارلیمنٹ میں ہی ان تمام الزامات اور نکتہ چینیوں کا جواب دیا جو یونیورسٹی کے خلاف عائد کئے گئے تھے۔ ساتھ ہی مرکزی وزارت تعلیم کی نظر میں یونیورسٹی کے دامن کو شکوک و الزامات سے صاف کرنے کے لئے پوری جدوجہد فرمائی۔ الغرض مسلم یونیورسٹی کے خلاف معاند اور تنگ نظر حلقوں کی ان تمام کوششوں کے تدارک اور روک تھام کے لئے جو سرگرمیاں پچھلے پندرہ برس میں مسلسل عمل میں آتی رہی ہیں اور جن کی بدولت مسلم یونیورسٹی کو تقسیم ہند کے بعد بقا و استحکام نصیب ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان تمام سرگرمیوں کا محور امام الہند مولانا آزادؒ، ہمارے محبوب وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو اور مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ ہی رہے ہیں۔

دار العلوم دیوبند

دار العلوم دیوبند جو ایشیا کی سب سے بڑی اسلامی و دینی درس گاہ ہے۔ مجاہد ملتؒ نے اس کے دامن فیض میں پرورش پائی تھی۔ مادر علمی کا حق خدمت جس گہرے احساس اور لگن کے ساتھ عمر بھر انھوں نے ادا کیا وہ درحقیقت بڑی سعادت و کرامت تھی جو ان کے حصہ میں آئی۔ مجاہد ملتؒ نہ صرف یہ کہ دار العلوم کی مجلس شوریٰ کے رکن رکین رہے بلکہ دار العلوم کی فلاح و بہبود ان کے فکر و عمل کا نمایاں عنوان رہی ہے۔ خاص طور پر تقسیم ہند کے بعد کتنے ہی نئے اور پیچیدہ مسائل سامنے آئے جن کی عقدہ کشائی میں مولانا مرحوم کی بااثر شخصیت پیش پیش رہی۔ پاکستان اور دوسرے ممالک سے آنے والے طلبہ کے لئے پاسپورٹ اور ویزا کے نت نئے قوانین نے جب بھی کوئی پیچیدگی اختیار کی، مجاہد ملتؒ ہی کا اثر و رسوخ اس کو حل کرا سکا۔ ابھی آخری دنوں جب دار العلوم پر ایک ناگہانی افتاد نازل ہوئی اور ریاستی حکومت نے بھی اس موقع پر غیر ہمدردانہ موقف اختیار کیا تو مولانا مرحوم ہی تھے جو سینہ سپر ہوئے اور پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں سے دار العلوم کا دامن بے داغ رکھ سکے۔

دار العلوم میں اسلامی ممالک کے سربراہ آئیں یا صدر جمہوریہ ہند، ان کے خیر مقدم میں دوسرے نمائندین کے ساتھ ساتھ دار العلوم کا یہ نامور فرزند عالی مقام بھی پیش پیش نظر آتا۔

مسافران حرم کی خدمت

حضرت مولانا مرحوم کو اپنی دوسری گراں بار مصروفیتوں کے ساتھ ساتھ مسافران حرم کی خدمت گزاری اور ان کی سہولت و رفاہیت کا فکر بھی ہمیشہ عزیز رہا

اور ہر ضرورت کے موقع پر مولانا مرحوم کی مساعی جمیلہ زائرین حجاز مقدس کے کام آسکیں۔ کم و بیش ۱۹۴۹ء سے مسلسل حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ سنٹرل حج کمیٹی کے رکن رکین اور پورٹ حج کمیٹی بمبئی کے صلاح کار و مددگار رہے۔ اپنی وفات کے وقت مولانا ہی سنٹرل حج کمیٹی کے چیرمین تھے۔ حکومت ہند بھی حجاج کے معاملات میں زیادہ تر آپ ہی کے قیمتی مشوروں پر اعتماد کرتی تھی۔ کئی بار حکومت کی فرمائش پر آپ نے بمبئی جا جا کر حجاج کے انتظامات، جہازوں کی ضروریات، کسٹم چیکنگ، بمبئی کے قیام وغیرہ کا خود تفصیلی جائزہ لیا اور اپنی مفصل رپورٹ اور تجاویز حکومت کے سامنے رکھیں جو بیشتر عمل میں لائی گئیں۔

سب سے پہلی مرتبہ مولانا مرحوم نے، ستمبر ۱۹۵۰ء کو بمبئی پہنچ کر اپنے رفقاء کار حکیم اعظمی صاحب، مولانا حامد الانصاری غازی، الحاج احمد غریب صاحب وغیرہ کے ہمراہ زائرین حرم کے انتظامات اور اسلامی جہاز کا معائنہ کیا۔ جہازوں میں حجاج کو دی جانے والی خوراک، پلنگ، روشنی، صفائی، ہوا، طبی ضروریات وغیرہ، کسٹم چیکنگ، مسافر خانہ میں قیام، راشن، ٹیکہ وغیرہ تمام ہی معاملات پر ایک مبسوط رپورٹ مرتب کی جس کی بدولت آنے والے برسوں میں بہت کچھ اصلاحات عمل میں آئیں۔ پھر ۹ جولائی ۱۹۵۱ء کو، ۱۵، ۱۶ جولائی ۱۹۵۳ء کو، ۲۳ جون ۱۹۵۵ء کو اور ۲۵ اپریل ۱۹۵۶ء کو بمبئی پہنچ کر اسی طرح تمام معاملات کا معائنہ کیا اور برابر اپنے مفید مشورے حکومت ہند کے سامنے رکھتے رہے۔ اور وقتاً فوقتاً حجاج کو پیش آنے والی تکالیف و مشکلات کو بھی دور کراتے رہے۔

اپریل ۱۹۵۴ء میں ہندوستان سے باہر جانے والوں پر انکم ٹیکس کلیرنس سارٹیفکیٹ کی پابندی عائد ہوئی اور اس کی عملی دشواریاں حجاج کی کثیر تعداد کے لئے ایک مستقل الجھن بنیں تو مولانا مرحوم نے فوراً سکریٹری سنٹرل حج کمیٹی کو لکھا کہ حجاج کو اس پابندی سے مستثنیٰ کیا جائے۔ لیکن وزارت مالیات اس کے لئے آمادہ نہ ہوسکی تو ۲۹ مئی کو عید الفطر کے روز حضرت مولانا خود وزیر اعظم ہند مسٹر نہرو سے ملے اور ان کو حجاج کی اس تکلیف پر توجہ دلائی۔ محترم وزیر اعظم نے دوسرے ہی دن متعلقہ وزارتوں کو ہدایت فرمادی اور عام حجاج اس پابندی سے مستثنیٰ کردیئے گئے۔

جون ۱۹۵۵ء میں عازمین حجاج کی تعداد معمول سے بہت زیادہ تھی، تمام جہاز پُر ہوچکے تھے، ہزاروں حاجی مایوس و ناکام بمبئی سے واپس ہورہے تھے حضرت مولانا نے بمبئی ہی سے ٹرنک کال پر وزارت خارجہ کو توجہ دلائی اور بالآخر ان کی اس تجویز کو حکومت ہند نے منظور کرلیا کہ ہر جہاز میں مقررہ تعداد سے دس فیصدی اضافہ کردیا جائے۔ اس طرح مایوس عازمین کی بڑی تعداد زیارت حرمین سے بہرہ مند ہوسکی۔

۱۹۵۶ء میں حضرت مولانا خود سفر حجاز مقدس پر تشریف لے گئے۔ اس موقع پر بھی ہندوستان واپسی کے بعد آپ نے ساحل ہند سے حجاز مقدس تک ہندی حجاج کے مسائل پر اپنی مفید تجویزیں حکومت کے سامنے رکھیں۔

عام طور پر ہر سال حج کے سیزن میں مولانا مرحوم بمبئی کا ایک سفر ضرور کرتے اور وہاں حجاج کی روانگی اور انتظامات کی دیکھ بھال، مسافر خانہ میں عام حجاج سے ملاقات و گفتگو ضرور فرماتے۔

ستمبر ۱۹۵۸ء میں وزیر مالیات حکومت ہند مسٹر کرشنما چاری نے "خرچہ ٹیکس" کا بل پارلیمنٹ میں پیش کیا، مجاہد ملتؒ نے حج و زیارت کے مصارف، عام مذہبی اخراجات، خیراتی اداروں کے چندوں اور بیرون ہند مقدس مذہبی مقامات کے لئے دی جانے والی رقوم کو اس بل سے مستثنیٰ کرانے کے لئے بڑی جد و جہد کی اور بالآخر ان کی کوششیں کامیاب ہوئیں

عالم اسلام سے روابط اور ان کی خیر سگالی

جمعیۃ علماء ہند کے مقاصد کار کا ایک اہم جزء ممالک اسلامیہ اور خاص طور پر بلاد عربیہ سے روابط کی استواری اور انکی خیر خواہی و خیر سگالی بھی ہے۔ اس عنوان کے تحت جمعیۃ نے اپنے پچھلے دور میں تقسیم فلسطین کے عزائم اور صیہونی تحریک کے خلاف مسلمانان ہند کی رائے عامہ کو بیدار کرنے اور ان کے جذبات کو بین الاقوامی سیاسی اسٹیج تک پہنچانے میں اپنا شاندار کردار پیش کیا۔ مجاہد ملتؒ بھی جمعیۃ کی اس تحریک میں پیش پیش رہے۔

ادھر مغرب اقصیٰ (شمالی افریقہ) کے مسلم ممالک، مراکش، تیونس اور الجزائر کی تحریک آزادی نے جب شدت اختیار کی تو ان کے برحق مطالبہ آزادی کی پرجوش تائید و حمایت کے لئے جمعیۃ علماء کے اسٹیج سے مسلسل آواز بلند کی گئی۔ مجاہد ملت نے ۱۹۵۲ء میں اور اس کے بعد بار بار اپنے بیانات اور تقریروں میں جمعیۃ علماء کے نقطہ نظر

کو پیش کیا۔ فرانس نے جب جب مطالبۂ آزادی کو بجبر دبانے کے لیے الجزائر میں وحشیانہ مظالم ڈھائے، حضرت مولانا نے ہر موقعہ پر اس کے خلاف آواز بلند کی۔ ملک بھر کی ماتحت جمعیتوں کو ہدایات بھیج کر الجزائر ڈے کا اہتمام کیا۔ تیونس کے رہنما حبیب بورقیبہ، مراکش کے طیب سلیم اور الجزائر کے نمائندے حسین الاحول نے ہندوستان کے دورے کئے تو ان کے خیر مقدم اور تائید میں دوسرے ملکی رہنماؤں کے ساتھ ساتھ جمعیۃ علماء کی جانب سے مجاہد ملت رحمۃ اللہ علیہ بھی پیش پیش رہے۔

نہر سوئیز کے قومیانے پر برہم ہو کر جب فرانس اور برطانیہ نے ستمبر ۱۹۵۶ء میں مصر پر یلغار کی۔ حضرت مولانا ان دنوں سفر حجاز سے واپس ہو رہے تھے۔ ہندوستان پہنچتے ہی انہوں نے اکتوبر ۱۹۵۶ء میں جمعیۃ کے سالانہ اجلاس منعقدہ سورت میں ایک خاص قرارداد کے ذریعہ مصر کے ساتھ دلی ہمدردی اور اس کی مظلومیت پر رنج و ملال کا برملا اظہار کیا۔ سورت سے دہلی واپس پہنچتے ہی مصر کے سفیر ڈاکٹر مصطفیٰ کامل سے ملے اور مسلمانانِ ہند کی پیش کردہ امداد برائے مظلومین سوئیزان کے سپرد کی۔ ان کے علاوہ جب بھی مسلم ممالک کی نمایاں شخصیتیں ہندوستان آئیں مثلاً کرنل انوار السادات سکریٹری موتمر اسلامی (مصر) وسطی ایشیا کے بلاد سمرقند و بخارا سے مفتی ضیاء الدین ایشان بابا خان۔ دمشق سے استاد سعید رمضان، شیخ بہجۃ البیطار، استاذ عبد اللہ المبارک وغیرہ وغیرہ ان کے خیر مقدم اور برادرانہ تعارف و تقرب میں حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب ہمیشہ پیش پیش رہے۔ اسی ذیل میں آپ نے ہندوستان کی تشریف آوری کے موقعہ پر جمعیۃ علماء ہند کی جانب سے ۲۹ نومبر ۱۹۵۵ء کو تال کٹورہ گارڈن نئی دہلی میں اور ۱۰ دسمبر ۱۹۵۵ء کو بمبئی میں سعودی عرب کے سربراہ جلالۃ الملک سعود کے نہایت شاندار خیر مقدم اور عصرانہ کا اہتمام فرمایا۔ پھر ۱۷ فروری ۱۹۵۶ء کو کانسٹی ٹیوشن کلب نئی دہلی میں شہنشاہ ایران ہز مجسٹی رضا شاہ پہلوی اور ہر مجسٹی ملکہ ثریا کا، ۱۴ فروری ۱۹۵۸ء کو کانسٹی ٹیوشن کلب نئی دہلی میں شہنشاہ افغانستان ہز مجسٹی ظاہر شاہ کا اور ۳۰ مارچ ۱۹۶۱ء کو اسی کلب میں زعیم مصر صدر جمال عبد الناصر کا اسی طرح مہتم بالشان خیر مقدم کیا۔

اسلامی اوقاف کا تحفظ۔ راہ کی مشکلات اور ان کا تدارک

مسلم وقف ایکٹ۔ ریاستی وقف بورڈوں کی تشکیل

ملک بھر میں پھیلے ہوئے لاکھوں اسلامی اوقاف، مساجد، مقابر، خانقاہوں، درگاہوں اور ان سے وابستہ دینی مقاصد کا تحفظ اور بقا بھی ایک اہم تعمیری مسئلہ تھا جس پر آزاد ہندوستان کے نئے جمہوری نظام و قوانین میں ایک متعین پالیسی کے ساتھ ملک گیر پیمانہ پر کوشش ضروری تھی

۴۷ء میں اور اس کے بعد دہلی و پنجاب، میوات، اجمیر اور راجستھان کے سرحدی اضلاع میں برباد شدہ اور مقبوضہ ہزاروں مساجد و مقابر، درگاہوں اور دیگر اوقاف کی بحالی، ناجائز قبضوں کا ازالہ، مرمت و صفائی، ان سے وابستہ زمینوں اور ملکیتوں کی بحالی وغیرہ فوری ہنگامی مسائل تھے جن پر پندرہ برس مسلسل حضرت مولانا نے جد و جہد جاری رکھی۔ ایک ایک مسجد، ایک ایک وقف ایک ایک درگاہ کے لئے ان کو بار بار متعلقہ حکام کو خطوط بھی لکھنے پڑے، خود بھی بھیجنے پڑے دسیوں مرتبہ پنجاب، راجستھان اور اجمیر میں خود جا کر حالات کا مشاہدہ کرنے اور وزراء و حکام سے مل کر اصلاح حال کی کوشش بھی کرنی پڑی۔ مرکزی حکومت میں برسوں حضرت مولانا آزادؒ وزیر بحالیات اور جنرل بھونسلے نائب وزیر بحالیات اور دوسرے ذمہ داروں سے سینکڑوں ہی مرتبہ مولانا مرحوم کو خود مل کر ایک ایک معاملہ کو ٹھیک کرانا پڑا۔

ان تمام کوششوں اور جانفشانیوں کے ساتھ ساتھ ایک نہایت اہم اور مستقل ضرورت تھی کہ یونین پارلیمنٹ اوقاف اسلامی کے بارے میں ایک جامع اور ملک گیر قانون وقف بنائے اور تمام ریاستوں میں اس کے مطابق ایسے ذمہ دار وقف بورڈ بنائے جائیں جو درو بست مسلم اوقاف کے تحفظ اور انتظام کے با اختیار ذمہ دار ہوں بحمد اللہ مولانا نے مسلمانانِ ہند کی اس اہم تعمیری خدمت کو بھی جمعیۃ علماء کے اسٹیج سے انجام دیا اور ان کی مساعی جمیلہ کامیاب ہوئیں، ۴۷ء کے ہنگاموں سے کچھ مہلت پاتے ہی یہ اہم مسئلہ جمعیۃ کی مجلس عاملہ میں اپریل ۴۹ء میں پیش کیا اور مسلسل دو سال کے غور و فکر کے بعد ماہرین قانون کے مشورہ سے شرعی نقطۂ نظر کے مطابق اسلامی اوقاف کے لئے ایک مسودہ قانون مکمل کیا گیا جو جمعیۃ کی طرف سے مرحوم محمد احمد کاظمی صاحب ایڈوکیٹ ممبر پارلیمنٹ نے ۱۲ اپریل ۵۱ء

کو پارلیمنٹ میں پیش کیا۔ اور حضرت مولانا نے　　اس کی ضرورت پر وضاحتی تقریر فرمائی۔ پارلیمنٹ نے مسودہ کو غور و فکر کے لئے جوائنٹ کمیٹی کے سپرد کیا اور پھر رائے عامہ معلوم کرنے کے لئے مشتہر کیا گیا۔ جمعیۃ علماء سے اختلاف رکھنے والے کچھ ناعاقبت اندیشوں نے اس موقع پر پورے ملک میں مخالفت کا ایک طوفان کھڑا کر دیا اور یہ مغالطہ دے کر کہ اس بل کی آڑ میں جمعیۃ علماء اور وہابی مولوی اوقاف اسلامی پر اپنا تسلط جمانا چاہتے ہیں۔ ایک نہایت ضروری تعمیری خدمت کی راہ میں حائل ہونے کی مذموم و ناکام کوشش کی۔ ان غلط کاروں کی روش نے معاملہ میں جو الجھن پیدا کر دی تھی۔ حضرت مجاہد ملت رحمۃ اللہ علیہ کو کافی محنت کرکے اس صورت حال کا تدارک کرنا پڑا۔ آخر کار اکثر صوبوں کے معتمد عوام و خواص نے بل کی ضرورت اور افادیت کی تصدیق کی اور ۱۳ مارچ ۱۹۵۴ء کو جوائنٹ کمیٹی کی سفارش پر بحث و مباحثہ اور حضرت مجاہد ملتؒ کی وضاحتی تقریر کے بعد مسلم وقف بل ہند پارلیمنٹ میں منظور ہو گیا۔

اس سلسلہ میں ریاستی حکومتوں کا رجحان شروع ہی سے یہ رہا کہ ایک جمہوری نظام میں سب ہی فرقوں کے اوقاف کا مشترک بندوبست کسی ایک قانون کے تحت ہونا چاہئے۔ مسلم اوقاف کے لئے الگ مستقل قانون بنانا غیر ضروری ہے۔ لیکن دستور ہند کے مسلمات کی رُو سے چوں کہ یہ خیال سراسر غلط تھا اور عملاً مسلم اوقاف کے لئے بڑا خطرناک ہو سکتا تھا۔ اس لئے مجاہد ملت نے پوری پامردی کے ساتھ اس کا مقابلہ کیا اور کامیاب ہوئے۔ تاہم وقف ایکٹ کے نفاذ کے بعد اس کی تعمیل اور وقف بورڈوں کی تشکیل میں ریاستی حکومتوں کی طرف سے ٹال مٹول اور دفع الوقتی کی پالیسی جاری رہی اور مجبوراً اس مرحلہ پر بھی مسلسل ایک مہم کی طرح کام کرنا پڑا

دہلی، یوپی، بہار اور بنگال میں ریاستی سطح پر پہلے سے اپنے اپنے وقف ایکٹ نافذ العمل تھے۔ ضرورت صرف اتنی تھی کہ تمام ریاستوں میں انتظامی سہولتوں اور یکسانیت کے لئے صوبائی وقف بورڈ نئے مرکزی ایکٹ کو اپنے یہاں اپنا کر دستور العمل بنا لیں، لیکن دوسری ریاستوں مثلاً پنجاب، راجستھان، مدھیہ پردیش، جہاراشٹر آندھرا وغیرہ میں قانون کا نفاذ اور وقف بورڈوں کی تشکیل باقی تھی۔ اور اس کے لئے فرداً فرداً ہر ہر ریاست کے معاملہ میں حضرت مولانا کو خود بار بار جدوجہد کرنی پڑی۔ مرکزی وزراء سے بار بار توجہ مبذول کرائی۔ خود بھی مولانا مرحوم ان ریاستوں کے وزراء سے بار بار ملے صوبائی جمعیتوں نے بھی تقاضے جاری رکھے تب بھی یہ مسلسل جدوجہد آندھرا، پنجاب، مدھیہ پردیش تک کامیاب ہوئی۔ راجستھان کا وقف بورڈ مولانا مرحوم کی آخری علالت کے ہی زمانہ میں بن پایا۔ کچھ ریاستیں ابھی تک باقی ہیں۔

اوقاف پر ناجائز قبضے اور قانون تمادی

اسی ذیل میں ایک اور اہم سوال سامنے آیا کہ پنجاب، میوات، دہلی وغیرہ میں جن مسلم اوقاف کے ناجائز قبضے ۱۹۴۷ء سے ابھی تک جاری ہیں اور مسلسل جدوجہد کے باوجود وہ بحال نہیں ہو سکے ہیں۔ بارہ سالہ قبضہ کا قانون تمادی ان کے لئے ایک مستقل خطرہ بن رہا تھا اور ناجائز قابضین اس سے فائدہ اٹھا سکتے تھے۔

حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کو خدا تعالےٰ جزاء خیر دے کہ اس کے لئے بھی انھوں نے پوری بھاگ دوڑ کی۔ وزیر قانون سے ملے، ہوم منسٹر سے بات کی۔ قانون دانوں سے مشورہ کیا اور بالآخر صدر جمہوریہ ہند سے مل کر معاملہ کی نزاکت ان پر واضح کی اور اس کے نتیجہ میں ۲۱ جولائی ۱۹۵۹ء کو صدر جمہوریہ نے ایک خصوصی آرڈی نینس جاری کرکے ناجائز تصرفات میں تمام مسلم اوقاف کی حد تک قانون تمادی کی مدت ۱۲ سال سے بڑھا کر ۲۰ سال کر دی اور مسلم اوقاف ایک بڑے خطرہ سے محفوظ ہو گئے۔

اسی طرح ایک اور خطرہ اس وقت سامنے آیا جب کہ ستمبر ۱۹۶۰ء میں گورنمنٹ آف انڈیا کا ایک لا کمیشن اس غرض کے لئے مقرر کیا گیا کہ وہ ہندوستان بھر کے خیراتی اداروں، اوقاف اور دوسرے عوام سکنائی عطیات کے ملے جلے انتظام کے امکانات پر اپنی رپورٹ اور سفارش مرتب کرے۔ حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے اس رجحان میں لپٹے ہوئے خطرات کو بروقت محسوس کرتے ہوئے ایک بار پھر جدوجہد کی کہ اس کمیشن کی حدود کار سے اسلامی اوقاف کو دور رکھا جائے اور ان کا انتظام و اختیار مستقل حیثیت سے مسلمانوں ہی کے ہاتھ میں باقی رہے۔ مولانا مرحوم کی مؤثر جدوجہد اس مرحلہ پر بھی کامیاب ہوئی اور مسلم اوقاف کے تحفظ کی راہ پیدا ہوئی۔

جہاں تک دہلی کے اسلامی اوقاف کا تعلق ہے ۱۹۴۷ء ہی سے ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب (موجودہ نائب صدر جمہوریہ ہند) کے بعد حضرت مولاناؒ بذات خود دہلی وقف بورڈ کے چیرمین رہے اور بارہ سال مسلسل دہلی کی مساجد، مدارس، مقابر اور تمام ہی وقف اداروں کے ہر چھوٹے بڑے معاملہ کی نگرانی اور ان کے بقاء و تحفظ کی جان توڑ کوششیں فرماتے رہے۔ غرض یہ کہ اس تمام عرصہ میں ملک و ملت کی دوسری ہزاروں ذمہ داریوں اور اہم سے اہم معاملات کے فکر کے ساتھ ساتھ مولانا مرحوم کے قیمتی وقت اور توانائیوں کا بڑا حصہ اس راہ میں بھی صرف ہوتا رہا اور بفضلہ تعالےٰ اس نازک ترین دور میں اوقاف اسلامی کے تحفظ اور بقاء و فلاح کے لئے حضرت مولانا مرحوم بہت کچھ مفید اور کامیاب خدمات انجام دے کر دنیا سے رخصت ہوئے۔

اُردو تحریک، قومی زبان کا مسئلہ اور اس کے عواقب

ہندوستان کی آزادی کے ساتھ ساتھ ملک کی غیر قدرتی تقسیم نے "عمل اور ردعمل" کی جو ناگہانی صورت حال برپا کی اس کا لازمی نتیجہ تھا کہ فکر و نظر کے تمام قالب بدل گئے اور متعدد بنیادی مسائل جو تحریک آزادی کے دنوں اپنی متعین صورت میں مسلمات کا درجہ رکھتے تھے، ملک کی وحدت کے ساتھ ساتھ ان کی متعین پوزیشن بھی بکھر کر رہ گئی، ان ہی مسلمات میں قومی زبان اور اردو کا مسئلہ بھی تھا۔

"آزاد ہندوستان کی قومی زبان وہ عام فہم ہندوستانی ہوگی جو پورے شمالی ہند میں رائج اور ملک کے دوسرے حصوں میں متعارف و مشہور ہے، اس کے رسم الخط اردو اور دیوناگری رہیں گے" یہ تھا گاندھی جی کا واضح نظریہ جو کانگریس کے حلقوں میں طے شدہ مسئلہ سمجھا جاتا تھا۔ لیکن تقسیم ہند کی بدولت جوش و جذبات کا تلاطم ایسے سب ہی اصول اور مسلمات کو بہالے گیا اور ان کی جگہ غور و فکر کی نئی ادائیں بروئے کار آئیں۔ ٹھیک اس فضا میں (۱۹۴۹ء میں) قومی زبان کا سوال جب کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی کے سامنے آیا تو دو ہی نقطۂ نظر زیر غور تھے۔ خود کانگریس پارٹی کا بڑا حصہ اس اہم سوال کو خالص وقتی جذبات کے رنگ میں دیکھ رہا تھا اور پوری قوت کے ساتھ اس پر تلا ہوا تھا کہ ہندوستان کی قومی زبان 'ہندی' ہو۔ بہت کم دماغ تھے جو جذبات کی سطح سے بالاتر ہو کر حقیقت بینی اور دور اندیشی کے ساتھ اس سوال کو طے کرنا چاہتے تھے۔ ان کی واضح رائے یہی تھی کہ عملاً پورے ملک کے لئے جو فیصلہ قابل قبول ہو سکتا ہے وہ یہی ہے کہ گاندھی جی کی قطعی رائے کو بروئے کار لایا جائے۔ اور قومی زبان "ہندوستانی" رکھی جائے۔ حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب اس گروپ کی صفوں میں پیش پیش تھے۔

مجھے آج تک وہ منظر یاد ہے کہ اس بنیادی مسئلہ کے تصفیہ کے لئے جس روز دستور ساز اسمبلی کی کانگریس پارٹی کا ایک ہنگامی اجلاس کانسٹی ٹیوشن ہاؤس نئی دہلی میں ہو رہا تھا۔ دونوں نقطہائے نظر کی کشمکش اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی، مولانا مرحوم اور مسٹر رفیع احمد قدوائی مرحوم کے دست راست آنجہانی خورشید لال "ہندوستانی" کی حمایت اور پیروی میں سرگرم کار تھے۔ مولانا بار بار اجلاس میں جاتے اور آتے۔ اپنے ساتھی ایک ایک ممبر کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر لاتے اور بے چین تھے کہ کانگریس پارٹی حقیقت پسندی کے ساتھ قومی زبان کے مسئلہ کو طے کرے۔ اور پھر جب جذبات کی رو میں ڈوبی ہوئی عددی اکثریت 'ہندی' کا فیصلہ کرا کے گاندھی جی کی رائے "ہندوستانی" کو ہمیشہ کے لئے نظر انداز کر دیا گیا۔ مولانا مرحوم اپنے گہرے تاثر اور ملال کے ساتھ واپس آئے۔ ان کے دل پر ایک چوٹ تھی اور چہرے پر اپنی ناکامی سے زیادہ کانگریس کے بنیادی اصولوں کی شکست کا احساس۔

ان دنوں کانگریس پارٹی میٹنگ میں اور پھر دستور ساز اسمبلی میں قومی زبان کے عنوان پر حضرت مولانا نے جس وضاحت اور دلیری کے ساتھ اپنے نقطۂ نظر کو پیش کیا اس کی یادگار مولانا کی وہ تقریر ہے جو اسی مجاہد نمبر کے صفحات میں کسی دوسری جگہ پیش کی جا رہی ہے۔ بہر حال دستور ساز اسمبلی میں لگاتار کوشش اور پیروی کے بعد بھی اردو زبان کے لئے صرف اسی قدر کامیابی ہو سکی کہ ملک کی دوسری تیرہ زبانوں کے ساتھ ساتھ اردو کو بھی ہندوستان کی ایک زبان تسلیم کر لیا گیا اور اس کے حقوق کی راہ متعین ہو سکی۔ لیکن فیصلہ اور دستور کی حد تک اردو کی ایک متعین حیثیت ہوتے ہوئے بھی جہاں تک عملی دنیا کا تعلق ہے اردو کے حق میں ہندوستان کی فضائیں برابر تنگ و تاریک رہی ہیں۔ بلکہ سرکاری دائروں میں اردو کے ساتھ معاندانہ سلوک اور قدم بقدم اس کو پامال کرنے کی روش بدستور آج تک قائم ہے اور واقعتہً ہماری تاریخ کا یہ عجیب المیہ ہے کہ آزادی کے دور میں خود اسی ملک کی ایک زبان اردو کے حق میں ملک کی فضائیں اس قدر گھٹ کر رہ گئی ہیں کہ بڑی سے بڑی جمہوری اور دستوری کوششیں، ہر فرقہ اور خیال کے اونچے سے اونچے ارباب فکر و نظر اور محبوب وزیر اعظم ہند کی انتہائی با اثر و بانفوذ شخصیت بھی اردو کی قدر و قیمت کے برملا اعتراف سے زیادہ عملاً اس کے جائز حقوق دلانا تو درکنار، اس کے حقوق کی پامالی کو بھی آج تک نہ روک سکیں

بہر کیف تاریخ کے اس منفی ریکارڈ اور حالات کی انتہائی ناسازگاری کے باوجود ملک کا ایک سنجیدہ حلقہ پچھلے پندرہ سولہ برس میں مسلسل سرگرم کار رہا اور اس کی تحریک آج بھی جاری ہے کہ اردو کے حق میں دستور ہند کی دی ہوئی گنجائشیں عملاً بروئے کار لائی جائیں اور ہندوستان کی اس "یتیم" زبان کو بھی ہندوستان میں زندہ رہنے اور پھولنے پھلنے کے مواقع حاصل ہوں۔

اس تحریک کے قائدین میں مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے جتنی جانفشانی اور سرگرمی کے ساتھ کام کیا وہ انہی کا حصہ تھا۔ اپنی مصروف ترین زندگی اور کاموں کے بے اندازہ ہجوم میں بھی انھوں نے پچھلے پندرہ برس مسلسل اردو کے لئے وہ سب کچھ کیا جو کسی بڑی سے بڑی تحریک کا قائد اپنے نصب العین کے لئے کر سکتا ہے۔ ہند۔ پارلیمنٹ کے اندر اور اس سے باہر اردو تحریک کے ہر قدم پر وہ پیش پیش رہے۔ کل ہند انجمن ترقی اردو کا کوئی اہم سے اہم فنکشن ہو یا دلی کی مقامی اردو سبھا کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا جلسہ، مولانا مرحوم پورے اہتمام اور لگن کے ساتھ اس میں شریک ہوتے اور اس کے انکار و اعمال میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے۔

اس پورے دور میں اردو تحریک کا بنیادی پروگرام یہ رہا کہ دہلی، پنجاب، یوپی وغیرہ شمالی ہندوستان میں اردو کو علاقائی زبان کے طور پر پورے حقوق حاصل ہوں اور دوسری کوشش یہ کہ سرکاری تعلیم گاہوں میں، دفاتر اور عدالتوں میں، تعلیمی نصاب اور سرکاری لٹریچر میں اردو کے ساتھ جہاں جہاں معاندانہ سلوک ہو رہا ہے اس کی روک تھام ہو اور اردو کے ساتھ انصاف کے لئے مسلسل پیروی و چارہ جوئی کی جائے۔ حضرت مولانا مرحوم نے جس سرگرمی کے ساتھ اردو تحریک کے دونوں پہلوؤں پر کام کیا۔ افسوس کہ اس کی تفصیل ان مختصر صفحات میں نہیں سما سکتی۔ اس لئے اپنی ڈائری کی یادداشتوں سے کچھ واقعات پیش کر رہا ہوں۔

سب سے پہلے ۲۲ مئی ۱۹۵۱ء کو انجمن ترقی اردو کا ایک وفد اردو کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کی شکایات کا ایک محضر نامہ لے کر لکھنؤ میں یوپی کے وزیر تعلیم شری سمپورنانند سے ملا۔ اس وفد میں ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب۔ حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب۔ قاضی عبدالغفار مرحوم شریک تھے۔

۲۲، ۲۳ دسمبر ۱۹۵۱ء کو لکھنؤ میں کل ہند اردو کانفرنس ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ اردو کے حقوق کی قانونی اور دستوری جدوجہد کے لئے بیس لاکھ دستخطوں کی مہم کا فیصلہ ہوا۔ حضرت مولانا نہ صرف یہ کہ کانفرنس میں شریک ہوئے۔ بلکہ اس کے اہتمام و انصرام میں بیشتر حصہ مولانا مرحوم ہی کی کوششوں کا تھا۔

۲۱-۲۳ مارچ ۱۹۵۲ء۔ اجمیر میں کل ہند اردو کانفرنس (قاضی عبدالغفار مرحوم کی صدارت میں) ہوئی۔ اس کا افتتاح مجاہد ملت رحؒ نے ہی فرمایا تھا
بیس لاکھ دستخطی مہم کو کامیاب بنانے میں جہاں جہاں ضرورت ہوتی مجاہد ملتؒ خود سفر کر کے گئے۔ جلسوں میں شریک ہوئے۔ جمعیۃ علماء کی شاخوں اور کارکنوں کے ذریعہ اس مہم کو کامیاب بنانے میں پوری مدد فرمائی۔ جب مسلسل جدوجہد کے بعد بیس لاکھ دستخط پورے ہو گئے تو ۲۵-۲۶ جولائی ۱۹۵۳ء کو لکھنؤ ہی میں انجمن ترقی اردو کی دوسری کانفرنس ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی صدارت میں منعقد ہوئی جس میں دستخطی مہم کی روداد اور فراہم شدہ دستخطوں کو صدر جمہوریہ ہند کے سامنے لے جانے کا پروگرام زیر غور تھا۔ اس کانفرنس کے افکار و اعمال میں بھی حضرت مولانا نے پورا حصہ لیا۔

۱۵ فروری ۱۹۵۴ء کو نئی دہلی میں انجمن کا معزز وفد ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی سرکردگی میں ڈاکٹر راجندر پرشاد صدر جمہوریہ ہند سے ملا اور یوپی میں اردو کو علاقائی زبان قرار دینے کے لئے بیس لاکھ سے زائد انسانوں کے تحریری مطالبہ کا گراں بار ریکارڈ صدر موصوف کو دیا۔ اس وفد میں ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے علاوہ حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب۔ پنڈت ہردے ناتھ کنزرو۔ پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی۔ شری کشن پرشاد کول۔ شریمتی اوما نہرو، قاضی عبدالغفار، پنڈت سندر لال پروفیسر مسعود حسن رضوی، حیات اللہ انصاری۔ بیگم حیات اللہ۔ شری کرشن چندر اور قاضی نذیر احمد شریک تھے۔

صدر جمہوریہ سے ملاقات کے دوسرے روز نئی دہلی کے ہوٹل ڈی سگمنڈ میں وفد کی جانب سے ایک پریس کانفرنس کا اہتمام کیا گیا جس میں اردو کے مطالبات کی وضاحت اور وفد کی کوششوں کا تذکرہ تھا۔ کانفرنس میں وفد کی جانب سے بولنے والے حضرات ڈاکٹر ذاکر حسین، پنڈت کشن پرشاد کول اور مولانا حفظ الرحمٰن صاحب تھے۔

۲۹ مارچ ۱۹۵۶ء کو جے پور میں کل راجستھان اردو کنونشن میں اور پھر ۵ جولائی ۱۹۵۸ء کو علی گڑھ میں منعقدہ اردو کانفرنس میں حضرت مولانا نے شرکت فرمائی
۴ اگست ۱۹۵۶ء کو مولانا مرحوم نے جے پور پہنچ کر راجستھان کے وزیر اعظم، وزیر تعلیم اور ڈائرکٹر تعلیمات سے ملاقات کی اور راجستھان کے اسکولوں میں اردو کو نظر انداز کئے جانے کی شکایات ان کے سامنے رکھیں۔ ملاقات میں سید الطاف احمد خیری صاحب صدر راجستھان اردو کانفرنس اور مولوی احترام الدین شاغل سکریٹری بھی مولانا مرحوم کے ساتھ تھے۔

۱۵ فروری ۱۹۵۸ء کو دہلی میں کل ہند اردو کانفرنس ڈاکٹر تاراچند کی صدارت میں منعقد ہوئی جس کا افتتاح وزیر اعظم ہند مسٹر نہرو نے کیا اور امام الہند مولانا ابوالکلام آزادؒ نے اپنی زندگی کی آخری تقریر بھی یہیں ارشاد فرمائی۔ کانفرنس کے اہتمام و انصرام کے ذمہ دار اعلیٰ اور صدر مجلس استقبالیہ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب

ہی تھے۔ اور بحیثیت صدر استقبالیہ حضرت مولانا مرحوم نے جو خطبہ اس کانفرنس میں پڑھا تھا۔ وہ بلا مبالغہ اردو تحریک کی ایک اہم تاریخ کہا جا سکتا ہے۔ کانفرنس کے بعد ۲۹ اپریل ۵۴ء کو نئی دہلی میں انجمن ترقی اردو کا وفد دوسری بار صدر جمہوریہ ہند سے ملا۔ اس میں بھی دوسرے عمائدین تحریک کے ساتھ حضرت مولانا پیش پیش تھے۔ اُردو کے سلسلہ میں مجاہد ملتؒ کی مسلسل کاوش و دلسوزی کا آخری نقش وہ مکتوب ہے جو انھوں نے اپنے مرض الموت کے دوران جب کہ وہ میڈیسن (امریکہ) میں زیر علاج تھے، بستر علالت سے یو۔پی کے چیف منسٹر شری سی۔ بی گپتا کو اور اس کی نقل وزیر اعظم پنڈت جواہرلال نہرو کو بھیجی اور جس میں یو۔پی کے سہ لسانی فارمولے میں اردو کو نظرانداز کرنے پر پُرزور احتجاج کے ساتھ ساتھ یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ مجوزہ فارمولے میں جس طرح جنوبی ہند تک کی زبانوں کے لئے گنجائش رکھی گئی ہے، غریب اردو کے لئے بھی کچھ رحم دلی اور انصاف پسندی کا ثبوت دیا جائے۔

وزیر اعظم ہند پنڈت نہرو نے حضرت مولانا کو اپنا جواب امریکہ بھیجتے ہوئے ان کی رائے سے پورا اتفاق کیا اور لکھا کہ میں چیف منسٹر یو۔پی کو بھی ساتھ ہی خط لکھ رہا ہوں۔

بعض تعلیمی اداروں کی غلط روش، نصابی کتابوں اور مسلم آزار تحریروں کا مسئلہ

مجاہد ملتؒ کے بعض بصیرت افروز مکاتیب

۴۷ء کے بعد خاص طور پر مسلمانان ہند کے لئے جو حوادث زیادہ سر اٹھاتے رہے، ان ہی میں ایک اہم مسئلہ جو کبھی غیر مسلم مصنفین کی ناواقفیت اور کبھی فرقہ وارانہ تنگ دلی کی بدولت رونما ہوتا رہا، وہ توہین آمیز اور غلط اور مسلم آزار تحریریں تھیں جو آئے دن اخبارات و رسائل اور پبلک لٹریچر میں بھی شائع ہوتی رہیں اور جن سے ملک کے مختلف حصوں میں تعلیمی نصاب کے صفحات بھی داغ دار ہوتے رہیں۔

مثلاً "دھرم اتہاس کی روپ ریکھا"، جو ۵۱ء میں یو۔پی کے نصاب تعلیم میں شریک کی گئی "فلم انڈیا بمبئی" اور قومی مرچیاں کلکتہ، کے بعض شمارے جو اپریل مئی ۵۲ء میں شائع ہوئے "امرت پتریکا الہ آباد" کا ایک شمارہ جولائی ۵۲ء کا پائنیر لکھنؤ۔ سو تنتر بھارت۔ جنوری ۵۶ء

ودیا بھون بمبئی کی ایک بدنام کتاب "ریلیجس لیڈرز"، جو اگست ۵۶ء میں سامنے آئی۔ ان کے علاوہ دسیوں نصابی کتابیں جن کی فہرست پیش کرنا یہاں غیر ضروری ہے۔

ان کتابوں، رسالوں اور اخبارات میں اکثر و بیشتر ایسے مضامین شائع ہوئے جن میں ذات اقدس سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اور اصحاب کرام یا اسلامی عقائد و نظریات کی توہین و تضحیک تھی اور مسلمانوں کے مذہبی جذبات پر بنداؤ نہ حملے یا ہندوستان کے گزشتہ مسلم فرماں رواؤں کا اشتعال انگیز مذاق اڑایا گیا تھا۔ وجہ اعتراض نصابی کتابوں میں ایسے اجزا بھی شامل ہوتے تھے اور ساتھ ہی ایسے اسباق بھی جو معصوم بچوں کو زبردستی ان کے اپنے مذہب کے برخلاف، دوسرے مذہب کی تلقین کریں۔

اس قسم کی تمام تحریریں نہ صرف یہ کہ مسلمانان ہند کے لئے ناقابل برداشت اور اشتعال انگیز تھیں، بلکہ خود دستور ہند اور سیکولرزم کے تقاضوں کو بھی پامال کرتی تھیں۔

مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے پچھلے پندرہ برس میں ایسی سینکڑوں نصابی کتابوں پر برملا احتجاج کیا۔ ریاستی اور مرکزی وزراء کو پُرزور خطوط لکھے، وقتاً فوقتاً ان سے خود ملاقات کر کے توجہ دلائی پارلیمنٹ میں تقریریں کیں (چنانچہ مولانا مرحوم کی اس سلسلہ کی بعض پارلیمنٹری تقریریں اسی "مجاہد ملت نمبر" میں آپ کے مطالعہ میں آئیں گی) اور آخر تک ان کا تعاقب کیا۔ بالآخر اکثر و بیشتر وہ کتابیں یا تو نصاب سے خارج کی گئیں یا ان کی اصلاح کرائی گئی۔

جہاں تک اخبارات و رسائل کے ایسے توہین آمیز مضامین کا تعلق ہے حضرت مولاناؒ نے بڑی پامردی کے ساتھ ان کا نوٹس لیا۔ ملک گیر پیمانہ پر احتجاج

کی صفیں آراستہ کیں، حکومت ہند کے ذمہ داروں کو خطوط لکھ کر توجہ دلائی، اس سلسلہ میں کئی بار وزیر اعظم محترم پنڈت جواہر لال نہرو تک سے ملے اور ہر موقعہ پر مسلمانان ہند کے جذبات کی پوری پوری ترجمانی کی۔

کیرالا تعلیمی بل — شروع ۱۹۵۸ء میں ریاست کیرالا نے ایک تعلیمی بل منظور کیا جس کی دفعات اقلیتوں کو اپنے مذہبی تعلیم کے حق سے محروم کرتی تھیں۔ مجاہد ملت رح نے جمعیۃ علماء ہند کی جانب سے اس بل کو سپریم کورٹ آف انڈیا میں چیلنج کرایا، دہلی کے مشہور بیرسٹر مسٹر نورالدین احمد نے اس پر بحث کی اور بالآخر سپریم کورٹ نے اس بل کو دستور ہند کے خلاف قرار دیتے ہوئے ناجائز ٹھکیر کردیا۔

اسکولوں میں گاندھی جی کی پرارتھنا اور مسلم طلبہ

۲ اپریل کو ہیڈ ماسٹر صاحب ہائی اسکول پیپری ضلع مظفر پور (بہار) کا ایک خط مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کو موصول ہوا جس میں سوال کیا گیا تھا کہ گاندھی جی کی مشہور پرارتھنا اگر مسلمان بچے سرکاری اسکولوں میں صبح کے وقت گائیں تو کیا ان کے مذہبی نقطۂ نظر سے اس میں کوئی بات قابل اعتراض ہے۔ ایسے ہی سوالات بعض دوسرے اسکولوں کی طرف سے بھی کئے گئے۔ بلکہ بعض جگہ یہ شکایت بھی تھی کہ مسلمان بچوں کو مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ اس پرارتھنا میں شریک ہوں اگرچہ کسی پرارتھنا یا دعائیہ گیت کے متعلق مسلمانوں کے مذہبی نقطۂ نظر اور جواز و عدم جواز کا اظہار چنداں دشوار نہیں۔ تاہم اس پرارتھنا کے ساتھ گاندھی جی کے نام کی نسبت نے معاملہ کی ایک خاص اہمیت اور نزاکت پیدا کردی تھی۔ بہرحال حضرت مولانا نے اس اہم سوال کا بہت واضح، جرأت مندانہ اور بصیرت افروز جواب تحریر فرمایا۔

ہیڈ ماسٹر صاحب پیپری ہائی اسکول کا خط

"پیارے مولانا صاحب! گاندھی جی کی پرارتھنا جو ذیل میں درج ہے، ہمارے ہوسٹل میں گائی جاتی ہے، پہلے ہندو مسلمان بچے مل کر اس کو گاتے تھے۔ لیکن اب مسلمان بچوں نے اپنی مذہبی بنیاد پر اعتراض شروع کردیا ہے۔ اس لئے آپ کی رائے معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ کیا واقعی اس میں اسلامی نقطۂ نظر سے کوئی بات قابل اعتراض ہے۔

پرارتھنا

رگھوپتی راگھو راجہ رام — پتت پاون سیتا رام
پتت پاون سیتارام — ایشور اللہ تیرے نام
بھج پیارے تو سیتا رام — سب کو سمتی دے بھگوان
رگھوپتی راگھو راجہ رام — پتت پاون سیتا رام"

حضرت مولانا رح کا جواب

"محترمی! آپ کا خط ملا، شکریہ۔ گاندھی جی کا یہ مشہور گیت اسلام کے عقیدہ توحید کے بالکل خلاف ہے اس لئے کہ اسلام کا سب سے بڑا اور بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ اللہ، ایشور، خدا اس ذات کا نام ہے جو نہ کسی کا باپ ہے، نہ کسی کی اولاد، نہ کسی کا شوہر، نہ بیوی، وہ ان تمام رشتوں سے پاک ہے۔ اس کا کوئی ہمسر اور برابر نہیں۔ (سورۂ اخلاص۔ قرآن حکیم)

جس گیت میں رام، ایشور اور اللہ کو ایک ہی بتایا جارہا ہے اور ساتھ ہی رام کو سیتا جی کا پتی، اور سیتا جی کو رام کی دھرم پتنی کہا جارہا ہے تو ظاہر بات ہے کہ اسلام اس کو قبول نہیں کرسکتا۔ مسلمان بچے اگر پہلے اس پر اعتراض نہ کرتے تھے تو لکن ہے کہ وہ اس حقیقت سے ناواقف ہوں، لیکن اب اگر واقف ہونے کے بعد ان کو اعتراض ہے تو بجا ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ ان کو اس گیت کے گانے پر مجبور کیا جائے اس لئے کہ ایک سیکولر اسٹیٹ میں یہ کبھی جائز نہیں ہوسکتا۔

آپ کو غلط فہمی نہ ہو۔ گاندھی جی نے اس گیت کو کیوں پسند کیا۔ اور اگر یہ پسند کیا تو مسلمان جو گاندھی جی کو اپنا پیارا اور محبوب لیڈر مانتے ہیں ان کی اس پر ارتھنا کو کیوں پسند نہیں کرتے۔ اس لئے کہ گاندھی جی خود اس اصول کے زبردست حامی تھے کہ کسی کے مذہبی عقائد کو دوسروں پر زبردستی نہیں ٹھونسا جا سکتا اور صحیح اصول بھی یہی ہے۔

رہی یہ بات کہ خود گاندھی جی اس پرارتھنا میں دونوں باتوں میں کیوں کر مطابقت کرتے تھے اور اس کو عقیدۂ توحید کے خلاف کیوں نہیں سمجھتے تھے۔ یہ گاندھی جی ہی جان سکتے تھے ہم اس کے لئے مجبور نہیں ہیں۔

اس لئے یہ ذہن ہرگز نہیں بننا چاہئے۔ کہ ہر وہ بات جو گاندھی جی نے اپنے لئے پسند کی ہر مذہب والا اس کو اپنے لئے ضرور روا رکھے، خواہ اس کے مذہب کے بنیادی اصول اس کے خلاف ہی کیوں نہ ہوں۔ والسلام

آپ کا مخلص —— محمد حفظ الرحمٰن کان اللہ لہٗ "

گاندھی جی اور دوسرے لیڈروں کی تصاویر کا مسئلہ

مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کا حقیقت افروز مکتوب

ذیل میں مجاہد ملت رحمۃ اللہ علیہ کا ایک روشن مکتوب جو آپ نے ۱۲ اکتوبر ۵۸ء کو مسٹر عزیز الٰہی کے جواب میں ارسال فرمایا تھا درج کیا جا رہا ہے۔

مکرم و محترم عزیز الٰہی صاحب السلام علیکم ورحمۃ اللہ برکاتہ مزاج گرامی

آپ کا خط ملا۔ آپ نے اپنے خط میں دو سوال کئے ہیں، جو یہ ہیں۔

(۱) کیا یہ صحیح ہے کہ مذہب اسلام کی رو سے کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ کسی بھی تصویر یا مجسمہ پر ہار پھول وغیرہ چڑھائے۔ یہاں تک کہ مسلمانوں کے مذہبی بزرگوں اور پیغمبروں کی تصویروں اور مجسموں پر بھی ہار پھول چڑھانا اسلامی شریعت کی رو سے قطعاً گناہ اور ناجائز ہے۔

(۲) کیا ملک کا سیکولر آئین یا کانگریس کا دستور کسی شخص کے لئے یہ لازم قرار دیتا ہے کہ وہ ملک و وطن کے کسی لیڈر کی تصویر یا مجسمہ پر ضرور ہار پھول چڑھائے اور جو شخص ایسا کرنے سے اپنے مذہب کی پابندی کرتے ہوئے انکار کر دے اس کو مجرم سمجھا جائے۔ آپ نے اس ضمن میں مسٹر معین الحق وزیر آسام کے جس واقعہ کا تذکرہ کیا ہے اور جو سوالات تحریر فرمائے ہیں ان کا جواب درج ذیل ہے۔

(۱) مسٹر معین الحق وزیر آسام نے جو عمل کیا وہ اسلامی بنیادی عقیدہ کے اعتبار سے قابل ستائش ہے۔ میں ان کو اس جرأت حق کی داد دیتا ہوں۔ اسلام کے عقیدۂ توحید کا تقاضہ ہے کہ کوئی عمل مسلمان ایسا نہ کرے جس سے اس کے بنیادی عقیدہ پر بالواسطہ یا بلاواسطہ زد پڑتی ہو۔ اسلام نے اسی وجہ سے نبی اور پیغمبر کے ساتھ بھی اس طرح کے عمل کی اجازت نہیں دی جس سے پرستش کا شائبہ یا وہم بھی پیدا ہوتا ہو۔ اسلام نے اسی بنا پر نبیوں اور پیغمبروں حتیٰ کہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی تصویر بنانے کو حرام قرار دیا ہے اور اسلام کی اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین تسلیم کیا ہے۔ اس لئے گاندھی جی کی عظیم شخصیت کی عظمت اپنی جگہ قابل تسلیم رہتے ہوئے بھی کسی مسلمان کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ گاندھی جی کی تصویر یا مجسمے یا کسی بھی مسلم یا غیر مسلم رہنما کی تصویر یا مجسمے پر ہار پھول چڑھائے۔

(۲) ہماری قومی حکومت کسی خاص مذہبی عقیدے کی حکومت نہیں ہے، بلکہ ملک کے عوام کی ملی جلی جمہوری حکومت ہے جس کو ہم سیکولر کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ سیکولر اسٹیٹ کا جو بہترین دستور بنایا گیا ہے۔ اس میں مذہب کی آزادی کو بنیادی حقوق میں اہم ترین حق تسلیم کیا گیا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص کو اس کے اپنے عقیدے کے مطابق مذہبی آزادی حاصل ہو۔ یعنی کوئی شخصیت یا کوئی

کمیونٹی دوسروں سے اپنے مذہبی عقائد و اعمال زبردستی منوانے کی مجاز نہ ہوگی
پس آسام صوبہ کانگریس کمیٹی کے بعض ارکان نے اگر مسٹر معین الحق کے اس عمل پر انڈین نیشنل کانگریس کے پریذیڈنٹ سے الیکشن لینے کی درخواست کی ہے تو ان کا یہ فعل قطعاً باطل اور دستور کی کھلی خلاف ورزی ہے۔ ایک مسلمان ملک و وطن کے سب سے بڑے شخص اور موجودہ دنیا کی عظیم شخصیت مہاتما گاندھی کی ہر طرح کی عزت اور عظمت کرتا ہے لیکن اپنے اسلامی عقیدہ کے خلاف کسی فعل یا عمل پر ہرگز ہرگز مجبور نہیں کیا جا سکتا اور نہ اس سے گاندھی جی کی توہین لازم آتی ہے۔ مسٹر معین الحق کا قومی جھنڈے کا لہرانا خود اس کی دلیل ہے کہ جہاں تک وطن اور ملک کی محبت کا تعلق ہے اور ملک کی آزادی اور آزادی دلانے والے کی شخصی عظمت کا تعلق ہے مسٹر معین الحق کے دل میں نہ دوسرے محبان وطن کے مقابلہ میں کسی سے کم نہیں ہے اس لئے مسٹر معین الحق کا طرز عمل سرتا سر حق بجانب ہے

میں نے اس سلسلہ میں محترم شری ڈھیبر بھائی صدر انڈین نیشنل کانگریس کو بھی خط لکھا ہے۔

محمد حفظ الرحمٰن، ناظم عمومی جمعیۃ علماء ہند "

پردہ نشین خواتین کو سرکاری ملازمت میں بے پردگی پر مجبور نہیں کیا جا سکتا

بہار کی بعض شکایات پر حضرت مجاہد ملتؒ کا نوٹس اور حکومت کا جواب

مارچ ۱۹۵۶ء میں حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کو ریاست بہار کے بعض علاقوں بالخصوص ضلع چمپارن سے یہ شکایات موصول ہوئی تھیں کہ محکمہ تعلیم کی جانب سے پردہ نشین مسلمان استانیوں اور انسپکٹریس وغیرہ کو جو سرکاری ملازم ہیں محکمہ کی جانب سے مجبور کیا جا رہا ہے کہ وہ پردہ چھوڑ دیں یا سروس سے دست بردار ہو جائیں۔ ممکن ہے ملک کے کسی دوسرے حصہ میں بھی کہیں کوئی ایسی شکایت درپیش ہو۔ بہرحال مولانا محترم نے اپنے خصوصی مراسلے کے ذریعہ وزیر اعلیٰ بہار اور وزیر تعلیم بہار کی توجہ اس افسوسناک شکایت پر مبذول کرائی اور لکھا:

"میں ان شکایات کو دیکھ کر حیران ہوں کہ اگر واقعتہً حکومت بہار نے کچھ ایسے احکام جاری کئے ہیں تو قانوناً وہ کہاں تک جائز اور قابل برداشت ہو سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ دستور ہند اور بنیادی حقوق کی دفعات ایسے احکام کو ہرگز گوارا نہیں کر سکتیں میں چاہتا ہوں کہ ایسے غلط احکام کو اگر واقعتہً (وہ جاری کئے گئے ہیں) دستور کی روشنی میں چیلنج کروں۔ براہ کرم آپ مجھے اپنے ذمہ دارانہ اور اطمینان بخش جواب سے مطلع فرمائیں میں منتظر رہوں گا"

وزیر اعلیٰ بہار شری ایس۔ کے سنہا نے مولانا محترم کو اس سلسلہ میں جو جواب بھیجا وہ بہت صاف تھا جو ایسے امور پر سرکاری موقف کو برملا واضح کرتا تھا ذیل میں اس کا ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے۔

"پٹنہ۔ مارچ ۱۹۵۶ء۔ ڈی او نمبر ۳۸۸

مائی ڈیر مولانا صاحب۔ آپ کے شکایت نامے پر میں نے ایک مکمل انکوائری کرائی ہے اور میں مطمئن ہوں کہ جو شکایت آپ تک پہنچائی گئی وہ سراسر بے بنیاد اور غلط ہے اس لئے کہ میری حکومت کی ہمیشہ یہ پالیسی رہی ہے کہ سابق دستور اور ہدایات کو جہاں تک ممکن ہو سکے نباہا جائے اور ان میں کوئی مداخلت نہ کی جائے۔ چنانچہ مسلم خواتین کو خواہ وہ استانیاں ہوں، طالبات ہوں یا گورنمنٹ کی کسی دوسری سروس میں ہوں، بے پردگی پر مجبور کرنے اور پردہ سے دست بردار ہونے کا کوئی سوال ہی نہیں ہو سکتا۔

آپ کا مخلص (دستخط ایس۔ کے سنہا)

حیدرآباد کی تباہی اور اس کے بعد ـــ مجاہد ملت کا دورہ

تقسیم ہند کے عواقب میں دہلی، پنجاب، الور، بھرت پور اور اجمیر کے بعد جہاں مسلم اقلیت کو ہولناک تباہی سے گزرنا پڑا، وہ ریاست حیدرآباد تھی۔ ستمبر ۱۹۴۸ء میں حیدرآباد پر پولیس ایکشن ہوا۔ اور اس کا پورا خمیازہ خاص شہر حیدرآباد کو چھوڑ کر ریاست کے وسیع علاقہ اور اضلاع و مفصلات کی مسلم اقلیت کو بھگتنا پڑا۔ تباہی اور بربادی کی جو گرم بازاری [illegible] ریاست میں رونما ہوئی اس کی دہشت نے باقی ماندہ مسلم آبادی کو زندہ درگور کر دیا تھا۔ شمالی ہند کی طرح جنوبی ہند کی اس دم بخود اور نیم جان آبادی کو بھی جس مجاہد وقت کی دستگیری نے نئے سرے سے زندگی کی شاہراہ دکھائی وہ حضرت مولانا مرحوم کی ذات گرامی تھی۔

دردناک حوادث اور پیش آمدہ واقعات سے مضطرب ہو کر مجاہد ملتؒ نے دسمبر ۱۹۴۸ء میں جمعیۃ علماء کا سب سے پہلا وفد حیدرآباد بھیجا جس میں مولانا عبداللہ مصری اور پنڈت سندرلال شریک تھے۔ ارکان وفد نے حیدرآباد کا دورہ کیا اور اپنے مشاہدات کی رپورٹ مجاہد ملتؒ کے ذریعہ پنڈت نہرو، مولانا آزاد اور سردار پٹیل کے سامنے رکھی۔ پھر ایک دوسرا وفد ۳ جنوری ۱۹۴۹ء کو بھیجا جس میں مرحوم مولانا بشیر احمد، مولانا نور الدین بہاری، مولانا سید محمد میاں صاحب اور مسٹر سید محمد جعفری شریک تھے۔ تیسرا وفد مولانا محمد اسمٰعیل صاحب سنبھلی اور مقبول جامعی صاحب پر مشتمل فروری ۱۹۴۹ء میں روانہ کیا۔

ان وفود نے ریاست کے اہم علاقوں کا دورہ کیا۔ حالات کو بچشم خود دیکھا، سہمے ہوئے مسلم و غیر مسلم عمائدین سے ملے۔ ان کی ڈھارس بندھائی، ہنگامی مسائل و ضروریات کے ساتھ مسلم اقلیت کے تحفظ اور زندگی کی تدابیر ساتھ لے کر لوٹتے اور دہلی واپس آ کر اصلاح حال کے لئے جدوجہد شروع کی۔

ان ہی دنوں حیدرآباد میں جمعیۃ علماء کی داغ بیل پڑی۔ مولانا عبدالسبحان صاحب، انور خاں صاحب، مسٹر یونس سلیم وکیل اور مولانا حمید الدین قمر اور ان کے رفقاء کرام نے جماعتی زندگی کے پیغام پر سب سے لبیک کہا۔ یہ حضرات بڑے عزم و ہمت کے ساتھ کام کے لئے کھڑے ہوئے اور اس وقت سے کئی برس تک مسلسل دہلی آ آ کر حضرت مجاہد ملتؒ کے ذریعہ حیدرآباد کے حالات کو بہتر بنانے کی جدوجہد کرتے رہے۔

نادار مظلوموں کی امداد، اجڑے ہوئے لوگوں کی آبادکاری، مساجد اور عبادت گاہوں کا تخلیہ اور بحالی، پولیس ایکشن میں کام آ جانے والوں کے لاوارث یتیم اور بیوہ پس ماندگان کی نگہداشت جیسے بیسوں وقتی مسائل کے ساتھ ساتھ دہشت زدہ مسلمانوں میں اطمینان و اعتماد کی فضا پیدا کرنا اور ان کو ملک کے بدلے ہوئے حالات کے ساتھ مربوط کر کے عزت نفس، خودداری اور صحت مند زندگی کی راہ پر لانا، حکومت اور برادران وطن کے حلقوں میں ان کے کھوئے ہوئے اعتماد کو لوٹانا۔ اس وقت سرزمین حیدرآباد پر یہ تمام الجھے ہوئے اور نازک کام جس خوبی تدبیر اور دوراندیشی کے ساتھ انجام پائے آج مسلمانان حیدرآباد کی باوقار شہری زندگی بڑی حد تک ان ہی کوششوں کا ثمرہ اور نتیجہ ہے۔

مرکز میں ان تمام وفود کی سرگرمیوں کا محور اور حکومت ہند تک ان کی رسائی کا وسیلہ حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب ہی تھے۔ حضرت مولاناؒ کی سرپرستی میں مسلسل کوششوں کی بدولت ریاست کے حالات نے بتدریج اصلاح کی شکل اختیار کی۔ جب ہنگامی اور وقتی جدوجہد ایک مرحلہ تک پہنچ پائی تب مجاہد ملتؒ نے بذات خود ۹ اکتوبر ۱۹۴۹ء کو دہلی سے روانہ ہو کر دس روز تک اضلاع و مفصلات حیدرآباد کا دورہ کیا۔ بہت سے معاملات وہیں ملٹری گورنر مسٹر ویلوڈی اور ریاستی چیف سکریٹری مسٹر جین سے مل کر حل کرائے۔ جو کام مرکز کے تھے۔ ان کے لئے واپسی کے بعد مرکز میں مسلسل جدوجہد فرمائی۔ مولانا لقاء اللہ صاحب عثمانی پانی پتی اس دورہ میں حضرت مجاہد ملت رح کے ہمراہ تھے۔

سال بھر کی ان تھکا دینے والی کوششوں کے بعد حضرت مولانا کے اس دورہ نے حیدرآباد کی فضا پر جو گہرے اور مفید اثرات ڈالے اور ان کی حیات بخش تقریروں نے حیدرآباد کو جرأت و استقامت کا جو پیغام دیا اس کی شہادت کے طور پر ہم روزنامہ شعیب حیدرآباد اور ہمارا اقدام حیدرآباد کے بعض اقتباس ذیل میں پیش کرتے ہیں جو اخبارات مذکور نے ان ہی دنوں شائع کئے تھے۔

معاصر شعیب حیدرآباد کا مقالہ افتتاحیہ

"جمعیۃ علماء ہند کے ناظم اعلیٰ حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی ان دنوں حیدرآباد میں تشریف فرما ہیں اور اضلاع کا دورہ کر رہے ہیں

تاکہ مسلمانانِ حیدرآباد کے حقیقی دکھ درد کو معلوم کرسکیں اور اس کا علاج سوچیں۔

مولانا حفظ الرحمٰن نے ہندوستان اور مسلمانوں کی جو خدمات انجام دی ہیں اگر ان کا شمار کیا جائے تو شاید ایک دفتر بن جائے۔ یہ شخص خلوص اور اصول پروری کا پیکر ہے اور ایثار و قربانی کا مجسمہ۔ آپ وطن کی خدمت میں بھی صفِ اول میں رہے اور مسلمانوں کی خدمت میں بھی اوّل درجہ پر۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ آپ میں وطن پروری کا جذبہ زیادہ ہے یا مسلم پروری کا۔ ایک سچے مسلمان کو کیسا ہونا چاہئے۔ مولانا حفظ الرحمٰن اس کے مجسم نمونہ ہیں اور ایک سچا ہندوستانی کیسا ہونا چاہئے۔ اس کا نمونہ بھی آپ کی ذات ہے۔ آپ بیک وقت ایک سپاہی۔ ایک والینٹر۔ ایک رہنما ایک مدبر۔ ایک جادو بیان مقرر سبھی کچھ ہیں۔ اور تمام خوبیوں کے بعد جو سب سے بڑی خوبی ہے وہ آپ کی کسر نفسی اور وہ بے غرضی اور بے لوثی ہے۔ مولانا قومی کاموں میں اس طرح مصروف رہتے ہیں کہ کبھی اپنے متعلق انھیں سوچنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ جن لوگوں کو آپ کے ساتھ قومی کام کرنے کا شرف حاصل ہوا ہے، انھوں نے دیکھا ہے کہ اس شخص کو سوائے کام کے اور کوئی دھن ہی نہیں۔ مولانا کو جس شخص نے دہلی کے فسادات کے زمانہ میں کام کرتے دیکھا ہے اسے یقیناً اس شخص کی عظمت اور خلوص کا قائل ہونا پڑتا ہے اور ہم نہایت احتیاط کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر دہلی میں مولانا حفظ الرحمٰن کی ذات گرامی نہ ہوتی تو آج وہاں ایک مسلمان بھی زندہ نہ بچتا۔

اس وقت جمعیۃ علماء ہند کی روحِ رواں یہی مولانا کی ذات ہے اور مولانا حفظ الرحمٰن اس وقت جمعیۃ علماء کا سب سے بڑا سرمایہ اور اثاثہ ہیں۔

بہرحال حیدرآباد کے مسلمانوں کی خوش نصیبی ہے کہ مولانا یہاں تشریف لے آئے ہیں اور ہمیں توقع ہے کہ حیدرآباد کے مسلمان اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنا سیاسی لائحۂ عمل مرتب کرنے میں مولانا کی بصیرت سے فائدہ اٹھائیں گے۔"

روزانہ ہمارا اقدام کا مقالہ

"آج سے دو سو سال پہلے حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی نے ہندوستان کو مستحکم، خوش حالی اور بیرونی تسلط سے کامل آزاد سلطنت بنانے کے لئے اپنی مجاہدانہ مساعی سے وہ آگ روشن کی تھی جس نے ایک طرف بے ہمتی اور خوف کی تاریکی کو کافور کر کے لاکھوں ہندوستانیوں کے دل میں آزادی کی شمع فروزاں کی تو دوسری طرف سرفروشوں کا ایک ایسا گروہ پیدا کیا جو آزادیٔ ہند کے لئے بلاخانہ سلاسل کا مسکراتے ہوئے استقبال کرتے ہیں۔ اس راستہ میں زہرِ غم کے ہر پیالے کو قندِ دنیات کا شربت سمجھ کر پیتے رہے، بجلیوں سے کھیلتے اور موت سے ٹکراتے رہے۔ نہ سرحد کی صحرا نوردی ان کے عزائم میں ضعف پیدا کر سکی نہ مالٹا میں قیدِ فرنگ کی ہوش ربا تکلیفیں ان کے جذبۂ آزادی کو کچل سکیں۔ اگر کابل کی گلیوں میں عبید اللہ نے اسی آزادی کا ترانہ سنایا تھا تو انڈمان میں کالے پانی کی جانگسل تکلیف برداشت کرتے ہوئے فضلِ حق خیرآبادی نے دنیا سے کوچ کرتے ہوئے اسی نعرہ سے اس ہولناک ویرانہ میں زندگی کے نقش و نگار قائم کئے۔ اسی قافلہ کے ایک اولوالعزم رہبر اور اسی فوج کے ایک نڈر سپاہی یعنی مولانا حفظ الرحمٰن ناظم اعلیٰ جمعیۃ علماء ہند کے زندگی کے چند گوشے ان کی تشریف آوری کی خبر سن کر بے اختیار سامنے آگئے ہیں، جو منزلِ آزادی کے مسافر کے لئے سامانِ شباب اور مایوسیوں کے ماحول پر قابو پالینے کا عملی نسخہ فراہم کرتے ہیں۔

مجسمۂ کردار

مولانا حفظ الرحمٰن کی زندگی کی ہر ادا کا اگر تجزیہ کیا جائے تو بہ آسانی اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس کے ہر گوشے پر سچی کردار کا ایک خوش گوار اور جنون طراز جذبہ ابرِ نو بہار کی طرح چھایا ہوا ہے۔ ان کا پیکر خدا پرستی اور خدمتِ خلق کے ولولہ انگیز خمیر سے اس طرح بنایا گیا ہے کہ وہ سچائی کو منوانے کے لئے کسی بڑی سے بڑی قوت سے کبھی مرعوب نہیں ہوتے اور انتہائی معصیت کے وقت بھی جبکہ قیامت پر قیامت ٹوٹ رہی ہو، حادثات خوفناک اژدہے کی صورت پھنکار رہے ہوں، خوف و سراسیمگی کی وجہ سے کلیجے منہ کو آرہے ہوں، کسی طرف امید کی کوئی کرن نظر نہ آرہی ہو۔ ایسی پرخطر گھڑی میں بھی موصوف کا دل امید کی ایک ایسی جلوہ گاہ معلوم ہوتا ہے جس میں مایوسی کی ہر تاریکی پہنچ کر روشن مستقبل کی بشارت دیتی ہے۔

چنانچہ تقسیم ہند کے بعد دلی میں قیامت خیز قتل و غارت گری کا وہ خونین ہنگامہ جس نے ہزاروں گھروں کا چراغ گل کر دیا۔ گلی کوچے انسانی خون سے لالہ زار بن چکے تھے۔ ہر طرف موت کی حکمرانی تھی۔ فرقہ پرستی کا جنون جنگل کے درندوں کو شرمندہ کر رہا تھا۔ ایسی حالت میں مولانا ہی کی ذات تھی جو موت و تباہی کی اس خوفناک جنگ میں ہر خطرہ سے بے پرواہ ہو کر دیوانہ وار میدانِ عمل میں کود پڑی اور مظلوم انسانیت کی خدمت کے لئے وہ نقش قائم کر گئی جس پر جواں مردی ناز کرتی رہے گی۔

اور انسانیت فخر کرتی رہے گی۔

پاسبانی

خدمت خلق کا راستہ ایک ایسا خارستان پُرخطر ہے کہ جس میں راہی کو برہنہ پا دوڑایا جاتا ہے۔ قدم قدم پر غیروں ہی کی طرف سے نہیں، بلکہ اپنوں کی طرف سے بھی رکاوٹیں پیدا کی جاتی ہیں، یہی نہیں بلکہ ان کے جسم میں طعنہ و تشنیع کے تیر و نشتر چبھا کر ان کے جذبہ کو پرکھا جاتا ہے اور کبھی کبھی اس راہ میں اپنے خون کے سمندر میں خود ہی غوطہ لگانے کا تقاضہ کیا جاتا ہے۔ اس منزل کے یہ ایسے راہ و رسم ہیں جس میں آزمائش ناگزیر ہے، اور یہ آزمائش بالآخر کامیاب ہونے والوں کو حیات جاوید کی بشارت دیتی ہے۔ اس روشنی میں جب ہم مولانا کی سیاسی زندگی کا مطالعہ کرتے ہیں تو موصوف کے اس حوصلہ کی بلندی پر سخت حیرت ہوتی ہے کہ تقسیم ہند سے پہلے ایک فرقہ پرستی کے خلاف اعلان جنگ کے بعد وہ کون کون سی ذلتیں تھیں جو ان پر لادی نہ گئی ہوں۔ اور آزادی ہند کے بعد دوسری فرقہ پرستی کے خلاف مورچہ قائم کرنے کی وجہ سے وہ کون کون سے بدترین القاب اور ننگی گالیاں ہیں جو ان کے لئے استعمال نہ کی گئی ہوں مگر ہر دور کی زندگی کو ہر طرف سے الٹ پلٹ کر دیکھ ڈالئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کیسی مٹی کے بنے ہوئے پتلے ہیں جو ان تمام سامانِ ذلت کو اپنے لئے سب سے بڑی عزت سمجھتے ہوئے ایک والہانہ جذبہ کے ساتھ ایک ہی دُھن اور ایک ہی سودے کو سر میں لئے ہوئے اپنے نصب العین کی طرف بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔

اسی والہانہ جذبہ نے مسلمانانِ ہند کی پاسبانی کے لئے ایسی حالت میں جب کہ شدید انقلابیہ کے جابر جھٹکوں نے مسلمانوں کی زندگی کو بری طرح بیدار کر دیا ہے اور وہ ایک خطرناک قسم کی ذہنی طوائف الملوکی کا شکار ہو چکے ہیں۔ موصوف کے درد مند دل میں تڑپ پیدا کی ہے جو صبح و شام آپ کو بے چین رکھتی ہے۔

ناخدائی

آزادی کے اس پانچ سال میں مسلمانوں کے تعلق سے جتنے تباہ کن مخمصے پیدا کئے گئے ان کو موصوف نے حسن و خوبی سے حل کیا ہے اس کی صحیح داد مابعد انقلاب، مورخ کا قلم ہی دے سکتا ہے۔ کسٹوڈین کے حیات سوز ہنگاموں، فرقہ پرستوں کے لرزہ انگیز منصوبوں اور اسلامی معابد و آثار کو برباد کرنے والی صبر سوز تحریکوں کو جس سعیٔ پیہم اور کاوش روز و شب کے بعد مولانا کی ہستی نے کہیں ختم کرنے اور کہیں اس کو بے اثر کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے اس کی صحیح داد نہیں دی جا سکتی۔ موصوف کی ان مساعی سے جن کا اظہار ان کی زبان یا ذات سے کیا جاتا ہے ان کی تعداد کہیں زیادہ ہے، جہاں آپ اگرچہ خاموش نظر آتے ہیں۔ مگر حکومت کی ذمہ دار شخصیتوں کی زبان سے آپ ہی کے الفاظ اور آپ ہی کا منشا اس طرح گرجتا ہے جیسے کہ آپ ہی کی بے باک اور حقیقت پسند زبان مقرر کے منہ میں بول رہی ہے۔ موصوف کی دوسری بہت سی خصوصیات مثلاً ایک بے باک صحافی، جہتم بالشان مصنف، عمیق نظر اسلامی مورخ، رقابل رشک خطیب، بلند نگاہ مفسر اور اولوالعزم مبصر ہونے کی حقیقت قدرت کی ایسی بخششیں ہیں جن کا خوبصورت اجتماع ایک ہی ذات میں بہت کم دیکھنے میں آیا ہے۔ ان عنوانات پر بحث طویل بحث کی داعی اور فی الحال اس مختصر تعارف نامہ کے حدود سے خارج ہے۔ لہٰذا عقیدت کے ان چند ہی غیر مربوط جملوں کو مولانا کی خدمت میں پیش کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے

خفی گہر روزنامہ ہمارا اقدام حیدرآباد (دکن)

بہرحال مسلمانان حیدرآباد کی نشاۃ ثانیہ اور ان کی فلاح و بہبود کے لئے مجاہد ملتؒ نے تدبیر و چارہ گری کا جو عظیم کردار پیش کیا اس کی مقبولیت اور برملا اعتراف کا پہلا نقش یہ تھا کہ مسلمانان حیدرآباد نے گرم جوشی کے ساتھ مجاہد ملتؒ کو دعوت دی کہ وہ جمعیۃ علماء ہند کا سالانہ اجلاس حیدرآباد میں بلائیں۔ دعوت قبول ہوئی کیونکہ یہ بھی ان کوششوں کے سلسلہ کی ایک موثر کڑی تھی۔ جنوبی ہند کے اطراف میں پہلی بار جمعیۃ علماء ہند کا سالانہ اجلاس ۲۷ تا ۲۹ اپریل ۱۹۵۱ء کو اپنی بے مثال کامیابی کے ساتھ منعقد ہوا جو اپنی شان و شوکت اور عظیم اجتماع و کامیابی کے لحاظ سے مجاہد ملتؒ کے ساتھ مسلمانان حیدرآباد کی عقیدت و شیفتگی کا ایک لازوال ثبوت تھا۔

ہندوستانی افسروں کو دلّی سے جو ہدایات ملیں ان پر سچے جذبے سے عمل کریں

حیدرآباد میں ہندوستانی عہدداروں سے تکلیف پہنچی تو وہ جواب دہ ہوں گے

سقوط ریاست کے بعد اپنے پہلے دورہ میں حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ نے حیدرآباد کے جلسۂ عام میں جو تقریر کی تھی اس کے چند اقتباسات درج ذیل ہیں۔

"میں نے حیدرآباد کے اضلاع، قصبوں، دیہات اور خود حیدرآباد کے بعض مقامات کا دورہ کیا ہے۔ مجھے حیدرآباد کے مسلمانوں کا پورا احساس ہے

میں نے دیکھا کہ دیہات میں بھی ابھی تک پوری طرح حالات اعتدال پر نہیں آئے۔ اور پوری طرح امن قائم نہیں ہوا۔ اب بھی دیہات کے مسلمانوں کو قتل و خون کا خوف ہے ان کی زمینوں پر دوسروں کا قبضہ ہے اور ان کے گھراب بھی کہیں کہیں ویران ہیں۔ میں نے بعض مسجدیں بھی دیکھیں، جنھیں یا تو مندروں میں تبدیل کر دیا گیا ہے یا وہ شہید کر دی گئی ہیں اور ویران ہیں۔ بہت سے لوگ جو بے گناہ ہیں آج بھی جیلوں میں قید ہیں اور ان کے خاندان پریشانیوں میں مبتلا ہیں۔ میں اس وقت نہیں کہہ سکتا کہ اس معاملہ میں کیا خدمت مجھ سے ہو سکتی ہے اور میں دہلی میں کیا کروں گا لیکن یہاں ایک بات میں کہنا چاہتا ہوں۔ انڈین یونین کے ان عہدہ داروں سے جنھیں یہاں حالات سدھارنے اور نظم و نسق سنبھالنے کے لئے متعین کیا گیا ہے وہ حیدرآباد پر قابض نہیں ہیں۔ اگر انڈین یونین کے عہدہ داروں کے ہاتھوں کسی کو یہاں تکلیف پہنچ رہی ہے تو کل انھیں جواب دینا ہوگا، وہ یاد رکھیں کہ نئے ہندوستان میں سرکاری عہدہ دار حاکم نہیں ہیں بلکہ خادم ہیں لہٰذا جو ہدایات انھیں دہلی سے دی گئی ہیں ان پر خدمت کے جذبہ کے ساتھ عمل کریں جن کی زمینیں ہیں انھیں واپس دلائیں۔ مسجدوں کی بازیابی کا انتظام کریں اور جن کی مدد کرنی ہے ان سے غفلت نہ کریں اس طریقہ سے جب وہ دہلی واپس ہوں گے تو سرخرو بھی ہوں گے۔ وہ یاد رکھیں کہ کسی کو تباہ کرنے والا کبھی آباد نہیں ہو سکتا، مجھے مسرت ہے کہ سوامی جی سے مل کر میری بڑی حوصلہ افزائی ہوئی۔ میں سوامی جی سے اس وقت بھی کہوں گا کہ وہ فرقہ پرستوں پر پوری نگرانی کریں۔ میں اس شکایت سے اتفاق نہیں کرتا کہ حیدرآباد اسٹیٹ کانگریس نے مسلمانوں کو اس طریقہ سے دعوت نہیں دی جس طریقے سے دینی چاہئے تھی۔ ان کا سواگت نہیں کیا گیا۔ خود مسلمانوں کا کام ہے کہ وہ تمام رکاوٹوں کی پرواکئے بغیر کانگریس میں گھس جائیں (بعض فرقہ پرست عناصر کو جواب دیتے ہوئے) قومیں غدار نہیں ہوتیں، البتہ افراد غدار ہوتے ہیں اور مسلمانوں سے اس قسم کا مطالبہ کرنا قطعاً غلط ہے کہ وہ اپنی وفاداری کا اعلان کریں "

صدر کانگریس سوامی رامانند تیرتھ نے اپنی افتتاحی تقریر میں کہا کہ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی تقریر نے میرے دل پر بے حد اثر کیا ہے۔ میں نے بڑے بڑے جلسوں میں شرکت کی، بہت سے نیتاؤں کی تقریریں سنیں۔ لیکن پوری زندگی میں شاید ہی کبھی میں نے اتنی اچھی تقریر سنی ہو۔ میں اس موقع پر مسلمانوں کو یقین دلاتا ہوں کہ حیدرآباد اسٹیٹ کانگریس ان تمام شکایات کو دور کرنے کی پوری کوشش کرے گی۔

کسٹوڈین ڈپارٹمنٹ کی بارہ سالہ سرگذشت

مجاہد ملتؒ کی مسلسل جدوجہد

پچھلے بارہ برس میں فرقہ وارانہ جنون اور بدمستیوں نے جس طرح شہری زندگی میں جابجا بدامنی، قتل و غارت، ہنگامہ و فساد بپا کر کے مسلمانان ہند کو وسیع پیمانہ پر پامالی و برباد کیا ہے، اسی طرح قانون تخلیہ کنندگان کی تہرمانی بھی ان کے لئے مسلسل وبال جان بنی رہی ہے۔

حقیقتاً یہ قانون بھی اسی بھیانک ماحول کا ایک ثمر تلخ تھا جس کی بدولت تقسیم ہند کے ساتھ ساتھ ہندوستان و پاکستان کے لاکھوں بے گناہ، اپنی جان بچانے کی خاطر ترک وطن کرنے پر مجبور ہوئے اور انسانی تاریخ نے آبادیوں کے تبادلہ کا حیرت انگیز تماشہ دیکھا۔ قانون تخلیہ کنندگان (ایکوئیٹیز پراپرٹیز) کا منشا صرف یہ تھا کہ تارکین وطن کی چھوڑی ہوئی املاک اور جائدادوں کو حکومت کا ایک محکمہ اپنی تحویل میں لے کر ان کا مناسب بندوبست کرے۔ اسی منشا کی تکمیل کے لئے محکمہ کسٹوڈین کا تقرر ہوا لیکن محکمہ کے اسٹاف اور کارندوں نے اس قانون کو ایک انتقامی اور جنگی ہتھیار کی طرح گھمانا شروع کر دیا اور اپنے حدود سے تجاوز کر کے ہر اس جائداد کو جس کی نسبت مسلمان سے تھی، یہاں تک کہ اوقاف، مساجد اور قبرستانوں تک کو اندھا دھند "نکاسی جائداد" قرار دینا شروع کر دیا اور قانون کے نفاذ میں ایسی دیدہ دلیری اور چابکدستی کا مظاہرہ کیا کہ خود ہندوستان کے شہری مسلمانوں کی لاکھوں بلکہ کروڑوں کی جائدادیں تھوڑے ہی عرصہ میں ایوکوٹی ڈکلیئر کر دی گئیں، اس طرح ہندوستان کے مسلمانوں پر، جو پہلے ہی حالات کی سنگینی اور اقتصادی بدحالی کا شکار تھے، کسٹوڈین ڈپارٹمنٹ کی اس لاقانونیت نے اور بھی زندگی کا دائرہ تنگ کر دیا مسلمانان ہند کی مظلومیت اور بے چارگی کے اس محاذ پر بھی حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ ہی مدافعت کے لئے آگے بڑھے اور اس صورت حال کے ازالہ

ہوتے ہی مولانا مرحوم نے اس کے تدارک اور چارہ گری کی کوششیں شروع کر دیں۔ پھر آنے والے برسوں میں کسٹوڈین ڈپارٹمنٹ کی کارفرمائیوں کے ساتھ ساتھ حضرت مولانا کی اصلاحی سرگرمیاں پوری قوت اور پامردی کے ساتھ آخر تک جاری رہیں۔

اس سلسلہ میں دہلی کے ابتدائی واقعات جب سامنے آئے تو مجاہد ملتؒ نے فوراً ہی وزیر اعظم ہند مسٹر نہرو اور حضرت مولانا آزادؒ کو ان سے آگاہ کیا اور محکمہ مذکور کی غلط روش کی روک تھام کے لئے حکومت ہند کی اعلیٰ سطح پر بھی جدوجہد کی اور قانونی راستہ سے بھی معاملات کی پیروی کے لئے جمعیۃ علماء کی جانب سے ایک قانونی امدادی کمیٹی بنائی جس کے کنوینر مسٹر سلطان یار خاں وکیل بنائے گئے اور دوسرے ماہر قانون دانوں کا تعاون حاصل کیا گیا۔ جمعیۃ کی یہ قانونی امدادی کمیٹی ۴۷ء سے مسلسل چھ سات سال تک کام کرتی رہی اور اس نے کسٹوڈین کی گرفت میں آئے ہوئے ہزارہا مظلوم مسلمانوں کے جن میں بڑی تعداد خود دہلی کے اجڑے ہوئے غریبوں کی تھی، معاملات کی پیروی کا حق ادا کیا۔

اس کے ساتھ ہی جب کسٹوڈین کی غلط کاریوں کا سلسلہ دہلی سے باہر ملک کے دوسرے حصوں میں بھی پھیلنے لگا تو مولانا مرحوم نے وسیع پیمانہ پر اس مصیبت کے انسداد کے لئے جدوجہد شروع کی، چنانچہ یکم ستمبر ۴۹ء کو جمعیۃ علماء ہند کے زیر اہتمام ایک مخصوص میٹنگ بلائی گئی جس میں دوسرے صوبوں کے ذمہ داران جمعیۃ بھی بلائے گئے اور حضرت مولانا آزادؒ کی موجودگی میں ان سب نے اپنے اپنے صوبوں کے واقعات و مشاہدات بیان کئے اور ان تمام واقعات کی روشنی میں ایک میمورنڈم تیار کیا گیا جس میں محکمہ کسٹوڈین کی ہمہ نوع غلط کاریوں پر واقعات کے حوالے دیئے گئے تھے۔ یہ میمورنڈم لے کر مجاہد ملتؒ اور حضرت مولانا احمد سعیدؒ وزیر اعظم ہند پنڈت جواہر لال نہرو اور وزیر بحالیات سے ملے اور یہ مطالبہ کیا کہ اگر واقعی حکومت کا منشا وہی ہے جو یہ محکمہ انجام دے رہا ہے تو ایک واضح اعلان کر کے مسلمانان ہند کو سوچنے سمجھنے کا موقع دیا جائے۔ ورنہ محکمہ مذکور کی غلط کاریوں کو سختی سے روکا جائے۔ اس کوشش کے نتیجہ میں وقتی طور پر حالات میں کچھ اصلاح رونما ہوئی اور متعلقہ آرڈیننس کو قانون کی شکل دیتے ہوئے کچھ ترمیمات عمل میں لائی گئیں کہ محکمہ مذکور کی مطلق العنانی کو روکا جا سکے۔ تاہم اس محکمہ کے کارپرداز جس انتقامی جذبہ کے ساتھ مصروف کار تھے اس نے قانون میں طرح طرح کی موشگافیاں کر کے اپنی من مانی کارروائیوں کے لئے نئی نئی راہیں نکال لیں۔ ادھر مجاہد ملتؒ روزمرہ کے واقعات برابر پنڈت نہرو، مولانا آزاد اور وزیر بحالیات کے نوٹس میں لاتے رہے۔ بہت جلد نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ حکومت ہند کی قطعی پالیسی پر بھی محکمہ کے افسران اعلیٰ نے اپنے حاشیے چڑھانے شروع کر دیئے۔ ایک معاملہ محکمہ مذکور کی اعلیٰ سطحوں تک پہنچ کر بھی جب انصاف اور قانون کے تقاضوں سے بے ربط رہتا اور پھر مجاہد ملتؒ اس کو محترم وزیر اعظم ہند کے علم میں لاتے تو انھیں بھی حیرانی ہوتی۔ محکمہ کسٹوڈین کی اس مطلق العنانی نے یہاں تک طول کھینچا کہ دہلی کے ایک تاجر محمد دین چھنری والا کے کیس میں پوری یونین کیبنٹ نے غور کر کے اپنی واضح پالیسی سے جب کسٹوڈین جنرل آف انڈیا مسٹر اچھرو رام کو مطلع کیا تو انھوں نے کیبنٹ کے فیصلے سے بھی اتفاق نہ کیا اور اس کے خلاف اپنی رائے پر قائم رہے اور بالآخر ۲۰ ستمبر ۵۱ء کو وہ اپنی اس اعلیٰ ذمہ داری سے سبک دوش کر دیئے گئے

مسٹر اچھرو رام کسٹوڈین جنرل نے سبک دوشی کے بعد اخبارات میں بحث چھیڑ کر پاکستان سے آئے ہوئے پناہ گزینوں کے جذبات کو ابھارنا چاہا اور یکم اکتوبر ۵۱ء کو بعض پناہ گزیں ممبروں نے یہ سوال پارلیمنٹ میں پیش کر ہی دیا۔

جس کے جواب میں خود محترم پنڈت نہرو کو حکومت کے موقف پر اپنا وضاحتی بیان پارلیمنٹ میں پیش کرنا پڑا۔

اس تمام سرگزشت سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستان کے شہری مسلمانوں کو کسٹوڈین ڈیپارٹمنٹ کی لاقانونیت سے بچانے کے لئے مجاہد ملتؒ نے کس پامردی اور تسلسل کے ساتھ اعلیٰ سطحوں تک اپنی مؤثر جدوجہد جاری رکھی۔

مرکز میں ان کوششوں کے ساتھ ساتھ مختلف صوبوں سے فرمائشیں موصول ہوئیں تو مولانا مرحوم نے اس قانون کے نشیب و فراز سے باخبر اپنے قانونی مشیروں کو بالخصوص مسٹر نور الدین بیرسٹر، مسٹر محمد احمد ایڈوکیٹ اور مسٹر سلطان یار خاں ایڈوکیٹ کو جے پور، جودھپور، الہ آباد وغیرہ بھیج کر درپیش معاملات میں مدد دی۔ بمبئی کی فرمائش پر حضرت مولانا خود تشریف لے گئے اور جمعیۃ علماء صوبہ بمبئی کے وکلاء کے اجتماع میں حکومت ہند کی پالیسی اور طریق کار کی وضاحت فرمائی۔ ہندوستان بھر کے صوبوں کے ورکر بھی وقتاً فوقتاً دہلی آکر اس بلائے بے درماں کے علاج کے لئے حضرت مجاہد ملتؒ کی ہدایات اور مشورے حاصل کرتے رہتے۔

پھر علاوہ اس کے کہ ۴۹ء سے ۵۶ء تک واقعات اور تجربات کی روشنی میں ہندوستانی مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کے لئے حضرت مولانا کی جدوجہد اور محترم پنڈت نہرو اور مولانا آزادؒ کے توسط سے خود قانون نکاسی جائیداد میں بار بار ضروری تبدیلیاں عمل میں لائی جاتی رہیں۔ جن سیکڑوں بلکہ ہزاروں انفرادی

واقعات میں کسٹوڈین عدالتوں نے کسی نہ کسی بہانہ اپنے غیر منصفانہ فیصلوں پر اصرار جاری رکھا۔ ان کے آخری تدارک اور درستگی کے لئے خود مجاہد ملتؒ نے کئی کئی برس تک وزارتی سطح پر جدوجہد جاری رکھی اور سینکڑوں معاملات کے تجربہ سے حکومت ہند کے ارباب حل وعقد کو بھی جب یقین ہو گیا کہ اس محکمہ کی مطلق العنانی کسی نہ کسی شکل میں جاری ہے تو بالآخر محترم وزیر اعظم پنڈت نہرو نے اپنے پرنسپل پرائیویٹ سکریٹری مسٹر کول، حضرت مولانا اور وزارت بحالیات کے جوائنٹ سکریٹری مسٹر ذتیاگی پر مشتمل ایک کمیٹی مقرر کر دیا جس نے کم وبیش چھ، سات ماہ تک دسیوں ایسے معاملات کو جانچا اور درست کرایا جن میں کسٹوڈین کی اعلیٰ عدالتیں بھی آخر تک غلط فیصلے صادر کرتی رہیں

اس کمیٹی کے بعد بھی وزارتی سطح پر ملک بھر کے ہزاروں انفرادی معاملات کی پیروی اور اصلاح کی جدوجہد حضرت مولاناؒ نے اپنی زندگی کے آخر تک جاری رکھی اور ان ہی کی تنہا ذات اور سرگرمیاں کسٹوڈین کے مارے ہوئے ہندوستانی مسلمانوں کی آخری امیدگاہ بنی رہیں۔ اس سلسلہ کی چندہ سالہ کش مکش اور کارگزاریوں پر خود حضرت مرحوم کا ایک حقیقت افروز بیان اسی مجاہد ملت نمبر کے دوسرے صفحات میں شامل ہے جو انھوں نے موجودہ وزیر بحالیات شری مہرچند کھنہ کے نام ایک کھلے خط کی شکل میں اگست ۱۹۶۱ء میں ارسال فرمایا تھا۔ اس کے مطالعہ سے ناظرین کرام مزید اندازہ فرما سکیں گے۔

اجڑے ہوئے انسانوں کی آبادکاری۔ تارکین وطن کی واپسی

دہلی، پنجاب، الور، بھرت پور، اجمیر وغیرہ میں ۱۹۴۷ء کے قیامت خیز ہنگاموں کے بعد بقیۃ السیف لاکھوں مسلمان جو چھپ چھپا کر کسی نہ کسی طرح اپنی جان بچانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ ان کی کچھ تعداد تو ہندوستان ہی میں قرب وجوار کی محفوظ بستیوں میں منتقل ہو گئی تھی اور کچھ وہ تھے جو اس غضبناک فضا میں کوئی اور راہ نہ پا سکے اور بادل ناخواستہ پاکستان کی طرف جا نکلے۔ پھر جوں ہی حالات کچھ سکون کی طرف آئے، ان بے گناہ مصیبت زدوں نے بڑی تعداد میں واپس ہو کر اپنے گھروں میں آباد ہونا چاہا، خود گاندھی جی دنیا سے جاتے جاتے اس کے لئے بے چین رہے کہ دونوں ملکوں کی اقلیتوں کو اپنے اپنے وطن میں واپسی کا موقع ملنا چاہئے۔

جہاں تک حکومت ہند کا تعلق ہے اس کی بھی طے شدہ پالیسی یہی تھی۔ لیکن عمل کے درجہ میں صورت حال چوں کہ ایسی ہو چکی تھی کہ پاکستان سے آنے والے پناہ گزینوں کے لئے واپسی کا کوئی امکان باقی نہیں رہا تھا اور یہ لوگ ہندوستان کے ان علاقوں سے اجڑے ہوئے مسلمانوں کی جگہ لے چکے تھے اس لئے بڑی الجھن درپیش تھی۔

تاہم گاندھی جی کے جانشینوں اور خاص طور پر وطن کے دور اندیش لیڈر پنڈت نہرو نے مشکلات کے باوجود یہ تہیہ کیا کہ ایسے لوگوں کو پھر بسانے کی ہر ممکن کوشش ہونی چاہئے۔

ان دنوں واپس آنے والے مسلم پناہ گزینوں کی بڑی تعداد علاقہ میوات والور، بھرت پور کی تھی اور سب سے پہلے ان ہی کے بسانے کی کوششیں شروع ہوئیں اور شری ونوبا بھاوے۔ سیتم بھائی۔ ایک نیک نہاد خاتون مس مردولا سارابھائی نے اس مہم کے لئے خود کو بڑی تندہی کے ساتھ وقف کر دیا اور حضرت مجاہد ملتؒ، حضرت مولانا احمد سعید صاحب، مولانا لقاء اللہ صاحب پانی پتی، مولوی محمد ابراہیم میواتی اور دوسرے کارکنوں نے اس خدمت کا بیڑا اٹھایا۔ مرکز میں ان کوششوں کے سرپرست مولانا آزادؒ اور پنڈت جواہر لال نہرو تھے۔ اس طرح قدم قدم دشواریوں اور الجھنوں سے گزرتے ہوئے ماتحت سرکاری عمال کی عام بے دلی اور بے رخی کی فضا میں یہ کوششیں آہستہ آہستہ آگے بڑھیں۔ مجاہد ملتؒ نے بار بار میوات وپنجاب کے سفر کر کے نیچے سے اوپر تک ریاستی اور مرکزی حکام وافسران سے پیہم ملاقاتیں کر کے اور خود ان اجڑے ہوئے انسانوں کو صبر وبرداشت کی بار بار تلقین کرتے ہوئے پوری دل سوزی کے ساتھ اس مہم کو آگے بڑھایا اور پھر بسائے جانے والوں کے لئے زمینیں، مکانات اور ہر طرح کے سروسامان زندگی کے فراہم کرانے میں پیہم جدوجہد کی۔ پھر یہ سلسلہ سال دو سال نہیں، بلکہ مستقل طور پر چلتا ہی رہا۔ بحمداللہ ان ہی ان تھک کوششوں کی بدولت آج میوات میں، اجمیر میں۔ ہماچل پردیش اور پنجاب میں جابجا اجڑے ہوئے مسلمانوں کی آبادیاں نظر آ رہی ہیں کاش پاکستان میں بھی کچھ ایسے ہی مخلص اور جاں باز کارکن سامنے آئے ہوتے اور وہاں بھی پناہ گزینوں کا کچھ حصہ واپس ہوا ہوتا۔

پاکستان جانے والوں کی واپسی

جولائی ۱۹۴۸ء سے ہندوستان اور پاکستان کے درمیان آزادانہ آمد ورفت پر پرمٹ سسٹم کی پابندی عائد ہوئی جس کے قوانین بھی دن بدن بدلتے رہے اور کچھ عرصہ بعد پرمٹ سسٹم کی جگہ پاسپورٹ کا نفاذ ہو گیا ادھر ہنگامی حالات اور مار دھاڑ سے مجبور ہو کر دہلی، یوپی وغیرہ سے پاکستان جانے والے مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد اپنے وطن میں واپس آنے کے لئے مضطرب

رہی ہے۔ سینکڑوں بلکہ ہزاروں خاندان ایسے بھی ہیں جن کے نابالغ بچے دوسرے عزیزوں کے ساتھ افراتفری کے عالم میں پاکستان پہنچ گئے۔ لیکن والدین آج تک ہندوستان ہی میں ہیں یا جوان اولاد یہاں رہ گئی اور ضعیف و بے وسیلہ ماں باپ وہاں پہنچ گئے۔ کوئی خاوند ادھر رہ گیا اور بیوی پاکستان جا نکلی۔ اسی نوعیت کے ہزاروں کیس پرمٹ سسٹم کے نفاذ کے بعد سے ایک تکبرابر سامنے آتے رہے جن کے لئے مستقل طور پر ہندوستان واپس آنے کے سوا کوئی چارہ کار بھی نہیں تھا اور پرمٹ سسٹم کی روز افزوں پابندیاں ان کی راہ میں برابر حائل رہیں۔

مجاہد ملتؒ نے شروع دن سے ایسے ہزاروں کیسوں میں فرداً فرداً کوشش شروع کی۔ حضرت مولانا آزادؒ اور محترم پنڈت نہرو کے توسط سے اصولی طور پر یہ پالیسی طے کر لی گئی کہ ہندوستان کے شہری مسلمانوں کا یہ حق ہے کہ ان کی نابالغ اولاد، بیوی بچے یا خاص خاص صورتوں میں ضعیف ماں باپ اور بے وسیلہ بہن بھائی کسی بھی وجہ سے پاکستان میں رہ گئے ہیں تو اب ان کو مستقل طور پر ہندوستان میں بسنے کی اجازت ملنی چاہئے۔ اس اصول کی روشنی میں پاکستان سے واپس ہونے والے ہزاروں ہزار مسلمانوں کے معاملات کی فرداً فرداً پیروی حضرت مجاہد ملتؒ نے فرمائی۔ جمعیۃ کے دفتر میں یہ شعبہ حاجی حسام الدین صاحب کے سپرد رہا۔ آج ہندوستان میں جہاں تہاں ہزاروں ایسے مسلم افراد آباد ہیں جو پاکستان میں گھر کر رہ گئے تھے اور تنہا مجاہد ملتؒ کی سعی و سفارش کی بدولت انھیں اپنے وطن میں مستقل واپسی کا موقع ملا۔

اس کے ساتھ ہی عارضی طور پر پاکستان جانے آنے والوں کے لئے پرمٹ یا پاسپورٹ سسٹم کی الجھنیں، عورتوں کے فوٹو کی پابندی، انکم ٹیکس سارٹیفیکیٹ کی پابندی یا مقررہ وقت سے زیادہ ٹھہرنے پر دارو گیر کی جو جو دشواریاں وقتاً فوقتاً مسلمانوں کو پیش آتی رہیں ان کے ازالہ کے لئے بھی مولانا مرحوم ہمیشہ پیش پیش رہے۔

اغوا شدہ خواتین کی بازیابی

۱۹۴۷ء کے تاریک دور میں سرزمین ہند و پاکستان پر دوسری تمام حشر سامانیوں سے بڑھ کر جو شرمناک حرکت عمل میں آئی وہ مظلوم و بے کس خواتین کا وسیع پیمانہ پر اغوا اور ان کی پامالی تھی۔

چنانچہ ۱۹۴۷ء کے بعد دوسرے ہنگامی مسائل میں یہ مسئلہ بھی سرفہرست تھا۔ دونوں ملکوں کے سربراہوں نے تاریخ کے اس شرمناک داغ کو دھونے کے لئے باہم ایگریمنٹ کر کے ایسی مغویہ خواتین کی بازیابی کے لئے راہ پیدا کی اور قومی کارکنوں نے اس خدمت کا بیڑہ اٹھایا۔ ہندوستان میں خاص طور پر دہلی، پنجاب اور اور بھرت پور سے بڑی تعداد میں معصوم عورتیں اغوا کی گئیں تھیں اور جب بازیابی کی مہم شروع ہوئی تو اس خدمت کے لئے مردوں سے زیادہ کچھ نیک نہاد عورتیں آگے بڑھیں۔ خاص طور پر شریمتی رامیشوری نہرو، مس مردولا سارابھائی۔ بیگم انیسہ قدوائی نے تو خود کو اس خدمت کے لئے وقف ہی کر دیا۔ اور پوری تندہی کے ساتھ انجام دیا۔ دوسرے قومی کارکنوں کا تعاون بھی ان کو برابر حاصل رہا۔ جنرل شاہ نواز صاحب بھی جو آج کل ہندوستان کے نائب وزیر ریلویز ہیں ۱۹۴۸ء میں مس مردولا سارابھائی کے ساتھ اس خدمت میں سرگرم عمل تھے۔ اونچی سطح پر نگراں اور مشیر کار حضرات میں حضرت مولانا حفظ الرحمن صاحبؒ بھی شامل تھے۔ ویسے جمعیۃ علماء کی جانب سے اس خدمت کی ذمہ داری مولانا مرحوم نے مجھے سونپی تھی اور سرپرستی خود فرماتے تھے۔ ۱۹۴۸ء سے مسلسل پانچ چھ سال یہ سلسلہ جاری رہا اور ان تھک کوششوں کی بدولت اغوا شدہ خواتین کی ایک بڑی تعداد اس مدت میں برآمد کر کے اپنے ورثاء تک پہنچائی جا سکی۔

ہنگامی حالات میں مرتد ہونے والوں کا اعلان اسلام

اسی زمانہ میں پنجاب، میوات، اور بھرت پور کے دیہات و قصبات میں ایک بڑی تعداد ایسے مسلمانوں کی رہ گئی تھی جو غضبناک حالات اور کشت و خون میں اپنی جان بچانے کے لئے اس کے سوا کچھ نہ کر سکے کہ جس طرح ان پر جبر کیا گیا انھوں نے دوسرے مذاہب قبول کر لئے۔ حالات کے سدھرنے کے بعد بعض بعض مقامات میں ایسے لوگوں سے اچانک سابقہ پڑا اور پھر اندازہ ہوا کہ جا بجا ایسے مسلمان موجود ہیں جنھوں نے ارتداد کی آڑ میں اپنی جان بچا رکھی ہے اور حسرت و یاس کے ساتھ اپنی زندگی پر آنسو بہا رہے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ اگر حکومت ان کی پشت پناہی کے لئے آمادہ ہو تو پھر وہ کھل کر اپنے اصل مذہب کی زندگی اختیار کریں۔ ایسے کچھ لوگ چوری چھپے دہلی پہنچ کر حضرت مولانا حفظ الرحمن صاحب سے ملے اور انھوں نے دوسروں کی بھی نشان دہی کی اور اپنی خواہش کا اظہار کیا تو مولانا مرحوم نے یہ معاملہ حضرت مولانا آزادؒ اور محترم پنڈت نہرو تک پہنچایا اور ان کی کوششوں سے ریاستی حکومتوں کے نام ایک ہدایت نامہ جاری ہو گیا جس کا مفاد یہ تھا کہ حکومت ہند ایسے جبری تبدیل مذہب کو چونکہ تسلیم نہیں کرتی ہے اس لئے جہاں جہاں ایسے واقعات درپیش ہوں وہاں لوگوں کو سرکاری طور پر پوری مدد دی جائے تاکہ وہ اپنے اصل مذہب کو علی الاعلان ظاہر کر سکیں اور اس معاملہ میں ان کی مشکلات کو دور کیا جائے۔

ہدایت نامہ اگرچہ کانفیڈینشل تھا تاہم پرائم منسٹر سکریٹریٹ سے اس کی ایک نقل حضرت مجاہد ملتؒ کو دے دی گئی اور اس سے کام لے کر پنجاب و راجستھان میں ایسے مرتدین کی بڑی تعداد کو دوبارہ اعلان اسلام کا موقع بہم پہنچایا گیا۔ اور آج وہ لوگ کھل کر اپنی اسلامی زندگی گزار رہے ہیں۔ والحمد للہ

کچھ اور خدمات

تقسیم ہند کے ری ایکشن نے جس طرح زندگی کے دوسرے گوشوں کو متاثر کیا اس کا خاص اثر ہندوستان میں باقی ماندہ پانچ کروڑ مسلمانوں کی اقتصادی اور معاشی زندگی میں بھی نمایاں ہوا۔ پاکستان بننے کے ساتھ ساتھ ایک طرف اونچے درجہ کے تاجر اور سرمایہ دار سمٹ کر پاکستان چلے گئے اور دوسری طرف سرکاری اور نیم سرکاری سروسوں میں بھی جو اونچے عہدوں پر فائز تھے انھوں نے بھی اپنا مستقبل پاکستان ہی میں محفوظ سمجھا۔ پھر یہاں فرقہ واریت کے سیلاب اور آئے دن قتل و غارت کی گرم بازاری نے مسلمانوں کی رہی سہی امیدوں اور امنگوں کو خاک میں ملا دیا۔ وقت کی فضا اتنی مکدر اور حالات کے تیور اس قدر برہم تھے کہ نہ کاروباری زندگی میں مسلمانوں کے لئے کوئی خاص گنجائش باقی رہی، نہ سروسوں اور ٹھیکوں وغیرہ میں۔

پھر زمینداری اور جاگیرداری کے خاتمہ نے اور بھی قافیہ تنگ کر دیا اور ان سب سے بڑھ کر جو ہمہ گیر مصیبت وبال جان بن رہی تھی وہ کسٹوڈین کی مار تھی جس نے مسلمانان ہند کی اقتصادیات کی رگیں خشک کر دی تھیں۔ ایک ایسے وقت میں جب کہ آزادی کے بعد وطن عزیز کی تعمیر و استحکام، خوش حالی اور ہمہ گیر ترقی کی بنیادیں استوار کی جا رہی تھیں ملک کے اندر ایسی کثیر العدد اقلیت کی معاشی زبوں حالی اور بربادی خود ملکی اور وطنی نقطۂ نظر سے بھی ناقابل برداشت اور باعث فکر و تشویش تھی۔

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ جن کے فکر و شعور پر بیک وقت ملک اور ملت دونوں ہی کے تقاضے اور فکر مندیاں چھائی ہوئی تھیں اس صورت حال کے تدارک اور اصلاح کے لئے بھی وہ اپنے اثر و رسوخ اور قوت عمل کے ساتھ برابر کوشاں رہے۔ ملک کے نئے نظام اور رجحانات میں اگرچہ اس کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ سروسوں، ٹھیکوں اور کاروباری سہولتوں میں مختلف فرقوں کا تناسب ملحوظ رکھا جائے۔ تاہم مولانا مرحوم اپنے ذاتی تعلقات اور اثرات کے بل پر فرداً فرداً سینکڑوں بلکہ ہزاروں امیدواروں کو سرکاری، نیم سرکاری اور پرائیویٹ سروسوں اور کاروباری سہولتوں کے حصول میں پوری مدد دیتے رہے اور بلا مبالغہ ان کی سعی و سفارش کی بدولت اس دور میں ہزارہا مسلمانوں کو روزگار اور معاش کے مواقع مل سکے اور ان ہزاروں گھرانوں کی اقتصادی زندگی سُدھر سکی۔ انفرادی کوششوں کے ساتھ ساتھ وہ مجموعی طور پر برابر اس کی کوشش کرتے رہے کہ سرکاری ملازمتوں اور کاروباری وسائل میں اقلیت کو اس کے جائز حقوق سے بالکل محروم نہ رکھا جائے اپنی پارلیمنٹری تقریروں میں بھی بار بار انھوں نے اس اہم قومی ضرورت کو پیش کیا اور انہی کی کوششوں کی بدولت مرکزی حکومت نے کئی بار ایسی ہدایات اپنے اداروں کو بھی اور ریاستی حکومتوں کو بھی دیں اور اس کا چیکنگ بھی کیا کہ مسلم اقلیت کے نظر انداز کئے جانے کی شکایات کیوں در پیش ہیں۔

جمعیۃ علماء ہند کے اجلاس سورت (اکتوبر ۱۹۵۶ء) میں ایک مستقل تجویز کے ذریعہ انھوں نے مسلمانوں کی اقتصادی فلاح و بہبود کا ایک مستقل پروگرام جمعیۃ کے سامنے رکھا اور اگر ہنگامی حالات و مشاغل نے مہلت دی ہوتی تو وہ اس راہ میں بہت کچھ کرنا چاہتے تھے۔

تقسیم ہند کے وقت خاص طور پر ریلوے ڈپارٹمنٹ، پوسٹ اینڈ ٹیلی گراف اور دوسرے محکموں میں ایسے مسلم ملازمین کی تعداد ۳۵ ہزار سے زائد تھی جنھوں نے آپشن فارم میں "مستقل ہندوستان" یا "عارضی پاکستان" کے فارم پُر کئے تھے۔ لیکن بعد میں حالات نے ایسا رُخ اختیار کیا کہ ان میں سے بڑی تعداد جس نے ہندوستان میں ہی رہنا طے کیا تھا مختلف بہانوں سے نظر انداز کر دی گئی اور ان کی سروسیں ختم کر دی گئیں۔ ان کے وفود مولانا کے پاس پہنچے اور ۱۹۵۲ء سے مسلسل چار پانچ برس تک مولانا مرحوم ان کے معاملات کی پیروی کرتے رہے۔ مرکزی کیبنٹ میں ایک واضح پالیسی طے کرائی اور پھر اس پالیسی پر عمل درآمد کے لئے برابر جد و جہد فرماتے رہے اور بحمد اللہ ان کی کوششوں سے ایسے ہزاروں ملازمین کو دوبارہ سروسوں میں لے لیا گیا۔

ان سلسلوں کے علاوہ آئے دن ماتحت اسٹاف کے فرقہ وارانہ جذبات کی بدولت مسلم ملازمین کو مختلف محکمانہ ناانصافیوں کی جو صدہا شکایات پیش آتی رہیں ان کے تدارک کے لئے مولانا کی فکر مندیاں برابر مصروف کار رہیں اور سینکڑوں معاملات کو خود انھوں نے اپنی گفتگوؤں اور خطوط کے ذریعہ طے کرایا۔

مسلمانوں کی طرح غیر مسلم اور خاص طور پر پاکستان سے آئے ہوئے پناہ گزیں بھی ان معاملات میں مولانا مرحوم کی نفع بخشیوں سے برابر فیض یاب ہوتے رہے اور وہ یکساں دردمندی اور ہمدردی کے ساتھ ہر مسلم و غیر مسلم کی خدمت اور سعی و سفارش فرماتے رہے۔

ریلوے ڈپارٹمنٹ میں جب مسلم ملازمین کو نماز جمعہ کی مہلت سے محروم کر دیا گیا تو یہ معاملہ بھی مولانا نے اس وقت کے ریلوے منسٹر مسٹر گوپالا سوامی آئینگر کے سامنے رکھا اور بالآخر وزیر موصوف نے یہ سرکلر جاری کر دیا کہ مسلم ملازمین کو نماز جمعہ کے لئے ایک گھنٹہ کی تعطیل بوضع تنخواہ بلا تامل دے دی جائے۔

ایک اور پریشانی ۱۹۴۹ء، ۱۹۵۰ء سے ظہور میں آئی جب کہ ریلوے اسٹیشنوں کو خاص طور سے شمالی ہند میں مسلمان ٹھیکیداروں کے ریسٹوران، ریفرشمنٹ روم

اور ٹی اسٹالس کے کنٹریکٹ ختم کر دیئے گئے اور اس کے نتیجہ میں سینکڑوں گھرانوں کے روزگار ہاتھ سے جاتے رہے۔ ان کی فریاد بھی مولانا مرحوم نے مرکزی وزراء اور بالخصوص وزیر اعظم ہند تک پہنچائی۔ اور ان کی توجہ سے اس وقت بڑی حد تک یہ مسئلہ حل ہو سکا۔

کلکتہ کی مشہور "مسلم چیمبر آف کامرس"، کا سرکاری ریکوگنیشن ختم کر دیا گیا تقسیم ہند کے بعد ہندوستان میں مسلمانوں کا یہ تنہا چیمبر باقی رہا تھا۔ اس کے لئے بھی مولانا مرحوم نے کامیاب جدوجہد فرمائی اور بحمداللہ آج وہ "اورینٹل چیمبر آف کامرس" کے نام سے باقی اور سرکاری ریکوگنیشن سے بہرہ مند ہے۔

اقتصادی اور معاشی زندگی کی طرح تقسیم ہند کے بعد مسلمانوں کی سیاسی زندگی اور اس کے تقاضے بھی پامال ہو کر رہ گئے تھے اور ٹھیک اسی طرح جس طرح ان کے اقتصاد و معیشت کی از سر نو تعمیر کے لئے کوششیں کی گئیں، ملکی سیاست اور نظام جمہوریت کے دائروں میں بھی مسلمانوں کی واجبی نمائندگی اور صلاحیت کار کے لئے مولانا مرحوم نے اپنی ذاتی حیثیت سے مسلسل جدوجہد فرمائی۔ ایک طرف وہ مسلمانوں کو ہمیشہ یہ تلقین فرماتے رہے کہ وہ پوری جرأت مندی کے ساتھ وطن عزیز کی تعمیر اور پیش رفت میں حصہ لیں اور خود کو ملکی زندگی میں ایک لمحہ کے لئے بھی اجنبی اور تماشائی نہ سمجھیں اور دوسری طرف اپنی جماعت "کانگریس"، کے حلقوں میں برابر اس کی کوشش کرتے رہے کہ مسلمانوں کو وسعت قلبی کے ساتھ اپنایا جائے۔ مرکزی اور ریاستی مجالس قانون ساز میں ان کے تناسب کے بقدر ان کو پورے مواقع دیئے جائیں۔ خاص طور پر جنرل الیکشنوں کے موقع پر تو مولانا ہی کی ذات گرامی پورے ملک کے مسلمانوں کی امیدوں اور کوششوں کا محور بنی رہتی تھی۔ دفتر جمعیۃ میں ایک میلہ سا لگ جاتا تھا اور تین تین مہینے سرگرمیاں جاری رہتی تھیں۔ ایک ایک سیٹ اور ایک ایک ٹکٹ کے لئے مولانا لڑتے تھے اور پوری کوشش فرماتے تھے۔

ان تمام مواقع پر مولانا کے اثر و رسوخ اور ان کی کوششوں سے مسلمانوں کے ساتھ غیر مسلم بھی برابر فیضیاب ہوتے اور مولانا کی سفارش کا سہارا پاکر اپنی کوششوں کو آگے بڑھاتے تھے۔

آج جب کہ مولانا مرحوم ہم سے رخصت ہو چکے ہیں، ہزاروں اور لاکھوں دلوں پر یہ احساس طاری ہے کہ عوام و خواص کی خدمت و مدد کا ایک بڑا سہارا جاتا رہا اور ایک ایسا ستون گر چکا ہے جس کی پشت پناہی ہزاروں کو سنبھالتی اور سہارا دیتی تھی۔

اوپر کے صفحات میں جو کچھ لکھا گیا وہ بھی مولانا کی ہمہ گیر اور دور آفریں خدمات اور ان کے جذبۂ عمل کا محض ایک مختصر خاکہ اور نا تمام نقش ہے، غریبوں اور مظلوموں کی مدد میں انھوں نے بیسیوں خدمات وہ انجام دیں جن کا تذکرہ زبان و قلم تک لانا انھوں نے کبھی گوارا نہ کیا۔ بہرحال اس نا تمام خاکہ سے بھی یہ اندازہ ہوتا ہے کہ خاص طور پر زندگی کے آخری پندرہ برسوں میں ان کے جذبۂ عمل اور ان تھک خدمات کا کیا عالم تھا اور خدمت و عمل کی کن کن راہوں کو انھوں نے بیک وقت آباد رکھا اور فکر و تدبیر کے کون کون سے محاذ تھے جہاں تنہا اُن ہی کی ذات برابر سینہ سپر رہی اور ان کے سایۂ خلوص و شفقت میں خدا کی کتنی مخلوق کو چین و سکون کا سانس لینا نصیب ہوا۔

فرقہ وارانہ فسادات اور مجاہد ملّت کی خدمات

سرزمین ہند پر فرقہ واریت کے جوش و خروش نے ۱۹۴۸ء میں جو انگڑائیاں لیں وہ بدترین دور بالآخر گاندھی جی کی قیمتی جان لے کر رہا۔ کاش سیہ بختی کی یہ تاریخ یہیں ختم ہو گئی ہوتی اور اس کے بعد ہندوستان کا دامن عزت حوادث قتل و غارت سے داغ دار نہ ہوتا۔ مگر افسوس کہ ۱۹۴۸ء کے بعد بھی آئے دن جنون فرقہ پرستی کی بدمستیاں جاری رہیں اور اگلے برسوں میں لگ بھگ کوئی سال بھی ایسا نہ گزرا جس میں فرقہ وارانہ ہنگامے اور فسادات رونما نہ ہوئے ہوں۔

ملک کے اندر بدامنی اور حوادث کا یہ تسلسل اقلیت کے لئے تو ایک مستقل آزمائش، بددلی اور بے اطمینانی کا سبب بنا ہی رہا۔ مگر اس کے ہاتھوں وطن عزیز کی عزت و نیک نامی کا دامن بھی تار تار ہوتا رہا اور اس کی ترقی اور خوش حالی کی منزل بھی دور ہوتی رہی، انکار نہیں کیا جا سکتا کہ آزادی ہند کے بعد فسادات کا تسلسل ہی سب سے بڑا حربہ تھا، جو دنیا کی نظر میں ہندوستان کی امن پسندی، شرافت اور تہذیب کو رسوا کرنے کے لئے کام آتا رہا اور جس نے دوسروں کے ہاتھ مضبوط کئے

حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب جیسے سچے وطن دوست جو آزاد ہندوستان کو امن و خوش حالی کا گہوارہ اور دنیا کی نظروں میں نیک نام اور سربلند دیکھنے کی تڑپ رکھتے تھے اور اسی جذبہ کے ساتھ انھوں نے اپنی جان کی قیمت پر حریت و انقلاب کے جھنڈے اٹھائے تھے۔ آزادی کے بعد ملک کے اندر مسلسل ہنگامے اور

آئے دن فساد کی خبریں ان کے لئے کس قدر کوفت اور قلبی اذیت کا باعث تھیں، اس کا اندازہ دشوار نہیں۔ پھر بھی ان ہی کا ظرف اور حوصلہ تھا کہ پندرہ برس مولانا یہ سب کچھ دیکھتے رہے اور مایوس ہونے کی بجائے آخر دم تک اصلاح حال کی کوششوں میں لگے رہے۔ ایک طرف بے سہارا اقلیت کا یہ حال تھا کہ جہاں کہیں کوئی فرقہ وارانہ یورش ہوتی مولانا ہی کی طرف امید کی نگاہیں اٹھتیں اور ان سے بڑھ کر تھا بھی کون جو خدمت گزاری کی لگن میں اپنی جان عزیز سے بھی بے نیاز ہو چکا ہو اور دوسری طرف خود مولانا کا یہ حال رہا کہ ملک کے کسی بھی گوشہ سے فساد کی خبر آئی اور وہ تلملا کر اٹھے۔ ہو سکا تو خود موقع واردات پر پہنچے یا اپنی طرف سے اپنے رفقا رکار کو بھیجا۔ صحیح واقعات پر فوراً حکومت کے سربراہوں کو توجہ دلائی۔ پارلیمنٹ کے بھرے اجلاس میں فرقہ پرستوں کی حرکتیں کھول کر بیان کیں اور اعلان پر اپنے دل کی چوٹ کا برملا اظہار کیا۔ برباد ہونے والے مظلوموں کی مدد کی فکر کی۔ زخمیوں اور ستم رسیدگان کی ڈھارس بندھائی اور جو کچھ خدمت وہ کر سکتے تھے اس کی تکمیل کے بغیر چین سے نہ بیٹھے۔

۵۰ء میں

اواخر ۵۰ء میں ہولی کے موقع پر یوپی کے مغربی اضلاع مرادآباد۔ بریلی۔ پیلی بھیت، شاہجہان پور اور علی گڑھ میں ہنگامے بپا ہوئے اور دوسری طرف کلکتہ و نواح کلکتہ میں خوفناک اور شدید نوعیت کے حوادث قتل و غارت کی گرم بازاری ہوئی۔ مولانا مرحوم نے ہم لوگوں (انیس الحسن۔ مولانا فقیہہ الدین۔ مسٹر خلیل باغ والا اور مولوی شفیق احمد مرحوم) پر مشتمل ایک وفد اضلاع یوپی میں بھیجا اور خود ۵ مارچ ۵۰ء کو کلکتہ پہنچ کر وہاں کی مصیبتوں کا جائزہ لیا۔ واقعات کی سنگینی کے پیش نظر حضرت مولانا آزاد مرحوم اور وزیر اعظم نہرو بھی کلکتہ پہنچ چکے تھے۔ مجاہد ملتؒ نے پنڈت جی کے ساتھ فساد زدہ علاقوں کا دورہ کیا، مظلوموں اور پناہ گزینوں سے ملے اور اصلاح حال کی تدبیروں میں پورا ہاتھ بٹایا۔ پانچ روز کلکتہ میں کام کرنے کے بعد ۱۲ مارچ کو مولانا لکھنؤ آئے اور وزیر داخلہ شری لال بہادر شاستری سے یوپی کے حوادث پر تفصیل سے بات چیت کی اور واپسی میں خود شاہجہان پور، بریلی، پیلی بھیت ہوتے ہوئے حالات کا خود مشاہدہ کر کے دہلی لوٹے۔

ان ہی دنوں فسادات کی آگ یوپی و بنگال کے علاوہ گوالیار اور سی پی میں بھی بھڑک اٹھی۔ حضرت مولانا نے جمعیۃ کا دوسرا وفد (مولانا اخلاق حسین صاحب قاسمی اور مسٹر محمد احمد وکیل) گوالیار کٹنی وغیرہ بھیجا اور دہلی میں بیٹھ کر ریاستی اور مرکزی حکومتوں کو اصلاح حال پر متوجہ فرماتے اور تدبیر و چارہ جوئی میں مصروف رہے اور ۲ مئی کو خود کٹنی، ساگر، جبل پور کا دورہ کر کے پیش آمدہ مصائب و مشکلات کی مفصل رپورٹ مرکزی اور ریاستی حکومت کو دی۔ اور مصیبت زدوں کی مدد کے لئے ہر ممکن جدوجہد فرمائی۔

اسی دوران (اپریل ۵۰ء) ٹونک میں ہنگامے ہوئے تو حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب اور سلطان یار خاں صاحب وکیل کو ٹونک بھیجا اور پھر ۲۹ جنوری کو مالپورہ (راجستھان) سے فساد کی خبر آئی اور مولانا نے مسٹر شاکر علی خاں و مولانا محمد عاقل صاحب الہ آبادی کو مالپورہ روانہ کیا۔ اسی مہینہ میں ایک طرف کاٹھیاواڑ کے علاقوں دھوراجی، سید پور وغیرہ میں سخت ہنگامے رونما ہوئے، جہاں مرکزی جمعیۃ کی طرف سے حضرت مولانا محمد میاں صاحب اور مسٹر آفتاب احمد بی۔ اے پر مشتمل ایک وفد کو روانہ کیا اور دوسری طرف بڑنگر (مدھیہ بھارت) میں شرپسندوں نے سر اٹھایا تو مولانا سید محمد میاں صاحب، مسٹر سلطان یار خاں وکیل اور مولانا مسعود احمد صدیقی کو ادھر بھی بھیجا۔

ملک بھر سے ان حوادث قتل و غارت کی پوری رپورٹیں موصول ہونے کے بعد حضرت مولانا ایک طویل یادداشت ساتھ لے کر ۲ جولائی ۵۰ء کو دہلی میں وزیر اعظم ہند پنڈت نہرو سے ملے اور مظلوم اقلیت کی پریشان حالی اور تباہیوں کا پورا نقشہ ان کے سامنے رکھا۔

اسی اثنا میں آسام کے تنگ نظر فرقہ پرستوں نے غریب اور بے سہارا اقلیت کو ستانے کے لئے ایک نئی ٹیکنک ایجاد کی اور جا بجا پاکستانی ہونے کے الزام میں مسلمانوں پر داروگیر شروع ہو گئی۔ حضرت مولانا نے اس صورت حال کی تحقیق اور ضروری کوششوں کے لئے مرکزی جمعیۃ کی جانب سے حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمن صاحب۔ حضرت مولانا محمد میاں صاحب اور مسٹر سلطان یار خاں وکیل کو آسام روانہ کیا اور اس وفد کے پہنچنے سے حالات میں خوشگوار تبدیلی پیدا ہوئی اور مسلمانوں کی بے چینی بھی بڑی حد تک دور ہو سکی۔

۲۰ ستمبر ۵۰ء کو چیلی ضلع بھاگلپور میں فساد ہوا۔ جہاں حضرت مولانا محمد میاں صاحب اور حضرت مولانا نور الدین صاحب بہاری بشکل وفد پہنچے اور مجاہد ملتؒ نے وزیر اعظم بہار مسٹر سری کرشن سنہا کو تار دے کر متوجہ کیا۔ پھر ۲۱ ستمبر کو دہلی میں وزیر اعظم ہند سے دوبارہ ملاقات کی۔

۱۹۵۱ء میں

۳۱ جنوری کو کمار دھبی (دھنباد) میں سخت ہنگامہ ہوا۔ مولانا نے پہلے چیف منسٹر کو تار بھیجا۔ پھر ۹ فروری کو خود وہاں پہنچ گئے ۲۳ مارچ کو نذگڑھ (راجستھان) سے بدامنی کی خبریں آئیں۔ مولانا نے ٹیلی فون پر چیف منسٹر شری جے نرائن ویاس سے مفصل گفتگو کی۔ شروع مئی ۱۹۵۱ء میں دوحد (گجرات) میں فرقہ وارانہ فتنوں نے سر اٹھایا تو فوراً مولانا محمد رفیق دہلوی اور چودھری شیر جنگ کو وہاں بھیجا۔ ۲ جولائی کو اُجین شہر میں ہنگامے ہوئے تو مدھیہ بھارت کے چیف منسٹر شری تخت مل جین کو متوجہ کیا اور مولانا مسعود احمد صاحب صدیقی سے پوری رپورٹ طلب کی۔

اکتوبر میں محرم کے دنوں بارہ بنکی اور بہرائچ میں فسادات رونما ہوئے تو حضرت مولانا سید محمد شاہد فاخری صاحب کو فوراً وہاں بھیجا۔

۱۹۵۲ء میں

۱۲ فروری کو جے پور میں کچھ حوادث پیش آئے۔ یہاں راقم السطور کو اور مسٹر عتیق احمد کو بھیجا۔ پھر ہولی کے دنوں آگرہ و فیروز آباد میں بدامنی ہونے پر مولانا اخلاق حسین قاسمی اور مسٹر اسرار احمد آزاد کو ۱۷ مارچ کو روانہ کیا۔ چندہی روز بعد مظفر نگر میں بھی گڑبڑ ہو گئی اور مجاہد ملتؒ خود وہاں تشریف لے گئے۔ پھر ستمبر میں ۸ تاریخ کو علی گڑھ میں کچھ واقعات پیش آئے۔ جہاں مولانا فقیہ الدین کو بھیجا گیا۔ ادھر ۲۸ ستمبر کو دہلی میں محرم کے جلوس پر ہنگامہ ہوا، تو مولانا نے اس کی روک تھام کے لئے بھی بروقت بھاگ دوڑ کی۔

۱۹۵۳ء میں

سب سے پہلے یکم مارچ (عین ہولی کے دن) اور پھر ۵ مارچ (رنگ پنچمی کے روز) بھوپال میں شدید فساد ہوا جہاں حضرت مولانا محمد میاں صاحب، مسٹر یوسف فیروزی اور مولانا فقیہ الدین پر مشتمل وفد بھیج کر اصلاح حال کی پوری کوششیں فرمائیں۔ ۱۷ اپریل کو چومو (ضلع جے پور) میں گڑبڑ ہوئی اور وہاں مسٹر سلطان یار خاں وکیل کو بھیجا۔

اسی زمانہ میں گجرات کی نواح میں شدھی تحریک نے پوری قوت کے ساتھ سر اٹھایا تھا اس کے مقابلہ اور روک تھام کے لئے ناظم جمعیۃ علما حضرت مولانا محمد میاں صاحب گجرات پہنچے اور مرحوم مولانا شمس الدین صاحب بڑودوی کے ساتھ انھوں نے نہایت مؤثر مفید اور خاموش خدمات انجام دیں اور اس فتنہ کی سرکوبی ہو سکی

۱۹۵۴ء میں

۵ جون کو علی گڑھ میں پھر مار دھاڑ کی شورشیں بپا ہوئیں۔ مولوی فقیہ الدین اور مولانا محمد زبیر قریشی کو حالات کی دیکھ بھال کے لئے بھیجا ادھر جولائی و اگست میں بیلی بھیت، ہلدوانی، متھرا، جودھپور، پالی، ڈیڈوانہ وغیرہ میں جزوی واردا تیں ہوئیں اور بڑے پیمانہ پر دکن کی طرف نظام آباد، اندور، جالنہ، عادل آباد، گلبرگہ وغیرہ میں "پاکستانی جھنڈا لہرانے" کا بے جا الزام دے کر شرپسندوں نے شہری امن و سکون کو برباد کیا مولانا مرحوم نے ان تمام واقعات پر جمعیۃ کے ریاستی کارکنوں کو اصلاح حال کے لئے بھیجا۔ اور خود مرکزی و ریاستی حکومتوں سے ربط قائم کر کے حالات کی درستی کے لئے کوشاں رہے۔ ان فسادات کے سلسلے میں ۲۶ اگست ۱۹۵۴ء کو مولانا نے پارلیمنٹ میں ایک شورٹ نوٹس سوال رکھنا چاہا جو اڈمٹ نہیں کیا گیا تاہم مولانا ۲۹ اگست کو لکھنؤ پہنچے اور ریاستی ذمہ داروں سے ملے اور وہاں سے مولانا محمد قاسم صاحب اور مولانا عبد الرؤف صاحب کو ساتھ لے کر پیلی بھیت گئے جہاں مسلم اقلیت پر حوادث کا بہت اثر تھا۔ ۲ ستمبر کو دہلی میں جمعیۃ کی ورکنگ کمیٹی کا اجلاس تھا۔ مولانا نے تمام حالات اجلاس کے سامنے رکھے اور طے پایا کہ جمعیۃ کا ایک معزز وفد وزیر اعظم ہند سے مل کر مسلمانوں کی بربادی اور پریشانیوں پر ان کو توجہ دلائے۔ ۱۸ ستمبر کو یہ وفد (جس میں حضرت مولانا احمد سعید صاحب سید محمد جعفری صاحب، مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب، مولانا شاہد فاخری صاحب، مولانا نور الدین صاحب بہاری، مولانا سید محمد میاں صاحب اور خود حضرت مجاہد ملتؒ شریک تھے) حضرت شیخ مدنیؒ کی قیادت میں محترم پنڈت نہرو سے ملا۔ پنڈت جی نے وفد کی گزارشات اور تجاویز کو بڑی توجہ اور دردمندی کے ساتھ سنا اور اسی کے نتیجہ میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی جانب سے تمام ریاستی شاخوں کو ایک سرکلر کے ذریعہ ہدایات دی گئیں کہ فرقہ وارانہ فسادات کی روک تھام اور مقامی حکام کی کوتاہ کاریوں پر کانگریس کے عمائدین اور کارکن پوری توجہ رکھیں اور اقلیت کی پریشانی اور بے اطمینانی دور کرنے میں پوری دلچسپی لیں۔

ان ہی دنوں حضرت مجاہد ملت کی فکر مندانہ دوڑ دھوپ کو دیکھتے ہوئے کلکتہ کے مشہور روزنامہ "آزاد ہند" نے اپنے اداریہ میں لکھا تھا!

"بڑھاپے میں آدمی کم زور پڑ جاتا ہے۔ دل بجھ جاتا ہے۔ خون میں ٹھنڈک دوڑ جاتی ہے۔ کام کرنے کی نہ تو امنگ باقی رہتی ہے اور نہ حوصلوں میں بلندی مگر ہندوستان کے دو بوڑھے ایسے ہیں جو نوجوانوں کو بھی مات دیتے ہوئے ہیں۔ ایک تو ہیں پنڈت نہرو وزیر اعظم ہند۔ اور دوسرے جمعیۃ علماء ہند کے جنرل سیکریٹری مولانا حفظ الرحمٰن۔ ان دو بوڑھوں نے اس وقت ملک کا اپنے کم زور کندھوں پر جوان اور مضبوط ہمت کے ساتھ اٹھا لیا ہے۔ یہ فرق اپنی جگہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا کہ ایک شخص عوامی لیڈرشپ کے علاوہ سرکاری کرسی بھی سنبھالے ہوئے ہے اور دوہری محنت کر رہا ہے۔ مولانا حفظ الرحمٰن نے آج سے چند برس پہلے کہ ہمت شکن

ہندوستان میں جواں مردی سے عوام کی جو خدمت کی ہے۔ وہ ان کی زندگی کا ایسا ورق ہے جسے زمانے کی کسی عمر میں بھی بھلایا نہ جاسکے گا۔ اور آج بھی وہ آسمان پر گھنگھور بادل دیکھ کر جس طوفانی انداز سے ملک کے ایک گوشہ سے دوسرے کونے تک دوڑتے پھر رہے ہیں اور ٹوٹتی ہوئی ہمتوں کو سنبھال رہے ہیں۔ یہ انھیں کا کام ہے۔ اگر آج کوئی یہ سمجھے کہ وہ صرف مسلمانوں کے لئے کام کر رہے ہیں تو موجودہ حالات میں ایسا سمجھنا غیر قدرتی نہیں ہے۔ جب عقل پر پتھر پڑ جاتے ہیں تو دوست بھی دشمن نظر آنے لگتے ہیں۔ ورنہ سچ تو یہ ہے کہ مولانا نے مظلوم مسلمانوں کے حق میں جو آواز بلند کی ہے۔ وہ پورے ہند کے لئے آواز ہے۔ اس آواز کے مخاطب ہندوستان کے ۴۳ کروڑ آدمی ہیں۔ مولانا کا خطاب انھیں سے ہوتا ہے۔ وہ انھیں کو بتاتے ہیں کہ آخر تم کس قسم کے جنون میں مبتلا ہوگئے ہو کہ اپنے ہی ناک کان کاٹنے لے رہے ہو۔ مسلمان اس ملک کی رونق ہیں، عزت ہیں، حرمت ہیں۔ تم نادان اسے پیروں تلے روندے ڈال رہے ہو۔ جیا ہے آج یہ باتیں سمجھ میں نہ آئیں، کل ضرور سمجھ میں آجائیں گی۔ اور تب مولانا کی خدمت کو بلا تفریق مذہب و ملت سراہا جائے گا۔ آنکھوں سے لگایا جائے گا۔"

اسی سال اکتوبر میں مدھوبنی (دربھنگہ) اور ضلع مظفر پور کے قصبات جھولیا و فتح پور میں اور ۱۹ نومبر کو برہم پور (اڑیسہ) میں افسوسناک حوادث پیش آئے۔ مولانا محترم ان دنوں دینی تعلیمی کونشن کی تیاریوں میں بے حد مصروف تھے۔ پھر بھی وہ ان ہنگاموں پر ریاستی حکام و وزراء کو برابر توجہ دلاتے رہے۔

سنہ ۵۵ء میں

۲ مارچ کو مندسور میں ہنگامہ ہوا جہاں مولانا مسعود احمد صدیقی کو تحقیق حال کے لئے بھیجا۔ سرونج کے واقعات پر مجھے اور مولانا اخلاق حسین صاحب قاسمی کو بھیجا اور پھر ستمبر کو کوٹہ میں فرقہ وارانہ حوادث کی گرم بازاری ہوئی۔ مولانا خود کوٹہ پہنچے (راقم السطور بھی ساتھ تھا) اور حادثات کی سنگینی کو دیکھتے ہوئے راجستھان کے چیف منسٹر شری سکھاڑیا، آئی جی پولیس اور ڈی آئی جی کو کوٹہ بلایا۔ یہ لوگ دوسرے روز پہنچ گئے۔ مولانا نے تمام حالات ان کے سامنے رکھے۔ چنانچہ کلکٹر اور ایس پی کوٹہ کا تبادلہ عمل میں آیا اور حالات کی درستی کے لئے کافی کوششیں ہوئیں۔

۱۵ اکتوبر کو کاس گنج میں کچھ شورش ہوئی اور مولانا نے فوراً مجھے، مولانا فقیہ الدین اور مولانا عبدالشاہد شروانی کو وہاں بھیجا

سنہ ۵۶ء میں

۲۴ فروری کو آلوٹ میں کچھ گڑبڑ ہوئی جس پر ریاستی حکومت کو توجہ دلائی۔ ۷ اپریل کو دہلی میں جمعیۃ کی ورکنگ کمیٹی کے عین اجلاس میں بھوپال سے ٹیلی فون پر شدید حوادث کی اطلاع ملی۔ دوسرے ہی روز مولانا شاہد فاخری صاحب کو اور مجھے بھوپال روانہ کیا۔

ادھر ۱۳ مئی کو گودھرا اور ۲۹ مئی کو دھولیہ میں کچھ بدامنی ہوئی۔ اور پھر ستمبر میں "ریلیجیس لیڈرز" نامی کتاب نے ملک بھر میں جو فتنہ کھڑا کیا۔ اس کے نتیجہ میں اوری، جبل پور، کھام گاؤں، علی گڑھ، مراد آباد اور جگہ جگہ بڑے پیمانہ پر فسادات کی آگ بھڑکی۔ مولانا نے حافظ جمیل الرحمٰن صاحب اور مسٹر عبدالستار فاروقی کو جبل پور وغیرہ اور مولوی فقیہہ مسٹر سلطان یار خاں اور مولانا عبدالشکور ایم۔ پی کو علی گڑھ روانہ کیا۔ خود مراد آباد پہنچے اور دہلی آتے ہی پنڈت نہرو، پنڈت پنتھ اور صدر کانگریس سے ملے اور تمام حالات ان کے نوٹس میں لائے۔ پنڈت نہرو پر ان حوادث کا اتنا گہرا اثر ہوا کہ ۲۳ ستمبر کو انھوں نے دہلی کے جلسۂ عام میں فرقہ پرستوں کی فتنہ سامانی اور توہین مذاہب کے خلاف سخت الفاظ میں تنبیہہ کی اور ان حرکتوں کو ملک کی عزت و نیک نامی کے لئے ناقابل برداشت قرار دیا۔

سنہ ۵۷ء و سنہ ۵۸ء میں فسادات کا تسلسل بڑی حد تک رکا رہا۔ راوریہ، ساگلی، بھیوساول، جل گاؤں وغیرہ میں کچھ جزوی واقعات ضرور پیش آئے، لیکن عام حالات پرسکون رہے۔ لیکن

سنہ ۵۹ء میں

شر و فساد کی کوششوں نے پھر سر اٹھایا۔ چنانچہ ۹ جنوری سنہ ۵۹ء کو کشن گنج (ضلع پورنیہ) میں ہنگامے برپا ہوئے اور مجاہد ملتؒ نے فوراً مولانا محمد میاں صاحب، مولانا محمد طاہر صاحب ایم۔ پی اور مولانا سید محمد نور اللہ صاحب کو وہاں روانہ کیا۔ پھر ہولی کے موقع پر ۲۴ مارچ کو مبارک پور و بہرائچ میں اقلیت کشی کے شدید حوادث پیش آئے اور ان سے بھی بڑھ کر پولیس کے مظالم نے حالات کو سنگین بنا دیا۔ رمضان کے دن تھے پھر بھی ۲۸ مارچ کو مولانا خود روانہ ہوئے اور جو دردناک حالات وہاں دیکھ کر آئے۔ ان سے بے حد مغموم اور متاثر تھے۔ واپسی میں لکھنؤ ٹھہر کر چیف منسٹر یو۔ پی کو مولانا نے اپنے تاثرات اور مشاہدات سے آگاہ کیا۔

دہلی پہنچے ہی تھے کہ دتا نگر (ضلع میرٹھ) کا ایک وفد اپنی بپتا سنانے کے لئے مولانا کے پاس آیا۔ مولانا نے فوراً مولوی فقیہہ الدین صاحب کو روانہ کیا۔ ادھر رنگ پنچمی کے دن (۲۹ مارچ کو) بھوپال میں پھر قتل و غارت کی گرم بازاری ہوئی اور مولانا ۳ اپریل کو مجھے ہمراہ لے کر بھوپال پہنچ گئے۔ حالات کو خود دیکھا اور بہ تعداد میں گرفتاریاں ہوئی تھیں۔ مولانا نے جیل کا وزٹ بھی کیا۔

ادھر ۱۷؍ اپریل کو رام نومی کے دن سیتا مڑھی اور آختہ میں بڑے پیمانہ پر مار دھاڑ شروع ہوگئی۔ مولانا نے فوراً جمعیۃ علماء بہار کا وفد وہاں بھیجا اور خود ریاستی وزیر اعظم کو تار دیئے۔ ساتھ ہی دہلی میں مرکزی جمعیۃ کی جانب سے صدر کانگریس کو ایک مفصل میمورنڈم دیا اور ۶؍ مئی کو مسلم ممبران پارلیمنٹ کے نمائندہ وفد کے ساتھ پرائم منسٹر صاحب سے ملے اور فرقہ واریت کی بدمستیوں پر حالات و مشاہدات کی ایک مؤثر یادداشت ان کے سامنے بھی رکھی۔ چنانچہ ۹ مئی کو کانگریس ورکنگ کمیٹی میں ملک کے ان افسوسناک حالات پر غور کیا گیا۔ خصوصی دعوت پر مولانا مرحوم بھی اس میں شریک ہوئے۔ مدھیہ پردیش کے چیف منسٹر شری کاٹجو بھی بلائے گئے۔ اس میٹنگ میں بہت صفائی کے ساتھ مولانا نے فرقہ پرستوں کی حرکتوں کے ساتھ مقامی حکام کے عملی تعاون اور گہری دلچسپیوں کے شواہد پیش کئے۔ ادھر سیتا مڑھی اور آختہ سے مولانا کو مسلسل بلایا جا رہا تھا۔ چنانچہ ۲ جولائی کو وہ خود وہاں پہنچے اور ضروری جدوجہد عمل میں لائے۔

سنہ ۶۰ء میں

۱۲؍ اگست کو فیروزآباد کی جامع مسجد پر جو شاید حادثہ پیش آیا۔ اس کی یاد ابھی ذہنوں میں تازہ ہوگی۔ یہاں مولانا مرحوم نے پہلے جمعیۃ کے وفد کے طور پر مولانا فقیہ الدین اور ڈاکٹر محمود قادری صاحب کو بھیجا اور خود ٹیلیفون پر یوپی کے وزراء سے بات کی۔ ادھر وزیر اعظم ہند سے ملے اور پھر جب حالات زیادہ بگڑے اور ۱۸؍ ستمبر کو دوبارہ فیروزآباد سے آگرہ تک آگ پھیلی تو مولانا مرحوم خود دونوں جگہ پہنچے۔ آئی، جی، پی اور ڈی، آئی، جی۔ کمشنر اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سے ملے اور دونوں فرقوں کی کشمکش کو ختم کرانے میں بڑی حد تک کامیاب ہوئے۔

سنہ ۶۱ء کے بھیانک حوادث

سنہ ۶۱ء شروع ہوا تو اس کے تیور اور بھی غضبناک تھے۔ ادھر مولانا ۲۳ جنوری سے آسام اور بہار کے دورہ پر تھے۔ ۸ فروری کو دہلی واپس پہنچے۔ ادھر ۶ فروری سے جبل پور میں بھیانک اور دہشتناک حوادث کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا۔ دہلی واپس پہنچتے ہی مولانا نے ٹرنک کال پر چیف منسٹر مدھیہ پردیش ڈاکٹر کاٹجو سے بات کی۔ انھوں نے اطمینان دلایا کہ حالات قابو میں ہیں۔ مگر اگلے ہی روز ۹ فروری کو وہاں قتل و غارت کا سلسلہ اور بھی تیز ہوگیا۔ آنے والی خبروں سے اندازہ ہوا کہ حالات زیادہ بگڑ چکے ہیں اور آگ دور دور تک پھیل رہی ہے۔ مولانا نے فوراً محترم پنڈت ہنرو وزیر اعظم ہند کو ایک ذاتی خط لکھا اور اپنی گہری تشویش کا اظہار کیا۔ ساتھ ہی حالات کی تحقیق کے لئے مرکزی جمعیۃ کا وفد جس میں راقم السطور (انیس الحسن) اور مولانا مسعود احمد صدیقی شریک تھے جبل پور روانہ کیا۔ ہم لوگ ۱۳ فروری کو بھوپال ہو کر انسپکٹر جنرل پولیس مسٹر رستم جی سے ملے جن کے لئے مولانا نے ایک مفصل خط ہمارے سپرد کیا تھا اور دوسرے روز جبل پور پہنچ کر ہم نے سب سے پہلے مسٹر عثمانی وکیل اور صدر جمعیۃ (سیٹھ احمد علی رجب علی) سے ملاقات کی اور پھر شہر کے فساد زدہ علاقوں۔ آتش زدہ اور برباد شدہ دوکانوں، مکانوں وغیرہ کو دیکھا زخمی ہونے والوں سے ملے اور شہر کے مختلف محلوں کا گشت کیا۔ جہاں مسلمان پناہ گزیں تھے۔ شہر کے میونسپل میئر شری بھوانی داس اور شری جگموہن داس کے ساتھ بعض علاقوں میں ریلیف کا کام دیکھا جمعیۃ کے نمائندے مولانا ریاست علی صاحب اور محمد رمضان بابا صاحب برابر ہمارے ساتھ رہے۔ جبل پور سے واپسی پر ہم لوگ ساگر ٹھیرے اور وہاں کی تباہیوں کا نقشہ بھی دیکھا۔ اور حاجی محمد شفیع صاحب ایم، ایل، اے کے مکان میں پناہ گزینوں سے ملاقاتیں کیں۔ پھر مولانا مسعود صاحب اُجین واپس ہوگئے۔ اور میں نے دہلی پہنچ کر حضرت مولانا کو اپنے مشاہدات اور تاثرات سے مطلع کیا۔

یہاں یہ واقعہ بھی قابل ذکر ہے کہ ان دنوں جبل پور، سرنیا، ساگر اور گرد و پیش میں جو بھیانک اور دردناک حوادث پیش آئے، ان کی سنگینی کا چرچا دور دور تک ہوا۔ اور بعد میں کانگریس، کمیونسٹ، سوشلسٹ پارٹیوں کے وفود بھی پہنچے۔ ممبران پارلیمنٹ کی ایک جماعت بھی وہاں گئی اور دوسری جماعتوں کے وفود اور لیڈر پہنچتے رہے مگر ان حوادث کے فوراً بعد خطرناک حالات میں سب سے پہلا وفد جو وہاں پہنچا وہ ہم خادموں پر مشتمل جمعیۃ علماء ہند ہی کا وفد تھا ۱۴؍۱۵ فروری کو ہم لوگ جبل پور میں تھے۔ وہیں ۱۵ فروری کو ہم نے رمضان المبارک کا چاند دیکھا تھا۔

بہرحال ان حوادث کا جتنا گہرا اثر مجاہد ملتؒ پر ہوا اس کا کچھ اندازہ ان مضطرب اور دردمندانہ کوششوں سے ہی ہوسکتا ہے جو ان حوادث کے بعد مولانا مرحوم نے مسلسل انجام دیں۔ اور جو بالآخر ان کی تندرستی اور زندگی کا سودا ثابت ہوئیں۔

ہماری رپورٹ دیکھنے کے بعد مولانا مرحوم نے ایک طرف وزیر اعظم ہند کو تمام حالات سے مطلع کیا اور دوسری طرف ۲۱ فروری کو (اور پھر اسی سلسلہ میں ۲۹ مارچ کو) ہند پارلیمنٹ میں وہ معرکۃ الآراء تقریریں کیں جن پر پورے ملک سے تحسین و آفرین کی صدائیں بلند ہوئیں اور جن کو مجاہد ملتؒ کی جرأت گفتار و کردار کا آئینہ کہا جاسکتا ہے یہ دونوں تقریریں اس نمبر کے صفحات ۲۵۷ تا ۲۶۶ پر شائع کی جا رہی ہیں۔ ساتھ ہی مولانا نے پورے ملک سے ان مظلومین کی امداد کے لئے اپیل کی تو

ملک کے کونہ کونہ سے امدادی سامان اور رقوم کا ایک سیلاب امنڈ آیا۔ آخر تک کُل تقریباً تین لاکھ روپیہ موصول ہوا۔ اس امداد کی سب سے پہلی قسط لے کر ۲۶ فروری کو مولانا روانہ ہوئے۔ مسٹر مظہر امام ایم پی اور ہمارے رفیق ادارہ مسٹر سلیمان صابر ساتھ تھے۔ پانچ روز وہاں ٹھہر کر مولانا مرحوم نے تمام حالات اور امدادی ضروریات کا خود مشاہدہ کیا۔ ساگر وغیرہ بھی گئے۔ پھر ۵ مارچ کو دوبارہ تشریف لے گئے۔ اور اس کے بعد بار بار جبل پور و ساگر جاتے آتے رہے۔ اپنے علاوہ جماعت کے رفقاء کار میں سے حضرت مولانا محمد میاں صاحب۔ مولانا اخلاق حسین صاحب قاسمی۔ مولانا محمد عاقل صاحب الٰہ آبادی۔ مولانا فقیہ الدین، مولانا شاہد فاخری صاحب مسٹر ظہیر الدین صدیقی اور جمعیۃ کے دوسرے کارکنوں کی مستقل ڈیوٹیاں لگا دیں اور خدمت و امداد کا ایک مستقل مشن قائم کر دیا۔ ساتھ ہی مقدمات کی پیروی اور انکوائری کمیشن کے سامنے واقعات کے پہلوؤں کو واضح کرنے کے لئے ممتاز قانون دانوں کی ایک قانونی امدادی کمیٹی بھی بنائی۔ دوسری جماعتیں اور افراد جو امدادی خدمات انجام دے رہے تھے ان کے ساتھ تعاون میں بھی مولانا نے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی

کل ہند مسلم کنونشن

ایک طرف خدمات کا یہ سلسلہ چلتا رہا۔ دوسری طرف مولانا کو گہرا احساس تھا مسلمانان ہند کی اُس عام بے چینی اور بددلی کا جو جو شرپسندوں کی آئے دن کی شورشوں اور دردناک حوادث کے تسلسل اور گراں باریوں کا قدرتی نتیجہ تھی اور آزادی کے تیرہ برس بعد بھی ان سے چھٹکارہ کی کوئی سبیل نظر نہیں آتی تھی۔ مولانا کو سخت اضطراب تھا کہ اگر ہندوستان کی اس عظیم الشان اقلیت پر بددلی اور مایوسی کی گرفت یوں ہی مضبوط ہوتی رہی اور اس کے اسباب و عوامل یوں ہی قائم رہے تو وہ خود اس کے لئے بھی موت کا پیغام ہوگا اور وطن عزیز کی قدر و قیمت کو بھی خاک میں ملا کر رہیگا مولانا کی نگاہ میں تیرہ سال کی پوری سرگزشت تھی اور وہ مستقبل کے اندیشوں کو بھی پوری طرح محسوس کر رہے تھے۔ چنانچہ اپریل ۶۱ء میں جب مجلس عاملہ جمعیۃ علماء ہند کے سامنے مولانا نے اپنے تاثرات رکھے تو جہاں اور کچھ چیزیں طے کی گئیں وہاں یہ بھی فیصلہ ہوا کہ جلد پورے ملک کے مسلمانوں کا ایک نمائندہ کنونشن بلایا جائے اور ملک میں فرقہ پرستی کی فتنہ سامانیوں کا کوئی مؤثر حل تلاش کیا جائے۔ چنانچہ مجاہد ملت تو فوراً ہی کنونشن کی تیاریوں میں لگ گئے۔ لیکن ملک میں اس فیصلہ کے اعلان نے ایک نیا موضوع بحث قائم کر دیا۔ فرقہ پرست افراد اور جماعتوں کا اختلاف تو متوقع تھا۔ مگر اس سے بھی زیادہ اور خلاف امید ملک کے بڑے بڑے سنجیدہ ارباب فکر و سیاست، صف اول کے انگریزی، اردو، ہندی اخبارات اور خود کانگریس کے قوم پرور رہنماؤں اور لیڈروں کی تنقیدات سامنے آئیں کسی نے اس کی اہمیت اور افادیت کو برملا سراہا اور کسی نے اس کو بے محل اقدام قرار دیا۔ شدہ شدہ کچھ دراندازوں نے معاملہ کو تاریک بنا کر محبوب وزیر اعظم ہند پنڈت نہرو تک پہنچا دیا اور جس طرح بات کو ان تک پہنچایا گیا تھا اس کا لازمی نتیجہ تھا کہ پنڈت جی بھی کنونشن کے مخالفین کی صف میں آگئے۔ مولانا مرحوم جس اضطراب اور فکر مندیوں کے ساتھ کنونشن کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ ملک کے تمام اخباری اور سیاسی حلقوں میں موافق و مخالف تنقیدات نے مولانا کے فکر و اضطراب میں کچھ اضافہ ضرور کیا۔ لیکن ان کے عزم راسخ اور جرأت عمل میں ایک لمحہ کے لئے کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہوئی پرائم منسٹر کی مخالف رائے معلوم ہو جانے کے باوجود وہ اپنی جگہ اٹل رہے اور بالآخر پنڈت نہرو اور صدر کانگریس نے بھی ان کی اصابت فکر اور برمحل اقدام کے حق میں اپنی رائے بدل دی اور ۱۰، ۱۱ جون ۶۱ء کو سپرو ہاؤس نئی دہلی میں ڈاکٹر سید محمود صاحب ایم۔ پی کی صدارت اور مجاہد ملت کے اہتمام میں مسلمانان ہند کی تاریخ کا یہ دور آفریں اقدام (مسلم کنونشن) بھرپور کامیابی اور حسن و خوبی کے ساتھ تکمیل پا سکا اور ملک و ملت کے مستقبل پر بہت گہرے اور دور رس اثرات قائم کر سکا۔

کنونشن کی تیاریوں میں مولانا کے سب ہی رفقاء اور ہم خدام شب و روز مصروف رہے اور تمام انتظامات کی نگرانی خود مولاناؒ فرماتے رہے مجلس استقبالیہ کے صدر بھی مولانا ہی تھے (مولانا کا خطبہ استقبالیہ ان کے افکار و عزائم کی آخری یادگار رہ گیا ہے جو صفحہ ۳۳۶ پر آپ کے ملاحظہ سے گزرے گا)

جنرل سکریٹری سید مظہر امام صاحب ایم پی اور سکریٹری مسٹر ظہیر الدین صدیقی ایم۔ اے، ایل، ایل، بی اور مسٹر یونس سلیم ایڈوکیٹ حیدرآباد تھے۔ کنونشن کی پبلسٹی اور نشر و اشاعت کا پورا کام مولانا نے ظہیر صاحب کے سپرد کر دیا تھا۔ اور انھوں نے بڑی محنت اور خوبی کے ساتھ اس کو انجام دیا۔ مولانا بھی آخر تک اس کے مداح رہے۔

۲۲ مئی کو دہلی سے کنونشن کا دعوت نامہ جاری کیا گیا جس پر ملک بھر کے ۶۳ نامور ارباب فکر و بصیرت کے دستخط تھے اور اس میں کہا گیا تھا!

" جناب محترم!

یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ وطن عزیز کی آزادی اور ملک میں سیکولر جمہوری دستور کے نفاذ سے لے کر آج تک مسلمانان ہند زندگی کے تقریباً

تمام اہم شعبوں میں اپنے جائز حقوق سے بڑی حد تک محروم رہے ہیں اور یہ بھی واقعہ ہے کہ اس سلسلہ میں جماعتی اور انفرادی مسلسل جدوجہد کے باوجود جو ریاستی و مرکزی لیجسلیچرز کے اندر اور باہر جاری ہے۔ خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوسکی ہے۔

یہ صورت حال نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کے لئے انتہائی ہمت شکن اور شدید اضطراب کا باعث ہے بلکہ خود ملک و قوم کی سالمیت، استحکام، وقار اور ترقی کی راہ میں بھی زبردست رکاوٹ ہے۔ اس لئے شدید ضرورت ہے کہ ہندستان کے پانچ کروڑ مسلمانوں کے ارباب فکر و عمل اپنے اپنے جماعتی اختلاف و نقطہائے نظر سے بالاتر ہو کر وحدتِ فکر و عمل کے تعمیری جذبہ کے ساتھ ایک جگہ جمع ہوں اور مسطورۂ ذیل بنیادی امور پر متحد و متفق ہو کر غور کریں، اور کوئی مؤثر راہِ عمل تلاش کریں۔

(۱) — ایسے طریقوں اور تدبیروں پر غور کرنا جن سے ملک کے تمام باشندوں کے درمیان اپنے اپنے مذہب اور کلچر پر مضبوطی سے قائم رہتے ہوئے باہمی اتفاق و اتحاد میں ترقی ہو تاکہ ملک کی ہرجہتی ترقی اور استحکام کو زیادہ سے زیادہ تقویت حاصل ہو۔

۲ — مسلم اقلیت آئے دن فرقہ وارانہ فسادات کے نتیجہ میں جن بھیانک جانی و مالی بربادیوں کا شکار ہوتی رہتی ہے، ان کے انسداد کے مؤثر وسائل و ذرائع معلوم کرنے کے لئے غور و فکر۔

۳ — ایسی تجاویز جن کے بروئے کار لانے سے مسلمان سرکاری ملازمتوں میں اپنا واجبی حصہ پاسکیں اور لیجسلیچرز میں ان کو حق کے مطابق نمائندگی حاصل ہوسکے

۴ — وہ تدابیر اور وسائل جن کو اختیار کر کے مسلمان تجارت اور معاش کے دیگر ذرائع مثلاً پرمٹوں، لائسنسوں، ٹھیکوں وغیرہ میں عملی طور پر اپنے حق کے مطابق نمائندگی حاصل کرسکیں۔

۵ — اردو زبان سے متعلق ابھی تک اصل دستوری مطالبہ پورا نہیں ہوسکا ہے۔ اگرچہ انجمن ترقی اردو کی مشترکہ جدوجہد جاری ہے تاہم اس مسئلہ سے متعلق ایسی تدابیر کی تلاش جن سے اردو کو اس کا اصلی مقام حاصل ہوسکے اور ہماری ملی جلی تہذیبی زندگی کا حسن برقرار رہ سکے۔

۶ — سرکاری نصاب تعلیم کی منظور شدہ کتابوں میں آئے دن ایسے اجزاء کی شمولیت جو اسلامی نقطۂ نظر سے ناقابل برداشت اور وجہ اعتراض ہیں ان شکایات کے ازالہ کے لئے مؤثر و اطمینان بخش تجاویز۔

۷ — عام تعلیمی اداروں، بالخصوص میڈیکل اور ٹیکنیکل تعلیم کے اداروں میں داخلے اور سرکاری وظائف کے حصول میں معیاری قابلیت کے باوجود مسلم طلباء کو امتیازی سلوک اور ناانصافی کی عام شکایت ہے۔ اس کے تدارک کے لئے ضروری تدابیر ——————"

مولانا مرحوم نے جس خوبی تدبیر کے ساتھ کنونشن کے نازک مسائل اور کارروائی کو تکمیل تک پہنچایا۔ اس کے بعد وہ تمام اندیشے خود بخود کافور ہوگئے جو بعض حلقوں نے قبل از وقت محسوس کرنے شروع کر دیئے تھے۔

۲۲ جون ۱۹۶۱ء کو نئی دہلی میں کنونشن کی طرف سے تمام تجاویز پنڈت نہرو وزیر اعظم ہند کی خدمت میں پیش کی گئیں۔ پنڈت جی نے گہرے تاثر اور توجہ کے ساتھ ان کو قبول کیا اور ان ہی تجاویز کی صدائے بازگشت تھی جو ملک بھر میں قومی اتحاد اور یک جہتی کی مہم کی شکل میں رونما ہوئی اور جس کا بیڑا خود وزیر اعظم موصوف نے اٹھایا۔ خود مسلمانوں کے حق میں اس کنونشن کی بڑی افادیت یہ تھی کہ ان کی پریشانیاں اور ان کے مسائل پوری وضاحت کے ساتھ ملک کے سامنے آئے اور تمام ہی سنجیدہ حلقوں نے ان کی تائید اور حمایت کی۔ بہت سی غلط فہمیاں دور ہوئیں۔ ساتھ ہی مسلمانوں میں بڑھتی ہوئی مایوسی اور بیدلی کی جگہ عزم و عمل اور جرأت مندانہ زندگی کے نئے آثار پیدا ہوئے۔ اور وطنی زندگی میں اپنے موقف کا زیادہ صحیح شعور بیدار ہوا۔

بحمد اللہ آج اثرات و نتائج کو سامنے رکھتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ جس طرح ۱۹۴۷ء کی قیامت صغریٰ کے بعد لکھنؤ کانفرنس نے زندگی کی مایوسیوں میں عزم و عمل کی ایک نئی راہ دکھائی اور تاریخ کا رخ بدل دیا تھا ٹھیک اسی طرح مجاہد ملتؒ کی زندگی کا یہ آخری کارنامہ مسلم کنونشن بھی ملک و ملت کی تاریخ کا ایک دور آفریں واقعہ تھا جس نے نہ صرف دلوں اور دماغوں کو ایک نئی روشنی بخشی، بلکہ عزم و کردار کی خشک رگوں کو بھی زندگی کا نیا خون اور شادابی عطا کی یہ بھی مجاہد ملتؒ ہی کی مقبولیت اور ان کا نفوذ و رسوخ تھا کہ ایک آواز پر ملک کے گوشہ گوشہ سے پانچسو سے زائد ڈیلی گیٹ گرمی کی شدت اور سفر کی صعوبتوں کو انگیز کر کے دہلی پہنچے اور وحدت فکر و عمل کا ایک شاندار مظاہرہ تاریخ کی نگاہیں دیکھ سکیں۔

زندگی کے آخری ایام۔ مرض اور وفات

جبل پور، ساگر وغیرہ کے ان حوادث سے مولانا مرحوم کو جو قلبی اور ذہنی اذیت پہونچی اور اصلاح حال کے لئے ان تھک جد وجہد کا جو بے پناہ بوجھ پڑا۔ اس نے مولانا مرحوم کی بڑھاپے کی صحت اور توانائیوں کو بے حد مضمحل کر دیا۔ رمضان کا مہینہ تھا اور اپنے معمول میں وہ سال کے گیارہ مہینے برابر بھاگتے دوڑتے رہتے تھے۔ مگر رمضان میں دہلی سے باہر قدم نکالنا پسند نہیں کرتے تھے۔ مگر اس سال حالات کی سنگینی نے ان کے اس معمول کو بھی قائم نہ رہنے دیا۔ ۸ فروری کو جب وہ آسام کے طویل سفر سے واپس آئے بے حد تھکے ہوئے تھے۔ بخار بھی تھا۔ یہاں آتے ہی انھیں جبل پور کی تشویشناک خبروں سے واسطہ پڑا۔ اور پھر مسلسل کاموں میں لگا رہنا پڑا۔ رمضان ہی میں وہ جبل پور ساگر وغیرہ گئے۔ پھر کنونشن کی تیاریوں کا عظیم بوجھ بھی ان ہی پر پڑا۔ اس دوران میں بعض رفقاء کار نے بھی اپنی غلط روش سے مولانا کی قلبی اذیتوں میں اضافہ کیا اور ایسے نازک وقت میں ان کا دل دکھایا شاید اسی وقت سے مولانا کے شعور پر مستقبل کی پرچھائیاں پڑنی شروع ہو گئی تھیں، چنانچہ مسلم کنونشن سے چند روز پہلے مقامی مسلم ورکرز کی ایک میٹنگ میں تقریر کرتے ہوئے مولانا کی زبان سے وفات سے ایک سال قبل یہ کلمات بے اختیار نکلے:۔

"میں نے خدا سے معاملہ کر لیا ہے۔ میں نعرہ ہائے تحسین و نفریں سے بے نیاز ہو چکا ہوں۔ دنیا کی عمر ہی کتنی ہے، میری تو بس یہی خواہش ہے کہ اللہ کے روبرو جاؤں تو سرخرو ہو کر۔"

مولانا کے ان جملوں کو دہلی کے نوجوان شاعر کامل قریشی صاحب نے اشعار کے رنگ میں یوں ادا کیا تھا:۔

مانا کہ غم و رنج نے مارا ہے مجھے — ہر تلخی و ترشی کو بھی گوارا ہے مجھے
للہ ذرا وقت کے نباض سمجھ — ملت کی تباہی نے پکارا ہے مجھے

میں وقت کی تنقید سے مرعوب نہیں — تنقید نے اے دوست سنوارا ہے مجھے
دنیا کے سہاروں کا میں قائل ہی نہیں — اللہ کی رحمت کا سہارا ہے مجھے

غرضیکہ یہ تمام اندرونی اور بیرونی عوامل آہستہ آہستہ ان کی صحت کی جڑیں کاٹ رہے تھے۔ تھوڑے ہی دن بعد رانچی میں (ستمبر کے تیسرے ہفتہ میں) فساد ہو گیا۔ وہاں بھی مولانا فوراً ہی پہنچے اور ان کے پہنچ جانے سے حالات پر بہت ہی اچھا اثر پڑا۔ اور حکومت بہار نے بروقت مفید قدم اٹھائے۔ رانچی سے مولانا دہلی پہنچے ہی تھے کہ اکتوبر شروع ہوتے ہی علی گڑھ، میرٹھ، ہاپوڑ اور چندوسی میں شرپسندوں نے ایک طوفان بپا کر دیا۔ مولانا کی صحت رفتہ رفتہ اتنی بگڑ چکی تھی کہ مرض و اضمحلال ان کے چہرہ سے نمایاں ہونے لگا تھا۔ ویسے بھی بخار، نزلہ اور کھانسی کی گرفت میں تھے۔ ایک قابل مقامی معالج "ڈاکٹر سلیم" نے مولانا کا معائنہ کیا تو بڑی تشویش محسوس کی اور تمام مشاغل چھوڑ کر کم از کم دس دن کے لئے مکمل آرام اور علاج کا مشورہ دیا۔ لیکن مولانا کی طبیعت ان باتوں کو گوارا نہیں کر سکتی تھی۔ انھوں نے ڈاکٹر سلیم سے صاف کہا کہ میرٹھ، علی گڑھ اور چندوسی میں لوگوں کی جان کے لالے پڑ رہے ہیں اور میں اپنی صحت کی خاطر گھر میں لیٹا رہوں۔ یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا اور پھر واقعۃً اسی شام مولانا علی گڑھ اور پھر میرٹھ وغیرہ پہنچ گئے۔ ان دنوں خاص طور پر محترم حافظ ابراہیم صاحب، جنرل شاہنواز صاحب چودھری چرن سنگھ وغیرہ جو بھی مولانا سے ملا چہرہ کی حالت دیکھ کر تشویش محسوس کی اور اصرار کیا کہ آپ اپنی صحت پر توجہ دیں۔ مگر مرض اپنی جڑیں پکڑتا رہا اور مولانا اپنے کاموں میں اسی تن دہی کے ساتھ لگے رہے۔ چندوسی بھی گئے۔ دہلی میں پنڈت جواہر لال نہرو سے بھی ملتے رہے۔ ۱۵۔۱۶ نومبر کو زندگی میں آخری بار جبل پور، ساگر بھوپال کا سفر بھی اسی حالت میں کیا۔ دسمبر بھی زیادہ تر سفروں میں گزرا۔ جنوری میں میرٹھ، کان پور، امروہہ کے بعض جلسوں میں شریک ہو کر اپنے حلقہ انتخاب میں واپس آئے اور آٹھ دس روز سخت سردی کے عالم میں دیہات و قصبات کا گشت کیا۔ یہاں تک کہ مرض پوری قوت کے ساتھ مولانا کی صحت پر چھا گیا۔ ۲۲ جنوری کو بمبئی جانے کے لئے دہلی واپس پہنچے اور ان کی حالت کو دیکھ کر ہم خدام نے زبردستی بمبئی کا سفر ملتوی کرایا۔ ۲۳ جنوری ۱۹۶۲ء کی تاریخ تھی کہ مولانا زندگی بھر کی تھکن اور مرض جانکاہ کو سنبھالے کر بستر علالت پر ایسے گرے کہ آخرکار اللہ کی رحمتوں نے انھیں بستر علالت سے نہیں، دنیا ہی سے اٹھا لیا۔

علاج کے سلسلہ میں سب سے پہلے مولانا نے اپنے پرانے معالج ڈاکٹر پانڈے سے رجوع کیا اور پہلے ہی دن انھوں نے پھیپھڑوں سے جو پانی نکالا اس میں خون کی گہری آمیزش دیکھ کر وہ کھٹک گئے۔

مزید تحقیق کے لئے خون ٹیسٹ کرایا گیا تو اس میں کینسر کے جراثیم پائے گئے۔ ڈاکٹر پانڈے نے فوراً ہی مولانا کو بمبئی لے جانے کی ہدایت کی، چنانچہ ۲۶ جنوری کو صبح ہی ہوائی جہاز سے مولانا کو بمبئی لے جایا گیا۔ گورنر بمبئی شری سری پرکاش مولانا کے پرانے رفیق اور دوست تھے۔ انھوں نے پورے اہتمام کے ساتھ ٹاٹا ہوسپٹل میں مولانا کو داخل کرایا۔ ایک ماہ وہاں علاج ہوتا رہا اور ۲۶ فروری ۱۹۶۲ء کو مولانا دہلی واپس پہنچے، یہاں بہترین اور ماہر ڈاکٹروں اور معالجوں سے رجوع رہا مگر مولانا صحیح معنیٰ میں مریض عشق تھے۔ ان کی حالت بھی یہ تھی کہ ع مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ علاج کی آخری کوششوں کے لئے یہ طے ہوا کہ مولانا کو امریکہ لے جایا جائے، چنانچہ ۱۶ اپریل ۱۹۶۲ء کو شام کے آٹھ بجے مولانا مرحوم عالمی ایروڈروم "پالم" سے امریکہ روانہ ہوئے، مولانا کے داماد مسٹر عزیز الرحمٰن رفیق سفر رہے۔ امریکہ کی ریاست "وسکونسن" کے مشہور شہر میڈیسن میں ڈھائی ماہ بغرض علاج مقیم رہ کر ۱۲ جولائی کو علی الصباح دہلی واپس پہنچے، حالت بہت گر چکی تھی اتفاق سے ان دنوں دہلی میں گرمی اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی اور بجلی کے تعطل نے اور بھی غضب ڈھا رکھا تھا۔ گرمی کی تکلیف سے مولانا بہت بے چین تھے، اور گلمرگ (کشمیر) جانے کا ارادہ کر رہے تھے۔ تیاری بھی ہو گئی تھی، مگر قضائے الٰہی ان کے لئے گلمرگ کی بجائے گلزار بہشت میں ابدی و سرمدی راحتوں کا اہتمام کر چکی تھی۔ اکیس دن اور قید حیات کے گزار کر ع

آخر اس بیماریٔ دل نے اپنا کام تمام کیا

۲ اگست ۱۹۶۲ء مطابق یکم ربیع الاول ۱۳۸۲ھ کو صبح ۱/۲ ۳ بجے بارگاہ ربّی سے تقرب کی مخصوص ساعتوں میں، وقت اور تاریخ کے طوفانوں سے کھیلنے والی پاکیزہ روح نے اس دیار فنا کو خیرباد کہا ؎

کون ہوتا ہے حریفِ مۓ مردافگنِ عشق   لب یہ ساقی کے مسلسل ہے صلا میرے بعد

حضرت مولانا کی علالت نے پورے ملک کو اضطراب میں مبتلا کر رکھا تھا اور ان کی صحت و شفا کے لئے پورے ملک میں دعائیں ہو رہی تھیں مگر مشیت الٰہی کو ان سے جو کام لینا تھا وہ پورا ہو چکا تھا ؎

کام تھے عشق میں بہت، پر میرؔ   ہم تو فارغ ہوئے شتابی سے

صبح ہوتے ہوتے یہ اندوہناک خبر ہندوستان و پاکستان کی وسعتوں میں پھیل گئی۔ ۱۱ بجے ہم خدام (راقم السطور، مولانا فقیہ الدین، علی محمد صاحب شیخ محمد ادریس صاحب میر محلہ حویلی حسام الدین دہلی۔ اور سید بسمل صاحب شاہجہان پوری) نے اپنے مخدوم مجاہد ملت رحمہ اللہ کو غسل دیا۔ کھادی کا کفن پہنایا، عطر و کافور میں بسا کر سفر خلد بریں کے لئے دولہا بنایا اور احباب و مخلصین کے آخری دیدار کے لئے ۴ بجے تک بنگلہ کے ایک کمرہ میں آرام سے لٹا دیا جہاں رونق صدیقی صاحب اور دوسرے حضرات قرآن حکیم تلاوت کرتے رہے اور مولانا سے تعلق خاطر رکھنے والی بے شمار مخلوق خدا قطار در قطار اپنے محبوب رہنما کی آخری بار زیارت کرتی رہی۔ ان میں دہلی کے لاکھوں ہندو مسلم عوام و خواص بھی تھے اور باہر سے پہنچنے والے احباب کے قافلے بھی، مولانا کے پرانے رفیق وزیر اعظم ہند پنڈت جواہر لال نہرو بھی آئے، دوسرے وزراء اور پارلیمنٹ کے سینکڑوں ممبر بھی، مسلم ممالک کے سفراء اور عمائدین بھی۔ صدر جمہوریہ ہند، نائب صدر جمہوریہ اسپیکر لوک سبھا، آل انڈیا کانگریس کمیٹی، دہلی پردیش کانگریس کمیٹی، دہلی میونسپل کارپوریشن وغیرہ کی طرف سے ملک و وطن کے اس عظیم رہنما کے قدموں پر خراج عقیدت و محبت کے نشان "پھولوں کے حلقے" (ریتھ) نچھاور کئے گئے۔ ۱/۲ ۴ بجے دو لاکھ انسانوں کے بے حال و اشکبار ہجوم نے مجاہد ملت رحمہ اللہ کا جنازہ اپنے کاندھوں پر اٹھایا۔ دہلی دروازہ کے بیرونی میدان میں حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند نے نماز جنازہ پڑھائی اور مغرب کے وقت ملک و ملت کا یہ سرمایۂ عزیز پہلوئے محدثین کرام میں آغوش رحمت کے سپرد کر دیا گیا۔

نغفر اللہ لہٗ و نور مرقدہ واکرم مثواہ واعلیٰ درجاتہ فی جنۃ الخلد وجزاہ عنا وعن سائر الامۃ احسن الجزاء

دل کو سکون روح کو آرام آگیا   موت آگئی کہ دوست کا پیغام آگیا

آخری نقوش

یوں تو مولانا حفظ الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی پوری زندگی فکر و عمل کی ممتاز صلاحیتیں، ملک و ملت کی خوش حالی کے لئے مسلسل جد و جہد اور عظیم الشان کارنامے بجائے خود انسانی تاریخ کا ایک سنہرا ورق ہیں اور ان کی یاد ہزاروں لاکھوں دلوں میں، یوں باقی رہے گی، لیکن زندگی کے آخری حصہ میں بھی جو انھوں نے بستر علالت پر گزارے اپنی سرگزشت اور کوائف کے لحاظ سے ایک عجیب یادگار بن گئے ہیں جن میں ایک طرف

مولانا کے ساتھ عوام وخواص کی بے اندازہ محبت وعقیدت کے نقش بھی بہت ابھر کر سامنے آئے اور دوسری خود مولانا مرحوم کی بے مثل استقامت وعزیمت ،صبر ورضا اور زندگی کے آخری لمحات تک ملک وملت کی لگن اور دردمندیوں کے جوہر بھی بہت ہی نکھر کر دنیا کے سامنے آئے ۔یقیناً مولانا مرحوم کے تذکرہ اور سوانح حیات میں ان آخری نقوش کی آب وتاب اور دلآویزی بھی ہمیشہ نمایاں رہے گی ۔خاص طور پر مولانا کے آخری پارلیمنٹری الیکشن میں جب کہ وہ اپنی بیماری کے باعث آخر تک اپنے حلقہ سے دور رہے نہ صرف ان کے حلقہ کے ہندو مسلم عوام وخواص کا جوش محبت بلکہ دور دور سے مخلصین کی آمد اور کوششیں اور مشرق سے مغرب تک اردو صحافت کے وہ اداریئے جن میں مولانا کی خدمات جلیلہ کو برملا سراہا گیا تھا اور مولانا کے الیکشن کو پورے ملک کی عزت ووقار کا سوال قرار دیا گیا تھا اور پھر الیکشن کے نتیجہ میں سخت مقابلہ کے باوجود مولانا کی شاندار کامیابی ۔اور دوسری طرف ملک بھر میں مولانا کی علالت سے انتہائی تشویش اور صحت یابی کے لئے مسلسل بے تاب دعائیں ۔اس انتہائی قدر وقیمت کے مظاہرے تھے جو مجاہد ملتؒ کے لئے ہندوستان کے ایک گوشہ سے دوسرے گوشہ تک لاکھوں کروڑوں انسانوں کے دلوں میں جاگزیں تھی ۔

گذشتہ صفحات میں یہ ذکر آ ہی چکا ہے کہ شروع ۱۹۶۱ء میں جبل پور وغیرہ کے حادثہ نے جو وحشت ناک شکل اختیار کی ، دل ودماغ پر اس کی چوٹ نے اتنا گہرا اثر کیا تھا کہ اسی وقت سے مولانا کی صحت کو گھن لگ گیا تھا جوں جوں وقت گزرتا گیا ، وہ کاموں کے بے انتہا بوجھ کو سنبھالے ضرور رہے ۔مگر اندر ہی اندر ان کی تندرستی گھلتی جا رہی تھی اور اس کا پورا اندازہ اس وقت ہوا جب جنوری ۱۹۶۲ء میں وہ بیماری سے نڈھال ہو کر بالکل ہی گر گئے ۔

اور تحقیق ومعائنہ کے بعد ڈاکٹروں کو یہ یقین ہو گیا کہ کینسر جیسا مہلک مرض ان پر قابو پا چکا ہے ۔۲۷ جنوری ۱۹۶۲ء کو جب وہ جی ٹی ہوسپٹل میں تھے اور کینسر کی تشخیص قطعی ہو گئی تھی اور بہت عجلت کے ساتھ ان کو بمبئی لے جانے کی تیاریاں ہو رہی تھیں ۔کوشش یہ تھی کہ مولانا کو ڈاکٹروں کی اس تشخیص کا علم نہ ہو ۔لیکن اپنے خدام اور تیمارداروں کے چہروں پر تشویش کے آثار کو بالآخر انھوں نے پا ہی لیا ۔عصر کے بعد محترم حافظ ابراہیم صاحب پہنچ گئے اور مزاج پرسی کرنے لگے تو مولانا خود بول اٹھے کہ "ان لوگوں کو کینسر کا اندیشہ ہے ۔ویسے تو مجھے کچھ سکون معلوم ہو رہا ہے اور بہرحال جو بھی کچھ ہو ۔اللہ کی مرضی ۔اگر بمبئی جانا طے ہے تو اس کا انتظام ہونا چاہیئے " مولانا کے منہ سے یہ الفاظ نکل رہے تھے اور میں حیرانی سے دیکھ رہا تھا ۔اس بیماری کو جاننے کے بعد ذرا بھی ان کے چہرے پر گھبراہٹ یا فکرمندی کا کوئی نشان نہ تھا ۔وقت گزرتا گیا ۔ان جیسا زیرک انسان اس مرض کے انجام سے ناواقف نہ تھا ۔اگلے مہینوں میں یہ تاثر ایک دو بار خود ان کی زبان پر آ بھی گیا کہ تدبیر وعلاج تو جاری رکھنا ہی ہے مگر انجام بھی نامعلوم نہیں ۔

ایک طرف اپنی مہلک بیماری کا یہ ادراک اور یقین اور دوسری طرف زندگی کی آخری ساعتوں تک ان کی استقامت اور صبر وتحمل کا یہ حال کہ بلا ناغہ سینکڑوں ہی احباب ومخلصین مسلم وغیر مسلم ۔امیر وغریب ۔اپنے بیگانے روزانہ اس پورے عرصہ میں ان سے ملتے رہے مگر ایک لمحہ کے لئے بھی کسی ملنے والے نے ان میں مایوسی اور بے صبری کا کوئی اثر محسوس نہ کیا ۔اسی خندہ پیشانی اور محبت کے ساتھ ہر کسی سے ملنا جو زندگی میں ہمیشہ سے ان کا معمول تھا ، آخر تک قائم رہا ۔بڑے بڑے انسانوں کے کردار میں عزم وتحمل کی ایسی مثالیں کم ہی ملیں گی ۔

یہی نہیں بلکہ قومی اور ملی مسائل کی فکر اور کاموں کی دھن جو تندرستی میں ان پر چھائی رہتی تھی ، مہلک بیماری کے ان ایام میں بھی ان سے چھوٹ نہ سکی ۔بمبئی سے واپس آ کر جب تک دہلی میں رہے تمام ہی معاملات کی پرسش احوال کرتے رہے ، خاص طور پر جمعیۃ علماء کی مہمات اس زمانہ میں بھی انھیں عزیز رہیں ۔حضرت مولانا محمد میاں صاحب کو تاکید کر کے اپریل میں مجلس عاملہ کا اجلاس بلوایا جس میں وہ خود اپنے رفقاء جماعت کو اہم ہدایات دینے کے لئے مضطرب تھے ۔(اگرچہ اجلاس کی تاریخ سے پہلے ہی سفر امریکہ کی تیاری ہو گئی اور وہ پروگرام پورا نہ ہو سکا) اور اسی لئے ۱۶ اپریل کو جس روز امریکہ جا رہے تھے ، عصر کے وقت میں حاضر ہوا ، تو سب سے پہلے مجھ سے (اپنی زندگی کا آخری) پیغام لکھوایا جس میں جمعیۃ کی تنظیم اور اس کے مقاصد کی تکمیل کے لئے عامۃ المسلمین اور رفقاء جماعت کو پُر زور نصیحت فرمائی تھی ۔

امریکہ کے قیام میں اخبار الجمعیۃ وہاں کے پاس برابر پہنچتا رہتا تھا ۔برابر دیکھتے اور ہندوستان کے حالات معلوم کرتے رہے ۔اسی دوران انھوں نے پنجاب منسٹر یو ۔پی کو اردو زبان کے سلسلہ میں خط لکھا تھا ۔امریکہ سے واپسی کے بعد ناتوانی اور تکلیف کی انتہائی شدت میں بھی اگر ان کے دماغ پر کوئی فکر تھا تو قومی اور ملی مسائل کا ۔یہ تھا ان کی فدائیت اور دردمندیوں کا عالم ۔افسوس کہ مولانا دنیا سے رخصت ہوئے تو خدمت وعمل کی پوری تاریخ بھی اپنے ساتھ لے گئے ۔اب کون صاحب دل ہے جس کی تنہا ذات خدمت خلق کی ہزار محفلوں پر بھاری ہو گی ________ کس کے گھر جائے گا سیلاب بلا میرے بعد

فما کان قیس هلکه هلك واحد ولکنه بنیان قوم تهدما

جمعیۃ علماء ——— مجاہد ملتؒ کے دور میں

۱۹۱۹ء میں جمعیۃ علماء کی تشکیل اور مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ کی قومی و ملی سرگرمیوں کا آغاز تقریباً ساتھ ساتھ ہوا اور اس وقت سے مولانا مرحوم جمعیۃ علماء سے وابستہ رہے، جوں جوں وقت گزرتا گیا یہ وابستگی اور تعلق بھی بڑھتا رہا یہاں تک کہ مارچ ۴۲ء کے اجلاس لاہور میں جمعیۃ علماء ہند کی نظامت عامہ مجاہد ملتؒ کو تفویض کردی گئی۔ جمعیۃ کے اس اجلاس میں حضرت شیخ الاسلامؒ، حضرت مولانا آزادؒ، حضرت مفتی اعظم مولانا محمد کفایت اللہؒ جیسے اکابر امت کی موجودگی میں اس منصب جلیل پر باتفاق رائے مولانا مرحوم کا انتخاب ہوا۔ اور آنے والے وقت میں مولانا مرحوم نے جس حسن و خوبی کے ساتھ اس عظیم منصب کا حق ادا کیا اور اس کی قدر و منزلت کو چار چاند لگائے۔ وہ درحقیقت ان ہی کا حصہ تھا، مولانا مرحوم اپنی زندگی کے آخری سانس تک یعنی بیس سال مسلسل ملت اسلامیہ کے اس عالی قدر ادارہ اعتماد پر فائز رہے

جمعیۃ علماء کی تاریخ میں مجاہد ملتؒ کا یہ دور اپنی بھرپور خدمات، وسیع تنظیم، دور آفریں کارناموں اور عوام و خواص میں اپنے اعتماد و مقبولیت کے لحاظ سے جمعیۃ کی تمام تاریخ پر بھاری نظر آتا ہے نصب العین اور اغراض و مقاصد کے لحاظ سے اس سے پہلے بھی جمعیۃ علماء اپنا ہی موقف رکھتی تھی۔ لیکن ان دنوں جنگ آزادی کی ہماہمی اس شدت کے ساتھ جاری رہی کہ جماعتی خدمات اور سرگرمیوں کا بڑا حصہ اسی محاذ پر صرف ہوتا رہا۔ اسی لئے جمعیۃ علماء اس وقت ملک کی ایک حریت پسند سیاسی جماعت کی حیثیت سے نمایاں رہی۔

ایک دوسرا پہلو یہ بھی تھا کہ جمعیۃ علماء اس وقت عوام سے زیادہ علماء کی مخصوص تنظیم سمجھی جاتی تھی۔ دستوری لحاظ سے بھی اس کی تنظیم اتنی وسیع اور ہمہ گیر نہ تھی۔

مجاہد ملتؒ نے اس کی قیادت سنبھالی تو اس وقت وطن عزیز کی تحریک آزادی اپنی آخری منزل میں تھی۔ اسی سال (۴۲ء) کے وسط میں "کوئٹ انڈیا" کی آخری تحریک برپا ہوئی اور دوسرے عمائدین جماعت کے ساتھ ساتھ مجاہد ملت بھی نظر بند کردیئے گئے۔ دو سال قید و بند میں گزار کر ۲۴ جولائی ۴۴ء کو آپ بریلی جیل سے رہا ہو کر آئے اور فوراً ہی اپنی جماعتی ذمہ داریوں کی تکمیل میں مصروف ہوگئے۔ اس وقت سے اب تک جمعیۃ کے افکار و اعمال میں مجاہد ملتؒ کا قائدانہ کردار مسلسل نمایاں رہا۔ اور اس میں شک نہیں کہ مولانا مرحوم نے جس تندہی اور انہماک کے ساتھ بیس سال کے اس طویل عرصہ میں خدمت و عمل کی راہوں کو آباد رکھا، اس نے جمعیۃ کو ایک نئی تاریخ اور ایک نیا کردار بخشا اور بلند سے بلند موقف تک پہنچایا۔ مجاہد ملت کے اس دور میں جمعیۃ علماء ہند ایک سیاسی تحریک سے بڑھ کر جہد و عمل کا مرکز بن گئی اور اس کی خدمات کا دائرہ زندگی کے تمام شعبوں تک پھیل گیا۔ ساتھ ہی دستوری اور تنظیمی لحاظ سے وہ ملک بھر کے مسلمانوں کی وسیع واحد نمائندہ تنظیم بن گئی، اور ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں اس کی قیادت و اعتماد کے پرچم لہرانے لگے۔ وطن عزیز کے کتنے ہی علاقے ایسے تھے جہاں ۴۷ء تک جمعیۃ کے تنظیمی نشان قائم نہیں ہوئے تھے۔ لیکن ۴۷ء کے بعد سرزمین ہند کی کوئی ریاست، کوئی علاقہ اور کوئی گوشہ ایسا باقی نہیں رہا جہاں جمعیۃ علماء کی مقبولیت و اعتماد نے اپنا اثر نہ قائم کیا ہو اور یہ سب کچھ نتیجہ تھا مجاہد ملتؒ کی فکری اور عملی صلاحیتوں اور ان کی ان تھک جد و جہد کا۔

مرکزی دفتر

جمعیۃ کی تاریخ میں مجاہد ملتؒ کا دور ایک ایسے وقت سے شروع ہوتا ہے جب کہ جمعیۃ اپنے سر و سامان کے لحاظ سے بھی کچھ بہت منظم اور مضبوط نہ تھی۔ تحریک آزادی کی دار و گیر اور سیاسی افکار کے تصادم نے اس کے پھولنے پھلنے کی راہیں بڑی حد تک مسدود رکھیں جمعیۃ کا مرکزی دفتر اس وقت کرایہ کے ایک مکان میں، مالی لحاظ سے مقروض و زیربار اور دفتری نظم کے لحاظ سے بہت محدود تھا۔ صرف ایک محرر اور ایک کارندہ ہی اس کی بساط تھی۔ نہ ٹیلی فون تھا، نہ ٹائپ مشین۔ عوام و خواص کے رجوع اور مشاغل کار کے لحاظ سے بھی اس کا دائرہ محدود تھا۔ لیکن مجاہد ملت کے دور میں اپنے ساز و سامان اور وسعت کار کے لحاظ سے اس کی مرکزی حیثیت اتنی نمایاں ہوئی کہ بجا طور پر وہ ایک ملک گیر تحریک کا مرکزی دفتر معلوم ہونے لگا۔ آج حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب کے تخمینہ کے مطابق مرکزی دفتر کا اثاثہ لاکھوں کی مالیت کا ہے۔ اس کی اپنی جائداد ہے ٹیلی فون ہے کئی کئی کاریں ہیں۔ مختلف شعبے ہیں اور وسیع اسٹاف ہے۔ پورے ملک سے مراسلت کا رابطہ ہے اور دسیوں انفرادی اور اجتماعی مسائل ہر روز اس کے مشاغل کار میں جگہ پاتے ہیں۔

اخبار

آج کی دنیا میں کسی بھی زندہ جماعت اور تنظیم کی آواز اخبار ہی کے ذریعہ پھیلتی اور بڑھتی ہے۔ اسی خیال سے جمعیۃ علماء کا جماعتی آرگن الجمعیۃ ایک بار پہلے بھی جاری کیا گیا تھا۔ مگر برطانوی دور حکومت اس کو برداشت نہ کرسکا۔ مجاہد ملتؒ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے دور نظامت میں سب سے پہلے جماعت کی جن ضرورتوں پر جد و جہد فرمائی وہ دفتر کا اپنا مکان اور الجمعیۃ کا دوبارہ اجراء ہی تھا۔ چنانچہ مولانا موصوف کے دور میں جمعیۃ کا سب سے پہلا اجلاس عام

مئی ۱۹۴۵ء میں سہارنپور میں چھاپہ۔ اور دہلی میں تعمیر فنڈ اور اخبار فنڈ کی تجویزیں بروئے کار آئیں اور دو ہی سال کے بعد یعنی دسمبر ۱۹۴۷ء میں ایک طرف دفتر نے وہ مکان خرید لیا جہاں پہلے اس کی حیثیت کرایہ دار کی تھی اور دوسری طرف روزنامہ الجمعیۃ کا دوبارہ اجراء عمل میں آیا جو بحمد اللہ آج تک جاری ہے اور اسی کو عوامی اور سرکاری حلقوں میں مسلمانوں کی جماعتی آواز سمجھا جاتا ہے۔

مسیج ویکلی

روزنامہ الجمعیۃ کے کامیاب اجراء کے بعد مولانا مرحوم کی دوسری کوشش یہ تھی کہ مسلمانانِ ہند کی آواز کو زیادہ مؤثر اور مضبوط بنانے کے لئے جماعتی سطح پر ایک انگریزی اخبار بھی جاری کیا جائے۔ چنانچہ ملک کے ہنگامی حالات نے جونہی ان کو کچھ مہلت دی انھوں نے انگریزی اخبار کے لئے جدوجہد شروع کر دی۔ نومبر ۱۹۵۰ء میں سب سے پہلے وہ اس کوشش میں بمبئی گئے پھر جنوری ۱۹۵۱ء میں اپنے رفیق محترم مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی کے ہمراہ بمبئی کا دوسرا سفر کیا۔ اور دس روز وہاں مقیم رہ کر مخیر مسلمانوں کو اس اہم ملی اور جماعتی ضرورت پر متوجہ کیا۔ اسی سال میں مالی گاؤں، راندیر، ڈابھیل، سورت، وغیرہ اور بار بار بمبئی کے سفر کئے، یہاں تک کہ ان کی کوششیں بار آور ہوئیں اور تقریباً ایک لاکھ روپیہ کے سرمایہ سے ہفتہ وار مسیج ۲۲ دسمبر ۱۹۵۱ء سے جاری ہو گیا۔ اس کے اجراء میں بمبئی اور دیگر مقامات کے مسلمانوں نے فراخ دلی کے ساتھ مولانا مرحوم کی اپیل پر لبیک کہا۔ افسوس کہ مسلمانوں کی عام اقتصادی زبوں حالی اس کی راہ میں حائل رہی اور مسیج ویکلی تین سال سے زیادہ جاری نہ رہ سکا۔ پھر بھی مولانا مرحوم انگریزی اخبار کی فکر میں برابر رہے اور زندگی کے آخری دو برس تو انھوں نے برابر اس لگن میں گزارے کہ کس طرح مسلمانوں کی اس اہم خدمت کو بھی اپنے جیتے جی انجام دے جائیں۔

پریس۔ بک ڈپو اور لائبریری

مرکزی دفتر کے دوسرے شعبے جو مولانا مرحوم کے دور میں قائم ہوئے اور بفضلہ تعالیٰ ترقی کر رہے ہیں وہ الجمعیۃ بک ڈپو۔ لائبریری (جس میں کم و بیش پانچ ہزار کتابیں اب تک فراہم ہو چکی ہیں) اور الجمعیۃ پریس ہے۔ ان میں خاص طور پر پریس کا قیام بڑی جدوجہد کا متقاضی تھا۔ لیکن ۱۹۵۲ء سے ۱۹۵۵ء تک مولانا مرحوم کی مسلسل کوششوں اور کاوشوں کے بعد الجمعیۃ پریس قائم ہو سکا جس کا افتتاح ۳۰ مارچ ۱۹۵۵ء کو حضرت شیخ مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔

مرکزی دفتر کی اس تمام ترقی اور تنظیم میں مولانا کے رفقاء کرام (مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب اور مولانا سید محمد میاں صاحب) کی شبانہ روز جدوجہد اور مسلسل تعاون کو بھی بڑا دخل ہے۔ اگر یہ حضرات ہاتھ نہ بٹاتے تو مولانا کے رات دن کے ہنگامی مشاغل میں نہ جانے کب تک یہ سلسلہ تشنۂ تکمیل ہی رہتا۔

مرکزی دفتر کی توسیع اور تنظیم سے الگ خود جماعت کی وسیع تنظیم۔ ملک گیر پیمانہ پر اس کو روشناس اور مقبول بنانے، اس کے اغراض و مقاصد کو ایک تحریک کے طور پر ملک کے گوشہ گوشہ میں برپا کرنے اور اس کی سرگرمیوں کا وسیع سے وسیع تر دائرہ بنانے کے لئے مولانا مرحوم نے جس انہماک اور تندہی کے ساتھ جدوجہد فرمائی آج ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جمعیۃ علماء کا پھیلا ہوا انتظام، اس کی ہزاروں شاخیں، ان کے دفاتر اور مخلص کارکنوں کی دن رات خدمت گزاری یہ سب کچھ اسی جدوجہد کے روشن آثار اور ناقابلِ تردید شہادت ہیں۔

مولانا مرحوم کی اس لگن اور ان تمام کوششوں کا محرک صرف ان کے عہدہ اور منصب (نظامت عامہ) کی ذمہ داریاں ہی نہیں تھیں۔ بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ مولانا مرحوم کی نظر، دین مبین کی سچی تعلیمات پر تھی ـــ ایک روشن ضمیر اور صاحب بصیرت عالم دین کی حیثیت سے وہ ہمیشہ ہندوستان بھر کے مسلمانوں کو ایک باوقار جماعتی زندگی سے مربوط دیکھنا چاہتے تھے۔ ملت اسلامیہ میں انفرادیت اور انتشار کے رجحانات سے وہ ہمیشہ نالاں رہے اور برابر اس کوشش میں رہے کہ چھوٹی چھوٹی گروہ بندیوں اور کشمکش سے بالاتر ہو کر "وحدت کلمہ" کی بنیاد پر ہندوستان کے مسلمان منظم ہوں اور صحیح ایجابی شعور کے ساتھ اپنی جماعتی زندگی بنائیں۔ ایک طرف پوری جرأت مندی اور استقامت کے ساتھ اپنے دین و ایمان پر قائم رہیں اور دوسری طرف اپنے وطن اور پوری انسانیت کی خدمت اور خیر خواہی کے علمبردار ہوں کہ یہی ایک سچے مسلمان کا کردار ہو سکتا ہے۔ خاص طور پر آزاد ہندوستان کے اس نئے اور تعمیری دور اور بدلے ہوئے حالات میں یہ اور بھی زیادہ ضروری ہو گیا ہے کہ مسلمان تنگ نظری اور افتراق باہم کے سایہ سے بھی دور رہیں، تب ہی وہ اپنی وطنی زندگی میں آبرومندی اور عزت کا مقام حاصل کر سکتے ہیں۔

اپنے اس بنیادی فکر اور پیغام کو لے کر وہ ہندوستان کی آخری سرحدوں اور ساحلوں تک گئے، عوام و خواص سے ملے اور مسلمانوں کے ہر اجتماع۔ مجلس و رہبر طبقہ کو انھوں نے دعوت دی کہ جمعیۃ علماء کو اپنائیں، کیونکہ یہی ایک تحریک ہے جس کی مرکزیت پر آج کے حالات میں مسلمانانِ اپنی جماعتی زندگی کی بنیادیں استوار کر سکتے ہیں۔

یہی بنیادی نقطۂ نظر داعی تھا کہ تقسیم ہند کے فوراً ہی حضرت مولانا نے جمعیۃ کے دستوری اور تنظیمی دائروں کو بھی اتنا وسیع کرا دیا کہ ہر مسلمان مرد و عورت اس کی ممبری قبول کر سکے اور اس کی تنظیم کسی مخصوص حلقہ تک محدود نہ رہے چنانچہ آج جمعیۃ علماء اپنے دائرہ تنظیم و کار کے لحاظ سے تمام مسلمانان ہند کی ایک عام، وسیع اور ہمہ گیر تحریک بن چکی ہے اور یہ تمام تر نتیجہ ہے حضرت مجاہد ملت رحمۃ اللہ علیہ کی قائدانہ صلاحیتوں، دوراندیشیوں اور ان تھک کوششوں کا، اور یہی ان کی مجاہدانہ زندگی کا یادگار مشن اور آخری پیغام ہے۔

نہ افسوس یہ بڑی بدقسمتی تھی کہ تقسیم ہند کے بعد ملک میں طبقاتی کشمکش اور جذباتی شورشوں نے بڑی قوت کے ساتھ سر اٹھایا اور اس کے ہاتھوں نت نئے ہنگامی اور وقتی مسائل رونما ہوتے ہی رہے اور مولانا حفظ الرحمن صاحب جیسے اولوالعزم رہنما کی فکری اور عملی صلاحیتوں کا ایک بڑا حصہ اس دور کی ناگہانی آفات و مشکلات پر صرف ہوتا رہا۔ لیکن اگر یہ صورت حال رونما نہ ہوتی اور ہنگامی مسائل و مہمات سے ان کا وقت بچ سکتا تو وہ یقیناً اپنی پوری توجہات اور سرگرمیوں کے ساتھ اپنے اسی مشن کی آبیاری اور تکمیل میں مصروف رہتے اور ان حالات میں بھی جتنا کچھ کر سکے اس سے کہیں زیادہ مسلمانان ہند کی اجتماعی زندگی کو منظم اور مستحکم کر جاتے۔ مولانا مرحوم کے دنیا سے اٹھ جانے کے بعد اب یہ ہمارا فرض ہے کہ اس مقدس نصب العین کو ہمیشہ سربلند رکھنے کا عہد کریں کہ اس کی سربلندی ہماری اپنی سربلندی اور کامیابی ہے

آج ہندوستان کی جغرافیائی وسعتوں کا ایک حصہ تو وہ ہے جو ابتدا ہی سے جمعیۃ علماء ہند کی قومی اور ملی سرگرمیوں سے متعارف اور قریب رہا ہے اور تقسیم ہند سے پہلے بھی جمعیۃ کے نظام کار میں شریک و سہیم رہا ہے۔ لیکن متعدد ریاستیں اور علاقے ایسے ہیں جنھوں نے جمعیۃ علماء کو مجاہد ملت رحمۃ اللہ علیہ ہی کے ذریعہ پہچانا اور ان کی عظیم خدمات اور دردمندیوں نے جمعیۃ کے ساتھ وابستگی اور گرویدگی کی فضا پیدا کی۔ خاص طور پر ہندوستان کی نئی اور وسیع ریاست "راجستھان"، مدھیہ بھارت، مہاکوشل و مدھیہ پردیش۔ آندھرا، کرناٹک و میسور، بنگلور، کیرالا (مالابار) کورگ، کاٹھیاواڑ (اور سابق بمبئی گجرات و مہاراشٹر کے متعدد علاقے) ان تمام علاقوں اور ریاستوں میں جمعیۃ علماء کی تنظیم ۱۹۴۷ء کے اواخر سے شروع ہوئی۔ ان میں سے ہر جگہ مجاہد ملت رحمۃ اللہ علیہ خود بار بار تشریف لے گئے اور بڑی محنت اور تندہی کے ساتھ انھوں نے خدمت و عمل کا یہ سدابہار چمن لگایا جو آج "جمعیۃ علماء" کے نام سے ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک لہلہا رہا ہے۔

راجستھان میں وہ سب سے پہلے دسمبر ۱۹۴۸ء میں جے پور تشریف لے گئے اور وہاں شیخ محمد اسلام صاحب (مرحوم) حبیب الغفار صاحب وکیل اور حاجی نہال احمد و حاجی محمد عثمان صاحب (مرحوم) نے مولانا کی جماعتی اپیل پر لبیک کہا۔ جنوری ۱۹۴۹ء میں جودھپور کے احباب مرحوم مولانا حکیم محمد ابراہیم صمصامی، مولانا حکیم محمد علی غوری، وکیل احمد بخش صاحب سندھی بیکانیری وغیرہ نے مولانا کی دعوت کو اپنایا۔ ادھر ٹونک کے احباب خاص طور پر حکیم سید ظہیر احمد صاحب برکاتی اور مولانا سید قاضی الاسلام۔ ناگور کے وکیل رشید احمد صاحب۔ عبدالقیوم غوری صاحب۔ سوائے مادھوپور میں حکیم سید شاہد علی صاحب نگینوی اور سید عابد علی صاحب وکیل بھیلواڑہ کے عبدالشکور غوری صاحب، کوٹہ کے حافظ عبدالحلیم صاحب اور وکیل احمد بخش صاحب جھالاواڑ کے حاجی جان محمد اور اعجاز محمد خاں صاحب۔ اجمیر میں مولانا عبدالشکور۔ دیوان سید عنایت حسین صاحب اور سید عباس علی صاحب وغیرہ الور سے مولوی ابراہیم صاحب غرضیکہ رفتہ رفتہ مخلص احباب کی ایک پوری جماعت سامنے آگئی جس نے راجستھان کے گوشہ گوشہ میں جمعیۃ کی تنظیم قائم کی

جنوبی ہند میں بھی مولانا مرحوم کی آمد و رفت ۱۹۴۸ء میں شروع ہوئی۔ کرناٹک، میسور، بنگلور، مالابار، کورگ وغیرہ کے دوروں کا ذکر کسی دوسری جگہ آچکا ہے۔ اُس وقت سے ان وسیع علاقوں میں جمعیۃ کی بنیادیں استوار ہوئیں۔

مدھیہ پردیش کے مختلف حصوں میں بھی مولانا مرحوم نے در در کی خاک چھان کر جماعتی نظام کو برپا کیا۔ خاص طور پر دسمبر ۱۹۶۲ء، نومبر ۱۹۵۴ء اور پھر اپریل ۱۹۵۶ء میں محترم حافظ جمیل الرحمن صاحب۔ سید نور علی شاہ صاحب اور مولانا مسعود احمد صاحب صدیقی کے ہمراہ بہت تفصیلی دورے کئے اور ریاست کے چپہ چپہ پر جماعتی زندگی کی شمعیں روشن کیں۔

خدا کرے کہ مجاہد ملت رحمۃ اللہ علیہ کا لگایا ہوا یہ چمن تادیر سرسبز و شاداب رہے اور اس کی نفع بخشیوں سے ملک و ملت مستفید ہوتے رہیں۔

مجاہد ملتؒ کے دور میں جمعیۃ کے سالانہ اجلاس

★ جمعیۃ علماء ہند کا تیرھواں سالانہ اجلاس ۲۰ تا ۲۲ مارچ ۱۹۴۲ء لاہور میں منعقد ہوا۔ اسی اجلاس میں مرکزی جمعیۃ کی نظامت عمومی حضرت مجاہد ملت کو تفویض ہوئی۔

★ جمعیۃ علماء ہند کا چودھواں سالانہ اجلاس ۷ مئی ۱۹۴۵ء سہارنپور شہر میں ہوا۔ صدر اجلاس حضرت شیخ الاسلامؒ اور صدر استقبالیہ خواجہ اظہر حسین تھے۔ کشمیر کے رہنما شیخ محمد عبداللہ بھی اس اجلاس میں شریک تھے۔

★ جمعیۃ علماء ہند کا پندرھواں سالانہ اجلاس زیر صدارت حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ ۲۶، ۲۷ اپریل ۱۹۴۸ء بمبئی میں ہوا جس کا افتتاح مولانا آزاد نے کیا اور وزیر اعظم ہند پنڈت جواہر لال نہرو بھی اس میں شریک ہوئے۔

★ جمعیۃ علماء ہند کا سولھواں سالانہ اجلاس منعقدہ لکھنؤ ۱۶، ۱۷، ۱۸ اپریل ۱۹۴۹ء بصدارت حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنیؒ مولانا مصطفیٰ حسن صاحب صدر استقبالیہ تھے

★ جمعیۃ علماء ہند کا سترھواں سالانہ اجلاس منعقدہ ۲۷، ۲۸، ۲۹ اپریل ۱۹۵۱ء حیدرآباد دکن۔ بصدارت شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ مولانا حکیم مقصود جنگ مرحوم صدر استقبالیہ تھے۔

★ جمعیۃ علماء ہند کا اٹھارواں سالانہ اجلاس ۱۱، ۱۲، ۱۳ فروری ۱۹۵۵ء کلکتہ بصدارت حضرت شیخ الاسلامؒ

★ جمعیۃ علماء ہند کا انیسواں سالانہ اجلاس ۲۷-۲۸-۲۹ اکتوبر ۱۹۵۶ء سورت۔ صدر حضرت شیخؒ سکریٹری استقبالیہ جناب محسن بھائی حضوری اور جمعیۃ علماء گجرات کے مخلص اور سرگرم رفیق سید عبدالحق قادری صاحب اور مولوی محمد میاں صاحب ابن مولانا مفتی مہدی حسن صاحب نے اس اجلاس کی کامیابی کے لئے بڑی ہی تندہی اور سرگرمی کے ساتھ کام کیا مسٹر غلام رسول قریشی صدر استقبالیہ تھے۔

★ جمعیۃ علماء ہند کا بیسواں سالانہ اجلاس ۹-۱۰-۱۱ دسمبر ۱۹۶۰ء اجین بصدارت حضرت مولانا فخرالدین صاحب صدر استقبالیہ حضرت مولانا مفتی محمود احمد صدیقی صاحب تھے

مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ اور کانگریس

یوں تو حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ اپنے ہوش و شعور کے وقت سے آخر تک پورے عزم و یقین کے ساتھ نہ صرف اپنے نظریات میں بلکہ عمل اور مجاہدوں میں بھی انڈین نیشنل کانگریس سے وابستہ رہے۔ لیکن ملک میں سیاسی ہما ہمی اور تحریک کے ساتھ ساتھ یہ تعلق اور بھی پختہ ہوتا چلا گیا یہاں تک کہ جذبات کے انتہائی عروج اور نظریات کے شدید تصادم کے دور میں بھی مولانا مرحوم کے اس تعلق میں کبھی کوئی کمزوری نہیں آئی۔

آزادیٔ وطن کے بعد اگست ۱۹۵۰ء میں اجلاس ناسک کے موقع پر آنجہانی پرشوتم داس ٹنڈن کانگریس کے صدر ہوئے اور گیارہ مہینے انتہائی کشمکش میں گزار کر بالآخر انہیں صدارت سے دست بردار ہونا پڑا۔ ٹنڈن جی کا دور صدارت کانگریس کی تاریخ میں اندرونی خلفشار اور انتہائی کشمکش کا دور رہا ہے۔ یہاں تک کہ مرحوم رفیع احمد قدوائی جیسے بڑے بڑے کٹر کانگریسی بھی اس زمانے میں الگ ہو گئے تھے۔ پنڈت نہرو اور مولانا آزادؒ نے بھی یہ دور انتہائی بیزاری اور ناراضی کے ساتھ گزارا۔ لیکن مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے (ٹنڈن جی کے بعض نظریات سے انتہائی بیزار ہوتے ہوئے بھی) اس دور میں اپنی پسندیدہ جماعت کو نہ چھوڑا۔ اس لئے کہ ملکی سیاست میں وہ انڈین نیشنل کانگریس ہی کو سچے اصول و نظریات کا علم بردار سمجھتے تھے۔ پھر جب ہم اس پہلو پر بھی نظر رکھیں کہ کانگریس کے ساتھ اتنی گہری اور عملی وابستگی عمر بھر مولانا مرحوم کے لئے ایک کڑی آزمائش اور ایثار و فداکاری کا مسلسل امتحان بنی رہی ہے اور اس کی بدولت انھوں نے ہمیشہ اپنے ہم مذہبوں کے سخت سے سخت تہمتیں گھناؤنے الزامات لگائے گالیاں بھی کھائیں۔ اذیتیں بھی سہیں۔ طرح طرح کے نقصان اور صدمے برداشت کئے اور ساتھ ہی اپنی زندگی کی راحتوں، اپنے کسب معاش بلکہ صحت اور تندرستی

سے بھی منہ پھیر لیا تو ان کی اصول پسندی، استقامت اور کردار کی بلندی اور بھی نمایاں ہوتی ہے ۔

کانگریس سے تعلق رکھنے والے بہت سے ایسے بھی ہیں جنھوں نے پوری عافیت پسندی کے ساتھ اپنی کانگریسیت نباہ دی۔ لیکن مولانا مرحوم اس سطح سے بہت بلند تھے۔ انھوں نے کانگریس کو اپنایا تو ہر فکر و لالچ سے بلند ہوکر، اس کے مقاصد کی تکمیل اور اس کی تحریکوں کی کامیابی کے لئے اپنی جان کھپائی اور کھل کر اس کی سرگرمیوں میں حصہ لیا۔ آزادی وطن کی خاطر پچھلی چوتھائی صدی میں کانگریس کی جتنی تحریکیں اٹھیں اور جب جب گرفتاری اور قید و بند کی نوبت آئی، مولانا ہر موقع پر پیش پیش ہی نظر آئے ۔

صوبہ یو۔ پی کانگریس میں مدت تک مولانا ایگزیکیٹو کے رکن رہے۔ سنہ ۳۶ء سے آخر تک آل انڈیا کانگریس کے ممبر بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ قائدین کی صف میں شامل رہے۔ ہندوستان کی آزادی کے بعد کانگریس ٹکٹ پر ہی وہ چودہ سال مسلسل دستور ساز اسمبلی اور پارلیمنٹ کے رکن منتخب ہوتے رہے۔ اے آئی سی سی کے ہر اجلاس میں بڑے اہتمام کے ساتھ شریک ہوتے۔ ضرورت ہوتی تو درپیش مسائل پر تقریر بھی کرتے۔ الیکشن کا زمانہ آتا تو پورے جوش اور تندہی کے ساتھ کانگریسی امیدوارون کی کامیابی کے لئے جہاں تہاں دورے اور تقریریں کرتے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ سنہ ۵۲ء اور سنہ ۵۷ء کے جنرل الیکشن میں مولانا مرحوم کا مقام ان گنے چنے کانگریسی رہنماؤں میں تھا جن کا بے پناہ اثر و نفوذ، جن کے بیان و تلقین اور ساحرانہ تقریروں پر کانگریس کی بھرپور کامیابی کا مدار ہوتا تھا اور جن کی کوششیں پورے ملک کی فضا بدل دیتی تھیں۔ مولانا کی ہمیشہ یہ عادت رہی کہ جب بھی کسی ہنگامی معاملہ میں کسی جگہ جاتے تو سب سے پہلے کانگریس کے کارکنوں کو جمع کرتے اور ان کی ذمہ داری یاد دلاتے، ان کے تعاون ہی سے معاملہ کا حل اور اصلاح کی تدبیر فرماتے۔ یہ بھی ان کے جماعتی احساس اور وضعداری کا نشان تھا۔

ملک کی آزادی سے پہلے کانگریسی ہونا جتنا خطرناک اور حوصلہ طلب تھا، آزادی کے بعد اتنا ہی آسان بلکہ مصلحت وقت، بن گیا تھا لیکن مولانا مرحوم نے جس عزم و استقامت، عالی حوصلگی، بے غرضی اور خلوص نیت کے ساتھ آزادی سے پہلے دور میں کانگریس کو اپنایا تھا، آزادی کے بعد بھی کردار کی اسی بلندی پر قائم رہے یہی وجہ ہے کہ آزادی کے بعد جب ۴۷ء سے اکثریت کی فرقہ پرستی اور نفسانفسی نے سر اٹھایا اور ہندوستان کے شہری مسلمانوں کو طرح طرح سے پامال کرنے پر کمر باندھی تو مولانا مرحوم تیور بدل کر اٹھے اور ان ہی رفقاء جماعت کو جو کل تک جیل کے ساتھی اور آج اقتدار و اختیار کے مسند نشین تھے، مولانا نے قدم بقدم ٹوکا۔ گاندھی جی پنڈت نہرو۔ سردار پٹیل اور مولانا آزادؒ کا ہاتھ پکڑا۔ بڑے بڑے منسٹروں اور چیف منسٹروں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ان سے کہا!

"اگر ہندوستان کا بنیادی دستور کوئی زندہ حقیقت ہے تو یونین کے پانچ کروڑ مسلم شہریوں کو یرغمال نہیں بنایا جا سکتا۔ ان مسلمانوں کی وفاداری کا مسئلہ ایک فرسودہ سوال بن چکا ہے۔ بار بار اس کو زیر بحث لانا نہ ملک کی کوئی خدمت ہے نہ دماغ کی کوئی ذہانت۔ اگر کچھ مسلمان اس لئے غیر وفادار ہیں کہ انھوں نے ملک کی تقسیم کے لئے رائے دی تھی اور ایک ہی رات میں ان کے دل نہیں بدل سکتے تو آر ایس ایس اور دوسری فرقہ دار جماعتیں جو آج تک جمہوری مقاصد کو تباہ کرتی رہی ہیں۔ کانگریس میں شامل ہوکر بھی کس طرح ایک ہی رات میں اپنے دل و دماغ کو بدل سکتی ہیں اگر ان کو اپنانے کی تدبیریں کی جاسکتی ہیں تو یہ کیوں ناممکن ہے کہ انصاف و جمہوریت کی فضا پیدا کرکے ان مسلمانوں کے دلوں کو بھی اپنا لیا جائے"

"کسی بھی جائز شکایت کے موقع پر پاکستان یا لیگ کا نام لے کر ہماری آواز کو دبانے کی کوشش نہ کی جائے، ہم نے وطن کی آزادی کے لئے اسی طرح اپنی جان کی بازی لگائی ہے جس طرح دوسروں نے۔ آج وطن کی سرزمین پر جواہر لال نہرو اور سردار پٹیل اپنا حق رکھتے ہیں تو حسین احمد، کفایت اللہ اور حفظ الرحمٰن کو بھی وہی حق حاصل ہے اور ان کے اس حق کو چھینا نہیں جا سکتا"

آج بلا تامل یہ کہا جا سکتا ہے کہ تحریک آزادی وطن اور کانگریس میں مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ کی شرکت اور سرفروشانہ جدوجہد جس طرح وطن عزیز کی سربلندی کا ذریعہ بنی مسلمانان ہند کو بھی، خاص طور پر پچھلے پندرہ برس میں اسی کردار کی بدولت بہت کچھ تحفظ اور سہارا حاصل ہوسکا۔ آج اس واقعہ سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ۴۷ء سے ۶۲ء تک آزادی کے دور میں مسلسل اکثریت کی فرقہ پرستی کو چیلنج کرنے اور مسلمانان ہند کے ساتھ کی جانے والی بے انصافیوں کے انسداد و اصلاح کے لئے انتہائی بے جگری اور تندہی کے ساتھ مجاہدانہ کارنامے انجام دینے کی جو سعادت مولانا مرحوم کے حصہ میں آئی اس کا سرچشمہ مولانا مرحوم کا یہی بلند و بالا،

بے باک، بے غرض کردار تھا جو ہر موقع پر ان کی آواز میں اثر اور ارادوں میں قوت بن کر ابھرتا تھا اور ماحول پر چھا جاتا تھا۔

یو۔پی اور دہلی تو خیر ان کا گھر تھا۔ اس پوری بات میں میرا خود مشاہدہ یہ ہے کہ وہ جب خالص مسلمانوں کے مسائل و معاملات کو لے کر ہندوستان کے کسی بھی حصہ میں جاتے خواہ پنجاب ہو یا راجستھان۔ مدھیہ پردیش ہو یا اڑیسہ۔ مہاراشٹر ہو یا گجرات، بہار، بنگال ہو یا آسام حتیٰ کہ جنوبی ہند میں آندھرا۔ مدراس اور میسور تک کہیں بھی وہ پہنچتے، کسی بھی ملاقات اور تعارف کے بغیر بھی، وہاں کے ریاستی حکام، وزراء اور وزیر اعلیٰ بھی اسی احترام و عقیدت کے ساتھ ان سے ملتے۔ ان کی بات سنتے اور دھیان دیتے تھے جس کی توقع دہلی یا یو۔پی میں ہو سکتی تھی۔

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا

بھوپال کا واقعہ

مارچ ۵۹ء میں بھوپال شہر میں سخت فساد رونما ہوا۔ رمضان شریف کے دن تھے۔ حالات کی سنگینی کو سن کر مولانا فوراً بھوپال پہنچے، میں ساتھ تھا۔ وہاں شہر کے حالات دیکھے۔ جمعیۃ کے مقامی ذمہ دار حضرات سے پوری سرگزشت سنی۔ اتفاق سے وزیر اعلیٰ ڈاکٹر کاٹجو باہر گئے ہوئے تھے اور ڈپٹی ہوم منسٹر صاحب ہی (جو گوالیار کے باشندہ تھے اور پہلے کبھی مولانا سے ان کی ملاقات نہیں ہوئی تھی) صورت حال کی دیکھ بھال کر رہے تھے۔ مولانا نے ان سے وقت لیا اور ان کے بنگلہ پہ ملاقات ہوئی۔ انسپکٹر جنرل پولیس بھی موجود تھے۔ مولانا کے ساتھ صرف میں تھا۔ گفتگو شروع ہوئی۔ مولانا نے اپنے مشاہدات بتا کر جب حکومت کی غلط روش اور بے محل اقدامات کا ذکر کیا تو وہ کچھ برہم ہونے لگے۔ مولانا تو پہلے ہی جوش میں تھے۔ گفتگو کی تلخی بڑھی اور منسٹر صاحب موصوف کے اکھڑے اکھڑے جواب سن کر اور بھی گرما گئے۔ منسٹر صاحب کو شاید اس جرأت گفتار سے پہلی بار سابقہ پڑا تھا۔ کچھ تیور دکھانے لگے پھر جو مولانا نے انکو للکارا ہے

”میرے دیکھے ہوئے واقعات کو بھی جب آپ جھٹلا رہے ہیں تو اصلاح حال کی کیا امید ہو سکتی ہے …… میں آپ کے سامنے مسلمانوں کی طرف داری کر رہا ہوں؟ آپ مجھے جانتے ہی نہیں، آج کاٹجو یہاں ہوتے تو وہ مجھے اس طرح جواب نہ دیتے جس طرح آپ دے رہے ہیں… وغیرہ وغیرہ

تو وہ بے چارے دم بخود ہو کر رہ گئے اور کچھ سوچنے کے بعد بڑی ندامت کا اظہار کیا اور کہنے لگے۔ واقعی مولانا۔ میں نے دیر میں آپ کو پہچانا۔ میں تو آپ سے ملنے کا خود آرزو مند تھا آپ کو گوالیار بلانا چاہتا تھا وغیرہ وغیرہ۔ رنگ ہی بدل گیا، بڑی محبت سے باہر تک پہنچانے آئے اور بہت کچھ اطمینان دلا کر رخصت کیا۔

جالور کا واقعہ

اسی طرح ایک اور واقعہ جالور میں پیش آیا۔ دسمبر ۶۰ء میں مولانا نے جمعیۃ علماء جودھ پور ڈویژن کی دعوت پر پالی، سوجت جودھ پور وغیرہ کا دورہ کیا اور جالور بھی پہنچے۔ جمعیۃ علماء راجستھان کے روح رواں الحاج حکیم محمد علی غوری، وکیل احمد بخش سندھی اور میں رفقاء سفر تھے۔ یہ ایک دور افتادہ بستی ہے۔ جمعیۃ کا نظام وہاں نیا نیا قائم ہوا تھا۔ دفتر کا افتتاح اور جھنڈا لہرانے کی رسم مولانا کے ہاتھوں انجام پانی تھی۔ مقامی مہاسبھائیوں نے بستی میں شور برپا کر دیا کہ آج یہاں مسلم لیگ کا جھنڈا لہرایا جا رہا ہے۔ ہم اس کو نہیں لہرانے دیں گے۔ شہر میں ایک ہیجان بپا ہو گیا۔ مسلمان بھی خائف۔ مقامی کانگریسی بھی کچھ چھپے چھپے اور فکر مند۔ جوں توں کر کے جھنڈا تو لہرا دیا گیا۔ مگر رات کو عام جلسہ میں گڑبڑ کرنے کے ارادے قطعی تھے۔

جلسہ شروع ہوا۔ مہاسبھائی کوئی فتنہ اٹھانے کے لئے موقع کے منتظر ہی تھے۔ مولانا کو بھی صورت حال سے جوش آ گیا تھا۔ تقریر شروع کی تو اپنی عادت سے بڑھ کر اس قوت اور روانی کے ساتھ بولے کہ ایک سماں بندھ گیا۔ تقریر کیا تھی۔ ایک بوچھار تھی جس میں بجلی کی سی کڑک اور سیلاب کا جوش تھا۔

”میں یہاں مسلم لیگ بنانے آیا ہوں۔ یہی ہے آپ کی سمجھ بوجھ کی پرواز! مجھے آپ جانتے نہیں ہیں تو پہلے گاندھی جی کی سمادھی پر جا کر پوچھیے جواہر لال نہرو کے دل سے پوچھیے کہ میں کون ہوں۔ میں یہاں مسلم لیگ کا جھنڈا لہراؤں گا اور آپ اس کو روکیں گے! آپ بھول میں ہیں، کان کھول کر سن لیجیے جس دن مسلم لیگ کا جھنڈا لہرایا گیا تھا۔ اس کو روکنے کے لئے آپ میں ہمت نہیں تھی میں ہی آگے بڑھا تھا۔ اور پھر سن لیجیے کہ آج بھی اگر لیگ کا جھنڈا لے کر کوئی اٹھے گا تو آپ سے پہلے اس کا ہاتھ پکڑنے والا میں ہی ہوں گا اور یہ جمعیۃ کے غریب کارکن ہی اٹھیں گے۔ یہ آپ کے بس کی بات نہیں ہے اب آپ ایک آزاد و آباد دیش کے باشندے ہیں۔ ہوش و حواس کی بات کیجیے“ وغیرہ وغیرہ

جالور والوں کے لئے نئی بات تھی کہ ایک انسان چاروں طرف سے بکھرے ہوئے ماحول میں کھڑا ہو کر اس جرأت، تیز رفتاری اور گھن گرج کے ساتھ بولے، حیرانی کے عالم میں وہ بھی سب کچھ بھول گئے جن کے ارادے ہی کچھ اور تھے۔ دل ہی دل میں شرمسار اور کھوئے کھوئے ہوئے الٹے پاؤں واپس ہو گئے۔ جمعیۃ اور کانگریسی کارکنوں میں ہراس کی جگہ ہمت اور جوش ابھرا۔ اگلے روز شہر بھر نے بڑی محبت اور قدر کی نگاہوں سے مولانا کو رخصت کیا۔

جناب سالم لکھنوی

مجاہد کو میداں میں نیند آگئی ہے

بیادِ مجاہدِ ملت رحمۃ اللہ علیہ

(مسدس حالی کی زمین میں)

زمانے کو غفلت سے جس نے جگایا
حوادث سے ٹکرا کے جو مسکرایا
فضا پر جو ابرِ کرم بن کے چھایا
خبر سن کے یہ روح تھرا گئی ہے
مجاہد کو میداں میں نیند آگئی ہے

مخالف ہواؤں کا رُخ جس نے موڑا
غلامی کی زنجیر کو جس نے توڑا
کبھی جس نے ہمت کا دامن نہ چھوڑا
سحر شام غم کی ستم ڈھا گئی ہے
مجاہد کو میداں میں نیند آگئی ہے

وہ ناموسِ اسلام پر مرنے والا
وطن کی محبت کا دم بھرنے والا
مصائب میں ہنس کر گزر کرنے والا
گھٹا خون کے اشک برسا گئی ہے
مجاہد کو میداں میں نیند آگئی ہے

وہ ہندو مسلماں کی آنکھوں کا تارا
وہ مظلوم انساں کے دل کا سہارا
بھنور سے سفینے کو جس نے ابھارا
وفات اس کی دل پر ستم ڈھا گئی ہے
مجاہد کو میداں میں نیند آگئی ہے

(مولانا) حفظ الرحمن (رحمۃ اللہ علیہ)

مولانا عبدالماجد دریا بادی

مرحوم و مغفور سے پہلی ملاقات آج سے تیس تینتیس سال قبل دہلی کے سفر میں ہوئی۔ مرحوم اس وقت عملی سے زیادہ ایک علمی آدمی تھے۔ تفصیل تو اب یاد نہیں۔ اتنا اچھی طرح یاد ہے کہ گفتگو زیادہ تر علمی و دینی رہی۔ خصوصاً قرآن مجید کی تفسیروں اور ترجموں سے متعلق۔ سنجیدگی، فکر اور اپنے کام میں تندہی و انہماک کے آثار اس وقت بھی نمایاں تھے۔

پھر اس طویل عرصہ میں ملاقاتیں بارہا رہیں۔ کبھی کبھی طویل بھی، اور مراسلت بھی وقتاً فوقتاً رہی۔ مولانا کا رُخ بھی بجائے دین کی علمی خدمت کے رفتہ رفتہ سیاسی و ملی خدمات کی طرف زیادہ سے زیادہ پھرتا گیا، اور وہ عالم و مقتدائے دین سے بڑھ کر مجاہد و قائد بنتے گئے۔ اور ۱۹۴۷ء کے بعد سے تو کہنا چاہئے کہ ملت کے مرجع امید وہی رہ گئے تھے۔ ایک طرح مولانا ابوالکلام و رفیع احمد قدوائی صاحب کے ہم پلہ اور ایک طرح ان دونوں سے بھی بڑھ کر۔

اگلی سطروں میں کوشش یہ ہوگی کہ طویل سابقہ میں جو تاثرات ان کے متعلق قائم ہوتے انھیں مختصر اور سادہ لفظوں میں قلمبند کیا جائے۔

(۱) **مولانا کی خصوصیت**، شاید سب سے بڑی، ان کا انہماک عمل، سرگرمی اور یکسوئی تھی۔ جس کام کو ہاتھ میں لیتے اپنا سارا وقت اور اپنی ساری قوت وقف کر دیتے اور ان کی سنجیدگی فضولیات اور گپ شپ کے لئے کوئی مہلت ہی ان کے لئے نہ رکھتی تھی، وہ تفریح بھی کام ہی سے حاصل کرتے تھے

(۲) ان کی دوسری بڑی بنیادی صفت ان کی گہری ـــــ آج کی زبان میں "بے پناہ" محبت اسلام اور ملت اسلامی کے ساتھ تھی۔ ان کی "نیشنل ازم اور وطن پرستی" خدمت اسلام کے منافی ہونا کیا معنی، اس سے ایک ذرہ الگ نہ تھی۔ نیشنل ازم کے تقاضوں کی خاطر وہ اپنے دینی تصلب پر ٹیس لگا دینا یا مداہنت برتنا جانتے ہی نہ تھے۔ نیشنل ازم کی "علم" برداری کے ساتھ ساتھ اتنا درد اسلامی رکھنے والا اور ایسا کھرا اور پکا مسلمان ذرا کم ہی دیکھنے میں آیا ہے۔ خود جمعیۃ علماء کے حلقہ میں ان کی سی مثالیں بہت زیادہ نہیں۔

(۳) تیسری بڑی چیز ان کا امتزاج جوش و ہوش تھا۔ محض جوشیلے مسلمان تو بہت دیکھنے میں آئے ہیں، جو اپنے اندھا دھند جوش میں آگے پیچھے کچھ نہیں دیکھتے اور نہ کسی خطرہ کی پرواہ کرتے ہیں نہ کسی مصلحت کی رعایت رکھتے ہیں۔ نتائج سے بے پرواہ یہ نادان دوست بارہا مقصد کو نقصان ہی پہنچا چکے ہیں۔ ان کے ٹھیک مقابل ایک طبقہ محض ہوش مندوں اور مصلحت شناسوں کا ہے۔ ملت پر کچھ بھی گزر جائے۔ دین کو جتنا بھی صدمہ پہنچ جائے یہ اپنی حکمت عملی کے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔ ـــــ مرحوم کی ذات جوش و ہوش کی جامع، دل و دماغ سے بیک وقت کام لینے کی عادی تھی۔ صفِ اول کے مسلمان لیڈروں میں فہم و فراست تدبر اور جوش وغیرہ کے اچھے نمونوں کی افسوسناک کمی بارہا محسوس ہوئی، اس سے بڑی حد تک بڑی اور مستثنیٰ ذات دیکھنے میں آئی وہ انہیں مرحوم و مغفور کی تھی

(۴) چوتھا بڑا وصف مرحوم کا طبعی انکسار تھا۔ جاہ نہ مرتبہ پاکر یا بڑے مقام پر پہنچ کر وہ آج بھی اپنی زندگی میں ایسے سادہ تھے کہ جیسے بیان نہیں، اب تک طالب علم ہی ہو۔ لیڈری پر پہنچ کر اچھے اچھے بہک جاتے ہیں۔ یہ منزل خاصی امتحان کا کام دیتی ہے۔ مرحوم کی بات چیت میں کوئی فرق آنے پایا نہ وضع و لباس میں نہ اور کسی چیز میں سوا اس کے کہ اب دسترخوان شاید زیادہ وسیع ہو گیا تھا اپنے غریب عزیزوں سے ملنے ملانے یا ان کا کام کرنے سے وہ ہرگز نہ شرماتے نہ جھجکتے۔

(۵) پانچواں امتیازی وصف میں نے مرحوم میں شرافتِ مزاج کا پایا۔ نظریات کے اختلاف کو ہنسی خوشی برداشت کر لیتے۔ دل میں اپنے حریف یا مقابل کیمپ والے کی طرف سے ذرا بھی میل نہ لاتے بلکہ اپنے معاندانہ یا سب وشتم کرنے والے کی طرف سے بھی دل تنگ نہ ہوتا۔ اور موقع پانے پر ہمدردی، مروت اور روا داری، درگزر برابر اس کے ساتھ بھی کرتے رہتے ـــــ اتنی عالی ظرفی اور برداشت ہر ایک کے بس کا کام نہیں۔ اِنَّ ذٰلِکَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ۔

(۶) ایک اور وصف جو مرحوم کا میرے تجربہ میں آیا، وہ ان کی مہمان نوازی اور فیاضی تھی۔ اور اس کے لئے کچھ اس کی قید نہ تھی کہ کوئی ان کے گھر ہی پر جاکر ان کا مہمان بنے کہیں ریل میں اتفاق سے ساتھ ہو گیا تو یہاں بھی بے تکلف وہ مہمان داری میں مشغول ہو جاتے اور اپنے ساتھی کو اصرار کرکے کھلانے پلانے۔ ایک بار گرمیوں کے موسم میں لکھنؤ سے مولانا کا ساتھ دہرہ ایکسپریس پر ہوا۔ وہ دہلی سے آرہے تھے اور خربوزے ان کے ساتھ تھے بس چھیل کاٹ کاٹ کر مجھے کھلانے شروع کر دیئے، حالاں کہ میزبانی کا

خی اگر ہوتا تو مجھی کو بھیجا تھا کہ میں خربوزہ کی منڈی "لکھنؤ" سے سوار ہوا تھا

(۷) سال ڈیڑھ سال ہوا، لکھنؤ کونسل گھر میں مرحوم کا ساتھ ایک اُردو زبان کی کمیٹی کے سلسلہ میں رہا۔ میٹنگ ختم ایسے وقت ہوئی کہ نماز عصر کا وقت آگیا مولانا نے برآمدہ میں جھٹ اپنی شیروانی اتار بطور جانماز بچھائی اور مجھے امامت کے لئے آگے کردیا۔ اب میں ہر چند انکار کرتا ہوں، لیکن ان کا اصرار اسی قوت سے بڑھتا جاتا ہے۔ آخر میں ہارا۔ مجھی کو ہتھیار ڈالنے پڑے۔

اس ایک واقعہ سے علاوہ اہتمامِ نماز کے مولانا کے اس وصف پر بھی روشنی پڑ گئی کہ اپنے سے کمتروں کو دینی پیشوائی میں بھی آگے بڑھاتے رہتے تھے۔

مولانا اپنی نفع رسانیٔ خلائق و خدمتِ ملت کے عین شباب میں اٹھا لئے گئے اللہ کی مصلحتوں کو کون سمجھ سکتا ہے۔ تاہم اتنی بات تو کھلی ہوئی نظر آتی ہے کہ حشر میں خدا معلوم کتنی تعداد میں اللہ کے بندے ایسے نکلیں گے جو ہر طرح مولانا کے ممنونِ کرم اور زیر بارِ احسان ہوں گے۔ وہ سب کے سب مولانا کا بوجھ اتار کر اپنے سر لینے کو شوق سے دوڑیں گے اور مولانا کتنے سبک ہو کر، کیسے ہلکے پھلکے، شاداں و فرحاں، خرم و خنداں انشاء اللہ جنت کی طرف روانہ ہوں گے۔

اس دنیا میں رہ جانے والوں کی تو بس یہی دعا ہے کہ اللہ انھیں اپنے ان الطافِ خصوصی سے سرفراز فرمائے جو مقربین کے لئے مخصوص ہیں

اشک و آہ

وارث القادری

آج سارے اہلِ دل ہیں وقفِ دردِ و اضطراب — آج ہر فردِ بشر ملتا ہے با چشمِ پُر آب

باہمہ مایوسی و حسرہاں بصد رنج و محن — رو رہے ہیں آج تجھ کو صاحبانِ علم و فن

چیخ اٹھی یک بیک، یک لخت گریاں ہو گئی — عالموں کی ساری "جمعیت" پریشاں ہو گئی

ہند ہی تنہا نہیں مرنے پہ تیرے سوگوار — تیرے غم میں ہو گئے دیگر ممالک بے قرار

کیوں نہ تڑپائے دلوں کو انتقالِ پُر ملال — علم و حکمت، فہم و دانش میں نہ تھی تیری مثال

آہ اے روحِ روانِ اتقا تیرے بغیر — ہو گئے سینوں میں دل وقفِ بُکا تیرے بغیر

غم میں ڈوبا ملک و ملت کا چمن تیرے لئے — آبدیدہ ہو گئے قوم و وطن تیرے لئے

ایک جانب دین کا تھا رکن از فضلِ خدا — دوسری جانب سیاست کا بھی اعلیٰ رہنما

کیا کوئی سمجھے گا تیری خوبیوں کی انتہا — دین کا رہبر بھی تھا دنیا کا تو لیڈر بھی تھا

ہند میں کیا چیز تھا تو ہم سمجھتے تھے تجھے — "قوتِ بازوئے نہرو" ہم سمجھتے تھے تجھے

تیرے مرقد پہ عمائد دین کے گریہ کناں — تیری ممنونِ کرم آزادیِ ہندوستاں[۱]

ہے دعا وارثؔ کی اک اک خستہ جاں کو صبر دے[۲]

اے مرے معبود ان پس ماندگاں کو صبر دے

۱ خط کشیدہ حروف کے اس مصرع سے سن عیسوی نکلتا ہے ۱۹۶۲ء۔ ۲ اس مصرع کے خط کشیدہ حروف سے سن عیسوی ۱۹۶۲ء نکلتا ہے قادری

مولانا سعید احمد اکبر آبادی ایم اے۔ صدر شعبہ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

وقت کی اہم ترین شخصیت

مندرجہ ذیل مضمون ۱۹۵۵ء میں لکھا گیا تھا۔ اُس وقت مولانا اکبر آبادی نے گذارش کی تھی کہ ہندوستان کے موجودہ حالات میں مسلمانوں کو جس قسم کا لیڈر درکار ہے مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی اُن تمام اوصاف و کمالات کے جامع ہیں اگر میرا خیال صحیح ہے تو اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو توفیق دے کہ وہ اس حقیقت کو محسوس کریں اور ان کی خدمات سے فائدہ اٹھائیں۔ لیکن کیا معلوم تھا کہ سات برس بعد ہی جبکہ اس عرصہ میں مولانا مسلمانان ہند کے مسلمہ لیڈر کے درجہ پر پہنچ چکے ہوں گے ہمیں ان کی جدائی کا صدمہ برداشت کرنا ہوگا ———— "ادارہ"

مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی رشتہ میں مجھ سے بڑے میرے ماموں زاد بھائی ہیں۔ دارالعلوم دیوبند کے ساتھ تعلق کی نسبت سے میرے خواجہ تاش جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کی زندگی کے ساتھی اور اس کے بعد ندوۃ المصنفین دہلی کے رفیق ہیں۔ اس بنا پر میں نے ان کی زندگی کا مطالعہ بہت قریب سے کیا ہے ان کی خانگی زندگی اور خاندانی ماحول سے واقف ہونے کے ساتھ میں نے اُن کو خلوت میں، جلوت میں اور بے تکلف دوستوں کی مجلس میں، غرض ہر جگہ اور ہر مقام پر دیکھا ہے اور ان کی سیرت و کردار کا بڑی گہری نظر سے جائزہ لیا ہے اور اسی کا یہ اثر ہے کہ اس وقت میں یہ چند سطریں تحریر کر رہا ہوں، جو احباب اس حقیقت سے واقف ہیں کہ میں کسی زندہ انسان کی مدح سرائی میں خواہ وہ دنیا کا کتنا ہی بڑا انسان ہو، کس درجہ کوتاہ قلم واقع ہوا ہوں، ان کو یہ باور کرنے میں تکلف نہ ہوگا کہ ان سطور کا مقصد مسلمانوں کو خصوصاً اور اہل ملک کو عموماً صرف یہ بتانا ہے کہ تعمیر نشاۃ ثانیہ کے اس مرحلہ پر قدرت نے حفظ الرحمٰن کے نام سے اُن کو ایک کیسی جامع اور قابل قدر شخصیت عطا فرمائی ہے تاکہ وہ اس سے خاطر خواہ فائدہ اٹھا سکیں اور اللہ کی اس نعمت پر شکریہ ادا کر سکیں، ورنہ جب وقت نکل جاتا ہے تو پھر پشیمان ہونے سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔

ابتدائی زندگی مولانا کے ددھیالی، بہنوئی اور بھتیجے سب مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں اور اُن میں سے کچھ اعلیٰ سرکاری ملازمتوں سے پنشن لے چکے ہیں اور کچھ اب تک برسر روزگار ہیں خاندان میں انگریزی تعلیم کا اس قدر رچا ہونے کے باوجود ایک تنہا قابل ذکر ہستی مولانا حفظ الرحمٰن کی ہی ہے جن کو شروع ہی سے انگریزی کے بجائے عربی تعلیم کی طرف میلان پیدا ہوا اور سیوہارہ کے ایک مقامی مدرسہ میں طالب علمی شروع کردی، ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات مشہور ہیں میں بہت کمسن تھا اور آگرہ میں مکان پر ہی ایک اتالیق کے زیر نگرانی تعلیم حاصل کرتا تھا۔ اس زمانہ میں میرے ماموں قاضی ظہور الحسن ناظم سیوہاروی اکثر آگرہ آتے جاتے تھے اور ہفتوں ہمارے گھر قیام کرتے تھے ماموں صاحب کے بڑے لڑکے عثمان مرحوم تقریباً ایک ڈیڑھ سال سے آگرہ میں ہمارے ہاں مسلسل ہی رہتے تھے۔ جب کبھی ماموں سیوہارہ سے آتے تو وہ اور ان کے صاحبزادہ عثمان یہ دونوں اکثر سنایا کرتے تھے کہ سیوہارہ میں تمہارا بھائی حفظ الرحمٰن ایسا حاضر جواب ہے، خوب مناظرے کرتا ہے۔ ابھی سے وعظ کہتا ہے اور علیگڑھی بھائیوں سے ایسی ایسی بحثیں کرتا ہے کہ ان کو مات کردیتا ہے پھر ساتھ ہی ایسا نیک ہے، ایسا ہمدرد اور باادب ہے اور حسین و جمال ہے۔ غرضکہ ماموں مزے لے لے کر مجھ کو اور والد صاحب اور والدہ صاحبہ رحمۃ اللہ علیہما کو بھائی حفظ الرحمٰن صاحب کی باتیں سناتے تھے اور جی بھر کر تعریفیں کرتے تھے۔

جذبہ خدمت خلق ان خوبیوں کے ساتھ موصوف میں خدمت خلق کا

جذبہ اور اس راہ میں تکالیف برداشت کرنے کا حوصلہ بھی شروع ہی سے تھا۔
۱۹۲۰ء میں مرادآباد کے مدرسہ امدادیہ میں پڑھتا تھا کہ سنا کہ سیوہارہ سے پانچ میل کے فاصلہ پر رات کے دو بجے کے قریب دون ایکسپریس کو ایک بڑا شدید حادثہ پیش آیا جس میں بیسیوں آدمی مظلومیت و بیچارگی کے ساتھ لقمۂ اجل بن گئے بھائی حفظ الرحمٰن کو جوں ہی اس حادثہ کی اطلاع ملی اُسی وقت اندھیری رات میں پانچ میل پاپیادہ سفر کر کے موقع واردات پر پہنچ گئے اور پھر جو کچھ وہ کر سکتے تھے کیا اور اس عالی حوصلگی کے ساتھ کیا کہ دیکھنے والے دنگ رہ گئے

تحریکِ خلافت

انھیں دنوں میں تحریک خلافت اُٹھی اور دیکھتے ہی دیکھتے پورا ملک اس کے ہنگامہ سے گونج اٹھا، حفظ الرحمٰن ایسی طبیعت اس سے کس طرح الگ رہ سکتی تھی اس میں شریک ہوتے اور جیل خانہ پہونچے۔ موصوف جس جیل میں تھے اس کے افسر اعلیٰ کرنل زیڈ احمد تھے جو اپنے زمانہ کے بڑے ہی سخت قسم کے افسر تھے ان کی صاحبزادی فخریہ حمیدہ سلطان جو اردو زبان کی مشہور ادیب اور افسانہ نگار ہیں اور ان کی بیگم صاحبہ جو دہلی کے مشہور خانوادہ کی چشم و چراغ اور بڑی عابدہ و زاہدہ ہیں یہ دونوں مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کے اس زمانہ اسارت کا بڑی دلچسپی سے ذکر کرتی ہیں۔
ایک مرتبہ فخریہ حمیدہ سلطان نے کہا کہ میں اس وقت کم عمر میں تھی مگر اب تک مجھ کو یاد ہے کہ مولوی حفظ الرحمٰن اور اُن کے ساتھی جیل میں قرآن مجید کی تلاوت کرتے تھے اور نماز پڑھتے تھے۔ والدہ صاحبہ کو یہ معلوم ہوا تو ابّا سے کہا کرتیں کہ آپ نے خدا کے کتنے بندوں کو جیل خانہ میں بند کر رکھا ہے۔ بہرحال بیگم صاحبہ بیچاری کر کیا سکتی تھیں وہ "حکم حاکم مرگ مفاجات" پھر بھی اتنا ضرور کرتی تھیں کہ عمدہ عمدہ کھانے پکوا کر اپنے شوہر سے ان قیدیوں کے لئے بھجواتیں اور ان کی خاطر مدارات کرتیں۔ اسی اثنا میں عید آگئی تو بیگم صاحبہ نے بہت بڑی مقدار میں سویاں، دودھ، شکر اور شیر وغیرہ بھیجا اور اس طرح ان کی دلجوئی اور دلدہی کی کہ مرزا غالب کے لفظوں میں ان اسیران فرنگ کو یہ کہنے کا موقع نہ رہا کہ ؎

اُگ رہا ہے در و دیوار پہ سبزہ غالب
ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

کرنل زیڈ احمد صاحب مرحوم کے پورے خاندان کو مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کے ساتھ جو غیر معمولی خلوص و عقیدت اور ارادت و محبت ہے وہ اسی زمانہ سے ہے۔

دارالعلوم دیوبند میں

۱۹۲۱ء میں میں دارالعلوم دیوبند چلا آیا، اور میرے وہاں پہنچنے کے ایک سال بعد جب تحریک خلافت کا بحرانی دور ختم ہو گیا تو مولانا حفظ الرحمٰن صاحب بھی علوم و فنون کی تکمیل کے لئے وہاں پہنچ گئے اور غالباً دورہ حدیث میں داخلہ لیا۔ موصوف نے دیوبند پہنچتے ہی وہاں کی سوسائٹی میں اپنا ایک مقام پیدا کر لیا اور بہت جلد حضرت الاستاذ مولانا سید محمد انور شاہ الکشمیری کے مقربین خاص اور مخصوص تلامذہ میں جن میں اس وقت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی اور شیخ الحدیث مولانا محمد بدر عالم نمایاں تھے مولانا حفظ الرحمٰن صاحب بھی شامل ہو گئے۔ دورۂ حدیث سے فراغت تو ایک سال میں ہو ہی گئی لیکن مولانا اس کے بعد مختلف فنون کی اعلیٰ کتابیں پڑھنے کے ساتھ صحیح بخاری کی سماعت مسلسل کئی سال تک کرتے رہے۔ چنانچہ میں جس سال دورۂ حدیث میں تھا اس سال بھی یہ صحیح بخاری کی سماعت بڑی پابندی سے کر رہے تھے اور میرے لئے حضرت شاہ صاحب کی تقریر قلمبند کرتے تھے۔ میرے پاس بھائی حفظ الرحمٰن صاحب کے ہاتھ کی لکھی ہوئی یہ دو موٹی موٹی کاپیاں محفوظ تھیں۔ مگر ۱۹۴۷ء کے ہنگامہ میں جب گھر لٹا تو یہ کاپیاں بھی نہ رہیں۔

رہا کھٹکا نہ چوری کا دُعا دیتا ہوں رہزن کو

۱۹۲۸ء میں حضرت شاہ صاحب اپنے چند رفقاء اور تلامذہ کے ساتھ ڈابھیل ضلع سورت تشریف لے گئے تو مولانا حفظ الرحمٰن صاحب بھی ایک رکن کی حیثیت سے اس جماعت کے ساتھ ڈابھیل آئے اور طبقۂ علماء کی کتابوں کا درس دینے لگے۔ طبیعت ایسی رسا اور ذہن پایا ہے کہ یہاں ہر فن کی اونچے درجہ کی کتاب پڑھایا کرتے تھے اور یہ کہنا مشکل تھا کہ انہیں سب سے زیادہ مناسبت کس فن سے ہے۔

سیاسیات

ڈابھیل میں کم و بیش تین سال قیام رہا اور اصلاً مشغلہ درس و تدریس اور تصنیف و تالیف ہی رہا لیکن سینہ میں استخلاص وطن کا جو جذبہ موجزن تھا وہ اُبھر آنے کے لئے مواقع و محل کا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا چنانچہ گاندھی جی کی تحریک سول نافرمانی شروع ہوئی اور ملک نے سیاسیات میں ایک نئی کروٹ لی ہی تھی کہ مولانا حفظ الرحمٰن اپنی ملازمت سے مستعفی ہو کر اپنی پوری قوت کے ساتھ سیاسیات کے خارزار میں کود پڑے۔ اس وقت ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ ۱۹۳۰ء میں بمقام امروہہ جمعیۃ علماء ہند کا جو سالانہ اجلاس ہوا اس میں مولانا محمد علی مرحوم ایسی شخصیت کے ساتھ ٹکر لے کر شرکت کانگریس کا رزولیوشن منظور کرا لیا اور اس طرح مسلمانان ہند کے لئے ایک واضح اور روشن نصب العین متعین کر دیا۔
جمعیۃ علماء ہند کے سرگرم کارکن ہونے کے ساتھ کانگریس کے برابر ممبر رہے اور صوبہ کانگریس میں ہمیشہ با وقار سمجھے گئے۔ متعدد بار جیل گئے لیکن

جب ہزاروں آدمی جیل جا رہے ہوں اور "ہر کہ انبوہ جشن دارد" کا عالم ہو صرف جیل جانا کوئی معیار فضیلت نہیں قرار پا سکتا۔ البتہ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے جس خلوص، انہماک، ایثار اور عزم و استقلال کے ساتھ جیل کے مصائب اور اس کے متعلقات کو برداشت کیا ہے وہ بلاشبہ اُن کی کتاب فضائل کا ایک روشن باب ہے۔ سال ۱۹۳۲ء کا ہے کانگریس کو غیر قانونی جماعت قرار دیا گیا ہے اور اس کے باوجود کانگریس نے فیصلہ کیا ہے کہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا جلسہ مسز سروجنی نائیڈو کی صدارت میں دہلی میں گھنٹہ گھر کے پاس ہوگا۔ گاندھی ٹوپی میں جو نظر آتا ہے پکڑا جاتا ہے۔ کھدر میں جو دکھائی دیتا ہے دھر لیا جاتا ہے اب ممبران کانگریس ہیں کہ عجیب عجیب طرح سے بھیس بدل بدل کر آ رہے ہیں انہیں میں مولانا حفظ الرحمٰن صاحب بھی تھے مگر اپنی وضع میں، پولیس کو پتہ چل گیا اور وہ ان کے تعاقب میں چلی لیکن مولانا ہیں کہ دلی میں ہی ایک گھر سے دوسرے میں اور دوسرے سے تیسرے میں چھپے اور اس طرح پولیس اور سی آئی ڈی کو جُل دیتے پھر رہے ہیں یہاں تک کہ جلسہ کا مقررہ وقت ہوا۔ اور گھنٹہ گھر پر متعین پولیس نے آنکھ اُٹھا کر دیکھا تو مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سامنے ہی نظر آئے انجام تو پہلے ہی سے معلوم تھا، پکڑ لئے گئے جیل گئے لیکن جلسہ کرنا تھا وہ کر چکے تھے۔ روپوشی کے ان دنوں میں سے ایک دن میرے گھر میں بھی رہے تھے مجھ کو یہ دیکھ دیکھ کر تعجب ہوتا تھا کہ پولیس کی لاٹھیاں کھانی اور پھر جیل جانا یقینی تھا مگر کیا مجال کہ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی پیشانی پر فکر و فکر و تشویش کی ایک شکن بھی کہیں نظر آ جائے۔ وہی روزانہ کے معمولات کی پابندی، ہر ایک کے ساتھ ہنسی خوشی سے بات چیت، کھانا پینا اور وقت پر سوجانا، گویا انہیں کوئی نیا حادثہ پیش آنے والا ہی نہ تھا اور گویا انھوں نے کسی خطرناک وادی میں کوئی قدم ہی نہ رکھا۔

۱۹۴۲ء میں

اس کے بعد اسی سلسلہ کا دوسرا واقعہ جو میں نے اپنی آنکھ سے دیکھا وہ ۱۹۴۲ء میں پیش آیا جنگ عالمگیر زوروں پر تھی۔ کانگریس خلاف قانون جماعت قرار دی جا چکی تھی ورکنگ کمیٹی اور ہزاروں ممبران کانگریس گرفتار ہو چکے تھے اور روزانہ ہو رہے تھے۔ مولانا حفظ الرحمٰن کا بھی آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ممبر ہونے کی حیثیت سے گرفتار ہونا یقینی تھا اور صبح شام ہو رہی تھی۔ ان دنوں میں مولانا ندوۃ المصنفین کے رفیق کی حیثیت سے تصنیف و تالیف کا کام بھی کرتے تھے۔ فضا میں اس درجہ بحران اور گرفتاری کے یقین کامل کے باوجود ان کا معمول تھا یعنی صبح آٹھ بجے دفتر ندوۃ المصنفین میں پہنچ جانا اور شام کو چار بجے وہاں سے رخصت ہو کر دفتر الجمعیۃ میں بیٹھنا، کیا مجال کہ اس میں سر مو بھی فرق آ جائے وقت مقررہ پہ آتے اور مطالعہ کرتے، لکھتے، بولتے چالتے اور تھوڑی دیر کے لئے درمیان میں قیلولہ کرتے۔ یہ سب معمولات بدستور قائم رہے۔ چنانچہ ایک دن دوپہر کے دو بجے کا وقت تھا کہ اچانک پولیس دفتر ندوۃ المصنفین میں داخل ہوئی اور وارنٹ دکھایا۔ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے ہنستے ہوئے شیروانی پہنی، ٹوپی سنبھالی، اپنے کاغذات لپیٹ کر رکھے اور سب سے مل ملا معانقہ کر پولیس کے ساتھ چل دئے نہ پھر ان کے لئے کوئی پیغام ہے نہ گھر سے متعلق کوئی ہدایت ہے، چہرہ ہے کہ اسی طرح شگفتہ ہے لب ہیں کہ ان پر تبسم کھل رہا ہے، اُن کے ساتھی جو اس طرح ان کو جاتے دیکھ رہے ہیں دم بخود ہو کر رہ گئے ہیں۔ آنکھیں ڈبڈبا آئی ہیں، لیکن اس بطل حریت کا یہ عالم ہے کہ جیل خانہ کی طرف اس طرح قدم بڑھاتے جا رہا ہے کہ گویا اسے وہاں پہنچنے میں دیر ہو گئی ہے اور وہ رفتار تیز کر کے اب تلافی مافات کر رہا ہے

اسد بسمل ہے کس انداز کا قاتل سے کہتا ہے
تو مشق ناز کر خون دو عالم میری گردن پر

اس زمانہ اسارت میں کئی مرتبہ ان سے جیل خانہ میں ملاقات ہوئی مگر ہمیشہ یہی ہوا کہ ملاقات کے وقت جیل خانہ کا ماحول، آہنی سلاخیں اور کوٹھریاں دیکھ کر ہمارا دل ہے کہ اندر ہی اندر اداس ہو رہا ہے لیکن مولانا حفظ الرحمٰن ہیں کہ خوش و خرم نظر آ رہے ہیں گویا کہ ملک کے آسمان پر شدائد و مصائب کے جو گہرے بادل چھائے ہوئے تھے مولانا نے ان بادلوں کی نقاب اٹھا کر آزادی کی روشن ناظورۂ خوش جمال کو دیکھ لیا تھا جو ان کے پیچھے چھپی بیٹھی تھی اور جو جلد ہی عالم ظہور میں آنے والی تھی۔

تقسیم کے بعد

کہتے ہیں کہ انسانی کیرکٹر کے اصل نقوش و خطوط جو عام حالات میں ڈھکے چھپے اور دبے دبے رہتے ہیں۔ انتہائی غم یا جوش کے عالم میں ایک بیک سطح پر ابھر آتے ہیں۔ اگر یہ صحیح ہے تو آئیے اس آئینہ میں حفظ الرحمٰن صاحب کے کیرکٹر کی ایک جھلک دیکھتے چلیں۔

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کا دن حفظ الرحمٰن کے روزنامچۂ حیات میں گویا ایک چھٹ پٹے کا وقت تھا جبکہ صبح مسرت اور شام غم دونوں

ایک دوسرے سے مصافحہ کر رہے تھے۔ مسرت اس کی کہ وطن آزاد ہوا، اور رنج و الم اس بات کا کہ ملک کے دو ٹکڑے ہو گئے اور اس کے نتیجہ میں سرحد کے اُس پار اِس پار دونوں طرف شرافت و انسانیت ننگی ناچنے لگی۔

حادثۂ جانکاہ

مولانا حفظ الرحمن صاحب کی ایک نہایت پیاری نوجوان بیٹی خالدہ جو دو تین برس سے تپ دق میں مبتلا تھی اور جس کے علاج معالجہ میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا گیا تھا آخر ۲ یا ۳ ستمبر ۱۹۴۷ء کو مفارقت ابدی کا داغ دے کر دنیا سے رخصت ہو گئی۔ مولانا انتقال کے وقت سیوہارہ میں ہی تھے اور ابھی ان کے غم کے آنسو خشک بھی نہ ہوتے تھے کہ خبر ملی کہ مشرقی پنجاب کا طوفان برق و بلا دہلی میں پہنچ گیا ہے اور چلتی ٹرین میں حادثات ہونے لگے ہیں، بچی کے انتقال کے دوسرے ہی دن سامان اٹھا کر اور تمام گھر والوں کو روتا پیٹتا چھوڑ کر دلی کے لئے روانہ ہو گئے۔

ان دنوں میں ریلوں میں مسلمانوں پر حملے ہونے شروع ہی ہو گئے تھے۔ خود مولانا جس ڈبہ میں تھے اس پر بھی حملہ ہوا جس کا ظاہر ہے کہ سب سے بڑا نشانہ آپ ہی تھے لیکن چونکہ قدرت کو ان سے کام لینا تھا اس لئے فوج کا ایک افسر اعلیٰ جو سکھ تھا اور مولانا کے پاس ہی بیٹھا ہوا تھا اُس نے ان لوگوں کو ڈرا دھمکا کر واپس کر دیا اور اس طرح آپ دہلی بخیریت پہنچ گئے۔ دہلی میں پہنچ کر انھوں نے کیا کیا؟ اے کاش دہلی کی جامع مسجد کو گویائی عطا ہوتی اور وہ اس داستان کو سنا سکتی۔ یا شاہجہاں آباد کے گلی کوچے، وہاں کے بازار اور سڑکیں وہاں کے محلے اور آبادیاں بول سکتیں اور وہ یہ کہانی بیان کر سکتیں۔ دہلی کی مسلم آبادی کے محلے، آگ کے شعلوں میں لپٹے ہوئے تھے وحشت و بربریت کا کارواں برہنہ رقص کرتا پھر رہا تھا جو انسانیت کے ہمدرد اور غمگسار تھے، وہ کس مپرسی کے عالم میں دم بخود تھے۔ مسلمان غریب اپنے مکان کی کھڑکی سے جھانکتے ہوئے بھی ڈرتا تھا، مگر دلی کا چپہ چپہ گواہ ہے کہ ایسے عالم رعد و برق میں ایک مولانا حفظ الرحمن ہیں کہ ایک چھوٹی سی موٹر میں صبح و شام اِدھر اُدھر پھر رہے ہیں۔ جہاں فساد کی اطلاع ملی اور یہ موقع پر پہنچے۔ حکام کو اُن کے فرائض کی طرف متوجہ کر رہے ہیں۔ ان کو مشورہ دے رہے ہیں جو لوگ مکان چھوڑ رہے ہیں اُن کے تخلیہ کا انتظام کرا رہے ہیں کہ وہ جائے پناہ تک صحیح و سلامت پہنچ جائیں شہر میں جہاں جہاں جو صورت حال پیدا ہو رہی ہے یا اس کے پیدا ہونے کا امکان ہے اُس کا بڑی گہری نظر سے جائزہ لے رہے ہیں اور پل پل کی خبر حکومت دہلی اور حکومت ہند کو پہنچا رہے ہیں اور اس سلسلہ میں ضروری احکام لے رہے ہیں۔ غرض ایک تنہا جان ہے جو ہر وقت متحرک، ہر آن بیدار اور برابر سرگرم عمل ہے۔ راستہ میں موٹر پر کئی بار بم گرے، لاٹھیاں برسیں، پتھر پھینکے گئے۔ قتل کی سازشیں ہوئیں، دھمکیوں کے خط ملے لیکن جس نے اپنی جان جان آفریں کے بندوں کی خدمت کے لئے وقف کر دی تھی وہ ان سب چیزوں سے کیا ڈرتا۔ اُس کی سرگرمی اور جوش میں ذرا بھی فرق نہیں آیا۔ اس وقت کون کہہ سکتا ہے کہ حفظ الرحمن کے دل میں غم و الم کے کتنے بادل ہوں گے جو آنکھوں کی راہ سے برس کر کھل جانا چاہتے ہوں گے۔ لیکن کیا مجال کہ چہرہ پر اداسی اور افسردگی کی کوئی ایک سکوڑ بھی ہو۔" وہی ایک بہادر سپاہی کا عزم و استقلال، وہی ایک خود اعتمادی اور ہمت جو حوادث کے ہاتھوں شکست کھا کر بھی تازہ دم رہتی ہے اور اپنے مستقبل کو ماضی و حال کی مایوسیوں کے سپرد نہیں کرتی۔ اس تمام مدت میں مولانا حفظ الرحمن صاحب کے چہرے بشرہ سے اور اُن کی ہر ہر ادا سے عیاں اور نمایاں تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ آج دہلی میں اور اس کے اطراف و نواح میں لاکھوں مسلمان آباد ہیں اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حکومت اور دوسرے پبلک ورکرز کی کوششوں کو بڑا دخل ہے۔ لیکن مجھ کو اس میں ذرا شک نہیں کہ مولانا حفظ الرحمن ان تمام کوششوں کے روح رواں تھے جو ایک طرف پبلک اور دوسری طرف حکومت دونوں سے پوری طرح وابستہ تھے یہی وجہ ہے کہ گاندھی جی دلی آتے تو انہیں سب سے زیادہ اعتماد مولانا حفظ الرحمن پر ہی تھا۔ روزانہ صبح کو ان کا گاندھی کے پاس پہنچنا، حالات سے باخبر کرنا، اور اس سلسلے میں انتظامی مشورے دینا یہ ان کا مقررہ معمول تھا، اگر کسی دن مولانا کو ذرا دیر ہو جاتی تو گاندھی جی سخت پریشان ہو جاتے تھے کہ خدا خیر کرے آج حفظ الرحمن اب تک نہیں آئے اور کوئی شگوفہ تو کہیں نہیں کھل پڑا۔

مخالفوں اور دشمنوں کے ساتھ سلوک

انسانی کیریکٹر کی سب سے بڑی عظمت یہ ہے کہ مخالفوں اور دشمنوں کے ساتھ بھی انصاف کا معاملہ کیا جائے اور وقت پڑنے پر اُن سے انتقام نہ لیا جائے۔ ان مذکورہ بالا تمام کاموں کے ساتھ سیکڑوں، ہزاروں، مسلمان تھے جو کل تک مولانا حفظ الرحمن صاحب کے شدید مخالف اور بے حد نکتہ چین رہے تھے۔ مولانا نے اس وقت دوست دشمن کا کوئی امتیاز نہیں برتا اور اُن لوگوں کے لئے جو پاکستان جانے کا ارادہ کر چکے تھے سفر کی سہولتوں کا انتظام کیا۔ غرض کہ اس

وقت مسلمانوں کی امداد اور اس کے ذریعہ سے خود ملک کی خدمت کا کوئی ایک
کام بھی ایسا نہیں تھا جس کو مولانا پوری سرگرمی، جوش، تندہی اور کمال ایثار و
قربانی کے ساتھ انجام نہ دیتے ہوں۔

غیرت و حمیت اسلامی

تقسیم کے بعد مسلمانوں کے لئے سب سے زیادہ تباہ کن ان کا احساس کمتری تھا
مولانا حفظ الرحمن صاحب نے ملک کے طول وعرض کا دورہ کر کے اپنی حقیقت
افروز تقریروں سے اس احساس کو جس طرح دور کیا ہے اُسے تمام باخبر حضرات
جانتے ہیں۔ لیڈروں کا عام طور پر ظاہر و باطن ایک نہیں ہوتا۔ پلیٹ فارم پر کچھ
کہتے ہیں اور خلوت میں کسی اور طرح کی باتیں کرتے ہیں۔ لیکن یہاں معاملہ بالکل
یکساں ہے۔

دو واقعات

ایک مرتبہ ۱۹۴۸ء میں میں اور مولانا حفظ الرحمن صاحب
دونوں ایک ساتھ دہلی سے لکھنؤ جا رہے تھے۔ وہاں
یو۔پی گورنمنٹ کی ایک تعلیمی سب کمیٹی کے جلسہ میں شریک ہونا تھا۔ راستہ
میں میں نے اُن سے کہا کہ پاجامہ اور دھوتی کی جنگ ختم کرنے کے لئے کیا یہ بہتر
نہ ہوگا کہ دوسرے ترقی یافتہ ملکوں کی طرح مغربی لباس اختیار کر لیا جائے؟
مولانا نے فوراً تراق سے جواب دیا کہ اگر مسلمانوں نے ہندوؤں سے مرعوب
ہو کر اسی طرح اپنی قومی تہذیب اور ملی تمدن کو چھوڑ کر مغربی تہذیب و تمدن کو
اختیار کر کے اپنی عافیت و اطمینان کا سہارا ڈھونڈا تو پھر بات ہی کیا ہوئی۔؟
اور یہ تو کسی آزاد ملک کے ایک آزاد باشندہ کی زندگی نہ ہوئی۔ اسے میں ہرگز
پسند نہیں کر سکتا۔

اسی طرح میرا ذاتی خیال تھا کہ ملک کے موجودہ حالات کے پیش نظر
مسلمانوں کو گاؤکشی کے انسداد کا اعلان کر دینا چاہئے کیونکہ مذہباً ایسا کرنا جائز
بھی ہے اور اس سے ہندو مسلم تعلقات کے خوشگوار ہونے کی امید بھی ہو سکتی ہے۔
ایک دن مولانا حفظ الرحمن صاحب سے میں نے اپنے اس خیال کا اظہار
کیا تو حسب عادت سنتے ہی بگڑ پڑے۔ اور لگے تقریر کرنے۔ انہوں نے کہا کہ تقسیم
سے پہلے اگر ہم کرتے تو اس کی قدر بھی ہوتی لیکن اب تو یہ کہا جائے گا کہ مسلمانوں
نے ڈر کر ایسا کیا ہے تو پھر کرنے کا کیا فائدہ؟ اس لئے میں ہرگز مسلمانوں سے
نہیں کہوں گا کہ وہ انسداد گاؤکشی کا اعلان کر دیں۔ حکومت سیکولر ہے۔ دستور
جمہوری ہے۔ اگر ہندو اس سیکولرزم اور جمہوریت کو عریاں کرنا چاہتے ہیں تو وہ
بڑے شوق سے گاؤکشی قانوناً بند کرا دیں۔ اس وقت ہمارا موقف دوسرا ہوگا
اور ہم اس مسئلہ پر پھر از سر نو غور کریں گے۔

مجھ کو اپنی رائے پر اتنا اصرار تھا کہ میں نے اس پر برہان میں لکھا مگر ساتھ ساتھ مولانا
حفظ الرحمن کو اپنی رائے پر اس قدر پختگی تھی کہ انہوں نے میرے مضمون کا جواب برہان
میں بھی دیا اور بڑے زور و شور کے ساتھ دیا۔ اس وقت تو بات میری سمجھ میں نہ آئی
تھی لیکن اب میں محسوس کرتا ہوں کہ میں ہی غلطی پر تھا اور رائے انہیں کی درست تھی۔

ٹھنڈا دماغ

۱۹۴۷ء کے انقلاب نے ہندو اور مسلمان کانگریسی
اور مسلم نیشنلسٹ سب کے دماغ کا توازن ہی
بگاڑ دیا جو کل تک گاندھی جی کے دست راست تھے وہ آج فرقہ پرستی میں تنگ
وطن ہیں جو کل تک بہادر تھے آج بزدل ہیں اور ان پر مرعوبیت چھائی ہوتی ہے
لیکن مولانا حفظ الرحمن صاحب آج سے دس برس پہلے جہاں تھے وہیں آج
بھی ہیں۔ ایک طرف سیاسیات اور قومی و ملکی معاملات کے مسائل میں اول درجہ
کے نیشنلسٹ اور جمہوریت پسند لیکن ساتھ ہی مذہبی اور ثقافتی امور میں
پکے مسلمان اور دونوں میں ایسا توازن اور تناسب قائم رکھتے ہیں کہ ع

ہر ہوسناکے نداند جام و سنداں باختن

ان کا جو فیصلہ ہوتا ہے ٹھنڈے دماغ کے ساتھ ہوتا ہے اس میں نہ کسی مرعوبیت
کو دخل ہوتا ہے اور نہ کسی کو خوش کرنے کا جذبہ!

بے لوثی

اسی وجہ سے وہ کانگریس کے سرگرم کارکن اور اس کے ٹکٹ
پر پارلیمنٹ کے ممبر ہیں لیکن اس میں کانگریس کے مرہون احسان
بالکل نہیں دو مرتبہ کانگریس کے ٹکٹ پر الیکشن لڑا مگر کانگریس کے سخت
اصرار کے باوجود اس سلسلہ میں ایک پیسہ کانگریس سے نہیں لیا سب اخراجات
جوں توں کر کے خود ہی برداشت کئے ان کا یہی معاملہ جمعیت کے ساتھ ہے دن رات
وہ اس کی خدمت کے لئے وقف ہیں لیکن پھر تمام خدمات آنریری ہیں یہاں
تک کہ پارلیمنٹ تک آنے جانے میں وہ جمعیت کی موٹر استعمال کرتے ہیں۔
تو اس کے لئے پچھتر (۷۵) روپیہ ماہوار اپنی جیب سے جمعیت کو ادا کرتے ہیں۔

بعض شکایات

کچھ لوگوں کو اب ان سے یہ شکایت پیدا ہو گئی ہے کہ
ان کا غصہ بڑھ گیا ہے بات بات پر بگڑ جاتے ہیں اور
ان کا لب و لہجہ سخت و کرخت ہو جاتا ہے لیکن اصل بات یہ ہے کہ اس کی وجہ ان کی
کمزوری ہے کہ وہ ہر چھوٹا بڑا کام خود کرنا چاہتے ہیں اور کرتے ہیں یہاں تک کہ جلسہ
میں مقرر کے نام کا اعلان بھی کریں گے تو خود ہی! اس بنا پر ان کا نقصان ایک
طرف تو یہ ہے کہ ان کے رفقاء اور ساتھیوں کو بھی بدگمانی ہوتی ہے کہ مولانا
کو ان پر اعتماد نہیں ہے اور اس وجہ سے وہ تقسیم کار کے اصول پر عمل پیرا
نہیں ہوتے اور دوسری جانب ان کا دل و دماغ خود دونوں پریشان ہو جاتے

ہوجاتے ہیں اور اس کی وجہ سے مزاج میں اور کرختگی پیدا ہوجاتی ہے۔ لیکن حق یہ ہے کہ کرختگی صرف ظاہری اور سطحی ہوتی ہے ورنہ ان سے بڑھ کر کوئی ہمدرد نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ پھر تھوڑی ہی دیر میں وہ بڑے نرم اور مہربان ہوجاتے ہیں اور پوری ہمدردی کے ساتھ کہنے والوں کی بات سنتے ہیں اور ان کی مدد کرتے ہیں۔ بہرحال ہندوستان کے موجودہ حالات میں مسلمانوں کو جس قسم کا لیڈر درکار ہے مولانا اس کے تمام اوصاف و کمالات کے جامع ہیں اور اگر میرا خیال صحیح ہے تو اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو توفیق دے کہ وہ اس حقیقت کو محسوس کریں اور ان کی خدمات سے فائدہ اٹھائیں

قطعہ تاریخ وفات حضرت مجاہد ملت علیہ الرحمۃ

(از:۔ سید شمیم الحسن صاحب زیدی۔ مرادآباد)

خطیب بے بہا آں حفظ رحمٰن — کہ در آفاق مقبولِ زماں شد

امیرِ حریت جانباز ملت — پناہِ قوم در ہندوستاں شد

صد افسوس و ملال و حسرت و غم — کہ از دارِ فنا رحلت کناں شد

شمیمؔ زار در تاریخِ فوتش — بگفتہ "فخرِ ملت در جناں شد"

۱۹ ۶ ۶۲

قطعہ تاریخ وفات حضرت مجاہد ملت علیہ الرحمۃ

(حکیم نور العین حسن صاحب راغب چھتاروی)

رُوحِ جمعیت امیرِ کارواں — حفظِ رحمٰن بے مثال و بے بہا

تم نے دیکھا ہی نہ ہوگا دوستو ل — بے غرض جانباز ایسا رہنما

بعد مدت کے ملا تھا قوم کو — اک مجاہد اور سچا رہنما

قوم کی حرماں نصیبی آہ آہ — وہ بھی دنیا سے اچانک اُٹھ گیا

راغبؔ اِس مژدہ پر اب تو صبر کر
حفظِ رحمٰن داردِ جنت ہُوا

۱۹ ۶ ۶۲

جی بہلتا ہی نہیں ہے کسی افسانے سے

بہ یادِ مجاہدِ ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ

(از:۔ ایم حفیظ بنارسی، ایم اے، بی ایڈ)

تو کہ تھا انجمنِ دانش و حکمت کا چراغ　　محفلِ علم کی ضو بزمِ سیاست کا چراغ
تو کہ تھا بارگہہِ فہم و فراست کا چراغ　　نورِ عرفان و یقیں رشد و ہدایت کا چراغ

ہو گیا ختم ترے ساتھ محبت کا چراغ
گل ہوئی شمعِ وفا بجھ گیا الفت کا چراغ

خدمتِ قوم و وطن تجھ کو مگن رکھتی تھی　　بے نیازِ ہوسِ کام و دہن رکھتی تھی
مضطرب تجھ کو سدا فکرِ چمن رکھتی تھی　　تیری ہر بات عجب حسنِ سخن رکھتی تھی

ناز فرماتے تھے تری طاقتِ گفتار پہ ہم
فخر کرتے تھے تری عظمتِ کردار پہ ہم

جانبِ فکر و عمل سب کو پکارا تو نے　　بے سہاروں کو دیا بڑھ کے سہارا تو نے
قوم کی زلفِ پریشاں کو سنوارا تو نے　　ڈوب کر کشتیٔ ملت کو ابھارا تو نے

زندگی آئینۂ حسنِ عمل تھی تیری
تو مجاہد تھا ہر اک بات اٹل تھی تیری

تو نے اوروں کیلئے زیست کا ساماں کیا　　اپنا سب کچھ وطن و قوم پہ قرباں کیا
سب کی تسکیں کیلئے خود کو پریشاں کیا　　اپنے آرام کا کب تو نے کوئی دھیان کیا

جہد کرتا رہا تو امن و اماں کی خاطر
سعیٔ پیہم رہی تعمیرِ جہاں کی خاطر

راہِ انصاف و مساوات دکھائی ہم کو دینِ اسلام کی روداد سنائی ہم کو
زندگی کیا ہے مجاہد کی بتائی ہم کو تو نے حق گوئی و بے باکی سکھائی ہم کو

اہلِ باطل تری آواز سے تھرّاتے تھے
تری جرأت ترے کردار سے گھبراتے تھے

تیری تصویر سے ظاہر تھا عجب رعب جمال تیری شخصیت ذی شان کی نہیں ملتی مثال
بسترِ مرگ پہ بھی تھا تجھے اُردو کا خیال کیوں نہ ہو تیری جدائی کا ہر اک دل کو ملال

دیکھ کر تجھ کو قرارِ دل و جاں ملتا تھا
ذات سے تیری ہمیں عزمِ جواں ملتا تھا

کوئی ہمدم کوئی غمخوار نہیں ہے اپنا تجھ سا اب کوئی مددگار نہیں ہے اپنا
پوچھے سچ تو کوئی یار نہیں ہے اپنا اب کوئی قافلہ سالار نہیں ہے اپنا

چوٹ وہ دل پہ لگی ہے ترے مر جانے سے
جی بہلتا ہی نہیں ہے کسی افسانے سے

سوگوار آج ہے ہر بزمِ ادب تیرے لئے حزن اور یاس کی تصویر ہیں سب تیرے لئے
انجمن ہند کی ہے آہ بلب تیرے لئے کشتۂ غم ہے عجم اور عرب تیرے لئے

دیدۂ اہلِ زمانہ میں نمی ملتی ہے
کوئی محفل ہو مگر تیری کمی ملتی ہے

باعثِ صد الم و رنج ہے تیری رحلت آج معلوم ہوئی ہے ہمیں تیری قیمت
سایہ گستر ترے مرقد پہ ہو ابرِ رحمت مرنے والے تجھے حاصل ہو بہارِ جنت

بیکراں رحم و کرم تجھ پہ خدا فرمائے
ہم کو نعم البدل اللہ عطا فرمائے



آلِ احمد سرور۔ جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو ہند۔

مولانا حفظ الرحمٰن — ایک تاثر

"تمہاری خوبیاں زندہ، تمہاری نیکیاں باقی"

انتخابات کے زمانہ میں اچانک خبر ملی کہ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب بہت علیل ہیں، کینسر کا شبہ ہے اور بمبئی علاج کے لئے گئے ہوئے ہیں۔ کینسر ایسا موذی مرض ہے کہ اس کا نام سن کر ہی خون خشک ہو جاتا ہے اور موت سامنے منڈلاتے لگتی ہے۔ مولانا بمبئی سے واپس آئے تو یہ شبہ قوی ہو گیا، مگر انسان دل کو کسی نہ کسی طرح ڈھارس دے ہی لیتا ہے۔ اس وقت روس اور امریکہ میں کینسر پر بہت کام ہوا ہے اور ابتدائی مرحلے میں اس مرض کو دور کرنے میں کامیابی بھی ہوئی ہے۔ مولانا کے متعلق ضروری ریکارڈ روس اور امریکہ بھیجا گیا۔ روس کے ڈاکٹروں نے کہا کہ مرض خاصی خطرناک صورت اختیار کر چکا ہے اور چھ مہینے سے زیادہ زندگی کی توقع نہیں ہے۔ امریکہ کے ڈاکٹروں نے ایک نئی دوا آزمانے کے لئے بلایا۔ اپریل میں مولانا میڈیسن تشریف لے گئے، جولائی کے وسط میں واپس آئے۔ اخبار سے معلوم ہوا کہ مرض زائل ہو چکا ہے، صرف کمزوری اور بیماری کی شکایت ہے مگر یہ سب طفل تسلیاں تھیں۔ میں تین اگست کو میسور میں تھا، وہیں اخبار میں دیکھا کہ مولانا نے اپنی جان جان آفریں کو سپرد کر دی۔

بیماری میں انسان کے کردار کا امتحان ہوتا ہے۔ مولانا سے دو دفعہ بیماری کے زمانے میں ملاقات ہوئی۔ سخت کھانسی اور تکلیف میں مبتلا تھے مگر کیا مجال تھی جو مزاج کی شگفتگی اور طبیعت کے تحمل میں ذرا بھی فرق آتا۔ عقیدتمندوں، دوستوں اور مداحوں کا ہجوم تھا۔ سب سے خندہ پیشانی سے ملتے تھے۔ ہر ایک کے معاملات پر بھی گفتگو کرتے تھے۔ اس عالم میں بھی ضرورتمندوں کی امداد کے لئے لوگوں سے کہتے تھے۔ خط لکھتے تھے اور ضروری مشورے دیتے تھے۔ بیماری بھی مولانا کی ہمت وجرأت، استقلال واستقامت کو متاثر نہ کر سکی۔ بہت مختصر الفاظ میں مرض کا تذکرہ کرتے تھے۔ کوئی بھی جاتا اس کی تواضع ہوتی، پاس بلاتے، خیریت دریافت کرتے اس کے مسائل پر اظہار خیال کرتے۔ جس طرح زندگی میں سب کے کام آتے رہے، سب کی دلجوئی کرتے رہے، اسی طرح مرض الموت میں بھی اپنی وضع قائم رکھی۔ خدا انہیں اپنی رحمتوں سے سرفراز فرمائے۔

مولانا کو آزادی کے سپاہی، ایک بلند پایہ عالم دین، ایک معزز سیاسی رہنما کی حیثیت سے سارا ملک جانتا اور مانتا تھا۔ جب مسلم لیگ کا زور تھا تو بہت سے قوم پرست گوشہ نشین ہو گئے تھے۔ کون آندھی کے گرد وغبار کا سامنا کرے۔ مگر مولانا میدان چھوڑنے والے نہ تھے۔ ڈٹ کر فرقہ پرستی کا مقابلہ کرتے رہے۔ لیاقت علی خاں کے مقابلہ میں ہار تو گئے مگر ان کے بھی چھکے چھڑا دیئے جب دہلی میں فساد اور قتل وغارت کی گرم بازاری ہوئی تو مولانا نے جان پر کھیل کر مسلمانوں کی امداد کی۔ انہیں مسلمانوں کی جو انہیں گالیاں دیتے تھے اور برا بھلا کہتے تھے۔ اس زمانے میں جلے پاؤں کی بلی کی طرح مولانا رات دن ایک محلّے سے دوسرے میں، شہر کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک پھرتے رہتے تھے، ہزاروں کو خطرے سے نکال کر لاتے، سینکڑوں کو موت کے منہ سے بچایا۔ خدمت کا کوئی موقع ایسا نہ تھا جس میں مولانا سب سے آگے نہ رہے ہوں، حق گوئی کا کوئی مرحلہ نہ تھا جس میں مولانا نے جرأت اور بے باکی سے سچی بات نہ کہی ہو۔ وہ سچے اور پکے مسلمان تھے، مگر انھوں نے اپنا وقت دوسروں کے ایمان میں کیڑے نکالنے میں صرف نہ کیا۔ وہ مضبوطی کے ساتھ اپنی رائے دیتے تھے، کھلے الفاظ میں بنیادی باتوں میں اختلاف کرتے تھے، مگر جزئیات میں دوسرے کی بات سننے اور ماننے میں انھیں کبھی تامّل نہ ہوا۔ وہ کام کرنے والے آدمی تھے، کہیں فساد ہوا، یا کہیں سے زیادتی یا ظلم کی خبر آئی مسلمانوں کے بہت سے خود ساختہ لیڈر بیان دینے یا افسوس کرنے پر اکتفا کرتے تھے، مولانا خود پہنچتے تھے مظلوموں کی امداد کے لئے ہر ممکن کوشش کرتے تھے، پارلیمنٹ میں سچی اور کھری بات کہنے میں اپنی مثال آپ تھے۔ پھر اُن میں خود نمائی نہ تھی۔ اردو کی تحریک میں مولانا لیڈر کی حیثیت سے نہیں سپاہی کی حیثیت سے انجمن کا کام کرتے تھے۔ جہاں مولانا کی ضرورت محسوس ہوتی بھیج دیا۔ جہاں دقت ہوئی مولانا نے سلجھا دی، جہاں اختلاف ہوا مولانا کی وجہ سے دور ہو گیا۔ انھوں نے ہمیشہ فصل کے بجائے وصل پر زور دیا۔ وہ کام کرنے والوں کو ساتھ رکھنے اور اُن کی دلجوئی کرنے میں اپنی نظیر آپ تھے۔

۱۹۵۷ء کی علی گڑھ کی کانفرنس میں طے ہوا کہ انجمن کی کل ہند کانفرنس ۱۹۵۸ء میں دہلی میں ہو۔ مولانا کو بس و پیش تھا کیونکہ وہ انتظامی دشواریوں سے واقف تھے۔ میں نے کہا مولانا آپ ذمے داری نہ لیں گے تو یہ کام رہ جائے گا۔ بس اتنا کہنا تھا کہ تیار ہو گئے۔ اپنے سیاسی کاموں کا حرج کر کے اس کانفرنس کے انتظامات کئے۔ انہیں کی وجہ سے دہلی کی کانفرنس اس قدر شاندار ہوئی کہ پنڈت جی آئے۔ مولانا آزاد نے کانفرنس کو خطاب کیا اور ہماری تحریک کا اثر پورے ملک نے محسوس کیا۔

مولانا ڈسپلن کے قائل تھے۔ اردو کے سلسلے میں بہار کی ایک کانفرنس میں مولانا نے ایک ایسی تقریر کی جو میرے خیال میں انجمن کے ایک ممتاز ممبر کو نہیں کرنی چاہئے تھی۔ میں نے ایک اداریہ میں اس کی طرف اشارہ کیا۔ مولانا نے ایک طویل خط اخبار میں اشاعت کے لئے لکھا۔ میں نے خط روک لیا اور مولانا کو لکھا کہ آپ یہ مسئلہ کونسل میں پیش کریں لیکن اخبار میں آپ کا یہ کھلا ہوا اختلاف کسی طرح مناسب نہیں ہے۔ مولانا میری بات مان گئے اور پھر کونسل میں بھی میری ہم نوائی کی۔ آج کتنے لیڈر اور سیاسی رہنما ایسے ہیں جو اپنی بات کی پچ نہیں کرتے۔ مولانا نے کبھی بات کی پچ نہیں کی، ہمیشہ اپنے نصب العین پر نظر رکھی اور حقائق کی روشنی میں منزل کی طرف سفر کی تیاری کرتے رہے۔

قومی کارکنوں کے سامنے ایک بہت سخت مرحلہ آتا ہے۔ جب انھیں شہرت حاصل ہو جائے اور کچھ اختیارات بھی مل جائیں تو ہر قسم کے ضرورتمند ان کے گرد جمع ہو جاتے ہیں کوئی اپنے لڑکے کے لئے نوکری چاہتا ہے، کسی کی ترقی کا سوال ہے، کسی پر کوئی الزام لگا دیا گیا ہے اور اس کی ملازمت خطرے میں ہے۔ کہیں مذہبی تعصّب کی وجہ سے زیادتی ہوتی ہے، کہیں ذاتی بات کا سوال کھڑا ہو جاتا ہے۔ پھر کسی فرد یا گروہ کے ساتھ زبردستی ہوتی ہے پولیس نے بلاوجہ کچھ لوگوں کو گرفتار کر لیا ہے۔ کہیں فساد ہو گیا ہے اور بجائے شر پسند عناصر کی خبر لینے کے، صلح جو اور امن پسند اور بے گناہ آدمیوں کو دھر لیا گیا ہے۔ یہ سب ہمارے دور کی حقیقتیں ہیں مولانا کو ان سب سے سابقہ پڑتا تھا۔ ہر وقت لوگ انہیں گھیرے رہتے تھے۔ مولانا کا دفتر گلی قاسم جان دہلی میں تھا۔ ان کا سارا وقت دفتر ہی میں یا مختلف کاموں، تقریبوں یا جلسوں میں صرف ہوتا تھا۔ رات کو دیر سے گھر جاتے تھے۔ کوئی اشد ضرورت ہوئی تو گھڑے گھڑے ہو آتے، اُن کی ذاتی زندگی گویا تھی ہی نہیں۔ سارا وقت پبلک کے کاموں میں صرف ہوتا تھا۔ وہ ہر ضرورتمند سے خود ملتے، اس کی ضرورت رفع کرنے کی پوری کوشش کرتے۔ خط سے کام چل جاتا تو خط لکھتے۔ ملنا ضروری ہوتا تو مل آتے۔ وفد لے جانے کا مسئلہ ہوتا تو وہ بھی ترتیب دے لیتے۔ کہیں کوئی فساد یا ہنگامہ ہوا اور مولانا کو خبر ملی تو کیسا ہی ضروری کام کر رہے ہوں چھوڑ چھاڑ کر پہنچتے تھے۔ مصیبت زدہ لوگوں سے ملتے، ان کو تسکین دیتے اُن کی دیکھ بھال کرتے اور حفاظت کرتے۔ اس سلسلے میں بڑے بڑے افسروں میں مباحثہ، جھگڑا سب ہی کچھ کرتے رہتے تھے۔ پارلیمنٹ میں نہایت صفائی سے، نہایت دلیری سے، نہایت بے باکی اور بے خوفی سے سچی بات کہتے۔ مگر اُن کا کمال یہ تھا کہ کسی کے ظلم یا زیادتی کی وجہ سے اُن کے بنیادی عقائد میں کبھی فرق نہ آیا تھا۔ کچھ مسلمانوں کے ساتھ اگر کچھ ہندو دوں نے زیادتی کی تو انھوں نے اُس پر برملا اظہار خیال کیا اور متعصب اور تنگ نظر ہندوؤں کو برا بھلا کہا، مگر اپنے قومی نقطۂ نظر کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ جہاں فرقہ پرستی اور علیحدگی کا جذبہ دیکھا، اُس پر سخت نکتہ چینی کی۔ کچھ لوگوں کو پاکستان جانے کے لئے پرمٹ ملنے میں دشواری ہوتی، مولانا نے دور کرا دی۔ جو لوگ وہاں سے واپس آئے، اُن کے مکان اُن کو واپس دلوانے کے لئے کوئی کوشش اٹھا نہ رکھی۔ عموماً انہیں کامیابی ہوتی۔ ہر چیز ایک آدمی کیسے کرا سکتا تھا۔

مجھے اکثر یہ خیال آتا تھا کہ مولانا کا بہت سا وقت چھوٹی موٹی باتوں میں سفارشوں میں گذر جاتا تھا اور بڑے کاموں کے لئے جن کے لئے وہ خاص طور سے موزوں تھے، وقت نہیں نکلتا تھا۔ کئی دفعہ تنہائی میں ان سے اس مسئلہ پر بات چیت ہوئی۔ میں نے اُن سے اصرار کیا کہ قوم ہی کی خاطر، بڑی باتوں کے لئے وقت زیادہ نکالئے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کو چھوڑ دیجئے۔ اپنی صحت اور آرام کا خیال کیجئے۔ تاکہ زیادہ عرصہ تک آپ وہ کام انجام دے سکیں جو صرف آپ ہی کر سکتے ہیں۔ مولانا مجھ سے متفق ہو جاتے تھے مگر اس بات پر عمل نہیں کر سکتے تھے اس میں تھوڑی سی بے مروتی کرنا پڑتی ہے اور وہ مروت کے پتلے تھے۔

ہماری قوم اپنے اچھے آدمیوں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتی۔ محبت کا اظہار یا تو دعوتوں کی بھرمار سے ہوتا ہے یا وقت بے وقت گھنٹوں ایسے مسائل پر تبادلۂ خیالات سے جن پر پہلے سے غور نہیں ہوا ہے اور جن کے متعلق کوئی ذاتی تجربہ نہیں ہے صرف ایک جذبہ ہے پھر یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ بات ہندوستان کے مستقبل، مسلمانوں کے عروج و زوال اور سیاسیات کے نشیب و فراز سے شروع ہوئی اور بہت دیر کے بعد اس بیان کی خبر یہ نکلی کہ کسی ہندو افسر نے محض تعصب کی بنا پر کسی بیچارے مسلمان کو معطّل کر دیا ہے اب مولانا اس

بات کی تحقیقات کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ افسر متعصب نہ تھا، یہ صاحب ہی گئے گزرے تھے۔ ایسی بھی مثالیں سامنے آئیں جہاں لوگ اپنے حق سے زیادہ مانگتے تھے اور نہیں ملتا تھا تو تعصب اور تنگ نظری کی دہائی دیتے تھے۔ تعصب اور تنگ نظری خاصی عام ہے اور ابھی ہندو ہوں یا مسلمان عموماً اس سے بلند نہیں ہو سکے ہیں۔ ہاں اچھے آدمی ہر گروہ اور جماعت میں مل جائیں گے انھیں کے دم سے ہمارا بھرم قائم ہے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ حقیقی اور ٹھوس کام کرنے والوں کو اس لئے وقت نہیں ملتا کہ چھوٹی چھوٹی باتوں میں لوگ الجھا لیتے ہیں۔ مولانا کی بڑائی یہ ہے کہ ان میں گرفتار رہنے کے باوجود ہمیشہ بڑی باتوں پر نظر رکھتے تھے اور اُن کے لئے کوشش بھی کرتے رہتے تھے۔

مولانا بڑی دلنواز شخصیت کے مالک تھے اور اُن میں بڑی وضعداری تھی۔ وہ جن لوگوں سے محبت کرتے تھے، اُن کے لئے بہت کچھ کرتے تھے۔ جن لوگوں سے زیادہ لگاؤ نہ تھا، اُن کے ساتھ بھی ایک باوقار رشتہ تھا۔ وہ دو سال سے ہماری اگزیکٹو کونسل کے ممبر تھے۔ ایک دفعہ ایک مسئلہ پر میرا اُن سے سخت اختلاف ہوا۔ میرے جو جی میں آیا میں نے کہا۔ مولانا نے بھی خلاف معمول نہایت تند و تیز لہجے میں تقریر کی۔ میٹنگ کے بعد باتیں ہونے لگیں تو مجھے یہ محسوس ہوا کہ وہ بات وہیں ختم ہو گئی۔ میرا اور مولانا کا رشتہ اور تعلق جو محبت کی بنا پر تھا بدستور رہا۔ ایسے عالی ظرف لوگ سیاست کے اس کارزار میں کم دیکھے جاتے ہیں۔

مولانا اس پر اکثر افسوس کرتے تھے کہ قومی کاموں اور عملی مسائل نے اُن سے تصنیف و تالیف کا محبوب مشغلہ چھڑا دیا۔ کون جانے کون خسارے میں رہا اور کون فائدے میں۔ علم و ادب کے نقصان اور زندگی و سیاست کے نفع کو کیا ایک میزان میں تولا جا سکتا ہے۔ یہ موقع اس پر بحث کرنے کا نہیں ہے۔ ہاں یہ بات بلاخوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ مولانا نے اپنے خلوص اور عمل سے خدمت کی جو روایت قائم کی، اُسے عبادت میں شمار کرنا چاہئے۔

مولانا علماء کی برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ اس برادری کی شاندار خدمات سے کون انکار کر سکتا ہے۔ مگر اس برادری کے بہت سے افراد کا وقت ایک دوسرے کی تکفیر، چھوٹی چھوٹی باتوں پر ذہنوں اور دلوں میں دیواریں بنانے اور وصل کی بجائے فصل کی طرف لے جانے میں صرف ہوا ہے۔ مولانا کی شان دوسری تھی، وہ اُن ہندوستانیوں میں سے تھے جو مسلمان ہونے پر کبھی شرمائے نہیں، اُن مسلمانوں میں سے تھے جنہوں نے ہر حال میں قومی مقاصد کو پیش نظر رکھا اور اس پر فخر کیا۔ وہ پرانی وضع کے، پرانی نسل کے، پرانی چال کے، سیدھے سادے آدمی تھے۔ مگر نئے خیالات، نئے تقاضوں، نئی ضروریات سے انھوں نے آنکھیں کبھی بند نہیں کیں۔ ہر جماعت اور گروہ میں اُن کی عزت کرنے والے اور اُن سے محبت کرنے والے موجود تھے۔ انھوں نے جس طرح ایک وضع، ایک دھن، ایک لگن کے نشے میں زندگی گزاری اُسی طرح موت کا بھی نہایت وقار اور تحمل سے استقبال کیا، وہ تو اب اس دنیا میں نہیں ہیں مگر جنھیں بھی انہیں دیکھنے، اُن سے ملنے، اُن کے کچھ قریب آنے کا فخر نصیب ہوا ہے، وہ اُن کو بھلا نہیں سکتا اور نہ ان قدروں کو نظر انداز کر سکتا ہے جن کے وہ علمبردار رہے ہیں۔

مولانا حبیب الرحمٰن صاحب۔ صدر انجمن ترقی اردو۔ حیدر آباد دکن۔

اب سے تقریباً دس سال پہلے جمعیۃ العلمائے ہند کا سالانہ جلسہ حیدر آباد میں منعقد ہوا تھا۔ اس اجلاس میں اردو کے تعلق سے جو قرارداد مرتب کی گئی تھی، اُسے کھلے اجلاس میں پیش کرنے کا کام بحیثیت سکریٹری انجمن ترقی اردو حیدر آباد میرے سپرد تھا۔ اس موقعہ پر مجھے پہلی مرتبہ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی خدمت میں نیاز حاصل ہوا۔ اور پھر یہ نیاز مندی کا سلسلہ آخر تک جاری رہا۔

گزشتہ دسمبر میں مولانا حیدر آباد تشریف لائے تھے۔ اُس وقت یہاں آندھرا پردیش اردو کانفرنس کے اجلاس ہو رہے تھے۔ میری درخواست پر مولانا اردو ہال تشریف لائے اور تھوڑی دیر کے لئے اجلاس کو مخاطب کیا۔ اُس وقت کسی کو یہ گمان بھی نہ تھا کہ ہمارا یہ عظیم رہنما اس کے بعد پھر کبھی حیدر آباد نہیں آئے گا۔

مولانا کی زندگی عمل پیہم کا اعلیٰ نمونہ تھی۔ اوّلاً جد و جہد آزادی میں اور تقسیم کے بعد مصیبت زدہ مسلمانوں کے مسائل حل کرنے میں انہوں نے اپنی حیات کا تقریباً دو تہائی حصہ صرف کر دیا۔ اور اس ساری تگ و دو میں اپنی ذات کے لئے کچھ بھی حاصل نہیں کیا۔ ایثار و بے غرضی کی ایسی مثالیں بہت کم ملیں گی۔

مولانا ہمیشہ قومی نقطۂ نظر کے حامی رہے۔ لیکن ان کا یہ نقطۂ نظر مظلوم مسلمانوں کی حمایت کرنے میں مانع نہیں ہوا۔ آزادی کے بعد صرف اُنہی کی ذات گرامی ایسی تھی جس کی بدولت حکومت کے ایوانوں میں مسلمانوں کے حقیقی احساسات و جذبات کی ترجمانی ہوتی تھی۔ اب اُن کی جگہ لینے والا کوئی نظر نہیں آتا۔ خدا انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔

مسافران حرم کیلئے مجاہد ملتؒ کی مساعی جمیلہ

الحاج احمد غریب صاحب
ممبر بورڈ حج کمیٹی بمبئی سکریٹری انجمن خدام النبی
مینیجنگ ٹرسٹی محمد حاجی صابو صدیق مسافر خانہ بمبئی

حضرت مولانا حفظ الرحمن صاحبؒ نے ہندوستان کے مسلمانوں کی جو خدمات انجام دی ہیں، اس کی ایک شاخ مذکورہ بالاعنوان ہے۔ حرمین شریفین کے مسافروں کے لئے ان کی خدمات اظہر من الشمس ہیں خصوصاً سنٹرل حج کمیٹی جو ایک مشورتی ادارہ کی حیثیت رکھتی تھی۔ اس کی از سرنو تعمیر کرنا اور اس میں عملی روح پھونکنا یہ صحیح معنوں میں مولانا مرحوم کی مساعی جمیلہ کا نتیجہ تھا

حرمین شریفین۔ حجاج۔ مسافر خانہ۔ جہازوں کے آنے جانے کے پروگرام۔ حجاج کے آرام و آسائش کی باتیں، ہوائی جہاز کے مسائل۔ بمبئی اور جدہ کی بندرگاہ پر حجاج کے سامان کسٹم، مزدور، جگہ وغیرہ مسائل، حرمین پر ہندوستانی رباطوں، مسافر خانوں کے تصفیے، سعودی عرب میں ہندوستانی سفارت خانے کے امور، جہازران کمپنی۔ دہلی میں وزارت خارجہ کے متعلق امور حج کی چھان بین۔ حجاج کے ساتھ لے جانے اور لانے کی اشیاء پر غور و فکر۔ حجاج کے ساتھ لے جانے کی رقم۔ جہازوں میں حجاج کے کھانے اور جگہ کی تکالیف کا احساس، مسافر خانہ بمبئی میں حجاج کو آرام پہنچانے کی فکر اور ان کے علاوہ اور اسی طرح کے آئے دن سامنے آنے والے حجاج کے مسائل و معاملات میں مولانا کو عملی اور دماغی دلچسپی رہا کرتی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مولانا ان ہی کاموں کے لئے وقف ہیں حالانکہ جیسا اوپر کہا گیا یہ ان کی بیش بہا خدمات کی ایک شاخ تھی۔ اور ان کی خدمات کا صرف ایک رُخ تھا کیونکہ وہ تو ہندوستانی مسلمانوں کے چھوٹے بڑے کام کرنے میں آگے آگے رہتے تھے اور ان کو کامیابی کے ساتھ انجام بھی دیا کرتے تھے۔ یہ ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے۔ "تانہ بخشند خدائے بخشندہ"۔

حجاج کے کاموں سے مجھے تقریباً تیس سال سے قرب رہا ہے اور یہ میدان ایسا ہے کہ جس میں وہی شخص کامیابی کے ساتھ پار اتر سکتا ہے جس کو ان اجری الا علی اللہ پر یقین کامل ہو۔ اس میں شہرت اور ناموری قریب نہیں آتی۔ بہت دور سے اس کا واسطہ پڑتا ہے۔ یہ میدان سیاست سے علیحدہ رہا۔ اور جب تک علیحدہ رہا اس میدان میں مسلمانوں کی یا یوں کہیے کہ حجاج کی خدمت کا تانتا لگا رہا۔ اب اس میدان کو بھی سیاسی اکھاڑا بنانے کی کوشش ہو رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اس میدان کو اپنے حفظ و امان میں اور پناہ میں رکھے۔ انجمن خدام النبی بمبئی کی حج اور حجاج کی خدمات کا سلسلہ ۱۹۱۲ء سے شروع ہوا اور اب تک الحمد للہ جاری ہے۔ درمیان میں ایک دور اس کے مٹانے کی خواہش رکھنے والوں کا بھی آگیا۔ اس وقت مولانا مرحوم ہی تھے جنھوں نے دکھلائے جانے والے سیاہ رُخ کو ہی نہیں دیکھا بلکہ اس کے سفید رُخ کو بھی دیکھنے کی کوشش کی اور جب ان کو اطمینان ہوگیا تو پھر اس کی حمایت میں پوری قوت لگادی۔ یہ جرأت و ہمت افزائی بہت شاذ و نادر ہی پائی جاتی ہے۔

ان کے ساتھ کام کرنے میں ایک لطف محسوس ہوتا تھا۔ کیونکہ کام کرنے والوں کو یہ اطمینان رہتا تھا کہ ان مسائل کو حل کرتے ہوئے اگر حکومت کا کوئی شعبہ یا ذریعہ مقابلہ پر آجائے گا تو مولانا اس کا مقابلہ کریں گے۔ جو ہر لیڈر نہیں کرپاتا۔ ان کا حال تو یہ دیکھا کہ پنڈت جواہر لال نہرو سے قریبی تعلقات ہونے کے باوجود وہ ان کے ساتھ بھی لڑنے پر آمادہ ہو جاتے جہاں حجاج کا معاملہ سامنے آجاتا۔

ایک واقعہ کا مجھے ذاتی علم ہے کہ وزارت خارجہ کے ایک بڑے عہدہ دار کے ساتھ ان کی جھڑپ ہوگئی تھی اور اس کا علم جب پنڈت جی کو ہوا تو وہ بھی خاموش ہوگئے تھے

حجاج کے لئے جب انکم ٹیکس کلیرنس سرٹیفکیٹ کا معاملہ درپیش ہوا اور ان کی بمبئی کی تشریف آوری کے وقت ان کے گوش گزار یہ بات میں نے کی تو بے چین ہوگئے اور اس کام کے پیچھے لگ گئے تا وقتیکہ یہ سرٹیفکیٹس رد کردیئے گئے۔

سنٹرل حج کمیٹی میں میٹنگ میں بطور ممبر اور صدر ضرور شریک ہوتے اور ایک وقت تو ان کو غیر حاضر رکھنے کے لئے تاریخ بھی بدلنی پڑی تھی۔ جس میٹنگ میں وہ شریک نہیں ہوتے تھے اس میں خلا نظر آتا تھا۔

ان کی بمبئی کی ایک حاضری میں ان کو حجاج سے خطاب کرنے کے لئے گزارش کی گئی جو باوجود کم فرصت کے انھوں نے بصد شوق قبول فرمائی اور حجاج کو بہت سی کام کی باتیں بتلائیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا ان کا خاص موضوع ہے۔ تقریر کے اختتام پر ایک حاجی نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بہت کم باتیں آپ نے بتلائی ہیں تو حاجی کو خوش کرنے کے لئے انھوں نے سیرۃ النبی پر ایک گھنٹہ تک ایسی تقریر کی کہ لوگوں کی آنکھیں اشکبار ہوگئیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ جو بھی موضوع ہو اس پر وہ بلا جھجک بہت اچھی تقریر کرسکتے تھے اور حجاج کے معاملہ میں تو گویا ایک مخصوص انداز تھا جو سیرۃ کی تقریر میں ان کا انداز رہتا تھا۔

جدہ کے سفارت خانہ کے متعلق جب میں نے شکایات پیش کیں تو سن کر ان کو فوراً مان نہیں لیا بلکہ اس وقت کا انتظار کرتے رہے کہ بذات خود جا کر ان شکایات کی تحقیقات کریں۔

خدام النبی نے جمعیۃ علماء ہند کے ساتھ پورا تعاون کر کے بمبئی میں دینی تعلیمی کنونشن کرنے کا فیصلہ کیا۔ حضرت مولانا مرحوم و مغفور کی ذات تھی جس نے ناچیز کے ساتھ وقتی اور فروعی اختلافات کے باوجود اخلاقی طور سے اس پر مجبور کیا کہ وہ اس کام کی ذمہ داری لے اور الحمد للہ کہ جو ذمہ داری مولانا مرحوم نے دینی تعلیمی کنونشن کے سلسلہ میں عائد کی اسے پوری حد تک کامیابی کے ساتھ اس ناچیز نے ادا بھی کی۔ یہاں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ مولانا مرحوم کی ایک ہی بات نے سارے معاملات کو رفع دفع کر دیا، اور وہ بات یہ تھی کہ "باہمی اختلافات اپنی جگہ پر ہیں، اس وقت اس کام میں ہمارا ساتھ دیں۔ بعد میں بیٹھ کر گفتگو کر لی جائے گی۔

حجاج کے کام جب بھی بمبئی تشریف لائے تو مجھ جیسے ناچیز کارکن سے بغیر ملے ہوئے نہیں گئے اگر سنٹرل حج کمیٹی کے ایجنڈا میں کوئی اہم بات ہوتی تو میٹنگ سے قبل ملاقات کر لیتے۔ ان ہی مسافران حرم کے لئے کئی مرتبہ یہ مشورہ بھی ہوا کہ میں ان کے ساتھ حج کے موسم کے علاوہ وقت میں بادشاہ سعود کے یہاں ایک وفد کی صورت میں جاؤں اور حجاج کی جو شکایات حکومت سعودیہ سے متعلق ہیں ان کے بارے میں بادشاہ سعود سے براہ راست گفتگو کی جائے۔ مگر اس کا کوئی موقع نہیں آیا کہ ہم دونوں اس کام کو انجام دیں۔ حالاں کہ مولانا مرحوم نے اپنی مصروفیات کے باوجود مجھ سے یہ کہہ دیا تھا کہ تم جب بھی کہو گے میں ساتھ چلنے کو تیار ہوں۔

حجاج کے ایک ایسے مخلص خادم کی موت پر مسافران حرم کے دل رنج و غم سے بھر نہ جائیں تو اور کیا ہو۔ حجاج اور ان کے خدام کے لئے ان کی وفات کافی پریشانی کا باعث بن گئی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بنی رہے گی۔ کیوں کہ ؎

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

بمبئی میں حجاج کے لئے محمد حاجی صابو صدیق مسافر خانہ اپنی نوعیت کا ایک ہی بلکہ یوں کہئے کہ دنیا میں ایک ہی مسافر خانہ ہے۔ جب بھی کسی کام سے بمبئی تشریف لاتے تو مسافر خانہ میں ضرور ایک وقت حاضری دیتے اور اوپر کی منزل تک خود چڑھتے اور جو اصلاحات سمجھ میں آتیں وہ مجھ تک ضرور پہنچاتے۔ اسی طرح خدام النبی کے دفتر میں ضرور تشریف لاتے اور کارکنان سے مل کر خوش ہوتے جیسا اوپر کہا گیا ہے کہ جب خدام النبی کو دنیا کے سامنے غلط پیش کیا جا رہا تھا اور حالت یہ تھی کہ

رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں
کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

ایسے حال میں مولانا کی ذات تھی کہ مولانا نے خدام النبی کی حمایت میں اپنے آپ کو پیش کیا اور یہاں تک کوشش کی کہ اس کے سکریٹری کو حج کمیٹی کی صدارت دی جائے۔

مولانا کے ساتھ بعض غلط فہمیوں کی بنا پر میرے تعلقات بہت گہرے نہ تھے، مگر اس زمانہ میں کئی

جب حجاج کا سوال پیش آیا یا ان کے متعلق کوئی شکایت پیدا ہوئی تو وہ فوراً ایسے گھل مل جاتے تھے جیسے ہم دونوں کے تعلقات بہت گہرے، بہت قدیم اور بہت ہی قریبی ہیں۔

پروردگار عالم حرمین کے بے شمار مہمانوں کے طفیل میں ان کی روح کو اعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرمائے ان کی قبر کو منور کر دے۔ ان کی خدمات کو قبول فرمائے۔ ساتھ ہی ہندوستانی مسلمانوں کو اس قحط الرجال کے دور میں مولانا مرحوم جیسے بے باک و بے لاگ، جفاکش رہبر عطا کرے۔ پس ماندگان کو صبر جمیل دے۔ ہندوستان کے مظلوم مسلمانوں کی الجھی ہوئی گتھیوں کو سلجھانے والا نعم البدل مرحمت فرمائے۔ مسلمانوں کو ہمت و توفیق سے نوازے اور سچا اور عملی مسلمان بنا دے۔

وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيزٍ
اللّٰهُمَّ اغْفِرْ لَهٗ وَارْحَمْهُ رَحْمَةً وَاسِعَةً
بِرَحْمَتِكَ يَا أَرْحَمَ الرَّاحِمِينَ

مولانا حفظ الرحمٰن مرحوم

شری ایس، پی سنہا ایڈووکیٹ سپریم کورٹ
سابق جسٹس الہ آباد ہائی کورٹ

مجھ سے یہ فرمائش کی گئی ہے کہ میں مولانا مرحوم کے متعلق اپنے تاثرات اور مشاہدات پیش کروں یہ بہت مشکل کام ہے۔ میں اپنے کو اس قابل نہیں پاتا۔ دہلی آنے کے بہت عرصہ کے بعد مولانا سے تعارف ہوا۔ میری معلومات بہت محدود ہیں۔ لیکن ارشاد کی تعمیل بھی بہت ضروری ہے۔

انگلستان کے صف اول کے ایک شاعر TENNYSON ٹینسن نے اپنے ایک دوست ہیلم HALLAM کی وفات پر ایک بے مثل نظم تصنیف کی۔ اس کے عنوان کا مفہوم یہ ہے۔

دنیا نے ہیلم کا سوگ منایا اس سے میرے دل کا
بوجھ ہلکا نہیں ہوا۔ وہ اپنی جگہ پر ہے

ایسے ہی کچھ میرے بھی تاثرات ہیں۔

ملک اور قوم نے مولانا کی وفات پر سوگ منایا
یہ ان کا فرض تھا۔ میرے دل کا بوجھ ہلکا نہیں ہوا

میری پہلی ملاقات مولانا سے ۱۹۵۵ء میں ہوئی۔ اس کے بعد اکثر ملاقاتیں ہوئیں، ۱۹۴۷ء کے محشر انگیز زمانہ میں جو خدمات مولانا نے ادا کی تھیں ان کا تذکرہ میں سن چکا تھا۔ ان کی عظمت میرے دل میں پہلے ہی سے تھی۔ قریب آنے پر وہ عظمت اور بڑھ گئی۔ مولانا انگریزی نہیں جانتے تھے، لیکن سیاسیات خوب سمجھتے تھے۔ سیاسیات سمجھنے والے تو بہت ہیں لیکن ایثار اور قربانی کا جذبہ کتنوں میں ہے! شاید لاکھوں میں ایک یا دو ہیں۔ مولانا ان خوبیوں کی جیتی جاگتی تصویر تھے۔

قانونی مسائل میں وہ اکثر مجھ سے مشورہ کرتے تھے۔ آخر میں تو ان کا کرم اس قدر بڑھ گیا تھا کہ ان مسائل پر میری رائے ان کی نظروں میں فیصلہ کن ہوتی تھی۔ ہر شخص کی مدد کرنا۔ دوسرے کے دکھ درد کو اپنا دکھ درد سمجھنا۔ یہ باتیں تو میں مولانا میں برابر دیکھتا تھا۔ اکثر میں نے اپنے مضامین انگریزی اور اردو میں مولانا کی تعریف کی۔ لیکن ۱۹۶۰ء میں جب بھوپال، جبل پور، ساگر وغیرہ میں قیامت خیز واقعات ہوئے۔ اس وقت میں مولانا کی ہمت، استقلال اور جذبۂ انسانیت کو دیکھ کر حیران ہوگیا۔

اس وقت انھوں نے اپنے کو دامے درمے ہرمتے میں قربان کردیا۔ جبل پور سے لوٹنے کے بعد ایک بدحواسی کے عالم میں انھوں نے مجھ سے ساری کیفیت ٹیلیفون پر بیان کی، مجھ سے پوچھا جبل پور جا کر پیروی کیجئے گا اور یہ بھی کہا کہ "عنایت ہوگی"۔ میں نے جواب دیا "عنایت کس بات کی، یہ تو میرا فرض منصبی ہے"۔ یہ جواب سن کر میں نے یہ محسوس کیا کہ ان کا بوجھ ہلکا ہوگیا۔ انھوں نے یہ فرمایا کہ "مجھ کو یہی امید تھی"۔

اس کے بعد انھوں نے جو کارہائے نمایاں کئے وہ دنیا جانتی ہے۔ لیکن ان واقعات نے سخت پیچیدگیاں پیدا کردی تھیں۔ ایک طرف ہر مسلمان کے دل میں خوف وہراس اور احساس کمتری پیدا ہوگیا تھا۔ یہ ملک کے لئے بڑے خطرے کی بات تھی۔ دوسری طرف ہندو مہا سبھا، جن سنگھ راشٹریہ سیوک سنگھ میں یہ خیال پیدا ہوگیا تھا کہ اس ملک میں اقلیتوں کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ ڈاکٹر کاٹجو نے اپنی تحریر، تقریر، اپنے طرز عمل سے اس خیال کو تقویت پہنچائی۔ اس آگ کے پھیلنے کا سخت اندیشہ ہوگیا تھا۔ سبھدرا جوشی۔ مسز شیلا نہرو۔ انیسہ قدوائی نے موقع پر جاکر اس آگ کو بجھایا، مولانا کا ہاتھ بٹایا۔ پرائم منسٹر نے ان واقعات کی سخت مذمت کی، بار بار کی۔ لیکن مسلمانوں کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی کہ مجموعی طور پر مرکز نے اپنی ذمہ داری پورے طور پر محسوس نہیں کی اور اپنا فرض ادا کرنے میں قاصر رہا۔ یہ وقت بہت نازک تھا، مولانا کو اس وقت مسلم کنونشن

Muslim Convention

کا خیال پیدا ہوا۔ مسلم کنونشن کو اس وقت ایک برا خیال کیا گیا۔ اکثریت کے صرف انھیں لوگوں نے نہیں جو ہمیشہ اور ہر موقع پر مسلمانوں کے خلاف رہتے ہیں، بلکہ بہت سے آزاد خیال لوگ بھی اس کے خلاف تھے، یہی نہیں بلکہ خود مسلمانوں میں کچھ ایسے لوگ تھے جو اس کے سخت مخالف تھے۔ لیکن مولانا کی منشا دوسری تھی۔ وہ ایک پلیٹ فارم بنانا چاہتے تھے جس پر سب مسلمان ایک جگہ جمع ہوکر فرقہ واری کے دائرہ میں محدود رہ کر اپنے خیالات اور جذبات کا اظہار کریں۔ احساس کمتری جو ملک کے لئے خطرۂ عظیم ہے دل سے نکال دیں۔ دوسری طرف اکثریت اور حکومت کو پوری طرح یہ محسوس ہوجائے کہ مسلمانوں پر زیادتیاں ہورہی ہیں ان کو مذہبی حق اس ملک میں رہنے کا ہے جو اکثریت کو ہے اب ان کا پیمانہ صبر لبریز ہوگیا ہے۔

مولانا نے مجھ کو اپنے خیالات سے مطلع کیا۔ میں نے ان کی رائے سے اتفاق کیا۔ اردو اخبارات میں میں نے متعدد مضامین لکھے۔ لیکن میں نے اس کو کافی نہیں سمجھا ——
انگریزی کے ایک صف اول کے اخبار کی تائید ضروری تھی۔

شکر ہے کہ ہندوستان ٹائمز نے مجھ سے اتفاق کیا اور میرے مضامین چھاپے۔ آج مولانا نہیں ہیں۔ لیکن وقت نے ان کی رائے کو صحیح ثابت کر دیا۔ مسٹر لال بہادر شاستری نے خود تسلیم کیا کہ مولانا کی رائے صحیح تھی۔ آج مسلم کنونشن کو برا کہنے والا کوئی نہیں ہے۔ مسلمانوں کے لئے کنونشن نے آئندہ کے لئے ایک صحیح راستہ کھول دیا۔

محنت، جانفشانی، بے پناہ دوڑ دھوپ کا مولانا کی تندرستی پر سخت اثر ہوا ہم جیسوں کا اندیشہ تھا۔ لیکن جب تک صاحب فراش نہیں ہو گئے مولانا ہر جگہ موجود تھے۔ میرٹھ، چندوسی، مرادآباد، علی گڑھ ہر جگہ۔ میری تنی رائے ہے کہ مسلم یونیورسٹی پر اگر مجموعی طور پر کوئی آنچ نہیں آئی تو بہت کچھ مولانا کے اثر اور اقتدار کا نتیجہ ہے۔ ڈاکٹر شریمالی اور مسٹر دتار نے جو تقریریں علی گڑھ میں کیں۔ ان کا طرز عمل۔ خود یونیورسٹی کے جو فروش گندم نما لیڈروں کا طرز عمل۔ ان سب نے ہر مسلمان کے دل میں ایک ہراس پیدا کر دیا تھا۔ لیکن حسب معمول پنڈت نہرو نے اپنے کو بہت اونچا ثابت کر دیا۔ دشمنوں کو جواب مل گیا۔ لیکن دنیا شاید پورے طور پر نہیں جانتی کہ پنڈت نہرو کو صحیح واقعات بتانے، صحیح رائے دینے اور صراط المستقیم پر قائم رکھنے میں مولانا کا کتنا ہاتھ و حصہ تھا۔

یوں تو ہر موقع پر مولانا سینہ سپر ہوتے تھے۔ لیکن دو ایک باتوں کا تذکرہ ضروری ہے۔ خاص کر اردو کا۔ اردو ہماری سب کی زبان ہے۔ اردو ہمارا مشترکہ سرمایہ ہے۔ یہ سب باتیں تو ہمارے دلوں پر نقش ہیں ان کو دہرانا بیکار ہے ہمارے ہی دلوں پر نہیں بلکہ مخالفین کے دلوں پر بھی، چاہے وہ زبان پر نہ لائیں۔ میں چند الفاظ میں یہ دکھلانا چاہتا ہوں کہ آزادی کے وقت سے اردو کس مشکل دور سے گذری۔ اس پر کیا کیا ظلم ڈھایا گیا۔ مولانا نے کیا کیا خدمات کیں۔

محبان اردو کو یاد ہوگا کہ کچھ ایسے لوگ بھی تھے اور ہیں جو اس کے وجود ہی سے منکر تھے اور ہیں۔ مثلاً ڈاکٹر سمپورنانند حالانکہ شاید بہت سے لوگ نہیں جانتے کہ وہ خود بھی ایک نہایت اچھے اردو کے شاعر ہیں۔ ایک ایسی جماعت بھی تھی جس کا طریقہ نہایت مخدوش تھا۔ مثلاً مسٹر پرشوتم داس ٹنڈن۔ ڈاکٹر رگھبیر سیٹھ گوبند داس۔ ان کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا یہ مولانا ہی کا کام تھا۔ یہ لوگ اردو کو مسٹر جناح اور مسلم لیگ کی زبان کہہ کر بدنام کرتے تھے اور کہتے تھے کہ اس کی وجہ سے پاکستان بنا۔ اگر یہ ختم نہ کر دی جائے گی تو اس ملک میں اور بہت سے پاکستان بن جائیں گے یہ کہہ کر ایک ہوا کھڑا کر دیا گیا تھا۔ کہ مسلمان اس سے مرعوب ہو جائیں اور قریب قریب کامیاب ہو گیا تھا۔ لیکن کچھ محبان اردو ایسے تھے جنہوں نے اس کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ ان میں حسب معمول مولانا پیش پیش تھے۔ یوں تو مولانا نے بہت سی تقریریں کیں لیکن سب سے زوردار اور مدلل تقریر وہ تھی جو انہوں نے پارلیمنٹ میں ۲۹ مارچ ۱۹۶۳ء کو کی تھی جس سے مسٹر ٹنڈن، سیٹھ گوبند داس کے الزامات اور مولانا کا جواب پوری طرح سے ظاہر ہو جائے گا۔

(۱) .... دوسروں کو مرعوب کرنے کا یہ ڈھنگ نکالا ہے کہ فوراً ہی پاکستان، مسٹر جناح اور مسلم لیگ تین بھوت سامنے کھڑے کر دیئے جائیں گویا اگر کوئی دوسرا شخص ٹنڈن جی یا سیٹھ گوبند داس کے خلاف بولنا چاہے تو مرعوب ہو کر وہ جرأت ہی نہ کر سکے۔

(۲) اسپیکر صاحب آج اس گمراہ کن طرز عمل کے خلاف پر زور احتجاج کرنے اور یہ بتانے کھڑا ہوا ہوں کہ حق کی آواز ٹنڈن جی کا یہ طریق کار ہرگز نہیں دبا سکتا

(۳) ہم نہ پاکستان کے لفظ سے مرعوب ہو سکتے ہیں اور نہ مسلم لیگ اور مسٹر جناح سے۔ اس لئے کہ ہماری قوم پروری پنڈت نہرو اور دوسرے چوٹی کے لیڈروں سے کسی طرح کم نہیں ہے۔

(۴) اردو زبان کی تحریک جو یو۔پی میں چلائی جا رہی ہے اس کی مخالفت کرنے والا خود فرقہ پرست ہے۔

(۵) پاکستان اردو نے نہیں بنوایا۔ بلکہ سیاسی بے ایمانیوں اور دلوں کے کھوٹ تنگ نظری اور تنگ دلی نے اس کو چار چاند لگائے۔

(۶) تاریخ بتاتی ہے کہ جب یہ مسئلہ کانگریس کے اجلاس میں زیر بحث تھا، اس وقت لیڈروں کی تقریروں کے بعد پہلا شخص میں تھا جس نے پورے زور کے ساتھ کہا کہ بزدلانہ طریقہ پر انگریز کی کرائی ہوئی تقسیم کو قبول نہیں کرنا چاہئے

یوں تو تمام تقریر بہت راست گفتاری۔ دلیل کا کرشمہ ہے۔ لیکن یہ چند ٹکڑے اپنی جگہ ایک خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ مولانا کے کارہائے نمایاں تو ہر شعبہ میں پائے جائیں گے۔ لیکن میں نے اردو کا خاص طور پر تذکرہ اس وجہ سے کیا ہے کہ اب بھی اس کی مخالفت در پردہ کی جا رہی ہے۔ سیٹھ گوبند داس اور ڈاکٹر رگھبیر اب بھی ہیں۔ مسٹر گوپالا ریڈی نے ریڈیو کی مشکل ہندی کو آسان بنانے کی کوشش کی اس پر ایک طوفان برپا ہو گیا۔ حال ہی میں ایک جلسہ بھی اس مقصد سے کیا گیا۔ ڈاکٹر راجندر پرشاد نے بھی اس پر اپنی مہر ثبت کر دی۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کیونکہ ڈاکٹر صاحب نے اردو کے حق میں پچیس لاکھ کی دستخطی درخواست کو ردی کے ٹوکرے میں پھینک دیا تھا۔ عرضداشت کا جواب بھی انہوں نے نہیں دیا۔ مسلمانوں میں بھی کچھ ایسے لوگ موجود ہیں جو ہندی کی خوشامد میں اردو کے رسم الخط کو ہی مٹانا چاہتے ہیں۔ خواجہ احمد عباس نے یہ خیال ظاہر کیا ہے۔ ان کا جواب ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے خوب اور مدلل دیا ہے۔ مولانا کو اس کا کس قدر خیال تھا کہ انہوں نے بستر مرگ سے بھی ایک خط اس کے متعلق چیف منسٹر یو۔پی کو حال ہی میں

لکھا تھا۔ وقت اپنا انتقام لیتا ہے، قانون قدرت اپنا کام کرتا ہے۔ جب انگریزی پر بھی سارے ملک میں حملے شروع ہوئے تو سارے ہی ملک میں پریشانی پھیل گئی مدراس نے جس طرح اس کا مقابلہ کیا وہ سب جانتے ہیں۔ مسٹر راج گوپال آچاریہ نے جو جواب حامیان ہندی کو دیا وہ دہرانے کے قابل ہے۔ انھوں نے یہ کہا:۔

"آپ لوگوں کا طریقۂ عمل جو اُردو کے ساتھ رہا اور ہے
اس کے بعد کس کو اطمینان ہو سکتا ہے کہ آپ ہماری زبانوں
کو مٹا نہ دیں گے"

یہ ہے جواب قانون قدرت اور یہ ہے انتقام وقت۔

مولانا کی وفات پر جو تعزیتی جلسہ زیر اہتمام جمعیۃ علماء صوبہ دہلی ہوا تھا اس میں مسٹر گلزار زتشی نے ایک نہایت معرکۃ الآراء نظم پڑھی تھی۔ ایک شعر اس کا مجھ کو خاص طور پر پسند آیا۔

روحیں قاسم اور کفایت کی بھی رنجیدہ ہیں آج
ان کی بزم ناز کا کیا ارمغاں جاتا رہا

مسٹر زتشی کی اجازت سے اس پر ایک گرہ لگانا چاہتا ہوں۔

روحیں گاندھی اور نہرو جی کی رنجیدہ ہیں آج
ان کی بزم ناز کا کیا ارمغاں جاتا رہا

عربی کا ایک مقولہ ہے سید القوم خادمھم۔ قوم کا جو خادم ہے وہی سردار قوم ہوتا ہے۔ مولانا نے اپنے کو قوم اور ملک کی خدمت میں مٹا دیا۔ قوم نے ان کو اپنا سردار مانا۔ بستر مرگ پر پڑے ہوئے وہ امروہہ کے الیکشن میں کامیاب ہوئے۔ یہ قوم اور ملک کا ایک سپاہی تھا مرتے دم تک ان کی خدمت میں رہا۔

مضمون طویل ہو گیا چند الفاظ میں اس کو ختم کر دوں گا۔ انگریزی کے ایک شاعر نے کہا ہے:۔

موت تو سب کو آتی ہے، لیکن ایسا شخص کبھی نہیں مرتا
جو مرنے کے بعد دوسروں کے دلوں میں اپنی یادگار چھوڑ جائے

یہ شعر مولانا کے بالکل حسب حال ہے۔

ایک مورخ نے لکھا ہے کہ مرنے کے وقت نپولین کے لبوں پر یہ الفاظ تھے

My Country میرا ملک Josephence جوزیفنس

France فرانس

جن لوگوں کو یہ سعادت نصیب ہوئی ہوگی کہ وہ مولانا کے قریب آخر وقت میں تھے تو انھوں نے شاید ان کے لبوں پر یہی الفاظ سنے ہوں گے۔

ملک۔ قوم خداوندا! ان کو اپنی آغوش رحمت میں رکھنا۔

لوگوں کے دلوں میں یہ خیال پیدا ہوا ہے کہ ان کی یادگار قائم کی جائے۔ ان کے کارنامے ان کی بہترین یادگار ہیں۔

"ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما"

لیکن اگر یادگار کا خیال ہے تو میری رائے میں ایک اول درجہ کا انگریزی روزنامہ ان کی بہترین یادگار ہوگا۔ مولانا کو خود اس کا بے انتہا خیال تھا۔ اگر وہ کچھ روز اور زندہ رہتے تو وہ یقینی طور پر اس کو کر کے دکھا دیتے۔ مجھ سے بارہا انھوں نے اس کا تذکرہ کیا۔ وہ جو کہتے تھے کر کے دکھا دیتے تھے۔ اگر ان کے فرمانوں سے متاثر ہو کر لوگوں نے یہ کام کیا تو میرے بزرگ جسٹس کان پوری کا شعر حسب حال ہوگا

موت ہی سے ہو اگر زیست کا پیدا ساماں
ایسی اک مرگ پہ صد زیست ہماری قرباں

اَللّٰہ غفارٌ لہٗ

۱۳۸۲ ھ

الولی، یحیی ویمیت وھو علی کل شیٔ قدیر

۱۳ ھ ۸۲

قطعہ تاریخ وفات جانکاہ

۱۹ ۶ ۲

آہ محب اسلام مجاہد ملت نور اللہ مرقدہٗ

۱۳ ھ ۸۲

عزم و عظمت کا نشاں فخر زماں جاتا رہا
حفظ رحمن نازش اسلامیاں جاتا رہا
سرنگوں ہے اے ثمر اب قصر ملت کا علم
"دین و ملت کا عزیز پاسباں جاتا رہا"

نیاز آگیں مہجیدان ثمر چھتاروی علی گڑھ
۱۹۶۲ء

جس ملت کے لئے وہ جیتا تھا اور
تڑپتا تھا عمر بھر کیا وہ اسے چھوڑ کر چلا گیا ؟
کیا کینسر کے ایک زخم نے حفظ الرحمٰن کو ختم کر ڈالا ؟
کیا ایک چنگاری نے آتشکدہ کو بجھا دیا ؟
ہم گواہ ہیں اس کی بیماری کے آخری دن بھی !
اس دل مضطرب نے اس سے کہا ۔
تیری ساری زندگی پیغام تھی یہ بیماری بھی ایک پیغام ہو !
کینسر کی ٹیسیں — جانکنیاں — لیکن
ہجوم احباب میں اس کی محبت اور مروت بدستور تھی ۔
وہ صبر و رضا کا مجسمہ ہر ایک کو خوش آمدید کہتا تھا ۔
مرض کی انتہائی سختیوں میں اس کی استقامت اور خندہ پیشانی
قائم تھی ۔

اس کی استقامت اور صبر میں جھلک تھی اس صبر و استقامت
کی جو مدینہ کے زمین و آسمان نے چودہ سو برس پہلے دیکھی تھی ۔
موت کے سائے گہرے ہوتے جاتے تھے ۔
لیکن وہ مایوس نہ تھا — وہ ملت کے حال سے کبھی غافل
نہ تھا ۔ وہ عیادت کرنے والوں سے ملت کے حال کا پرساں تھا ۔
ہم گواہ ہیں کہ ہم نے آخری دنوں تک اس کی شگفتہ پیشانی
پر موت کا خوف نہیں دیکھا ۔
سانس بے قابو ہو رہا تھا لیکن ہمت سینہ سپر تھی ۔
وہ موت سے لڑتا رہا ، وہ مجاہد تھا ملت کا ۔
حفظ الرحمٰن کی زندگی ایک پیغام ہے ۔
اس کی موت بھی ایک پیغام ہے — ایک پیغام جاوداں ۔

امیر دھامپوری

نوحۂ دل

تم سے بس اتنا ہی اے اہل وطن کہنا ہے
آج ملت کے مجاہد نے کفن پہنا ہے

پیکرِ خُلق و مروت نے کفن پہنا ہے
قوم کے صاحبِ خدمت نے کفن پہنا ہے
اُمتِ بیضا کی عظمت نے کفن پہنا ہے
آج اک غازیِ میت نے کفن پہنا ہے
آج اک غازیِ ملت نے کفن پہنا ہے
آج مسلم کی سیاست نے کفن پہن لیا
ولی اللّٰہی طریقت نے کفن پہن لیا
کیا کہوں دین کی امانت نے کفن پہن لیا
آج احمدؐ کی نیابت نے کفن پہنا ہے
آج اک غازیِ میت نے کفن پہنا ہے

آج ایک اہلِ شریعت نے کفن اوڑھ لیا
آج اک صاحبِ نسبت نے کفن اوڑھ لیا
آج اک اہلِ حقیقت نے کفن اوڑھ لیا
آج اک غازیِ اُمت نے کفن پہنا ہے
حفظ الرحمٰن کی میت نے کفن پہنا ہے
تھا جو سے دردِ یتیموں کا کفن پوش ہے آج
تھا جو بیواؤں کا ہمدرد کفن پوش ہے آج
فخرِ ملت وہ جوانمرد ، کفن پوش ہے آج
تم سے بس اتنا ہی اے اہلِ وطن کہنا ہے
آج ملت کے مجاہد نے کفن پہنا ہے

مولانا حفظ الرحمن بحیثیت محسن قوم وزبان

از الحاج۔ خان بہادر۔ الطاف احمد خیری۔ آر۔ اے۔ ایس (ریٹائرڈ)
صدر انجمن ترقی اردو۔ راجستھان جے پور

مولانا حفظ الرحمن مرحوم یوں تو اپنی زندگی کے تقریباً چالیس سال تک ملک وقوم کی بے مثال خدمات انجام دیتے رہے مگر ان کی وہ خدمات جن کی بنا پر مجھے مولانائے مرحوم سے ایک غیر معمولی اور شروع میں غائبانہ محبت ہو گئی تھی۔ وہ تھی ان کی وہ خدمت جو ۱۹۴۷ء کے ہنگاموں کے موقع پر انھوں نے مسلمانوں کی کی اور اس کے بعد سے جو مسلسل جد وجہد وہ کرتے رہے اور جس سوجھ بوجھ کے ساتھ انھوں نے مسلمانوں کی رہبری اور رہنمائی کی۔

ملک کے تقاسمہ سے پہلے مولانا حفظ الرحمن نے ہمیشہ دو قومی نظریہ کی اور ملک کے تقاسمہ کی مخالفت کی مگر آزادی سے پہلے بھی اور بعد میں بھی کبھی انھوں نے حق بات کہنے سے گریز نہیں کیا۔ ان کی دو صفتیں مجھے خاص طور سے پسند ہیں۔ ایک ان کا نڈر پن یا بے باکی اور دوسری ان کی حق گوئی۔ وہ کبھی بڑی سے بڑی ہستی سے مرعوب نہیں ہوئے اور باوجود کانگریس پارٹی کے ممبر ہونے کے اور پنڈت جواہر لال نہرو سے خاص عقیدت اور محبت رکھنے کے، مولانا کبھی کسی فرد یا پارٹی کی وجہ سے حق بات کہنے سے باز نہیں رہے۔

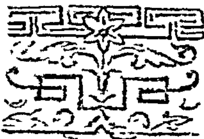
تیسری بات جو ان میں خاص تھی وہ تھی ارادے کی پختگی۔ ہر بات میں ان کا طریقۂ کار تعمیری اور مصلحانہ ہوتا تھا۔ مگر جب کوئی بات اچھی طرح غور وخوض کے بعد طے کر لیتے تھے تو پھر اس پر جمے رہتے تھے۔

مولانا حفظ الرحمن ؒ نے جو زبردست عزت اور مرتبہ پایا اور لوگوں کے دلوں میں جو جگہ حاصل کی ظاہر ہے کہ وہ انھوں نے ملک اور قوم کی بے لوث و مخلصانہ اور حقیقی خدمت سے کی۔ مولانائے مرحوم سے لوگوں کو کس درجہ محبت تھی اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ وہ مستورات جو گھر میں بیٹھی رہتی ہیں اور جن کو سیاست سے کوئی واسطہ نہیں وہ "الجمعیۃ" پڑھتی تھیں تو سب سے پہلے مولانا کی صحت کا بلیٹن پڑھتی تھیں۔ نیز ۲ اگست کی صبح کو جبکہ مولانا کا انتقال دلی میں ہو چکا تھا، مگر ابھی اعلان نہیں ہوا تھا اس وقت بھی یہاں جے پور میں اور ملک کے ہر شہر میں فجر کی نماز کے بعد مجھ جیسے بے شمار بندگان خدا نے روزانہ کی طرح مولانا کی صحت اور درازیٔ عمر کی دعائیں کیں۔

مولانا مرحوم سے میری ابتدائی ملاقات بھی غالباً اردو کے تحفظ کے سلسلہ میں ہوئی۔ اور اس کے بعد سے ان سے زیادہ تر تبادلۂ خیالات اردو ہی کے بارے میں ہوا۔ مولانا نے کبھی ہندی کی مخالفت نہیں کی۔ مگر ساتھ ہی ساتھ ہمیشہ یہ کوشش کی کہ اردو کو اس کا جائز مقام ملے اور اس کو بھی ملک کی ایک قومی زبان کی حیثیت سے پھیلنے پھولنے کا موقع حاصل ہو۔ وہ نہ صرف انجمن ترقی اردو ہند کی مجلس عاملہ کے ممبر تھے اور اپنے مفید مشورے انجمن کو دیتے تھے، بلکہ انجمن کے باہر بھی وہ ہر ممکن طریقے سے اردو کی حمایت کرتے رہتے تھے۔ اور یہ کہ اردو کی حمایت میں جو خط انھوں نے اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ کو اور ملک کے وزیر اعظم کو بستر علالت سے بھیجے وہ غالباً اردو کے لئے ان کی آخری خدمت تھی۔

آزادی کے بعد سے مولانا کی زندگی کا مشن ہی یہ تھا کہ ایک طرف تو ملک ترقی کرے اور ملک میں اتحاد واتفاق ہو (وہ اردو کو بھی اتحاد کا ایک ذریعہ سمجھتے تھے) اور دوسری طرف مسلمانوں کو بحیثیت ہندوستانی شہری جو حقوق قانوناً حاصل ہیں ان سے فائدہ اٹھانے کا عملاً پورا پورا موقع ان کو ملے اور مسلمانوں کے ساتھ بے انصافیاں اور ظلم وزیادتیاں نہ ہوں۔ ساتھ ہی ساتھ مسلمان اپنے آپ کو ہندوستان کا ویسا ہی شہری سمجھیں جیسے دوسرے فرقوں کے لوگ ہیں اور ان میں کسی قسم کا خوف وہراس اور احساس کمتری نیز یاس وناامیدی پیدا نہ ہو۔

اس وقت جب کہ مولانا حفظ الرحمن کے انتقال کو پندرہ ہی دن ہوئے ہیں۔ میں ایسا محسوس کرتا ہوں کہ قوم یتیم ہو گئی اور قوم کا کوئی مخلص خادم اور رہبر نہ رہا۔ اور ان کی جگہ کوئی نہیں لے سکتا، مگر ظاہر ہے کہ مولانائے مرحوم کے مشن کو پورا کرنا ہے۔ اس کام کو انجام دینے کے لئے لوگوں کو آگے بڑھنا چاہئے۔



مولانا حفظ الرحمٰن میری نظر میں

(شری گوپی ناتھ امن لکھنوی)

یوں تو ۱۹۳۰ء اور ۱۹۳۲ء میں میرٹھ جیل میں مولانا بشیر احمد اکثر مجھ سے مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کا ذکر کیا کرتے تھے کہ کس طرح وہ ڈابھیل کے مدرسہ کو چلانے کے ساتھ ساتھ جدوجہد آزادی میں حصہ لے رہے ہیں۔ لیکن مولانا سے میری ملاقات ۱۹۳۷ء میں دہلی میں ہوئی۔ جب میں ادارۂ تیج سے وابستہ ہوکر غازی آباد سے یہاں آگیا۔ ٹھیک ٹھیک تو یاد نہیں لیکن رائے بہادر رام کنشور کی صدارت میں اردو کے متعلق کوئی جلسہ تھا جس میں تعارف ہوا۔ جب سے مولانا نے دہلی ہی کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنایا۔ اس وقت سے مجھے ان کی خدمت میں نیاز حاصل ہوتا رہا۔ میں نے اپنی زندگی میں بہت کم لوگ ایسے دیکھے ہیں جو کہ سیاسی میدان میں اس درجہ حق و صداقت پر قائم ہوں چونکہ مولانا کی کیفیت یہ تھی کہ " نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پرواہ" ان کے جو کچھ دل میں ہوتا تھا وہی زبان پہ ہوتا تھا حق بات کہنے سے کبھی نہیں جھجکتے تھے۔ اور باطل سے مرعوب کبھی نہیں ہوتے تھے۔ وہ مصلحت جسے مولانا آزاد نے ایمان کی موت کہا ہے کبھی ان کے آس پاس ہوکر نہ نکلتی تھی۔ کبھی کبھی ان کی تلخ نوائی غالب کا یہ شعر یاد دلاتی تھی۔

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی سے معاف ؛ آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

کئی جلسوں میں مولانا کو پاکستان بلایا گیا۔ ان میں سے ایک دو میں میں بھی گیا۔ لیکن مولانا تشریف نہیں لے گئے میں نے وجہ دریافت کی تو فرمایا۔ کیا کہوں کچھ جی نہیں چاہتا۔ مولانا کا کام بہت مشکل تھا۔ ایک طرف تو جمعیت العلماء کے لیڈر کی حیثیت سے مسلمانوں کے جائز حقوق کی حفاظت کرنا اور دوسری طرف انہیں فرقہ پرستی سے باز رکھنا۔ ماننا پڑے گا کہ یہ دونوں کام مولانا نے بہ درجہ احسن سر انجام دیئے۔

بہ حیثیت مقرر مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کا درجہ بہت بلند تھا۔ محفل میلاد ہو کہ سیاسی جلسہ کوئی دینی اجتماع ہو یا پولٹیکل کانفرنس ان کی شخصیت چھا جایا کرتی تھی۔ ان کی زبان میں اثر تھا اور ان پر یہ مصرع صادق آتا تھا۔ کسی کی آنکھ میں جادو تری زبان میں ہے۔

میں نے بے شمار جلسوں میں انہیں سنا اور یہی کیفیت پائی۔

محفل میلاد کے کئی جلسوں میں انہیں میرے ساتھ شریک ہونے کا اتفاق ہوا۔ اور جب کبھی ان کے بعد تقریر کرنی پڑی تو میں چند منٹ سے زیادہ نہ بول سکا۔ کیونکہ ذہن میں ان کی تقریر گونجتی رہتی تھی پار سال یوم غالب پر جب انہوں نے حضرت غالب کے اس مطلع کی تشریح کی کہ "نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا" تو تمام مجمع سے صدائیں بلند ہوئیں خواجہ حسن نظامی صاحب کی رحلت پر درگاہ نظام الدین میں جو تعزیتی جلسہ ہوا اس میں مولانا نے اسی انداز میں تقریر فرمائی جیسے کہ خواجہ صاحب مرحوم کیا کرتے تھے ۱۹۳۸ء میں شری سبھاش بابو کی صدارت میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا اجلاس ہوا تو مولانا نے اقلیتوں کے حقوق کے بارے میں جس انداز سے اپنی تقریر پیش کی وہ انہیں کا حصہ تھا۔

ایک بار محفل میلاد شریف شروع ہونے سے قبل میں مولانا کے قریب بیٹھا تھا۔ میں نے عرض کی کہ آپ کو جس طرح سیاسی اور دینی حلقوں میں مقبولیت حاصل ہے یہ بات بڑی مشکل سے کسی کے حصے میں آسکتی ہے مولانا نے مسکراتے ہوئے فرمایا۔ مگر امن صاحب اس کا دوسرا پہلو بھی ہے مولویوں کے حلقہ میں مجھے شبہہ کی نظر سے دیکھا جاتا ہے کہ یہ تو سیاسی آدمی ہے۔ اور سیاسی حلقوں میں مجھے ملائے مکتب سمجھا جاتا ہے اسی طرح مولانا بہت سی باتیں بذلہ سنجی کے الفاظ میں کہہ جایا کرتے تھے۔

ایک بار کسی سیاسی جلسہ سے ہم واپس ہو رہے تھے میرے ساتھ میری اہلیہ بھی تھیں۔ مولانا کی جیپ میں بیٹھتے وقت میں نے کہا۔ مولانا آپ کو کوئی اعتراض نہ ہوگا کہ کوئی عورت آپ کی جیپ میں بیٹھ جائے مولانا نے جواب دیا میں بھی کون سا ایسا مرد ہوں جو مجھے اعتراض ہوگا مولانا جس انجمن میں رہے اس کو فیض پہنچاتے رہے

گلشن میں سرو فوج میں مثل نشاں رہے
ہم بھی تو سربلند رہے ہیں جہاں رہے

جمعیۃ العلماء کی وہ جان تھے میری آنکھوں کے سامنے بار بار ان کی تصویر آتی ہے میری نظر کے سامنے بار بار وہ نقشہ آجاتا ہے کہ مولانا جمعیت کے دفتر میں بیٹھے ہیں سامنے عقیدتمندوں اور ضرورتمندوں کا ایک جھرمٹ ہے اور مولانا سب کی باتوں کا جواب دے رہے ہیں کسی کے لئے کسٹوڈین کے محکمے کو خط لکھ رہے ہیں کسی کے لئے کسی اور افسر کو۔ اس نوعیت کے خطوط میرے پاس بھی آیا کرتے تھے

یوں تو مولانا جس انتخاب میں کھڑے ہوئے کامیاب ہوئے لیکن اس سال پارلیمنٹ میں ان کی کامیابی بڑی حیرت انگیز تھی کیونکہ اپنی بیماری کی وجہ سے وسط جنوری کے بعد اپنے حلقہ انتخابات میں نہ جا سکے۔ ایک طرف فرقہ پرست ہندوؤں سے مقابلہ تھا تو دوسری طرف فرقہ پرست مسلمانوں سے۔ مولانا کی غیر حاضری کے باوجود ان کی حمایت میں بڑے بڑے شاندار جلسے ہوئے اور ایک مخالف امیدوار

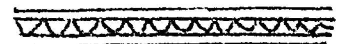
کی ضمانت بھی ضبط ہوگئی جب میں مولانا کو مبارکباد پیش کرنے گیا تو انہوں نے شکریہ ادا کرتے ہوئے ایک ہندو فرقہ پرست اخبار کا بھی تذکرہ کیا جس نے ان کے حق میں مضامین لکھے تھے میں نے عرض کی حضور یہ حب علیؓ نہیں بغض معاویہ ہے۔

جواب دیا کچھ بھی ہو جس نے کلمۂ حق کہا ہے اس کا شکریہ تو ادا کرنا ہی چاہئے۔

یہ تھی مولانا کی ذہنیت یہ تھا ان کا انداز فکر۔ صحت کے قانون بھی اخلاقی قانون کی طرح اٹل ہیں۔ مولانا نے حیثیت کے باہر محنت کی ان کے دروازے ہمیشہ غریبوں اور حاجتمندوں کے لئے کھلے رہتے تھے صبح سے آدھی رات تک کام کرتے رہتے تھے ملک کے مختلف حصوں میں دورے کیا کرتے تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی رحلت کے بعد انہی پر مسلمانوں کی نظریں جاتی رہتی تھیں بڑے سے بڑے قومی مسائل کے ساتھ ساتھ انہیں چھوٹی سے چھوٹی باتوں پر توجہ دینی پڑتی تھی۔ کہیں کسی کانفرنس کی صدارت کرنی ہے وہاں کے لوگ دعوت نامے لے کر آتے ہیں کہیں کسی کے مکان پر ناجائز قبضہ ہوگیا ہے وہ بھٹا کرتہ پہنے سامنے کھڑا ہے مولانا خوش ہو رہے ہیں کہ پہلے میرے پاس کیوں نہیں آئے اس وقت معاملہ بآسانی سلجھ جاتا خیر مجھ سے جو کچھ ہوسکتا ہے کروں گا۔

دہلی میں کل ہند اردو کانفرنس ہوئی تو مولانا استقبالیہ کمیٹی کے صدر تھے اور میں سکریٹری۔

مولانا کا خطبہ بڑے معرکہ کا تھا ساتھ ہی ان میں تنظیم کی قوت بھی بلا کی تھی۔ اس کانفرنس کا افتتاح شری جواہر لعل نہرو نے کیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی تقریر فرمائی اور اس کے ایک ہفتہ بعد مولانا آزاد سپرد خاک ہوگئے۔ اب یہ سب داستانیں ہیں۔ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کا جسم خاکی ہمارے آگے نہیں بلکہ ان کے کارنامے باقی ہیں۔



سراپا درد و اخلاص

(از: حکیم محمد مختار اصلاحی۔ مدیر مسیحا بمبئی)

مولانا حفظ الرحمن صاحب مرحوم جنگ آزادی کے ایک بہادر سپاہی ملک کے ایک مخلص رہنما۔ ملت کے ایک عظیم مجاہد۔ بہترین خطیب، خوش بیان مقرر۔ بلند پایہ مصنف و ادیب، مدبر و مفکر اور اسی طرح کی اور دوسری بہت سی خوبیوں کے مالک تھے۔

ان پر اب تک بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور آئندہ بھی بہت کچھ لکھنے کی گنجائش ہے۔ ان کی تمام صفات میں میرے نزدیک انہیں جو چیز دوسرے رہنماؤں سے ممتاز کرتی ہے وہ ان کا "سراپا درد و اخلاص" ہے۔ آزادی سے پہلے دل میں آزاد ہونے کی تڑپ رہی اور آزادی ملنے کے بعد ہمہ وقت یہ غم ستاتا رہا۔ کہ ملک کے لوگ صحیح راستہ پر کیوں نہیں چلتے۔

مولانا کو میں نے دور سے بھی اور قریب سے بھی دیکھا۔ دینی تعلیمی کانفرنس میں۔ بمبئی کے مختلف اجتماعات میں۔ سورت کے تاریخی اجلاس میں اور دہلی کے مسلم کنونشن میں، ہر موقع پر میں نے یہ محسوس کیا کہ مولانا کا اخلاص اور درد نکھر کر ظاہر ہو رہا ہے۔

مسلم کنونشن میں یہ دیکھا کہ جن سے اتفاق تھا انہیں بھی اور جن سے اختلاف تھا انہیں بھی پکڑ پکڑ کر اسٹیج اور اونچی کرسیوں پر بٹھلاتے تھے اور خود اپنے لئے نیچے کرسی پسند کرتے تھے۔ یہی ان کے اونچے ہونے کی دلیل تھی۔ مقصد ایک ہی پیش نظر تھا کہ کسی صورت میں بھی مل بیٹھ کر مسائل حل ہوجائیں۔ یہ کنونشن جس نازک موڑ سے گذرا اور مولانا نے اسے جس طرح بچایا یہ انہیں کے بس کا کام تھا۔

جب کبھی ملکی و ملی حالات پر ان سے گفتگو ہوئی۔ درد وغم سے بھرا پایا

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

امیر کا یہ شعر خود کے کتنا حسب حال تھا نہیں معلوم! لیکن مولانا کے بالکل حسب حال تھا۔ ہندو ہو یا مسلمان، سکھ ہو یا عیسائی ظلم کسی پر بھی ہو مولانا تڑپ اٹھتے تھے اور ہر طرح سے اس کی مدد کرتے تھے۔ بناوٹ و تکلف سے ہمیشہ دور رہے۔ سادہ زندگی اور وضعداری ان کا شعار رہا۔ سیاسی زندگی کے ابتدائی دنوں میں جب بمبئی تشریف لائے تو حاجی عبداللہ عرب کے مہمان رہے۔ حاجی صاحب نے جس خلوص و محبت کا ثبوت دیا مولانا کے دل پر بھی اس کا اتنا ہی گہرا اثر رہا۔ مجھے علم ہے کہ مولانا کی شہرت و مقبولیت کے بعد بہت سے لوگوں نے یہاں انہیں اپنا مہمان بنانا چاہا لیکن مولانا نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ حاجی صاحب کو تو میں نے اپنا "مستقل میزبان" بنا لیا ہے اب کسی اور جگہ قیام کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس طرح کی اور بہت سی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ جن سے ان کے اخلاص اور وضعداری کا پتہ چلتا ہے۔

اب ہماری کچھ یہ عادت ہوگئی ہے کہ ہم اپنے عظیم رہنماؤں کی زندگی میں جیسی چاہیئے قدر و عزت نہیں کرتے لیکن مرنے کے بعد چند دن خوب روتے ہیں اور پھر ہمیشہ کے لئے بھول جاتے ہیں۔ یہ عادت ہمیں چھوڑ دینا چاہیئے ملکی و ملی خدمات کے سلسلہ میں مولانا کا ایک عظیم ریکارڈ ہے اس کو فراموش کر دینا بڑی ناسپاسی ہوگی۔ پورے ملک کا یہ فرض ہے کہ جلد ان کی ایک ایسی یادگار قائم کی جائے جس سے آئندہ نسل بھی مولانا کو

آخری قندیل جو بجھ گئی

جناب احمد فاطمی ۔ مدیر بھوداں تحریک

مولانا حفظ الرحمٰن کی موت، امام الہند حضرت مولانا ابوالکلام آزادؒ کی رحلت کے بعد ملک اور ہندوستانی مسلمانوں کے لئے سب سے بڑا حادثہ ہے۔

ملک کی آزادی کی لڑائی کے دوران ہندوستانی مسلمانوں میں سے ایک ایسی بھی قیادت اُبھری تھی جس کی جڑیں مذہب میں تھیں اور جس کے لئے ملک کی آزادی جزو ایمان کا درجہ رکھتی تھی۔ وہ لوگ جتنے اچھے مسلمان تھے اتنے ہی اچھے ہندوستانی بھی تھے۔ ان کی "مسلمانی" اور ان کی "ہندوستانیت" میں کوئی ٹکراؤ نہ تھا۔ بلکہ پوری ہم آہنگی اور مطابقت تھی۔ وہ جہاں ہندوستانی مسلمانوں کے حقوق سے آگاہ تھے وہاں مسلمانوں کے فرائض کی طرف سے بھی ان کی آنکھیں اوجھل نہیں تھیں۔ امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد، شیخ الہند حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ، مفتی کفایت اللہؒ، مولانا احمد سعید اور ان جیسے دوسرے بزرگوں نے حب وطن اور مسلمان دوستی کی جو ایک روایت قائم کی تھی۔ مولانا حفظ الرحمٰن اس کی آخری نمایاں کڑی تھے۔ مولانا مرحوم کے انتقال کے ساتھ اس شاندار روایت کی آخری قندیل بجھ گئی!

مولانا حفظ الرحمٰن کو قوم نے مجاہد ملت کا خطاب دیا تھا۔ وہ سچ مچ مجاہد ملت تھے ان کی ساری زندگی جہاد کرتے گذری، جہاد ملک کی غلامی کے خلاف، فرقہ پرور مسلمانوں اور ہندوؤں کے خلاف ملک کے دشمنوں کے خلاف! غیروں نے ان کی ذات پر حملے کئے۔ انھوں نے انھیں طعن و تشنیع کا نشانہ بنایا فرقہ پرور مسلمانوں نے انھیں ہندوؤں کا غلام بتایا۔ فرقہ پرست ہندوؤں نے انھیں فرقہ پرور مسلمان کہا۔ لیکن اس مرد مجاہد کے مضبوط قدم ایک لمحہ کے لئے بھی اپنی جگہ سے نہیں ڈگمگائے۔ وہ ملک کی غلامی کے دوران انگریز سامراجیہ کے خلاف بدستور سینہ سپر رہے اور ملک کی آزادی کے بعد ملک کے بناؤ کی تدبیروں کی طرف حکومت اور عوام کی توجہ دلاتے رہے۔ وہ اس حقیقت سے باخبر تھے کہ ملک صحیح معنوں میں تبھی ترقی کرے گا جب سماج کے کُل اعضا یکساں ترقی کریں گے۔ اور ملک کو ترقی یافتہ بنانے کی تگ و دو میں تمام عناصر کو مساوی حصہ لینا اور کوشش کرنی چاہئے۔ اسی لئے وہ جہاں ایک طرف مسلمانوں کو ملک کی مجموعی زندگی میں برابر کا حصہ لینے اور ترقی کی کوششوں میں پورے طور پر شریک ہونے کے لئے اکساتے رہے وہاں دوسری طرف حکومت کی کوتاہیوں اور فرقہ پرور ہندوؤں کے تنگ نظرانہ خیالات کے مہلک اثرات ڈٹ کر اجاگر کرتے رہے۔ چنانچہ یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ ملک کی آزادی کے بعد مسلمانوں کے حقوق کی نگہبانی اور ان کے مفاد کی حفاظت کی سعی و جستجو میں مولانا آزاد کے بعد مولانا حفظ الرحمٰن سب سے مضبوط ستون تھے۔

ملک کی بہبودی اور بہتری میں انھوں نے اپنی شخصیت کو ضم کر دیا تھا اور اپنی زندگی کے کسی دور میں بھی وہ اس کی طرف سے غافل نہیں رہے۔ تین زبانوں کے فارمولا پر وزیر اعلیٰ اتر پردیش کے نام امریکا سے

جہاں وہ بستر علالت پر پڑے تھے۔ ان کا خط اس کی مثال ہے۔ موت واقع ہونے سے کوئی ایک ہفتہ قبل بھوداں کا یہ خادم مولانا مرحوم کی خدمت میں عیادت کی غرض سے دوبارہ حاضر ہوا تھا اور اس کے دل پر اس بات کا گہرا اثر ہوا تھا کہ ایسے وقت بھی جب کہ موت دروازے پر کھڑی تھی، مولانا کا ذہن ملکی مسائل پر سوچ رہا تھا۔

مولانا مرحوم کے تدبر اور احساس ملی کی حالیہ مثال دلی میں مسلم کنونشن کا انعقاد ہے۔ یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے کہ اس کنونشن کے روح رواں مولانا تھے مسلمانوں کے مسئلے اور ان کی شکایتوں کو منظم اور مربوط ڈھنگ پر ملک اور حکومت کے سامنے پیش کرنے کی ضرورت محسوس کرتے ہی مولانا نے کنونشن کی داغ بیل ڈال دی۔ اس کنونشن کے انعقاد سے پہلے ملک کے ایک طبقے نے بہت شور واویلا مچایا اور اس کے بعد بعض اپنوں اور پرائے رفیق کاروں کو بھی ان سے غلط فہمی پیدا ہوگئی۔ لیکن مولانا مرحوم پر ان کا کوئی اثر نہیں ہوا انھوں نے دونوں محاذوں پر جم کر مقابلہ کیا اور بالآخر وہ بادل چھٹ کر رہا۔

انڈین مسلم کنونشن میں جن لوگوں نے شرکت کی تھی، وہ مولانا مرحوم کے حسن و تدبر کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتے اس سے کچھ ہی روز پہلے ملک میں فرقہ وارانہ فسادات ہوئے تھے ان فسادوں کی وجہ سے مسلمانوں کے دل دکھی تھے۔ کئی لوگوں کے جذبات مشتعل تھے۔ مولانا کی حکمت عملی یہ رہی کہ کنونشن کے کھلے اجلاسوں میں انھوں نے دل کا بخار اتارنے میں مندوبین کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی۔ لیکن بند اجلاس میں انھوں نے اپنی ساری توجہ اس بات پر مرکوز کر دی کہ مندوبین کے اذہان قومی تقاضوں سے دور نہ جا پڑیں۔ مشتعل ڈیلی گیٹ چونکہ کھلے اجلاس میں اپنے دل کی بھڑاس نکال چکے تھے اس لئے فیصلہ کرتے وقت وہ حضرات بھی مسئلہ کو ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچنے کی حالت میں آچکے تھے۔ نتیجہ یہ کہ کنونشن میں جو تجویزیں منظور ہوئیں ان کی معقولیت ہر گوشہ میں تسلیم کی گئی۔ راقم الحروف کا خیال ہے کہ اگر کھلے اجلاس کی طرح

بند اجلاسوں میں بھی اخبار نویسوں کو شریک ہونے کی اجازت دی گئی ہوتی تو تنقید کے بدلے مولانا مرحوم کے تدبر کی توصیف اخباروں میں شائع ہوتی۔

ایک ایسے وقت میں جب کہ عام انتخاب میں ٹکٹ حاصل کرنے کے لئے غرض مندانہ اصحاب جوڑ توڑ کر رہے تھے۔ مولانا نے مسلم کنونشن کے انعقاد کی تیاری شروع کی۔ ان دنوں دلی کے بعض حلقوں میں یہ عام چرچا تھا کہ آنے والے عام چناؤ میں مولانا کو پارلیمنٹ کے لئے ٹکٹ نہیں ملے گا اور اگر کسی طرح ٹکٹ مل بھی گیا، تو ان کا ہارنا یقینی ہے۔ لیکن مولانا کے سامنے پورے ملک کا مفاد تھا۔ انھیں اس کی ذرہ برابر بھی فکر نہیں تھی کہ انھیں ٹکٹ ملے گا یا نہیں اور ملے گا تو ان کا کیا انجام ہوگا۔ خوشی کی بات ہے کہ دونوں شبہے غلط ثابت ہوئے۔ انھیں ٹکٹ بھی ملا اور اس کے باوجود کہ اپنی علالت کے سبب اپنے الیکشن میں وہ کوئی کام نہیں کر سکے ان کی بہت ہی شاندار جیت ہوئی۔

مولانا مرحوم کی خاموش اور تعمیری خدمت کا ایک باب جو بہتوں کی نگاہ سے پوشیدہ ہے جمعیۃ علماء ہند کی قیادت کا ان کا دور ہے۔

آزادی حاصل ہونے کے بعد ملک کی جس ایک جماعت کے ساتھ سب سے زیادہ ناانصافی ہوئی ہے، وہ ہے جمعیۃ علماء ہند۔ دنیا کے کسی حصے کا مولوی ہندوستان کے مولویوں جتنا انقلابی شاید ہی رہا ہو، غالباً ہندوستان کی تنہا مثال ہے، جہاں کے عالم طبقہ نے ملک کی غلامی کے خلاف منظم طور پر حکومت سے مسلسل ٹکر لی ہو۔ اس ملک کی آزادی کی جدوجہد میں شاہ ولی اللہ اور سید احمد شہید بریلوی سے لے کر حسین احمد اور حفظ الرحمٰن تک یہاں کے علماء کا بڑا حصہ ہے۔ لیکن آزادی حاصل ہونے کے بعد جب یہاں کے مسلمانوں میں سیاسی لیڈرشپ قائم کرنے کا سوال پیدا ہوا، اس وقت کانگریس نے جس کے دوش بدوش علماء کی اس جماعت نے قربانی پیش کی تھی، جمعیۃ علماء یا نیشنلسٹ مسلمانوں کی لیڈرشپ قائم کرنے کے عوض رجعت پسند مسلم لیگ کے سابق لیڈروں سے ساز باز کر لی۔ چنانچہ آج نئی پیڑھی کو اس کی بھی خبر نہیں کہ حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری، مولانا آزاد، شیخ الہند مولانا محمود الحسن، مولانا حسین احمد مدنی، مفتی کفایت اللہ، مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد، مولانا احمد سعید اور بہت سے دوسرے اکابر کی رہنمائی میں جمعیۃ علماء نے ایک طرف مسلمانوں میں ملی اور ملکی شعور بیدار کیا تھا اور دوسری طرف ان کے دلوں میں آزادی کی جوت جگائی تھی۔

جمعیۃ علماء کی قیادت جس وقت مولانا حفظ الرحمٰن کے حصہ میں آئی اس وقت جمعیۃ علماء بجا طور پر شکست امید کے ملال میں گرفتار تھی۔ مایوسی اور ملال کے سبب کئی لوگوں کے سوچ میں تشدد اور انتہا پسندی پائی جانے لگی تھی۔ لیکن یہ مولانا حفظ الرحمٰن کی ہی قیادت کا کمال تھا کہ انھوں نے نہ تو جمعیۃ علماء کو ٹوٹنے دیا اور نہ انتہا پسندوں کے رجحانات کو ایک حد سے تجاوز ہونے دیا۔ ملک کی قومی زندگی پر مولانا مرحوم کا یہ بہت بڑا احسان ہے۔

دنیا کی کوئی کمی ناقابل تلافی نہیں ہوتی۔ لیکن یہ سچ ہے کہ مولانا حفظ الرحمٰن کے انتقال سے جو جگہ خالی ہوئی ہے اسے پوری کرنے والا آج کوئی نہیں ہے۔ مولانا مرحوم کے عقیدت مندوں کی اس دیس میں کمی نہیں ہے ان کے عقیدت مند مولانا کی سمجھائی ہوئی واضح راہ اختیار کر کے اس خلا کو پُر کرنے کی کوشش کریں، اس سے بہتر مولانا کی دوسری کوئی یادگار نہیں ہو سکتی۔

خدمت کا ایک اعلیٰ نمونہ

مولانا عبید الرحمٰن شروانی علی گڑھ

مولانا مرحوم مغفور کی ابدی مفارقت سے جو خلا ہوگیا اس کے پُر ہونے کی شکل نظر نہیں آتی اللہ تعالیٰ مولانا مرحوم مغفور کو غریقِ بحرِ رحمت فرمائے قدرت جس سے جو کام جتنے دن چاہتی ہے لے لیتی ہے مولاناؒ نے مسلسل جد و جہد پیہم عمل اور شبانہ روز محنت سے نوع انسان کا ایک اعلیٰ نمونہ پیش کیا۔ اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کو ان کے نقش قدم پر چلنے کی ہمت اور توفیق ارزاں فرمائے۔ آمین

جان دی دی ہوئی اُسی کی تھی

ایک سچا ہندوستانی، سچا مسلمان اور اونچے درجہ کا انسان

از پنڈت سندر لال صاحب

سب مذہبوں نے اور خصوصاً اسلام نے آدمی کے دو طرح کے فرائض صاف صاف بتائے ہیں ایک وہ فرائض جو ہر انسان کے اپنے خالق اور پروردگار کی طرف ہیں اور دوسرے وہ جو ہر انسان کے باقی تمام انسانوں اور تمام مخلوق کی طرف ہیں سورہ نساء ۶، میں اللہ نے کہا ہے "اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی دوسرے کو شریک مت کرو اور نیکی کرو اپنے والدین کے ساتھ، اپنے قریبی رشتہ داروں کے ساتھ، یتیموں کے ساتھ، مسکینوں یعنی ضرورت مندوں کے ساتھ، اپنے اُن پڑوسیوں کے ساتھ جنھیں تم جانتے ہو۔ اور ان پڑوسیوں کے ساتھ جنھیں تم نہیں جانتے یا جو دور کے ہیں اور اپنے پاس کے ساتھیوں کے ساتھ اور راہ چلتوں کے ساتھ جو تمھیں مل جاویں اور اُن سب کے ساتھ بھی جن پر تمھارا اختیار ہے، کیوں کہ اللہ ان لوگوں سے پیار نہیں کرتا جو دوسروں کے ساتھ بُرا برتاؤ کرتے ہیں یا جو گھمنڈ کرتے ہیں "

اوپر کی آیتوں میں ہمارے دونوں طرح کے فرائض کا صاف صاف ذکر کیا گیا ہے اور دوسرے انسانوں کی طرف ہمارے فرائض میں مذہب یا ملت کا کوئی لحاظ نہیں رکھا گیا ۔

یہ دونوں طرح کے فرائض کلام مجید میں بار بار اور جگہ جگہ بیان کئے گئے ہیں ۔ ایک حدیث اس مضمون کی بھی ہے کہ اللہ اپنی طرف انسان کے فرائض کو خاص صورتوں میں معاف کرسکتا ہے لیکن دوسرے انسانوں یا مخلوق کی طرف فرائض میں کوتاہی کو معاف نہیں کرسکتا ۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ دوسرے انسانوں کی طرف ہمارے فرائض وقت اور حالات کے مطابق بدلتے رہتے ہیں ۔ اب اگر ہم فی زمانہ دنیا کے ان حالات کی طرف نظر ڈالیں تو دو باتیں صاف دکھائی دیتی ہیں ۔ ایک یہ کہ اس زمین کے قریب پونے تین ارب انسان چھوٹے بڑے بے شمار مذہبوں اور سینکڑوں قوموں میں بٹے ہوئے ہیں ۔ دوسری یہ کہ تمام انسانی قوم کی یگانگت یعنی مساوات انسانی یا اخوت انسانی کو عملی جامہ پہنانے کی طرف دنیا آج جس تیزی کے ساتھ بڑھتی ہوئی نظر آرہی ہے تاریخ میں پہلے شاید کبھی نظر نہیں آئی دنیا کے مختلف ممالک میں آنا جانا جتنا آج بڑھا ہوا ہے پہلے کبھی نہیں تھا ۔ آج آسانی سے ایک آدمی صبح کا کھانا دہلی میں کھا کر شام کا کھانا نیویارک میں جا کر کھا سکتا ہے ۔ چوبیس گھنٹے میں ہم پورے کرۂ زمین کا چکر لگا سکتے ہیں جس منزل کی طرف انسانی دنیا آج بڑھتی ہوئی نظر آتی ہے اس کا ذکر قرآن پاک میں صاف صاف الفاظ میں آچکا ہے ۔ کلام مجید کا کہنا ہے : ۔ كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً (۲-۲۱۳) یعنی تمام بنی نوع ایک اُمت یعنی ایک قوم تھے ۔ یہ خیال کلام مجید میں قریب قریب ان ہی الفاظ میں کئی جگہ آیا ہے ۔ مفسروں کی یہ بھی رائے ہے کہ ماضی کا صیغہ کَانَ عربی محاورہ میں تاریخی حقیقتوں اور عالمگیر سچائیوں کے لئے بھی استعمال کیا جاتا ہے ۔ سورۃ المائدہ ۵ میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ : ۔

لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَمِنْهَاجًا وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَجَعَلَكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَلَكِنْ لِيَبْلُوَكُمْ فِي مَا آتَاكُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ إِلَى اللَّهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ (۵-۵۱)

یعنی " تم میں سے ہر ایک کے لئے ہم نے الگ الگ شرع اور منہاج بنا دیئے ہیں ۔ اگر اللہ چاہتا تو تم سب کو ایک ہی امت (یعنی ایک ہی شرع اور منہاج کے ماننے والے) بنا دیتا ۔ لیکن وہ چاہتا ہے کہ جس کو جو طریقہ بتا دیا گیا ہے اسی میں اُسے آزماوے ۔ اسی لئے نیک کاموں کے کرنے میں ایک دوسرے سے بڑھنے کی کوشش کرو ۔ تم سب کو اللہ ہی کی طرف جانا ہے ۔ اس وقت وہ تم پر ان باتوں کی حقیقت ظاہر کر دے گا، جن کے بارے میں تم میں آپس میں اختلاف ہے "

آیت لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ (۲-۲۵۶) کا بھی یہی منشا ہے ۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ عربی لفظ اُمت کئی الگ الگ مفہوموں میں استعمال کیا جاتا ہے اور قرآن اور دیگر اسلامی کتب میں بھی الگ الگ مفہوموں میں آیا ہے

مولانا حفظ الرحمٰن مرحوم کی وفات پر ملال پر اپنے رنج و الم کا اظہار کرنے کے لئے جو جلسہ عام جمعیۃ علماء ہند کی طرف سے ہوا تھا ۔ اس میں ایک بھائی نے یہ یاد دلایا تھا کہ مولانا مرحوم اپنی تقریروں میں موجودہ انسانی دنیا کا اور خصوصاً اپنے پیارے وطن کا موازنہ ایک ایسے باغ کے ساتھ کیا کرتے تھے جس میں الگ الگ رنگوں اور الگ الگ خوشبوؤں کے پھولوں کی الگ الگ کیاریاں اپنے اپنے رنگ اور اپنی اپنی خوشبو سے پورے باغ کی زینت اور اس کی شان کو بڑھاتی ہیں ۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کی تمثیلیں خاص حدود کے اندر ہی درست مانی جاسکتی ہیں لیکن اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ مولانا مرحوم کا یہ

خیال قرآن کریم کی تعلیم کے مطابق اور مشیت ایزدی کی سچی تصویر ہے۔ اس کے خلاف تخیل اور عمل کی کوشش مشیت ایزدی میں مداخلت اور لا اکراہ فی الدین کے حکم کی خلاف ورزی ہے جلال الدین رومی نے اپنی مثنوی میں جسے "قرآن در زبان پہلوی" کہا گیا ہے۔ قرآن کے اسی مفہوم کو ان الفاظ میں ادا کیا ہے ۔

ہندیاں را اصطلاح مادہ اند　　سندھیاں را اصطلاح دیگر اند

قرآن کریم نے ان لوگوں میں جو اس طرح کے حالات میں اللہ کی خدمت کرنا چاہتے ہیں۔ نو اوصاف کا ہونا لازمی بتایا ہے — (۱) وہ ایمان والے ہوں (۲) انھیں اللہ پر پورا بھروسہ ہو (۳) وہ اپنے یا دوسروں کے خلاف سنگین جرم یعنی ظلم کرنے سے اور خواہش سے بچتے ہوں (۴) دوسروں کے قصور کرنے پر باوجود غصہ آ جانے کے (خود اپنی کوتاہیوں پر نظر رکھتے ہوئے) انہیں معاف کر دیتے ہوں (۵) ہر وقت اللہ کے حکم اور اللہ والوں کی نصیحت کو سننے، سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کو تیار رہتے ہوں (۶) ہمیشہ اللہ سے دعا مانگتے رہتے ہوں (۷) زندگی میں اپنے معاملات کو ان لوگوں سے ایسی صلاح و مشورہ کر کے طے کرتے ہوں جن کے ساتھ ان معاملات کا تعلق ہے (جیسے گھریلو معاملات میں گھر والوں سے، تجارتی معاملات میں ساجھی داروں سے، ملکی معاملات میں حکام وقت یا اہل کاروں یا دوسرے ساتھیوں سے وغیرہ) (۸) اللہ نے جو کچھ انھیں دیا ہے اس میں سے ضرورت مندوں کی مدد کرتے ہوں اور (۹) اُن پر اگر کوئی بڑی زیادتی کی جاوے تو گھبرا کر ظلم کے سامنے کبھی جھکنے کو راضی نہ ہوں۔ کیوں کہ جو جس کو نقصان پہنچاوے اس کو اس کے بدلے میں اتنا ہی نقصان پہنچایا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص معاف کر دے اور اپنے کو نقصان پہنچانے والے کے ساتھ صلح کر لے تو اُسے اللہ سے اس کا اچھا اجر ملتا ہے۔ سچ مچ اللہ دوسروں پر ظلم کرنے والوں کو پیار نہیں کرتا (۴۲ سے ۳۶ سے ۴۰ تک)

قرآن کے بتائے ہوئے ان اوصاف میں جن دوسروں کے ساتھ برتاؤ کا ذکر کیا گیا ہے ان میں مسلم یا غیر مسلم کا کوئی فرق نہیں کیا گیا۔ جو لوگ مولانا مرحوم کے خیالات، جذبات اور ان کے کام کے طریقوں سے واقف تھے انھیں معلوم ہے کہ مولانا مرحوم کو ان اوصاف سے بھرپور حصہ ملا ہوا تھا مولانا حفظ الرحمٰن کو مجاہد ملت کہا جاتا ہے۔ جہاد لفظ کے اونچے سے اونچے معنی میں مولانا مرحوم سچے مجاہد تھے۔ ہو سکتا ہے کہ "جہاد" کے اور بھی مرد میدان موجود ہوں جن سے مجھے نیاز حاصل نہیں ہوا لیکن جہاں تک میں واقف ہوں مجھے اس وقت مولانا حفظ الرحمٰن سے بڑھ کر مجاہد اس ملک میں نظر نہیں آتا۔ جہاد کے اعلیٰ ترین معنی کے لئے قرآن کی آیتیں اور احادیث نقل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میری نظر اس وقت صرف آزادی کے بعد کے زمانہ پر ہے ۔

ایک واقعہ اپنے ذاتی تجربہ کا اس جگہ دہرانا مجھے ضروری معلوم ہوتا ہے ۱۹۴۷ء–۴۸ء میں ملک کی آزادی کے ٹھیک بعد ہمارے کچھ بڑے بڑے اہل وطن اس بات کے درپے تھے کہ ملک کے دو ٹکڑوں میں سے پاکستان کو ہندوؤں سے اور ہندوستان کو مسلمانوں سے خالی کر دیا جائے۔ گاندھی جی نے دونوں طرف سے اس کارروائی کو روکنا چاہا۔ اس کے لئے انھوں نے مجھے پاکستان بھیجا۔ میں لاہور پہنچا۔ لاہور سے میں نے جہلم اور چکوال تک کا دورہ کیا۔ اس سارے خطے کے حالات کو آنکھوں سے دیکھا واپس آکر لاہور میں میں نواب زادہ لیاقت علی خاں، راجہ غضنفر علی خاں اور دوسرے مسلم لیڈروں سے ملا۔ گفتگو ہوئی پاکستان کے سب مسلم لیڈر اس بات پر راضی ہو گئے کہ پاکستان سے باقی ہندوؤں کا نکلنا اور ہندوستان سے باقی بچے مسلمانوں کا نکلنا دونوں فوراً بند کر دیئے جائیں۔ اتفاق سے مسٹر جناح بھی لاہور میں موجود تھے۔ انھوں نے بھی اس تجویز سے پوری طرح اتفاق کیا۔ ایک معاہدہ تحریر میں لایا گیا۔ اس قلمبند معاہدہ کی ایک کاپی راجہ غضنفر علی کے پاس چھوڑ کر دوسری اپنے ساتھ لے کر میں فوراً دہلی آیا۔ معاہدہ کی کاپی میں نے گاندھی جی کو دکھائی۔ انھوں نے اسے غور سے پڑھا۔ بے حد خوش ہوئے، مجھے شاباش دی، صاف الفاظ میں انھوں نے کہا کہ :— "یہ تو بڑی اچھی چیز ہے مجھے یہ منظور ہے"۔ میں نے اجازت چاہی کہ میں راجہ غضنفر علی کو گاندھی جی کی منظوری کا تار بھیج دوں تاکہ دونوں طرف سے اس پر عمل درآمد فوراً شروع ہو جائے۔ راجہ غضنفر علی نے میرے لاہور سے چلنے پر متعدد ایسی اسپیشل ٹرینوں کی روانگی پاکستان سے روک دی تھی جن میں ہندو شرنارتھی بھر بھر کر بھارت بھیجے جا رہے تھے۔ اسی لئے معاہدہ کی اس طرف سے منظوری کی اطلاع کا جلد از جلد لاہور پہنچنا ضروری تھا گاندھی جی نے میرے اجازت مانگنے پر کچھ سوچا اور کہا "ذرا ٹھہر جاؤ، میں ولبھ بھائی سے بات کر لوں، صبح تار دے دینا۔" میں چلا آیا۔ صبح کو پھر میں گاندھی جی کے پاس پہنچا۔ میں نے پھر لاہور منظوری کا تار بھیجنے کی اجازت چاہی۔ گاندھی جی نے نہایت درد کے ساتھ جو درد اُن کے چہرے کے ایک ایک روئیں سے ٹپک رہا تھا سرد آہ بھر کر مجھے جواب دیا "کیا کروں بھئی! ولبھ بھائی نہیں مانتا، اچھا ذرا اور ٹھہرو۔ دیکھو ....."۔ میں شکستہ دل ہو کر گھر لوٹ آیا۔ اس وقت کا وہ صدمہ آج تک میرے دل میں موجود ہے، مجھے یقین ہے، گاندھی جی کے دل پر بھی اس کا

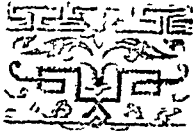
آخر مرتے دم تک رہا ہوگا، جو معاہدہ اس وقت لاہور میں قلمبند کیا گیا تھا اور جسے پاکستان کے لیڈروں اور مسٹر جناح تک نے منظور کر لیا تھا اس کی نقل ابھی تک میرے پاس محفوظ ہے۔ غالباً اس کی کوئی نقل پاکستان میں بھی ضرور ہوگی۔

گاندھی جی اور ان کے ہم خیال لوگوں کے لئے اب صرف یہ باقی رہ گیا تھا کہ جہاں تک ہو سکے بھارت کو مسلمانوں سے خالی نہ ہونے دیا جائے۔ اس معاملہ میں دلی بھارت کی گردن تھی۔ میوات کا علاقہ دلی سے ملا ہوا تھا اور بہ کثرت مسلمانوں سے آباد تھا۔ زبردست اور منظم کوششیں کی گئیں کہ دلی اور میوات کو مسلمانوں سے خالی کر دیا جائے۔ حکومت کی زیادہ تر طاقتیں بھی اسی طرف لگی ہوئی تھیں۔ ظاہر ہے کہ اگر دلی اور میوات مسلمانوں سے خالی ہو جاتے تو باقی بھارت بھر میں شاید ہی کہیں کوئی مسلمان باقی رہ جاتا۔ گاندھی جی نے اپنی پوری طاقت اس کوشش میں لگا دی کہ دہلی اور میوات مسلمانوں سے خالی نہ ہونے پائیں۔ اس زبردست آزمائش کے دنوں میں میں برابر گاندھی جی کے ساتھ تھا۔ ان کے حکم سے میں نے کئی بار میوات کا بھی دورہ کیا۔ دلی کی بھی گلیوں کے چکر لگائے ظاہر ہے کہ اگر کوئی سربرآوردہ مسلمان لیڈر ان حالات میں گاندھی جی کی پوری پوری مدد کے لئے کھڑا نہ ہو جاتا تو گاندھی جی کی نیک کوششیں ہرگز کامیاب نہ ہو سکتیں۔ ان نازک حالات میں محض ہندوؤں کی مخالفت ہی نہیں خود مسلمانوں کی لعن طعن برداشت کر کے اور گالیاں سن کر جس مرد میدان نے گاندھی جی کا ساتھ دیا وہ حفظ الرحمٰن تھا۔ ان دنوں مولانا حفظ الرحمٰن اپنے دو تین نیک طینت اور باہمت ساتھیوں کے ہمراہ روز مہاتما گاندھی سے ملا کرتے تھے۔ ان گفتگوؤں میں میں برابر شریک رہتا تھا۔ ایک دن کی گفتگو میں مولانا ابو الکلام آزاد و ولبھ بھائی اور جواہر لال بھی شامل تھے۔ میں یہ بات پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ان نازک حالات میں اگر دہلی اور میوات کو مسلمانوں سے خالی نہ ہونے دیا گیا اور اس طرح سارے ہندوستان کو مسلمانوں سے خالی ہونے سے بچایا جا سکا و نیز ہمارے ملک کے سیکولرزم کے دعویٰ میں کچھ بھی اصلیت باقی رہ سکی تو اس زبردست کام کا سہرا مہاتما گاندھی کے بعد اگر کسی انسان کے سر پہ باندھا جا سکتا ہے تو وہ مرحوم بھائی مولانا حفظ الرحمٰن کے سر پہ ہی باندھا جا سکتا ہے۔

جلال الدین رومی کا جو شعر میں نے اوپر نقل کیا ہے اسی کے سلسلے میں مولانا روم نے یہ اشعار بھی کہے ہیں:-

مذہب عشق از ہمہ ملت جدا است	عاشقاں را مذہب و ملت خدا است
موسیا آداب داناں دیگر اند	عاشقاں سوز دروناں دیگر اند
تو برائے وصل کردن آمدی	نے برائے فصل کردن آمدی

معلوم ہوتا ہے کہ دانستہ یا نادانستہ انسانی قوم کے قدم اسی مذہب عشق کی طرف بڑھ رہے ہیں جس کی طرف جلال الدین رومی نے اوپر کے اشعار میں اشارہ کیا ہے اور جو اس نفیر کی رائے میں حقیقی اسلام یا مذہب اسلام کا جوہر ہے۔ گزشتہ تقریباً چالیس سال سے میں مولانا حفظ الرحمٰن سے کافی نزدیک سے واقف تھا۔ اپنی واقفیت کی بنا پر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ مولانا مرحوم اس مذہب عشق سے بے گانہ نہیں تھے۔ میری نظروں میں مولانا حفظ الرحمٰن ایک سچے ہندوستانی، سچے مسلمان اور اونچے درجہ کے انسان تھے، محبت، ایکجہتی اور رواداری کے جس راستے پر چل کر انھوں نے اپنی جان دی وہی ایک راستہ اس ملک کے موجودہ حالات میں سب کی سلامتی اور بہبودی کا راستہ ہے۔ میری رائے میں وہی عین اسلام ہے۔ اس کے دائیں اور بائیں کے دو راستے ایک لامذہبی کا اور دوسرا غلط قسم کی مذہبی عصبیت کا۔ یہ دونوں راستے غلط، خطرناک اور اسلام کی روح کے منافی ہیں۔ اللہ ہم سب کو توفیق دے کہ ہم مولانا حفظ الرحمٰن مرحوم کے نقش قدم پر چل کر اپنے پیارے وطن اور بنی نوع دونوں کی سچی خدمت کر سکیں۔



ایک اُولوالعزم شخصیت

سید اوصاف علی صاحب
سابق ایڈیٹر "میسیج" ویکلی

جن ممتاز قوم پرور مسلم رہنماؤں نے اولوالعزمی کے ساتھ جنگِ آزادیٔ وطن میں بھی حصہ لیا اور آخر دم تک تقسیم ہند کے داعی مسٹر جناح کے دو قومی نظریہ کی برملا مخالفت بھی کی، مولانا حفظ الرحمٰن کی شخصیت اُن اولوالعزم رہنماؤں کی صف میں آخری شخصیت تھی۔

پاکستان کی تخلیق اور ملک کی تقسیم اگرچہ ان رہنماؤں کے نقطۂ نظر اور فکر و یقین کے لئے ایک بڑا حادثہ تھا۔ پھر بھی مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے دل برداشتہ ہوکر قومی خدمت سے منہ نہ موڑا۔ بلکہ اسی جوش اور جذبۂ عمل کے ساتھ وہ مسلمانانِ ہند کی خدمت گذاری میں لگ گئے اور اس راہ میں عزم و ثبات کے وہ حیرت انگیز نمونے دنیا کے سامنے پیش کئے کہ بجا طور پر انہیں مسلمانِ ہند کا مخلص ترین اور واحد رہنما تسلیم کیا گیا اور آج جب کہ وہ دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں مسلمانانِ ہند میں یہ عام احساس ہے کہ ان کا پشت پناہ جاتا رہا۔

مولانا مرحوم کی پیدائش بجنور کے ایک قصبہ میں بیسویں صدی کے پہلے سال میں ہوئی جب کہ تحریک آزادی کی پو پھوٹ رہی تھی اور حریت پسندی کی فضاؤں میں یہ نغمہ گونج رہا تھا۔

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے

مولانا موصوف نے اس فضا میں ہوش سنبھالا تو بہت ہی جلد وہ ان نغمات کی کشش سے مانوس اور آشنا ہو گئے اور اس قوت اور محویت کے ساتھ کہ سچ مچ ایک سرفروش مجاہد کی تصویر بن گئے۔ اور زبانِ خلق نے اُن کو "مجاہد ملت" ہی کے لقب سے پکارا۔

مولانا موصوف ایک صاحب فکر سیاس ہونے کے ساتھ ساتھ علم و فضل، اعلیٰ خطابت اور تدبیر و فراست غرض مختلف اوصاف کا مجموعۂ کمال بھی تھے۔

جو شخص ایک بار بھی ان سے ملا، ان کی عظیم شخصیت کو عمر بھر فراموش نہ کر سکا۔ ان کے جاری کئے ہوئے میسیج ویکلی کا ایڈیٹر ہونے ہوئے مجھے بہت قریب سے ان کو دیکھنے اور سمجھنے ہی کا موقعہ نہیں ملا بلکہ بارہا سیاسیات سے فلسفیات تک مختلف موضوعوں پر بات چیت کرنے کے مواقع بھی میسر آئے۔ خالص فلسفیانہ عنوانوں پر بھی جب کبھی ان سے گفتگو ہوئی اُن کی فاضلانہ تنقیدات کو سنکر میں حیران رہ جاتا تھا اور ایسا محسوس کرتا تھا کہ فلسفۂ قدیم و جدید کا کوئی عنوان ایسا نہیں ہے جس پر انہیں عبور نہ ہو۔ ایک بار انھوں نے خود بتایا کہ ایک بار جیل میں انہیں مولانا آزاد کے ساتھ کبھی مغربی فلسفہ پر طویل بحث و گفتگو کا موقعہ ملا تھا مسلسل سیاسی اور ہنگامی مشاغل نے لکھنے پڑھنے کی مہلت اور سکون سے اُن کو محروم کر دیا تھا۔ رات دن سیاسی کارکنوں، ضرورت مندوں اور مصیبت زدوں کا ہجوم اپنے اپنے مسائل و معاملات کی خاطر انہیں اس طرح مصروف رکھتا تھا کہ اپنی دلی خواہش کے باوجود وہ اس زندگی میں قلم و کاغذ کے شغل سے آشنا نہ ہو سکے۔ "اسلام کا اقتصادی نظام" اور "قصص القرآن" جیسی بلند پایہ اور ضخیم کتابیں بھی بڑی حد تک انہوں نے یا اپنے سفروں میں مکمل کیں یا کچھ جیلوں میں۔

مسلمانانِ ہند کے متعلق مولانا مرحوم کا تأثر بھی حقیقت سے بہت قریب معلوم ہوتا ہے۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ ہندوستان کے مسلمان اپنے شعور و مزاج میں استقلال سے شاید بہت دور جا چکے ہیں۔ بعض دفعہ تو اس تیزی سے وہ بدل جاتے ہیں کہ حیرانی ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر مولانا محمد علی مرحوم کا واقعہ سناتے ہوئے مولانا نے بتایا کہ میں نے وہ دن بھی دیکھے ہیں جب یہی مسلمان مولانا محمد علی مرحوم کو سونے چاندی میں تولنے کے لئے جان چھڑکتے تھے اور پھر وہ دن بھی دیکھا کہ وہی مولانا محمد علی اپنے گھر کی دو دو چار چار آنے کی ضروریات بھی اُدھار لینے کے لئے دکان دکان خود چکر لگاتے تھے۔

اس تجزیہ کی روشنی میں اگر غور کیا جائے کہ مولانا حفظ الرحمٰن کی وفات کے بعد مسلمانانِ ہند کا سیاسی شعور و رجحان اپنا کونسا رُخ بنائے گا کوئی پیشگوئی بہت دشوار معلوم ہوتی ہے۔ ابتک تو مولانا مرحوم ہی کی ذات تھی جس کے کمال فکر و تدبیر نے مسلمانانِ ہند .... کو جماعتی طور پر کانگرس سے وابستہ کر رکھا تھا اور اتنا قریب کر دیا تھا کہ پچھلے تین جنرل الیکشنوں میں مسلمانوں کی بھاری اکثریت نے جہاں جہاں کانگرس کا ساتھ دیا لیکن مستقبل کیلئے اب پھر یہ سوال کھڑا ہو سکتا ہے۔ مولانا مرحوم کی عظیم شخصیت کو بنانے میں میرے خیال کے مطابق دو عنصر بہت دخیل ہوئے ہیں صافِ دماغی اور صدق دلی۔ ہر معاملہ کے نشیب و فراز پر غور کر کے وہ اپنی ایک رائے خود قائم کرنے اور مضبوطی سے اس پر جم جانے کے عادی تھے اور پھر کوئی بھی قوت انکے موقف کو بدل نہیں سکتی تھی۔ حال ہی میں مسلم کنونشن کا سوال سامنے آیا اور اس پر مخالف و موافق تنقیدیں ہوئیں مولانا نے بھی معاملہ پر اپنے نہج پر غور کیا اور جب اُن کی یہ رائے مستحکم ہو گئی کہ کنونشن کا انعقاد نہ صرف مسلمانوں بلکہ پوری ہندوستانی قوم کے لئے مفید ہی ہو گا۔ تو پھر وزیر اعظم ہند بھی انکی رائے کو بدلنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ غرض مولانا حفظ الرحمٰن اپنے عزم و ارادہ میں ناقابلِ تسخیر لیکن اپنے جذبات کے لحاظ سے بہت متحمل اور متواضع واقع ہوئے تھے۔ ایسی عظیم صفات کی حامل شخصیتیں اس دنیا میں رونما ہوتی ہیں مگر بہت ہی کم۔

کہتے ہیں آج ذوق جہاں سے گزر گیا

ذیل کا مضمون "قومی آواز" کے ایک ایڈیٹوریل کا اقتباس ہے، جو مولانا مرحوم کے آخری الیکشن کے زمانہ میں گزشتہ سال لکھا گیا تھا جب کہ مولانا مرحوم حلقہ امروہہ سے پارلیمنٹ کے امیدوار تھے ـــــــــــــ ادارہ

یوں تو مولانا حفظ الرحمٰن جمعیۃ علمائے ہند کے سب سے بڑے لیڈر ہیں۔ اسی جماعت کی وجہ سے مولانا کو ہندوستان نے پہچانا ہے، اور اب اس جماعت کی سرگرمی کا بڑا حصہ مولانا ہی کی شخصیت کا مرہون منت ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مولانا حفظ الرحمٰن کی شخصیت کا حدود دار بعہ اب اتنا وسیع ہو چکا ہے کہ وہ جمعیۃ کے نہیں قوم کے مسلمہ لیڈر بن چکے ہیں۔ صوبوں کی تقسیم، آسام کا فساد زبانوں کے اختلافات، پست اقوام کے مسائل، کانگرس کی صفوں میں نشستوں کی تقسیم ان سب معاملات میں مولانا کی رائے کا وزن پڑتا ہے اور حکومت اور سیاست کے با اثر حضرات اس اثر کو محسوس کرتے ہیں۔ ہندوستان کے مستقبل کا ڈھانچہ جو حال کے سانچے میں ڈھل رہا ہے، کی آہن گری میں جو دس بارہ فولادی ہاتھ کام کر رہے ہیں۔ ان میں ایک ہاتھ مولانا حفظ الرحمٰن کا بھی ہے اور یہ ہاتھ اس بننے والے ڈھانچے میں اقلیتوں، کمزوروں اور بے سہارا لوگوں کے لئے جگہ پیدا کر رہا ہے۔

یہ واضح رہے کہ جمہوریت کی بناوٹ کچھ ایسی ہوتی ہے کہ اگر مستقبل کے ڈھانچے میں صرف ایک ہی اقلیت کے لئے جگہ پیدا کی جائے تو بھی اس کی شکل کچھ ایسی بن جائے گی کہ تمام اقلیتوں اور بے آواز لوگوں کے لئے اس میں جگہ نکل آئے گی۔ مولانا حفظ الرحمٰن اس ڈھانچے کی بناوٹ میں اسی طرح کا لوچ پیدا کر رہے ہیں۔

آج ہندوستان میں بہت سی مذہبی اقلیتیں ہیں لیکن ان میں سے کسی کے پاس بھی ایسی وزنی شخصیت نہیں ہے جو ہندوستان کے مستقبل پر اثر انداز ہو سکے۔ کسی اقلیت کے پاس اگر مفکر ہے تو وہ عوامی نہیں ہے اگر عوامی ہے تو اس کا ماضی اس طرح کا ہے کہ وہ کبھی اس پارٹی میں رہا، تو کبھی اس میں ...... اگر وہ مفکر بھی ہے اور اس کا ماضی استقلال سے بھرپور ہے تو پھر آزادی کے بعد کی تبدیلیوں میں وہ اپنی اہمیت کھو چکا ہے۔ ان حالات میں مسلمانوں کی یہ بڑی خوش نصیبی ہے کہ ان کے پاس مولانا حفظ الرحمٰن کی ایسی ذات موجود ہے جس کے پس منظر میں عظیم ملکی خدمتیں بھی ہیں استقلال رائے بھی ہے۔ یہ ذات خود غرضیوں اور کھوکھلی باتوں سے پاک بھی ہے۔ اور اس میں حق کی بے باکانہ جسارت بھی ہے۔ ساتھ ساتھ وہ ۳۰۔۳۵ سال سے عوامی لیڈر رہے۔ اور آج اس کی اہمیت کم نہیں ہوئی بلکہ پہلے سے دوگنی تگنی ہو چکی ہے۔

مولانا حفظ الرحمٰن اپنی ان خصوصیتوں کی وجہ سے قوم و ملک کی تعمیر میں بہت عظیم حصہ لے رہے ہیں اور اس کی ساخت میں ایسا لوچ پیدا کر رہے ہیں جس کا فائدہ تمام اقلیتوں اور کمزور جماعتوں کو پہونچ رہا ہے اور پہونچتا رہے گا۔ اور مولانا جو قدم بھی اٹھاتے ہیں۔ وہ اس احساس کے ساتھ اٹھاتے ہیں کہ دوسری اقلیتوں کا بھی بھلا ہو۔ یعنی حکومت کی نظروں میں تمام مذاہب اور اقلیتیں برابری کا درجہ رکھنے لگیں۔

۲۰۔۲۵ سال سے مولانا حفظ الرحمٰن کی زندگی اتنی عوامی رہی ہے جتنی ہندوستان کے بہت کم لیڈروں کی ہوگی۔ دہلی کی گلی قاسم جان میں ایک اوسط درجہ کا مکان ہے، جو حفظان صحت کے نقطۂ نظر سے نہ کافی ہوا دار ہے۔ اور نہ کافی روشن اور صاف، اس مکان کے ایک وسیع کمرے میں مولانا فجر کی نماز کے بعد بیٹھ جاتے ہیں اور لوگ آرہے ہیں، جا رہے ہیں۔ مولانا ان کی باتیں سن رہے ہیں۔ خط پڑھ رہے ہیں۔ ان کے جواب لکھ رہے ہیں۔ اخبار پڑھ رہے ہیں۔ ایک جلسے کے بعد دوسرے میں اور دوسرے کے بعد تیسرے میں حصہ لے رہے ہیں۔ یہیں سے اٹھ کر پارلیمنٹ میں یا جلسوں میں جاتے ہیں اور پھر واپس آکر یہیں بیٹھ جاتے ہیں۔ اسی کمرے میں ناشتہ ہے اور یہیں کھانا ہے اور یہیں نماز ہے۔ اس طرح رات کے گیارہ بج جاتے ہیں۔ پھر وہ سوتے چلے جاتے ہیں۔ بس اس نیند ہی کو ان کا آرام سمجھ

لیجیے، چاہے عیش۔

مولانا کا کھانا اور ناشتہ وہ ہوتا ہے جو معمولی اوسط درجے کے گھروں میں ہوتا ہے۔ کوئی چیز بھی قیمتی نہیں ہوتی ہے، اس میں اکثر مہمانوں کا بھی حصہ ہوتا ہے۔

مولانا دوروں پر اور سفر پر جاتے ہیں تو وہاں بھی ان کا یہی پروگرام رہتا ہے کہ مقامی جمعیۃ کے دفتر میں سی جگہ بیٹھ گئے اور گفتگو اور مشورے اور بحثیں اور جلسے وغیرہ شروع ہو گئے۔

عجیب اسلامی مساوات اور جمہوریت کی فضا رہتی ہے مولانا حفظ الرحمٰن کے گرد نماز کی ایک ہی صف میں محمود و ایاز کھڑے تو ہوا کرتے ہیں۔ لیکن یہاں بیٹھتے بھی ہیں، سوتے بھی ہیں اور رہتے سہتے بھی ہیں اور کام بھی اسی اسپرٹ سے کرتے ہیں، اسی چٹائی پر وزیر بھی آکر بیٹھتے ہیں اور کلرک اور والنیٹر بھی بیٹھتے ہیں اور سب کی بات پوری طرح سنی جاتی ہے۔

مولانا حفظ الرحمٰن اپنے ماتحتوں کو اُن کی غلطیوں پر ٹوکتے ہیں۔ لیکن اگر ان کے ماتحت کہیں پر مولانا کی غلطی کو محسوس کرتے ہیں تو وہ بھی اس بات کے اظہار میں کسی طرح کی بے ادبی محسوس نہیں کرتے ہیں مولانا حفظ الرحمٰن جب بھی اپنی غلطی محسوس کرتے ہیں۔ تو فوراً مسکرا کر تسلیم کر لیتے ہیں۔

قبرستان کی خبریں، اسکولوں کی زمین، پارلیمنٹ کے ٹکٹ، ریاستوں کی سیاست مصر و روس کی خارجہ سیاست اور کشمیر پر متحدہ اقوام کی قرار دادوں سے لے کر حکومت کے معمولی افراد کے کے ساتھ بے انصافیاں یہ سب مولانا کے سامنے آتی ہیں، یہاں سوشلسٹ، پرجا سوشلسٹ کمیونسٹ، غیر سیاسی سب ہی طرح کے لوگ آتے ہیں اور سب اپنی اپنی باتیں کہتے ہیں۔ مولانا کو متعلقہ کاغذات کا بھی مطالعہ کرنا پڑتا ہے اور ہر طرح کی باتیں بھی سُنتے ہیں۔

اور مولانا یہ سب کام ان تھک مشین کی طرح بلا اپنے سن و سال اور صحت کے ساتھ مروت کئے کرتے چلے جاتے ہیں۔ اسی زندگی میں طول طویل سفر بھی شامل ہے۔ جو جاڑے برسات گرمی، ہر موسم میں آسام سے گجرات تک اور دہلی سے جنوبی ہند تک ہوتے رہتے ہیں۔

مولانا کے اہل و عیال جس مکان میں جو گلی در گلی میں ایک تنگ جگہ واقع ہے۔ بیس سال پہلے رہتے تھے اسی میں اب بھی رہتے ہیں۔ اور اُن کا کھانا پینا اور رہن سہن بھی جیسا پہلے تھا ویسا ہی اب بھی ہے۔ آزادی کے بعد ان چیزوں میں اگر اضافہ ہوا ہے، تو ناخواندہ مہمانوں کا یا غیروں کی فکروں اور ذمہ داریوں کو اوڑھنے کا ؂

ہمیں تو موت ہی آئی شباب کے بدلے

آج ہندوستان کے کسی گوشہ میں بھی ایسی سیاسی خانقاہ نہیں ہے۔ جیسی مولانا کے گرد لسی رہتی ہے۔

جو لوگ عوامی زندگی کا تجربہ رکھتے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ کسی بالکل احتجاجی سیاسی جماعت کو تعمیری غیر سیاسی بنانا کتنا مشکل کام ہے۔ تحریک آزادی کے زمانہ میں احتجاجی سیاسی جماعتوں میں وہی لوگ ہوتے تھے جو پلیٹ فارم سے بےجگری سے پُرجوش تقریریں کر سکتے یا بہادری سے قانون شکنی کر کے جیل جا سکتے تھے۔ لیکن تعمیری اور غیر سیاسی کام کے لئے نہ پرجوش تقریروں کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ جیل جانے والی قربانیوں کی بلکہ ان کاموں کے لئے بالکل ہی دوسرے قسم کے مزاجوں اور عمل کی ضرورت ہوتی ہے۔ آزادی کی جدوجہد کے زمانے میں بہت سی احتجاجی سیاسی جماعتیں تھیں۔ جب آزادی مل گئی تو ان میں سے بہتوں کے لئے صرف یہ راہ رہ گئی کہ وہ اپنے کو تعمیری، اصلاحی اور غیر سیاسی بنا دیں اس قسم کی جماعتوں میں سے سوائے جمعیۃ کے کوئی بھی ایسی تبدیلی کے ساتھ اپنے کو زندہ نہ رکھ سکی۔ یہ مولانا حفظ الرحمٰن کا بہت بڑا کارنامہ ہے کہ انھوں نے جمعیۃ کو تعمیری جماعت بنا کر، ۱۹۴۷ء کے بعد بہت سے بڑے بڑے کارنامے انجام دیئے۔ مسلمانوں کے مسائل کو تو صرف اسی نے اُٹھایا اور حل کیا۔ اور آج بھی وہ ایسے کاموں میں لگی ہوئی ہے۔



مجاہد ملت کا تصنیفی درجہ

(از مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی ایڈیٹر معارف)

مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب مرحوم کی شخصیت بڑی جامع تھی، ان کے کارنامے بڑے گوناگوں ہیں۔ وہ نامور سیاسی لیڈر بھی تھے اور ممتاز عالم دین بھی پرجوش خطیب بھی تھے اور خوش بیان واعظ بھی۔ ماہر و تجربہ کار متکلم و مدرس بھی تھے اور مشاق مصنف و صاحب قلم بھی، انھوں نے مختلف اوقات میں دارالعلوم دیوبند، مدرسہ اسلامیہ ڈابھیل اور مدرسہ اسلامیہ کلکتہ میں تعلیم و تدریس کی خدمت انجام دی متعدد علمی کتابوں کے مصنف تھے۔ مگر ان کی طوفانی سیاسی زندگی نے ان کے ان کمالات کو اتنا چھپا دیا تھا کہ مخصوص طبقہ کے علاوہ شاید عام لوگوں کو اس کا علم بھی نہ ہوگا۔ اس مضمون کا مقصد ان کی علمی و تصنیفی حیثیت کا مختصر تعارف اور اس پر تبصرہ ہے۔ ان کا اور ان کے رفیق کار اور میرے محترم دوست مفتی عتیق الرحمٰن صاحب کا سب سے بڑا علمی کارنامہ ندوۃ المصنفین دہلی کا قیام ہے۔ دارالمصنفین کے بعد یہ دوسرا ادارہ ہے جس نے مختلف علوم و فنون اسلامیات پر بڑا مفید اور وقیع ذخیرہ فراہم کر دیا ہے جس کے ذریعہ مولانا حفظ الرحمٰن مرحوم کا علمی فیض ہمیشہ جاری رہے گا۔ وہ خود بھی ایک اچھے اور ممتاز مصنف اور اہل قلم تھے۔ اگر وہ علمی زندگی اختیار کرتے تو ہندوستان کے مشہور مصنفین میں ان کا شمار ہوتا اور یہ بھی ان کا کمال ہے کہ اپنی طوفانی سیاسی زندگی کے باوجود انھوں نے متعدد اہم تصانیف بھی یادگار چھوڑی ہیں۔ ان میں سب سے اہم قصص القرآن ہے۔

کلام اللہ میں عبرت و بصیرت کیلئے بہت سے انبیاء و رسل علیہم السلام اور ان کی امتوں کے حالات بیان کئے گئے ہیں، مگر ان کا مقصد تاریخ اور سوانح نگاری نہیں، بلکہ سبق آموزی اور عبرت پذیری ہے۔ اس لئے ان میں تاریخی اور سوانحی ترتیب و تسلسل نہیں ہے اور نہ ان کی تفصیلات میں پڑا گیا ہے بلکہ صرف عبرت و بصیرت کے پہلوؤں کو نمایاں کیا گیا ہے۔ اور موقع و محل کے لحاظ سے جہاں جن پیغمبروں اور ان کی امتوں کے جس قدر حالات کی ضرورت تھی ان کو بیان کر دیا گیا ہے اس لئے کلام مجید میں تاریخ و سوانح کی طرح ان کے مرتب اور مفصل حالات نہیں ملتے اور جس قدر ہیں وہ بھی یکجا نہیں ہیں۔ بلکہ مختلف سورتوں اور مختلف آیات میں بکھرے ہوئے ہیں۔ ان کے حالات کا دوسرا ماخذ احادیث نبوی، تفسیری روایات عہد عتیق کے صحیفے، قدیم تاریخی کتابیں، تاریخی آثار اور اسرائیلی روایات ہیں۔ جن کی مدد سے ان انبیاء علیہم السلام اور ان کی امتوں کے حالات مرتب کئے جاسکتے ہیں، مگر عہد عتیق کے صحیفے محرف ہیں۔ ان میں اور کلام مجید کے بیانات میں بعض اختلافات ہیں۔ اسرائیلیات میں خرافات کا حصہ بھی شامل ہے۔ اس لئے ان سے اخذ و استفادہ میں بڑی احتیاط اور تحقیق و تنقید کی ضرورت ہے۔ عربی میں تو اس نقطۂ نظر سے قصص القرآن پر متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں مگر اردو میں قصص الانبیاء وغیرہ جیسی غیر معتبر اور افسانوی کتابوں کے علاوہ کوئی مستند کتاب نہیں تھی۔ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے اس کمی کو پورا کرنے کے لئے قصص القرآن لکھی، اس میں کلام مجید اور احادیث نبوی کی روشنی میں کلام مجید میں مذکور انبیاء علیہم السلام کے حالات لکھے ہیں اور جابجا دوسرے ماخذوں سے بھی مدد لی ہے اور جہاں ان کے اور کلام مجید کے بیان میں اختلاف ہے وہاں دلائل سے کلام مجید کے بیانات کی صحت و صداقت ثابت کی ہے اور مستشرقین کے اعتراضات کے تحقیقی جوابات بھی دیئے ہیں۔ اور کلام مجید کے اصل مقصد عبرت و بصیرت کے پہلوؤں کو خاص طور سے نمایاں کیا گیا ہے۔ اس طرح یہ کتاب انبیاء علیہم السلام اور ان کی امتوں کی تاریخ بھی ہے اور عبرت و بصیرت کا صحیفہ بھی۔

دوسری اہم تصنیف بلاغ مبین ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پورے عالم انسانیت کے لئے سراج منیر اور رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجے گئے تھے اور آپ کی بعثت کا مقصد ساری دنیا کو اسلام کے نور سے منور کرنا تھا۔ اسی لئے جزیرۃ العرب میں اسلام کے فروغ کے ساتھ ہی آپ نے عرب کے قرب و جوار کے حکمرانوں اور امراء و حکام کو اسلام کی دعوت دی اور ان کے نام تبلیغی خطوط ارسال فرمائے۔ اس دعوت پر بعضوں نے اسلام قبول کر لیا، بعض نے انکار کیا اور بعض عناد اور مخالفت پر آمادہ ہوگئے۔ یہ تبلیغی مکاتیب اور ان کے نتائج احادیث و سیر اور تاریخ کی کتابوں میں محفوظ ہیں اور عہد رسالت میں دعوت اسلام کی اہم کڑی ہیں۔ اس لئے سیرت کی تمام کتابوں میں ان کا ذکر ہے۔ مگر کسی ایک کتاب میں ایک جگہ جمع نہیں ہیں بلکہ مختلف کتابوں اور مختلف جگہوں پر بکھرے

ہوئے ہیں۔ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے ان کو جمع کر کے بلاغ مبین کے نام سے اس کا مجموعہ مرتب کر دیا ہے۔ مگر یہ محض مکاتیب کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ اس میں اور بہت سی ضروری بحثیں بھی آگئی ہیں۔ چنانچہ یہ مجموعہ تین حصوں میں تقسیم ہے پہلے حصہ میں کلام مجید اور احادیث نبوی کی روشنی میں بڑی تفصیل سے تبلیغ اسلام کے اصول تحریر کئے گئے ہیں جن کی حیثیت دعوت و تبلیغ کے نصاب کی ہے، دوسرے حصہ میں مکاتیب مبارکہ ہیں۔ ہر مکتوب کے ضمن میں مکتوب الیہ کے ضروری حالات اور اس کی دعوت کے سلسلہ میں جو واقعات پیش آئے ان کی تفصیل ہے۔ تیسرے حصہ میں نتائج کے عنوان سے اس تبلیغ کے اثرات و نتائج کی تفصیل اور تبلیغ اسلام کے متعلق بعض اصولی باتیں تحریر کی گئی ہیں اور اس سلسلہ میں جو شکوک و سوالات پیدا ہوتے ہیں ان کا جواب دیا گیا ہے دوسرے اور تیسرے حصہ میں تبلیغ اسلام کے سلسلہ میں مخالفین اسلام کے اعتراضات اور ان کے جوابات کا خاص طور سے لحاظ کیا گیا ہے اور ان کی مدلل تردید کی گئی ہے۔ اس لئے یہ کتاب تنہا مکاتیب کا مجموعہ نہیں ہے، بلکہ دعوت و تبلیغ کا نصاب بھی ہے، عہد رسالت میں دوسری اقوام و مذاہب میں اس کی تاریخ بھی ہے اور تبلیغ اسلام پر مخالفین اسلام کے اعتراضات کا محققانہ جواب بھی ان مسائل سے متعلق بعض اور ضروری مباحث بھی آگئے ہیں جن کا اندازہ کتاب کے مطالعہ ہی سے ہو سکتا ہے۔

تیسری کتاب اسلام کا اقتصادی نظام ہے۔ اس دور کا سب سے بڑا مسئلہ اقتصادیات اور مختلف طبقوں میں دولت کی تقسیم کا ہے، جس نے دنیا کو مختلف گروہوں اور مختلف نظاموں میں تقسیم کر دیا ہے اور سرمایہ و محنت میں ایک مستقل کش مکش برپا ہے۔ اسلام نے صدیوں پہلے اس مسئلہ کو حل کر دیا تھا اس کا اقتصادی نظام اس قدر متوازن ہے کہ اگر اس پر عمل کیا جائے تو سرمایہ داری اور غربت کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ نہ کوئی اتنا بڑا سرمایہ دار بن سکتا ہے کہ قارون بن جائے اور نہ کوئی مفلس و محتاج باقی رہ سکتا ہے۔ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے اسلام کے اقتصادی نظام پر ایک مستقل کتاب لکھی اس میں بڑی تفصیل کے ساتھ اسلام کے اقتصادی نظام کو پیش کیا ہے اور یہ دکھایا ہے کہ یہ نظام اتنا متوازن ہے اور اس میں تقسیم دولت کے اصول اتنے عادلانہ ہیں کہ اس سے سرمایہ داری اور غربت و افلاس کے سارے مسائل حل ہو جاتے ہیں۔ نہ اس کے لئے کسی سوشلزم کی ضرورت رہتی ہے اور نہ کمیونزم کی۔

رسول کریم = یہ کتاب جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے سیرت نبوی پر اوسط استعداد کے طلبہ کے لئے لکھی گئی ہے۔ اس میں سوانح نبوی کے ساتھ آپ کے خصائص و شمائل، اخلاق اور اسلام کی اخلاقی تعلیمات کا مختصر مگر مؤثر انداز میں ذکر ہے۔ ہر بحث کے خاتمہ پر اس کا خلاصہ اور اس کے متعلق سوالات دیدیئے ہیں طلبا کے لئے سیرت پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ان میں سے یہ کتاب ایک امتیازی حیثیت رکھتی ہے۔

آہ مجاہد ملت

عثمان احمد قاسمی جون پوری

صفِ ماتم بچھی ہے کیوں زمینوں آسمانوں میں
یہ کس نے آہ منہ موڑا وطن کے مہربانوں میں

خدا کا کون بندہ آگیا جنت کے باغوں میں
فرشتے حور و غلماں سب ہیں جس کے میزبانوں میں

مکانِ خلدِ بریں کے اس قدر آراستہ کیوں ہیں
مجاہد دین حق کا ہے خدا کے میہمانوں میں

ترے سینے کے اندر خالدؓ جرّار کا دل تھا
تری جرأت کا ڈنکا بج رہا ہے آسمانوں میں

ابھی تک کانپتی ہے تجھ سے استبداد کی دنیا
ابھی تک زلزلہ برپا ہے باطل کے مکانوں میں

ہمیشہ سر بکف ہو کر کے کی ہے قوم کی خدمت
ترا پہلا قدم ہوتا تھا مشکل امتحانوں میں

گلستاں میں لگی ہے آگ ویرانی کا عالم ہے
کوئی بلبل نظر آتا نہیں اب آشیانوں میں

قیامت تک سبق لیتے رہیں گے تیری باتوں سے
حیاتِ جاوداں کا درس ہے تیرے فسانوں میں

ترا فرمان دنیا کے لئے مہرِ ہدایت ہے
تری باتیں لکھی جائیں گی سچی داستانوں میں

تری حقانیت اے کاش سیکھیں قوم کے خادم
ترا سوزِ دروں آئے مؤذن کی اذانوں میں

وہی عثمان جو نغمہ سرا تھا تیری مدحت میں
وہ دن آیا کہ تیرے غم میں ہے وہ نوحہ خوانوں میں

مجاہد ملت کی پارلیمانی زندگی

محمد سلیمان صابر۔ مدیر معاون روزنامہ "الجمعیۃ" دہلی

مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمان کی پارلیمانی زندگی کا آغاز حصول آزادی کے بعد اس وقت سے ہوتا ہے جب وہ دستور ساز اسمبلی کے ممبر چنے گئے جس کی تشکیل ملک کے لئے برطانوی دور کے فرسودہ آئین کی جگہ ایک جمہوری آئین وضع کرنے کے لئے عمل میں آئی تھی۔

آئین ساز اسمبلی کی ممبری کو عام لوگ ایک بڑا اعزاز کہہ سکتے ہیں لیکن حضرت مولانا نے کسی اعزاز کی خاطر نہیں بلکہ اس لئے آئین یا قانون ساز اسمبلی کی ممبری قبول کی کہ وہ شروع ہی سے ایک قومی کارکن رہے تھے۔ برطانوی دور میں ملک کو آزاد کرانے کا ایک اہم مقصد سامنے تھا۔ اور حصولِ آزادی کے بعد سب سے اہم کام یہ تھا کہ ملک کو ایک ایسا جمہوری آئین دیا جائے کہ بلا تخصیص مذہب کسی باشندے کو کسی دوسرے پر فوقیت یا برتری حاصل نہ ہو، بلکہ قانون کی نظر میں وہ سب برابر ہوں۔ یہ حضرت مولانا جیسے وسیع النظر ممبروں ہی کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ ملک کو ایک سیکولر آئین دیا گیا۔ اگرچہ انھیں ہمیشہ اس بات کا قلق رہا تھا کہ ہندوستانی زبان کو جس کے فروغ کے لئے مہاتما گاندھی آخر وقت تک کوشش کرتے رہے اور جسے وہ قومی زبان سمجھتے تھے آئین میں کوئی درجہ نہ مل سکا۔ اس کی جگہ ہندی نے لے لی۔

حضرت مولاناؒ کی پارلیمانی سرگرمیاں صرف ایوان پارلیمنٹ میں حاضری تک ہی محدود نہ تھیں بلکہ اس کے باہر بھی وہ ہر وقت مصروف رہتے تھے۔ جمعیۃ علماء ہند کے دفتر کے اجتماعات، وزیر اعظم ہند، مولانا آزاد اور دوسرے قومی لیڈروں سے ملاقاتیں، یہ سب ان کی پارلیمانی سرگرمیوں کا حصہ تھیں۔ ملک کے طول و عرض میں سال کے زیادہ حصہ میں ان کے دوروں کو بھی ان ہی سرگرمیوں کا حصہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس لئے کہ ان ہی دوروں میں انھیں عوام اور خاص طور سے اقلیتی فرقہ کے مسائل کو جاننے اور سمجھنے اور پھر ان کی بنیاد پر آئین ساز اسمبلی یا پارلیمنٹ میں بولنے کا موقع ملتا تھا۔

حضرت مولانا ان بیک بنچروں میں نہ تھے جن کا مہر سکوت کبھی نہیں ٹوٹتا۔ جب کبھی موقع ملتا اور کوئی اہم مسئلہ سامنے آتا وہ لازماً وقت لیتے اور بولتے تھے۔ خاص طور پر وزارتِ تعلیم اور وزارتِ داخلہ کے معاملات پر ہمیشہ بولنے کے لئے بے چین رہتے۔ کیونکہ یہ دو محکمے ایسے ہیں جو عوام کی تعلیمی ثقافتی اور سماجی زندگی پر خاص طور سے اثر انداز ہوتے ہیں۔

پارلیمنٹ ہاؤس کی پریس گیلری سے میں نے بارہا حضرت مولانا کو بولتے سُنا، وہ ایک وجیہہ انسان تھے۔ طویل قامت اور چھریرہ بدن، خوبصورت داڑھی، گرمی سردی کی رعایت سے سفید کھدر یا گرم پٹو کی شیروانی، اور کھدر یا فر کی ٹوپی میں ملبوس۔ جب تقریر کرنے کھڑے ہوتے تو ایک پُر وقار شخصیت نظر آتے تھے۔ ان کے ہاتھ لانبے اور مضبوط تھے ـــ ایک قومی سپاہی کے ہاتھ ـــ جو تقریر کے دوران مسلسل حرکت کرتے رہتے تھے۔ ان کے ہاتھوں کی یہ جنبش ان کی بے قرار توانائی کا مظہر تھی، جسے باہر نکلنے کے لئے خواہ اس پر کتنا ہی کنٹرول کیوں نہ ہو، راستے کی ضرورت تھی ـــ ان کے چہرے کے اتار چڑھاؤ سے ان کے منہ سے نکلی ہر بات کی تائید ہوتی تھی اور ظاہر ہوتا تھا کہ ان کا ہر جملہ ایک حقیقت اور سچائی ہے۔ وہ انتہائی صاف گو اور بیباک تھے ٹکسالی اردو میں جچے تُلے الفاظ بولتے کہ معلوم ہوتا تھا، مُنہ سے پھول جھڑ رہے ہیں۔ وہ جس مسئلہ پر بولتے، خوب بولتے اور پورے ایوان کو مسحور کر دیتے۔ فنِ خطابت میں انھیں ید طولیٰ حاصل تھا۔

بعض اوقات تقریر میں الفاظ کی تکرار ہوتی تھی۔ مگر اس کا مقصد اپنی بات میں زور پیدا کرنا ہوتا تھا۔ اکثر انگریزی الفاظ کو بھی شامل کر دیتے۔ تاکہ جنوبی ہند کے ممبران بھی پوری طرح سمجھ جائیں کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ مدھیہ پردیش کی حکومت کو تنبیہہ کرتے ہوئے انھوں نے اپنی ایک تقریر میں فرمایا:۔

"آج مدھیہ پردیش کی سرکار فیلیور ہوئی ہے۔ بھوپال سے لے کر آج تک کے جو واقعات ہوئے ہیں، انھیں دیکھ کر کہنا چاہئے کہ اسے حکومت کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ اس طریقہ سے تباہ کر کے، کرش کر کے، برباد کر کے یہاں رکھا جائے گا تو یقینی طور پر اس کے نتائج اچھے نہیں نکلیں گے۔ اس طرح کے طریقوں کو بدلنا ہوگا اور صحیح معنی میں سیکولرزم کو لانا ہوگا۔"

ان کی تقریر موقع محل کے مطابق ہوا کرتی تھی۔ مذہبی اجتماع میں مذہبی، عوامی جلسوں میں عوامی اور پارلیمنٹ میں پارلیمانی۔ پارلیمانی تقریر میں کوئی نہ کہہ سکتا تھا کہ کسی جگہ بھی . . . .

. . . حضرت مرحوم نے پارلیمانی ضابطے کی خلاف ورزی کی۔ قانون داں نہ ہونے کے باوجود ایسی ایسی قانونی موشگافیاں فرماتے تھے کہ اچھے اچھے وکلاء حیران رہ جاتے تھے۔ آج کل ممبران اور خاص طور پر بعض مخالف ممبران موقع بےموقع اور بعض اوقات غیر پارلیمانی زبان میں بول کر شہرت حاصل کرنے کی کوشش کرنے میں مصروف رہتے ہیں۔ لیکن حضرت مولانا مرحوم کا طرز عمل بالکل جُدا تھا۔ وہ ایک بُردبار اور سنجیدہ ممبر پارلیمنٹ تھے۔ تمام سنجیدہ مسائل پر انتہائی سنجیدگی اور دلائل کے ساتھ بولتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ نظریاتی اختلاف رکھنے والوں تک کو ان کے طرزِ تخاطب کی تعریف کرتے سُنا گیا۔

حضرت مولانا ایک نڈر، جری اور بہادر انسان تھے، یہ برداشت نہ کرسکتے تھے کہ ملک کے اندر کسی کے ساتھ بے انصافی اور ظلم ہو، وہ نہایت صفائی اور بےخوفی سے سچی بات کہتے اور بعض اوقات نام نہاد "پارٹی ڈسپلن" تک کی پرواہ نہ کرتے تھے۔

وزارتِ داخلہ کے معاملات پر بولتے ہوئے، حضرت مولانا نے مدھیہ پردیش کی حکومت کو ایسے جرأتمندانہ انداز میں للکارا کہ اُس وقت کے وزیر اعظم ڈاکٹر کاٹجو بےچین ہو گئے تھے۔ فرمایا:۔

"جبل پور میں ساگر، دموہ اور کٹنی میں فسادات ہو جائیں، اور جو منسٹر ہیں وہ اسی طرح بیٹھے رہیں، کرسیوں پر قائم رہیں اور لوگوں کی جان و مال اور آبرو برباد ہوتے دیکھتے ہیں یہ اُن کے لئے کیسے جائز ہو سکتا ہے، چاہے اقلیتوں کا سوال ہو چاہے اکثریت کا۔ ہمیں سب ہی کی حفاظت کرنی ہے اور خاص طور پر اقلیتوں کی پوری قوت اور مضبوطی کے ساتھ کرنی ہے۔ میں ایمانداری کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ یہ پورے ملک کا سوال ہے، ملک کی آزادی کا سوال ہے، ملک کے وقار کا سوال ہے۔ ملک کی شانتی کا سوال ہے اور ملک کی سالمیت کا سوال ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس طرف خاص توجہ دی جائے۔"

یہ صحیح ہے کہ حضرت مولانا آئین ساز اسمبلی یا پارلیمنٹ میں صرف مسلمانوں کے نمائندہ بن کر نہیں گئے تھے، بلکہ وہ پوری قوم کے نمائندے تھے۔ اس لئے کہ قومی بنیاد ہی پر اُن کا انتخاب عمل میں آیا تھا لیکن جہاں کہیں اقلیت کے ساتھ بے انصافی دیکھی۔ انھوں نے اس کے خلاف آواز اٹھانا اپنا فرض سمجھا۔

فسادات مدھیہ پردیش کے زمانے میں پارلیمنٹ میں اکثریتی فرقہ سے تعلق رکھنے والے ممبروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:۔

"اگر سیٹھ گووند داس (جبلپور کے نمائندہ) نہیں بولیں گے تو حفظ الرحمان کو بولنا پڑے گا"

حضرت مولانا کو اکثر اقلیتی معاملات پر اسی بنا پر بولنے کے لئے مجبور ہونا پڑتا تھا کہ بہت کم دوسرے ممبروں کو اس بارے میں بولنے کی جرأت ہوتی تھی۔ حق و انصاف کے لئے لڑنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔ لیکن یہ بات بھی صحیح نہیں کہ وہ اقلیتی مسائل کے علاوہ کسی اور مسئلہ پر بولتے ہی نہ تھے۔

فروری ۱۹۶۱ء میں انھوں نے جو زوردار تقریر کی، اس میں انھوں نے نہ صرف مدھیہ پردیش کے واقعات پر ہی روشنی ڈالی، بلکہ ہند چین کے تعلقات اور کانگو جیسے ملک کے اہم مسائل سے بھی بحث کی۔ چین کے معاملے میں واضح الفاظ میں اعلان کیا کہ اُس نے:۔

"ہندستان کے وسیع علاقہ پر قبضہ کر کے ہندستان کے ساتھ بے وفائی کی ہے۔ اور شرافت سے گری ہوئی زندگی کا ثبوت دیا ہے"

حضرت مولانا قدرے تیز اور مسلسل بولتے تھے۔ کہیں درمیان میں اٹکنے کا نام نہ تھا، اس لئے بعض نامہ نگاروں کو خاص طور پر انھیں، جو اُردو زبان سے اچھی طرح واقف نہ تھے، کچھ دقت ہوتی تھی، لیکن انھیں حضرت مولانا کی تقریر سے خاص دلچسپی تھی، بڑی توجہ سے سُنتے، اور کوئی بات سمجھ میں نہ آتی تو دوسروں سے پوچھ کر اپنے اخباروں میں بھیجتے۔

جب کبھی معلوم ہو جاتا کہ حضرت مولانا کو پارلیمنٹ میں بولنا ہے، میں بڑے اہتمام سے پریس گیلری میں پہونچتا۔ لیکن کبھی کبھی ایسا ہوا کہ اپنی بعض دفتری مصروفیات کی بنا پر نہ پہونچ سکا تو حضرت مولانا تقریر کو یا تو زبانی بتا دیتے اور یا پھر سرکاری طور پر آئی ہوئی تقریر کی نقل حوالے کر دیتے۔ مگر ساتھ ہی ہدایت فرما دیتے کہ تحریر کو اچھی طرح دیکھ لینا۔ یہ اسٹینوگرافر لوگ بعض اوقات کچھ کا کچھ بنا دیتے ہیں۔

حضرت مولانا کو اپنی کسی پبلسٹی کا شوق نہ تھا، لیکن حالات کا تقاضا تھا اور خود قارئین الجمعیۃ اور عام لوگوں کی، جنھیں اقلیتوں سے خصوصی دلچسپی ہے، خواہش رہتی تھی کہ حق وانصاف اور ملک میں حقیقی جمہوریت کے قیام کے لئے پارلیمنٹ میں جو باتیں بھی ہوں اخبار میں تفصیل کے ساتھ آئیں۔ حضرت مولانا پارلیمنٹ میں جو کچھ فرماتے اس کی تفصیل کا تقاضہ بھی رہتا تھا اور ایسی تقریروں کے لئے تو قارئین بے چین رہتے جن میں ان کے دُکھ درد کی باتیں بیان کی جائیں۔ خود مولانا بھی پریس کی اہمیت سے واقف تھے، اور حکومت کو توجہ دلانے کے لئے کسی بھی مظلوم طبقہ کی شکایات ومطالبات کی اشاعت کو ضروری سمجھتے تھے۔

لیکن اگر اس راہ میں کارکنانِ الجمعیۃ کی طرف سے کبھی غفلت برتی گئی تو اس کا حضرت مولانا نے کبھی خیال نہ فرمایا۔ وہ انتہائی معتدل مزاج، متواضع اور خلیق انسان تھے۔ ان کے اندر وہ ضبطِ نفس دیکھا جو دارالعلوم دیوبند کا خاصّہ ہے جہاں کے وہ فارغ التحصیل تھے

ایک مرتبہ پارلیمنٹ میں حضرت مولانا کی ایک معرکۃ الآراء تقریر ہوئی۔ جس کی مسلم نقطۂ نظر سے بڑی اہمیت تھی، بدقسمتی سے تقریر کے دوران میں غیر حاضر تھا، کئی مرتبہ ایسا ہو چکا تھا کہ مولانا سے ان کی تقریر حاصل کی گئی، مگر اس مرتبہ مجھے ان کے پاس جاتے ہیں تامل ہوا کہ شاید دل میں کچھ خیال فرمائیں، حالانکہ یہ میرا خیال ہی خیال تھا وہ ایسی باتوں کی پرواہ نہ کرتے تھے۔ مولانا کو پریس گیلری سے میری غیر حاضری کا علم تھا، لیکن صبح کو جب ان کی پوری تقریر الجمعیۃ میں شائع ہوئی تو حیران ہوئے۔ ملاقات ہونے پر پوچھنے لگے کہ اتنی جلدی تقریر کہاں سے حاصل کی؟ اور جب میں نے بتا دیا تو بہت خوش ہوئے۔

حضرت مولانا جب دلی میں ہوتے تو بڑی پابندی سے پارلیمنٹ جاتے تھے اگرچہ ان کی دوسری بے انتہا مصروفیات انھیں ہر روز وہاں پورے وقت نہ بیٹھنے دیتی تھیں۔ لیکن اس کے باوجود جب کبھی کوئی اہم مسئلہ ہوتا تو وہ ہاؤس نہ چھوڑتے تھے۔

حضرت مولانا کو سنٹرل ہال میں بھی بہت کم بیٹھنے کا موقع ملتا تھا لیکن جب بیٹھتے تو ان کے گرد ممبروں کی ایک بھیڑ ہوتی تھی۔ سرکردہ مسلم ممبران تو سبھی جمع ہو جاتے اور ان مسائل پر اہم مشورے کرتے تھے جن کا خاص طور پر اقلیتی حقوق سے تعلق ہوتا تھا۔ فرقہ وارانہ فسادات بالخصوص جبلپور، ساگر، علی گڑھ، میرٹھ اور چند وسی وغیرہ۔ ہنگاموں کے زمانہ میں اسی ہال میں ان کی نشست بڑھ گئی تھی کیونکہ یہاں ہر طبقہ وخیال کے ممبروں سے انھیں تفصیلی گفتگو کرنے کا موقع مل جاتا تھا۔

آج سنٹرل ہال کی مجموعی چہل پہل میں شاید کوئی کمی محسوس نہ کی جائے لیکن ملک کے اتحاد ویکجہتی اور یکجا کے حامی ان ممبران پارلیمنٹ کو یہ ہال ضرور خالی نظر آتا ہے جو گویا حضرت مولانا کو اپنا رہنما سمجھتے تھے، کم از کم دو ممبر خواتین ۔۔ آپا انیس قدوائی (ممبر راجیہ سبھا) اور بہن سبھدرا جوشی (ممبر لوک سبھا) ۔۔ ایسی ضرور موجود ہیں جن کے لئے یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ ایک جگہ بیٹھیں اور حضرت مولانا مرحوم کو یاد نہ کریں۔ فرقہ وارانہ ہنگاموں کے موقعوں پر ان دونوں خواتین ممبروں نے جو خدمات انجام دیں، حضرت مولانا مرحوم کے دل میں ان کی بڑی قدر تھی۔ دونوں کو حضرت مولانا کا پورا پورا اعتماد حاصل تھا۔

پارلیمانی زندگی میں، میرا حضرت مولانا سے پندرہ برس کا واسطہ رہا۔ اکثر وہ اکیلے جاتے اور میں پہلے یا بعد کو پریس گیلری میں پہنچتا لیکن کبھی کبھی ساتھ بھی ہو جاتا یا واپسی میں ان کی ہمراہی، اور پارلیمنٹ میں زیر بحث مسائل پر گفتگو کرنے کا موقع مل جاتا۔ کاش اس زمانے کی ان مختصر گفتگوؤں کے، جو کبھی کبھی پارلیمنٹ ہاؤس سے لال کنوئیں تک یا لال کنوئیں سے پارلیمنٹ ہاؤس تک ہوا کرتی تھیں، ریکارڈ میرے پاس محفوظ ہوتے اور اس ملک کے رہنے والے معلوم کر سکتے کہ حضرت مولانا کے دل میں قوم وملت کا کتنا درد تھا

حضرت مولانا جب آخری بار پارلیمنٹ کے لئے منتخب ہوئے تو وہ اپنی علالت کے باعث اپنے ووٹروں کے پاس نہ جا سکے اور وہ کام نہ ہو سکا جو آج کل کی الیکشن بازی کا حصہ ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ تقریباً ۷ ہزار ووٹوں کی اکثریت سے کامیاب ہوئے۔ یہ ان کی ہر دلعزیزی اور اپنے حلقہ کے عوام میں مقبولیت کا ثبوت تھا۔

جس وقت نتیجہ کا اعلان ہوا، حضرت مولانا بستر علالت پر تھے ہم لوگ پہونچے اور خبر سنائی، مولانا کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو آ گئے ۔۔ انھیں خوشی اس بات پر تھی کہ بے انتہا مخالفانہ پروپیگنڈہ کے باوجود ابھی تک عوام کو ان پر اعتماد تھا۔

لیکن افسوس کہ قدرت کو یہ منظور نہ تھا کہ وہ اپنے حلقہ، اور پورے ملک کے باشندوں کی خدمت کے لئے ابھی کچھ اور دن ہمارے درمیان

ہی کینسر کی ناپاک بیماری نے انھیں آگھیرا اور بہتر سے بہتر علاج کے باوجود ان کی طبیعت بگڑ گئی، اور آخر میں روس اور امریکہ کے ڈاکٹروں سے مشورے ہوئے، تمام ڈاکٹری ریکارڈ دونوں ملکوں میں بھیجے گئے۔ روسی ماہرین نے ریکارڈ دیکھ کر حضرت مولانا کو روس آنیکا مشورہ نہیں دیا۔ لیکن امریکی ڈاکٹروں نے کچھ امید دلائی اور امریکہ جانے کا پروگرام بن گیا۔

حضرت مولانا جس دن روانہ ہونے والے تھے، اس دن پارلیمنٹ میں انھوں نے حلف اٹھایا۔ بہن سعیدہ راجوشی صبح ہی انھیں لینے کیلئے حافظ ابراہیم (وزیر مبرقیات) کی کوٹھی پر پہونچ گئی تھیں، جہاں حضرت مولانا کا قیام تھا۔

پارلیمنٹ کے دروازے پر اترے تو ان کے نیازمندوں نے جن میں راقم الحروف بھی شامل تھا، ان کا خیر مقدم کیا۔ وہ کمزور و نحیف تھے اور مشکل سے چل سکتے تھے۔ لیکن جری، مضبوط ارادے کے مالک اور مستقل مزاج انسان تھے ــــ ان کی انتہائی خطرناک علالت بھی انھیں پارلیمنٹ میں جانے سے نہ روک سکی۔

اسپیکر پارلیمنٹ کو حضرت مولانا کی علالت کا علم نہیں تھا انھیں متوجہ کیا گیا اور انھوں نے حضرت مولانا کو ان کی باری سے پہلے ہی حلف لینے کی اجازت دیدی تاکہ وہ جلد واپس جاسکیں۔

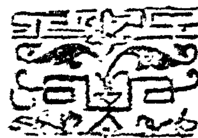
جوں ہی وہ اپنی سیٹ سے اٹھے میں پریس گیلری سے نیچے دوڑا اور انھیں دروازہ تک سہارا دینا چاہا ــــ حضرت مولانا نے انکار فرمایا۔ لیکن ان کا یہ انکار ان کے ایک پرانے نیازمند کو اپنے فرض کی انجام دہی سے نہ روک سکا۔ ڈاکٹر سوشیلا نئر (وزیر صحت) اور مسز سعیدہ راجوشی حضرت مولانا کے ہمراہ تھیں۔ مولانا موٹر میں سوار ہوئے اور اس ایوان پارلیمنٹ سے جس میں گزشتہ پندرہ برسوں میں ان کی جرأت و بے باکی اور حق و انصاف کے لئے آخر وقت تک جد و جہد کرنے کا مظاہرہ بہت سی بار دیکھنے میں آیا تھا وہ رخصت ہوگئے۔ پارلیمنٹ میں یہ حضرت مولانا کی آخری حاضری تھی ــــ یا یوں کہئے کہ یہ ان کی پارلیمانی زندگی کا اختتام تھا ــــ اسی شام حضرت مولانا بغرض علاج امریکہ کے لئے روانہ ہوگئے، جہاں وہ دو ماہ سے کچھ زیادہ عرصہ تک رہے۔

راقم الحروف جب امریکی حکومت کی دعوت پر ایک پریس پارٹی میں شامل امریکہ روانہ ہوا تو وہ میڈیسن میں زیر علاج تھے۔ خیال تھا کہ میں حضرت مولانا کو ہندوستان کے کروڑوں باشندوں کا پیغام محبت پہنچاؤنگا لیکن نہ صرف یہ کہ امریکہ میں حضرت مولانا سے ملاقات نہ ہوسکی، بلکہ واپس آنے کے بعد بھی ان کے دیدار سے محروم رہا۔ میری واپسی سے قبل ہی وہ ابدی نیند سوچکے تھے ــــ ملک و ملت کا وہ روشن ستارہ غروب ہوچکا تھا۔ شاید ایسا روشن ستارہ ہم پھر کبھی نہ دیکھ سکیں گے۔

ع بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

اللہ تعالیٰ مرحوم کی قبر کو نور سے بھرے اور انھیں جنت الفردوس میں داخل کرے۔

آمین ثم آمین



میرے مشاہدات!

از جناب کنور مہندر سنگھ بیدی آئی اے ایس
ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سنگرور

سنہ ۱۹۴۳ء میں میری پہلی بار دہلی تعیناتی ہوئی۔ میں ان دنوں نیشنل وار فرنٹ کا انچارج تھا۔ دہلی میں آنے کے فوراً ہی بعد مجھے مختلف سیاسی جماعتوں کے ارکین سے تعلقات قائم کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ فرائض منصبی کی ادائیگی کے لئے بھی میرے لئے ایسا کرنا مناسب تھا۔ چنانچہ اسی سلسلے میں ایک روز گلی قاسم جان جمعیت کے دفتر پہنچا۔ وہاں بہت سے اصحاب موجود تھے۔ ایک لاغر جسم لیکن باوقار انسان مجھ سے ملنے کے لئے اٹھے۔ ان کے کتابی چہرے، نورانی ریش اور چمکدار آنکھوں سے متانت، تدبر اور استقلال کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔ یہ تھے مولانا حفظ الرحمٰن مرحوم و مغفور۔ بہت دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں اور جب میں نے تخفیف تصدیعہ کہہ کر رخصت حاصل کی تو باہر تک مجھے پہنچانے آئے۔ پہلی ہی ملاقات میں مولانا نے میرے دل پر ایک گہرا نقش چھوڑا۔

مجھے دہلی میں تقریباً گیارہ برس سرکاری طور پر رہنے کا موقع ملا۔ اس اثنا میں سینکڑوں بار مولانا سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ کئی بار ریاسی معاملات کی خاطر اور بارہا دنیوی سلسلے میں ملاقاتیں ہوئیں۔ کئی بار میں نے ان سے ذاتی معاملات میں بھی مشورہ حاصل کیا۔ ہر ملاقات میں مولانا کی شخصیت، گفت گو اخلاق، تہذیب، مشرقیت، ذہانت اور سنجیدگی سے متاثر ہوا۔ مولانا کے ویسے تو ہزاروں نیازمند تھے۔ لیکن مجھ سے مولانا بڑی محبت سے پیش آتے تھے اور اپنے عزیز ترین نیازمندوں میں شمار کرتے تھے۔ سنہ ۱۹۴۷ء کے فسادات کے فوراً ہی بعد جب میں دہلی میں بطور سٹی مجسٹریٹ تعینات ہوا تو مولانا ایک روز غریب خانہ پر تشریف لائے۔ ان کے دل و دماغ پر ایک بوجھ سا تھا جیسے وہ کسی بڑی کشمکش میں مبتلا ہیں۔ فرمانے لگے میں آپ کو لینے آیا ہوں۔ باڑہ ہندو راؤ میں مسلمانوں کا اجتماع ہے۔ میں چاہتا ہوں آپ وہاں چل کر ان کی ڈھارس بندھائیں۔ وہ آپ پر اعتماد رکھتے ہیں۔ مولانا کے ہر حکم کی تعمیل کرنا میں اپنا فرض سمجھتا تھا اور پھر یہ تو مسئلہ بھی نہایت ضروری تھا۔ چنانچہ میں ساتھ ہو لیا۔ مولانا نے رسمی طور پر مجمع سے میرا تعارف کرایا اور مجھے تقریر کرنے کے لئے فرمایا۔ جلسہ کے اختتام پر جب ہم گھر لوٹے تو مولانا نے اس خلوص اور محبت کے ساتھ میرا شکریہ ادا کیا جیسے میں نے ان کی گردن سے کوئی بھاری بوجھ اتار دیا ہو۔

فسادات کا یہ دور مولانا کے لئے نہایت اہم اور نازک تھا۔ دہلی کے مسلمان گھبرائے ہوئے تھے۔ بہت جا چکے تھے، باقی جانا چاہتے تھے۔ مولانا محسوس فرماتے تھے کہ ان کا دہلی سے ان حالات میں جانا جہاں ان کے اپنے مفاد کے خلاف ہوگا، وہاں ہندوستان کی بین الاقوامی شہرت اور عزت کے لئے بھی مضر ثابت ہوگا۔ چنانچہ چوبیس گھنٹے اِدھر اُدھر مارے مارے پھرتے تھے اور اس کوشش میں تھے کہ فضا ہموار ہو اور سبھی قومیں پھر سے پہلے کی طرح شیر و شکر ہو کر رہیں۔ اس دور میں مسلمانوں کی صحیح نمائندگی کا بوجھ یا تو امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد اٹھا سکتے تھے یا مولانا حفظ الرحمٰن۔ اس لئے نہیں کہ دہلی یا ہندوستان میں اور کوئی صحیح دماغ مسلمان لیڈر نہیں تھا بلکہ اس لئے کہ مولانا آزاد اور مولانا حفظ الرحمٰن پر سب قومیں اعتماد رکھتی تھیں اور ان کی ہر تجویز کو محض اس لئے نہیں ٹھکرا دیا جاتا تھا کہ ان میں کسی تعصب یا انتقام کا عنصر ہے۔

ان دنوں مجھے وقت بے وقت دہلی کے گلی کوچوں میں گشت کرنی پڑتی تھی۔ کبھی کبھار مولانا بھی ہمراہ ہوتے تھے۔ فضا مایوس کن ہونے کے باوجود مولانا کو ہندوستان کا مستقبل تاریک نظر نہیں آتا تھا۔ وہ محسوس کرتے تھے کہ ہمارا ملک سیکولرزم کی صحیح مثال دنیا کے سامنے پیش کر سکتا ہے اور کرے گا۔ چنانچہ آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ مولانا کی یہ پیشین گوئی کس قدر درست ثابت ہوئی۔

جو شخص اپنے عقائد کا پکا ہو بہادر بھی ہوا کرتا ہے۔ اسی جذبے نے دنیا میں غازی اور شہید پیدا کئے ہیں۔ مولانا بھی اپنی دھن کے پکے تھے، اور کبھی کسی مصیبت یا رکاوٹ سے گھبراتے نہیں تھے۔ میں نے ان کو کئی بار مخدوش علاقوں میں اکیلے چکر کاٹتے دیکھا۔ ایک بار لال کنواں بازار کی ایک گلی میں کسی پر قاتلانہ حملہ ہوا۔ میں پولیس لے کر فوراً موقع پر پہنچا، دیکھا کہ مولانا پہلے سے ہی وہاں پر موجود ہیں۔ میں نے گذارش کی کہ اب آپ تشریف لے جائیے۔ میں یہاں کی دیکھ بھال کر لوں گا۔ میں نے ہر چند چاہا کہ پولیس ساتھ کر دوں تاکہ مولانا کو گلی قاسم جان تک پہنچا آئے۔ لیکن مولانا نے انکار کر دیا اور فرمانے لگے کہ میں اکیلا ہی چلا جاؤں گا۔ میں نے تعمیل حکم میں پولیس کو کہیں اور گشت کے لئے بھیج دیا۔ مولانا پیدل ہی واپس گلی قاسم جان کی سمت چل پڑے۔ بظاہر تو میں نے مولانا سے رخصت چاہی۔ لیکن جب وہ تھوڑی دور چلے گئے۔ تو میں آہستہ سے اُن کے پیچھے ہو لیا، تاکہ راستے میں کہیں کوئی اور واقعہ نہ پیش آ جائے۔ مولانا کی زندگی ہمارے لئے ایک بیش بہا سرمایہ تھی۔ جیسے ہم کسی قسم کے خدشہ

میں نہیں ڈالنا چاہتے تھے۔ اس واقعہ کا ذکر آج میں پہلی بار کررہا ہوں۔ مولانا کو کبھی اس کا علم نہ تھا۔ مولانا کی تمام عمر اسی جدوجہد میں گزری کہ ہم ہندوستانی بلاتفریق مذہب وملت باہم اُنس واخلاق سے رہیں اور اپنے محبوب وطن کی فلاح وبہبود کے لئے شانہ بشانہ کام کریں۔ جب لسانی مسئلہ نے نازک صورت اختیار کی اور یہ ایک مذہبی سا مسئلہ بن کر رہ گیا، اس وقت بھی مولانا نے اس طوفان بدتمیزی کو روکنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ انھیں ایام میں وددیا شنکر جی آئی سی ایس سردار پٹیل کے سکریٹری تھے، بلکہ دست راست تھے۔ انھوں نے ایک روز مجھے یاد فرمایا اور کہا کہ سردار پٹیل یہ چاہتے ہیں کہ زبان کا مسئلہ تعصب سے بری رہنا چاہئے اور اس کے لئے ضروری ہے کہ چند ایسے لوگ میدان میں آئیں جن کا کردار ہمیشہ سے غیر متعصب رہا ہے دونوں زبانوں کو نزدیک لانے کی کوشش کی جائے۔ ہندی کو بسر وچشم قومی زبان تسلیم کیا جائے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اردو کو بھی پنپنے کا موقع دیا جائے۔ میں نے اس بارے میں جن معدودے چند حضرات کو ہم راز بنایا ان میں سے ایک مولانا حفظ الرحمٰن تھے اور دوسرے منشی گوپی ناتھ امن۔ ان دونوں کے مشورے سے دہلی میں اردو سبھا کا انعقاد ہوا، کچھ دیر تک اردو سبھا نے اس سلسلہ میں بہت اچھا کام کیا اور مولانا نے ہمیشہ اس کی سرپرستی فرمائی۔

مولانا مرحوم اپنی تمام مصروفیتوں کے باوجود ادبی سرگرمیوں کے لئے وقت نکال لیا کرتے تھے۔ ان کے ایما سے درجنوں ایسے مشاعروں کا انعقاد ہوا جو اپنی مثال آپ تھے۔ شاعر حضرات (انھیں خدا رکھے) اکثر زود رنج مشتعل مزاج ہوتے ہیں۔ ان مشاعروں میں اور ان کے علاوہ اپنی روزمرہ کی زندگی میں ان لوگوں کو تعلقات بگاڑنے اور بنانے کے کافی مواقع ملتے ہیں جب کبھی بھی شعراء میں ناچاقی ہو جاتی تھی، مولانا مرحوم کو ثالث بنا دیا جاتا تھا۔ اور دونوں فریق مکمل طور پر مطمئن ہو کر شیر وشکر ہو جاتے۔ ایک بار لال قلعہ میں ایک مشاعرہ ہوا۔ اس میں قبلہ جوش ملیح آبادی نے ایک نظم پڑھی۔ جس میں منتظمین مشاعرہ سے یہ گزارش کی گئی تھی کہ وہ سیاست کو ادب میں نہ گھسنے دیں۔ ادبی لحاظ سے نظم بہت اچھی تھی۔ لیکن اس مشاعرہ کے پس منظر کے نقطۂ نظر سے نہ پڑھی جاتی تو اچھا تھا۔ اس نظم سے مشتعل ہو کر میرے ایک اور عزیز دوست شاعر نے ایک قطعہ براہ راست جوش صاحب کے خلاف پڑھ دیا، جو کسی لحاظ سے بھی مناسب نہ تھا۔ ہم سب کو اس شاعر کا ایسا کرنا ناگوار گزرا، لیکن چونکہ جوش صاحب صرف میرے ہی اصرار پر اس مشاعرے میں شریک ہوئے تھے، میں مشاعرے سے اُٹھ کر چلا گیا۔ مولانا نے بھانپ لیا کہ میں احتجاج کے طور پر کنارہ کش ہوا ہوں، چنانچہ فوراً ہی میرے پیچھے اٹھ کر آگئے اور فرمانے لگے کہ واقعہ افسوسناک ہے، لیکن میرے یوں اٹھ کر چلے جانے سے اور بھی زیادہ افسوسناک ہو جائے گا، یہ فرماتے ہوئے مجھے بازو سے پکڑ کر واپس لے آئے۔

مولانا کو ہندوستان میں مسلمانوں کا مستقبل کبھی بھی تاریک دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اور وہ ہر مناسب موقع پر صاف صاف کہہ بھی دیا کرتے تھے ۱۹۵۰ء میں پاکستان سے تاجروں اور اخبار نویسوں کا ایک خیرسگالی وفد ہندوستان آیا۔ بھائی جشن خاں میں حافظ یوسف صاحب نے اس وفد کو چائے پر مدعو فرمایا۔ میں بھی وہاں موجود تھا۔ بڑی پرتکلف چائے تھی، اِدھر اُدھر سے بڑی تھیدار تقریریں ہوئیں، مقررین نے دونوں ملکوں کے تعلقات بہتر ہونے کی دعائیں مانگیں، ہم سب نے آمین کہی۔ جب مولانا حفظ الرحمٰن کی باری آئی تو انھوں نے فرمایا اگر پاکستان والے ہندوستان کے مسلمانوں کی بہتری چاہتے ہیں اور اگر صحیح معنوں میں ان کے ہمدرد ہیں تو ہندوستان کے مسلمانوں پر رحم کریں اور اُن کو اُن کے حال پر چھوڑ دیں۔ ہندوستان کے مسلمان خود ہی اپنے حقوق کی دیکھ بھال کرنے کے اہل ہیں۔ وقتی طور پر شاید اس تقریر کا اثر پاکستانی وفد پر اچھا نہ پڑا ہو لیکن وقت نے ثابت کر دیا ہے کہ مولانا نے کتنی اچھی بات کہی تھی

مولانا میں سب سے بڑا وصف جو میں نے دیکھا وہ یہ تھا کہ ان کے دل میں کبھی بھی بیجا نام ونمود کی خواہش پیدا نہ ہوئی۔ اگر وہ چاہتے تو سرکاری طور پر کئی قسم کے اعزازات حاصل کرسکتے تھے۔ لیکن انھوں نے کبھی اس کی پروا اس لئے نہیں کی کہ ایسا کرنے سے شاید وہ عوام کی اتنی خدمت نہ کرسکیں۔ آج کل کی سیاسی دنیا میں ایسے لوگ اگر نایاب نہیں تو نادر ضرور ہیں۔

مولانا کی طویل علالت کے دوران میں ان کے ہزاروں لاکھوں بہی خواہوں نے کیا کیا نہ دعائیں مانگیں، لیکن جو عدم سے وجود میں آئے ہے اسے واپس لوٹنا پڑتا ہے۔ دست اجل سے آج تک سوائے خدائے پاک کی ذات کے اور کوئی مفر حاصل نہ کرسکا۔ مہاتما گاندھی گئے، سردار پٹیل گئے، مولانا آزاد گئے اور رفیع احمد قدوائی گئے پنڈت پنت گئے۔ اب مولانا حفظ الرحمٰن چل بسے، خدا جانے اب اور کس کی باری ہے۔

ہمارے لئے اب اس کے سوا چارہ بھی کیا ہے کہ صدق دل سے خداوند تعالیٰ کی حضور میں دعا مانگیں اور علامہ اقبال کا یہ شعر دہرائیں۔

جو بادہ کش تھے پرانے وہ اٹھتے جاتے ہیں
کہیں سے آب بقائے دوام لے ساقی

مولانا کی یاد

ہز ہائی نس
نواب سرور علی خاں
آف کوروائی

محترمی قبلہ انیس الحسن صاحب - السلام علیکم

میں پاکستان سے پہلے ہفتہ ستمبر میں واپس آیا - تو آپ کا عنایت نامہ ملا اور اب آپ کی یاد دہانی بھی وصول ہوگئی - قبلہ مرحوم کے لئے کیا عرض کروں - اللہ تعالیٰ نے کیسی ہستی کو ہمارے پاس سے بلالیا ہے

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک ایسی عظیم ہستی تھی کہ اس پر موت کے غلبہ کا یقین ایک دم مشکل سے آتا ہے - خاص کر ایسے زمانہ میں جب کہ قوم کو اس کی نازک حالت میں ان کی شدید ضرورت تھی - برِصغیر ہند و پاکستان کا کونسا گوشہ ہوگا جہاں کے لوگ چاہے وہ کسی مذہب و ملت سے تعلق رکھتے ہوں مولانا مرحوم کے کمالات انسانی کی وجہ سے ان سے بخوبی واقف نہ ہوں - ویسے تو مولانا گزشتہ چالیس سے قومی زندگی میں ایک نمایاں حصہ ادا کرتے چلے آرہے تھے جس کے باعث ملک میں وہ ایک جانی پہچانی ہستی تھے اور لوگوں کے دلوں میں اپنے کارناموں کے نقوش ثبت فرما چکے تھے - لیکن تقسیم ہند کے بعد کے پندرہ سال سے تو ان کی توانائیاں کچھ اس طرح نمایاں ہوئیں کہ قوم اور ملت کے جاذب نظر بن گئے - ۱۹۴۷ء سے قبل میں قبلہ مولانا کے بارے میں کچھ اخباری معلومات رکھتا تھا - مولانا کی تقاریر وغیرہ اکثر اخبارات وغیرہ میں نگاہ سے گزرتی تھیں جس سے میرے دل میں مولانا کی طرف بے حد کشش پیدا ہوئی اور مجھے یہ آرزو ہوئی کہ مولانا کی فیضِ صحبت سے کچھ استفادہ حاصل کروں - اس شوق کی تسلی کے لئے میں نے مولانا کو چند یوم کے لئے کوروائی تشریف لانے کی دعوت دی - مولانا کے اخلاق کا یہ کیا کم کمال تھا کہ انھوں نے باوجود اپنی اہم مصروفیات کے میری دلی آرزو پر لبیک کہہ کر شرف قبولیت بخشا اور کوروائی دو مرتبہ تشریف لائے اور اپنی فیض صحبت سے مجھے اور کوروائی کے باشندوں کو مستفید فرمایا - یہاں کے دوران قیام میں - میں ایک واقعہ بھول نہیں سکتا جس کا اثر میرے دل پر ہمیشہ رہے گا - کوروائی میں ایک جناب حشمت حسین صاحب ملازمت سے ریٹائر ہوکر رہتے ہیں - بہت غربت میں بسر اوقات کرتے ہیں اور قبلہ مولانا کے دور کے رشتہ دار ہیں - مدت سے مولانا سے ملاقات نہیں ہوئی تھی - البتہ مولانا کو علم تھا کہ وہ کوروائی میں ہیں - مولانا کا قیام میرے محل پر تھا اور جناب کی آمد کا خیر مقدم اور استقبال بھی کافی شاندار ہوا جیسے ہی استقبال وغیرہ کا پروگرام ختم ہوا تو مجھ سے فرمایا کہ نواب صاحب میرے ایک رشتہ دار جن کا نام حشمت حسین ہے کوروائی میں رہتے ہیں - بہت عرصہ ہوا ان کا خط میرے پاس آیا تھا - وہ کثیر العیال ہیں اور غریب ہیں - لیکن میرے رشتہ دار ہیں ممکن ہے وہ مجھے بھول گئے ہوں لیکن میں انھیں نہیں بھولا - ان سے میں ملنا چاہتا ہوں - اتفاق سے اس روز حشمت حسین صاحب علالت کی وجہ سے مولانا مرحوم کے استقبال میں نہیں آسکے تھے میں نے مولانا سے کہا کہ میں ان کو موٹر بھیج کر بلاتا ہوں - اس پر فرمایا کہ "میرے لئے ان کا محل پر بلانا ان کی توہین ہوگی مجھے ہی ان کے پاس بھیج دیجئے"

اس کے بعد مولانا خود ان کے گھر گئے اور دوران قیام میں دو مرتبہ گئے - اس سے مرحوم کے اخلاق کا اندازہ ہوگا اس کے بعد ویسے تو کئی مرتبہ مجھے حاضری کا موقع ملا - لیکن اجین میں جمعیۃ علما کی جو کانفرنس ہوئی تھی جس میں قبلہ مرحوم نے مجھے استقبالیہ کا صدر بنا دیا تھا وہاں کی شرکت کے ایام میں مولانا کی صحبت کا جو کچھ تاثر مجھ پر ہوا وہ تو میرا دل ہی محسوس کرتا ہے - اس کے بعد کچھ میری زندگی ہی بدل گئی اور اب بفضلہ تعالیٰ اور مرحوم کی توجہات کی بنا پر میں ہوں، میری زندگی ہے اور دینیات میں دینی ادائے میں یہ سب ان کا طفیل ہے اور اللہ تعالیٰ کا فضل

سب سے پہلے مولانا کی شخصیت خود ایک جاذب نظر تھی ان کی گفتگو کرنے کا انداز لوگوں کو قدرتی طور پر اپنی جانب متوجہ کرلیتا تھا اور ان سے ملنے کے بعد - ان سے گفتگو کرنے کے بعد ان کے سمجھانے کے بعد کوئی یہ نہیں کہتا تھا کہ "یہ کام میرے بس کا نہیں - یا میں اس کام کے قابل نہیں" - کچھ عجیب قابلیت اور ہمت اور استعداد وہ پیدا کردیا کرتے تھے مجھے ہی دیکھئے - کہاں میں اور کہاں میری سنٹرل وقف بورڈ اگر مرحوم نہ کہتے تو عمر بھر میں اس کو قبول کرتا اور نہ اپنے آپ کو اس قابل سمجھتا - پھر ماشاء اللہ ان کا تبحر علمی سونے پر سہاگے کا کام دیتا تھا - الجھی سی الجھی بات کو ذرا سی دیر میں صاف فرما دیتے تھے - خطابت کی صلاحیت اور کمال تو قدرت کی طرف سے ماشاء اللہ ان کو خاص طور پر ودیعت کیا گیا تھا - علم اور خاص کر علم دین کے وہ بحر بے کراں تھے صحیح معنوں میں انسان تھے - جس طرح علم دین میں وہ چوٹی کے عالموں میں شمار ہوتے تھے - اسی طرح سیاست کے بھی مرد میدان تھے - پارلیمنٹ میں اور اس کے باہر ان کی بے باکانہ تقاریر اس کا زندہ ثبوت ہیں - دوسری خصوصیت ان کی سادگی تھی مرحوم کی طبیعت کچھ اس قدر سادہ واقع ہوئی تھی کہ ان کے ملنے والوں پر ان کے تبحر علمی کا ذرا رعب نہ پڑتا تھا - اور

ہر شخص کو ان سے کوئی بات پوچھنے میں ذرا تامل نہ ہوتا تھا۔ مرحوم نہایت نرمی سے ہر بات کو اس طرح سمجھا دیتے تھے کہ سننے والا مطمئن ہو جاتا تھا۔ ان کی ایک اور خصوصیت جس نے مجھے بہت زیادہ متاثر کیا وہ ان کی تواضع اور وضع کی پابندی تھی۔ باوجودیکہ مولانا ہندوستان کی چوٹی کی ہستیوں میں سے تھے مگر اتنے اونچے مقام پر ہونے پر بھی ان میں اپنی بڑائی کا احساس ذرا بھی نہ تھا۔ اجین میں بحیثیت صدر استقبالیہ میں نے مولانا مرحوم کے لئے اور دیگر علما مہمانوں کے لئے ان کی مصروفیتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے انتظام یہ کر دیا تھا کہ ان کا کھانا ان کے کیمپ میں پہنچا دیا جائے۔ لیکن کیا مجال۔ قبلہ مرحوم اصرار کے ساتھ جہاں عام لوگ کھانا کھاتے تھے وہیں آتے اور اسی خوان میں سے جہاں دو چار بیٹھے کھانا کھا رہے ہوتے ان کے ساتھ بسم اللہ کر کے شریک ہو جاتے۔ انداز گفتگو کچھ ایسا پرزور ہوتا تھا۔ اس سے بعض لوگوں کو ضرور یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ شاید مولانا کو احساس برتری ہے۔ مگر قریب کے جاننے والے بخوبی سمجھتے تھے کہ یہ ادعائے علم یا اپنی بڑائی کی بنا پر نہیں ہوتا تھا، بلکہ اخلاقی جرأت اور اپنی صلابت اور مضبوطی رائے کے باعث ہوتا تھا۔ جس بات کو مولانا اپنی صحت رائے کی بنا پر درست و مناسب سمجھتے تھے اس کے اظہار اور اس کے منوانے میں اپنی پوری صلاحیت اور زور کلامی سے کام لینے میں ذرا پس و پیش نہ فرماتے تھے ایسے معاملات میں مخالفت چاہے کسی بڑی سے بڑی ہستی کی ہو۔ مولانا اپنے موقف سے ایک انچ بھی ہٹنے پر راضی نہ ہوتے تھے۔ یہ طرز گفتگو ان کا فطری تھا جس میں تکلف کا ذرا شائبہ نہ تھا جس طرح ان کی خطابت اور گفتگو تکلف سے عاری تھی۔ اسی طرح وہ اپنے ملنے والوں سے بھی نہایت بے تکلفی سے ملتے تھے۔ مولانا کی حق گوئی اور بیباکی ان کا طرۂ امتیاز تھی۔

مولانا کی زندگی

جو حقیقتاً ایک مجاہد کی زندگی تھی اور کہنا چاہئے کہ زندگی کا نچوڑ تھا وہ ان کی آخری پندرہ سالہ زندگی تھی جس میں انھوں نے ملت کی وہ ان تھک خدمات انجام دیں کہ ایک مجاہد کی طرح اپنی جان عزیز ملت کی خاطر قربان کر دی اور ملت سے مجاہد کا خطاب جو ان کو ملا تھا اس کو اپنی جان دے کر ثابت کر دیا اور مجاہد ملت کے مقام سے تجاوز کر کے شہید ملت کے درجہ پر فائز ہو کر رہے۔

اللہ تعالے مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور ہم پس ماندگان کو ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق بخشے۔ آمین

قطعات

شوکت دھام پوری

(۱)

زندگی کے حسیں شبستاں سے
روشنی دور ہوتی جاتی ہے
تیرے جانے کے بعد محفل میں
شمع بے نور ہوتی جاتی ہے

(۲)

غم میں تیرے مجاہد ملت
دل پہ پژمردگی سی چھائی ہے
صرف میں ہی نہیں ہوں گریہ کناں
آج ہر آنکھ ڈبڈبائی ہے

حضرت مجاہد ملت میری نظر میں

منشی محمود قاسم۔ ترکیسر ضلع سورت

حضرت مولانا کو خداوند کریم نے یوں تو بہت سی خوبیوں سے نوازا تھا۔ لیکن ایک خاص چیز جو آپ کو حاصل تھی وہ بہت کم کہیں نظر آ سکتی ہے۔ وہ آپ کا بے لوث خلوص اور سادگی ہے۔ وہ واقعی اسلامی لشکر کے جرنل تھے [illegible] کے موسم سرما میں جب اوجین میں جمعیۃ علماء ہند کا سالانہ اجلاس ہوا تھا اس موقع پر میری طبیعت ناساز تھی۔ سفر کی تکالیف برداشت کرنے کی مجھ میں بالکل طاقت نہ تھی۔ اس لئے دل کے بہت چاہنے کے باوجود اس میں شرکت کرنے کا ارادہ نہ تھا۔ لیکن جب حضرت مجاہد ملت کی طرف سے ان الفاظ میں دعوت نامہ ملا کہ تمھیں جو بھی کام ہو اس کو چھوڑ کر اجین کے اجلاس میں حاضر ہو جاؤ تو میں نے کمزوری کے باوجود جلسہ میں شرکت کرنے کا ارادہ کر لیا یہ بات جب میرے دوست احباب کو معلوم ہوئی تو انھوں نے کہا تمھارے اندر کافی ضعف ہے تم کو اجین جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے جواب دیا کہ جمعیۃ علماء ہند کو میں مجاہد فی سبیل اللہ جماعت سمجھتا ہوں اور جب اسلامی امیر کا حکم حاضر ہونے کا ہوا تو میں اس کو جہاد سمجھ کر اس میں شرکت کیلئے جا رہا ہوں۔

بفضلہ تعالے یہ مولانا کی کرامت تھی کہ نہ راستہ میں مجھے کوئی تکلیف ہوئی اور نہ اجین میں۔ اجین کا اجلاس بہت کامیاب رہا۔ اجین میں میں نے دیکھا کہ حضرت مولانا حفظ الرحمن صاحب لشکر اسلام کو لے کر شہر کے باہر جنگل میں چھاؤنی ڈالے ہوئے یو۔پی کے ڈیلی گیٹوں کے تنبوؤں میں سب کے ساتھ زمین پر فروکش ہیں۔ باوجودیکہ آپ کے لئے بہترین آرام گاہ میسر ہو سکتی تھی مگر آپ نے بے نظیر خلوص اور سادگی سے اسلامی مساوات اور صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا نمونہ پیش کر دیا



یادِ مجاہدِ ملت۔ ایک سبق آموز عنوانِ حیات

(شاعر انقلاب علامہ انور صابری صاحب)

دورِ حاضر میں زندگی کے ہر تقاضے کو سمجھ کر عوام کی خدمت کا جذبۂ لطیف حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو قدرت نے اپنی خاص عنایتوں کی بنیادوں پر عطا کیا تھا۔

وہ مذہبی اعتبار سے بالغ نظر عالم۔ ادبی لحاظ سے بلند پایہ صاحبِ طرز ادیب۔ اور سیاسی میدان کے مخلص، نڈر اور بیباک مجاہد تھے۔

میں انھیں ۱۳۴۵ھ سے جانتا ہوں۔ وہ اُس وقت مجھے عربی کی ابتدائی کتابیں دارالعلوم دیوبند میں پڑھاتے تھے۔ ۳۶ سال کی ملاقاتوں کا تجرباتی دور اپنی ایک مستقل تاریخ رکھتا ہے۔

درسگاہِ شیخ الہند کے تربیت یافتہ حلقوں میں ایمان و اسلام کے ساتھ عشق اور سرزمینِ وطن سے محبت کا جو حقیقی ہوش و جوش نصیب ہوا تھا، مولانا اس کی زندۂ جاوید تفسیر تھے۔

ان کی گفتگو میں سنجیدگی و متانت کا شکوہ تھا اور نگاہوں میں پاک دامن شوخی، تبسم کی حسین موجوں میں زندگی کے تمام اہم اور صبر آزما مسائل کو بہا کر لے جاتے تھے۔

عمر بھر قومیت متحدہ اور تبلیغ دین کی راہوں پر چل کر اُنھوں نے کبھی تھکن محسوس نہیں کی۔ جبر و تشدد، ظلم و استبداد کے ہر لباس سے انھیں بغض تھا۔

انگریز کے فرعون مزاج دورِ حکومت میں اُنھوں نے وہ سب کیا جس کی توقع ایک حوصلہ مند، انسانیت نواز رہنما سے کی جا سکتی تھی۔ "زبان و قلم" سے رِستے ہوئے سب انگارے برطانوی اقتدار کی جانب پھینکے اور جب تک اسے خاکستر ہوتے نہیں دیکھ لیا، اُن کی روحِ بیقرار کو سکون نہیں ملا۔

وہ دشمن کی ایذا رسانی کو عروجِ ایمان کا وسیلہ سمجھتے رہے اور اپنوں کی مخالفتوں میں منصفانہ روش سے کبھی نہیں ہٹتے تھے۔

سیرت پر بولتے تھے تو قرونِ اولیٰ کی سچی تصویر نظروں کے سامنے آجاتی تھی۔ سیاست پر تقریر ہوتی تھی، تو دلوں کے ولولوں کو قابو میں رکھنا مشکل ہوجاتا تھا۔

انگریز کی غلامی اور آزادی کے بعد ماحول کی یاس انگیزی کے زمانوں میں اُنھیں کبھی توحش نہیں ہوا۔ وہ ہر دور کا مردانہ وار مقابلہ کرتے رہے اور ساتھیوں کی افسردہ دلی کو اولوالعزمی میں تبدیل کرتے رہے۔

محمود الحسن کے فکر و عمل، حسین احمد کے جہادِ حریت، اور ابوالکلام کی ولی اللّٰہی فراست کو جب بھی یکجا کر کے دیکھیں گے تو اس مجموعے کا نام حفظ الرحمٰن صاحب کے سوا کیا ہوگا۔

میں فطری طور پر نہایت لاابالی، قلندر منش اور آزاد طبع رہا ہوں میری ان تمام عیوب کے باوجود نہ جانے وہ آخر وقت تک کیوں مجھ سے محبت کرتے رہے ان کا خیال تھا کہ میں "حفظ الرحمٰن" کے نقطۂ فکر کو سمجھتا ہوں اور وقت کے دھارے کو پہچان کر، داعیوں کے سفینوں کو اشعار کی آہنگ دے کر صحیح رُخ پر لے جاتا ہوں۔

میری اور اُن کی بسا اوقات ایسی ملاقاتیں بھی ہوئیں جو نتیجہ کے اعتبار سے ظاہر بین نگاہوں میں شاید آخری ملاقاتیں کہی جائیں۔ لب و لہجے کی کوئی تلخی ایسی نہ تھی جو روا نہ ہوئی ہو لیکن چند ساعتوں کا سکوت ان سب تلخیوں کو بھول جاتا تھا۔ اور جب وہ "حسین و جمیل" اندازِ نظر کے ساتھ دیکھ کر آبدیدہ ہوجاتے تھے تو میں اُن کی نگاہوں کو اپنے آنسوؤں میں جذب کرنے پر مجبور ہوجاتا تھا۔ وسعتِ قلب اور پُرخلوص رواداری کے معاملے میں وہ اپنی نظیر آپ تھے۔

یہ حقیقت ہے کہ اگر حسین احمد اور ابوالکلام کو بخاری کی زبان، اور حفظ الرحمٰن کی جرأتِ کردار نہ ملتی تو شاید مساعدتِ وقت کا وہ سماں نہ دیکھنے کو ملتا جو ۱۵ اگست ۴۷ء کی رات میں فضاؤں کا حسن بڑھا رہا تھا۔

کردار و عمل کی تاریخ میں امروہہ کا اجلاس اپنی عظمتوں کا عظیم اجلاس تھا۔ اپنے مخالف بیگانوں کی سنگینیں چاروں طرف بلند، اچھے اچھے اربابِ شجاعت کے دل بھر آئے۔ مگر شیخ الاسلام مولانا حسین احمدؒ کی حیات افروز صدارت، حفظ الرحمٰن کی عدیم المثال ہمت، اور بخاری کی لازوال خطابت اس عمارت کا سنگِ بنیاد رکھ گئی، جو آج آزادی کے قصرِ رفیع کی صورت میں ہمارے

سامنے ہے اور قومی یکجہتی کا تصور اسی وقت سے پروان چڑھ کر آج روحوں اور دلوں کی تمناؤں کا مرکز بنا ہوا ہے۔

۴۷ء سے پہلے ہمارے مسائل کچھ اور تھے اور ۴۷ء کے بعد اُن میں بہت شکل تبدیلیاں آئیں عمل کے اس ماضی و حال میں حفظ الرحمٰن وہی تھا جو ہونا چاہیے تھا۔ درحقیقت مولانا مرحوم اپنی موت کے بعد ایک ایسا عنوان چھوڑ گئے ہیں جس پر مسلسل لکھتے رہنا بھی کافی نہ ہوگا۔

اُن کی موت پورے ایک دورِ عمل کی موت ہے۔ ولی اللّٰہی مشن کیلئے وجہ اضطراب اور مستقبل کے خطرات سے بچنے کی اُمیدوں کے چہرے کا رنگ ملال ہے لیکن اگر ہم میں حفظ الرحمٰن کی حقیقی تقلید کا جذبہ ہے تو پھر یہ موت ہماری نئی زندگی کا پیش خیمہ بھی ہے۔ دیکھئے یہ سوال کب اپنا جواب پاتا ہے۔

چند بیقرار آنسو

مجاہدِ ملت مولانا حفظ الرحمٰنؒ کی مرگِ ناگہاں پر

زہرۂ سخن سیدہ اختر

ہند سے اک رہنمائے باصفا رخصت ہوا ——— اک مجاہد ایک "مردِ لاالٰہ" رخصت ہوا

ہر تڑپتی جان کا کیف و سکوں گم ہو گیا ——— ہر دھڑکتے قلب کا اک آسرا رخصت ہوا

کشتیٔ ملت چلی جاتی تھی جس کے ساتھ ساتھ ——— بحرِ جہد و عزم کا وہ ناخدا رخصت ہوا

ہو گئی افسردہ مہرِ حریت کی روشنی ——— اُف یہ کیسا "آفتابِ حق نما" رخصت ہوا

کارواں کے واسطے ایک ایک راہ شوق میں ——— چھوڑ کر اپنے وہ روشن نقشِ پا رخصت ہوا

جس سے ایوانِ سیاست لرزہ براندام تھا ——— وہ صداقت وہ حقیقت آشنا رخصت ہوا

ابتدائے جہد میں اک جان جس سے پڑ گئی ——— تھا جو خود اپنی جگہ اک انتہا رخصت ہوا

حفظِ رحمٰں پا گیا دامانِ رحمٰن و رحیم ——— جانبِ خلدِ بریں وہ پارسا رخصت ہوا

الغرض اختر فروغِ آدمیت جس سے تھا

آہ وہ انسانِ اخلاص و عطا رخصت ہوا



سرآمد روزگارے آں فقیرے

جنابہ حمیدہ سلطان صاحبہ انجمن ترقی اُردو، دہلی

”بولی اَمّاں محمد علیؑ کی
جان بیٹا خلافت پہ دیدو“

بجنور میں ایک بہت بڑا ہجوم ہماری کوٹھی کے سامنے کھڑا زور، زور سے گا رہا تھا۔ اور میں اپنے اور بھائیوں، بہنوں کے ساتھ گول کمرے کی کھڑکی سے اس ہجوم کو حیرت و شوق کی نظروں سے تک رہی تھی۔ کوٹھی کے دونوں پھاٹک بند تھے۔ مسلح سنتریوں کی پوری ٹولی پہرہ دے رہی تھی۔ ہجوم اب نعرے لگا رہا تھا:۔

”ٹوڈی بچہ ہائے ہائے۔ انگریز نوکر شاہی چھوڑ دو۔“

اور یہ ہنگامہ اس لئے تھا کہ ابّا جان بجنور کے سول سرجن تھے اور بجنور جیل بھی قاعدے کے مطابق ان کی نگرانی میں تھی۔

مولانا حفظ الرحمٰن اور غالباً حافظ محمد ابراہیم صاحب نیز کچھ اور سیاسی کارکن دو دن قبل بجنور جیل میں زیرِ حراست لے لئے گئے اور اس سلسلے میں ہماری کوٹھی کے سامنے اظہارِ ناراضگی کرتے ہوئے عوام پورے جوش و خروش سے مظاہرہ کر رہے تھے۔

میرے کان میں بی مغلانی کی آواز آئی۔ وہ والدہ صاحبہ سے کہہ رہی تھیں ”اے بی بی! یہ نگوڑے کیوں بیکار اُتسلم مچا رہے ہیں۔“

والدہ صاحبہ نے ٹھنڈا سانس لے کر کہا:۔

”بوا! کیا کہوں؟ مجھے تو خود اس کا افسوس ہے نہ جانے کیسے کیسے شریف لوگ ملک اور قوم کی خاطر قیدی دان بنے ہیں، مہینہ رمضان کا ہے۔ اور جو مسلمان ہوں گے، وہ اس گرمی میں روزے رکھ رہے ہوں گے۔ میں تو آج صاحب سے کہوں گی، کہ ان بیچاروں کو پنکھے اپنے پاس سے منگوا کر دیں۔ کورے گھڑوں اور سحری کے لئے دودھ کا انتظام بھی خود کر دیں۔“

یہ ۱۹۲۲ء کا ذکر ہے۔ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب خود فرماتے تھے کہ دودھ سحری کے لئے جو آپ کی والدہ نے مقرر کرایا تھا۔ وہ ٹھیکا ملتا تھا مگر یہ بھی غنیمت تھا کہ اس سے کچھ تسکین تو ہوتی تھی۔

مولانا صاحب نے یہ بھی فرمایا تھا کہ جیل کے احاطے میں کبھی کبھی انھوں نے اس زمانے میں مجھے اپنی آیا کے ساتھ گھومتے ہوئے دیکھا تھا۔

مولانا حفظ الرحمٰن کی سیاسی زندگی کے متعلق تو ان کے ساتھی اور سیاسی رہنما ہی لکھیں گے۔ میری بساط کیا ہے کہ جو اس عظیم انسان کی خدمات جلیلہ پر کچھ لکھوں، لیکن اتنا جانتی ہوں کہ مولانا کی طرح کے بہت کم قوم پرست ہوں گے جو عنفوانِ شباب میں ہی اپنے ملک کو غلامی سے آزاد کرانے کیلئے جان کی بازی لگا بیٹھے تھے۔ میں نے ہوش سنبھالنے کے بعد مولانا کو مسلم آزاد کانفرنس کے زمانے میں دیکھا۔ ہمارا قیام ان دنوں ۲۳۔ سر یام روڈ۔ سول لائن میں تھا۔ آکا بھائی[1] سے ملنے اور مشورے کرنے اکثر مولانا صاحب اُن دنوں تشریف لاتے تھے۔ مولانا کی رہائش جب قرول باغ میں تھی، مجھے کچھ ایسا شعور نہیں تھا کہ اُس وقت مولانا کے کاموں کی اہمیت سمجھ سکتی۔ ایک مذہبی رہنما سمجھ کر اُن سے عقیدت البتہ تھی میری واقفیت دراصل مولانا سے ۱۹۴۸ء سے ہوئی۔ اس زمانے میں دلّی، دلی والوں سے کافی خالی ہو چکی تھی اور جو لوگ یہاں رہ گئے تھے، وہ مایوس، غمزدہ، پریشان اور گھبرائے ہوئے تھے۔ مولانا حفظ الرحمٰن اگر اس وقت ان مصیبت زدوں کو سہارا نہ دیتے، دُکھے دلوں کے لئے آسرا نہ بن جاتے تو دلّی میں مسلمان جم نہیں سکتے تھے۔ مولانا کی پُر نور مُسکراتی ہوئی صورت اور مشفقانہ اندازِ گفتگو صبح سویرے سے رات گئے تک غمزدہ مایوس لوگوں کو ڈھارس بندھاتا رہتا تھا۔ وہ ایک ایسے مسیحا تھے جنھوں نے جاں بلب قوم کو از سرِ نو زندگی بخشی۔ اور جمہوری نظام کو بحال کرنے کے لئے ہر وقت کام کیا۔ دورے، ملاقاتیں۔ ٹیلیفون۔ تقریریں، یہاں اور وہاں، سوتے اور جاگتے کام ہی کام اور آرام کا نام نہیں۔ اس انتھک محنت نے اس غازی مرد کو آخر جامِ شہادت پینے پر مجبور کر دیا۔ اب کہ مولانا کا جسدِ خاکی ہمارے سامنے نہیں، اِنکے

---

[1] فخر الدین علی احمد۔

کام، ان کا جذبۂ عمل، ان کی خود اعتمادی یقیناً ہمارے لئے مشعل راہ رہنی چاہئے۔ انسان اگر چاہے تو اپنے عزم سے ہمت سے ہر مصیبت کو ختم کر سکتا ہے، مشکلات پر قابو پا لیتا ہے۔ مولانا نے مسلمانوں کو سکھایا کہ وہ کبھی مایوس نہ ہوں، کبھی اپنا دل چھوٹا نہ کریں۔ ہمت و حوصلہ سے کام لیں اور زمانے کو اپنے ساتھ ساز کرنے کے لئے مجبور کریں۔

۱۹۵۰ء سے مولانا حفظ الرحمٰن انجمن ترقی اردو شاخ دلی کی مجلس عاملہ میں شامل ہوئے۔ بارہ سال مجھے ان کے ساتھ کام کرنے کا فخر حاصل ہے۔ ان بارہ سالوں میں مولانا نے شاخ دلی کے لئے کیا کام کیا اور کس طرح اپنے مفید مشوروں سے ہماری رہنمائی کی۔ یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ میں تو ان کی اولوالعزمی اور کام کرنے کی بے پناہ طاقت پر حیران تھی۔ باوجود انتہائی مصروفیتوں کے انجمن کی مجلس عاملہ کی شاید ہی کوئی میٹنگ ایسی ہوگی جس میں مولانا تشریف نہ لائے ہوں۔ بیماری کے عالم میں بھی اکثر میٹنگ میں چلے آتے تھے۔ آخری میٹنگ مجلس عاملہ کی ۲۵ نومبر ۱۹۶۱ء کو انکی صدارت میں ہوئی۔ اس دن مولانا کا عالم یہ تھا کہ ان کو خاصا بخار تھا۔ کمبل لپیٹ کر آئے تھے۔ کھانسی دم بھر چین نہ لینے دیتی تھی۔ سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ ان کا یہ حال دیکھ کر میں گھبرا گئی اور عرض کیا:۔

"خدا کے لئے مولانا! آپ آرام کیجئے، اتنا بھی کام کیا کہ انسان اپنا بالکل خیال نہ کرے۔ اس حالت میں تشریف لاکر آپ نے اپنے اوپر ظلم کیا ہے۔ کام تو ہوتے ہی رہتے ہیں لیکن آپ کی زندگی ملک کا عزیز ترین سرمایہ ہے۔"

مولانا نے اپنے مخصوص انداز میں مسکرا کر فرمایا:۔

"ہاں، بھئی! ہاں، میں بھی سوچ رہا ہوں فرصت ملے تو کچھ دن آرام لے لوں۔ اب یہ الیکشن سر پر آگیا اس کے بعد میں ضرور آرام کروں گا۔"

پھر وہ اردو کے مسائل پر گفتگو فرمانے لگے اور اپنی بیماری کو اس طرح بھول گئے گویا وہ بیمار ہی نہیں۔ اس عالم خود فراموشی نے مولانا کو موت کے شکنجے میں قبل از وقت پھنسا دیا۔

مرکزی اردو کانفرنس دلی میں جو ہوئی یہ مولانا حفظ الرحمٰن کی بدولت ہی اتنی شان سے ہوئی۔ اس کانفرنس میں جو لوگ شامل تھے۔ شاید پھر کسی اور کانفرنس میں نہ ہو سکیں۔ حضرت مولانا ابوالکلام آزاد علیہ الرحمۃ کا آخری دیدار بہت سے اردو دوستوں نے جو باہر سے آئے ہوئے تھے اس کانفرنس میں کیا۔ اور ان کی وہ آخری تقریر دلپذیر بھی سنی جو حاصل کانفرنس تھی۔ اور اس دن بہت سے وہ لوگ جو مولانا آزاد کی ذات گرامی پر اعتراض کرتے تھے ان کا کلمہ پڑھنے لگے اور یہ شاندار کارنامہ مولانا حفظ الرحمٰن کا تھا۔ اگر دلی میں اردو کانفرنس نہ ہوتی تو اس طرح لوگ کیسے مولانا کو دیکھ سکتے تھے اور سن سکتے تھے۔ یوں تو بہت لوگ مجلس استقبالیہ میں شامل تھے اور ان میں سے اکثر ایسے عہدیدار اصحاب تھے جو اردو کی خیر خواہی کا دم اٹھتے بیٹھتے بھرتے رہتے ہیں۔ لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ اس عظیم الشان کانفرنس کے لئے چندے کی فراہمی کا بوجھ بہت زیادہ مولانا حفظ الرحمٰن پر پڑا۔

میں خود کو خوش نصیب سمجھتی ہوں کہ کئی سال تک مولانا کے ساتھ مل کر کام کرنے کا مجھے موقعہ ملا۔ جب بھی کوئی مشکل مسئلہ دلی شاخ کیلئے ہمارے سامنے آتا، مولانا کے ناخن تدبیر سے سلجھ جاتا۔

مولانا حفظ الرحمٰن کے لئے دلی شاخ کی طرف سے تعزیتی جلسہ ہوا تو مفتی عتیق الرحمٰن صاحب نے فرمایا:۔

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا حفظ الرحمٰن ابھی آئیں گے ایک دھواں دھار تقریر کریں گے۔ اپنے دلکش انداز بیان سے ہمیں نیا ولولہ اور ہمت کام کرنے کے لئے دیں گے۔"

میں بھی یہی محسوس کرتی ہوں کہ مولانا اس دنیا سے نہیں سدھارے، کہیں لمبے سفر میں حسب معمول گئے ہوئے ہیں۔ کچھ ہی دن بعد ان کی مسکراتی صورت ہمیں دیکھ کر اطمینان ہوگا۔ ان کے مفید مشورے الجھے مسائل کو سلجھا دینگے۔ وہ مجھے کچھ تنبیہ فرمائیں گے پھر مشفقانہ انداز میں زمانے کے نشیب و فراز بتائیں گے، اور اردو کے لئے کسی مخصوص نشست میں اس طرح بے دھڑک بولیں گے کہ جس سے اردو والوں کو نیا عزم ملے گا، دوست خوش ہوں گے اور مخالف ان کا منہ تک کر رہ جائیں گے۔ کاش! یہ میرا خیال صحیح ہوتا۔ مولانا اپنے لمبے سفر سے واپس آکر ہماری رہنمائی فرما سکتے۔ لیکن اب تو ان کی مقدس روح باری تعالیٰ کے حضور میں پہنچ گئی۔ مسلسل کام نے ان کو قبل از وقت ابدی آرام لینے پر مجبور کر دیا۔ بقول جگر ؎

دل کو سکون روح کو آرام آگیا

وہ اپنے دوست کے پاس پہنچ گئے۔ لیکن ان کا کام، ان کا جذبۂ ایثار و عمل ہمارے سامنے ہے۔ اس عالم میں بھی کہ مولانا چند دن کے مہمان تھے اور کمزوری کا عالم یہ تھا کہ چند منٹ بات کرنے سے تھک جاتے

تھے۔ ان کے پاس تری پورہ سے مسلمانوں کا وفد آیا، اور ان سے کہا کہ وہاں سے مسلمانوں کو نکالا جا رہا ہے، تو تڑپ گئے۔ مجھ سے اور انیس[1] باجی سے فرمایا "تری پورہ والوں کے لئے کچھ ہونا چاہیئے۔"

آسام کے بھائی[2] آسام سے آئے، مزاج پرسی کیلئے گئے، تو ان سے بھی بہ اصرار کہا ——— کہ "ان مظلوموں کی مدد کیجئے۔"

معاملہ چونکہ بنگال کا تھا، اس لئے انھوں نے کہا "مولانا! یہ کام تو مرکزی حکومت ہی کر سکتی ہے۔ ہم لوگ مجبور ہیں۔"

آخری مرتبہ میں ان کی خدمت میں وفات سے چار دن قبل حاضر ہوئی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی فرمایا "آپ اچھی ہیں؟"

میں نے عرض کیا "مولانا! میں تو ٹھیک ہی ہوں آپ کی علالت نے البتہ ہم سب کو فکر مند کر دیا ہے۔ خدا آپ کو صحت دے۔

مسکرا کر خاموش ہو گئے، اسی وقت ڈاکٹر سید محمود اور حافظ محمد ابراہیم صاحب تشریف لے آئے۔

حافظ صاحب سے مولانا نے فرمایا "میرے کشمیر جانے کا جلدی انتظام کرا دیجئے۔"

اس کے چار دن بعد بجائے جنتِ ارضی کے مولانا جنت الفردوس سدھار گئے ——— لیکن اُن کی روح اب بھی یقیناً اپنی قوم و ملک کے لئے بے چین ہو گی۔

[1] بیگم انیس قدوائی [2] فخرالدین علی احمد وزیر مال آسام

زبیر فاروقی جونپوری

مرنے والے تری ہر ایک ادا پر شاہد سرزمینِ وطنِ ہند کا ہر ذرّہ ہے
ہو گیا تیرا فدائی وہ ہمیشہ کے لئے تیری پُر سحر نگاہوں نے جسے دیکھا ہے

تیرے احساس نے بخشی تھی تجھے روحِ عمل تو نے باطل کے سہاروں کو گوارا نہ کیا
تیز دھاروں سے عزائم ترے لڑتے ہی رہے تو نے خوابیدہ کناروں کو گوارا نہ کیا

مرنے والے ترے اوصاف کہاں سے لاؤں بات جو تجھ میں تھی اوروں میں کہاں ملتی ہے
زور جو تیری زباں میں تھا کہیں اور نہیں پختگی تیرے ارادوں کی کہاں ملتی ہے

چاہنے والے ترے، جاننے والے تیرے اب کہاں جائیں علاجِ غمِ دوراں کے لئے
اٹھ گئے جو ارباب معانی وہ اُٹھے جاتے ہیں بد نصیبی ہے یہ اس دور کے انساں کے لئے



مجاہد ہے سویا ہوا آج رن میں

از مولانا ابوالحسن حیدری الحسینی — الہ آباد

وہی جس نے توڑا غلامی کا بندھن
وہی جس کو کہتے ہیں، سب مردِ آہن
وہی جس سے اسلام کا نام روشن
چھپائے ہوئے منہ کو اپنے کفن میں
مجاہد ہے سویا ہوا آج رن میں

جو تھا ٹوٹی کشتی کا طوفاں میں ساحل
جو بھارت میں تھا رہبر راہ منزل
اُجالی تھی ایمان کی جس سے محفل
شریعت کا وہ چاند آیا گہن میں
مجاہد ہے سویا ہوا آج رن میں

ہزاروں ہیں طوفاں نہیں ہے کنارا
کہاں بے سہاروں کا کوئی سہارا
نہیں وہ تو کوئی نہیں ہے ہمارا
اُداسی اُداسی ہے، ہر انجمن میں
مجاہد ہے سویا ہوا آج رن میں

جو سوئے تھے غافل انھیں یوں جگایا
کہ کھا کھا کے زخم آدمی مسکرایا
نہ خطروں سے اس کو کبھی خوف آیا
خود آیا ہوا دام و دار و رسن میں
مجاہد ہے سویا ہوا آج رن میں

پڑھائے گا اب کون درسِ اخوت
ہوئی وقت سے پہلے افسوس رحلت
بہاروں میں بھی ہے وطن کی یہ حالت
خزاں جیسے آئی ہوئی ہو چمن میں
مجاہد ہے سویا ہوا آج رن میں

وہ ہمت برابر جو آفت سے کھیلی
ہماری بلا اپنے سر بڑھ کے لے لی
مصیبت ہمارے لئے کتنی جھیلی
کمی پھر بھی آئی نہ کچھ بانکپن میں
مجاہد ہے سویا ہوا آج رن میں



مجاہدِ ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی

ایک مصنف کی حیثیت سے

از مولانا قاضی زین العابدین صاحب سجاد میرٹھی

یوں تو قرآن کریم کو خدا کی آخری کتاب اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو آخری نبی تسلیم کرنے کا منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہی ہے کہ اسلام تاریخ عالم کے ہر موڑ پر بہترین رہنما ہے اور اسلام کی تعلیمات سیاسی اقتصادی و معاشی انقلابات کی اندھیریوں کے ہر طوفان میں شمع فروزاں بن کر انسانیت کے قافلہ کو منزل مقصود تک پہنچانے کی ضامن ہیں۔ مگر ظاہر ہے کہ یہ ایک عقیدہ ہے جسے ایک مسلمان اپنے سینے سے لگا کر اپنی انفرادی حیثیت میں اپنی نجات کا وسیلہ بنا سکتا ہے۔ جب اسے دنیا کے سامنے دعوٰی کی صورت میں پیش کیا جائے گا تو اس کا ثبوت بھی پیش کرنا ہوگا۔

سائنس کے اس دور میں جب کسی بات کی واقعیت اور صحت کو تسلیم کرنے کے لئے اس کا مشاہدہ میں آجانا ضروری سمجھا جاتا ہے یہاں تک کہ خدا ملائکہ اور عالم غیب کے دوسرے حقائق کا بھی اس لئے انکار کر دیا جاتا ہے کہ خوردبینوں اور دوربینوں سے ابھی تک ان کا نظارہ نہیں کیا جا سکا، یہ کس طرح ممکن ہے کہ آپ یہ دعوٰی کرتے رہیں کہ اسلام ہر زمانہ میں دین و دنیا کی صلاح و فلاح کا بہترین ضامن ہے مگر نہ دنیا کے نقشہ پر انگلی رکھ کر آنکھوں سے مشاہدہ کرا سکیں کہ اس ملک میں اسلام کا نظام جاری ہے اور یہاں سیاسیات، اقتصادیات و اجتماعیات کے جو نظریات بروئے کار لائے جا رہے ہیں انھوں نے اس ملک کو رشک جنت بنا دیا ہے اور اس سے نیچے اتر کر یہ سمجھا بھی سکیں کہ اگرچہ مسلمانوں کی بدقسمتی سے اس وقت اسلام کی جامعیت و کاملیت و کفایت کا کوئی عملی نمونہ ہم پیش نہیں کر سکتے۔ مگر جہاں تک دلائل و براہین علمیہ کا تعلق ہے ہم یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ اگر دنیا آج محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پرچم کے نیچے آجائے اور اسلام کے بنائے ہوئے نقشہ پر اس کی تعمیر کی جائے تو وہ طبقاتی و نسلی و لسانی جھگڑوں سے نجات پا سکتی ہے اور انسان اپنی اجتماعی و انفرادی زندگی میں امن و اطمینان کی دولت سے بہرہ اندوز ہو سکتا ہے۔

شاہ ولی اللہ دہلویؒ

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ بھی ایک معجزہ ہے کہ گذشتہ تیرہ صدیوں میں جب بھی دنیا کسی اہم انقلاب سے دوچار ہوئی، امت محمدیہ کی صفوں میں سے کوئی نہ کوئی اللہ کا بندہ اٹھا اور اس نے کتاب و سنت کی مشعل روشن کر کے ضروریات وقت کی پیچ در پیچ وادیوں میں انسانیت کے قافلہ کو منزل مقصود کا راستہ دکھایا۔ ان میں سے بعض مجددیت کے منصب رفیع پر فائز ہوئے اور بعض نے یہ مقام بلند تو نہ پایا، مگر ان کے نقش قدم پر چلے اور ان کے شروع کئے ہوئے کام کو انجام تک پہنچایا۔

آج سے دو صدی قبل جب ہندوستان میں مسلم حکومت کا چراغ گل ہو رہا تھا۔ کفر و شرک و بدعت کی اندھیریاں ہر طرف چھا رہی تھیں مسلمانوں کی اخلاقی و معاشرتی زندگی دم توڑ رہی تھی، کفر و اسلام کے اختلاط سے فرق باطلہ کے نئے نئے بھیانک چہرے نمودار ہو رہے تھے دوسری طرف یورپ میں علوم جدیدہ کا غلغلہ بلند ہو رہا تھا، فلسفہ و منطق و نفسیات و معاشیات و سیاسیات کی بنیادیں نئے انداز پر اٹھائی جا رہی تھیں، تحقیقات و انکشافات جدیدہ نے پرانے نظریات کی دنیا میں ہلچل ڈال دی تھی۔ ان علوم و فنون جدیدہ کی بنیادوں پر نئے نظام فکر و عمل مرتب ہو رہے تھے جنھوں نے آگے چل کر دنیا کا نقشہ ہی بدل دیا۔

ایسے وقت میں شاہ ولی اللہ دہلوی (م ۱۱۷۶ھ) جیسا بالغ نظر حکیم الاسلام پیدا ہوا جس نے ان خارجی و داخلی فتنوں کا گہری نگاہ سے جائزہ لیا۔ پھر اپنی خدا داد فراست سے کام لے کر ملت کے ایک

ایک مرض کی نشاندہی کی اور اس کا علاج کتاب الٰہی کی کتاب شفا سے تجویز کیا۔

دوسری طرف حضرت شاہ صاحب نے اسلام کے اعتقادی اخلاقی اجتماعی اور فقہی نظام کو فلسفیانہ انداز میں پیش کیا اور ہر عقل سلیم پر اللہ تعالےٰ کی "حجۃ بالغہ" پوری کر دی۔

شاہ صاحب کے پیش کئے ہوئے اسلام کے اس نقشہ کو سامنے رکھکر آج بھی اسلام کو ایک متحرک اور زمانہ حاضر کے مطالبات کو پورا کرنے والا مذہب ثابت کرنا مشکل نہیں ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ کے بعد اُن کے شروع کئے ہوئے کام کی تکمیل اپنے اپنے انداز پر اُن کے علمی خانوادہ کے دوسرے محترم ارکان نے کی جن میں حضرت شاہ عبدالعزیزؒ محدث دہلوی' مولانا شاہ عبدالقادر مولانا شاہ محمد اسمٰعیل شہید اور مولانا شاہ محمد اسحاق صاحب رحمہم اللہ تعالےٰ ممتاز ہیں۔

مولانا محمد قاسم نانوتوی

حضرت شاہ صاحب کے تقریباً ایک صدی بعد' وہ گھٹائیں برس چکی تھیں جو شاہ صاحب کے زمانہ میں اُفق مغرب سے اٹھی تھیں۔ انگریزی حکومت کا آفتاب طلوع ہو رہا تھا۔ اسلامی اقتدار کا ٹمٹماتا ہوا چراغ گل ہو چکا تھا۔ ہندوستانیوں کے جسموں کو برطانوی سنگینوں نے فتح کر لیا تھا' مگر دل و دماغ ابھی ان کی گرفت میں نہ آئے تھے۔ ان حالات میں اپنے اقتدار کی بنیادیں مستحکم کرنے کے لئے مدبرینِ انگلستان نے یہ تدبیر سوچی کہ ہندوستانیوں کو عیسائی بنا لیا جائے۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے عیسائی مشنریوں کی کھیپ کی کھیپ انگلستان سے ہندوستان آنے لگی اور جگہ جگہ مناظروں اور مباحثوں کے جلسے رچانے لگی۔ ان مشنریوں نے صرف تعلیماتِ اسلام ہی کو اعتراضات کا ہدف نہیں بنایا بلکہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اطہر پر بھی ہر قسم کی گندگی اُچھالی گئی۔ عیسائی مشنریوں کی پشت پر حکومت کی پوری طاقت ہوتی تھی اور صوبوں کے گورنر تک ان کی ہر قسم کی مدد کرتے تھے۔ چنانچہ سر ولیم میور نے اپنی مشہور کتاب لائف آف محمدؐ (Life of Mohammed) ایک پادری ہی کی فرمائش پر لکھی۔

عیسائیوں کی دیکھا دیکھی برادرانِ وطن کے ایک گروہ نے جس نے ۵۷ء کے بعد ہندو دھرم کی تجدید کا بیڑا اُٹھایا تھا اسلام پر حملے شروع کر دیئے۔

تاریخ کے اس نازک دور میں حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ (م ۱۲۹۷ھ) میدان میں اُترے اور آپ نے فریضۂ جہاد و تجدید انجام دیا۔ آپ نے جہاد بالسیف اور جہاد باللسان والقلم کے دوگونہ فرائض ادا کئے معرکۂ شاملی میں آپ نے انگریزی فوجوں کا مسلح مقابلہ کیا اور شاہجہان پور اور دوسرے مقامات پر مذہبی معرکوں میں اسلام کا اس قوت سے دفاع کیا کہ مخالفین کے منہ پھیر دیئے۔

آپ نے اپنے مشن کو مستقل طور پر جاری رکھنے کے لئے ۱۲۸۳ھ میں دارالعلوم دیوبند کی بنیاد ڈالی۔ ایشیا کی یہ سب سے بڑی دینی اسلامی درسگاہ بیک وقت مجاہدینِ ملت کا مضبوط قلعہ بنی رہی اور اسلامی علوم و فنون کا گہوارہ اور اسلامی ثقافت و روحانیت کا سرچشمہ بھی۔ دارالعلوم دیوبند نے گذشتہ سو سال میں جو فضلا پیدا کئے اُن میں سے اکثر نے بانی دارالعلوم کے اُسوہ کی تقلید میں سیاسی و دینی دونوں محاذوں پر کام کیا۔ ان میں شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن اور اُن کے ارشد تلامذہ مولانا عبیداللہ سندھی مولانا مفتی محمد کفایت اللہ اور مولانا حسین احمد مدنی رحمہم اللہ تعالےٰ بہت ممتاز ہیں۔

مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی

مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے تلامذہ کے تیسرے سلسلہ میں دیوبند کی بساط سے جو اصحاب علم و قلم اٹھے ان میں مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کا نام سرِعنوان ہے۔ مولانا مرحوم میں اپنے بزرگوں کے دونوں رنگ موجود تھے۔

آزادیٔ وطن کے سلسلہ میں ان کی خدمات کا ذکر سورج کو آئینہ دکھانا ہے۔ برطانوی حکومت کی قہرمانی کے خلاف جس جرأت و بے باکی کے ساتھ انھوں نے کلمۂ حق بلند کیا اور اس کی پاداش میں قید و بند کی جیسی سختیاں برداشت کیں وہ تاریخ آزادیٔ وطن کا سنہری باب ہیں۔ وطن عزیز کی آزادی کے بعد بھی انہیں چین سے بیٹھنا نصیب نہیں ہوا' وہ مرتے دم تک ان اصولوں کی خاطر جنگ کرتے رہے جنہیں تحریک آزادیٔ وطن کے رہنماؤں نے اپنی تحریک کا عنوان بنایا تھا اور اس جرم کی پاداش میں ہندوستان کی فرقہ پرست جماعتوں کی لعن طعن کا ہدف بنے رہے۔

مولانا کی زندگی کا یہ رُخ اُن کے دوسرے اوصاف و کمالات میں خصوصی حیثیت رکھتا تھا اس لئے عوام و خواص میں وہ "مجاہدِ ملت" کے لقب سے

مشہور ہوئے۔ مجھے مولانا کی زندگی کے اس پہلو سے بحث کرنا نہیں، یہ کام دوسرے اہل قلم انجام دے چکے اور دیں گے، تاہم یہ عرض کرتا چلوں کہ ہندوستان کے ممتاز نقاد اور بلند پایہ مورخ، ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب نے مولانا کی وفات کے دن مولانا کے فضائل کا ذکر کرتے ہوئے احقر کو مخاطب کر کے فرمایا

"میری نظر ہندوستان کی گزشتہ نصف صدی کی سیاسی تاریخ پر ہے، میری رائے میں اس طویل مدت میں مسلمانانِ ہند پر کوئی عظیم شخصیت اس قدر اثر انداز نہیں ہوئی جس قدر مولانا حفظ الرحمٰن کی۔"

مجھے اس وقت مولانا کی زندگی کے اس پہلو پر ایک سرسری نظر ڈالنی ہے جو دب کر رہ گیا ہے۔ یعنی مولانا کی زندگی کا تصنیفی پہلو۔

دیوبند اور ڈابھیل کی تعلیمی زندگی

مولانا حفظ الرحمٰن جب دیوبند آئے تو اس وقت یہ گلستانِ علم حضرت الاستاذ علامہ انور شاہ کاشمیریؒ کے نغموں سے گونج رہا تھا۔ دیوبند کے قدیم اساتذہ کا یہ طریقہ تھا کہ وہ طلبہ کی صلاحیتوں پر گہری نظر رکھتے تھے اور جسے جوہر قابل سمجھتے تھے اسے چمکانے اور جگمگانے کی کوشش کرتے تھے۔ علامہ کشمیری کی نگاہِ انتخاب نے جلد ہی مولانا کو اپنی آغوش میں لیلیا اور مولانا علامہ کشمیری کے منظور نظر طلبہ میں شامل ہو گئے۔

ہم طلبہ کو مولانا کے اس تقرب کا اندازہ اس وقت ہوا جب حضرتؒ نے بحیثیت صدر جمعیۃ علماء ہند، اجلاس پشاور میں فارسی زبان میں خطبہ پڑھا اور اس کی اردو ترجمانی کا فرض اپنے اس ہونہار شاگرد کے کاندھوں پر ڈالا۔

اس کے بعد جب سنہ ۲۸ء میں دیوبند میں دارالعلوم کے انتظامی امور پر کشمکش ہوئی اور حضرت علامہ کشمیریؒ، مفتی اعظم حضرت مولانا عزیز الرحمٰن دیوبندی اور حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی نے دیوبند چھوڑ کر ڈابھیل جانے کا فیصلہ کر لیا تو اس وقت ان بزرگوں کے ساتھ جن لوگوں نے رخت سفر باندھا ان میں مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی (صاحب فیض الباری) مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب دیوبندی، مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی کے علاوہ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی بھی تھے۔ علامہ کشمیری کے یہ تلامذہ خاص اس وقتِ مدرسین کے زمرہ میں شامل ہو چکے تھے۔

ڈابھیل کے گوشہ عزلت میں بیٹھ کر مولانا حفظ الرحمٰن اور ان کے رفقاء کو حضرت شاہ صاحب اور علامہ عثمانی رحمہما اللہ تعالیٰ کے فیض صحبت سے مستفیض ہونے کا بڑا موقعہ ملا اور اس زمانہ میں یہ شیشے جلا پاکر آئینہ بن گئے۔

کچھ عرصہ بعد ڈابھیل کی یہ مجلس علمی منتشر ہو گئی اور پھر غالباً مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کو درس و تدریس کی بساط پر بیٹھنے کا موقعہ نہ ملا۔ مگر اب مولانا نے اپنی علمی سرگرمیوں کے لئے تحریر کا میدان انتخاب کیا۔

ندوۃ المصنفین کا تصنیفی دور

سنہ ۳۸ء میں فضلاء دیوبند کی اس نوجوان پارٹی نے قرول باغ میں 'ندوۃ المصنفین' کے نام سے ایک تصنیفی و تالیفی ادارہ قائم کیا۔ فضلاء دیوبند کے متعلق بعض حلقوں میں کہا جاتا تھا کہ وہ میدان تحریر میں پس ماندہ ہیں۔ درس و تدریس اور وعظ و تقریر کے ہی مرد میدان ہیں یہ اعتراض اس لحاظ سے تو غلط تھا کہ بعض فضلاء دیوبند کا تنہا تصنیفی و تالیفی کام بڑے بڑے اداروں کے کام پر بھاری ہے۔ مگر اس پہلو سے یہ نکتہ چینی درست تھی کہ اکابر دیوبند کی سرپرستی میں کوئی اجتماعی کام اس سلسلہ میں نہیں ہوا تھا۔

'ندوۃ المصنفین' کے قیام سے دارالعلوم دیوبند کی علمی و دینی خدمات کا یہ پہلو بھی نمایاں ہو کر سامنے آ گیا۔

بہر حال 'ندوۃ المصنفین' قائم ہوا اور حضرت حجۃ الاسلام شاہ ولی اللہ دہلوی اور حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہما اللہ تعالیٰ کے انداز فکر و نظر پر وقت کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اسلام کے احکام کی تشریح و تعبیر اور مستشرقین مغرب و ریسرچ ورک کے پردہ میں اسلامی علوم و روایات اور اسلامی تہذیب و تمدن پر جو ناروا حملے کرتے رہتے ہیں ان کی مدلل تردید اس کا مقصد قرار پایا۔

مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی اس مجلس کے رفیق اعلیٰ اور مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب ناظم، اور مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی، مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی اور مولانا حامد الانصاری غازی کے ساتھ ساتھ اس خاکسار کو بھی رفاقت کی عزت حاصل ہوئی۔ مولانا سیوہاروی کو اس زمانہ میں مجھے بہت قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا اور ان کی علمی و عملی صلاحیتوں کا خوب اندازہ ہوا۔

مولانا کا قیام اس زمانہ میں 'ندوۃ المصنفین' کے دفتر کے قریب ہی شیدی پورہ کے ایک مکان میں تھا۔ متعلقین بھی ساتھ ہی رہتے تھے۔ مولانا صبح و شام باقاعدگی کے ساتھ دفتر میں آتے تھے۔

'ندوۃ المصنفین' کا دفتر فیض روڈ (قرول باغ) پر ایک چھوٹی سی خوبصورت کوٹھی میں تھا۔ کوٹھی کے ہال میں بالکل وسط میں ایک خوشنما قالین پر ایک خوبصورت ڈیسک لگا رہتا تھا۔ یہ مولانا کی نشست گاہ تھی۔ اس کے دونوں پہلوؤں میں دوسرے رفقا کی نشستیں تھیں۔ ہال میں چاروں طرف دیوار سے لگی ہوئی شاندار الماریاں کھڑی تھیں۔ قیمتی اور نادر کتابیں جن کی جلدوں کے سیاہ پشتوں پر سنہری حروف میں اُن کے ناموں کے ٹھپے جگمگاتے تھے، الماریوں کے شفاف شیشوں میں سے جھانک کر اصحاب ذوق کو دعوت نظارہ دیتی تھیں۔ مولانا اپنے مقررہ اوقات پر تشریف لاتے۔ اپنی کھدر کی صاف ستھری شیروانی اُتار کر کھونٹی پر ٹانگ دیتے، اپنی نشست پر جاتے اور ضرورت کی کتابیں ادھر ادھر پھیلا کر اپنے کام میں مصروف ہو جاتے۔

کچھ عرصہ بعد (۱۹۴۵ء میں) تو مولانا کے کاندھوں پر جمعیۃ علماء ہند کے ناظم اعلیٰ کے منصب جلیل کی گرانبار ذمہ داریاں پڑ گئی تھیں۔ مگر اس سے پہلے بھی وہ جمعیۃ علماء ہند کے صف اول کے لیڈر اور مجالس دینی کے سحر بیان خطیب ہونے کی حیثیت سے ہندوستان گیر شہرت و عظمت حاصل کر چکے تھے اس لئے مولانا کو دور دراز شہروں کے سفر بھی کرنا پڑتے تھے اور قیام کے زمانہ میں باہر سے آنے والے احباب و معتقدین ملنے کے لئے بھی برابر آتے رہتے تھے۔ کام کے ساتھ ساتھ یہ ملاقاتیں جاری رہتی تھیں۔ اسی طرح سفر کے دوران میں تصنیفی کام بھی جاری رہتا تھا مولانا کے دوسرے اسباب کے ساتھ کتابیں بھی ضروری سامان سفر کی حیثیت سے ساتھ جاتی تھیں۔

مولانا نے اسی "خلوت در انجمن" میں "قصص القرآن" اور "اسلام کا اقتصادی نظام" جیسی معرکۃ الآرا علمی تحقیقی کتابیں لکھیں جن پر اردو لٹریچر ہمیشہ نازاں رہے گا۔ اس مختصر گنجائش میں مولانا کی بلند پایہ تصنیفات پر سرسری نظر ڈالنا چاہتا ہوں۔

قصص القرآن

معاندین اسلام کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ وحی الٰہی کے اس ماہ تاباں پر جو چودہ سو سال سے آسمان صداقت پر جگمگا رہا ہے کسی طرح خاک ڈال سکیں اور اس کی حقانیت کے چشمۂ صافی کو اپنی کھوکھلی اندازی سے گدلا کر کے اپنی عداوت کی پیاس بجھا سکیں۔ اسلام کے نکھرے اور ستھرے عقائد روح پرور اور نظر افروز عبادات اور دلکش و دلآویز اخلاق کو تو ہدف اعتراض بنانا ذرا مشکل ہوتا ہے۔ اگرچہ اُن کی یہ کوششیں بھی ہمیشہ جاری رہی ہیں۔ مگر قرآن کریم کی حقانیت کو مشکوک کرنے کا ایک سہل طریقہ انھوں نے یہ بھی نکالا ہے کہ قرآن کریم کے بیان کردہ قصص و واقعات کو جدید تاریخی تحقیقات اور انکشافات کی آڑ میں غلط یا بے اصل ثابت کر دیا جائے۔

اُن کی یہ کوشش اس لئے بھی ضروری تھی کہ قرآن کریم بیان قصص میں جا بجا توریت و انجیل سے اختلاف کرتا ہے اور انبیاء کرام کی مقدس زندگیوں کو جن معصیتوں سے ان کتب مقدسہ محرفہ میں ملوث کیا گیا ہے ان سے ان کے دامانِ عصمت کو پاک قرار دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ قرآن کریم کوئی تاریخ کی کتاب نہیں ہے۔ اس میں ملل و اقوام کے عروج و زوال کے جو واقعات اور اہل حق اور اصحاب باطل کے جو قصص و حکایات بیان کئے گئے ہیں اُن کا مقصد محض تذکیر و موعظت ہے۔ تاہم جو واقعہ جس طرح کتاب الٰہی میں آ گیا ہے اس کا ایک ایک حرف صحیح ہے اور اس زمانہ میں علماء اسلام کی ایک ذمہ داری یہ بھی ہے کہ وہ ان واقعات کی صحت کو معترضین کے جدید تاریخی و جغرافیائی مسلمات کی روشنی میں ثابت کریں۔

مصر میں رشید رضا مصریؒ نے اپنی تفسیر "المنار" میں اور ہندوستان میں مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے 'ترجمان القرآن' میں ان گوشوں پر قلم اُٹھایا ہے اور بعض بعض مقامات پر تحقیق کا حق ادا کر دیا ہے مگر بدقسمتی سے یہ دونوں تفسیریں نصف قرآن سے آگے نہ بڑھ سکیں۔ پھر جو کچھ ان میں ہے وہ ضمنی مباحث کے طور پر ہے۔ ضرورت تھی کہ "قصص القرآن" کو موضوع بنا کر قرآن کریم کے تمام قصص و واقعات پر تحقیق و تنقید کی نظر ڈالی جائے اور قرآن کریم کے روشن چہرہ سے معترضین کی اڑائی ہوئی ہر گرد کو صاف کر دیا جائے۔ اس موضوع پر سب سے پہلے تو علامہ عبدالوہاب النجار مصری نے قلم اٹھایا اور "قصص الانبیاء" کے نام سے ایک متوسط درجہ کی کتاب مرتب کی۔ یہ دراصل ان کے ان لکچروں کی کتابی صورت تھی جو انھوں نے ۱۹۳۰ء اور ۱۹۳۱ء میں جامع ازہر کے قسم تخصص کے طلبہ کو دیتے تھے۔

علامہ نجارؒ کا یہ علمی کام خاصہ اہم ہے مگر بہرحال 'نقش اول' ہی کی حیثیت رکھتا ہے۔ یوں تو اس کتاب میں صرف انبیاء کرام ہی کے واقعات سے تعرض کیا گیا ہے۔ تمام قصص قرآنی سے بحث نہیں کی گئی۔ دوم اس

کتاب میں بحث و نظر کا دائرہ بہرحال محدود ہے۔ ساری کتاب (تیسرا ایڈیشن) ۷۶۴ بڑی تقطیع کے صفحات پر مشتمل ہے۔

مصر میں اس موضوع پر ایک اور کتاب مولانا یک جاد کے قلم سے قصص القرآن کے نام سے بھی شائع ہوئی ہے۔ مگر یہ کتاب صرف ادبی حیثیت رکھتی ہے علمی و تحقیقی قطعاً نہیں۔

مولانا حفظ الرحمٰن نے اس وادی میں قدم رکھا اور "قصص القرآن" کے نام سے اسے باغ و بہار بنا دیا۔ انشاء اللہ تعالیٰ مولانا کی نجات کے لئے ان کی یہ قرآنی خدمت کافی ہے۔

کتاب بے حد مقبول ہوئی اور مصنف کی محنت آخرت ہی میں نہیں، دنیا میں بھی مشکور ہوئی۔ خود مصنف رح نے اپنی اس محنت کو سرسبز ہوتے دنیا میں دیکھا اور اب انشاء اللہ تعالیٰ باغ جنت میں اس کے ثمرات سے متمتع ہو رہے ہوں گے۔

مولینا کتاب کے تیسرے حصہ کے مقدمہ میں ارقام فرماتے ہیں:۔

"قصص القرآن کا یہ تیسرا حصہ ہدیہ ناظرین ہے۔ پہلے
اور دوسرے حصہ کی افادیت اور قدیم و جدید علمی طبقوں
میں ان کی مقبولیت، خدائے برتر کا وہ فضل و کرم ہے
جس کے اظہار شکر کے لئے میرے قلم و زبان دونوں قاصر ہیں"

حقیقت یہ ہے کہ قصص القرآن کی اس جدید ترتیب و تدوین کے ساتھ اہل علم کا شغف، مصنف کی محنت و کاوش کا نتیجہ نہیں، بلکہ قرآن عزیز کی برکت و عظمت کا ثمرہ ہے۔ مسلمانوں کا کلام الٰہی کے ساتھ والہانہ ذوق اگر اس محنت کو مفید اور پسندیدہ سمجھتا اور اس کاوش کو بنظر استحسان دیکھتا ہے تو فالحمد للّٰہ علیٰ ذٰلک و ذٰلک فضل اللّٰہ یوتیہ من یشاء۔

قصص القرآن کے چار حصے ہیں اور پوری کتاب بڑی تقطیع کے ۱۴۸۰ صفحات میں سمائی ہے۔ مختلف حصوں کی تقسیم اس طرح ہے۔

حصہ اوّل:۔ حضرت آدم علیہ السلام سے حضرت موسیٰ علیہ السلام تک تمام انبیاء کرام کے حالات و واقعات

حصہ دوم:۔ حضرت یوشعؑ سے حضرت یحییٰؑ تک تمام پیغمبروں کے مکمل سوانح حیات اور ان کی دعوت حق کی محققانہ تشریح و تفسیر

حصہ سوم:۔ بعض انبیاء کرام کے سوانح زندگی کے علاوہ دیگر قصص قرآنی، اصحاب الکہف والرقیم، اصحاب القریہ، اصحاب السبت اصحاب الرس، بیت المقدس اور قوم یہود، اصحاب الاخدود، اصحاب الفیل اصحاب الجنۃ، ذوالقرنین، سد سکندری، سبا اور سیل عرم وغیرہ کا مورخانہ و محققانہ انداز میں بیان۔

حصہ چہارم:۔ حضرت عیسیٰؑ اور خاتم الانبیا علیہما الصلوٰۃ والسلام کی مقدس سیرتوں کا بیان اور قرآن کریم کی روشنی میں اہم مباحث پر تبصرے۔

کتاب کا انداز ترتیب اور اس کی خصوصیات تالیف یہ ہیں:۔

(۱) بیان واقعات میں قرآن کریم کی تصریحات کو بنیاد و اساس قرار دیا گیا ہے۔ پھر صحیح احادیث اور معتبر تاریخی روایات سے ان کی تشریح و توضیح کی گئی ہے۔

(۲) اہل کتاب کی کتب مقدسہ یا مغربی مورخین کی تحقیقات جدیدہ اور قرآن کریم میں جہاں تعارض نظر آیا ہے وہاں یا دلائل واضحہ سے دونوں کے درمیان تطبیق کی گئی ہے یا براہین قطعیہ سے قرآن کریم کی صداقت کو ثابت کیا گیا ہے۔

(۳) اسرائیلی روایات کی خرافات اور معاندین اسلام کی باطلیت کو حقائق مسلمہ کی روشنی میں واضح کیا گیا ہے

(۴) تفسیری، حدیثی اور تاریخی مطالب و مباحث میں حتی الوسع سلف صالحین کے مسلک قدیم کو نہیں چھوڑا گیا اور آزادی فکر و رائے کے گھوڑے نہیں دوڑائے گئے۔

حقیقت یہ ہے کہ قصص القرآن کی یہ آخری خصوصیت کتاب کی روح ہے اور اس کا وہ امتیاز ہے جو سے دوسرے جدید مصنفین اسلام کی کتابوں سے ممتاز کرتا ہے۔

ہندوستان اور مصر میں جن اہل علم و قلم نے جدید معترضین اسلام کے رد میں قلم اٹھایا ہے اور قرآن کریم کے چہرہ روشن سے اُن کے اڑائے ہوئے گرد و غبار کو صاف کرنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے بعض مواقع پر اس کے خد و خال کو ہی بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔ حدیث صحیح حتیٰ کہ احادیث بخاری کی بھی اُن کے ہاں خاص اہمیت نہیں۔ ان کا جچا تلا جواب ایسے مواقع پر یہ ہوتا ہے کہ

" ایک روایت پر صحت کی کتنی ہی مہریں لگ چکی ہوں لیکن
بہرحال غیر معصوم انسانوں کی ایک شہادت اور غیر معصوم
ناقدوں کا ایک فیصلہ ہے۔ ایسا فیصلہ ہر بات کے لئے مفید

حجت ہو سکتا ہے مگر یقینیات وقطعیات کے خلاف نہیں ہو سکتا۔"

پھر وہ "یقینیات وقطعیات" سے اپنا فہم اور اپنی تعبیر وتفسیر مراد لے کر ہر روایت صحیحہ کو رد کر دیتے ہیں۔

بے شک اس طرح وہ معترضین اسلام کے بعض حملوں کا دفاع کر دیتے ہیں اور ان کا یہ فعل بڑا مخلصانہ اور ہمدردانہ ہوتا ہے، مگر اس کا ایک خطرناک نتیجہ یہ نکل رہا ہے کہ خود مدعیان اسلام میں ایسے گروہ پیدا ہو گئے ہیں جنھوں نے اپنی فاسقانہ زندگی پر اس اصول سے قرآن کریم کی مہر تصدیق ثبت کر لی ہے اور احادیث صحیحہ کو جو اسلامی زندگی کی تشکیل کرتی ہیں نا قابل اعتبار قرار دیکر اس کی جکڑ بند سے آزاد ہو گئے ہیں۔

مولانا سیوہاروی، مولانا ابو الکلام آزاد کو اپنا سیاسی رہنما سمجھتے تھے اور ان کے علمی وادبی کارناموں کا بڑا احترام کرتے تھے۔ مگر سلف صالحین اور قدمار مفسرین کی تصریحات کے مقابلہ میں ان کی تحقیقات جدیدہ کو اس وقت تک قبول کرنے کے لئے تیار نہ ہوتے تھے جب تک اسے علم وتحقیق کے کانٹے میں تول نہ لیں۔ مولانا آزاد نے ترجمان القرآن میں ذو القرنین کی شخصیت اور سد یاجوج وماجوج کے تعین کے سلسلہ میں جو معرکۃ الآرا بحث کی ہے اس کا جائزہ لیتے ہوئے مولانا سیوہاروی لکھتے ہیں:۔

> " تفسیری مطالب کے سلسلہ میں ہم کو موصوف کے ساتھ شدید اختلاف بھی رہتا ہے اور اتفاق بھی۔ لیکن اس خاص مسئلہ میں چونکہ ان کی رائے علمار سلف سے بالکل مختلف تھی اس لئے کڑی تنقیدی نظر کی محتاج تھی چنانچہ کافی غور وخوض اور گہری نظر کے بعد اس کی صحت کو تسلیم کرنا پڑتا ہے اور جب کہ یہ طے شدہ امر ہے کہ علمار سلف کی جلالت قدر اور علمی عظمت وبرتری کے باوجود علمی تحقیق کا دروازہ بند نہیں ہے اور قرآن وحدیث کی روشنی میں علمار متاخرین نے علمار متقدمین سے سیکڑوں مسائل علمی میں اختلاف رائے کا اظہار کیا ہے خصوصًا تاریخی مباحث میں اور جدید معلومات نے ایسے انکشافات کئے ہیں جن کے ذریعہ ہم بہت سے ایسے مسائل کو بآسانی حل کر لیتے ہیں جو علمار سلف کے زمانہ میں لا ینحل رہے ہیں تو ہم کو مولانا آزاد کی اس تحقیق کا (خواہ وہ تاریخی لحاظ سے کتنی ہی وقیع کیوں نہ ہو) محض اس لئے انکار نہیں کر دینا چاہیئے کہ وہ ان کی اپنی تحقیق ہے"۔

پھر اسی کے ذیل میں بطور نوٹ لکھتے ہیں:۔

> " اس مسئلہ کی پوری تحقیق میں ہم کو مولانا آزاد کے اس حصہ بیان سے سخت اختلاف ہو جو انھوں نے علمار سلف کے خلاف یاجوج وماجوج کے آخری خروج کے متعلق تحریر فرمایا ہے اس لئے یہ حصہ تحقیق بلاشبہ باطل ہے۔"
>
> (قصص القرآن جلد سوم ص ۱۵۶)

افسوس ہے کہ اس مختصر مضمون میں گنجائش نہیں، ورنہ ہم مثالیں دیکر واضح کرتے کہ مولانا کا معیار رد وقبول علم وتحقیق رہا ہے جہاں انھوں نے مولانا آزاد یا کسی اور جدید محقق کی رائے کو قبول کیا ہے تو تحقیق وتنقید کی کسوٹی پر کس کر، اور جہاں اسے رد کیا اور معترضین سابقین کی رائے سے اتفاق کیا ہے تو وہ بھی علم وتحقیق کی روشنی میں۔ نہ مفسرین قدیم کی آرار جلیلہ کو انھوں نے تقویم پارینہ قرار دیا ہے اور نہ محققین جدید کی تحقیقات حدیثہ کو شجر ممنوعہ۔

مولانا کی یہ کتاب چونکہ ان کی تمام کتابوں پر گل سر سید کی حیثیت رکھتی ہے اس لئے اس پر ذرا تفصیل سے گفتگو کی گئی۔ اب مختصر طور پر دوسری کتابوں پر ایک نظر ڈالی جاتی ہے۔

اسلام کا اقتصادی نظام

محنت اور سرمایہ کی ہمارے زمانہ میں جو کشمکش جاری ہے اور اس سلسلہ میں اقتصادی وسیاسی لائنوں پر جو گروہ بندیاں ہو رہی ہیں اس نے ساری دنیا کو میدان جنگ میں تبدیل کر دیا ہے۔ نئے نئے اقتصادی نظام، جاذب نظر عنوانات کے ساتھ نگاہوں کے سامنے آرہے ہیں اور دلفریب اور سامعہ نواز نعرے فضاؤں میں گونج رہے ہیں، مگر دنیا امن وراحت سے محروم ہے اور دلوں کو سکون نصیب نہیں۔

اسلام کو جو لوگ ہر دور میں انسانیت کی مشکلات کا حل اور امن وسلام کا پیغام قرار دیتے ہیں ان کا فرض ہے کہ وہ اپنے اس دعویٰ کو ثابت کریں اور بتائیں کہ فرعونیت اور قارونیت کے خنجروں سے تڑپتی ہوئی دنیا رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے پرچم کے سایہ میں ہی امن و

اطمینان کی دولت پا سکتی ہے۔ غالباً مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ نے سب سے پہلے اس فرض کفایہ کو ادا کرنے کے لئے اردو زبان میں قلم اٹھایا اور ۱۹۳۹ء میں ان کی کتاب ' اسلام کا اقتصادی نظام ' کا پہلا اڈیشن شائع ہوا۔ چھ سال بعد ۱۹۴۵ء میں اس کا مکمل اڈیشن شائع ہوا اور اس طرح اس اہم موضوع پر جو عام طور پر ہمارے علماء کی نگاہوں سے اوجھل رہا ہے ' ایک بلند پایہ کتاب سامنے آ گئی۔

مولانا اپنی اس مایۂ ناز محنت کو پیش کرتے ہوئے اس کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں :-

" بہرحال میری اس نگارش میں نہ سرمایہ دارانہ ذہنیت رکھنے والوں کو دستِ غیب کا کوئی نسخہ ہاتھ آ سکتا ہے اور نہ ان مذہب تمام انسانوں کے لئے کوئی پیغام جاں فزا دستیاب ہو سکتا ہے جن کے نزدیک دنیا کے یہ موجودہ ظالمانہ نظام ہی خدا کی مرضی اور اس کا منشا ہیں۔

میری یہ محنت صرف ان ٹوٹے دلوں کے لئے ہے جو موجودہ ظالمانہ نظام کی دستبرد سے مایوس ہو کر حیرت سے چاروں طرف دیکھ رہے ہیں اور کسی عادلانہ نظام کے بروئے کار آنے کا انتظار کر رہے ہیں۔

اور میری یہ پکار مذہب سے ناآشنا اور یورپ کے انقلاب سے مرعوب ان نوجوانوں کے لئے ہے جو الحاد کے جھوٹے مگر چمکتے ہوئے نگینوں کو جوہر گوہر جانتے اور دنیا کے اس ظالمانہ کردار کا ردعمل کبھی ہیگل اور کارل مارکس کے فلسفہ سوشلزم اور کمیونزم میں سمجھتے ہیں اور کبھی نیشنلزم اور یورپ کی ڈیماکریسی کو کعبۂ مقصود یقین کرنے لگتے ہیں۔

وہ دیکھیں اور غور و انصاف کی نگاہ سے دیکھیں کہ رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہم کے بتائے ہوئے اور سلجھائے ہوئے نظام میں وہ سب کچھ موجود ہے جو ظالمانہ نظام کے خلاف محنت و سرمایہ کی کشمکش اور طبقاتی جنگ سے نجات دلاتا ہے اور جس سے انسانوں کی آزادی اور عام خوشحالی کی ضمانت ہوتی ہے "

مولانا کی یہ محنت رائگاں اور یہ پکار بیکار نہ گئی۔ کتاب خاصی مقبول ہوئی اور اصحابِ ذوق نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ مگر ضرورت ہے کہ اس کا انگریزی اڈیشن شائع کیا جائے تاکہ کتاب اپنے مقصد کو پورا کر سکے۔

مولانا کی اس کتاب کے بعد ہندوستان اور پاکستان میں اور بھی کئی کتابیں اس موضوع پر لکھی گئیں۔ مثلاً مولانا گیلانی کی کتاب " اسلامی معاشیات " اور ڈاکٹر محمد یوسف کی کتاب " اسلام کے معاشی نظریے " ان کتابوں کا بھی اپنا اپنا مقام ہے مگر الفضل للمتقدم۔

مولانا کی اس کتاب کا چوتھا اڈیشن بڑے سائز کے چار سو صفحات پر مشتمل ہے اور مباحث ذیل پر داد تحقیق دی گئی ہے۔

(۱) اقتصاد و علم الاقتصاد
(۲) معاشیات کے جدید نظریے
(۳) اصول معاشیات قرآن عزیز کی روشنی میں
(۴) انفرادی معیشت
(۵) اجتماعی نظام معیشت
(۶) بیت المال اور اس کے مصارف
(۷) زراعت ' تجارت اور صنعت و حرفت
(۸) مال گزاری ' خراج اور
(۹) زمینداری
(۱۰) ربوا اور اس کے اقسام و احکام
(۱۱) بینک ' کوآپریٹیو سوسائٹیاں اور مضاربت
(۱۲) کانیں ' اجارہ داری کی کمپنیاں ' ملیں اور کارخانے
(۱۳) زکوٰۃ ' صدقات ' وراثت اور اوقاف
(۱۴) اسلامی نظام کا دیگر اقتصادی نظاموں سے موازنہ
(۱۵) ہندوستان میں معاشی مسئلہ کا حل

یہ دراصل مختصر فہرست ابواب ہے ' مفصل فہرست مضامین نہیں۔ تاہم اس سے کتاب کی اہمیت و افادیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے

اخلاق و فلسفہ اخلاق

مولانا کی تیسری اہم علمی کتاب " اخلاق و فلسفہ اخلاق " ہے ۔ " اخلاقیات " اسلام کے جامع نظام زندگی کا ایک اہم باب ہے۔ جملہ انبیائے کرام کا خاص مشن یہ رہا ہے کہ وہ انسانوں کو حسن عمل نیک کرداری اور نکوکاری کے زیورات سے آراستہ کریں اور دنیا کو محبت، رافت اور امن و راحت کا گہوارہ بنا دیں۔ سید الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو اپنی بعثت کا مقصد اعلیٰ ہی یہ قرار دیا۔ چنانچہ ارشاد فرمایا۔

بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مکارمَ الاخلاق

اس لئے قرآن کریم کے علاوہ جملہ کتب حدیث میں مسائل اخلاق کے گلشن کھلے ہوئے ملتے ہیں۔

تاہم اخلاقیات کا تعلق دنیوی صلاح و فلاح کے لئے بھی اتنا ہی ہے جتنا آخرت کی سعادت و کرامت سے اس لئے ہر دور میں فلاسفہ نے بھی اس موضوع پر بہت کچھ لکھا ہے اور فلسفیانہ انداز میں مسائل اخلاق کی وضاحت کی ہے

حکمائے اسلام امام رازی، امام غزالی، عارف رومی، شیخ سعدی، حافظ ابن قیم اور شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہم اللہ نے دونوں کے ڈانڈے ملا دیئے ہیں اور اخلاقیات اسلام کو فلسفیانہ انداز بیان میں اس شان سے پیش کیا ہے کہ بادہ ناب رنگیں ساغر بلوریں میں آکر روح پرور ہونے کے علاوہ نظر افروز بھی ہوگئی ہے۔

پھر جدید تحقیقاتِ علمیہ کے اس دور میں یہ موضوع بھی افکار جدیدہ سے سیراب ہورہا ہے۔ ضرورت تھی کہ ان سرچشموں سے بھی موتی چن لئے جائیں اور ان سب کو ایک لڑی میں پرو دیا جائے تاکہ انبیائے کرام کی اخلاقی تعلیمات کے لعل و گوہر کی برتری و بہتری آفتاب کی کرنوں کی طرح عالم آشکارا ہوجائے۔ عالم اسلام میں اس طرف بہت کم توجہ کی گئی اور اردو زبان کا دامن تو اس گوہر مقصود سے بالکل خالی ہی تھا۔

مولانا سیوہارویؒ نے اسی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے قلم اٹھایا اور اس کا حق ادا کردیا۔

مقدمہ کتاب میں مولانا فرماتے ہیں:۔

"اردو میں اس سلسلہ میں جس قدر تالیفات موجود ہیں وہ جدا جدا نظریوں کے ماتحت تالیف کی گئی ہیں۔ جن حضرات کو مذہبی ذوق ہے انھوں نے جدید نظریہ ہائے اخلاق سے جدا ہو کر اپنی معروضات کو ایک ہی طرز میں ادا کیا ہے اور جن اربابِ قلم کو جدید علمی نظریوں سے شغف ہے انھوں نے صرف ان ہی نظریوں کی تحقیق، تفتیش اور شرح و بسط کو اپنا منتہائے مقصد بنایا ہے۔ لیکن وقت کا تقاضا یہ تھا کہ اس سلسلہ میں ایک ایسی کتاب مرتب کی جائے جس میں ایک جانب جدید اکتشافاتِ علمی کا مفید ذخیرہ محفوظ ہو اور زبردستی کے تعصب اور ہٹ دھرمی سے اس کے ساتھ معاندانہ روش اختیار نہ کی جائے اور دوسری جانب اسلامی اخلاقی تعلیم کو اس انداز سے پیش کیا جائے کہ صرف حسن ظن کی بنا پر نہیں بلکہ علمی دلائل و براہین کی روشنی میں اسلام کے نظریۂ اخلاق اور اسلامی تعلیمات کی برتری واضح ہوجائے۔

جہاں تک بیان و ترتیب کی اس نوعیت کا تعلق ہے "علم اخلاق" پر ایسی کوئی تالیف نظر نہ آئی۔ یہ دیکھ کر اپنی بے بضاعتی علم کے باوجود عزم و ارادہ کی قوت نے ابھارا اور وجدان و ضمیر نے پکارا۔

توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے
آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا"

یہ کتاب اپنی ترتیب کے لحاظ سے چار حصوں پر مشتمل ہے:۔

(۱) پہلے حصہ میں علم النفس اور نفسیاتی مباحث، ملکہ، وجدان، ارادہ وغیرہ سے بحث کی گئی ہے۔

(۲) دوسرے حصہ میں اخلاق کے معیاری نظریات اور اُن کے متعلقات نیز علم الاخلاق کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔

(۳) تیسرے حصہ میں اخلاق کے عملی پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے

(۴) چوتھے حصہ میں اسلام کی اخلاقی تعلیمات کی اس طرح وضاحت کی گئی ہے کہ علمی و عملی دونوں اعتبارات سے دلائل و براہین کی روشنی میں ان کا کمال و تفوق ظاہر ہوجاتا ہے۔

بہرحال مولانا کی یہ تالیف بھی جو بڑی تقطیع کے تقریباً چھ سو صفحات پر مشتمل ہے، اردو زبان کے خزانہ میں ایک متاع گراں بہا کا اضافہ کرتی ہے اور مولانا اس کی ترتیب و تدوین پر علمی دنیا کی طرف سے خراج تحسین و تبریک کے مستحق ہیں۔

مولانا سیوہاروی کی یہ تینوں معرکۃ الآرا کتابیں ندوۃ المصنفین کے تصنیفی و تالیفی پروگرام کے تحت مرتب ہو کر شائع ہوئیں اور ندوۃ المصنفین کے علمی ذخیرہ میں ان کو "گل ہائے سرسبد" کی حیثیت حاصل ہوئی۔

ان کے علاوہ مولانا کے قلم سے ندوۃ المصنفین کے وجود میں آنے سے قبل دو اور کتابیں بھی نکلیں۔

(۴) البلاغ المبین فی مکاتیب سید المرسلین۔ اس کتاب میں

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ان خطوط و پیغامات کو جمع کر دیا گیا جو آپ نے اپنے عہد کے سلاطین و امراء عالم کے نام لکھے۔ ان کا پس منظر اور ضروری تشریحات بھی اس انداز سے پیش کر دی گئی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا طریق تبلیغ و دعوت وضاحت کے ساتھ نگاہوں کے سامنے آجائے اور ہمارے علماء و مبلغین اس کو نمونہ و اسوہ بنا سکیں۔

یہ کتاب اس وقت نایاب ہے۔ راقم الحروف نے بھی اس کی اشاعت کے زمانہ ہی میں اسے دیکھا تھا۔ بڑی تقطیع کے غالباً دو سو صفحات پر مشتمل ہوگی۔ ضرورت ہے کہ اسے پھر شائع کیا جائے۔

(۵) نور البصر فی سیرۃ خیر البشر۔ اس کا دوسرا نام "سیرت رسول کریم" ہے اور اسی نام سے معروف ہے۔ یہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرۃ مبارکہ پر ۳۰۵ صفحات کی ضخامت کا رسالہ ہے جسے آپ نے ڈابھیل کے قیام کے زمانہ میں اسکولوں اور کالجوں کے طلبہ کی نصابی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے تحریر فرمایا۔

انداز ترتیب یہ ہے کہ دلچسپ اور موثر انداز بیان اور مختصر الفاظ میں رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس زندگی کی مکمل تصویر کھینچ دی گئی ہے۔ ہر عنوان کے تحت اس کے مناسب آیۂ قرآنیہ درج کر دی گئی ہے تاکہ واقعۂ مذکورہ اس آیۃ کی تفسیر بن کر سامنے آجائے۔ حیات طیبہ کے حسین و جمیل خد و خال کی عکاسی کے علاوہ نظام اسلامی کے نقش و نگار بھی واضح کئے گئے ہیں۔ یہ رسالہ آپ نے اپنے استاذ عالی مقام حضرت علامہ الاستاذ مولینا انور شاہ کشمیری کے ایماء پر تالیف کیا۔ پہلے ایڈیشن کو حضرت ممدوح کی خدمت میں پیش کر کے اُن کی رائے گرامی بھی حاصل کی جسے تبرکاً درج کیا جاتا ہے۔ وھو ھذا:۔

"نور البصر فی سیرۃ خیر البشر" مولفہ جناب مستطاب مولینا مولوی حفظ الرحمن صاحب سیوہاروی دام عزہ احقر کے اصرار پر تالیف ہوئی ہے۔ احقر کا خیال تھا کہ کوئی متوسط سیرت النبی تالیف ہو کہ مدارس عربیہ اور مدارس قومیہ کے طلبہ اس سے بسہولت مستفید ہو سکیں اور حدیث شریف کے مشتغلین کو اجمالی بصیرت نصیب ہو اور کتب معتبرہ سے ماخوذ ہو اور اہل حق اور سلف کے طریقہ کے خلاف نہ ہو۔ بحمد اللہ یہ مختصر کتاب ایسی ہی واقع ہوئی ہے۔ حق تعالیٰ مؤلف کو جزائے خیر نصیب کرے اور ان کی یہ خدمت بارگاہ خداوندی اور بارگاہِ نبوت میں قبول ہو۔ آمین۔

محمد انور شاہ کشمیری عفا اللہ عنہ۔ یکم جمادی الاخری ۱۳۵۱ھ

کتاب کافی مقبول ہوئی۔ اس کا آخری مکمل ایڈیشن گزشتہ سال شائع ہوا ہے۔ ٹائیٹل کے لئے ڈیزائن پر غور و خوض کے وقت راقم الحروف کو بھی شریک مشورہ ہونے کی عزت حاصل ہوئی تھی۔ اس ایڈیشن میں سرورق پر مختصر نام "سیرۃ رسول کریم" درج کیا گیا ہے۔ پہلے ایڈیشن پر صرف "رسول کریم" تھا۔ اس سلسلہ میں مولینا مرحوم نے ایک لطیفہ بھی سنایا۔ فرمایا کہ "جب کتاب پہلی مرتبہ چھپی اور میں نے اپنے بچپن کے ایک اُستاد کو پیش کی (جو غالباً سیوہاروی تھے) تو وہ سرورق پر رسول کریم دیکھ کر بہت بگڑے۔ فرمانے لگے کیا اب "رسول کریم" کو فروخت کرو گے؟ چنانچہ میں نے محض اپنے اُستاد کے تعمیل ارشاد میں دوسرے ایڈیشن میں "سیرت" کا لفظ اضافہ کر دیا۔

میں نے عرض کیا یہ تو عام دستور ہے کہ سیرت کو صاحب سیرت کے نام سے موسوم کر دیا جاتا ہے۔ چنانچہ احقر کی کتاب کا نام بھی "نبی عربی" ہے جو ندوۃ المصنفین سے شائع ہوئی ہے۔ مولینا نے ہنس کر فرمایا، مگر میں اپنے اُستاد کو ناراض کرنا نہیں چاہتا۔

ان کتابوں کے علاوہ مولینا نے بالکل ابتدائی زمانہ میں ایک کتاب مناظرانہ رنگ میں حفظ الرحمن لمذہب ابی حنیفۃ النعمان بھی لکھی تھی۔ اس کا علم مجھے حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمن صاحب کی زبانی ہوا، مگر مولانا بہت جلد فرقہ وارانہ نزاعات کے مقام سے بلند ہو گئے اور مولینا کی یہ کتاب بھی نسیاً منسیاً ہو گئی۔

اختتام کلام

مولانا سیوہاروی کی تصنیفی و تالیفی زندگی نے صرف دس سال کی مختصر مدت پائی۔ ۱۳۵۷ھ (ندوۃ المصنفین کا سال تاسیس) سے یہ دور شروع ہوا اور ۱۹۴۷ء کے ہولناک انقلاب پر ختم ہو گیا۔ اسی مختصر مدت میں یہ عظیم الشان تصنیفی کارنامے آپ نے انجام دیئے جن کو ہندوستان کے صف اوّل کے ادباء و مصنفین کی بہترین علمی خدمات کے مقابلہ پر بے تکلف پیش کیا جا سکتا ہے۔

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ دوسرے ممتاز اصحاب قلم کی طرح اگر مولانا کو قومی خدمات سے یکسو ہو کر اس میدان میں قلم کی جولانیاں دکھانے کا اور بھی موقع ملتا تو آپ کا مقام کیا ہوتا۔؟

انقلاب ۱۹۴۷ء کے بعد تو مولانا کی حالت یہ تھی کہ شعلۂ جوالہ بنے ہوئے ہندوستان کے ایک کونہ سے دوسرے کونہ تک ناچتے پھرتے تھے۔ ملی زندگی کا کون گوشہ ایسا تھا جہاں مولانا مصروفِ عمل نہ ہوں۔ مسلم یونیورسٹی میں مولانا یونیورسٹی کے بنیادی مقاصد کے تحفظ کے لئے جان لڑا رہے تھے، جامعہ ملیہ اسلامیہ میں اس کی انتظامی گتھیوں کو سلجھانے میں اپنی اصابت رائے کے جوہر دکھا رہے تھے۔ دارالعلوم دیوبند کو سخت سے سخت مشکلات کے بھنور سے نکالنے میں اپنے اثر ورسوخ کو کام میں لا رہے تھے۔ حج کمیٹی میں حجاج کو آرام و آسائش پہنچانے کے لئے سرگرمِ عمل تھے۔ اصلاح اوقاف کے لئے، وقف بورڈوں میں مولانا کی رہنمائی نشانِ منزل تھی۔ انجمن ترقی اردو کے لئے مولانا کی قیادت خضرِ راہ تھی اور پارلیمنٹ کے ایوان میں آپ کا نعرۂ حق ملت کے دکھے ہوئے دلوں کے لئے سرمایۂ سکون تھا۔

ان مسائل ملی کے سلسلہ میں مولانا ہندوستان کے کونہ کونہ کی خاک چھانتے پھرتے تھے۔ پھر جب سفر کا یہ سلسلہ ٹوٹتا اور مولانا کا دہلی میں قیام ہوتا تو مولانا کا دربارِ عام خود مصروفیات کا خارزار ہوتا۔ وہ دیکھئے جمعیۃ علماء ہند کے دفتر کا صحن ہے۔ ایک طرف چبوترہ ہے جس پر چٹائی کا فرش بچھا ہوا ہے۔ ایک طرف مولانا کے رفقاء کرام حضرت مولانا محمد میاں اور حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن وغیرہ تشریف فرما ہیں۔ دوسری طرف ضرورتمندوں کا ہجوم ہے۔ برابر میں دو کرسیاں آمنے سامنے لگی ہوئی ہیں۔ ان پر معزز ملاقاتی بیٹھے ہیں چبوترہ کے مقابل دوسری طرف ایک کھرّی چارپائی بچھی ہے جو کبھی بستر سے آشنا نہیں ہوئی۔ البتہ ایک گاؤ تکیہ ضرور ہے اور مولانا اس سے سہارا لگائے بیٹھے ہیں اور سب سے مسکرا کر باتیں کر رہے ہیں۔

کوئی بنگال سے آیا ہے تو کوئی گجرات سے۔ کوئی ہندو ہے یا کوئی مسلمان پارلیمنٹ کے ممبر بھی ہیں اور ملوں کے مزدور بھی۔ مرد بھی ہیں اور عورتیں بھی مولانا ہر ایک کی بات باری باری توجہ سے سُن رہے ہیں، کسی کو تسلی دے رہے ہیں، کسی کے لئے سفارشی خط لکھوا رہے ہیں، کسی کے کام کے لئے حکام سے ٹیلیفون پر بات کر رہے ہیں۔ سب مطمئن ہو کر واپس جا رہے ہیں۔

یہ لیجئے وہ ٹیلیفون آیا۔ فلاں مقام پر فساد کی آگ بھڑک اٹھی۔ بس اب مولانا کو قرار کہاں؟ بستر تو بندھا ہوا رہتا ہی ہے، ٹکٹ کی پارلیمنٹ کی ممبری کی وجہ سے ضرورت ہی نہیں، اب مولانا ہیں اور فساد کا شعلہ زار

گذشتہ سال اسی زمانہ میں علی گڑھ کے بعد میرٹھ فساد کی بھٹی بنا ۲۰ اکتوبر کی صبح صبح قیامت بن کر نمودار ہوئی۔ شام ہوتے ہوتے کرفیو لگا دیا گیا اور سارا شہر شہرِ خموشاں بن گیا۔ کرفیو کی ہیبت خاموشی میں جو "مردِ مجاہد" شہر کی خطرناک گلیوں کا چکر لگا رہا تھا وہی "حفظ الرحمٰن" تھا وہ واقعی "حفظ الرحمان" تھا جو مظلوموں کی دادرسی کر رہا تھا، اور مجروحوں کو تسلی و تشفی دے رہا تھا، حکام سے لڑ رہا تھا اور وزراء پر بگڑ رہا تھا۔

ان حالات میں کوئی بے وقوف ہی مولانا سے کہہ سکتا تھا کہ آپ اپنے قدم کی بجائے قلم کو گردش دیجئے۔ ہندوستان کے طول و عرض کو ناپنے کی بجائے ندوۃ المصنفین کے دفتر میں آ بیٹھئے۔ تاہم یہ بے وقوفی اس خاکسار نے کئی مرتبہ کی۔ مگر ہر مرتبہ مولانا نے آہِ سرد بھر کر یہی جواب دیا:

"قاضی صاحب! جی تو میرا بھی چاہتا ہے کہ کچھ وقت نکال کر "ندوۃ المصنفین" میں بیٹھا کروں اور لکھنے پڑھنے کے کام کا ٹوٹا ہوا رشتہ جوڑوں۔ مگر کیا کروں مجبور ہوں بات اپنے بس کی نہیں۔"

بے شک جس کے بس کی بات تھی اس کو، مولانا سے وہ کام لینا تھا جو قسمت والوں ہی سے لیا جاتا ہے اور جس کا موقعہ تاریخِ عالم میں صدیوں کے بعد ہی آتا ہے

این سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

تغمدہ اللہ برضوانہ ورحمتہ واسکنہ باعلیٰ منازل جنتہ



مجاہد ملتؒ بمبئی میں

مولانا قاضی اطہر مبارک پوری

مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے میرا غائبانہ اور عقیدت مندانہ تعلق اس وقت ہوا جب کہ میں عربی کی بالکل ابتدائی تعلیم جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور میں حاصل کر رہا تھا۔ اس زمانے میں ہمارے مدرسہ میں جمعیۃ الطلبہ کا نیا نیا قیام ہوا تھا اور محی السنۃ حضرت مولانا شکر اللہ صاحب مبارک پوری (متوفی ۵ ربیع الاول ۱۳۶۲ھ) رحمۃ اللہ علیہ کے دامن شفقت میں ہم لوگ علمی اور ذہنی پرورش پا رہے تھے۔ جمعیۃ الطلبہ کے کتب خانہ میں اردو کی بہت سی نئی اور معیاری کتابیں منگائی گئیں۔ ان ہی میں ایک کتاب "البلاغ المبین فی مکاتیب سید المرسلینؐ" نام کی تھی جو مولانا ابو القاسم محمد حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی کی لکھی ہوئی تھی۔ ان دنوں جو کتابیں آئی تھیں ان سب میں میرے بچپن کے ذوق کے مطابق یہ کتاب سب سے اہم اور بہتر تھی۔ میں نے اسے خوب خوب پڑھا اور بار بار پڑھا۔ یہ پہلا نقش تھا جو مولانا مرحوم کا میرے دل پر بیٹھا اور اسی وقت سے ان سے عقیدت پیدا ہوئی۔ اس کے بعد ان کی دوسری کتاب "رسول کریمؐ" دیکھی اور پڑھی جو سیرت میں نہایت جامع اور مختصر تھی۔ یہ کتاب دراصل ایک عربی کتاب کو سامنے رکھ کر لکھی گئی تھی مگر اس طرح کہ نہ ترجمہ، نہ اقتباس اور خلاصہ بلکہ مستقل تصنیف تھی۔

حضرت مولانا شکر اللہ صاحب ناظم جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور بڑے ہوش و حواس کے بزرگ تھے ان کی ذات نے اپنے یہاں بڑا انقلاب پیدا کیا، تحریک خلافت میں جیل جا چکے تھے۔ قومی اور سیاسی تحریکات میں کانگریس اور جمعیۃ علماء کے ہم نوا بلکہ جمعیۃ علماء کے فدائی تھے۔ پھر مقامی طور پر بدعات و خرافات اور ظلم و جہالت کے خلاف زبردست محاذ قائم کر رکھا تھا۔ ان گوناگوں تحریکات و اصلاحات کی وجہ سے مبارک پور ان دنوں ارباب علم و فضل اور اہل سیاست کا مرکز بنا ہوا تھا۔ آئے دن جلسے جلوس ہوا کرتے تھے۔ جامعہ عربیہ احیاء العلوم کا سالانہ اجلاس ہر سال بڑی شان و شوکت سے ہوتا تھا اور اپنے سلسلے کے تقریباً تمام اکابر بڑے ذوق و شوق سے اس میں شریک ہوا کرتے تھے، جس سے مبارک پور کی علمی، دینی، اصلاحی اور سیاسی فضا میں عجیب کشش اور زندگی پائی جاتی تھی۔ تمام جمعیتی اکابر و اصاغر اور علماء عام طور سے آتے جاتے تھے۔ اس زمانہ میں کہنا چاہیے کہ مشرقی یوپی میں مبارک پور مجاہد ملت کے لئے گھر کی طرح ہو گیا تھا۔ آئے دن تشریف لاتے تھے۔ مشرقی یوپی اور بہار وغیرہ آنے جانے حسب موقع ایک آدھ روز یا گھنٹہ دو گھنٹہ ہی کے لئے آ جاتے۔ بسا اوقات ایسا ہوا کہ ایک ٹرین سے آئے اور دوسری سے واپس گئے۔ بہر صورت حال مولانا شکر اللہ صاحب کی زندگی تک برابر قائم رہی۔ اور ہم نیاز مند مولانا مرحوم سے اس طرح گھل مل گئے تھے جیسے استاذ شاگرد بن گئے ہوں۔ ۱۹۴۳ء سے لے کر ۱۹۵۱ء تک راقم الحروف امرتسر، لاہور، بہرائچ اور ڈابھیل (ضلع سورت) میں رہا۔ اس پانچ چھ سال کی مدت میں مجاہد ملت سے ملاقات کا بہت کم موقع رہا۔ مگر بعض بعض معاملات میں خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہا اور بعض ملاقاتیں بھی ہوئیں۔ یہاں تک کہ جب راقم بمبئی آیا اور یہاں پر مستقل قیام کی صورت ہو گئی تو مجاہد ملت سے تمام پچھلی ملاقاتوں سے بڑھ کر ملاقاتیں ہونے لگیں۔ گویا تعلقات میں نئے باب کا اضافہ ہوا۔

مجاہد ملت کی بمبئی میں تشریف آوری سال میں کئی بار ہوا کرتی تھی پہلے تو جمعیۃ علماء صوبہ بمبئی کے اجلاسوں اور بعض دوسرے اہم کاموں کے سلسلے میں آنا ہوتا تھا۔ مگر بعد میں جب "میسیج" نکالنے کی باری آئی تو اس کے لئے رقم کی فراہمی کے سلسلے میں کئی مرتبہ آنا ہوا اور بعض اوقات مولانا مرحوم کو اس کام کے لئے ہفتوں ہفتوں ٹھہرنا پڑا۔ سنٹرل حج کمیٹی کی بمبئی میں میٹنگ، حجاج کی روانگی کا معائنہ، غیر ملکی اسفار اور مسلمانوں کے ضروری کام بار بار بمبئی آنے کا سبب بنتے رہے۔

بمبئی میں مولانا مرحوم کا قیام شروع سے آخر تک یہاں کے مشہور عرب بزرگ علمائے دین کے فدائی اور مخلص حاجی عبد اللہ عرب ہمکری صاحب خان منزل کھانڈیا محلہ کے گھر پر رہا۔ دونوں بزرگوں کی وضعداری آخر تک برابر قائم رہی۔ مولانا مرحوم جب یہاں تشریف لاتے تو بمبئی کے ہر طبقہ کے بڑے بڑے لوگوں کی آمد و رفت رہا کرتی تھی۔ حکام، وزراء، علماء، سرمایہ دار، لیڈر، معتقدین متعلقین، جان پہچان والے، ضرورت مند اور ہم جیسے حلقہ نشین اور خوشہ چین سب ہی زیادہ سے زیادہ مولانا کی مجلس میں رہنے کی کوشش کرتے اور مولانا مرحوم سب سے یوں ملتے اور بات چیت کرتے۔ جیسے سب سے ذاتی اور خصوصی تعلقات ہیں۔ بے تعلقی اور ادب کی ملی جلی یہ مجلسیں بڑی معلوماتی اور دلکش ہوا کرتی تھیں محترم حاجی عبد اللہ عرب صاحب کے اسلامی اور عربی اخلاق کی وجہ سے ہر طبقہ کے لوگ ان کے گھر آنے جانے میں کوئی تکلیف نہیں محسوس کرتے تھے۔ حاجی صاحب بھی شروع سے لے کر آخر تک بڑی وضعداری اور اخلاص کا برتاؤ مولانا مرحوم کی طرح دوسروں کے ساتھ کرتے رہے اور اس میں سرمو فرق نہیں آنے دیا۔ مولانا مرحوم کو بڑے بڑے لوگوں نے اپنے یہاں ٹھہرنے کی بارہا پیش کش کی، مگر مولانا نے اپنی وضع نہیں بدلی اور ہمیشہ

بے نیازی سے ہمیشہ معذرت فرمائی۔

میں عام طور سے فجر کی نماز کے وقت مولانا مرحوم کے پاس پہنچ جاتا تھا۔ اس وقت اکثر مولانا حکیم اعظمی اور مولانا حامد الانصاری غازی بھی پہنچ جاتے تھے اور بھیڑ بھاڑ سے اس خالی وقت میں مولانا مرحوم کے ساتھ ہماری خصوصی مجلس ہوا کرتی تھی۔ عام طور سے کسی خاص علمی و دینی موضوع کی باتیں چھڑ جاتی تھیں پھر شام کو بھی عصر سے لے کر مغرب بعد عشاء تک ہماری اسی قسم کی مجلس ہوا کرتی تھی۔ یہ اوقات ملنے جلنے والوں سے عام طور سے خالی رہتے تھے اور اگر یہ لوگ آتے تو ہماری باتوں میں شریک ہو جاتے۔ ان مجلسوں میں مولانا مرحوم عالمانہ رنگ میں ظاہر ہوا کرتے اور مختلف علمی اور دینی موضوعات پر گفتگو میں کھل کر حصہ لیتے۔

مولانا مرحوم کی زندگی ہمیشہ ایک رنگ میں گزرتی تھی۔ سفر ہو یا حضر اس میں فرق نہیں آتا۔ بے تکلفی، سادگی اور حقیقت پسندی کا یہ حال تھا کہ بمبئی جیسے شہر میں جہاں کے لوگ عموماً پوزیشن کا بے حد خیال کرتے ہیں اور دوسروں کے ساتھ اس کی پوزیشن دیکھ کر ملتے جلتے ہیں۔ مولانا کی سادگی اور بے تکلفی بہت عام تھی۔ تعلیم یافتہ، سرمایہ دار سیاسی اور سرکاری افراد کا مجمع ہو یا ہم لوگوں کی خصوصی مجلس مولانا ہر جگہ یکساں نظر آتے تھے۔ ایک مرتبہ شام کو مالابار ہل پر تفریح کے لئے تشریف لے گئے۔ ساتھ میں ہم لوگ بھی تھے اور اونچے طبقے کے تعلیم یافتہ، مالدار اور صاحب حیثیت بھی تھے۔ ٹہلتے ٹہلتے پہاڑ کی انتہائی بلندی پر ناز ہوٹل میں سب لوگ پہنچے جہاں سے مغرب بعد شہر بمبئی بقعۂ نور نظر آتا تھا۔ غالباً سات آدمی تھے۔ آئس کریم کھانے کا بل چودہ روپیہ سے زائد آیا۔ پھر نیچے اتر کر سب لوگ ٹہلتے رہے۔ مولانا نے سڑک کے کنارے ایک چنے بیچنے والے کو دیکھا تو لپک کر آگے بڑھے اور دو آنے کے بھنے ہوئے نمکین چنے لے کر ٹہلتے ٹہلتے کھاتے جاتے تھے اور فرماتے تھے کہ اس میں جو مزا ہے وہ آئس کریم میں کہاں ہے؟ مولانا کی دیکھا دیکھی جن لوگوں نے شاید کبھی ایسا چنا نہ کھایا ہو، انھوں نے بھی خریدا اور کھانا شروع کیا۔ اسی طرح بے تکلفی کی اور بہت سی باتیں مولانا میں تھیں۔ ایک مرتبہ حاجی یحییٰ زبیر صاحب نے مولانا مرحوم کی پرتکلف دعوت کی۔ ہم لوگ بھی ساتھ تھے۔ انواع و اقسام کے یو۔پی کے طرز کے کھانے دسترخوان پر تھے اور یار لوگ بڑھ چڑھ کر ہاتھ مار رہے تھے۔ مگر مولانا مرحوم تھے کہ سب کچھ چھوڑ کر ارہر کی عمدہ دال اور سادے چاول کا مزا لے رہے تھے اور جب صاحب خانہ نے دوسرے کھانوں کے لئے اصرار کیا تو فرمایا کہ آج کئی دن کے بعد اپنے وطن کی غذا ملی ہے۔ مہربانی کر کے مجھے کھانے دیجئے۔ اسی طرح اور بہت سے واقعات ہیں جن میں مولانا مرحوم بمبئی جیسے شہر میں بھی اپنی بے تکلفی ظاہر کرتے تھے۔ وہ بھی اس شان سے کہ دوسرے لوگ ان کو دیکھ کر سبق حاصل کریں۔

علمی اور دینی باتوں میں جو بات سمجھ میں آتی یا معلوم ہوتی نہایت صفائی سے فرما دیا کرتے۔ اگر ان کی ذاتی رائے ہوتی تو ساتھ ہی یہ فرماتے کہ میرا خیال یہ ہے مگر میں چونکہ مفتی نہیں ہوں اور نہ ان مسائل میں دخل دینا آج کل میرا منصب ہے۔ اس لئے مفتی حضرات جانیں اور اہل علم فیصلہ کریں۔ ایک مرتبہ ریڈیو اور ٹیلی گرام کے ذریعہ رویت ہلال کی خبر پر بحث چلی اور میں نے اس موضوع کو صبح کی مجلس میں پیش کیا۔ غالباً حکیم صاحب اور غازی صاحب بھی تشریف فرما تھے۔ مولانا نے فرمایا کہ آپ لوگوں میں ان مسائل میں جرأت کی کمی ہے اور کھل کر کوئی فیصلہ نہیں کرتے ہیں۔ جس کی وجہ سے عوام پریشان رہتے ہیں اور جب وہ کہنے لگتے ہیں تو آپ بھی اسے کرنے لگتے ہیں۔ یہ طریقہ اچھا نہیں ہے۔ اس معاملہ میں مولانا تھانوی کے منتسبین کا رویہ بہت اچھا ہے کہ ان میں جرأت ہے وہ ہر مسئلہ کی تحقیق کرتے ہیں اور جب تک بات سمجھ میں نہیں آتی اپنی رائے پر جمے رہتے ہیں اور جب تحقیق ہو جاتی ہے تو نہایت وسعت نظری کے ساتھ اس کا اعلان کرتے ہیں۔ مثلاً لاؤڈ اسپیکر اور تار اور ریڈیو کے ذریعہ چاند کی خبر کے عدم جواز پر وہ لوگ شدت سے مصر رہے۔ مگر ان کی تحقیق میں جب بات واضح ہو گئی تو اس کے جواز کا فتویٰ دیا اور بلا تردد اس کے حق میں ہو گئے۔

ایک مرتبہ ملکی و قومی مسائل کے سلسلے میں بات چلی، میں نے چند باتیں کھل کر کہیں۔ مولانا مرحوم ان کے جوابات دیتے رہے اور سمجھاتے رہے۔ میں نے کہا کہ آپ کی یہ باتیں اطمینان بخش نہیں ہیں۔ بلکہ صرف اقناعی ہیں۔ یہ سن کر اپنے خاص رنگ میں آ گئے اور کھڑے ہو کر کہنے لگے کہ میں آپ کی ان اصطلاحات سے مرعوب نہیں ہو سکتا۔ بات سمجھنے کی کوشش کیجئے۔ ہر بات اپنے خاص انداز و فکر ہی سے نہیں سوچی جاتی بلکہ حالات و واقعات کو سامنے رکھ کر اس پر غور کرنا پڑتا ہے۔

آخری مرتبہ جب علاج کے سلسلے میں بمبئی تشریف لائے تو ایک دن باتوں باتوں میں فرمانے لگے کہ الیکشن سے سالوں پہلے سے مجھ پر طرح طرح سے دباؤ ڈالا جا رہا ہے کہ میں یو۔پی کانگریس کمیٹی کا سکریٹری بن جاؤں۔ فلاں فلاں نے مل کر زور ڈالا، اور فلاں فلاں نے ٹیلیفون پر اصرار کیا۔ ظاہر ہے کہ صوبہ کے امیدواروں کی درخواست وغیرہ کا معاملہ کانگریس کمیٹی کے سکریٹری کے ہاتھ میں تھا۔ کانگریس کا سکریٹری بن جانا صوبائی حکومت مل جانے کے مترادف تھا۔ مگر میں نے اصرار کے ساتھ اس عہدہ سے اس لئے صاف انکار کر دیا کہ اس کے بعد پھر مسلمانوں کے معاملات میں کھل کر حصہ نہیں لے سکتا ہوں اور میری دوڑ دھوپ اور زبان بھی بند ہو جائے گی۔ مجھے عہدہ نہیں چاہئے، بلکہ خدمت چاہئے اسی جذبہ کے ماتحت میں امیدوار بن کر کھڑا ہوا ہوں۔ میں بمبئی میں زیر علاج ہوں مگر میرے حلقے میں کہاں کہاں سے مخلصین آ کر کام کر رہے ہیں۔ اگر مجھے آرام کرنا ہوتا تو آج بھی اس کے بہت سے

موافق ہیں. بلکہ پیش کش ہے۔

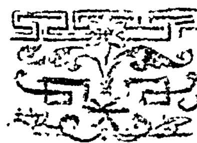
ان ہی ایام میں ایک دن میں نے کہا کہ یو، پی کے وزیر داخلہ نے آپ پر جو الزامات لگائے اور آپ نے جو صاف صاف جوابات دیئے اس کے نتیجہ میں آپ کے سرکاری اور سیاسی حلقہ کے لوگوں سے تعلقات کیسے ہیں؟ اور دہلی میں جو ایک گروپ جمعیۃ علماء کی شکایات اور شکایات میں پیش پیش رہ کر اپنے مفاد کے چکر میں تھا اس کی دوڑ دھوپ کا اثر کچھ ہے یا نہیں، تو مولانا مرحوم نے فرمایا کہ جہاں تک وزیر داخلہ کے الزام اور میرے جواب کا تعلق ہے اس سے سرکاری یا سیاسی حلقہ پر کوئی خاص اثر نہ پہلے تھا اور نہ اب ہے۔ بلکہ اس سلسلہ میں کئی باتیں صاف ہوگئیں اور لوگوں کی بہت سی غلط فہمیاں دور ہوگئیں جمہوری سیاست میں ایسی باتیں عام طور سے مفید ہوا کرتی ہیں

اور جمعیۃ علماء کے مخالف گروپ کی سرگرمی اب تھک تھکا کر ٹھنڈی پڑ گئی ہے۔ ان بے چاروں نے جس مقصد کے لئے یہ سب کام کیا تھا وہ پورا نہ ہوا حتیٰ کہ الیکشن کے زمانہ میں حکومت کی طرف سے جو سیاسی جماعتوں کو ریڈیو پر اپنا پروپیگنڈہ کرنے کا پروگرام بنایا گیا ہے اس میں کانگریس کے مقررین میں حفظ الرحمٰن کا نام بھی رکھا گیا ہے جب کہ ان بے چاروں کا کہیں پتہ تک نہیں ہے۔ اختلافات اپنی جگہ پر ہوتے ہیں ٹکراؤ ہوتا ہے اور شکوہ شکایت کی باری بھی آتی ہے۔ مگر کام کرنے والوں کو لوگ خوب جانتے ہیں اور وہی کام بھی آتے ہیں

مولانا مرحوم کا افریقہ جاتے آتے ممبئی میں رکنا ہوا تھا۔ واپسی پر کئی دنوں تک مقیم رہے۔ چونکہ چند ہفتوں کے لئے ملک سے باہر رہے اور ملکی معاملات وحالات سے متاثر نہیں تھے۔ اس لئے افریقہ کے دلچسپ حالات، وہاں کے فطری مناظر، سبزہ تفریح، سیاسی اور ملکی حالات بڑے دلچسپ انداز میں بیان فرماتے تھے۔ متعدد راتوں کو اس کے لئے ہماری مجلسیں جمتی تھیں۔ میں سوالات کرتا اور مولانا معلومات بہم پہنچاتے اور مجمع غور وشوق سے سنتا ایسا معلوم ہوتا تھا ابن بطوطہ اپنے کیف سفر کو ابن جزی کے سامنے بیان کر رہا ہے اور وہ قلم بند کرتا جاتا ہے افسوس کہ میں نے یہ کیف سفر قلم بند نہیں کئے۔ ورنہ شمالی افریقہ کے بارے میں ہمارے لئے اچھا خاصہ معلوماتی مقالہ تیار ہو جاتا۔ اب بھی مولانا کی بیان کردہ بہت سی باتیں ذہن میں موجود ہیں۔

ان تمام نجی مجلسوں میں عام طور سے محترم مولانا حکیم اعظمی صاحب صدر جمعیۃ علماء مہاراشٹر اور محترم مولانا حامد الانصاری غازی سکریٹری جمعیۃ علماء مہاراشٹر اور راقم ہوا کرتے تھے۔ چھوٹا ہونے کی وجہ سے عام طور سے میں بات نکالتا تھا۔ اگر الٹی سیدھی بات ہو جاتی تو اسی وجہ سے قابل درگذر بھی ہوا کرتی تھی۔ چونکہ مولانا مرحوم خود جرأت مند انسان تھے۔ اس لئے ہم چھوٹوں کی جرأت کی بڑی قدر فرماتے تھے اور کوئی بات مزاج کے خلاف بھی پڑتی تو برا نہیں مانتے تھے۔ البتہ اپنے خاص رنگ میں آکر سمجھانے کی کوشش فرماتے تھے۔

قیام ممبئی کے زمانے کی بہت سی دلچسپ معلوماتی اور اہم باتیں ہیں، جن میں سے بہت سی باتوں کے بیان کرنے کا یہ موقع نہیں ہے۔ مولانا ہم میں نہیں ہیں۔ مگر ان کی ایک ایک حرکت اور سکون نگاہوں کے سامنے ہے رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً۔



گلہائے عقیدت

نتیجۂ فکر جناب شہباز صدیقی ـــــ امروہہ

رات رخصت ہو رہی تھی سارے عالم سے کہ تھا وقت سحر
حفظ الرحمٰن نے کیا جب دارِ فانی سے سفر
پنجشنبہ کی تھی آمد انتیسویں تاریخ تھی
سن تھا تیرہ سو بیاسی، ماہ تھا ماہِ سفر

رہبرِ دیں حفظ الرحمٰن کی وفات
باعثِ صد حزن و ماتم ہو گئی،
دیکھئے جس کو وہ ہے افسردہ جاں
مرگِ عالم مرگِ عالم ہو گئی

دے کر کمالِ جرأت ہمت کا اس نے درس
دل سے مٹایا قوم کے احساسِ کمتری
قطرہ میں جیسے بھر دیا طوفان کا خروش
ذرہ کو جیسے بخش دی سورج کی ہمسری

واقفِ اسرارِ قرآں، محرمِ رازِ حدیث
عالمِ شرعِ پیمبر، حاجی بیت الحرام
بزم میں سردارِ محفل رزم میں سالارِ فوج
اوجِ منبر پر مقرر، صحنِ مسجد میں امام

(قاضی محمد عدیل عباسی ایڈوکیٹ بستی)

مردِ کامل مولانا حفظ الرحمٰن

آفتا بے کہ از تجلی او
افق ارم و شام نورانی

بعض ہستیاں ایسی ہوتی ہیں جو اس دُنیا سے گزرنے کے بعد ملک میں ایسا خلا پیدا کر جاتی ہیں جس کا پُر کرنا بہت دشوار ہوتا ہے اور کبھی کبھی ایک قرن، ایک صدی یا اس سے زیادہ کا انتظار کرنا پڑتا ہے "جبکہ مردے از غیب" نمودار ہو کر اس کمی کو پورا کرے جو موت کے ظالم لیکن ناگزیر ہاتھ نے پیدا کیا ہے۔ ایسی ہستیاں بالعموم ہمہ گیر ہوتی ہیں اور فکر و نظر میں بھی اور عمل و سعی میں بھی انقلاب آفرین ہوتی ہیں۔ اسی طرح کی ایک ہستی مولانا حفظ الرحمٰن رح کی تھی جو سیوہارہ ضلع بجنور کے گاؤں سے ایک کرن کی طرح نمودار ہوئی اور آفتاب بن کر تمام ہندوستان اور ہندوستان کے باہر ایشیا و افریقہ کے بلاد پر چمکی، زمانہ بہت سی کروٹیں لے گا زمین اپنے محور پر کتنے چکر کاٹے گی تب کہیں جا کر ایک ایسی جامع شخصیت کا وجود ہو سکے گا۔

آفرینندۂ عہد

مولانا کو بجا طور پر آفرینندۂ عہد کہا جا سکتا ہے۔ مولانا نے جب دُنیا میں آنکھ کھولی تو خلافت اسلامیہ اور اتحاد اسلام کا پاکیزہ تصور پارہ پارہ ہو رہا تھا، حتیٰ کہ وہ وقت آیا کہ ایک طرف علامہ شبلی مرحوم مرثیہ خواں تھے۔

س　حکومت پر زوال آیا تو پھر نام و نشاں کب تک
چراغِ کشتۂ محفل سے اوٹھے گا دھواں کب تک

دوسری طرف علامہ اقبال دل گیر ہو کر پکار رہے تھے کہ　ع
خاک و خون میں مل رہا ہے ترکمانِ سخت کوش

ہندوستان میں مسلم فرقہ پرستی زوروں پر تھی۔ فرقہ پرستی دراصل خوف اور بے یقینی سے پیدا ہوتی ہے جب منزل کا پتہ نہیں لگتا اور ہمت جواب دے جاتی ہے تو انسان اپنے کو ایک حصار میں بند کرنا چاہتا ہے اسی سے تنگ نظری جنم لیتی ہے اور واہمہ کو ڈراؤنے خواب نظر آنے لگتے ہیں اسی لئے مولانا ابوالکلام آزاد نے مسلمانوں کو مخاطب کر کے کہا تھا "وہ وساوس ہیں جنھیں انکار کہتے ہو خطرات ہیں جنھیں عزائم کہتے ہو" مولانا ان وساوس اور خطرات سے بہت دور تھے اور اپنی زندگی میں قوم کو ان مہلک بیماریوں سے نجات دلانے کے لئے اُنھوں نے جو کچھ کیا وہ کوئی دوسرا نہ کر سکا اور میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ بڑی حد تک کامیاب ہوئے اور ان کا مشن روز افزوں ترقی کے ساتھ جاری رہے گا۔

مسلمانانِ ہند میں فکر و نظر کی پختگی اور صحیح الخیالی پیدا کرنے کے لیے کام پہلے سے ضرور شروع ہوا تھا۔ اور ایشیا کی وہ سب سے بڑی علمی و اسلامی درس گاہ جو دار العلوم دیوبند کے نام سے موسوم ہے اور جس نے کبھی کسی حکومت سے امداد نہیں لی ان معتقدات کا سنگ بنیاد رکھ چکی تھی۔ مولانا محمود الحسن رح نے انگریزی حکومت کی موجودگی میں گاندھی جی کے برسرِ عام آنے سے پہلے تمام قوموں کی ایک ملی جلی مشترک حکومت "عارضی جمہوریہ ہند" کے نام سے قائم کر دی تھی۔ جمعیۃ علماء ہند کا بھی قیام عمل میں آ چکا تھا جس نے متحدہ قومیت اور مشترکہ حکومت کو جائز اور آزادی و خود مختاری کے لئے سعی و جہد ضروری قرار دی تھی۔ مگر اس فکر و نظر کی تفصیلات کو طے کرنے سے ایک مجموعۂ و قعات قانون بنانے اور اس کی ہر مشکل گرہ کو کھولنے کا کام اور اسے عملی جامہ پہنانے کی خدمت مولانا حفظ الرحمٰن نے اسی طرح کی جس طرح لینن نے کارل مارکس کے نظریات کو تجربہ اور عمل میں لاکر کمیونزم کو عالم آشکارا کیا۔ آج جس کا نام ہندوستان میں نیشنلزم رکھا جاتا ہے اور جس کی مطابقت دیگر ملکوں سے کر کے اس کے حسن و قبح پر بحث کی جاتی ہے وہ مولانا حفظ الرحمٰن کے نزدیک ایک واضح اور بہتر سہی مسئلہ کا انکشاف تھا۔ ہندوستان ایک ایسا ملک ہے جس میں مختلف مذاہب کے لوگ بستے ہیں۔ اور جہاں پیروانِ اسلام عددی طور پر اقلیت میں ہیں، سوال یہ ہے کہ یہاں مسلمان کس طرح زندگی گذاریں۔ مولانا نے اس نظریہ کو ایجاد تو نہیں کیا کہ وہ پکے مسلمان ہوتے ہوئے پختہ ہندوستانی بنیں ملک و وطن کی خدمت میں سب سے آگے آگے رہیں، احساس کمتری کو ترک کر دیں اور اسلام پرستی و وطن دوستی میں کسی قسم کا تضاد تصور نہ

کریں۔ لیکن جو نظریہ پہلے سے موجود تھا اسے مدون کرنے اور اسے منظر عام پر بیباکی اور حق گوئی کے ساتھ لانے میں انھوں نے جو خدمت انجام دی، اس کی حیثیت "فکر و نظر" میں انقلاب پیدا کرنے کے مرادف ہے۔ وہ بہ یک وقت جمعیۃ علماء ہند کے ناظم اعلیٰ۔ اسلامی جلسوں کے جادو بیان مقرر، دار المصنفین" میں حقائق اسلام کو اجاگر کرنے والے مصنف اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ممبر اور پارلیمنٹ کے رکن تھے۔ اپنے عالمانہ و محققانہ انداز۔ اپنی سحر آفرین خطابت۔ اپنی بے پناہ قوت تصنیف و انشا پردازی۔ اپنی اعلیٰ شخصیت، سادگی و پاکیزگی، جرأت و دلیری، جذبہ خدمت، اخلاق عالیہ، منجھے ہوئے کلچر اور قربانی و ایثار سے وہ ہر جگہ چھائے رہتے تھے۔ کانگریس میں جاتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ ہندوستان کے عظیم لیڈروں میں ہیں۔ اسلام کی خدمت تقریر اور تحریر سے کرنے پر آتے تھے تو اکابر علمائے روشن خیال میں نظر آتے تھے۔ اس طرح وہ اس زمانہ کو پیدا کرنے میں کامیاب ہوئے جو ہندوستان کی سالمیت اور وحدت کو بھی قائم کرتا ہے اور ہندوستان کے پانچ کروڑ مسلمانوں کے لئے ایک شاندار مستقبل کی بھی نشان دہی ہے۔ قوم نے ناانصافی کی جو انھیں صرف "مجاہد ملت" کہا وہ اس سے بہت اونچے تھے۔

بصیرت اور روشن خیالی

مولانا نے لاکھوں بلکہ کروڑوں انسانوں کو متاثر کیا اس میں مذہب اور ذات پات کی قید نہیں ہے۔ مسلمان اور ہندو کا امتیاز نہیں ہے۔ جس کی وجہ ان کی بصیرت اور روشن خیالی تھی۔ ہندوستان سے متعلق جتنے معاملات آتے تھے۔ اُن میں وہ صرف ہندوستان کی بسنے والی پانچ کروڑ مسلم آبادی ہی کے مفاد کے تصور کے دائرے میں گھرے نہیں رہتے تھے بلکہ ۴۴ کروڑ ابنائے ہند کے فائدے اور مستقبل کو مد نظر رکھتے تھے انھیں ہندوستان کے ایک ایک   سے محبت تھی خواہ وہ کسی مذہب وملت اور کسی ذات اور قوم کا ہو۔ سوائے ان معاملات کے جن کا تعلق مسلمانوں کے مذہب اور کلچر اور شعائر کے تحفظ و ترقی سے تھا۔ بقیہ دیگر امور یعنی اقتصادیات خوش حالی غریبی مرض وبا اور بہت سی مشکلات سے دوچار ہونے اور ان پر قابو پانے میں وہ مسلمانوں کی تقدیر کو دوسری قوموں سے نہ صرف وابستہ سمجھتے تھے، بلکہ اس کا پورا پورا یقین رکھتے تھے اور نہایت صفائی کے ساتھ اس کی تلقین بھی کرتے تھے۔ غالباً مولانا حفظ الرحمٰن پہلے بڑے عالم ہیں جنھوں نے کانگریس کے الکشن دیگر کانگریسیوں کی طرح لڑائے اور ان کو ہر فرقہ کی تائید و مخالفت حاصل رہی۔ وہ اپنے ذہن و مزاج کے لحاظ سے عوامی تھے اور اسی لئے وہ عوام کی قیادت کرتے تھے ان سے پہلے حضرت شیخ الہند بھی صوبہ کانگریس کے نائب صدر رہتے، مگر وہ اس بلندی پر تھے جہاں پارٹیوں کی اندرونی آویزش کا اثر نہ ہو سکتا تھا بلاشبہ حضرت شیخ کی کتاب متحدہ قومیت اور ان کا بحیثیت رکن کانگریس کے جلسوں میں شریک ہونا بڑے جرأت مندانہ اقدامات تھے۔ مگر جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا حضرت شیخ کتاب تھے اور مولانا حفظ الرحمٰن اس کی شرح۔ وہ اسی سلسلہ کی ایک کڑی تھے۔ مگر ایسی کڑی تھے جس سے ساری زنجیر کو نمایاں کر دیا تھا۔ جب وہ کانگریس کے اندر الکشن لڑاتے تھے تو کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی ہیں جن کی اسلام پر بصیرت افروز تقریروں اور تحریروں سے سارا ہندوستان گونج رہا ہے وہ اس وقت ایک پختہ کار کانگریسی ہوتے تھے میں نے ان کو انڈین نیشنل کانگریس کا نام ہمیشہ بڑی محبت سے لیتے سنا ہے اور وہ کانگریس کو کانگریس نہیں بلکہ ہمیشہ انڈین نیشنل کانگریس کے نام سے یاد کرتے تھے، عرصہ سے ہندوستان کے مسلمانوں میں کئی قسم کے لوگ ہیں ایک وہ ہیں جن کی سمجھ ہی میں نہیں آتا ہے کہ اسلام کے دعوے کے باوجود ایک متحدہ قومیت اور ایک مشترکہ حکومت کا تخیل قائم کیسے ہو سکتا ہے یہ لوگ تمام ان باتوں میں مجبوراً حصہ لیتے ہیں جو ان کی روزمرہ کی زندگی سے تعلق رکھتی ہیں مگر اسے خلاف اسلام بھی سمجھتے ہیں۔ اس لئے برابر اپنے کو گنہ گار تصور کرتے رہتے ہیں یہی وہ خیال ہے جو احساس کمتری پیدا کرتا ہے اور جس سے آگے چل کر بڑی بڑی برائیاں پیدا ہوتی ہیں۔ دوسرے وہ لوگ ہیں جو ان باتوں کو جائز تو سمجھتے ہیں مگر انھیں رخصت کے اس درجے پر رکھتے ہیں جو کراہت کی حد کے قریب ہے میں جب ۱۹۴۶ء میں مسلم لیگ سے الیکشن لڑ رہا تھا تو اس صوبہ کے ایک ممتاز عالم میرے لئے ایک جلسہ میں تقریر کرنے آئے۔ وہ بڑے فصیح البیان مقرر تھے اور انھوں نے پاکستان کی خرابیاں طرح طرح سے ثابت کیں، اور کانگریس کی تائید کی مگر فخریہ لہجہ میں یہ بھی کہا کہ "میں کبھی کانگریس کا ۴ آنے کا ممبر نہیں بنا" مولانا حفظ الرحمٰن کی زندگی کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے مسلمانان ہند کی ایک کافی آبادی کو اپنی تبلیغ اور اپنے عمل سے اس تنگ نظری سے باہر نکالا اور ان میں ذوق یقین

اور جوش عمل پیدا کیا انھوں نے ایک ماہر فن استاد کی طرح قوم مسلم کو سکھایا کہ وہ عوغائے عالم میں حصہ لے اور ہندوستان کے ایک بسنے والے کی حیثیت سے شہریت کے تمام حقوق کا مطالبہ کرے اس کے حصول کے لئے جد وجہد کرے اور پورے انشراح قلب سے دوسری قوموں اور دوسرے مذہب والوں کے ساتھ دوش بدوش ملکی ترقی میں سعی و کوشش کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھے۔ جمعیۃ العلماء اور بہت سی اور نیشنلسٹ جماعتوں کا بلا شبہ یہی نظریہ تھا۔ مولانا حفظ الرحمٰن اس میں منفرد نہ تھے وہ تو وہی بات کہتے تھے جو ہر مکتبہ خیال کے پانچ سو سے زائد علما متفقہ طور پر کہہ چکے تھے جن کے تقدس اور جن کے علم و تحقیق کی مثالیں کم ہیں مگر مولانا حفظ الرحمٰن کی حیثیت ایک میر کارواں کی تھی، انھوں نے اس نظریہ کو جاندار بنایا اسے خلعت فاخرہ بخشا اور اپنے پختہ عقیدہ بے پناہ عزم مسلسل عمل جرأت و بیباکی ایثار و قربانی اور بے مثال ذہن، اور باریک بینی سے اسے اجاگر کر دیا کہ معلوم ہوتا ہے کہ وہی اس کے موجد تھے لاکھوں انسان ان کے پیرو تھے اور ان کے ہر قول کو واجب التعمیل سمجھتے تھے انہی میں یہ عاجز بھی تھا۔ میں اس پر فخر نہیں کرتا مگر میری عادت نکتہ چینی کی ہے اور میں نے آج تک کسی کی کورانہ تقلید نہیں کی۔ اگر مولانا حفظ الرحمٰن دن کو رات کہہ دیتے تو میں تسلیم کر لیتا کیونکہ مجھے ان کے سوچنے کے انداز اور ان کی دیدہ وری پر پورا بھروسہ تھا۔

ملت اسلامیہ ہند کی خدمت

اس عوامی نظریہ کے ساتھ انھوں نے ملت اسلامیہ ہند کی جو گراں بہا اور ان مٹ خدمات انجام دیں وہ تاریخ میں زریں حروف سے لکھی جائیں گی آئندہ کا مورخ جب اس زمانہ کے حالات قلمبند کرے گا تو انھیں یقیناً نجات دہندہ کا لقب دے گا ۱۹۴۷ء کی آزادی کی برکتوں کے ساتھ پاکستان کے قیام کے ردعمل کے طور پر نفرت اور تنگ نظری کی جو فضا پیدا ہوئی وہ محتاج بیان نہیں ہے۔ ہر نیشنلسٹ مسلمان کا یہ خیال تھا کہ اس فضا کی بالواسطہ ذمہ داری مسلم لیگ پر ہے، یہ خیال صحیح ہو یا غلط اس سے یہاں بحث نہیں ہے واقعہ یہ ہے کہ مولانا کا نظریہ بھی یہی تھا۔ وہ مسلم لیگ سے بے پناہ جرأت و دلیری کے ساتھ لڑے تھے اور ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں ان لوگوں کے ساتھ محبت اور بھائی چارے کا رشتہ قائم کرنا بہت ہی دشوار تھا لیکن اس عظیم انسان کے لئے یہ بات جو ہم سب لوگوں کے لئے بڑی مشکل تھی ایسی آسان نکلی کہ گویا اس میں کوئی بات ہی نہ تھی وہ ہر مسلم لیگی کے لئے پشت پناہ تھے اور پنجاب سے مدراس اور کلکتہ سے پونا تک دورہ کر کے چیختے تھے کہ مسلمان سے وفاداری کا مطالبہ غلط ہے وہ ملک و وطن کا وفادار ہے۔ کریم النفسی اور عالی ظرفی کی ایسی نادر مثال شاید ہی مل سکے۔ پھر ان لوگوں سے جو وفاداری کا مطالبہ کرتے تھے مولانا بجلی کی کڑک دار آواز سے خطاب کرتے تھے۔ مجھے وہ منظر کبھی بھول نہیں سکتا جب کانفرنس مسلمانان ہند لکھنؤ میں منعقد ہوئی۔ اس وقت وفاداری کا مطالبہ اپنے عروج پر تھا۔ تمام ہندوستان کا مسلمان یہاں جمع تھا۔ امام الہند صدر تھے۔ اس میں مولانا حفظ الرحمٰن نے ایک یادگار تقریر کی تھی، اب تک جب میں اس تقریر کو سوچتا ہوں تو میرے کانوں میں بجلیاں کڑکتی اور توپیں گرجتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ انھوں نے جو الفاظ کہے تھے ان کا مفہوم میں ذیل میں درج کرتا ہوں:-

> "ہم کسی جماعت پارٹی یا حکومت کے وفادار نہیں ہیں ہم صرف ملک اور وطن کے وفادار ہیں، اگر کوئی جماعت پارٹی یا حکومت ہم سے وفاداری کا مطالبہ کرتی ہے تو ہم اسے بتا دینا چاہتے ہیں کہ اگر وہ جماعت یا پارٹی یا حکومت غلط راستوں پر جائے تو ہمارا کام اس کو سیدھا کرنا یا الٹ دینا ہے، جو افراد یا جماعتیں ہم سے وفاداری کا مطالبہ کرتی ہیں ہم ان سے ملک کی وفاداری کا مطالبہ کرتے ہیں جو لوگ فرقہ پرستی تنگ نظری یا تعصب پیدا کرتے ہیں وہ ملک کے غدار اور وطن کے دشمن ہیں ان کو کسی دوسرے سے وفاداری کے مطالبہ کا کوئی حق نہیں ہے وہ خود اپنی وفاداری کا امتحان دیں۔"

میں نے دیکھا کہ ہر صوبہ کا مسلمان جو پژمردہ۔ مایوس۔ خوف زدہ اور مضمحل تھا ایک دم بشاش ہو گیا اور گردن اٹھا کر اور سینہ تان کر چلنے لگا۔ یہ ایک مثال نہ صرف ان کی جرأت و دلیری اور وطن دوستی کی ہے کیوں کہ انتہائی درجہ تک محب وطن ہوئے بغیر کوئی شخص اس طرح کی باتیں کہنے کی ہمت ہی نہیں کر سکتا۔ بلکہ یہ ان کی بے مثال ذہانت کو بھی ظاہر کرتی ہے یہی ان کی نکتہ بینی اور صحیح الفکری تھی جو انھیں اپنے عصر کے لوگوں پر ممتاز کرتی تھی۔ میں نے بچشم خود دیکھا ہے کہ نہ صرف علما بلکہ بڑے بڑے انگریزی داں وکیل ماہر سیاست ملکی امور میں ان کے سامنے طفل مکتب نظر آتے تھے۔ چنانچہ آج مولانا کی یہ تقریر ایک

اصول مسلمہ بنی ہوئی ہے اور اس نے بے شمار پریشاں دماغیوں کا خاتمہ کر دیا ہے۔ ہندوستان کا کوئی گوشہ کوئی گاؤں ایسا نہیں تھا، جہاں سے ان کے پاس فریاد نہ جاتی ہو اور جہاں وہ خود اس فریاد پہ دوڑ کر نہ پہونچتے ہوں یا کسی کو بھیج کر یا مقامی اشخاص کو لکھ کر اس پر پوری توجہ نہ صرف کرتے ہوں۔ اس میں وہ اپنے عقیدے پر بھی اصرار نہ کرتے تھے۔ اگر اجمیر شریف اور خواجہ بختیار کاکیؒ کے عرس بند کئے جاتے تھے تو یہ مولانا حفظ الرحمٰن کی ذات تھی کہ اس کھلوانے کے لئے مجاہدہ کرتی تھی۔ چھوٹی سے چھوٹی باتیں بھی ان کی توجہ کا مرکز بنتی تھیں۔ اور یہی وجہ تھی کہ سارے ہندوستان کا مسلمان انھیں ملجا و ماویٰ سمجھنے لگا تھا۔ ان کے بارے میں امیر مینائی کا یہ شعر پورے طور پر موزوں ہے ؎

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

۱۹۵۰ء و ۱۹۵۱ء کے ہنگامہ خیز زمانہ میں وہ یوم النبی کمیٹی لبتی کی درخواست پر ۱۲ ربیع الاول کو تقریر سیرت کرنے آئے اور میرے مہمان ہوئے۔ میں نے کسی کی دعوت نہیں کی تھی مگر ۵۰۔۶۰ آدمیوں کا کھانا پکوایا تھا کیونکہ میں جانتا تھا کہ ان کا نام سن کر قرب و جوار کے مواضعات کے مقامی مسلم کارکن دوڑ پڑیں گے چنانچہ یہی ہوا گونڈہ فیض آباد، بہرائچ، گورکھپور، دیوریا، غازی پور، بلیا، سلطان پور وغیرہ سے لوگ اپنی شکائتیں لے کر آئے۔ اور اپنی اپنی کہانیاں بیان کرتے تھے۔ مولانا بڑے ہی صبر و سکون سے سب کی باتیں سنتے تھے اور جواب دیتے تھے۔ جس چیز نے سب سے زیادہ مجھ کو متاثر کیا وہ مولانا کا اطمینان اور سکون قلب تھا۔ وہ مطمئن تھے کہ فرقہ واریت دم توڑ کر رہے گی ان کا خیال تھا کہ آدھی لڑائی جیتی جا چکی ہے اور آدھی صرف باقی ہے جو جلد جیت لی جائے گی۔ اس کے علاوہ وہ ہندو فرقہ واریت سے اسی طرح لڑ رہے تھے جس طرح وہ مسلم فرقہ واریت سے لڑ چکے تھے کبھی میں نے ان کے اندر نفرت یا تلخی نہیں پائی اور نہ مایوسی ان کے قریب آئی۔ ان کے نزدیک یہ کام بھی حق و صداقت ملکی و وطنی سالمیت کی گراں بہا خدمات تھے۔

دستور ہند

جو مسلمان پاکستان چلے گئے ان کی متروکہ جائداد، گاؤں گاؤں میں قبرستانوں کے کھودے جانے کے قضیئے مسجدوں کی تعمیر میں رکاوٹیں بلوے اور فسادات اور اس سلسلہ میں حکام کی بعض جگہ بے راہ رویاں یہ سب اور ان کے علاوہ بہت سے بڑے اور چھوٹے معاملات ہمہ وقت ان کے پیش نظر رہتے تھے۔ اس سلسلہ کی داستان طویل ہے مگر سب سے بڑا احسان جو انھوں نے ملت اسلامیہ پر کیا وہ دستور ہند کا موجودہ ڈھانچہ ہے اس وقت مولانا دستور ساز اسمبلی کے ممبر تھے اور کم لوگوں کو یہ معلوم ہے کہ اقلیتوں کو جو حقوق دیئے گئے ہیں ان کی ترتیب و تدوین میں مولانا حفظ الرحمٰن کا بہت بڑا ہاتھ ہے آج یہی دستور کی دفعات ہیں، جو مسلمانوں کو ہندوستان میں سر بلند رکھ سکتی ہیں اور اگر ان میں ان حقوق کے حاصل کرنے کی طاقت پیدا ہو جائے یعنی وہ احساس کمتری سے نکل آویں تو ان کا مستقبل تابناک ہو سکتا ہے۔ مولانا بار بار کہتے تھے مسلمانوں سے احساس کمتری مٹانا اس عصر کی سب سے بڑی خدمت ہے ایک مرتبہ مولانا نے مجھے ایک خط لکھا اور ایک خاص قومی معاملہ میں مجھ سے رائے طلب کی میں نے جواب میں عرض کیا کہ میں تو آپ کا پورا نہ مقلد ہوں لیکن آپ رائے پوچھتے ہیں تو بہ تعمیل حکم عرض ہے کہ بات یوں ہے اس پر مولانا نے مجھے لکھا کہ آپ کے جواب سے طبیعت بہت خوش ہوئی، اگر اسی طرح مسلمان احساس کمتری کو اپنے دلوں سے نکال پھینکیں تو ہمارے کل معاملات آناً فاناً حل ہو سکتے ہیں۔ احساس کمتری کو مٹانا دستور کے دیئے ہوئے حقوق کو حاصل کرنے کا ایک ذریعہ اور عمل ہے دستور نے جو حقوق دیئے ہیں وہ ایسے جامع ہیں کہ ان کے بارے میں کوئی بھی آج تک اضافہ کی ہمت نہ کر سکا۔ جو لوگ حکومت الٰہیہ کا خواب دیکھتے ہیں اور ملک کی اس طرز حکومت کو نظام باطل کے نام سے پکارتے ہیں وہ بھی دستور ہند کے ان دفعات کی داد و تحسین کرتے ہیں، جن میں مذہبی اور لسانی اقلیتوں کے حقوق درج ہیں۔ مگر یہ حقوق بلا احساس کمتری کو دور کئے حاصل نہیں ہو سکتے ہیں۔ مولانا کا یہ زبردست مشن تھا کہ مسلمان احساس کمتری کو ترک کریں وہ فرمایا کرتے تھے کہ زمانہ حاضرہ کی سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ مسلمانوں سے احساس کمتری کو دور کیا جائے۔ یہ ان کے فکری گہرائی کی واضح مثال ہے۔

دینی تعلیمی تحریک

مولانا حفظ الرحمٰن کو بجا طور پر دینی تعلیمی تحریک کا موجد و محرک قرار

دیا جا سکتا ہے انکی دوررس نگاہوں نے دیکھ لیا تھا کہ مسلمان بچوں کو موجودہ
ماحول میں دینی تعلیم دیئے بغیر آئندہ کی نسلوں کا مسلمان رہنا دشوار ہوگا
وہ مسلمانوں کو اس سانچے میں جو دستور ہند کے ذریعے انھوں نے تیار
کرایا تھا پوری طرح فٹ کرنا چاہتے تھے۔ ان کی وطن دوستی اور ملک نوازی
اسلام کے اصولوں سے کسی مصالحت پر مبنی نہ تھی بلکہ ملک وطن تمام
ہندوستان کی اقلیت واکثریت کی خدمات وہ صرف اسلام کے احکام
کے ماتحت کرتے تھے۔ انھوں نے خوب سوچ سمجھ کر یہ رائے قائم کی
تھی کہ ملک کی ترقی کے ساتھ مسلمانوں کی ترقی اور ملک کی تنزلی کے ساتھ
مسلمان کا تنزل بھی وابستہ ہے۔ اور یہی امر حق ہے کہ ملک سے محبت
اور دوستی میں کسی منافقت کو دخل نہ دیا جائے کیونکہ وہ کشتی جس پر ہندو
مسلمان، سکھ، عیسائی، پارسی سب سوار ہیں اگر ڈوبے گی تو سب
ڈوب جائیں گے کوئی نہ بچے گا۔ مگر اسی کے ساتھ وہ مسلمانوں کی مذہبی
وثقافتی انفرادیت کو نہ صرف قائم رکھنا چاہتے تھے بلکہ اُسے اجاگر
کرنے کے لئے بے چین رہتے تھے اس لئے بنیادی دینی تعلیم پر
انھوں نے نہ صرف حد سے زیادہ زور دیا بلکہ بمبئی میں اس کے لئے
ایک آل انڈیا کنونشن بھی کیا اور ایک آل انڈیا دینی تعلیمی بورڈ بھی بنایا
جس کی شاخیں تمام صوبوں میں قائم کیں۔ مولانا ایک بہت مصروف آدمی
تھے مگر قوم کو انھوں نے ایک فکر دیدی۔ اور جہاں تک ہوسکا اس کے
لئے کوشش اور جدوجہد بھی کی۔

جمعیۃ علماء ہند

مولانا کو جمعیۃ علماء ہند سے بے پناہ محبت تھی بلکہ ہم لوگ کبھی کبھی
یہ محسوس کرتے تھے کہ اس میں ان کو غلو کا درجہ حاصل ہے۔ مجھے ایک
مرتبہ انھوں نے لکھا کہ میں ان لوگوں کو بہت ناپسند کرتا ہوں جو میری تو
تعریف کرتے ہیں اور جمعیۃ علماء ہند کی مذمت کرتے ہیں۔ میں جمعیۃ کا ایک
خادم ہوں اور میں جو کچھ کرسکتا ہوں یا کرتا ہوں وہ تنہا میرا کارنامہ نہیں
میرے جملہ رفقاء کی مشترکہ جدوجہد کا نتیجہ ہے۔ ایک کل ہند جماعت
بنانا یا بنی ہوئی جماعت کو قائم و برقرار رکھنا کوئی ہنسی کھیل نہیں ہے۔ تقسیم
کے بعد ملک کے اندر ایک ایسا طبقہ پیدا ہوچکا تھا جو مسلمانوں کی ہر تنظیم کا
مخالف تھا۔ جمعیۃ علمائے ہند کے شاندار ماضی کو نظر انداز کرکے وہ طبقہ
اس کا بھی دشمن تھا کیونکہ جمعیۃ اب مسلمانوں کی آواز تھی۔ جمعیۃ علمائے ہند
کو بڑے طوفانوں سے گزرنا پڑا مگر مولانا حفظ الرحمٰن نے اس امانت کو
جو انھیں اپنے بزرگوں سے ملی تھی بہت سنبھال کر رکھا۔ اور نہ صرف سنبھال
کر رکھا بلکہ بہت ترقی دی۔ جمعیۃ کی یہ خوش قسمتی تھی کہ ان کو ایک ایسا قائد
ملا تھا جس کا کوئی رقیب نہ تھا۔ اور اگر کبھی اندرونی اختلافات رونما ہوئے
جو ہر زندہ جماعت کے لئے لازمی ہیں تو ان کی بات کوئی ٹالنے والا نہ تھا
وہ سب کو ایک دھاگے میں پروئے رہتے تھے۔ مولانا حفظ الرحمٰن کا ایک
بڑا کارنامہ جمعیۃ علماء ہند کو اس مضبوطی استحکام اور نظم کے ساتھ قائم رکھنا
تھا۔ شاہ ایران، شاہ افغانستان، جمال عبدالناصر، صدر انڈونیشیا
الغرض جو بھی مسلم حکمراں یا قائد دنیا کے کسی گوشہ سے آتا تھا اُسے مسلمانوں
کا ایک نظام ملتا تھا اور ہندوستان کا مسلمان خواہ وہ جمعیۃ میں ہو
یا نہ ہو یہ محسوس کرنے پر مجبور ہوتا تھا کہ ہم بھی اس ملک میں بستے ہیں
اور ہماری بھی آواز ہے۔ اور جب جب اندرون ملک میں ضرورت پڑتی
تھی مسلمانوں کی ایک باضابطہ انجمن نمائندگی کے فرائض انجام دینے
کے لئے رہتی۔ میں اس موقع کو غنیمت تصور کرکے قومی آواز کے اس اپیل
کی تائید کرتا ہوں کہ مولانا حفظ الرحمٰن کی اس یادگار کو مسلمان مضبوط
بنائیں کیونکہ مسلمانوں کا یہ واحد ادارہ ہے جس کا ماضی تابناک اور
جس کی حالیہ خدمات ناقابل فراموش ہیں۔

انجمن ترقی اردو اور مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

مولانا انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی
کورٹ کے بھی ممبر تھے اور شاذ و نادر ہی کسی خاص مجبوری کی بنا پر ان کے
جلسوں میں شرکت ناغہ کرتے تھے۔ مولانا اردو کو ہندو اور مسلمانوں کا
مشترکہ سرمایہ تسلیم کرتے تھے اور اس کا کل کام انجمن ترقی اردو کے ذریعے
کرنے کے قائل تھے۔ مگر اردو پر ان کے عظیم احسانات ہیں۔ اور شاید ہی
ہندوستان میں کوئی دوسرا ایسا شخص ہو جو خدمت اردو میں ان کا ہم
پلہ قرار دیا جاسکے۔ مولانا کو اردو سے اس درجہ شغف تھا کہ جب لسانی
فارمولے کی آڑ لے کر ریاست اتر پردیش میں اردو کو ختم کرنے کے منصوبے
بننے لگے تو انھوں نے امریکہ کے بستر علالت سے جسے اب بستر مرگ
ہی کہا جاسکتا ہے وزیر اعلیٰ شری سی۔ بی۔ گپتا کو ایک دردانگیز خط لکھا
جس نے بھی اس خط کو پڑھا ہوگا اس کی آنکھ ضرور نم ہوگئی ہوگی۔ مولانا
کے اس خط کا عالمگیر اثر ہوا اور پنڈت جواہر لال نہرو نے اس کا جواب

دیا اور مولانا کو اطمینان دلایا۔ مولانا اپنے متوازن اور مدبرانہ مشوروں کے لئے ہر نازک موقع پر تلاش کئے جاتے تھے اور رہبرانِ تحریک اردو کو اپنی رائے پر اسوقت تک بھروسہ نہیں ہوتا تھا جب تک کہ مولانا اس پر صاد نہ کر دیں۔ یہی حال مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کا تھا۔

ان تمام مختلف مقامات پر کام کرتے ہوئے مولانا کی شخصیت خاص طور پر اجاگر رہتی تھی۔ میں نے ہر فرد کو ان کا احترام کرتے دیکھا یہ احترام اُن کی فطری ذہانت و فراست اور ان تمام معاملات میں جن کے لئے علوم جدیدہ کی مہارت کی ضرورت ہوتی ہے ان کی وسیع معلومات، ان کی بے پناہ جرات و ہمت، ان کا خلوص۔ ان کا جذبہ قربانی اور عدیم المثال حب الوطنی کی بنا پر تھا۔ وہ ایک جامع و ہمہ گیر ہستی تھے اور بلا وزن کئے اور تولے ایک لفظ بھی زبان سے نہ نکلتے تھے ان کے نزدیک اردو اور مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ اور اس طرح کی دوسری ضروری خدمات ملک و وطن کی خدمات تھیں جن کے متعلق تنگ نظرانہ رویہ ملک کو تباہی و بربادی کی طرف لے جانے والا تھا۔ وہ جس محفل میں بیٹھ جاتے تھے منفرد اور یگانہ روزگار نظر آتے تھے۔ اور اسی لئے علما اور مغربی تعلیم یافتہ سب کی گردنیں ان کے آگے جھکتی تھیں۔

خصائص ذاتی

مولانا کے خصائص ذاتی کا تذکرہ اسی طرح دشوار ہے جس طرح ان کی عظیم شخصیت اور ان کی خدمات ملکی و ملی کو بیان کرنا مشکل ہے وہ بہت ہی سادہ مزاج اور عوامی آدمی تھے۔ وہ دیکھئے جمعیۃ علماء ہند کے دفتر کے سائبان میں زمین پر ایک فرش بچھا ہے اس پر مولانا بیٹھے ہیں اور شہر اور بیرون شہر کے لوگ یکے بعد دیگرے اپنی حاجتیں لئے چلے آرہے ہیں۔ نہ کوئی دربان ہے اور نہ کسی سے یہ مطالبہ ہے کہ آپ کون ہیں کس غرض سے آئے ہیں۔ ہندو اور مسلمان دوست اور دشمن جمعیۃ علمائی و غیر جمعیۃ علمائی کانگرسی و غیر کانگرسی کی کوئی شرط نہیں ہے۔ نہ کبھی جھکتے ہیں اور نہ کبھی منہ بناتے ہیں خندہ پیشانی سے سب کی باتیں سنتے اور سب کو مشورہ و امداد کے لئے آمادہ ہیں کسی کو کسی یونی ورسٹی میں داخلہ چاہئے کوئی پاسپورٹ مانگ رہا ہے کسی کی متروکہ جائداد کا جھگڑا ہے کسی کو نوکری چاہئے الغرض تمام متنوع کام جو انسان کو پیش آسکتے ہیں اس دربار قلندرانہ میں پیش ہو کر انجام کو پہونچتے ہیں کہیں خط لکھ رہے ہیں کہیں ٹیلیفون ہو رہا ہے اور کہیں بہ نفس نفیس جا رہے ہیں۔ جلسوں میں جاتے تھے تو کوئی امتیازی شکل نہیں اختیار کرتے تھے۔ مسجد میں جاتے تھے تو یہ صورت تھی ؎

در مسجد اگر ادی چناں رو کہ ترا
در پیش نخواہند و امامت نہ کنند

تواضع اور مہمان نوازی حد درجہ تھی، جب صدر جمہوریہ سے اردو کا وفد مل رہا تھا تو میں بھی اس کا ایک رکن تھا مولانا نے مجھ سے کہا کہ تم میرے ہی پاس ٹھہرنا اگرچہ نئی دہلی دور ہے مگر میں اس کو قریب کر دوں گا۔ ایک مرتبہ اور میں ان کا مہمان ہوا۔ شام کو میں حافظ محمد ابراہیم صاحب کے ہاں گیا اور رات میں رہ گیا۔ صبح میں ناشتہ کر رہا تھا کہ وہ آگئے مجھے دیکھ کر فرمایا غریب کے گھر رہا نہیں جاتا منسٹر کے ہاں چلے آئے میں نے حافظ صاحب کی کوٹھی کے لان کی طرف اشارہ کیا اور عرض کیا کہ جمعیۃ کے دفتر میں گرمی بہت تھی فرمانے لگے کہ ہاں میں جمعیۃ کے دفتر کی توسیع کر رہا ہوں انشاء اللہ تعالیٰ آپ لوگوں کی یہ تکلیف جلد دور ہو جائے گی۔ کاش کہ قوم مولانا کی اس تمنا کو پوری کرنے کی جانب جلد توجہ کرے۔ مولانا میں سب سے زیادہ نمایاں اور تعجب خیز چیز ان کا کلچر تھا۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ ایک بڑے کلچرڈ آدمی تھے۔ کلچرڈ آدمی کی تعریف پنڈت جواہر لال نہرو نے یہ کی ہے کہ جو دوسروں کے جذبات و خیالات کو سمجھ سکے۔ ان کے برتاؤ میں ہر شخص کے ساتھ شائستگی ستھرا پن اور ملائمت کے وہ عنصر غالب رہتے تھے جو کمیاب ہیں وہ کسی سے نفرت کرنا اور کسی سے خواہ وہ کوئی ہو بہرے پن کا برتاؤ کرنا جانتے ہی نہ تھے۔ یہ وہ بات ہے جو مغربی تعلیم والے اپنے ساتھ مخصوص سمجھتے ہیں مگر وہ سب میں ممتاز تھے۔ اسی طرح معاملہ فہمی اور عملی کارروائی میں بھی وہ سب سے آگے تھے جب اردو کا وفد صدر جمہوریہ سے ملنے والا تھا تو وہاں کے آداب و قوانین مقررہ کے ماتحت باریابی حاصل کرنے کا ایک سوال تھا مولانا نے فوراً کہا کہ میں یہ سب کام کر لوں گا۔ چنانچہ ہم لوگوں کو کچھ خبر نہ ہوئی مولینا نے موٹریں اکٹھا کر دیں اور نہایت تیزی سے یہ بتلاتے گئے کہ کون کہاں بیٹھے اور سب سے آگے اپنی موٹر کر دی اور سب سیدھے صدر جمہوریہ تک پہونچ گئے۔ اسی طرح

وہاں سے واپسی کے بعد حیات اللہ انصاری کو یہ پریشانی ہوئی کہ کسی طرح فوراً ایک پریس کانفرنس ہو جائے جس کو وفد کے صدر ڈاکٹر ذاکر حسین خطاب کر دیں، مولانا نے نہایت اطمینان سے کہا کہ میں اس کا انتظام کر دوں گا۔ پھر ہر چھوٹے سے چھوٹا انتظام ہو گیا اور مولانا کی شخصیت کے اثر سے بہت سے اخبارات کے نمائندے آگئے، مسلم لیگ سے آویزش کے دوران میں کچھ لوگوں نے نیشنلسٹ مسلمانوں کی ایک علیحدہ پارٹی بنانے کا ارادہ کیا لکھنؤ میں جمعیۃ علما کا اجلاس ہو رہا تھا اس وقت جمعیۃ علما الکشن لڑتی تھی اور امیدوار کھڑا کرتی تھی۔ نیشنلسٹ مسلمانوں کی جماعت بنتی تو جمعیۃ کی رقیب ہوتی مگر جب مولانا سے یہ بات کہی گئی تو انھوں نے فوراً منظور کر لیا اور گنگا پرشاد میموریل ہال میں جلسہ کرا دیا خرچ کل جمعیۃ سے مولانا نے دلایا اور خود شرکت بھی کی مگر انتظام سب نیشنلسٹ مسلمانوں کے ہاتھ میں رہا۔ ایسی فراخ دلی اور کشادہ قلبی کی مثالیں کہاں ملتی ہیں؟ اور جب یہ معلوم ہوگا کہ کن حالات میں انھوں نے جمعیۃ کے صرفے سے یہ جلسہ کرایا تھا اور زیادہ حیرت ہوگی ایک نیشنلسٹ مسلمان صاحب نے کہا کہ ہم کانگرس میں جاتے ہیں تو وہاں لوہے کی دیوار کے اندر گھس نہیں پاتے ہیں آپ کے ہاں آتے ہیں تو آپ ہمہ وقت مذہب کی بات کرتے ہیں۔ اس لئے ہم اپنی الگ جماعت چاہتے ہیں مولانا نے جلسہ کو منظور کرتے ہوئے جو جواب دیا تھا وہ اب تک میرے دل پر نقش ہے، فرمایا کہ آپ جلسہ ضرور کریں۔ ہال کا کرایہ ہم دیں گے۔ فرش فروش وغیرہ ٹھیک کرا دیں گے؛ اور آپ کی ہر مدد کر دیں گے مگر جلسہ کی باگ ڈور آپ اپنے ہاتھ میں رکھیں رہی مذہب والی بات تو وہ تو ہم آپ کو ضرور سنائیں گے آپ یہاں نہیں سنیں گے تو گھر پر آپ کو سنائیں گے آپ ہمیں دھتکار دیں گے تو ہم چلے آئیں گے، مگر پھر جائیں گے غرضیکہ ہم آپ سے کہتے رہیں گے اور تھکیں گے نہیں۔ یہ تھا مولانا حفظ الرحمٰن کا ضمیر سارا ہندوستان بلا قید مذہب و ملت ان کا شیدائی تھا۔

اور تمام ہندوستان کی وہ مدد کرتے تھے، فیس کی معافی سے لے کر بڑی بڑی نوکریاں دلوانا اور ویزا حاصل کرنا وغیرہ ہزاروں کام روزمرہ لوگ ان کے پاس لے کر آتے تھے اور ان کا ایک پورا محکمہ ان خدمات کے لئے وقف تھا۔ مولانا کے چہرے پر کسی کی امداد کرنے میں کبھی تھکن محسوس نہیں کی، بلکہ انتہائی ذوق و شوق سے وہ ہر حاجت مند کی حاجت روائی کرتے تھے۔ اس میں مخالف و موافق کی بھی کوئی قید نہ تھی۔

مولانا جمعیۃ علمائے ہند کے سنوارنے والوں میں ہیں۔ ان کو جمعیۃ سے بے انتہا شغف تھا اور وہ جمعیۃ کو مسلمانانِ ہند کی خدمت کرنے کے قابل بنانے میں ہمیشہ مصروف رہتے تھے اور جمعیۃ نے اس دور بلا میں جو شاندار کام انجام دئے ہیں ان میں مولانا کی شخصیت ان کی خدمت اور لگن کا بڑا ہاتھ تھا۔

ہر نازک موقع پر وہ شیر کی طرح گرجتے تھے مگر اس گرج میں نفرت اور علاحدگی پسندی نے کبھی کارفرمائی نہیں کی۔ افسوس اب یہ گرج سنائی نہیں دے گی۔ اب پارلیمنٹ کا ایوان ہو یا کانگرس کا اجلاس، مسلمانوں کا پلیٹ فارم ہو یا مشترکہ جلسہ، حق گوئی کی وہ بے باک آواز کون اٹھائے گا۔ اب کون امریکہ کے بستر مرگ سے "اردو" کے لئے شری سی۔ بی، گپتا کو چٹھی لکھے گا جس کا جواب پنڈت جواہر لال نہرو دیں گے۔

اب ہندوستان کے ان چار کروڑ مسلمانوں کی رہنمائی اور نگہبانی کے فرائض کون انجام دے گا۔ افسوس! کون جانشین بھی نہیں چھوڑا۔ آفتاب غروب ہو گیا اور تاریکی پھیل گئی ہے۔ اس اندھیرے میں اجالا کون کرے گا۔

آج مولانا حفظ الرحمٰن کا ماتم ایک عصر کا ماتم ہے، ایک ایسے لیڈر کا ماتم ہے جو صحیح الخیالی، بے تعصبی، خوش فکری اور اسلام نوازی و ملک دوستی کے امتزاج کے لئے یقین محکم و عمل پیہم کا نمونہ تھا۔

مولانا حفظ الرحمٰن نہ اپنی تعریف سے خوش ہوتے تھے اور نہ اپنی مذمت سے ناراض۔ وہ کل خدمات فرض سمجھ کر تمام عمر انجام دیتے رہے نہ ستائش کی پرواہ کی اور نہ کبھی صلے کی تمنا کی۔ وہ انبیاء کرام کے اس مسلک پر تھے کہ ان اَجْرِیَ الاعلیٰ ربّ العالمین (میں اللہ کے سوا اور کسی سے کوئی اجر نہیں مانگتا) وہ ایک عظیم انسان ایک عظیم محب وطن اور ایک عظیم کارکن تھے۔ اور سب سے زیادہ یہ کہ اللہ کے فرمانبردار بندے تھے جو کچھ کرتے تھے اللہ کی رضا جوئی کے لئے کرتے تھے انھوں نے دنیا کو دکھلا دیا کہ ایک سچے مسلمان کا کردار کیسا ہوتا ہے اللہ تعالیٰ ان کی روح کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ اور ان کے مدارج بلند کرے۔ آمین

جناب ضیاء الحسن فاروقی

اک شمع رہ گئی تھی ۔۔۔۔۔ ایک تقریر ۔۔۔۔

سنتے جاتے نہ تھے تم سے مرے دن رات کے شکوے
کفن سرکاؤ میری بے زبانی دیکھتے جاؤ

۲ اگست کو نمبر ا کیننگ لین (نئی دہلی) میں نہ معلوم کیوں اس وقت یہ شعر میری زبان پر بے اختیار آ گیا جب ہندوستان کی ایک مقتدر ہستی جس کے ہاتھوں میں اس وقت زمام اختیار ہے اپنے ایک ساتھی اور جنگ آزادی کے بہادر سپاہی کے جنازہ کے سامنے خاموش کھڑے ہو کر عقیدت کے پھول پیش کر رہی تھی، آپ جانتے ہیں کہ اس سے میری مراد کیا ہے اور میں نے کس کی "بے زبانی" کی طرف اشارہ کیا ہے ــــــ اس کی بے زبانی جو گفتار ہی کا غازی نہیں بلکہ کردار کا بھی غازی تھا، اور جس کی شخصیت پر مجاہد ملت کا خطاب اسی طرح زیب دیتا تھا جس طرح مولانا حسین احمد مدنی، اور جناب مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیتوں پر شیخ الاسلام اور امام الہند کا۔

حضرات! مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کا انتقال ہو گیا یعنی وہ شمع خاموش ہو گئی جس کی روشنی میں ہمارا درماندہ کارواں اب دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہا تھا، وہ انسانی سہارا جاتا رہا جو حالات کی اندھیاریوں میں امید کی کرن بن کر چمکتا تھا، لوگوں کی مصیبتوں کو سن کر تڑپ جانے والا ایک دل تھا جو ٹھہر گیا، آزادی اور بے باکی کی ایک آواز تھی جو ڈوب گئی، فکر و عمل کا ایک آفتاب تھا جو غروب ہو گیا۔

مولانا مرحوم کا جنازہ کیننگ لین سے قوم اپنے کاندھوں پر اٹھا کر فیروزشاہ کوٹلہ کے بڑے میدان میں لائی اور پھر اُسے مہندیوں کے احاطے میں محصور اُس شہر خموشاں میں سپرد خاک کر دیا جہاں شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے خانوادہ اور سلسلہ کے لوگ ابدی نیند سو رہے ہیں

پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا۔

ہزاروں انسانوں کا ایک ہجوم تھا جو ملت کے اس مجاہد رہنما کو دل کی تمام سوگواریوں کے ساتھ رخصت کرنے آیا تھا، اور اس ہجوم میں میری نظر تصویر دیکھ رہی تھی کہ مولانا مرحوم کے جنازہ کے ساتھ دو سو سال کی تاریخ بھی تھی جو اُسے نئی دہلی سے مہندیوں کے احاطہ تک رخصت کرنے آئی تھی، یہ اس لئے کہ مولانا اس عہد میں اسی سلسلہ کی ایک کڑی تھے جو شاہ ولی اللہ کے افکار و خیالات سے شروع ہوتا ہے اور جس کا دامن ان گنت انقلابی سیاسی، تعلیمی اور مذہبی تحریکوں پر پھیلا اور پھیلا ہوا ہے۔

مولانا نے ابتدائی تعلیم اپنے وطن سیوہارہ (ضلع بجنور) میں پائی اور اس کے بعد دنیائے اسلام کی مشہور درسگاہ دارالعلوم دیوبند میں داخل ہو گئے۔ یہ پہلی جنگ عظیم کا زمانہ تھا اور اگرچہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی انقلابی تحریک ناکام ہو چکی تھی۔ لیکن دارالعلوم دیوبند کی فضا اس کی گرمی سے معمور تھی، اس فضا کا مولانا کے حساس دل و دماغ پر گہرا اثر پڑا تھا، اور ان میں آزادی اور اس کی برکتوں کا شعور پوری طرح جاگ اٹھا۔ یہاں تک کہ جب ۱۹۲۰ء کی تحریکیں شروع ہوئیں تو مولانا عہد شباب کے پورے جوش و خروش کے ساتھ ان میں شامل ہو گئے۔ اور قید و بند کی منزل سے گذرے، قید فرنگ سے آزاد ہوتے تو پہلے انھوں نے دارالعلوم کے نصاب کی تکمیل کی اور پھر وہیں ایک بوریئے پر بیٹھ کر درس دینے لگے، لیکن اس زمانے میں بھی وہ اپنے بزرگوں کے نقش قدم پر چل کر، کانگریس، خلافت اور جمعیۃ العلماء ہند کے تحت مختلف تحریکوں میں حصہ لیتے رہے، کہا جاتا ہے کہ ان کی عمر کے پندرہ سال درس و تدریس میں، پانچ سال قید فرنگ میں اور باقی حصہ ملک و ملت کی خدمت میں گذرا۔

مولانا کی شخصیت کا کمال یہ رہا کہ اس میں دین و دنیا، مذہب اور عقل، یعنی دوسرے لفظوں میں "جام شریعت" اور "سندان عشق" کا ایک ایسا خوشگوار امتزاج پیدا ہو گیا تھا جو اس زمانہ میں خال خال اشخاص کے یہاں ملتا ہے، انہوں نے ایک طرف علمائے دیوبند کی پُر وقار مجاہدانہ روایات کے ساتھ، گاندھی جی اور جواہر لال نہرو کے دوش بدوش چل کر، آزادی کی لڑائی لڑی تھی۔ آزادی کے بعد پنڈت نہرو کا ایک بازو بن کر، سوشلزم کی بنیادوں پر نئے ہندوستان کی تشکیل و تعمیر میں لگے ہوتے تھے، سیکولرزم کے حامی تھے اور اس کا جرأت کے ساتھ پرچار کرتے تھے، دوسری طرف وہ جمعیۃ العلماء جیسی مذہبی جماعت

کے ناظم اعلیٰ ہی نہیں بلکہ روح رواں تھے، مکاتب، مدارس اور دینی تعلیم کے پروگرام کو چلاتے تھے، مسجدوں، خانقاہوں اور قبرستانوں کو واگذار کراتے تھے اور اُن سے متعلق اوقات کو بچانے میں رات دن مصروف رہتے تھے، ایک طرف وہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور جامعہ ملیہ اسلامیہ جیسے تعلیمی اداروں میں جہاں دنیوی تعلیم دی جاتی ہے، اپنی شخصیت کا سایہ ڈالتے رہتے تھے۔ تو دوسری طرف دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے ایک بہت ہی اہم رکن تھے، اس طرح وہ بیک وقت مختلف النوع مذہبی وسیاسی، تعلیمی وثقافتی، لسانی، تصنیفی انجمنوں اور اداروں کے فعال رکن تھے اور ہر جگہ قائد کی حیثیت رکھتے تھے، آزادی سے پہلے بھی اور آزادی کے بعد خاص طور سے ملک وملت کی تاریخ پر ان کی شخصیت ان کی انتھک جدوجہد، اُن کی ذہانت، ان کی معاملہ فہمی اور ان کی گہری اور اثر آفریں انسانیت کی چھاپ ہے، اس تاریخ کا مطالعہ ان کی شخصیت کے مطالعہ کے بغیر نامکمل رہے گا۔

مولانا کی شخصیت کی سب سے نمایاں خصوصیت اُن کی جرأت اور اُنکی بے خوفی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ خدا کے سوا اور کسی سے نہیں ڈرتے تھے، ہم سب مذہبی انسان یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم خدا کے سوا اور کسی سے نہیں ڈرتے، لیکن حق یہ ہے کہ ہم خدا کے سوا سب سے ڈرتے ہیں، اُس زمانہ میں جب کہ بڑے بڑے قومی رہنما گوشہ نشین ہو گئے تھے اور اپنی کمزوریوں پر حالات کی ناساعدت یا مصلحت کا پردہ ڈال کر مطمئن ہو بیٹھے تھے، ایک آواز تھی جو ملک کے گوشہ گوشہ میں گونجتی تھی، ایک عشق تھا جو بے خطر تغیرات وانقلابات کی آگ میں کود پڑا تھا، ۱۹۴۷ء اور اس کے بعد کے پیچیدہ اور نازک زمانے میں ایک شخص تھا جو بہادری سے کہتا تھا کہ وہ مسلمان ہے اور ہندوستانی ہے، ۱۹۴۷ء کے فسادات میں جب حالات قابو سے باہر ہو گئے تھے اور اس کے غیر مسلم ساتھیوں نے اس خیال سے کہ یہ شخص بھی فسادات کی نذر نہ ہو جائے، یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ کہیں پناہ گزیں ہو کر بیٹھ جائے تو معلوم ہے کہ اس شخص نے کیا جواب دیا تھا، اس نے کہا تھا کہ جس وطن کی آزادی کے لئے میں نے جدوجہد کی تھی، اسی وطن میں آج میں شرنارتھی بن کر رہوں، یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا، جس زندگی کو میں اس طرح بھاگ کر بچالے جاؤں گا وہ کس قیمت کی ہوگی۔ آپ لوگ کیا باتیں کرتے ہیں، یہ موقع جان دینے کا ہے یا جان بچانے کا۔

لیکن مولانا میں محض جرأت وبے خوفی ہی نہیں تھی، آپ کو آج بھی خود جمعیۃ العلماء میں بہت سے نڈر سپاہی اور رضا کار مل جائیں گے۔ مولانا کی یہ خصوصیت تھی کہ وہ جرأت کے ساتھ ساتھ ہوش وسلیقہ بھی رکھتے تھے، بات کتنی ہی سچی ہو اور کتنی ہی بے باکی سے کیوں نہ کہی جائے، اگر کہنے کا سلیقہ نہیں تو بے اثر ہو کر رہ جاتی ہے، مولانا کو بات کہنے کا سلیقہ تھا اور یہی وجہ ہے کہ جب وہ کوئی بات کہتے تھے تو وہ سُنی جاتی تھی اور اس کا اثر ہوتا تھا۔ مولانا ایک بڑے خطیب تھے اور ان کی خطابت میں بلا کی صلابت تھی۔ اس صلابت اور اس کی سحر آفرینی کا سرچشمہ ان کی حق پرستی اور قوت ایمانی تھی۔ وہ وہی بات کہتے تھے جسے وہ حق سمجھتے تھے اور جس کی سچائی پر اُن کا ضمیر مطمئن ہوتا تھا اور یہی وجہ ہے کہ جب وہ کوئی بات اپنے خاص اسلوب میں، اپنی پوری شان خطابت سے کہتے تھے تو سننے والوں کے ذہن کی گرہیں کھل جاتی تھیں، کتنے دل ہوتے تھے جو تڑپ اٹھتے تھے۔ اور کتنے ضمیر ہوتے تھے جو بیدار ہو جاتے تھے۔

ابھی بہت دن نہیں ہوتے اور وہ معرکہ ہم سب کو یاد ہے جو اس برصغیر میں مسلم لیگ کے دوقومی نظریے اور مطالبہ پاکستان کے سلسلہ میں گرم ہوا تھا، آپ جانتے ہیں کہ مسلمانوں کو لفظ اسلام سے کتنا گہرا جذباتی تعلق ہے، یہ نظریہ اور یہ مطالبہ اس طرح پیش کیا گیا تھا کہ گویا اس وقت سارا اسلام یہی تھا۔ مولانا نے اپنے بزرگوں کی رہنمائی میں یہ چیلنج قبول کیا اور گاؤں گاؤں پھر کر اس کی نفی کی۔ مسلمانوں کا یہ خیال تھا کہ ایسے لوگوں کو وہ اپنا دشمن سمجھتے تھے اور ان کی تذلیل واہانت اسلام کی خدمت تصور کرتے تھے، اپنے ہی ہم مذہبوں کے خلاف اس طرح ڈٹ جانا کوئی آسان کام نہیں، بڑا مجاہدہ ہے یہ، ایمان کی بڑی آزمائش ہے اس میں، مولانا ہندوستان کی تقسیم کو تو نہیں روک سکے۔ لیکن انہوں نے حق شناسی اور بے باکی کی ایک مثال قائم کر دی، تقسیم کے بعد جو صورت حال سامنے آئی اس نے دوقومی نظریے کا کھوکھلا پن ثابت کر دیا جس چیز کو مسلمان عین ایمان سمجھ بیٹھے تھے محسوس ہوا کہ وہ باطل تھی، جنہیں وہ اپنی کشتی کا ناخدا سمجھتے تھے۔ معلوم ہوا کہ وہ انہیں منجدھار میں چھوڑ کر دوسرے کنارے پر پہنچ گئے، جس زمین پر انہوں نے اپنے خوابوں کے محل تعمیر کئے تھے وہ زمین کھسکتی ہوئی محسوس ہوتی، یہ صورت حال ایسی تھی جس نے مسلمانوں کو کہیں کا نہیں رکھا۔ کروڑوں انسانوں کے اس ملک میں اُن کی حالت اُن جلی ہوئی لکڑیوں کی مانند ہو گئی جنہیں قافلے صحرا میں جلا کر چھوڑ جاتے ہیں، نتیجہ ہوا وہی جو ہونا تھا، ان کا روحانی اضطراب اور ذہنی انتشار انتہا کو پہنچ گیا اور بے اعتمادی اور خوف کی وہ فضا پیدا ہو گئی جس کی مثال مسلمانان ہند کی تاریخ میں، ۱۸۵۷ء کے بعد نہیں ملتی، ایسے نازک وقت میں حفظ الرحمن صاحب مسلمانوں کی کشتی کے نگہبان بن گئے۔ مرکزی دفتر جمعیۃ العلماء میں بیٹھ

کر، ملک کے کونے کونے میں جاکر، پارلیمنٹ میں، غرض ہر جگہ پہنچ کر ایسے
ایسے حوصلہ بخش بیانات دیتے اور ایسی ایسی ولولہ انگیز تقریریں کیں کہ
مسلمانوں میں زندہ رہنے کا حوصلہ ایک بار پھر پیدا ہوگیا۔

مولانا کی ایک اور نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ وہ مایوس ہونا نہیں جانتے
تھے اور قنوطیت اور احساس کمتری کے سخت دشمن تھے، عثمان فارقلیط صاحب
نے صحیح کہا ہے کہ مولانا کا ایمان تھا کہ اسلام اور عزت نفس لازم ملزوم ہیں
کسی امت کا تباہ ہونا اتنا افسوسناک نہیں جتنا کہ اس کا احساس کمتری میں مبتلا
ہونا، عزت نفس کی موت احساس کمتری کی زندگی سے ہزار درجہ بہتر ہے۔

حضرت مولانا کو احساس کمتری کے نام سے چڑ تھی، آپ جہاں جاتے اس
خطرناک جذبہ کی سختی کے ساتھ مذمت کرتے، مرکزی دفتر جمعیۃ العلماء میں
لوگوں کا ہجوم رہتا اور آپ برابر گفتگو کرتے رہتے اور انداز بیان ایسا اختیار
کرتے گویا احساس کمتری کو چیلنج کر رہے ہوں، اگر ایڈیٹر الجمعیۃ کے قلم
سے کسی اداریہ میں احساس کمتری کی جھلک نظر آجاتی تو آپ اس پر سخت تنبیہ
کرتے اور فرماتے کہ ہماری زندگی تو اس جذبہ کے خلاف جہاد کرنے میں گذری
ہے، اگر جمعیۃ العلماء کا ترجمان بھی یہ جذبہ پیدا کرنے لگے تو مسلمانوں کو اس
دلدل سے نکالنے کے لئے کون آئے گا اور پوری امت کا انجام کیا ہوگا

مولانا نے یہ وطیرہ کبھی نہیں اختیار کیا کہ حکومت وقت کی خوشنودی
کے لئے اور اپنی سیکولرزم کے دکھانے کے لئے یہ کہیں کہ یہاں ہندوستان
کے مسلمانوں کو مشکلات کا سامنا نہیں ہے اور ان کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔
انھوں نے کھلے بندوں بار بار اس بات کو کہا کہ مسلمانوں کے سامنے بڑی مشکلات
ہیں، پچھلے سال کے مسلم کنونشن میں انھوں نے مسلمان نمائندوں کے ساتھ
مل کر مسلمانوں کی شکایات کا ایک دفتر تیار کیا۔ مسلم کنونشن جن حالات میں
ہوا وہ ہم کو معلوم ہے، کس طرح مختلف حلقوں سے اس کے انعقاد کی مخالفت
ہوئی، طنز و تشنیع کا ایک محاذ تھا جو مختلف جماعتوں نے اس کے خلاف قائم
کر لیا تھا اور غالباً حکومت بھی اس کو مناسب نہیں سمجھتی تھی، لیکن مولانا نے
کسی کی پرواہ نہیں کی، کنونشن ہوا اور جس مقصد کے لئے منعقد ہوا تھا وہ
مقصد مولانا نے پورا کر کے دکھایا۔ مولانا مسلمانوں کی مشکلات بیان کرتے
تھے۔ لیکن اس کے ساتھ وہ اس بات کو پرزور طریقے سے کہتے تھے کہ ان
مشکلات کو ہم ہی حل کر سکتے ہیں، کوئی دوسرا ملک یا دوسری جماعت انہیں نہیں
حل کر سکتی، ہاں دوسرے ہماری پریشانیوں میں اضافہ کر سکتے ہیں۔ جب وہ یہ
کہتے تھے تو بلاشبہ ان کے سامنے پاکستان کا رویہ ہوتا تھا۔ اس طرح مولانا
نے بے جا تملق کی فضا کو صاف کیا اور ان کی حق پرستی نے زمانہ سازی اور آقا
کے بھوکے رہنماؤں کو رسوا کیا۔ انہوں نے حکومت پر سخت سے سخت تنقید
کی اور اس طرح مسلمانوں اور باہر والوں پر واضح کیا کہ ہندوستان میں جمہوریت
اور اظہار خیال کی آزادی ہے۔ مولانا ہندوستان کی جمہوریت اور سیکولرزم کی
آبرو بن گئے تھے۔

مسلمانوں کی جماعتی زندگی کی یہ خصوصیت نئی تعلیم والوں کے لئے ایک لمحہ فکریہ
ہے کہ اب تک اس قوم کی کوئی عظیم الشان خدمت انجام دی ہے تو انہیں لوگوں
نے دی ہے جنہوں نے مکتبوں اور مدرسوں میں چٹائیوں پر بیٹھ کر تحصیل علم کیا تھا۔
مولانا ایک غریب اور گمنام خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ تعلیم بھی انہوں نے
پرانے طرز کی پائی۔ لیکن کام وہ کر گئے جو کالج اور یونیورسٹیوں میں تعلیم پانے
والوں سے نہ ہو سکا۔ کیا اسے ہم مکتب کی کرامت کہہ سکتے ہیں؟ بلاشبہ یہ
فیضان نظر تھا۔

حضرت مجاہد ملت صرف مسلمانوں ہی کے لیڈر نہیں تھے، درحقیقت
وہ ملک کے ایک بہت ہی بڑے رہنما تھے۔ وہ قومی مسائل میں پوری دلچسپی لیتے
تھے۔ ان کے پاس غیر مسلم حضرات بھی اپنے مسائل لے کر آتے تھے اور خواہ وہ
مسائل حل ہوں یا نہ ہوں، مطمئن ہو کر جاتے تھے۔ وہ مسلمانوں کے مسائل
کو خاص طور سے پیش کرتے تھے مگر محض اس خیال سے نہیں کہ وہ مسلمان
ہیں۔ بلکہ اس یقین کے ساتھ کہ مسلمانوں کے حل میں ملک اور قوم کی نیک نامی
ہے، جمہوریت کی کامیابی ہے، سیکولرزم کی جیت ہے۔ یقیناً وہ ایک سچے
محب وطن تھے۔

مولانا کی طبیعت میں فقیروں کی سی سادگی اور بوریہ نشین بزرگوں جیسا
انکسار اور وقار تھا۔ وہ ایک ایسے درویش تھے جس کی خانقاہ میں کوئی دربان
نہیں ہوتا۔ دہلی میں جمعیۃ کا دفتر اس درویش کی خانقاہ تھی۔ جس کے دروازے
موافق اور مخالف، امیر و غریب، مسلم و غیر مسلم، مقیم اور مسافر سب پر ہر وقت
کھلے رہتے تھے۔ لوگ دور دور سے آتے ایک گوشہ میں اپنا سامان رکھتے اور
پوچھتے مولانا حفظ الرحمن صاحب کہاں ہیں؟ مولانا موجود ہوتے تو سلام کر کے
ان کے پاس بیٹھ جاتے، بس اپنی بات کہتے اور اگر جی چاہا تو اس خانقاہ
میں قیام کرنے کے لئے اتنا کافی تھا، مولانا موجود نہ ہوتے تو لوگ کئی کئی دن ان
کا انتظار کرتے، مولانا ہر طرح کے لوگوں سے ایک ہی طرح ملتے اور سب
کے مسائل کو کمال توجہ سے سنتے اور ان کے حل کی تدبیریں سوچتے اور
بتاتے اور جتنا ہو سکتا اتنا کرنے کے لئے خوشی سے تیار رہتے ——— مولانا

نے اپنی امنگوں کو قوم کی امنگوں سے، اپنی ضرورتوں کو قوم کی ضرورتوں سے کچھ اس طرح ہم آہنگ کر دیا تھا کہ ان کی انفرادی زندگی جماعتی زندگی اور جماعتی زندگی ان کی انفرادی زندگی بن گئی تھی در دلیش صفت عوامی رہنما کی یہی شان ہوتی ہے اور یہی شان باقی و قائم رہتی ہے۔

آج مولانا ہم میں نہیں رہے، لیکن وہی دار العلوم دیوبند ہے۔ وہی جامعہ ملیہ ہے، وہی مسلم یونیورسٹی ہے، وہی ندوۃ العلماء ہے، وہی زمین اور وہی آسمان ہے، آفتاب اسی طرح چمکے گا اور چاند اپنی چاندنی سے فضا کو اسی طرح منور کرے گا ـــــ دیکھنا یہ ہے کہ اب اس آب و گل سے پھر کسی حفظ الرحمٰن کی تخلیق ہوتی ہے یا نہیں ..!

جناب محمد ضیاء الحق انصاری۔ ایم۔ اے۔ بچلنا ضلع بھاگلپور۔

مشعل ہدایت

ہندوستان کی تاریخ پر سرسری نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں برابر دو طرح کی طاقتیں کارفرما رہیں۔ ایک حکمرانوں (Rulers) کی اور دوسری خدا ترس فقیروں کی۔ حکمرانوں کی حکمرانی زمین، پہاڑ، پربت اور سمندروں پر رہی لیکن فقیروں کی حکومت ہندوستانی عوام کے دلوں پر رہی۔

مجاہد ملت کی ذات آخر الذکر سلسلہ کی عظیم شخصیت تھی۔ جہاں اس عظیم شخصیت نے قرآن اور حدیث کی تعلیم دیکر شریعت محمدی کی نشر و اشاعت کی اور الحاد اور ارتداد کا مقابلہ کیا۔ وہاں آزادی وطن کے حصول میں کسی حریت پسند رہنماؤں سے پیچھے نہیں رہے۔ آزادی وطن سے کچھ پہلے اور اس کے بعد مجاہد ملت کے نمایاں کارنامے ایسے رہے جو یقیناً رہتی دنیا تک سنہری حرفوں میں لکھے جائیں گے۔

آزادی کے پہلے فرقہ پرست عناصر کے دام فرقہ واریت سے نکل کر برٹش سامراج کا مقابلہ کرنا جبکہ ہندوستان کے بہت سے علماء اور قوم پرور مسلمان اسی دام فرقہ واریت میں پھنس چکے تھے اس کے علاوہ تقسیم ہند کے فوراً بعد ہند و مسلم دنگوں سے گھبرائے ہوئے مسلمانوں کو راہ فرار اختیار کرنے سے روکنا اور ایسے نازک وقت میں ان کے دلوں سے خوف و ہراس دور کرتے ہوئے مساوی شہری ہونے کا سبق دے کر ان کے پائے استقلال کو مضبوط کرنا مسلمانوں کی جائداد اور ان کے مطالبات کو حکومت سے منظور کرانا نیز تقسیم ہند کی تلخیوں کے باوجود دستور ہند میں مسلمانوں کو مساوی شہری ہونے کا حق دلانا۔ غرضیکہ یہی کارنامے ہیں جس کی بدولت آج مسلمان ہندوستان میں باعزت زندگی گذار رہے ہیں۔

مجاہد ملت اور ان کی جماعت (جمعیۃ العلماء ہند) آزادی وطن کے بعد جماعتی طور پر سیاست سے الگ ہو گئی۔ بظاہر یہ ایک عجیب معمہ ہے۔ جمعیۃ العلماء ہند کی یہ پالیسی ظاہر بیں حضرات کے لئے یقیناً پریشان کن ہو اس لئے کہ آزادی وطن کے لئے ان لوگوں کا ایثار اور ان کی قربانیاں برابر ہوتی رہیں۔ لیکن جب ان کی جدوجہد بار آور ہوئی تو سیاست سے الگ ہو گئے اور اپنی جماعت کا رجحان از سر نو خالص مذہبی تبلیغ اور تعلیم کی طرف مرکوز کر دیا گیا۔ حالانکہ آزادی وطن کے لئے جدوجہد کی طرح حکومت میں بھی جماعتی طور پر اشتراک عمل ہونا چاہئے تھا۔

میں جہاں تک سمجھتا ہوں یہ تبدیلی پالیسی اس لئے ہوئی ہے کہ جمعیۃ العلماء خالص مسلمانوں کی ایک مذہبی جماعت ہے اور حکومت کا دستور غیر مذہبی ہے۔ چونکہ ہندوستان میں مختلف مذاہب ہیں اس لئے دستور ہند کا غیر مذہبی ہونا لازمی تھا۔ نیز جمعیۃ العلماء کا اشتراک عمل صرف ہندوستان کی آزادی کے لئے تھا وہ حاصل ہو گئی اور اس کی آزادی کے ساتھ ساتھ قریب قریب پورے دنیا کے ممالک اسلامیہ بھی آزاد ہونے لگے۔ اس لئے جمعیۃ العلماء اپنے مقصد میں کامیاب ہو کر غیر مذہبی جمہوری حکومت سے مسلم عوام کو جو کچھ نقصانات پہنچنے کا امکان تھا اس سے بچانے کے لئے مستقل پروگرام مرتب کرنے میں لگ گئی۔ چنانچہ مجاہد ملت نے مسلم کنونشن و سالانہ اجلاس جمعیۃ کے ذریعہ موجودہ حکومت کو مختلف مسائل کے سلسلہ میں متنبہ کر دیا کہ وہ مسلمانوں کی تعلیم، زبان و دیگر شعبوں کے سلسلہ میں دستور ہند کے مطابق مساوات برتے اس کے علاوہ مجاہد ملت نے پورے ہندوستان میں جبری تعلیم Comp- ulsory education کے پیش نظر مذہبی تعلیمی بورڈ کے قیام کی ہدایت کر دی تاکہ خالی الذہن مسلم بچوں کے دلوں میں مذہبی تعلیم کا نقش دلگار باقی رہے اور آئندہ آنے والی نسلیں اسلامی امتیاز کو باقی رکھتے ہوئے مشترکہ تعلیم و صنعتی ترقیوں میں برادران وطن کی برابری حاصل کر سکیں۔

مجاہد ملت کا یہ آخری کارنامہ اسقدر اہم ہے کہ اگر مسلمان اس پر دل سے عمل پیرا ہوتے تو ان کا اسلامی شعور اور تہذیب و تمدن اور اخلاق تا قیامت باقی رہینگے اور اگر اس کی اہمیت کو نظر انداز کیا گیا تو یقیناً مسلمان ہندوستان میں نام کے رہ جائیں گے

ڈاکٹر محمود قادری (سعد گورکھپوری)

مجاہد ملت

میرے محسنِ اعظم حضرت مجاہدِ ملت مولانا حفظ الرحمان رحمۃ اللہ علیہ ہندوستان کے اُن مشاہیر میں سے تھے جنھیں بچہ بچہ جانتا ہے، اور اگر نہیں جانتا ہے تو یہ اس کی بدقسمتی ہے، اسے جاننا چاہیئے۔ کیونکہ گزشتہ نصف صدی کی تاریخ میں اُن کی شخصیت ایک ایسا ممتاز مقام رکھتی ہے جسے مشعلِ راہ کہا جا سکتا ہے۔

انھیں یہ مقام کیسے حاصل ہوا؟ وہ عطیۂ خداوندی تھا۔ انھیں اللہ تعالیٰ نے وہ زبان عطا فرمائی تھی جو شہد و شکر تھی، حنظل تلخ تھی، پھول اور موتی بکھیرنے والی تھی اور دھاردار تیغ چلانے والی تھی، آتش بار تھی، برودت کار تھی۔ اگر ایک طرف وہ اپنی زبان فصاحت بیان سے گلزار کھلا سکتے تھے تو دوسری جانب خزاں کے تند و تیز جھونکے بھی چلا سکتے تھے۔ یہ کمال اس دور میں ہندوستان کے اندر صرف پانچ شخصیتوں کو حاصل تھا۔

۱۔ حضرت سحبان الہند مولانا احمد سعید صاحبؒ
۲۔ امام الہند حضرت مولانا ابوالکلام آزادؒ
۳۔ بطل حریت حضرت مولانا عطاء اللہ شاہ بخاریؒ
۴۔ نواب بہادر یار جنگ، اور پانچویں حضرت مجاہدِ ملت مولانا حفظ الرحمان صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو۔

افسوس! کہ ہم آج ان تمام بزرگوں سے محروم ہو چکے ہیں۔ میں اس مختصر سے مضمون میں دیگر تمام بزرگوں کے اندازِ خطابت پر روشنی ڈالنا نہیں چاہتا۔ ان میں سے ہر ایک لاجواب تھا۔ حضرت سحبان الہند ایک ایسے خطیب تھے جن کی ایک تقریر سے سو تقریریں پیدا ہوتی تھیں۔ امام الہند حضرت مولانا ابوالکلام آزاد ایک بڑے پُر دماغ اور فصیح مقرر کا درجہ رکھتے تھے بطل حریت حضرت مولانا عطاء اللہ شاہ بخاریؒ سحر بیان تھے۔ نواب بہادر یار جنگ حسنِ تقریر سے موتی پرویا کرتے تھے، اور حضرت مجاہدِ ملت مولانا حفظ الرحمان تارہائے رگ جاں سے کھیلتے تھے۔ دیگر تمام بزرگوں کے میدان جُدا جُدا تھے لیکن مولانا حفظ الرحمان صاحب ہر میدان کے ہیرو تھے۔ ناقدین پر میرا یہ جملہ بار گزرے تو وہ ذرا تعصب کی عینک اتار کر دیکھیں کہ مولانا حفظ الرحمان کو کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑے تھے۔ ایک مخصوص حلقہ یا دور سے ان کا تعلق تھا۔ انھوں نے اس نازک دَور میں ہندوستانی مسلمانوں کی رہنمائی کی ہے جس میں بڑے بڑے پہلوان سیاسی اکھاڑہ چھوڑ کر بھاگ چکے تھے اور ان کی زبانوں پر تالے پڑ چکے تھے، لیکن یہ مردِ خدا اپنی زبان کی ننگی تلوار لئے سر بکف میدان میں گھومتا رہا اور کلماتِ حق ادا کرتا رہا۔ اگر ایک طرف وہ ہندوستان کی جنگِ آزادی کے ایک بڑے جرنیل کا درجہ رکھتے تھے تو دوسری جانب وہ ہندوستانی مسلمانوں کے مذہبی رہنما کا۔ اگر ایک طرف وہ کٹّر کانگریسی تھے تو دوسری جانب کانگریس کی بدعنوانیوں کی بیخ و بنیاد کو بھی ہلا کر رکھ دیتے تھے۔ الیکشن کا زمانہ آتا تو سارے اختلافات بالائے طاق رکھ دیتے۔ اور کانگریس کی اس طرح حمایت کرتے کہ ان کی ایک تقریر، ووٹوں کی سیکڑوں تقریروں کی بنیاد بن جاتی۔ اور جہاں الیکشن سے فرصت حاصل کی، کانگریس پر ایک دشمن کی طرح ٹوٹ پڑتے تھے اور بڑے بڑوں کو خراد پر چڑھا کر رکھ دیتے تھے۔ حکومت کی حمایت پر آتے تو ایسا انداز اختیار کرتے کہ لوگ پانی پانی ہو جائیں، اور جب کسی بات پر بگڑتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ حزبِ مخالف سے تعلق رکھنے والا یہ کوئی لیڈر ہے جو حکومت کے پرخچے اُڑا کر رکھ دے گا۔

"اب کہاں زمانے میں دوسرا جواب ان کا"

مولانا حفظ الرحمان میں بیک وقت کتنی خوبیاں جمع تھیں ان کا اندازہ انھیں کو ہو سکتا ہے جو ان کی، صبح و شام دیکھنے والے تھے۔ احسان فراموشی اور سرپرست ناشناسی ہوگی اگر انھیں اس بات کے لئے خراجِ تحسین نہ پیش کی جائے کہ ۱۹۴۷ء کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کی کشتی کے واحد ناخدا حفظ الرحمان تھے۔ نہ گھر کا خیال، نہ کپڑے لتّے کی فکر، نہ سونے جاگنے کی پروا، نہ عزت و آبرو کی فکر، چھوٹی سے چھوٹی بات کے لئے سر بکف، تیغ بدست، حکومت سے برسرِ پیکار۔ اور فرصت ملتے ہی پھر حکومت کے سب سے بڑے دوست اور بہی خواہ۔ انسانیت نوازی کا یہ عالم کہ کیا ہندو کیا مسلمان

بے امتیاز ہر شخص کی خدمت کے لئے کمربستہ ہر وقت تیار رہتے۔ نہ صبح دیکھتے تھے نہ شام، نہ جاڑے کی پرواہ نہ گرمی کا خیال۔ جب دیکھو دفتر میں بیٹھے ہیں، جسے دیکھو چلا آرہا ہے۔ جو چاہتا ہے سُناتا ہے۔ قوت برداشت اور عفو کا یہ عالم تھا کہ گالیاں دینے والوں کو بھی نظرانداز کر دیتے تھے، اور چشم پوشی سے اس طرح کام لیتے کہ اُسے اس بات کا احساس بھی نہ ہوتا تھا . . . . کہ اس کے رویّے سے مولانا باخبر ہیں۔ اکثر مولانا کے جاں نثاروں اور مدّاحوں کو غصّہ بھی آتا، لیکن مولانا ڈانٹ بلا کر انھیں چُپ کر دیتے۔ بے تعصب بے لوث جذبۂ خدمت رکھنے والا یہ انسان صبح سے شام تک یہ صعوبت برداشت کرنے والا، اور تلوار کے سایہ میں پرورش پانے والا، اگر واقعی مجاہد ملت نہ تھا تو کیا تھا؟ مسلم کنونشن، حکومت اور مسلمان قوم دونوں پر اس کا سب سے بڑا احسان تھا۔ جان کی بازی لگا کر کنونشن طلب کیا اور دودھ کا دودھ پانی کا پانی کر کے چلے گئے۔

آئے ہے بیکسیٔ عشق پہ رونا غالبؔ!
کس کے گھر جائے گا سیلاب بلا میرے بعد

تأثرات

از: مولانا مفتی محمد جمیل الرحمٰن سیوہاروی، دارالافتاء دارالعلوم دیوبند۔

حفظ رحمٰن یعنی وہ ملت پناہ — آسمانِ ہند کے رخشندہ ماہ
کل وہ صد افسوس رخصت ہوگئے — آہ کیسا دن تھا یہ روزِ سیاہ
قلب ان کی یاد میں بے چین ہے — ڈھونڈتی ہے ہر طرف ان کو نگاہ
الفراق اے حفظ رحمٰن الفراق — تیری فرقت ہے قیامت آہ آہ
یاد آتی ہیں وہ تیری مجلسیں — تھا مسلسل جن میں شورِ واہ واہ
یاد آتی ہے تری مشغولیت — خدمتِ مخلوق میں شام و پگاہ
یاد آتی ہیں وہ تقریریں تری — اور وہ تحسین اہلِ جلسہ گاہ
یاد آتی ہے تری فکرِ سلیم — قوم کے حق میں ہوئی جو شمعِ راہ
وہ مجاہد، وہ نثارِ شمعِ حق — جن کی جانبازی کی ہے خلقت گواہ
تھے جو مظلوموں کی ڈھارس کا سبب — بیکسوں کو جن سے ملتی تھی پناہ
کیا کہوں وہ کون تھے، کیا چیز تھے؟ — پیکرِ اخلاص تھے، بے اشتباہ
جسم وقفِ خدمتِ خلقِ خدا — اور دل مصروفِ ذکرِ لا الٰہ

ہاتفِ غیبی نے فرمایا لکھو
چل بسے ملّت کے وہ پشت پناہ

۸۲ ھ ۱۳

مجاہدِ ملتؒ — بچپن اور نوعمری

از مولوی مقبول احمد صاحب سیوہاروی

خدا تعالےٰ مولوی حاجی شمس الدین مرحوم پر رحمتوں کے پھول برسائے جنھوں نے اپنے ایک بیٹے (مولوی فخرالدین) کو ڈپٹی کلکٹر بنایا ایک (مولوی بدرالدین) کو وکیل بنایا۔ ایک کو طبیب بنا کر خدمتِ خلق کا منصب بخشا (حکیم مولوی صلاح الدین) اور ایک کو ایسا بنایا جو نہ فقط عالم بے بدل تھا، نہ فقط بلند پایہ خطیب تھا، نہ فقط دانش مند مفکر تھا نہ فقط سیاست کی گتھیوں کو سلجھانے والا تھا، نہ فقط عوام کے دلوں کی دھڑکن اور ان کی زبان تھا بلکہ امام طریقت بھی تھا، جس کے سبب اس کی بے پناہ محبت مخلوق کے دلوں میں بس گئی تھی، اس کی صحت، مخلوق کی صحت تھی، اس کی بیماری مخلوق کی بیماری تھی اور اس کی موت نے مخلوق پر اداسی طاری کردی ہے۔

مولانا حفظ الرحمٰنؒ کے جذبۂ خدمت نے انھیں اتنے بلند مقام تک پہونچا دیا تھا جہاں ہر ایک کی رسائی مشکل ہی نہیں محال ہے۔ کہنے اور کرنے میں بڑا فرق ہے۔ میٹھی بات کہنا، الفاظ سے تسلی دینا، زخمی دل کو مشورہ دینا آسان ہے اور اسے ہر ایک کرسکتا ہے مگر مردانِ طریقت کا کام یہ رہا ہے اور یہی رہے گا کہ مشورہ بھی دیں چارہ سازی بھی کریں، بیمار کو تسلی بھی دیں اور طبیب تک پہونچا کر علاج بھی کرادیں — "یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا"!

سوچئے!! ایک درجہ یہ ہے کہ راستہ بتا دیا جائے۔ حکیم کا گھر مشرق کی سمت ہے، گلی سے گذر کر نیم کا درخت ملے گا۔ پھر جنوب کی طرف جانا، آگے بڑا پھاٹک ہے، متصل سہ دری ہے۔ حکیم صاحب کا وہی مطب ہے۔

ایک درجہ یہ ہے کہ مریض کا ہاتھ پکڑا، چلنے کی سکت نہیں ہے تو سواری میں بٹھایا اور ساتھ لے جاکر حکیم کو دکھایا۔ سفارش کے ساتھ حال بیان کیا اور نسخہ لکھا کر دوا لادی۔ یہ "رہ نمائی" نہیں "رہبری" ہے۔

مولانا حفظ الرحمٰن رہ نمائی نہیں کرتے تھے، رہبری کرتے تھے اور ابتدائے عمر سے اس وقت تک کہ بستر موت پر رہے اُن کا عمل اور کردار رہبری کا تھا۔

ذٰلك فضل الله یؤتیه من یشاء

مولانا حفظ الرحمٰن پر نہ جانے کیسے کیسے بلند پایہ لکھنے والوں نے قلم اُٹھایا ہے۔ میں تو صرف اس لئے مجلسِ غم میں شریک ہونے آیا ہوں کہ وہ میرے رفیق، حال تھے، ہم وطن، ہم محلّہ اور ایک ہی خاندان سے تھے گھر سے گھر ملا ہوا تھا۔ برابر برابر دروازے تھے۔ اُن کی معصوم صورت بھولا بھالا چہرہ اس وقت بھی میری آنکھوں کے سامنے پھر رہا ہے۔ شاید جگر مرحوم نے اسی موقع کے لئے کہا تھا۔

وہ کب کے آئے بھی اور گئے بھی نظر میں اب تک سما رہے ہیں
یہ چل رہے ہیں، وہ پھر رہے ہیں، یہ آرہے ہیں وہ جارہے ہیں

گرمی ہے، دوپہر کا وقت ہے۔ مدرسہ فیضِ عام سے آرہے ہیں بڑی بڑی کتابیں بغل میں دب رہی ہیں، اس وقت ان کی عمر ۱۶ سال کی تھی، صورت پر مسکینی اور سادگی، سعادت کا یہ انداز کہ جب مدرسہ سے آتے تھے راستہ میں کسی جگہ ٹھہرنا، بات کرنا اور ہنسی مذاق کرنا پسند نہ کرتے تھے۔ کوئی بڑا بوڑھا ملا تو ادب سے سلام کیا اور گھر میں چلے گئے۔ ظہر کی اذان ہوتے ہی مسجد میں آجاتے، نماز پڑھتے اور مدرسہ چلے جاتے تھے۔

میں اُن سے سولہ برس بڑا تھا۔ وہ چھوٹے ہونے کے سبب بے جھجک بات نہ کرتے اور میں بڑا ہونے کے سبب بے تکلف نہ ہوتا اور یہی عمل اُن کا آخر وقت تک رہا۔

خدمت خلق کا جذبہ اسی عمر میں موجیں مارنے لگا تھا۔ کسی کو بیمار سنتے تو پرسشِ حال کے لئے جاتے اور دیر تک بیٹھ کر تسلی دیتے رہتے۔ برادری میں کوئی تقریب ہوتی تو ہاتھ بٹانے چلے جاتے اور پورے انہماک سے ہر کام میں مشورہ اور مدد دیتے۔

کسی کی میت ہوتی تو فوراً گھر پہونچتے اپنے ہاتھ سے غسل دیتے، کفن

پہنانے، جنازہ کے ساتھ جاتے اور میت کے دفن میں شرکت کرتے۔
انکسار اور فروتنی اتنی تھی کہ شفیع الرحمٰن جس کا حال ہی میں دردناک قتل ہوا ہے، ایک نوربات سے کسی بات پر لڑ پڑا اور اس کا تھان پھاڑ کر آگیا۔ نوربات دھام پور کا رہنے والا تھا، سیوہارہ میں دکان تھی۔
اس واقعہ نے نوربات برادری میں ہیجان پیدا کر دیا۔ صلح کے لئے جائے تو نوربات کے ہاں کون جائے۔ اور وہ آئے تو کیوں آئے۔ کچہری عدالت کی تیاریاں ہونے لگیں۔ مولانا خود اس کے پاس گئے، خوشامد کی اور عدالت جاتے سے روکا جس سے سیوہارہ کے مسلمانوں میں باہمی تصادم کا خطرہ ٹل گیا۔
یاد رہے کہ شفیع الرحمٰن صاحب مولوی صاحب کا خاندانی عزیز نہ تھا، ہم محلہ اور دوست کا برادر زادہ تھا۔
ان کا صلح کل مشرب فقط اپنی برادری یا عزیزوں تک محدود نہ تھا بلکہ ہندو مسلمان سکھ عیسائی سب معترف ہیں اور انہیں یاد کر کے روتے ہیں۔ یہ ایسی خصوصیات تھیں جو بظاہر معمولی تھیں مگر صاحب نظر کے لئے نشان دہی کرتی تھیں کہ یہ شخص آگے چل کر کیا ہونے والا ہے۔ سچ کہا ہے سعدی نے

بالائے سرش ز ہوشمندی ؛ می تافت ستارہ بلندی

محلہ میں میلاد شریف کی محفلیں ہوتیں۔ زیادہ اجتماع بھی نہ ہوتا مگر مولانا آتے اور اپنے نقطۂ نظر کی مطابق مختصر تقریر کر کے بغیر مٹھائی لئے چلے جاتے۔
آپ جانتے ہیں کہ سترہ اٹھارہ سال کی عمر میں انسان کی کیفیات کیا ہوتی ہیں۔ رنگین خوابیں اور رنگین تصورات ہوتے ہیں۔ مجلس آرائیاں اور فلک شگاف نعرے ہوتے ہیں۔ مگر اس مرد مجاہد کا شاندار نظارہ بھی دیکھ لیجئے۔ سہسپور سیوہارہ کے ایک اسٹیشن بعد آتا ہے، اسی سہسپور کے اسٹیشن پر ایکسپریس کا ایک خوفناک حادثہ ہوا تھا۔ حادثہ ایسا تھا کہ آس پاس کے دیہات والے بھی دوڑ پڑے تھے۔ مولینا حفظ الرحمٰن خدا ان کی قبر کو نور سے بھرے بے قرار ہو کر سہسپور پہنچے حادثہ کا نظارہ اتنا ہولناک تھا کہ دیکھ کر رو پڑے۔ پھر جس مستعدی اور ان تھک محنت سے، زخمیوں، ضرب رسیدہ مرد، عورت، بچوں کی خبر گیری کی، اپنی کمر پر لاد لاد کر انھیں ہسپتال پہنچایا اور ملبہ سے نکالا، وہ نہ الفاظ میں بیان کیا جا سکتا ہے نہ تحریر میں آسکتا ہے۔

جن لوگوں نے ریلوے حادثات دیکھے ہیں وہ جانتے ہیں کہ زخمیوں کی کراہٹیں ملبہ میں دبے ہوؤں کی چیخیں کتنی دلخراش ہوتی ہیں، مگر مولانا پر نہ گھبراہٹ تھی نہ خوف تھا، نہ زخمیوں کے خون سے لتھڑے ہوئے جسم سے نفرت اور گھن تھی بس مسلسل مدد تھی اور یہ سن کر آپ تعجب کریں گے کہ پورے ایک دن اور ایک رات بھوکے پیاسے کام کرتے رہے تھے۔ اللہ اللہ

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

اس زمانہ میں مولانا عبد الغفور صاحب، مدرسہ فیض عام کے صدر مدرس تھے۔ تقریر میں خطابت نہ تھی اصلاح و موعظت زیادہ ہوتی تھی، مولانا حفظ الرحمٰن نے ان ہی کی شاگردی سے ترقی کی اور دورۂ حدیث کے لئے دیوبند چلے گئے۔

اس وقت دیوبند میں مولانا انور شاہ صاحب کشمیریؒ، مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ، مولانا حبیب الرحمٰن مہتمم دارالعلوم حافظ محمد احمد صاحب رحمہم اللہ جیسے فاضل اور یگانہ موجود تھے اور مولانا حفظ الرحمٰن کے زمانۂ تعلیم میں یہ سب حضرات سیوہارہ آتے رہے اور مولانا کے مہمان رہے۔
اسی زمانہ کی بات ہے کہ مولانا حفظ الرحمٰن نے ایک خواب دیکھا، انھوں نے دیکھا کہ روشن چاند آسمان سے ٹوٹ کر گرا ہے اور ان کے گریبان میں داخل ہو گیا ہے اور پھر کرتہ کی آستین سے نکل کر آسمان پر چڑھتا چلا گیا ہے۔ ایسا یاد پڑتا ہے کہ جس وقت یہ خواب مولانا نے بیان کیا تھا مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی بھی موجود تھے۔
راقم الحروف نے کہا تھا کہ آپ شہرت کے آسمان پر چمکیں گے اور آپ کا سینہ انوار کا مرکز بنے گا۔
چند ہی دن بعد تحریک خلافت کا ظہور ہوا، مولانا بھلا اس موقع پر کیسے خاموش رہتے، تقریریں شروع ہو گئیں، جلسے ہونے لگے، حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا مدنی مالٹا سے تشریف لائے تو تحریک پورے شباب پر تھی اور سیوہارہ میں وہ تاریخی جلسہ ہوا جس کی یاد دلوں میں اب تک باقی ہے۔
اس جلسہ کا نظم و نسق عزت مآب حافظ محمد ابراہیم صاحب وزیر یو پی کے ہاتھ میں تھا اور وہی مختار کل تھے، جلسہ کے صدر مولانا مدنی تھے اور روح رواں مولانا حفظ الرحمٰن تھے۔ یہ جلسہ گویا اعلان جہاد تھا جس میں مولانا حفظ الرحمٰن کی دلیری اور حق گوئی کے جوہر چمکے۔ اور راقم الحروف نے محسوس

کیا کہ اب وہ سولہ برس مجھ سے بڑے ہوگئے ہیں اور اُن کی قیادت میں ہر جلسہ میں شرکت ہونے لگی۔ پھر بیوہارہ کا وہ مقدمہ شروع ہوا جس میں عوام وخواص جوق جوق تحریک میں شریک ہوگئے۔

طے یہ ہوا تھا کہ مقدموں میں صفائی نہ دی جائے، اس لئے نہ کوئی صفائی تھی نہ وکیل کھڑا کیا گیا۔ راقم الحروف نے بیان میں جو شعر پڑھا تھا وہ یہ تھا۔

وہی قاتل وہی مخبر ہے وہی منصف ہے
اقربا میرے کریں خون کا دعویٰ کس پر

اور اسی پر میرے بھائی عبداللطیف بجنوری نے جو سال گذشتہ تک پارلیمنٹ کے ممبر بھی تھے پولیس افسری سے استعفےٰ دیکر تحریک آزادی میں شرکت کی تھی۔

اس مقدمہ میں مولانا بشیر احمد بھٹا مرحوم، راقم الحروف، برادر معظم مولوی حکیم ابرار احمد صدیقی مقیم دہلی، حکیم عبدالکریم مرحوم، میر مظاہر حسین مرحوم، مولوی رضی الحسنین اور دوسرے لوگ جن کے نام یاد نہیں ہیں غالباً پندرہ سولہ آدمی تھے۔

مولانا بشیر احمد مرحوم کی یہ تجویز ہوئی کہ جب بھی مقدمہ کی پیشی ہو، ہماری جماعت قصبات اور گاؤوں سے گذرتی اور تقریریں کرتی بجنور تک پہونچے اس تجویز پر عمل کرنے سے پورے ضلع میں ہیجان پیدا ہوگیا اور ہزاروں آدمی تحریک آزادی میں شامل ہوگئے۔

تقریروں میں مولانا حفظ الرحمٰن اور مولانا بشیر احمد بھٹا مرحوم کی قائدانہ حیثیت تھی اور راقم الحروف ان کی اقتدا کرتا تھا۔ آخر یہ گروپ بجنور جیل میں داخل ہوگیا۔ بجنور کے سپرنٹنڈنٹ زیڈ احمد صاحب تھے آسام کے رہنے والے سیاہ فام، فربہ جسم چہرہ پر چیچک کے داغ، خوب پھیلی اور ناف تک لٹکی داڑھی، مزاج کے سخت تھے، ہفتہ بھر بھی نہ گذرا تھا کہ ہماری جماعت سے ٹکر ہوگئی۔

گرمیوں کا زمانہ تھا، قیدیوں نے ٹکٹ کے پنکھے سرکنڈوں میں پھنسا کر ہمیں دیدیئے۔ یہ خبر کسی نے زیڈ احمد صاحب کو پہونچادی۔ صبح کو معائنہ کے لئے آئے تو پنکھوں کو دیکھ کر بولے "تم راجا کا لڑکا" یہ جملہ تین دفعہ کہا، سامنا مولانا بشیر احمد مرحوم کا تھا، مولوی صاحب مرحوم غصہ میں لال ہوگئے، قریب تھا کہ جھپٹ پڑیں، میں نے اور مولانا حفظ الرحمٰن نے اشارہ کیا اور خون کا گھونٹ پی کر رہ گئے۔ اور جواب میں ہم نے کھانے کی ہڑتال کردی اور ہمارے اس اقدام نے جیل کے قیدیوں میں بغاوت کی روح پھونک دی۔

ہمارے وارڈ کے قریب پنڈت دیورتن شرما جنرل سکریٹری آل انڈیا ہندو مہاسبھا پہلے سے جیل یاترا کے لئے آچکے تھے۔ ہم سے اتنے قریب تھے کہ جنگلے کے دروازے سے جھانک کر باتیں کرلیتے تھے، انھوں نے بھی کھانا چھوڑدیا اور ہم سے کہا جب تک زیڈ احمد معافی نہ مانگے ہرگز کھانا نہ کھانا۔

اب ایک دلچسپ قصہ سنئے۔ زیڈ احمد صاحب کی بیوی دلّی کے خاندان کی ایک شریف خاتون تھیں۔ زیڈ احمد صاحب اُن سے بہت متاثر تھے۔ انھوں نے جب سنا کہ خلافت کے مولویوں نے کھانا چھوڑدیا ہے تو خود بھی کھانا چھوڑدیا۔

ہماری بھوک کا کتنا اثر ہوا یہ تو ہم جانتے نہیں مگر بیگم صاحبہ کا حربہ اتنا کارگر ہوا کہ زیڈ احمد صاحب کے حواس جاتے رہے۔ بیگم صاحبہ نے کہا جب تک مولویوں سے معافی نہ مانگوگے میں ہرگز کھانا نہ کھاؤں گی اور کسی قسم کے کھانے پکا کر شوہر کو دیتے کہ ابھی جاؤ، میرا سلام کہو اور معافی مانگ کر کھانا کھلاؤ۔

زیڈ احمد صاحب بیوی کی خفگی کی تاب نہ لا سکے اور جیل میں آکر ہم سب سے کھلے لفظوں میں معافی مانگی اور ہم نے پنڈت شرما کے کہنے پر کھانا کھالیا ایسی حالت میں بجنور جیل میں ہمیں کیسے رکھا جا سکتا تھا، بریلی بھیجدیا گیا۔ ڈسٹرکٹ جیل میں ہم ایسے وقت پہونچے کہ صبح ہونے میں دو گھنٹے باقی تھے اور جب تک سپرنٹنڈنٹ نہ آجاتے ہمیں پھاٹک سے جیل میں داخل نہ کیا جا سکتا تھا۔

صبح کے وقت سپرنٹنڈنٹ آیا۔ یہ آئرلینڈ کا شریف انگریز تھا ہم لوگ کھادی کے سبز چغے پہنے ہوئے تھے سینہ پر بٹن لگے ہوئے تھے جن پر خلافت لکھا ہوا تھا۔ بٹن دیکھ کر بولا اچھا خلافت خلافت اور تعظیماً ٹوپی اتارلی۔ اندر لے کر چلا تو ہنستا ہوا، حکم دیا کہ ان لوگوں کے لئے دیوانی کا جیل صاف کرایا جائے۔

دیوانی کا جیل اچھا خاصا مکان تھا پاخانہ بھی الگ تھا دروازہ بھی تھا جسے بند کرادیا جائے تو جیل سے الگ ہوجاتا تھا۔ بجنور جیل میں ہم میں سے ہر ایک کو دو کٹورے لوہے کی چادر کے دیئے گئے تھے۔ ایک کھانے کے لئے اور ایک پانی پینے کے لئے۔ مگر بریلی کے سپرنٹنڈنٹ نے حکم دیا کہ مٹکے اور گھڑے منگوا کر پانی بھروادیا جائے اور روز کے روز تازہ

پانی بھرا جایا کرے۔ مستقل ایک قیدی جو حافظ قرآن تھے انھیں ہدایت کی گئی کہ ہمارے پاس رہیں کھانا لائیں، پانی بھریں اور جو کام ہو انجام دیں رمضان شروع ہو گیا تھا، سحری کے لئے سبزی دال اور چاول اور شام کے کھانے پر فقط دال اور روٹی آتی تھی۔

عید آئی تو ہمارے کہنے سپرنٹنڈنٹ نے جیل کی چار دیواری میں نماز عید کا بندوبست کرایا اور تمام مسلمان قیدیوں کو اجازت دیدی کہ جو کوئی چاہے ہمارے ساتھ نماز ادا کرے۔ حکیم عبدالکریم مرحوم نے نماز پڑھائی۔

کچھ دن بعد سنٹرل جیل تبادلہ ہو گیا اور وہاں کے سپرنٹنڈنٹ جیل سے ہمارا ٹکراؤ ہو گیا۔ وہ چاہتا تھا کہ جب بھی جیل کی گشت کے لئے آئے ہم اس کی تعظیم کے لئے کھڑے ہوں، ہم لوگ اسے گوارا نہ کرتے تھے۔

مولانا بشیر احمد اور راقم الحروف کا یہ مشورہ ہوا کہ سپرنٹنڈنٹ جیل کے آنے کے وقت مولانا حفظ الرحمٰن چبوترہ پر بیٹھ کر تفسیر قرآن بیان فرمائیں اور ہم لوگ مودب بیٹھ کر سُنا کریں۔ تاکہ یہ کہا جا سکے کہ یہ ہماری عبادت کا وقت ہے اور عبادت کے وقت کسی کی تعظیم نہیں کی جا سکتی۔

ایک دلچسپ واقعہ اذان کا پیش آیا۔ میر مظاہر حسین مرحوم اذان دیتے تھے اور پوری آواز اور نعروں کے ساتھ اللّٰہ اکبر کی تکرار کرتے تھے۔ سپرنٹنڈنٹ اور جیلر نے اعتراض کیا تو مولانا حفظ الرحمٰن نے مسکرا کر کہا:۔

"ہمارا عقیدہ ہے کہ جہاں تک اذان کی آواز
جاتی ہے شیطان بھاگ جاتا ہے اس لئے
ہم اذان پوری آواز سے دیتے ہیں۔

اس پر دونوں چلے گئے۔

بابا رامچندر لیڈر کسان سبھا اور حمید اللہ الہ آبادی بھی اسی جیل میں تھے مگر ہم سے دور تھے، دونوں نے پیغام بھیجا کہ اپنے قول سے ہٹنا نہیں اور پوری بلند آہنگی سے اذان دینا۔

ایک دن سپرنٹنڈنٹ جیل نے ہم سے پوچھا آپ دنیا میں کیا کام کرتے تھے، میں نے اور مولانا بشیر احمد نے کہا۔ جی! ہم چوری کرتے تھے ڈاکے ڈالتے تھے، جیب تراشتے تھے۔ سپرنٹنڈنٹ اردو مشکل سے بولتا تھا۔ بولا نہیں نہیں، ہم یہ پوچھتا ہے کہ آپ لوگ دنیا میں کیا کام کرتے تھے، بہرحال ہم نے بتا دیا اور سپرنٹنڈنٹ کے اس جملہ پر کہ دنیا میں کیا کام کرتے تھے دیر تک ہنستے رہے۔

جس زمانہ میں ہم جیل میں تھے، ہمارے خاندان والوں کو تسلی دینے کے لئے ملک کے مایہ ناز فرزند اور حکومت کے محبوب وزیر اعظم پنڈت نہرو اور مولانا آزاد سیوہارہ پہونچے اور ہم جیسے بینواؤں کے گھر گھر جا کر تسلی دی اور اپنی ہمدردی کا یقین دلایا۔

جیل سے واپس آئے تو ہم میں سے بہت سے رفیق مولانا کا ساتھ نہ دے سکے اور تھک کر بیٹھ رہے۔ مگر مولانا کے جوش اور ولولہ کا یہ حال تھا کہ ہر قدم اُٹھاتے وقت آسمان چھو لینا چاہتے تھے۔

بلاشبہ اُن کے مجاہدانہ عزائم اسی کے مقتضی تھے اور یہ سب اسی خواب کا پرتو تھا جسے وہ دیکھ چکے تھے۔

اس کے بعد جو کچھ ہوا، انگریز بھاگا، اور ۱۹۴۷ء کا کردار تو اس کو بچہ بچہ جانتا ہے اور پورا اخبار اسی سے بھر جائے گا۔

وہ تو شاید اس خواب کو بھول بھی گئے ہوں گے۔ مگر ہم میں سے کچھ لوگ خصوصًا راقم الحروف کو انتظار تھا کہ وہ وقت کب آتا ہے کہ مولانا کے کردار کی روشنی سے ہندوستان کا کونا کونا منور ہوگا۔

اور اب سب دیکھ رہے ہیں کہ وفات کے بعد بھی خواب کا عکس اور پرتو نظر آ رہا ہے اور بڑے بڑے رہنما، حکومت کے وزیر اُن کے کردار کی روشنی سے اپنے دل کے چراغ روشن کرنے کے خواہشمند ہیں۔ اور یہ "مجاہد نمبر" بھی اسی خواب کا پرتو ہے۔



مجاہد ملت :- بچپن سے طالب علمی تک

غمگسار:- (مولانا مفتی) :- محمد جمیل الرحمٰن سیوہاروی مقیم دیوبند

ظلمت کدہ میں میرے شب غم کا جوش ہے
اک شمع تھی دلیل سحر، سو خموش ہے
(غالبؔ)

مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب ۱۳۱۸ھ میں عالم دنیا میں تشریف لائے۔ آپ کا اصل نام معزالدین تھا اور مستقبل نے ثابت کر دیا کہ آپ فی الواقع اسم بامسمیٰ تھے یعنی خداوند ذوالجلال نے آپ کے ذریعہ دین متین کو عزت بخشی تھی۔ حفظ الرحمان آپ کا تاریخی نام تھا جب کہ رحمان کے لفظ کو الف کے ساتھ لکھا جائے۔ مولانا نے یہ تصریح خود مجھ سے بیان فرمائی تھی۔ ابو انفا اسم کنیت فرماتے تھے۔ وطن مالوف قصبہ سیوہارہ ضلع بجنور محلہ مولویان تھا۔ مولانا ایک تعلیم یافتہ زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ والد ماجد کا اسم گرامی الحاج مولوی شمس الدین صاحب صدیقی تھا۔ جو نہایت خوش عقیدہ، صالح، بزرگ اور علماء حق کے گرویدہ و پروانہ تھے۔ اور حضرت مولانا عبدالرحمٰن گنج مرادآبادی (ضلع اناؤ) سے بیعت تھے۔ مولانا مرحوم ابتدائے شعور ہی سے متین اور مہذب واقع ہوئے تھے۔ اول تو متانت و تہذیب آپ کا خلقی و طبعی تقاضہ تھا لیکن خاندان کے بزرگوں کی تربیت نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔ مکتبی تعلیم اپنے مکان پر حاصل کی۔ آپ کے والد ماجد نے آپ کو ہونہار دیکھ کر خاص طور پر آپ کو عربی تعلیم دلانے کا عزم کیا۔ چند ابتدائی کتابیں مدرسہ شاہی مسجد مرادآباد میں آپ نے پڑھیں۔ اس کے بعد مدرسہ فیض عام سیوہارہ میں آپ کو داخل کر دیا گیا اور درس نظامی کی تکمیل تک آپ اسی مدرسہ میں مصروف تعلیم رہے۔

مدرسہ فیض عام میں آپ کے مخصوص اساتذہ میں سے حضرت مولانا سید عبدالغفور صاحب سیوہاروی تلمیذ رشید حضرت مولانا سید احمد حسن صاحب امروہوی اور الحاج حافظ مولانا احمد حسن صاحب چشتی نیز مولانا سید آفتاب علی صاحب شاگرد رشید حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند تھے۔ یہ تمام حضرات اعلیٰ قابلیت سے متصف اور اخلاق فاضلہ سے مزکیٰ و زرین تھے۔ اساتذہ کے یہ معنوی محاسن و کمالات مولانا پر بھی اثر انداز ہوئے۔ جس کے بعد دیگر اکابر ملت کی خدمت میں پہونچنے پر ان اثرات میں مزید جلا پیدا ہو گئی۔ مولانا مرحوم بہت ذکی اور ذہین تھے۔ خدا نے آپ کو طبع وقاد ودیعت فرمائی تھی، اسی بناء پر آپ زمانہ تعلیم میں اپنی جماعت میں ہمیشہ نمایاں اور ممتاز رہتے تھے، اور آپ کے اساتذہ آپ کی بڑی قدردانی فرماتے تھے۔ خوش قسمتی سے اساتذہ نے جس انداز سے آپ کی تعلیمی تربیت کی۔ اس نے شروع ہی میں آپ کو شاہراہ ترقی پر کھڑا کر دیا اور پوری زندگی میں یہ تربیت آپ کی رہنما ثابت ہوئی۔ جس کی تفصیل یہ ہے کہ جب آپ کی اعلیٰ تعلیم کا زمانہ آیا تو ہفتہ وار مجلس میں تقریر کے لئے آپ کو نیز آپ کے ہم جماعت طلباء کو اسلام وغیرہ سے متعلق اہم موضوع دیے جاتے تھے اور آپ ہفتہ وار بلا ناغہ اس موضوع پر تقریر کرتے اور اساتذہ سے داد و تحسین حاصل کرتے تھے۔ اس طرح آپ کو کتب بینی کا شوق بھی پیدا ہوا اور آپ کا مطالعہ وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا اور انجام میں یہی طریق تربیت آپ کے اعلیٰ خطیب اور وسیع النظر ہونے کا سبب بنا۔ مدرسہ فیض عام میں تکمیل کے بعد آپ نے دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا، اور بحر العلوم حضرت مولانا سید انور شاہ صاحب کشمیری، حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی، حضرت میاں صاحب وغیرہم، جیسے آفتاب و ماہتاب اکابر ملت، نیز مفتی اعظم مولانا عزیز الرحمٰن عثمانی، جیسے شیخ طریقت سے استفادہ کا آپ کو طویل موقع نصیب ہوا۔ یہاں آپ نے دوبارہ دورۂ حدیث وغیرہ اعلیٰ نصاب کی تکمیل فرمائی۔ اور بلا شبہہ دارالعلوم دیوبند کے اس قیام نے آپ کی اعلیٰ قابلیت میں چار چاند لگا دیئے۔ دارالعلوم کے اس زمانۂ طالب علمی میں مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب خلف اکبر حضرت مفتی اعظم قدس سرہٗ اور آپ کا ساتھ ہوا۔ جو آخیر لمحۂ حیات تک قائم رہا۔

مولانا کی سیاسی زندگی کا آغاز تحریک خلافت ہی سے ہو جاتا ہے مولانا کی سیاسی نشو و نما میں حضرت مولانا بشیر احمد صاحب (بھٹہ) مرحوم کی رفاقت کو بہت بڑا دخل ہے اور ان دونوں بزرگوں کی یہ رفاقت بھی پوری یکسانیت کے ساتھ آخر تک قائم اور باقی رہی ہے۔ مولانا مرحوم

کے مخصوص دوستوں میں میرے برادر بزرگ جناب حاجی حبیب الرحمٰن صاحب مرحوم تھے، اور دونوں اپنے مخصوص تعلق کی بنا پر ہمیشہ یکجان و دو قالب نظر آتے تھے۔ بھائی صاحب کا وصال اب سے تقریباً ڈیڑھ سال پہلے ہو چکا ہے۔ اور ان کی وفات پر ایک بیان میں مولانا نے فرمایا تھا کہ مجھے تو یہ امید تھی کہ حاجی صاحب مرحوم سے پہلے میں رخصت ہوں، اور وہ مجھ کو مٹی دیں گے۔ لیکن آہ وہ داغ مفارقت دے کر پہلے ہی چلے گئے، مگر ڈیڑھ سال آگے پیچھے ہی کیا۔ یوں سمجھئے کہ دونوں جگری دوست ساتھ ہی گئے اور ایک نے دوسرے کو چھوڑ نا گوارا نہ کیا۔ خدائے پاک دونوں کو رحمت خاصہ سے نوازے اور مغفرت تامہ نصیب فرمائے۔

اب اس رباعی پر اپنی گزارش کو ختم کرتا ہوں۔

درخلد حفظ رحمٰن آرام یاب بادا
عزت مآب بادا، ہم مستطاب بادا
گفتم کہ جیست ہاتف تاریخ ارتحالش
فرمود ایں دعائے غفراں مآب بادا

۸۲ ھ ۱۳

سنو مجاہد ملتؒ کی روح کہتی ہے

از: احسن مفتاحی جنرل سکریٹری جمعیۃ علماء ہوگلی۔

یہ کیسی آئی اچانک مصیبتِ عظمیٰ — کہ کہیے جس کو اے احسن قیامتِ صغریٰ
ہے بات کیا کہ "محمد میاں" [1] ہیں افسردہ — ہیں "فخرِ دیں" [2] بھی نظر آتے آج آزردہ
یہ بات کیا ہے کہ روتے ہیں ہند کے عالم — اداس اداس ہے کیوں آج ہر دلِ مسلم
یہ بات کیا ہے کہ طاری ہے ہر سو ایک جمود — بجھی بجھی سی طبیعت، مٹا مٹا سا وجود
یہ کس نے موڑ لیا منہ، یہ کون روٹھ گیا — یہ کس کی موت ہوئی، کون دہر سے اٹھا
سکون اب دلِ مضطر کو کون بخشے گا — اب آہ! کون ہمیں درسِ زندگی دے گا
کہاں ملے گا ہمیں ایسا ناظمِ اعلیٰ — یہ وقت کتنا "جمعیۃ" پہ آگیا ہے کڑا
صحیح ہے یہ کہ جو پیدا ہوا ہے آج خلا — وہ پُر کسی طرح احسن کبھی نہیں ہوگا
مگر سنو بھی تو دم بھرنے والو الفت کا — سنو ہے دل میں اگر جذبہ کچھ عقیدت کا
سنو مجاہد ملتؒ کی روح کہتی ہے — دلوں میں میری عقیدت تمھارے جو لی ہے
اگر ذرا بھی صداقت کا شائبہ ہوتا — تو عشق میری "جمعیۃ" سے بھی بڑھا ہوتا
یہ رسمِ ماتم و اظہارِ تعزیت چھوڑو — مرے اصول، مری بات پر عمل بھی کرو

اٹھو، بڑھاؤ "جمعیۃ" کا ہر طرف حلقہ
دلوں میں ہے مری الفت کا کچھ اگر جذبہ

---

[1] مولانا محمد میاں مدظلہ [2] حضرت مولانا فخرالدین صاحب مدظلہ۔

حضرت مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن رح

از:- شاکر جلیل صدیقی شیرکوٹی

حضرت مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب ناظم اعلیٰ جمعیۃ علمائے ہند وممبر پارلیمنٹ کے بارہ میں ملک کے گوشے گوشے سے مضامین آئیں گے، اور "مجاہد ملت نمبر" کی زینت ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ ادبی حیثیت سے تو میرا مضمون کوئی درجہ نہیں رکھتا۔ لیکن جو عزیزدارانہ تعلق اور قرب مجھے حاصل رہا ہے اور جس طرح میں نے ان کی خانگی زندگی کو ان کی بیرونی زندگی کی مطابقت کی ہے اس کے اعتبار سے میرا مضمون معلوماتی ہوگا۔ جذبات سے مجبور ہو کر چند سطریں بڑے اختصار کے ساتھ سپرد قلم کر رہا ہوں۔ لکھنے کو تو اور بھی بہت سی باتیں ہیں، لیکن انھیں نظر انداز کیا جا رہا ہے۔

مولوی شمس الدین صاحب سیوہارہ ضلع بجنور کے معززین اور علماء دین کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے بھوپال اور ریاست بیکانیر میں اسسٹنٹ انجنیئر کے عہدہ پر مامور رہے۔ ان کی زمینداری مالگذاری کے علاوہ پانچ ہزار روپیہ سالانہ بچت کی تھی۔ مولوی شمس الدین صاحب کے چار لڑکے اور دو لڑکیاں تھیں۔

بیٹے، مولوی ڈپٹی فخرالدین صاحب۔ مولوی بدرالدین صاحب وکیل۔ مولوی حفظ الرحمٰن اور حکیم صلاح الدین صاحب تھے

بیٹیاں، بتول فاطمہ اور عظمت النساء تھیں۔ بڑی لڑکی کی شادی مولوی انوارالحسن صاحب نائب صوبہ دار ریاست گوالیار سے اور دوسری لڑکی کی شادی حافظ محمد ابراہیم صاحب وزیر آب پاشی و برقیات سے ہوئی تھی۔

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی والدہ محترمہ بڑی دیندار مخیر اور پابند صوم وصلوٰۃ خاتون تھیں اور حافظ عبدالرحمٰن صاحب مرادآبادی سے بیعت تھیں۔ مولانا کے منجھلے بھائی مولوی بدرالدین صاحب انتقال فرما چکے ہیں۔ مولوی ڈپٹی فخرالدین صاحب اور حکیم صلاح الدین صاحب بقید حیات ہیں۔ مولانا مرحوم کی والدہ محترمہ نے مولانا کے والد بزرگوار سے درخواست کی کہ میں حفظ الرحمٰن کو دینی تعلیم دلانا چاہتی ہوں۔ ان کی یہ درخواست منظور ہوئی۔

مولانا نے ابتدائی تعلیم سیوہارہ کے عربی مدرسے میں حاصل کی۔ پھر وہاں سے دیوبند چلے گئے۔ حضرت مولانا انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر بزرگوں سے فیض حاصل کیا۔ حضرت مولانا انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی شاگردی پر ہمیشہ نازاں رہا۔ فراغت کے بعد دارالعلوم دیوبند میں تعلیمی خدمات انجام دینے لگے۔

اس کے بعد اساتذہ کے مشورہ پر سیٹھ یعقوب صاحب کی درخواست پر سلسلہ تبلیغ سنہ ۱۹۳۶ء مدراس گئے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے، کہ مولانا مرحوم بچپن ہی سے مجاہدانہ خدمت خلق کا جذبہ دل میں رکھتے تھے۔

سیوہارہ میں ایک نومسلم جذامی جس کی بہت بری حالت میں موت واقع ہوئی۔ اسے غسل دینے کے لئے کوئی تیار نہ تھا مولانا مرحوم نے اپنی کم عمری ہی میں اس جذامی کی تجہیز وتکفین اپنے ہاتھوں سے انجام دی۔

دوسرا واقعہ، نوادہ سہنسپور میں ٹرین کا حادثہ پیش آیا سیکڑوں افراد مجروح ہوئے اور بہت سے موت کے گھاٹ اتر گئے۔ مولانا اتفاق سے اس مقام پر تھے۔ جلتی ہوئی آگ سے مجروحین کو نکال کر ان کی تجہیز وتکفین کی، خود اس حادثہ سے جھلسے گئے تھے۔ کافی عرصے تک زخموں کا علاج کراتے رہے۔

عنفوان شباب ہی سے جمعیۃ علماء وتحریک خلافت وکانگریس میں آزادی وطن کے لئے طوفانی دوروں اور پُراثر تقریروں سے ہر محاذ پر سرگرم رہے اور وہ خدمات انجام دیں کہ ملک کے ممتاز اور سرگرم لیڈروں میں مقام حاصل کر لیا۔ مدارس کے قیام کے دوران سنہ ۱۹۲۸ء میں ڈابھیل تشریف لے گئے اور وہاں اپنے استاد حضرت مولانا انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ درس وتدریس میں مشغول ہو گئے۔ اس کے بعد سنہ ۱۹۳۴ء میں کلکتہ چلے گئے۔ وہاں دو سال مقیم رہے۔ وہیں سے مولانا نے اپنے زور بیان اور ترجمہ قرآن شریف کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف کا کام بھی شروع کر دیا۔ جسے بڑی مقبولیت حاصل ہوئی، اور

ایک مستقل ادارہ کے قیام کی بات لوگوں کے مشورہ سے سامنے آئی۔ مولانا مرحوم نے فیصلہ کیا کہ یہ ادارہ دہلی میں قائم کیا جائے۔ چنانچہ امروہہ میں تین سال درس وتدریس میں گذارنے کے بعد سیاسی مشغولیتوں کے ساتھ ۱۹۳۸ء میں دہلی چلے آئے۔ ندوۃ المصنفین کی بنیاد ڈالی، آج تک قائم ہے جس کے نگراں حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب ہیں اور مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی وغیرہ کی رفاقت میں بڑی شان سے چل رہا ہے۔ ایک ادبی رسالہ "برہان" بھی اس ادارہ سے شائع ہو رہا ہے۔

جمعیۃ علماء کی وابستگی اور مولانا کی خدمات وخلوص سے متاثر ہوکر اکابرین نے مولانا مرحوم کو ۱۹۴۲ء میں جمعیۃ علماء کا ناظم اعلیٰ منتخب کیا یہ سلسلہ تادمِ واپسیں قائم رہا۔ جمعیۃ کی بقا کے لئے فنا فی الجمعیۃ ہوکر کام کیا۔ اپنے گھر اور اہل وعیال کے مستقبل سے اللہ کے توکل پر بھروسہ رکھتے ہوئے ہمیشہ لاپرواہ رہے۔ کبھی آرام کرنا نہ جانا۔ بیمار ہوں یا تندرست جاڑا ہو یا گرمی، آج یہاں ہیں تو کل وہاں، جوشِ خدمت میں اپنی صحت تک کا خیال نہ کیا۔

۱۹۴۷ء کے فسادات میں کئی مرتبہ بچے۔ گولیاں سر پر سے اور دائیں بائیں قریب سے گزر گئیں۔ اللہ کریم کو اب تک حیات رکھنا تھا، اب تک زندہ رہے۔

حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رائپوری فرمایا کرتے تھے:۔

"مولانا حفظ الرحمٰن کی ۱۹۴۷ء کے خونی دور کے ایک دن کی خدمت ہم خانقاہی لوگوں کی تمام عمر کی عبادت سے زیادہ ہے"

مرحوم کچھ دنوں یو۔ پی اسمبلی کے ممبر رہے ہیں۔ چند مہینوں کے بعد ہی پارلیمنٹ کے انتخاب میں بھاری اکثریت سے کامیاب ہوئے اور تاحیات کامیاب ہوتے رہے۔

مولانا مرحوم کی قابلِ ذکر کتابیں

رسول کریم — قصص القرآن — اسلام کا اقتصادی نظام اخلاق اور فلسفۂ اخلاق — بلاغ المبین — حفظ الرحمٰن لمذہب النعمان وغیرہ وغیرہ۔

مرحوم کی یہ کتابیں بڑی مقبول ہوئیں۔

خدمت جمعیۃ علماء

نظامت عظمیٰ پر سرفراز ہونے کے بعد حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کو چند در چند دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ جمعیۃ مقروض تھی۔ نہ اخبار تھا نہ پریس، نہ ذاتی دفتر نہ جائیداد۔ یہ ان کی ہمت تھی اور استقلال، کہ انھوں نے قرضہ بھی ادا کر دیا، اخبار کا دوبارہ اجراء۔ الجمعیۃ بک ڈپو کا قیام عمل میں آیا اور "الجمعیۃ برقی پریس" دہلی کے ایک ممتاز پریس کی حیثیت سے منظر عام پر آ گیا۔ بک ڈپو کے ساتھ ایک چھوٹی سی لائبریری بھی قائم ہے جمعیۃ علماء ہند کی ذاتی املاک میں ایک بڑی عمارت اور اس سے ملحقہ جائیداد مجموعی طور پر ساٹھ ہزار روپے کی حاصل کر دی۔

مولانا مرحوم کے روزمرہ کے دفتری معمولات بھی انتہا نہیں رکھتے تھے۔ صبح کی نماز کے بعد گھر آتے، اور سب گھر والوں پر محبت بھری ایک نگاہ ڈالکر دفتر چلے جاتے۔

صبح کی چائے دفتر ہی میں جاتی تھی۔ دفتر کی چائے کے ساتھ اپنے چہیتے مہمانوں کے ہمراہ پیتے تھے۔ مہمانوں میں دسترخوان پر کوئی تخصیص نہ تھی ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، سب ہی ہنس بول کر چائے پیتے۔ اس کے بعد مولانا دفتری امور کی دیکھ بھال شروع کرتے اور اطراف و اکنافِ ہند کے آنے والوں کی ضرورتوں اور پریشانیوں کو سنتے اور ان کے مناسب و معقول حل تلاش کر کے مدد فرماتے۔

یہ سلسلہ ۱½ بجے دن تک جاری رہتا۔ اس کے بعد گھر جاکر آپ کھانا کھاتے اور پھر دفتر واپس آکر آرام فرماتے اور عصر کے وقت اٹھ جاتے اس درمیان میں ضرورت مند حضرات کو پوری اجازت تھی کہ عصر سے رات کے ساڑھے گیارہ بجے تک پھر دفتر جمعیۃ علماء ہند میں ملاقاتیوں اور ضرورت مندوں کا ہجوم رہتا" اور مولانا ان کی خاطر خواہ خدمت کرتے۔

اسفار کا یہ عالم تھا کہ جس کسی نے لکھا، اس کی درخواست اگر کوئی ضرورت خاص نہ ہوتی تو قبول فرماتے۔ بستر ہر وقت بندھا رہتا، اٹھا لیتے اور چلے جاتے۔

دفتر جمعیۃ علماء ہند کی مصروفیتوں کے علاوہ مولانا نے اپنی مرضی کے خلاف ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب موجودہ نائب صدر جمہوریہ ہند کے اصرار پر سنی مجلس اوقاف صوبہ دہلی کی صدارت قبول فرمائی اور اس سے متعلق تمام اداروں کی ذمہ داری سرانجام دی۔

۱ ـــ مدرسہ عالیہ فتحپوری
۲ ـــ مسلم ہائر سکنڈری اسکول فتحپوری
۳ ـــ دلی کالج اجمیری گیٹ۔
۴ ـــ فتحپوری پبلک لائبریری
۵ ـــ انجمن ترقی اُردو
۶ ـــ حج کمیٹی بمبئی
۷ ـــ مسلم یونی ورسٹی علی گڈھ
۸ ـــ کانگریس وغیرہ کی میٹنگوں میں مستعدی اور پابندی سے اپنے فرائض ادا کرتے۔ حج کمیٹی کے دوران پارلیمانی امور کو بھی سبکدوش فرماتے رہتے۔

اخلاق

مولانا مرحوم بڑے مردم شناس اور بڑے مرنجاں مرنج تھے، قوتِ برداشت کا یہ عالم تھا کہ جب کوئی کسی مخالف سے برسرکار ہونے کو کہتا۔ تو مولانا کا چہرہ سرخ ہوجاتا اور وہ سختی کے ساتھ منع کرتے۔ حتیٰ کہ اپنے گالی دینے والوں سے محبت اور خلوص کے ساتھ پیش آتے۔

ایک مرتبہ کچھ لوگ اپنی ضرورت لے کر مولانا کے پاس آئے۔ مولانا نے فرمایا، یہ کام مجھ سے نہیں ہوسکتا۔ پھر بھی ان لوگوں کے اصرار اور خوشامد پر اپنے حلقۂ اثر میں ٹیلیفون بھی کیا، اور وزراء کو ان کے کیس کی جانب متوجہ کرنے کے بعد خطوط بھی لکھے۔ ان مراحل کے طے ہونے کے بعد وہ لوگ دفتر سے جانے لگے۔ میں بھی اپنی ضرورت سے ان کے پیچھے پیچھے چلا۔ جس کا ان لوگوں کو علم نہ ہوا۔ باہر نکلتے ہی انھوں نے مولانا کی شان میں گستاخانہ کلمات نکالے اور یہ کہا کہ۔ دیکھا کیسا کام کرا لیا ـــ قریب تھا کہ میں ان سے دست و گریبان ہوجاتا ـــ کہ پیچھے سے مولانا نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور ان لوگوں کو محسوس نہ ہونے دیا کہ ان کے ساتھ کیا ہونے والا تھا۔

اور مجھے گھر لاکر سختی سے کہا مجھے خواہ کوئی کچھ ہی کہے تم میرے معاملات میں قطعی دخل نہ دیا کرو۔ ورنہ میں تمھیں اپنے لئے اور اپنے آپکو تمھارے لئے مُردہ تصور کروں گا۔ اس دن کے بعد میری کبھی ہمت نہ ہوئی کہ میں کسی سے باز پرس کرتا۔ لوگ سب کچھ کہہ جاتے اور مولانا ہنس کر ٹال دیتے۔ اور یہی کہتے کہ یہ لوگ مصیبت زدہ ہیں، اپنا غصہ اس طرح اُتار کر اپنے غم کا بوجھ ہلکا کرتے ہیں۔ انھیں نظر انداز کرو۔ لوگ پیچھے بادشاہ کو بھی گالیاں دیتے ہیں۔

مولانا مرحوم کی ساری زندگی سیاسی تگ و دو میں کانگریس کے ساتھ گزری اور اس درجہ کے کانگرسی شمار کئے گئے کہ بعض لوگوں نے انھیں وظیفہ خوار تک قرار دیا۔ لیکن مولانا مرحوم نے ملکی اور قومی مفاد کی وجہ سے اپنی وضع نہ بدلی۔ پورے خلوص کے ساتھ کانگریسی رہے پھر بھی انتخابات کے ختم ہوتے ہی مولانا مرحوم کا انداز حزب مخالف کے لیڈروں جیسا ہوجاتا اور وہ یہ کہتے کہ جتنا وطن عزیز کا میرے اوپر حق ہے اتنا ہی مسلم اقلیت کا ایک فرد ہونے کے ناطے سے مسلمانوں کا بھی مجھ پر حق ہے۔ چنانچہ حکومت اور کانگریس دونوں سے مسلمانوں کے لئے دشمن کی طرح لڑتے۔ ہندو۔ سکھ حضرات کے کیس بھی اگر لے کر کھڑے ہوتے تو ان کا رویہ وہ ہی ہوتا جو مسلمانوں کے لئے ہوتا تھا۔ کوئی تفریق نہ ہوتی۔ یہی وجہ تھی کہ جب بھی انتخابات میں حصہ لیا۔ بھاری تعداد میں ہندو ووٹوں سے کامیاب ہوئے۔ مسلمان ووٹ تو انھیں نوے فیصدی ملتے ہی تھے۔ ہندو بھی دسری پارٹیوں کے زور لگانے کے باوجود مولانا ہی کو ووٹ دیتے۔

آخری دنوں میں مولانا نے مسلمانوں کی خاطر مسلم کنونشن کیا۔ تمام پارلیمانی حلقہ کے مسلمانوں نے اسے شروع شروع میں قبول نہ کیا۔ حکومت کے اعلیٰ ترین ذمہ داران بھی اُسے فرقہ وارانہ تصور کرتے رہے اور یہ کنونشن نہ کرنے پر بضد رہے۔ لیکن مولانا کی بے باکی اور ہمت و استقلال نے یہ کنونشن کامیاب شان کے ساتھ کیا۔ ہندوستان کے تمام اخبارات اور کئی جماعتوں نے مخالفت کی لیکن مرحوم کے عزم و حوصلہ میں فرق نہ آیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مخالفین قائل ہوئے اور سکوت اختیار کرنا پڑا۔ مسلم کنونشن ہوا اور عالمی حیثیت سے کامیاب ہوا۔ حکومت کو بھی شکایت نہ ہوئی، اور مسلمانوں کے مسائل بھی سامنے آگئے اور مخالفین کے دانت کھٹے ہوگئے۔

مولانا مرحوم کے پسماندگان میں

ایک لڑکا اور پانچ لڑکیاں ہیں۔ لڑکے کا نام لطف الرحمٰن عرف اسلم فیروز ہے۔ لڑکے اور دو لڑکیوں کی شادی ہوچکی ہے تین لڑکیاں غیر شادی شدہ ہیں۔ مرحوم کے تین پوتے اور ایک پوتی ہے۔ پوتوں کا نام اسعد فیروز۔ احمد فیروز۔ ارشد فیروز ہے۔ ماشاء اللہ بڑا پوتا اسعد فیروز بہت ہونہار اور پڑھنے کا شوقین ہے۔

(حافظ غفران احمد پروفیسر اینگلو اورنٹیل کالج دہلی)

مولانا حفظ الرحمن اور ان کا علمی مقام

کسی عظیم شخصیت کے علمی مرتبہ کا تعین بڑا ہی دشوار کام ہے۔ اس سلسلہ میں، ہم کو نہ صرف اُس شخصیت کا بنظر غائر مطالعہ کرنا پڑتا ہے، بلکہ اُس زمانہ کے سماجی رجحانات، اور مختلف مکاتب خیال کو بھی پیش نظر رکھنا پڑتا ہے۔ چونکہ ہر عظیم شخصیت، جہاں اپنے عہد پر مختلف زاویوں سے اثر انداز ہوتی ہے۔ اسی طرح اُس شخصیت پر بعض غیر محسوس تاریخی عوامل بھی اثر انداز ہوتے ہیں۔ اُس عظیم شخصیت کا کردار، کچھ خداداد الہامی صلاحیتوں اور کچھ اپنے زمانہ کے تاریخی تقاضوں اور سماجی حقائق سے مل کر بنتا ہے۔ چنانچہ اس شخصیت کے علمی یا کسی اور پہلو سے مرتبہ کے تعین میں، ہمیں ان سب باتوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ کٹھن کام ہے۔

مولانا مرحوم، ایک عظیم تاریخی کردار کی حیثیت سے ہمارے سامنے آئے۔ اور ایک جدوجہد و سعی مسلسل سے بھرپور زندگی گذار کر، ہم سے جدا ہو گئے۔ مولانا جس دور میں پیدا ہوئے۔ اور جن حالات میں انھوں نے اپنے نصب العین اور فرائض کی تکمیل کی۔ وہ ہم سب کے نزدیک بڑے صبر آزما اور جان جوکھوں کے کام ہیں۔ ان کا عہد شباب، دیوبند جیسی عظیم درسگاہ، اور ان علماء و شیوخ کی صحبت میں گزرتا ہے۔ جو اپنے وقت کا جوہر شمار ہوئے تھے۔ استاد الاساتذہ، علامہ انور شاہؒ صرف ایک علامہ ہی نہ تھے۔ بلکہ ایک مستقل مکتب خیال، اور مدرسہ فکر تھے۔ ان کا زمانہ دیوبند کے علمی شباب کا زمانہ ہے۔ مولانا کی شخصیت کی تشکیل میں، دیوبند کا ماحول، وہاں کے اساتذہ اور علامہ انور شاہ کا خصوصی فیض شامل رہا۔ دیوبند پچھلی صدی کی ایک علمی تحریک تھی۔ اس کے بانیوں کی نظر میں، انگریز ڈپلومیسی اور ہندوستان کی غلامی کے حالات تھے۔ اس لئے ضروری سمجھا گیا تھا کہ انگریزوں سے مقابلہ کرنے کے ساتھ ساتھ، اندرونی استحکام اور اسلام کے بنیادی عقائد و علوم و فنون، کی حفاظت کی جائے۔ انگریزوں نے ہندوستان کو عیسائی بنانے کا جو خیال بعد میں ترک کیا، اُس کی ایک بڑی وجہ دیوبند کی دینی تحریک ہے۔ چنانچہ پھر انگریزوں نے ظاہر پرستوں کی جماعت پیدا کرنے پر اکتفا کیا۔

یہی وجہ ہے کہ جونہی علمائے دیوبند اس طرف سے مطمئن ہوئے انھوں نے جارحانہ کارروائی کے متعلق سوچنا شروع کر دیا۔ چنانچہ شیخ الہندؒ کی تحریک بجائے خود اس کی زندہ مثال ہے کہ کس طرح ایک اسلامی یونیورسٹی کا سربراہ اپنے دور کی عظیم طاقت سے ٹکر لینے کی کوشش کرتا ہے۔ آنے والا مورخ ضرور اس سربراہ کے آہنی عزم کو خراج عقیدت پیش کرے گا۔

انگریزوں سے مقابلہ کا یہ سخت اور مادی رخ تھا۔ جو کہیں دفاعی کوشش اور کہیں جارحانہ کوشش کی صورت میں ظاہر ہوا۔ اب مغربی افکار و نظریات کے تجزیہ و تنقید کا دور آیا۔ اگرچہ اس کی ابتدا بھی انیسویں صدی ہی میں پڑ چکی تھی۔ لیکن دیوبند نے اس کی جانب اصل توجہ علامہ انور شاہؒ کے زمانے میں کی۔ چنانچہ ان کے تلامذہ میں ہم کو یہ رجحان قوی تر نظر آتا ہے۔

مولانا حفظ الرحمن کے کردار کی تشکیل اسی دور میں ہوئی۔ اتفاق سے یہی وہ دور ہے۔ جس میں انگریزی سامراج کے خلاف ملک میں ایک عام بیداری کی لہر اٹھتی ہے۔ چنانچہ مولانا کو اپنی شخصیت تقسیم کر دینی پڑتی ہے۔ ایک جانب خدا نے اگر ان کو اعلیٰ ذہنی صلاحیت اور برتر فنی استعداد عطا کی تھی تو دوسری جانب ان کے نوشتہ تقدیر میں، سیاسی رہنمائی کا فرض بھی لکھ دیا تھا۔ چنانچہ وہ سیاسی زندگی اختیار کر لیتے ہیں۔ اور اس طرح علمی دنیا سے ان کا رشتہ کمزور تر ہو جاتا ہے۔ بیسویں صدی کے اکثر مفکرین کے ساتھ یہی ٹریجڈی پیش آئی کہ وہ زمانہ امن کی طرح، ثمرات کو اپنے افکار و خیالات سے مالا مال نہ کر سکے۔ بلکہ زندگی کی سخت ترین جدوجہد نے ان کو اپنی صلاحیتیں دو طرف استعمال کرنے پر مجبور کر دیا۔ مولانا آزاد، مولانا محمد علی، علامہ اقبال اور مولانا حفظ الرحمن کے ساتھ یہی المیہ پیش آیا کہ سیاست کی وقتی و ہنگامی دنیا نے ان کو علمی و تحقیقی زندگی کے پرسکون ماحول سے چھین لیا۔ خاص طور پر مولانا موصوف تو اپنی صلاحیتوں کے اعتبار سے، اپنے وقت کے علمی امام شمار کئے جاتے۔ چونکہ ہم کو ان کی تالیفات اور علمی تحقیقات کے نفسیاتی تجزیہ سے پتہ چلتا ہے کہ ان میں سیاسی زندگی کا ذرہ برابر بھی پرتو نہیں۔ اس کے

برعکس، مولانا آزاد کی تصنیفات میں ان کی سیاسی زندگی کی گرما گرمی، اور جذبات آرائی ملتی ہے۔ علامہ اقبال نے شاعری کے ذریعے اپنی اعلیٰ ذہنی صلاحیت اور بلند فکری کی تسکین کا راستہ ڈھونڈ لیا۔ لیکن مولانا مرحوم سیاسی مصروفیتوں کی بنا پر اپنے علمی رجحان کی تسکین کا کوئی ذریعہ نہ پا سکے چنانچہ ان کے شعور میں ہمیشہ اپنی سیاسی زندگی سے ایک بیزاری کا سا رجحان پرورش پاتا رہا۔ اور اسی بنا پر۔ آخر وقت میں، ان کی شخصیت میں تلون، اور کچھ بے اطمینانی کی سی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ جس نے مزاجی بے چینی، اور اس راہ میں انتھک محنت کا لبادہ اوڑھ لیا تھا —— لیکن یہ بات ان کی تعریف میں ہی جاتی ہے، کہ ایک فرض پسند انسان کی حیثیت سے انھوں نے اپنے ذاتی رجحانات کو خیرباد کہہ کر، سیاسی دعوت کو قبول کر لیا۔

جو افراد علم وفن کی دنیا سے واقف نہیں ہیں۔ ان کے نزدیک علوم وفنون کی دنیا، ایک خشک اور بے رنگ وروغن دنیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ علم اپنی آخری حد میں جا کر ایک رومان بن جاتا ہے۔ اور شخصیت اس میں اپنے آپ کو تحلیل کر دیتی ہے۔ مولانا کی تصنیفات میں بھی اس کی جھلک محسوس ہوتی ہے، اسی لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ اگر صرف اسی ایک میدان کے ہو رہتے، تو بھی اپنی انفرادیت اور برتر ذہنی صلاحیت کا لوہا، ساری علمی دنیا سے منوا لیتے۔ لیکن مشیت ایزدی میں کس کو دخل ہے۔ ہم جو کچھ چاہتے ہیں، وہی کچھ نہیں ہو جایا کرتا۔ ان کی شخصیت کے ان ہی مختلف زاویوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم ان کے علمی مقام کو پہچان سکتے ہیں۔

علمی کارنامے

مولانا نے اپنے علمی ترکہ میں ذیل کی تالیفات چھوڑی ہیں۔

۱۔ قصص القرآن (جلد اوّل تا چہارم)
۲۔ اسلام کا اقتصادی نظام
۳۔ اخلاق وفلسفہ اخلاق
۴۔ رسول کریم
۵۔ بلاغ مبین
۶۔ حفظ الرحمٰن لمذہب النعمان

اب ہم ان کتابوں پر الگ الگ تبصرہ کرتے ہیں۔

۱۔ **قصص القرآن:** ۔ جیسا کہ موضوع سے ظاہر ہے قصص القرآن کے نام سے مولانا نے چہار جلدوں میں شرح وبسط کے ساتھ تمام قرآنی قصوں کو جمع کر دیا ہے۔ اردو میں یہ تالیف اپنی نظیر آپ ہے۔ اس تالیف کے سلسلے میں جو اصول و مقاصد مولف کے پیش نظر رہے ہیں۔ ان میں سب سے مقدم یہ اصول تھے کہ قرآنی قصص کو معتبر طریقے سے بیان کیا جائے۔ اور ان کی تشریح، قرآن واحادیث صحیحہ کی روشنی میں کی جائے۔ دوسرے یہ کہ اسرائیلیات نے، جس جس طرح، قصص کی حقیقی شکل کو مسخ کر دیا ہے، ان کی تحقیق کی جائے گی۔ توریت وانجیل کی روایات کی صحیح حقیقت ظاہر کی جائے۔ ساتھ ہی قصص قرآنی سے حاصل شدہ، پند وموعظت اور قرآن کے مقاصد کو بہتر طور پر پیش کیا جائے۔ بلاشبہ مولف فاضل نے یہ کام بڑی کاوش سے انجام دیا ہے اور تحقیق کا حق ادا کر دیا ہے۔ چنانچہ قصص القرآن کو ایک مستقل تفسیر کا درجہ دیا جا سکتا ہے اس میں ایک جامع اور بسیط تفسیر کی تمام خصوصیات موجود ہیں۔ قصص القرآن کی ترتیب اس طور پر ہے۔

مجلد اول: ۔ اس میں حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر، حضرت موسیٰ وہارون کے عبور بحر قلزم تک کے واقعات وقصص ہیں۔ جن میں خاص طور پر، حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ اور حضرت یوسفؑ کے واقعات بیان ہوئے ہیں۔

مجلد دوم: ۔ اس میں حضرت موسیٰ واسرائیل کے بقیہ واقعات، سے حضرت یحییٰ علیہ السلام کے حالات تک، واقعات نہایت تحقیقی انداز میں پیش کئے گئے ہیں۔ بعض تحقیقات واقعی لاجواب ہیں۔

مجلد سوم: ۔ اس جلد میں اصحاب کہف، اصحاب رقیم، سیل عرم اصحاب فیل، اور ذوالقرنین وغیرہ کی بحث خاص طور پر مذکور ہے کتاب تحقیقی مباحث سے گراں ہے۔ اس میں خاص اور دلچسپ تحقیق ذوالقرنین، اور سد ذوالقرنین (سد سکندری) کی ہے۔ یہ بات ثابت کی گئی ہے کہ قرآن میں مذکورہ، ذوالقرنین، سکندر یونانی نہیں ہے۔ بلکہ یہ ذوالقرنین پہلے زمانہ میں ایک عادل اور مومن بادشاہ گزرا ہے۔ اور جس کے دور میں حضرت خضر علیہ السلام تھے۔ اسی نے وہ دیوار بنائی تھی۔ جو یاجوج وماجوج قوم کو روکنے کی غرض سے تعمیر کی گئی تھی۔ عباسی خلیفہ واثق باللہ کے عہد میں ایک دفعہ اس دیوار کی تحقیق میں گیا تھا۔ جس نے اس دیوار کی تعیین کر دی تھی۔ مولانا کی تحقیق یہاں پر ذرا تشنہ ہے۔ وہ تقریباً تین چار دیواروں کا تذکرہ

کر کے، داتی بالا اللہ کے دفار کی تحقیق پر مبحث ختم کر دیتے ہیں۔ یہ نہیں معلوم ہوتا کہ آیا آج بھی وہ دیوار کہیں موجود ہے، یا نہیں۔ یا استداد زمانہ سے مٹ چکی۔ تاہم ذوالقرنین، یا جوج ماجوج، اور سدّ کے بارے میں کئے گئے۔ وسیع مباحث کی داد دینی پڑے گی۔ یہ جلد تقریباً چار سو صفحات پر مشتمل ہے۔

مجلد چہارم: یہ پانچسو صفحات سے زیادہ پر پھیلی ہوئی ہے اس جلد میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک کے واقعات کا تذکرہ ہے۔ حضرت عیسیٰؑ سے متعلق خاص مباحث رفع سماء، پیدائش، حیات، اور قادیانی دعووں کی تکذیب، اس کتاب کے معرکۃ آرا، مسائل ہیں۔ آنحضورؐ کی ایک گونہ سیرت اس جلد میں آگئی ہے۔ خاص مباحث واقعہ معراج اور غزوات نبوی ہیں۔

۲۔ اسلام کا اقتصادی نظام

اس تالیف میں مولانا نے اسلام کے اقتصادی نظام کو مدون شکل میں پیش کیا ہے۔ اور ان اصولوں کی نشان دہی کی ہے۔ جن پر اسلام کے اقتصادی ڈھانچے کی بنیاد اور ٹھوس عمارت اُٹھائی جا سکتی ہے ساتھ ہی اشتراکیت اور سرمایہ دارانہ نظام سے موازنہ کیا گیا ہے، ایک خاص پہلو اس تالیف کا یہ ہے کہ ان جدید نظام ہائے اقتصادی پر بھی نظر ڈالی گئی ہے۔ جو دنیا کے مختلف تاریخی مذاہب نے پیش کئے۔ بعد میں اسلامی معاشی نظام کی ترجیح ثابت کی ہے۔ اپنے موضوع پر کتاب جامع ہے اور اچھا مواد رکھتی ہے۔ آئندہ اسلامی اقتصادیات پر جو بھی کام ہوگا۔ تقدم کا مرتبہ مولانا کو ہی حاصل ہوگا۔ اگرچہ اردو میں، اس فنی نقطۂ نظر سے کچھ اور بھی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ لیکن وہ اتنی جامع اور گہری فنی معلومات اپنے اندر نہیں رکھتیں۔ گو مولانا نے اشتراکیت اور سرمایہ دارانہ نظام کا بالواسطہ مطالعہ کیا ہے لیکن پھر بھی اس سلسلہ میں ان کی معلومات موضوع کے لئے بہت کچھ کافی ہیں۔ اہم ترین کارنامہ یہی ہے کہ اس میں اسلام کے اقتصادی نظام کا ایک خاکہ مثبت شکل میں پیش کر دیا گیا ہے۔

۳۔ اخلاق و فلسفہ اخلاق

کتاب کے عنوان ہی سے ظاہر ہے کہ اخلاقیات پر مشتمل ہے مولانا کی یہ کتاب اخلاقیات کے موضوع پر اردو میں پہلی جامع ترین کتاب ہے۔ کچھ کتابیں ضرور موجود ہیں۔ لیکن قطعی نامکمل، اس لئے کہ اگر ان میں جدید نظریات ہیں تو قدیم نہیں ——— تقابلی مطالعہ تو بہت دور کی بات ہے۔ اس کتاب میں قدیم وجدید، مذہبی و دنیوی، تمام نظریات کا نچوڑ ہے۔ اور اخلاقیات کے سلسلہ میں، قدیم وجدید نظریات پر نہ صرف سیر حاصل تبصرہ ہے۔ بلکہ اہم علمی تنقید بھی ہے پھر اسلام کے اخلاقی نظام کو پیش کیا گیا ہے۔ بعض اہم مباحث، مثلاً مباحث نفس ونفسانیت ماحول، کردار اور اس کے مبادیات وغیرہ بڑی خاص قدر وقیمت رکھتے ہیں، اسلام کے اخلاقی نظام کے سلسلہ میں اخلاق فاضلہ، خیر و شر، اور نفس وروح کی حقیقت، عملی اخلاق وغیرہ کے مباحث، خالص فنی وتحقیقی انداز میں ہیں۔ اور ان سب میں، معتبر ترین مواد موجود ہے۔ اور قرآن وحدیث سے استدلال ہے

۴۔ رسول کریمؐ

سیرۃ نبوی پر مشتمل ایک بہترین اور معتبر درسی کتاب ہے۔ ابتداء میں ایک مفید مقدمہ ہے جس میں تاریخ کے مبادی مذکور ہیں۔ اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا مواد، قرآن وحدیث اور قابل ستند تاریخ کی کتابوں سے ماخوذ ہے۔ خاص خاص مسائل کو تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔ اور اس سلسلہ میں متعصب غیر مسلم مورخین کی جانب سے کئے گئے اعتراضات کو رد کیا گیا ہے۔ ہر باب کے بعد اس کا خلاصہ درج ہے۔ تاکہ طلبہ کو یاد کرنے میں آسانی ہو۔ کتاب کی زبان عام فہم اور رواں ہے۔ بلاشبہ ہم کو تدریسی کتابوں میں کوئی ایسی کتاب نہیں نظر آتی۔ جو اس طرح کا معتبر مواد یکجا رکھتی ہو اور ساتھ ہی اس میں غیر مسلموں کے تعصبات کو رد بھی کیا گیا ہو۔ کتاب تقریباً پونے تین سو صفحات پر مشتمل ہے۔

۵۔ بلاغ مبین

یہ کتاب تبلیغ دین کے موضوع پر ہے۔ اس میں اعلائے حق اور تبلیغی اصولوں پر روشنی ڈالی ہے۔ کتاب کے ابتدائی حصہ میں، دعوتِ دین کے اصول قرآن اور حدیث سے جمع کئے گئے ہیں۔ درمیانی حصہ میں آنحضورؐ کے فرامین مبارک ہیں۔ جو کہ اپنے مختلف بادشاہوں اور سرداروں کے نام سلسلہ دعوت دین بھیجے۔ آخر حصہ کتاب میں نتائج، جہاد کی حقیقت جزیہ کی تعریف اور دعوت حق کا مفہوم بیان کیا گیا ہے۔ کتاب تقریباً

تین سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اور مولانا کی ابتدائی تصانیف میں سے ہے۔

۶۔ حفظ الرحمٰن لمذہب النعمان

مدراس کے ایک گاؤں، پیارم پیٹ میں مقامی مقلدین و غیر مقلدین میں اختلاف پیدا ہوا۔ اور نزاعی مسائل میں بحث کا دروازہ کھل گیا۔ اور ایسا چنداہل حدیث علمار کی شدت کی وجہ سے ہوا تھا۔ مقامی لوگوں نے آپ کو دعوت دی۔ چنانچہ آپ تشریف لے گئے۔ لیکن مناظرہ یا مباحثہ کا موقع نہ آیا۔ چنانچہ ان نزاعی مسائل کا حل یا جواب ایک کتاب کی صورت میں یکجا کر دیا گیا۔ جو احناف پر اعتراض کے طور پر پیش کئے جاتے ہیں۔ مثلاً قرآۃ خلف الامام، رفع یدین وغیرہ۔

تالیفات پر ایک نظر

مولانا کی تالیفات میں ہم کو سب سے ممتاز اور قابل فخر تالیف قصص القرآن نظر آتی ہے۔ اس کے بعد اخلاق و فلسفہ اخلاق، اور اسلام کا اقتصادی نظام کا درجہ ہے۔ قصص القرآن نہ صرف یہ کہ موضوع کے اعتبار سے اہم تالیف ہے، بلکہ اس سے صاحب تالیف کی فنی و علمی عظمت کا احساس بھی ہم کو ہوتا ہے اور صرف یہی ایک تالیف، مولانا کو علامہ شبلی، مولانا آزاد اور مولانا سید سلیمان ندوی کی صف میں کھڑا کر دیتی ہے۔ مستقبل میں ادبی مورخ مولانا کو اردو کے طبقہ علیا کے مصنفین میں شمار کرے گا۔ تفسیر قرآنی، اتنا آسان کام نہیں جتنا کہ سمجھا جاتا ہے۔ ایک جانب ہر لمحہ قرآن کی اہمیت و عظمت اور سلف صالحین کے مسلک کا خیال رکھنا ہوتا ہے تو دوسری جانب زمانہ جدید کے ارتقار اور تحقیقاتی اسلوب کو ملحوظ نظر رکھنا ہوتا ہے۔ اس راہ میں قلم کی ذراسی لغزش ہمیشہ کے لئے پایہ اعتبار سے گرانے کے لئے کافی ہوتی ہے۔

"اخلاق و فلسفہ اخلاق" سے اردو میں ایک نئے فن کا آغاز ہوتا ہے۔ بڑے تعجب کا مقام ہے کہ اردو باوجود ایک بڑا علمی ذخیرہ رکھنے کے، اخلاقیات کے موضوع پر تہی مایہ ہے۔ شاید اس کی جانب اس لئے توجہ نہیں کی گئی کہ یہ کام بڑا کٹھن اور دشوار ہے اور فلسفیانہ بصیرت چاہتا ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے ہم کو مولانا کی فنی بصیرت کی داد دینی پڑتی ہے۔ "اسلام کا اقتصادی نظام" بھی اپنے موضوع پر اولین کوشش تو نہیں، لیکن منفرد اور ممتاز ضرور ہے۔ اگرچہ اردو میں، اس موضوع پر اب کافی مواد فراہم ہو گیا ہے۔ تاہم اس کی قدر و قیمت اپنی جگہ برقرار رہے گی۔ "بلاغ مبین" اور "رسول کریم" دونوں عام اردو داں طبقہ کے لئے لکھی گئی ہیں۔ چنانچہ ان میں سلیس زبان اور عام فہم اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔ ان سے مولانا کی ہمہ جہت ذہنی صلاحیت اور انشا پردازی کی قابلیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

طرز تحقیق

مولانا ایک صاحب طرز محقق تھے۔ ان کا اپنا تحقیقی اسلوب تھا۔ ان کی تالیفات میں ہم کو ان کا یہ منفرد اسلوب تحقیق نمایاں نظر آتا ہے۔ موجودہ دور میں اسی اسلوب کو مقبولیت کی سند حاصل ہوتی ہے۔ جو اپنے فن اور شخصیت اور زمانے سے پوری طرح میل کھاتا ہو۔ مولانا کی فنی قابلیت کا معیار، ان کی شخصیت کی متانت و سنجیدگی، ذہنی و فکری بلندی پوری طرح ان کے اس اسلوب سے نمایاں ہے۔ ان کا اسلوب بنانے میں دیوبند کی نوے سالہ تاریخ، زمانہ جدید کی ادبی و علمی تحریکات اور خود ان کی اپنی الہامی صلاحیتیں شامل رہی ہیں۔ دیوبند کے فکری منبع نے مولانا کے قلم کو بہت کچھ دیا ہے۔ وہ 'ولی اللہی افکار، اور سلف صالحین کے تصورات کا مرکز ہے۔ اس نے اسلامی علوم و فنون کی اشاعت میں ایک ناقابل فراموش حصہ لیا ہے۔ چنانچہ دیوبند کے اس پہلو کا اثر ہم مولانا کی تحریروں میں صاف صاف دیکھتے ہیں۔ ان کے افکار حضرت شاہ ولی اللہؒ اور علامہ انور شاہؒ سے خاص طور پر متاثر ہیں، حضرت شاہ ولی اللہ نے ہندوستان کی علمی تاریخ بنائی ہے وہ ہندوستان میں احیائے دین کے علم بردار رہے ہیں۔ چنانچہ ایک عظیم مفکر ہونے کی حیثیت سے انھوں نے اپنے عہد کے تمام رجحانات کو سمجھا۔ اور ان سے نبرد آزما ہوئے۔ انھوں نے اسلامی تعلیم و فلسفہ عالیہ دینی تصوف کی روشنی میں کائناتی و شرعی نظام کی تشریح کی۔ وہ امام غزالیؒ و امام رازی ہی کی طرح، اپنے دور کے ایک بلند فکر ہیں۔ علامہ انور شاہ اپنے دور کی وہ عظیم شخصیت تھی جو مغربی افکار سے ضروری طور پر واقف تھی اور تمام اسلامی افکار پر حاوی تھی۔ ان کے دور سے دیوبند کی علمی نشاۃ ثانیہ کا آغاز ہوتا ہے۔ چنانچہ ہم ان کے شاگردوں، مولانا بدر عالم میرٹھی مولانا مناظر احسن گیلانیؒ مولانا سعید احمد اکبر آبادی اور مولانا محمد میاں صاحب میں اسی علمی رجحان کو نمایاں اور قوی تر پاتے ہیں۔ علامہ انور شاہؒ کی علمی تحریک کا نتیجہ

اس نوخیز علمی نسل کی صورت میں ظاہر ہوا۔ مولانا کے اسلوب تحقیق کو خاص شکل دینے۔ اور منفرد مقام دلانے میں، یہ سب حالات اور خود ان کی شخصیت کے اوصاف کمال شامل ہیں۔ قدرت نے ان کو قدسی تخیل، اور ملکوتی فکر سے نوازا تھا۔ ان کا شعور، عرشی قندیل تھا جو تیرگی میں بھی نور بکھیرتا رہا۔

مولانا کے طرز تحقیق میں سب سے نمایاں وصف یہ ہے کہ وہ فنی انداز کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ اور قلم کی گلکاریوں میں حقیقت کے حسن کو نہیں بھول جاتے۔ ان کی نگاہ اپنے ہر جملے اور ہر لفظ پر ہوتی ہے۔ قرون وسطیٰ کے علماء کی طرح وہ خالص فنی شعور اور حدود کے ساتھ بحث کرتے ہیں۔ وہ ایسے اجتہاد کے شکار نہیں ہیں، جو بسا اوقات فنی عدم استعداد کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اور زمانہ جدید کے بہت سے مصنفین میں پایا جاتا ہے۔ اسی بنا پر فنی اعتبار سے، مولانا کی تالیفات، اپنے معاصرین پر فوقیت رکھتی ہیں۔ اقتصادیات کے موضوع پر مولانا مناظر احسن گیلانی نے بھی "اسلامی معاشیات" کے نام سے قلم اٹھایا لیکن جو بات مولانا کی تالیف "اسلام کا اقتصادی نظام" میں ہے۔ وہ اس میں نہیں۔ بلاشبہ "اسلامی معاشیات" میں ایک بڑا مواد یکجا ہو گیا ہے۔ لیکن فنی اعتبار سے اس تالیف کی قدر و قیمت بہت کم ہے۔ کسی موضوع پر ایک بڑا مواد جمع کر دینا اور اس کو بہتر طور پر پیش کرنا ایک قابل تعریف بات ہے۔ لیکن خالص فنی انداز میں کوئی تالیف کرنا، قابل تعریف ہی نہیں بلکہ دشوار ترین بات ہے۔ تقابلی مطالعہ جچے تلے انداز میں اصول کی نشاندہی، موضوع کا منطقیانہ اثبات، اور فنی استدلال۔ یہ سب کچھ ہو تو ایک فنی تالیف وجود میں آتی ہے۔

مولانا کے اسلوب تحقیق کا دوسرا بڑا وصف تجزیہ و تحلیل ہے۔ ہر مسئلہ پر اپنی رائے پیش کرنے اور نتیجہ نکالنے سے قبل، وہ زیر بحث مسئلہ کو ناظر کے سامنے کھول کر بیان کرتے ہیں۔ پھر اس پر بڑے جچے تلے انداز میں فلسفیانہ استدلال سے کام لیتے ہوئے اپنی تحقیق پیش کرتے ہیں۔ ان میں تحقیق و تلاش اور حقیقت رسی کی بے پناہ صلاحیت ہے۔ وہ کھلے اور آزادانہ ذہن سے کام لیتے ہیں۔ کسی قسم کے علمی تعصب کو دخل انداز ہونے نہیں دیتے۔ اور یہی وصف ہے۔ جو ان کو ایک بلند محقق کے مرتبہ تک پہونچاتا ہے

ان کے اسلوب تحقیق کی تیسری بڑی صفت یہ ہے کہ وہ سب سے پہلے، دین کے سرچشمے، یعنی قرآن و حدیث، کو اپنے استدلال کا ذریعہ بناتے ہیں۔ پھر سلف صالحین کی توجیہہ و تشریح کی جانب رجوع کرتے ہیں۔ اور سب سے آخر میں اپنے وجدان کو اپنی دلیل بناتے ہیں۔ ان ہی اوصاف کی بنا پر مولانا کو جدید علم کلام کی تاریخ میں خصوصی مقام دیا جائے گا۔

طرز تحریر

جس طرح وہ ایک صاحب طرز محقق تھے۔ اسی طرح وہ ایک صاحب طرز ادیب بھی تھے۔ چنانچہ وہ اپنا ایک خاص اسلوب تحریر رکھتے ہیں۔ ان کے اسلوب تحریر میں نہ مشہور عام عالمانہ ثقافت ہے۔ اور نہ ہی مبتذل قسم کی کوئی چیز۔ موقعہ و محل کے اعتبار سے ان کا قلم اسلوب بناتا جاتا ہے۔ وہ تحقیق کے مواقع پر انشا پردازی یا لفاظی سے کام نہیں لیتے، اسی لئے اگر ایک جانب، ان کی سنجیدہ تالیفات میں، عالمانہ اور مقالاتی زبان کی سنجیدگی اور متانت ہے تو دوسری جانب، عام اردو داں طبقہ کے لئے لکھی گئی کتابوں میں وہ انتہائی سلیس اور رواں و عام فہم زبان استعمال کرتے ہیں۔ فہم مخاطب کے اعتبار سے ان کا انداز بیان تبدیل ہوتا جاتا ہے۔ اور یہی بلاغت کا معیار ہے۔ چونکہ ان کی شخصیت مجلسی تھی۔ اور عوام سے ان کا براہ راست تعلق تھا۔ اس لئے وہ بیک وقت دو قسم کے انداز بیان اختیار کر سکتے ہیں۔ قصص القرآن، اخلاق و فلسفہ اخلاق اور اسلام کا اقتصادی نظام کا انداز بیان خالص علمی و مقالاتی ہے جب کہ "بلاغ مبین" اور "رسول کریم" کا انداز بیان، نہایت آسان فہم اور سلیس ہے۔ چنانچہ آخر الذکر دونوں کتابوں کا، ایک ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

> "اسلام ایک نیچرل مذہب ہے، اور اس کی فطرت، فطرت الٰہی و قانون قدرت کے موافق ہے، بے شک وہ جوگیانہ اصول پر عمل پیرا ہونے کا مدعی نہیں ہے اور نہ وہ رہبانیت کی اس تعلیم کو پسند کرتا ہے کہ کسی غار میں، یا پہاڑ کی چوٹی پر، زندگی یا زندگی کا بیشتر حصہ انسانوں کی خدمت سے جدا ہو کر گزار دو۔ اور خدائے برتر کے اس کارخانۂ نظم و نسق کو یونہی کسی صحیح نظام اور امن پسند دستور و آئین کے بغیر چھوڑ دو۔"

(بلاغ مبین)

"فتح مکہ کے دن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب عزت و احترام کے ساتھ مکہ معظمہ میں داخل ہو گئے تو قریش ہی سے ایک شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ مگر خوف و دہشت کی وجہ سے کانپ رہا تھا۔ اور منہ سے بات تک نہ نکلتی تھی۔ آپ نے نہایت شفقت و مہربانی سے، ارشاد فرمایا "گھبراؤ نہیں! اور خوف کو دل سے نکالو، میں قریش ہی کی ایک خشک گوشت کھانے والی عورت کا بیٹا ہوں"

(رسول کریمؐ)

یہ دونوں اسلوب دراصل ایک ہی اسلوب کے دو رنگ ہیں۔ اور ان سے، ان کے منفرد اسلوب پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اسلوب کا معنوی ربط اور درجہ تو بہر حال یکساں ہے۔ رہا ہیئت اور لفظوں کی ظاہری کیفیت کا سوال تو اس کا تعلق مولانا کی شخصیت کے دو پہلوؤں سے زیادہ ہے۔ ایک تو وہ سنجیدہ اور علمی پختگی کا پہلو، دوسرا ان کی ہر لمحہ مضطرب سیاسی زندگی کا پہلو، مختصر یہ کہ ایک بلند پایہ محقق اور عالی مرتبہ ادیب کی حیثیت سے ہم کبھی بھی ان کا نام فراموش نہ کر سکیں گے۔ فقط

کچھ ایسے بھی اُٹھ جائیں گے اس بزم سے جن کو
تم ڈھونڈنے نکلو گے مگر پا نہ سکو گے

حضرت مجاہد ملت کی ہمہ گیر شخصیت پوری انسانیت کے لئے ایک نمونۂ زندگی ایک اسوۂ رسول کا مکمل عکس، اور العلماء ورثۃ الانبیاء کا اکمل ترین پرتو تھا، ہر وہ شخص جس نے آپ کو بہت قریب سے دیکھا ہے وہ آپ ہے نہ آپ کی بے پناہ محبت آپ کے بے لوث خدمات اور آپ کے والہانہ ایثار و قربانی کا بجا طور پر معترف ہوگا، اور اس سے انکار جوہر کی ناشناسی اور ایک حقیقت کا ٹھکرانا ہوگا۔

واقعہ یہ ہے کہ آپ نے اس فرقہ پرستی سے متاثرہ دور میں فرقہ پرستی کے انسداد کے لئے وہ کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں کہ وہ ہماری موجودہ اور آیندہ نسلوں کے لئے ایک گرانقدر انعام ہے، اور ایک ضابطۂ عمل بھی،

اور اس سے بھی انکار ممکن نہیں کہ حضرت مولانا نے اس نازک دور میں جس طرح جمعیۃ علماء ہند اور قوم پرست مسلمانوں کی طرف سے قومی اتحاد اور فرقہ پرستی کی روک تھام کے لئے اس تندہی اور انمٹ لگن کے ساتھ نمایاں کام انجام دیئے کہ اس کی کوئی مثال مشکل ہی سے مل سکتی ہے، اور چونکہ آپ کے یہ تمام تر خدمات نام و نمود اور مفاد پرستی کی سمت سے الگ تھلگ ایک خدمت قوم اور خدمت وطن کے لئے اخلاص کی صورت میں وجود پذیر ہوتے تھے، اس لئے ہمہ وقت آپ کا توکل اور بھروسہ اس ذات اقدس پر رہتا تھا، جس پر آپ کا ایمان و یقین تھا، چنانچہ اس کی ایک ادنیٰ مثال آپ کا وہ لازوال مقولہ ہے جو آپ نے کبھی کسی موقع سے آل انڈیا کانگریس کے موجودہ صدر جناب ڈی سنجیویہ سے انھیں اولوالعزمی اور ارادے کی پختگی کی طرف ہمت دلاتے ہوئے فرمایا تھا۔ جس کو ہمارے صدر موصوف نے کچھ اس طرح بیان کیا ہے، کہ "میں نے ایک اہم معاملہ میں ان سے گفتگو کی تھی اور انھوں نے مشورہ دیا تھا، کہ خدا پر بھروسہ رکھو صحیح کام کرو اور نتیجہ خدا پر چھوڑ دو" آپ کی اس نشان دہی میں کتنا وزن اور کس قدر اعتماد ہے، اس کو ہر ذی شعور اور باہوش انسان خود سمجھ سکتا ہے۔

بہر حال آپ کی عالم گیر شخصیت اور آپ کی مجاہدانہ اور وطن پرورانہ زندگی پوری دنیا کے لئے مشعل راہ ہے۔

مولانا اور فلسفۂ اخلاق

پروفیسر خواجہ محمد عبد الحی صاحب
شعبۂ فلسفہ ونفسیات۔
دیال سنگھ کالج۔ نئی دہلی

ہماری زندگی کی ابتداء وانتہا کی پیدائش کا مبداء ان مادیاتی نقطۂ نگاہ سے صرف انفرادی یا اجتماعی شعبہ ہائے حیات ہی نہیں ہیں بلکہ روحانی، ذہنی اور علمی حیثیت کو اگر زیرِ فکر لاکر صورت حال کا جائزہ لیا جائے تو تصویر اپنی جگہ قائم رہتی ہے اور اس کے اصلی اور اہم رُخ سامنے آجاتے ہیں۔ کون و فساد، حقیقت و مظاہر، اصلیت راز اور ظواہر، روح و نفس، ہستی مطلق، ہستی مقید و مخصوص، خالق و مخلوق اور شہود و مشاہد وغیرہ مسائل سے وابستہ خیالات ماضی ۔ بہت دور کی ماضی سے ۔ چلے آرہے ہیں ۔ کتنے خیالات ہیں؟ اور کتنے ان کو خیالات کا جامہ پہنانے والے؟ فلسفہ کیا ہے؟ کیا ایک فلسفہ ہے یا بہت سے فلسفے؟ جتنے ذہن اتنے خیالات اور جتنے منہ اتنی باتیں۔

اگرچہ خاموشی سے کام کرنا ایک بڑی خوبی ہے لیکن کچھ لمحات ایسے ہوتے ہیں کہ "احساس" کی دنیا میں ہلچل مچا دیتے ہیں۔ ایسے موقعہ پر زبان یا قلم کا جنبش میں نہ آنا ایک روحانی اور اخلاقی گناہ ہوتا ہے۔ احساسات کا سیلاب خطرناک بھی ہوتا ہے۔ لیکن ادراک تفکر کے سایۂ عاطفت میں بڑی امن مل جاتی ہے۔ اچھے آدمیوں کی رحلت ذہن و دماغ کو معطل کرنے والی ضرور ہوتی ہے۔ لیکن ان سے وابستگی کے راستے مختلف ہوتے ہیں۔ کسی عالم، مفکر اور فلسفی سے رشتہ کی نوعیت روحانی، عقلی، ذہنی یا علمی ہوا کرتی ہے۔ یہ رشتہ اٹوٹ ہے۔ ایسے اصحاب کو ان کے ارشادات اور دیگر کارناموں کی وجہ سے سرمدیت حاصل رہتی ہے۔

ظاہری حیات کا عرصہ تنگ ہے بلکہ بہت تنگ اور اسی لئے اس کی قدر کی جاتی ہے۔ یہ زندگی کے لمحات قیمتی ہوتے ہیں لیکن قیمت کا معیار اور فیصلہ افراد، جماعتیں اور قومیں اپنی اپنی طرح اور الگ الگ کرپاتی ہیں۔

ماہ اگست کو ہمارے ملک کی تاریخ میں اچھا مقام حاصل ہے۔ سنہ ۱۹۶۲ء کی دو اگست کی صبح وشام اپنی مادی تابناکی اور جگمگاہٹ کے باوجود ہندوستان کی عام فضا میں عموماً اور علمی دنیا میں خصوصاً اپنی تاریکی میں بے مثال ثابت ہوئی۔ ہم سے ایک عالم، ایک سیاست داں، صوفی فلسفہ داں دور دیش کنارہ کش ہوگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ علم و عمل کے توازن کا نادر نمونہ ہمارے سامنے نہ رہا۔ خدا پرستی و قوم پرستی کے معتدل مزاج کی تصویر کا رخ ہماری طرف سے پھر گیا۔ اسلامی تعلیمات اور ان کی فلسفیانہ بنیادوں کے ترجمان سے ہم محروم ہوگئے۔ انسان دوستی، فرض شناسی، عقلمندی اور جرأت ایسے اوصاف سے متصف شخصیت کو ہم نے کھودیا یہ وقت عبارت آرائی کا نہیں حق گوئی کا ہے۔ مولانا مرحوم کی شخصیت اور سوانح حیات کے لب لباب کو اگر ایک لفظ میں ادا کیا جائے تو وہ ہے "حق گوئی"۔ حق کا مفہوم واضح کرنا آسان نہیں۔ فلسفہ ہزاروں سال کی جد وجہد کے باوجود اس مفہوم کو متعین نہ کرسکا اور سائنس اپنی روحانی بے مائگی کی وجہ سے ان مسائل سے دوچار نہیں ہوپاتی۔ ہاں اور کبھی "حق گوئی" اور کبھی مشکل ہوجاتی ہے۔ لیکن اس روزمرہ کی زندگی میں کسی بات کو اپنے طور پر "حق" خیال کرتے ہوئے کبھی "حق گوئی" کی مثالیں پیش کرنے والے بہت کم ہی مل پاتے ہیں۔

ہندوستان بڑا خوش قسمت ملک ہے۔ بڑے بڑے انقلابات کے باوجود یہاں کا فلسفہ اپنی انفرادیت قائم رکھ سکا۔ مسیحی اور محمدی پیغامات یہاں پہنچے۔ اور آج تک مذہبی دنیا کا جہاں تک تعلق ہے اپنی اپنی انفرادیت اور عظمت کے ساتھ مذاہب ہند کی صف میں اپنا مقام لئے ہوئے ہیں۔ مولانا مرحوم کے فلسفہ کی مبادیات کیا ہیں؟ کائنات کے متعلق ان کا نظریہ کیا ہے؟ کون وتکوین اور تشریح کا مفہوم، مصداق اور طریقۂ تشکیل سے وابستہ وہ کیا رائے رکھتے ہیں؟ حیات، احساس اور علم وادراک ایسے بنیادی مسائل میں وہ کیا خیالات رکھتے ہیں؟ وجدان، تخیل، تعقل اور پھر فہم وافہام اور تفہیم کی حقیقت اور ان کے لواحقات سے وابستہ انھوں نے کیا کہا؟ خیر و شر، حسن وقبح اور حسن و تحسین، اچھے بُرے اور صحیح و غلط کے سلسلہ میں مولانا مرحوم نے کن بنیادی نظریات کو پیش نظر رکھا ہے۔ اس مختصر تبصرہ سے بالاتر مسائل ہیں۔ مولانا ایک جگہ فرماتے ہیں ۔ "انسانی تخلیق کے بارے میں صرف تین رائیں پائی جاتی ہیں (۱) انسان خدائے برتر کی بہترین ایجاد ہے اور اس کی صناعی کا بہترین شاہکار اور یہ کہ وہ مستقل مخلوق ہے نہ کہ کسی تدریجی ترقی کا نتیجہ (۲) انسان کی ہستی قوانین طبعی کے زیر اثر بخت واتفاق کا نتیجہ ہے یہ کسی خالق کی مخلوق نہیں (۳) انسان کی تخلیق قوانین قدرت کے اصولوں کے مطابق تدریجی ارتقاء سے ہوئی ہے اور وہ مستقل مخلوق ہوکر عالم وجود میں نہیں آیا۔ تمام اہل مذاہب اور بعض علماء طبیعی پہلی رائے کے قائل ہیں۔" مولانا نے تفصیلی طور پر آخری دو نظریوں کی تردید کی ہے اور اخلاقی قدروں کے لئے قرآنی ارشادات کو بنیاد قرار دیتے ہوئے ناقدانہ طرز استدلال کے ساتھ اس مسئلہ پر روشنی ڈالی ہے۔

عام فلسفیانہ مسائل کے بارے میں مولانا کی رائے سے پہلے ہم کو ان کی شخصیت کی طرف دیکھنا ضروری ہے۔ مولانا ایک مسلمان عالم باعمل تھے۔ تخلیق عالم کے سلسلہ میں ان کے نظریہ کی بنیاد قرآن کریم کے اس ارشاد عالی سے قائم ہوتی ہے۔ "واذ قال ربك للملائكة انی جاعل فی الارض خلیفة ۰ الآیة۔ اور کنت کنزاً مخفیاً فاحببت ان اعرف فخلقت الخلق ۔ الحدیث

نظریۂ علم کی نوعیت اس مندرجہ ذیل ارشاد باری تعالیٰ سے ماخوذ اور اسی پر مبنی ہے۔ وَعَلَّمَ آدَمَ الْاَسْمَاءَ كُلَّهَا۔ الآیۃ۔ چنانچہ مولانا حواس کے ذریعہ حاصل ہونے والی واقفیت کو اضافی، وقتی اور عارضی مانتے ہیں۔ یہ احساس یا تجربہ آخری اور حتمی جانکاری کا ذریعہ نہیں۔ اس کے ذریعہ ہم کو ان اشیاء کا اندازہ ہو جاتا ہے جو مظاہر اور ظواہر کی دنیا میں ہیں۔ حقیقت اور اصلیت کے راز و رموز کے لئے دوسرا راستہ ہے اور وہ ہے تعلیم ربّی خواہ وحی کی شکل میں ہو یا الہام، مشاہدہ یا خواب کی۔

مسئلہ تکوین کے سلسلہ میں مولانا مرحوم دیگر مذاہب سے اتفاق کرتے ہیں جو خالق حقیقی کو مبدأ حیات و تکوین اور مسبب الاسباب قرار دیتے ہیں۔ مسئلہ تکوین کے بارے میں مولانا کی یہ تحریر ان کے فلسفہ (کسی مفہوم میں) اور مذہبی شخصیت کو واضح طور پر روشن کر دیتی ہے "ہمارے دائرہ سے یہ باہر ہے کہ ہم "نظام تکوینی" سے بحث کریں۔ بلکہ ہم صرف "نظام تشریعی" (قانون تشریع) ہی کے دائرہ میں محدود رہ کر بحث کر سکتے ہیں۔" اسلام کا اقتصادی نظام صفحہ ۴۸۔

"اخلاق" کے بارے میں "اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ" سے ایک معیار اعلیٰ مولانا کے عقائد میں شامل ہے۔

معیار شخصیت "اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ" ارشاد عالی سے متشرح ہونے والے زرّیں اصول "تقویٰ" کو قرار دیا ہے۔

حیات اور اس کی قدر و قیمت، عبادت و ایثار وغیرہ کا منشاء اور ان سے وابستہ مقاصد: اِنَّ صَلٰوتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ کے فرمان پاک سے متعین ہوتے ہیں۔

مبدأ و معاد کے لئے اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ایک جامع و مانع کلیہ ہے جو منشاء تخلیق اور مقصد تخلیق دونوں کو واضح کرتا ہے۔

مختصراً مولانا کے فلسفۂ اخلاق کی بنیاد اسلامی تعلیمات پر ہے۔ مولانا کو ایک فلسفی کا مقام اس لئے نہیں دیا جا سکتا کہ وہ اس میدان میں منطقیانہ انفرادیت نہیں رکھتے، ان کو سقراط، افلاطون و ارسطو یا ان کے علاوہ دنیا کے کسی خطہ میں شروع ہونے والے سلسلے میں منسلک کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا لیکن فلسفۂ مذہب اور پھر خصوصاً مسلم فلسفہ یا اسلامی فلسفہ کے علماء میں مولانا کا ایک اچھا مقام ہے۔ مولانا کی زندگی سیاسی امور سے وابستہ رہی بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ سیاسی ہنگاموں میں مولانا کی مثال "طوفان" اور "دریا" کی رہی اگرچہ باد صرصر یا جھونکوں سے یہ چراغ گل نہ ہوا لیکن ہر دیا ایک وقت معین تک ہی ضیا پاشی کر سکتا ہے بحیثیت مجموعی مولانا کی زندگی کا بیشتر حصہ براہ راست فلسفہ سے وابستگی میں نہیں گزرا۔ مگر جو کچھ ہمارے سامنے اُن کے ارشادات ہیں ان سے ان کے بارے میں رائے قائم کی جا سکتی ہے۔

ایک طرف مشہور فلسفی کانٹ کی معقولیت اور منطق کی جھلک مولانا کے فلسفۂ اخلاق میں ہے اور دوسری طرف الغزالی کی فلسفیانہ ترجمانی موجود ہے۔ وجود باری تعالیٰ، روح، حیات ثانیہ، وحی و الہام اور مقصدیت مولانا کے فلسفۂ اخلاق کی بنیادیں ہیں بحیثیت مجموعی مولانا کا اخلاقیات "اسلامی اخلاقیات" ہے۔ مذہب کو تقدم حاصل ہے۔ اور "اخلاقیات" کی تکوین و تدوین کی حقیقت و حدود اور خصوصیات مذہب مقرر کرتا ہے۔ "قلب" کا کام یقین کرنا ہے اور "عقل" ان سب کی ترجمان۔ "احساس" اور "لذت" کو مولانا کے فلسفۂ اخلاق میں ثانوی حیثیت حاصل ہے۔ یہ ذرائع کی فہرست میں آتے ہیں بذات خود مقاصد نہیں، انسان کی انسانیت، اس کی روحانی، قلبی اور روحانی و عقلی حیثیات میں مضمر ہے۔ جسم، حواس اور جنسی لذات محض ہماری حیوانیت کے ساتھ قدرتی طور پر وابستہ ضرور ہیں۔ اور اسی حد تک ان سے متعلقہ امور کو روح، ذہن یا قلب مطمئن کے احکام کی پابندی کے ساتھ اس حیات عارضی میں نباہا جا سکتا ہے۔

الغزالی کی طرح مولانا جذبات کی ہستی اور ان کی مخصوص حقیقت کے قائل ہیں۔ جسمانی جذبات اور جنسی لذت کا قلع قمع انفرادی یا اجتماعی طور پر انسان کی بھرپور زندگی نہیں بلکہ وہ اس معنی کر قطعاً غیر فطری بن جاتی ہے کہ اگر اس قسم کی کسی خوبی (ایسا سمجھ کر) ہر شخص متصف ہوتا جائے تو نظام عالم قبل از وقت ہی اپنے کبھی ہو سکنے والے اختتام کو پہنچ جائے گا۔

کسی "نظریہ کی سچائی"، "خوبصورتی" اور "اچھائی" کے سلسلہ میں مولانا دو بنیادی باتوں کے قائل نظر آتے ہیں۔ ایک یکسانیت و ہمواریت اور دوسری جامعیت و ہمہ گیری لیکن مولانا منطقی پابندیوں میں الجھ کر جذبۂ شوق، عشق، اور جمالیاتی اور جنسی پہلوؤں کو نظر انداز نہیں کرتے

انسان کی قوت ارادی اور اس کے ارادہ کی فطرت و نوعیت اور اس کے اختیار کے سلسلہ میں ضمنی طور پر جو کچھ کہیں کہیں سے اندازہ ہو سکا ہے مولانا کسی حد تک عام علماء نفسیات کے ساتھ معلوم ہوتے ہیں لیکن یہاں بھی وہ بنیادی طور پر اسلام کے مسئلہ تقدیر، اختیار و جبر سے وابستہ متعدد آراء میں سے اہل سنت والجماعت کے مسلک پر ہیں اور ممتاز طریقہ پر یہاں ان کا مسلک حنفی متکلمین کا ہے۔

فعل اختیاری کی اچھائی یا برائی کے فیصلہ کے لئے معیار مولانا "نیک نیتی" یا "حسن نیت" کو قرار دیتے ہیں۔ اس کی بنیاد یورپ کے عہد وسطیٰ یا عہد جدید کے فلسفیوں کے نظریات نہیں بلکہ یہ معیار اس ارشاد نبوی سے قائم ہوتا ہے "اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ"۔

مختصراً اعمال کے حسن و قبح کے سلسلہ میں مولانا "اسلامی طرز زندگی" کو اخلاقیات کی ہدایت میں کتبی اصول اخلاق اور فلسفۂ اخلاق سے قریب ترین سمجھتے ہیں۔ جہاں انسان کچھ سادہ سے بنیادی امور کا مکلف ہوتا ہے مثلاً وہ ذہنی طور پر اس بات کا

یقین رکھتا ہے کہ وہ ہر لمحہ حاکم حقیقی کے سامنے حاضر ہے۔ سچائی ہی دکھ اور پریشانی سے نجات پانے کا راستہ ہے۔ اتفاق اور صلح ہی میں عافیت اور خیریت ہے حقیقی سرداری اپنے ہم جنسوں کی خدمت کرنا ہے۔ مادی ذرائع کے استعمال میں اعتدال ہی ان کا مناسب استعمال ہے۔ یہ زندگی ایک چلتی پھرتی چھایا ہے۔

اخلاق کا تعلق بنیادی طور پر اجتماع سے ہے عملی طور پر اخلاق اور حسن اخلاق کے لئے ایک سے زیادہ افراد کی ضرورت ہے صرف ایک فرد واحد اگر کسی طرح تجرد کی زندگی کسی ایسے گوشہ میں گذار رہا ہے کہ جہاں دوسرے افراد کی کسی طرح رسائی نہ ہو اور وہ بھی اپنی جگہ دوسرے افراد سے قطعاً بے نیاز ہو تو اس کی زندگی نہیں کہا جاسکتا کس نوعیت کی ہوگی مگر وہ شخص انسانی حقوق و فرائض کی دنیا سے بہت دور ہوگا اور وہاں اخلاقی زندگی کا سوال ہی نہیں پیدا ہو سکتا "اخلاق" کا سوال "فرد اور جماعت" کے باہمی امتزاج سے وابستہ ہے۔ مولانا نے اجتماعی زندگی اور فرد و جماعت کے رشتہ کو اسلام کے نظریۂ اخوت اور انسان دوستی کے تحت (متعدد جگہ) واضح کرکے یہ ثابت کیا کہ فرد کی انفرادیت اور جماعت سے وابستگی میں اعتدال چاہئے اور اسی اعتدالیت میں اس مسئلہ کا حل اور فرد کی خوبی پوشیدہ ہے۔

حق حیات یا زندگی کا حق اور آزادی، انفرادی اور اجتماعی، وغیرہ حقوق کے سلسلہ میں مولانا ان کو "اخلاقیات" کی بنیاد تسلیم کرتے ہیں۔ "آزادی" کے مفہوم کی وضاحت کرتے علماء متکلمین کے ساتھ ہوکر آزادی محدود کے قائل ہیں اور اخلاقی زندگی کے لئے آزادی اور حدود دونوں کو لازم خیال کرتے ہیں۔ "جبر مطلق" اور "آزادی مطلق" دونوں میں سے کسی ایک کے لئے "اخلاقیات" میں کوئی گنجائش نہیں۔ آزادی کے لفظ کے ساتھ دو لفظ اور رکھتے ہیں۔ "آزاد" اور "غلام" یہ الفاظ اسلامی تاریخ و ادب کے اندر ہی خصوصیت کے ساتھ استعمال نہیں ہوئے بلکہ ان کی وابستگی اسلام سے پہلے اور بعد ظہور اسلام غیر اسلامی دنیا سے بہت کچھ رہی ہے۔ اور آج تک (شاید) نام کے فرق کے ساتھ کم و بیش بہت سی جگہ موجود ہے اور یہ وجود رہنا کسی حد تک ناگزیر بھی ہے۔ اس مسئلہ پر مولانا نے کئی طرح روشنی ڈالی ہے۔ یہاں حضرت مولانا کی تالیف "اخلاق اور فلسفۂ اخلاق" کے صفحات ذیل خاص طور پر قابل ملاحظہ ہیں۔

از "بہر حال.... صفحہ ۲۹۸..... تا... خیال رہے" صفحہ ۳۰۰

حقوق و فرائض اور فضائل و رذائل کے سلسلہ میں مولانا مسلمان فلسفیوں کے ساتھ ہیں۔ مولانا اسلام کے "رواداری" کے عام رجحانات سے بہت متاثر ہیں "تعاون"، "مقاومت"، "امداد و ایثار" ایسے اوصاف کے لئے "اخلاقیات" میں مولانا کے نزدیک اہمیت حاصل ہے۔

فارابی، ابن قیم، ابن رشد، الغزالی، ابن مسکویہ وغیرہ کی فلسفیانہ ترجمانیاں مولانا بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور مستفیض بھی ہوتے ہیں۔ فارابی کے نظریہ "سعادت" ابن رشد اور الغزالی کے نظریہ "اخلاق میں تبدیلی"۔ ابن قیم کے ہمہ گیر مفہوم "خلق" کی مولانا مکمل تائید کرتے ہیں۔

فضائل و رذائل کے سلسلہ میں مولانا کے اقوال و آراء اور دیگر مسلم فلسفیوں کی طرح چند ایک مقامات پر فلاسفۂ یونان سے مل جاتے ہیں لیکن یہ محض اتفاق ہے۔ مولانا "مکارم الاخلاق" کے ترجمان ہیں اور ان کی تفصیلات ہی مولانا کے اخلاقیات کی جزئیات ہیں لیکن حقیقی طور پر یہ "مکارم الاخلاق" فطرت کے تقاضوں کے مطابق ہیں۔ اس لئے ظاہر ہے کہ جہاں کہیں کبھی کسی بھی ذہن انسانی نے کچھ نہ کچھ صحیح طور پر فطرت کا مطالعہ کیا اور اس کو سمجھا ہے اور اظہار کیا ہے۔ تو وہ ان "مکارم الاخلاق" کے یقیناً کچھ نہ کچھ مشابہ ہوگا۔ مزید برآں ایک اور بات کا بھی یہاں ذہن نشین رہنا ضروری ہے۔ فلسفہ کے مدون اور مستند طریقہ پر آغاز کے لئے تاریخ چند یونانیوں کے نام دکھلاتی چلی آرہی ہے۔ اس کے وجوہات کچھ بھی ہوں اور آئندہ تحقیقات کسی بھی نظریہ کی تشکیل کا باعث بن سکیں۔ یہ آگے کی بات ہے۔ فلسفہ کی ابتدا یونان میں ہوئی، ہندوستان میں یا کہیں اور ایک پیچیدہ مسئلہ ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ فلسفہ اتنا ہی قدیم ہے جتنا کہ انسان، خواہ اس کے ثبوت اور پیدا کردہ خیالات و نظریات کسی بھی شکل میں بنے اور مٹے ہوں۔ انسان کا شعور ان یونانیوں سے کہیں پہلے بیدار ہوچکا تھا لیکن تاریخ کی بے بسی یا ستم ظریفی کچھ بھی کہا جائے۔ اب تک جو کچھ ہوتا چلا آرہا ہے وہ یہ ہے کہ تمام علوم و فنون کے سلسلے انھیں چند یونانی علماء کے ناموں کے ساتھ وابستہ کردیئے جاتے ہیں اور بس یہ ایک حد آغاز بن جاتی ہے۔ اور تحقیق، تنقید اور تبصرہ کا معیار بھی اسی طرح قائم ہوتا ہے جب اسلامی تعلیمات اطراف عالم میں پھیلیں تو ظاہر ہے علماء زمانہ نے ان کو انھیں رائج الوقت فلسفیانہ طرز و طریق سے جانچا اور بطور نتیجہ مسلم عالموں (فلاسفۂ اسلام) کو بھی انھیں طرز و طریق کے لحاظ سے سمجھانا اور ثابت کرنا پڑا۔ اس کا قدرتی طور پر یہ اثر ہونا تھا کہ فضائل اور رذائل کی یونانی فہرست اور اسلامی فہرست کے درمیان یکسانیت اور مشابہت اجاگر ہوگئی اور متعصب شخصیتوں نے اس سے یہ فائدہ اٹھایا کہ اس کو بنیاد بناکر یہ اعتراض کردیا کہ یہ اخلاقیات اپنی جزئیات میں یونانی اخلاقیات سے وابستہ ہیں یا وہاں سے مانگ لیا گیا ہے حالانکہ ایسا نہیں اور نہ تاریخ اس کو ثابت کرسکی۔ مولانا بھی اپنے طرز استدلال میں یہی روش اختیار کرتے رہے ہیں اور ہمارے اسلامی مدارس میں بھی طرز استدلال تاحال رائج ہے ورنہ حقیقت حال یہ ہے کہ اسلامی تعلیمات اپنی ابتدا وارتقاء، مبادیات، عناصر، تفصیلات و جزئیات، موثرات و عوامل اور اثرات، ہر لحاظ سے اپنا مستقل وجود رکھتی ہیں۔

مولانا نے اسلامی نظریات، قدروں اور معیاروں کی فلسفیانہ طور پر رائج الوقت اصول اخلاق کے طرز استدلال کو بدلتے ہوئے ترجمانی کی ہے۔ عالم اسلام خصوصاً مسلم فلسفاء اردو سے وابستہ طبقوں کیلئے مولانا کی یہ ترجمانیاں شمع راہ ہیں اور قابل فخر سرمایہ بھی۔ طالب علم

دانائے راز حضرت مولانا حفظ الرحمٰن مجاہدِ ملت

از

(ہز ہائی نس نواب مرزا امین الدین احمد خاں صاحب آف لوہارو)

مجھ سے اور میرے خاندان سے جو قدیم و ذاتی تعلقات مولانائے موصوف کے تھے اسی نسبت سے میں نے مولانا موصوف کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ لہٰذا میں ڈاکٹر اقبال کی زبان سے یہ کہنے میں بالکل حق بجانب ہوں کہ :- بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

جب کبھی مولانا سے متعلق پچھلے حالات اور موجودہ واقعات بالمقابل سامنے آتے ہیں تو دل پر ایک خاص حالت طاری ہو جاتی ہے۔ خاص کر جب دنیائے تصور میں ان کو باوجود پیرانہ سالی ان تھک حالت میں مصروف جد و جہد پاتا ہوں اور ساتھ ہی ان جیسی بے غرض اور سراپا خلوص ہستی سے وطن کو خالی دیکھتا ہوں تو مایوسی کی تاریکی میں کوئی راہِ عمل نظر نہیں آتی۔

مولانا کی ذات گرامی ایک مرنجان و مرنج ہستی ہی نہ تھی بلکہ وہ اس ہمہ گیر قابلیت کے مالک تھے کہ جس کے باعث وہ ہر ادنیٰ سے اعلیٰ مسندِ قیادت اور بڑی سے بڑی ذمہ داری کے لئے باعثِ فخر تھے، اور کسی قسم کی اجنبیت و بے گانگی محسوس ہوئے بغیر مساوات و جمہوریت کی بے مثال مثال تھے۔ وہ گلستانِ ہند کے ایسے دیدہ ور چمن آرا تھے جسے کانٹوں سے الجھ کر آبیاری گل و ریحاں کا بڑا سلیقہ تھا وہ صرف مجاہدِ ملت ہی فی الواقع نہ تھے بلکہ مصلحِ قوم و محبِ وطن اور باہوش و خرد رہنما بھی تھے۔ ان کی اس خصوصیت کا کوئی جواب نہ تھا کہ وہ جب بعد از غور و خوض کسی بات کو صحیح مان لیتے تھے تو پھر میدانِ عمل میں آنے سے ان کو کوئی قوت اور بڑی سے بڑی طاقت روک نہیں سکتی تھی۔

مولانا میدانِ سیاست کے بے جگر سپاہی اور تہور تاب جنرل کی حیثیت سے بارہا باطل کے خلاف لشکرکشی کرتے اور مظفر و منصور ہوتے دیکھے جا چکے ہیں اور اسی طرح تقریر کی اسٹیج پر بہترین خطیب مقرر اور ناصح و واعظ پائے گئے ہیں جو انھوں نے حمایتِ حق و صداقت اور خیر خواہی ملک و بہبودی وطن کے ذیل میں بارہا پارلیمنٹ کے پلیٹ فارم سے دلیرانہ اور برجستہ کیں۔

ان کی عقابی نظر ملک کے ہر حصہ پر یکساں پڑتی تھی اور نہ تہ تک پہنچ جاتی تھی۔ وہ ہر مرضِ ملت کا مداوا اور ہر تکلیف بنی نوع کے ازالہ کی تدابیر کے لئے وقف کئے ہوئے تھے۔ ان کو جے پور کے مسلمانوں سے بھی اتنی ہی ہمدردی تھی جتنی زیادہ سے زیادہ کسی دوسرے مقام کے طبقہ اہل اسلام سے ہو سکتی تھی، چنانچہ وہ جب اپنے معالجہ کی غرض سے امریکہ کے لئے پابرکاب تھے اور مرض میں کافی شدت تھی تو میں ان کی مزاج پرسی کے لئے دہلی گیا مولانا سے نیاز حاصل کیا۔ مزاج پرسی کا جواب اور رسمی گفتگو کے بعد انھوں نے معاً جے پور کے مسلمانوں کے حالات و مسائل پر استفسارات شروع فرما دیئے۔ وہ اپنی تکلیف کو بھول کر نہایت سکون و اطمینان سے بہت دیر اس موضوع پر مجھ سے گفتگو فرماتے رہے۔ ان کے ہر فقرے سے جذباتِ خلوص و ہمدردی پھوٹے پڑتے تھے۔

مولانا ہر طبقہ خیال کے لوگوں کے جذبات و معتقدات سے بھی خوب واقف تھے اور وہ ایک جید عالم، مفکر، مبصر، رہنما اور بیدار مغز مدبر بھی تھے اور صلح کل پیشوا بھی۔

مولانا کی وفات پر ملک کے مایۂ ناز اور ہر دلعزیز وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے جن تاثرات کا اظہار تعزیتی پیغام اور اپنی متعدد تقاریر میں کیا ہے، اس سے مولانا کی عظیم شخصیت کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔

میری دلی تمنا ہے کہ اس ناقابل فراموش فدائے ملت و وطن کی یادگار اس کے شایانِ شان قائم کی جائے اور اس کی مفصل سوانح عمری موجودہ اور آئندہ نسل کی رہنمائی و بصیرت کے لئے پوری آب و تاب کے ساتھ شائع کی جائے۔

آخر میں مولانا کے لئے دست بدعا ہوں کہ حق تعالیٰ ان کو کروٹ کروٹ جنت الفردوس عطا فرمائے اور اپنے جوارِ رحمت سے سرفراز کرے اور ان کے پسماندگان و احباب اور عامۃ المسلمین کو صبر جمیل کی توفیق دے۔ (آمین)



نالۂ غم

مولانا حالی مرحوم کے رنگ میں

از: محمد مسلم مدرس مدرسہ بدرالاسلام، شاہ گنج۔ جونپور

حیف صد حیف ہو گیا رخصت — اس جہاں سے مجاہدِ ملت
ہاں وہ سرشارِ بادۂ وحدت — جان و دل سے تھا عاشقِ سنت
نازشِ ملک حافظِ ملت — قوم کے حق میں باعثِ عزت
صاحبِ فکر، مالکِ ہمت — چشمۂ خلق، پیکرِ جرأت
تھا یقیناً وہ بطلِ حریت — دلِ اعداء میں اس کی تھی ہیبت
ملک و ملت کے حق میں بے شبہ — ذات اس کی تھی باعثِ رحمت
دوستوں سے اسے نہ شکوہ تھا — دشمنوں سے اسے نہ تھی نفرت
وہ محبت کا اک سمندر تھا — نوعِ انساں سے اس کو تھی الفت
عزمِ محکم کے سامنے اس کے — بے حقیقت تھی قیصری سطوت
ہم غلاموں کو اس نے بتلایا — ہے غلامی کی زندگی لعنت
جان سے بھی عزیز تر تھا وہ — اب گوارا ہو اس کی کیوں فرقت

زخمِ دل جا کے کس کو دکھلائیں
دردِ دل کی دوا کہاں پائیں

نقشِ باطل مٹائے گا اب کون — قصرِ شدّاد ڈھائے گا اب کون
کون ہے جس پہ اعتماد کریں — بات بگڑی بنائے گا اب کون
جبکہ رہبر بھی ہو گئے رہزن — راہ سیدھی دکھائے گا اب کون
دل سے نفرت مٹائے گا اب کون — مئے الفت پلائے گا اب کون
قوم بے حس کو خوابِ غفلت سے — جب نہیں وہ جگائے گا اب کون
ہر اک طوفان کے مقابل میں — تان کر سینہ آئے گا اب کون
زندگی کی اندھیری راتوں میں — شمعِ عرفاں جلائے گا اب کون
ناخدا بن کے قوم و ملت کا — پار بیڑا لگائے گا اب کون
وقت پر کام آئے گا اب کون — ڈوبتوں کو ترائے گا اب کون

کس کے جانے سے دل ہوا ناشاد
گلشنِ ملک و دیں ہوا برباد

ہند میں جو ہے سوگوار ہے آج — اپنا بیگانہ اشکبار ہے آج
یاس و حرمان و اضطرار ہے آج — دل محزون بے قرار ہے آج
قلب غمگیں کو ہو سکوں کیونکر — رحلتِ یار غمگسار ہے آج
غم فرقت سے کیا کہوں اس کی — دامنِ صبر تار تار ہے آج
آہ گلشن سے جاتے ہی اس کے — صورتِ گل نگہہ میں خار ہے آج
گل پریشاں ہیں غنچے پژمردہ — جیسے روٹھی ہوئی بہار ہے آج
اب وہ گھبرا گیا ہے دنیا سے — قصد اس کا سوئے مزار ہے آج
قوم کے بار جو اٹھاتا تھا — قوم کے دوش پہ سوار ہے آج
ملک و ملت پہ جو ہوا قرباں — جان اس پہ مری نثار ہے آج
اس کے جانے سے قوم و ملت کا — آہ ٹوٹا ہوا حصار ہے آج
آہ اس ایک کے نہ ہونے سے — ملک و ملت میں انتشار ہے آج

اس کے دم سے تھی گرمئ محفل
اس کے جانے سے بجھ گیا ہے دل

قال تھا اس کا حال کی صورت — ہر عمل تھا کمال کی صورت
مقصد زیست کی تگ و دو میں — ہر قدم اعتدال کی صورت
زیر دستوں کے حق میں ذات اس کی — نظر آتی تھی ڈھال کی صورت
اس کے آئینۂ صداقت میں — رونما تھی جلال کی صورت
مرد مخلص کا ظاہر و باطن — اک مکمل جمال کی صورت
زیست اس کی تھا اک اک لمحہ — مستقل ماہ و سال کی صورت
اب کہاں دیکھنے کو پائیں گے — ایک روشن خیال کی صورت
کیا خبر تھی کہ اب نہ دیکھیں گے — عالم خوش خصال کی صورت
آہ نظروں سے ہو گئی غائب — رہبر بے مثال کی صورت

عہدِ پیری میں بھی جوان تھا وہ
عزم و جرأت کی اک چٹان تھا وہ

اے مجاہد تری قیادت پر — کون ہے جس کو اعتبار نہ تھا
قلب پر اس کی حکمرانی تھی — ہم نے مانا کہ تاجدار نہ تھا
سخت تھا ملک و دیں کے اعدا پر — ظلم اس کا مگر شعار نہ تھا
بار ہر ایک کے اٹھاتا تھا — اور خود وہ کسی پہ بار نہ تھا
اس کے الطاف عام تھے سب پر — دوستوں ہی پہ انحصار نہ تھا
پیار کرنا ہی اس کا مذہب تھا — شرپسندوں سے اس کو پیار نہ تھا
تخت اور تاج کا نہ تھا خواہاں — طالب جاہ و اقتدار نہ تھا

گرچہ تھا باعثِ بہارِ چمن — خود وہ آسودۂ بہار نہ تھا
جان و دل سے تھا قوم پر شیدا — پر تعصب کا وہ شکار نہ تھا

بے سہاروں کا وہ سہارا تھا
ڈوبتوں کے لئے کنارا تھا

حالِ دل جا کے اب کہیں کس سے — اس سا جب کوئی چارہ گر نہ ہوا
راستے ہی میں ہم سے منہ موڑا — آہ پورا بھی سفر نہ ہوا
رہِ تنظیمِ ملک و ملت میں — کوئی بھی اس کا ہمسفر نہ ہوا
اس کی صحت کی کی دعا سب نے — پر دعا میں کوئی اثر نہ ہوا
لاکھ تدبیر کی معالج نے — اُف افاقہ اسے مگر نہ ہوا
عمر بھر جھیلیں سختیاں اس نے — عیش و راحت سے بہرہ ور نہ ہوا

آہ سارا چمن اُداس ہے آج
کل تلک آس تھی جو یاس ہے آج

ملک و ملت کا پاسباں نہ رہا — گلشنِ دیں کا باغباں نہ رہا
علم کا بحرِ بیکراں نہ رہا — رونقِ بزمِ عارفاں نہ رہا
نطق کو فخر جس کی ذات پہ تھا — قوم کا وہ ہی ترجماں نہ رہا
کارواں کا خدا ہی حافظ ہے — کوئی اب میرِ کارواں نہ رہا
دور کیوں ظلم کی ہو تاریکی — عدل کا مہرِ ضوفشاں نہ رہا
بیکسوں پر ہو جس کی خاص نظر — اب کوئی ایسا مہرباں نہ رہا
جس پہ ہوا اعتبار اب ایسا — کوئی معمارِ گلستاں نہ رہا
نازِ جمہوریت کرے کس پر — وہ سیاست کا آسماں نہ رہا

یادگارِ حسین احمدؒ تھا
رازدارِ حسین احمدؒ تھا

قوم کو بخشا زندگی کا شعور — منکشف اس پہ سب تھے سرِ حیات
جو چمن میں بہار آئی ہے — ہیں اسی کے قدم کی سب برکات
اس کے فیضِ نظر کے صدقے میں — رشکِ خورشید بن گئے ذرات
حرفِ آخر تھیں اس کی تحقیقات — قولِ فیصل تھے اس کے ارشادات
حلِ مشکل تھیں اس کی توضیحات — دل میں لگتی ہوئی تھی اس کی بات
قابلِ قدر اس کی تنظیمات — ضامنِ امن اس کے پیغامات
لائقِ رشک اس کی تعلیمات — ہیں گرانقدر اس کی تصنیفات
بزدلی کو وہ موت کہتا تھا — تھے بلند اس کے کتنے احساسات
صفحۂ دل سے مٹ نہیں سکتیں — حشر تک اب تو اس کی سب خدمات

اس کو تاریخ کیوں بھلائے گی — ملک و دیں پر ہوں جس کے احسانات
مشعلِ رہ ہے نقشِ پا اس کا — وجہِ تسکین تھی تو اس کی ذات
اے خداوندا اس مجاہدؒ کے
تا قیامت بلند ہوں درجات

أضواء على تاريخ حياة:
الزعيم الهندي مولانا حفظ الرحمن السيوهاروي

للاستاذ محي الدين الالوائي - الازهري

إن النواميس الإلهية في الأرض تقتضي أن تتطور الحياة بين الامم والشعوب حسب تقلبات الزمن، وتتبدل النظم والدول والحكومات طبقاً لتغيرات العصر، ولا تستثنى من هذه القاعدة العامة والنواميس الطبيعية أمة أو شعب على وجه المعمورة وإذا تسربت عوامل الوهن والفساد إلى كيان قوم فتحطمه الحوادث وتوهنه الكوارث فيسود في الوطن نظام فاسد ويسيطر عليه مستبدون حتى تنتشر الفوضى في صفوف أفراد الامة وجماعاتها ويحيط بهم الجهل والخمود فهم كخشب مسندة لا تسرى فيهم الحياة ولا يدب فيهم دبيب الوعي الفكري والنشاط الذهني وتنقض عليهم الأعداء من كل صوب، وتمتص دماءهم القوى الاستعمارية والعناصر الطاغية -

وجرت سنة الله في خلقه - عندما تتفاقم الأمور وينتشر الفساد في البر والبحر بما كسبت أيدي الناس - أن يتقدم نفر من الزعماء الذين يشعرون بآلام قومهم ويفكرون تفكيراً عميقاً في عوامل الضعف وأسباب الداء لكي يبحثوا عن علاج نافع ودواء ناجح - وكل من هؤلاء الزعماء المصلحين لاقى متاعب وعقبات كأداء في سبيل تحقيق أهدافه ونشر دعوته، و لكن هؤلاء الابطال واصلوا كفاحهم في الحياة مجاهدين صابرين ويحيون المبادئ التي قاموا لأجلها أكثر من كل شئ آخر في الحياة وما كانوا يعبأون بالعراقيل والمتاعب التي واجهوها في سبيل الحق والاصلاح -

ومنذ نصف قرن من الزمن دخلت الهند في مرحلة حاسمة في تاريخها المديد ودبت فكرة الحرية والسيادة الوطنية في قلب كل وطني غيور واشتدت نار الكراهية والنفور ضد الاستعمار والطغيان - وتكاتفت العناصر الوطنية من مختلف الطبقات والطوائف في سبيل الكفاح لأجل الحرية والاستقلال وتقدمت شخصيات بارزة من المسلمين الهنود إلى الميدان وتزعمت حركة الحرية والاصلاح - وجعلوا نصب أعينهم هدفين هامين أولا تحرير الوطن من نير الحكم الاجنبي والنهوض به كدولة حرة راقية على قدم المساواة الانسانية والعدالة الاجتماعية بين أفراد الامة الهندية وجماعاتها بصرف النظر عن الاختلافات الدينية واللغوية والعنصرية، وثانيا إصلاح عقائد المسلمين والرجوع بهم إلى التعاليم الاسلامية الحقة وإبعادهم عن الخرافات والخزعبلات والتوهمات والاثبات في قلوبهم الوعي الديني الخالص، والايمان الراسخ، لأن هذا هو السبيل الوحيد للنجاة في الدارين -

وفي مقدمة هؤلاء الزعماء الأبطال الذين أنجبتهم الهند في القرن العشرين، وأسدوا خدمات جليلة في سبيل الامة والوطن ورفعوا راية العلم والدين في ربوعها الشيخ الفاضل مجاهد الملة مولانا أبو القاسم معز الدين محمد حفظ الرحمن السيوهاروي ومن حقه على كل من عرف شخصيته وعلمه وفضله، ولمس آثار خدماته ومساعيه، أن يجدد ذكره ويحيي سيرته، ويبين أخلاقه وصفاته الحميدة للجيل الجديد في القارة الهندية وخارجها سيما العالم العربي الذي له صلات وثيقة وروابط وطيدة مع الهند منذ القدم ومن بواعث السرور أن كثيراً من مسلمي الهند يعرفون تواريخ الشخصيات البارزة في البلدان العربية قديماً وحديثاً وهم تواقون دائماً إلى مزيد من الاطلاع على مجريات الأمور في ذلك العالم الذي هو بمثابة القلب للعالم الاسلامي كله - واما علماء الهند المسلمون وطلاب العربية فيها مولعون باللغة العربية وآدابها ومكبون - بقدر ما تسمح لهم الظروف - على مطالعة الكتب والرسائل والمجلات العربية - وبهذا يتيسر عليهم الوقوف على تواريخ شخصيات العالم العربي وسيرهم، ونحن معاشر المسلمين الهنود نصرف جهودنا أولا وقبل كل اعتبار إلى نشر الدعوة الاسلامية والعلوم الدينية في لغة قومنا لتكون في متناول ايديهم وتستفيد منها العامة والخاصة

على حد سواء عملاً بقوله تعالى: "وانذر عشيرتك الأقربين" فصار - طبعا - معظم مؤلفاتنا وسير زعمائنا ونتائج أفكار علمائنا في اللغات السائدة العامة في القارة الهندية، ونتجت عن هذا الموقف قلة اطلاع الناطقين بالضاد على منتجاتنا الفكرية وأعمالنا الأدبية وكتبنا التاريخية ولا ينبغي لنا أن ننسى في هذا الصدد أن الهند خرجت عددا من فطاحل علماء اللغة وآدابها وتبرعوا بمجموعة قيمة من المؤلفات العربية حول موضوعات شتى إلى المكتبة العربية وصارت محل استحسان وقبول لدى علماء العالم العربي وأدبائه ولكن هذا وذاك لا يسمن ولا يغني من جوع -

وأن الأمل لوطيد بأن يتقدم علماء العربية وكتابها في الهند إلى هذا المضمار لسد هذا الفراغ وإنارة الطريق أكثر فأكثر - إلى ساحة التعارف المعنوي والتعاون الأخوي بين أوصال العالم الإسلامي بواسطة اللغة العربية التي ما زالت ولا تزال نقطة التقاء وهمزة وصل بين قلوب المسلمين في مشارق الأرض ومغاربها -

وقد ساعدتني الظروف وشاء القدر للتعارف مع الزعيم البطل المجاهد مولانا حفظ الرحمن وقد ساعدني الحظ لتقضية حوالي سبع سنوات متتالية بجوار مولانا الجليل فكانت فرصة ثمينة للاطلاع على صفاته وخدماته وشخصيته ووجهات نظره في مختلف مرافق الحياة البشرية وفي ضوء هذه المحاسن والانطباعات الشخصية وضوء ما عرفت من زملائه في الكفاح والخدمة وأقربائه أريد أن أضع أمام قارئ العربية مقتطفات من تاريخ حياته الوافرة ليكون نبراسا لشباب الجيل الحاضر وعبرة للجيل المقبل وعونا على توثيق عرى الماضي بالمستقبل والله هو الموفق -

<u>مولده ونشأته</u> : ولد معز الدين أبو القاسم محمد حفظ الرحمن في يناير ..١٩ في عائلة صديقية بمدينة سهوارة في ولاية أترپرديش بشمالي الهند وسمي بمعز الدين ولكن والدته المحترمة كانت تدعوه محمد حفظ الرحمن وشاء القدر أن يشتهر بهذا الاسم فيما بعد وأما والده مولوي شمس الدين فعالم ديني جليل متمسك بأهداف الدين الحنيف وقد أصاب المرمى في تسمية ابنه "معز الدين" فصار معز الدين الله طول حياته وضحى بنفسه ونفيسه في هذا السبيل بدون أن يخاف لومة لائم -

ونشأ حفظ الرحمن منذ عنفوان شبابه مكبا على الدروس ومواظبا على الواجبات وظهرت فيه آثار العبقرية والشجاعة وبوادر رغبة الخدمة والتضحية، وبدأ تعليمه الابتدائي في مدرسة "الفيض العام" بسهوارة ثم انتقل إلى دار العلوم بديوبند وبعد التخرج منها واصل مهمته العلمية والدينية في التدريس والتبليغ وفي عام ١٩٢٤ تولى منصب التدريس بمدراس بجنوب الهند وأثناء إقامته هناك وضع أول كتاب له في اللغة الأردية وهو عن الإسلام والمسلمين في مليبار باسم: "مليبار مين اسلام (الإسلام في مليبار) ثم وضع كتابه المعروف "حفظ الرحمن لمذهب النعمان"

وفي عام ١٩٢٨ عين مدرسا في "داهبيل" بولاية "گجرات" في غربي الهند، وبدأ في عام ١٩٣٦ تدريسه في كلكتا مع إمام الهند مولانا آزاد، وشب حفظ الرحمن مع قلب امتلأ نشاطا وهمة في سبيل العمل المتواصل والخدمة الإنسانية وكان ينظر إلى الأمور بما في فكره بعيدا عن قيود الفكر الذهني ويجول بعقله الوثاب في مختلف نواحي القضية التي هي في صدد النظر فيها بقلب حازم وعقل واع ومن عادته المتبعة في جميع المناسبات أن يختار المصلحة العامة على المصلحة الخالصة الذاتية ولعل هذه هي الصفة الحميدة التي جمعت قلوب زملائه حوله ووضعوا فيه ثقتهم الكاملة، واستمر هذا النشاط إلى آخر لحظة من حياته وحتى في فراش مرض الموت كان يهتم بشئون حزبه وجماعته وزملائه -

<u>أخلاقه وصفاته</u> : ومن الصفات المحمودة التي يتهادى بها فيهم للجيل الجديد لسعة أفقه ورحابة صدره فكان حفظ الرحمن يرحب بكل فرد يأتي إليه فلا يعرف حينذاك الفوارق الحزبية أو الدينية أو السياسية ويتكلم مع الجميع في كل موضوع تتطلب الظروف التطرق إليه بدون خوف ولا وجل ولا مداهنة، وقد لاحظت مرات مجلسه في المقر الرئيسي لجمعية علماء الهند بدلهي مكتظا بالزوار من الشخصيات السياسية والدينية من داخل الهند وخارجها ولكن كلا منهم يجد نصيبه من الكلام والمناقشة معه في الموضوع

الذی أتی لأجله، وكانت سرعة فهمه وخفة معالجته للقضايا المطروحة أمامه تجعل الأمور هينة بحيث تدخل الثقة في قلب اليائس والطمانينة في ذهن المضطرب، وأما ثقة النفس فكانت بادية في معاملاته كلها سواء في معالجة القضايا الشائكة والبت في المنازعات وتصرفه مع حكام الدولة وفي المقترحات التي يقدمها إلى السلطات الحكومية وخطبه وكلامه وكان يعامل مع الجميع في غاية السخاء والكرم والجود، وامتازت شخصيته بالقناعة والايثار وخدمة الخلق ومراعاة حقوق الآخرين والحياة المتواضعة.

خدماته وأوجه نشاطه: ترعرع حفظ الرحمٰن في حظيرة فطاحل العلماء الدينيين والوطنيين الغيورين ونشطت فيه منذ الصغر الروح الاسلامية الوثابة والنزوة الوطنية الخالصة وساعدته على ذالك الترعرع المزدوج الظروف المحيطة بحياته الاولى والبيئة التي نشأ فيها والشخصيات التي شاء القدر أن يصطحب معها، ومن هنا تنوعت أوجه نشاطه وميادين خدماته، وفي كل ميدان أطلق لجام نشاطه وواصل كفاحه بقدم راسخة وقلب حازم لا يلين لملمات الزمن ووطأة الحوادث ولا تزل أقدامه عند الملمات.

وفي مكنتنا أن نقسم دوائر خدماته إلى اربع دوائر هامة حسب مقتضيات الأمة والوطن والعالم. وهي: الدينية والاجتماعية والعلمية والسياسية ومنذ أن أصبحت الهند دولة جمهورية مستقلة على أساس دستور علماني لا يقوم على أساس دين خاص، نفذت نظام التعليم العلماني في المعاهد الحكومية كلها واقتضت الظروف اتخاذ إجراءات خاصة لنشر التعاليم الاسلامية بين أطفال المسلمين بطريقة تتمشى مع النظام التعليمي في المدارس الحكومية لئلا يحرم طلابها من التعليم الديني وبذل مولانا حفظ الرحمٰن بصفة كونه أمينا عاما لجمعية علماء الهند وعضوا بارزا في حزب المؤتمر الوطني، في سبيل تسهيل التعليم الديني في أوساط المسلمين ونفث في قلوبهم روح الاعتماد على النفس والايثار في سبيل الصالح العام، ووضعت جمعية علماء الهند برنامجا خاصا لتنظيم التعليم الديني في شتى أنحاء الهند تحت إشرافها لتحقيق هذا الهدف المنشود ـ ودعى مولانا الأمة، برحلاته وخطبه ومقالاته إلى إدراك أهمية هذا المشروع لبث الروح الاسلامية في الجيل الجديد والمسؤوليات الجمة الملقاة على عواتق ولاة الأمور ....

،من المسلمين في هذا المضمار. وبفضل مساعيه انعقد في يناير عام ۱۹۵۵ في مدينة بومبائي" مؤتمر التعليم الديني العام وشكلت فيه لجنة التعليم الديني لعموم الهند وانتخب مولانا حفظ الرحمٰن أمينا عاما لها ومنذ ذلك الحين بذل جزءا كبيرا من نشاطه في تأسيس المدارس العربية الدينية والجمعيات الدينية والاشراف عليها وعلى المعاهد الاسلامية الكبرى في الهند مثل جامعة عليجره ودار العلوم بديوبند والجامعة الملية بدلهي وهلم جرا.

وفي الميدان الاجتماعي كان المرحوم يبذل مجهودات جبارة لحل القضايا والمنازعات الداخلية بين أفراد الأمة وجماعاتها في البلاد وفي الوقت الذي يبذل فيه مولانا مساعيه الجميلة لإيجاد التآلف والتآزر فيما بين المسلمين أنفسهم كان يسعى بجهد بالغ للانسجام الطائفي والاتحاد القومي وصرف اهتماما جما في توثيق عرى الصلات الودية والروابط الأخوية مع العالم الاسلامي سيما الدول العربية فقد جعلت جمعية علماء الهند هذا التوثيق من أسس أهدافها التي تنشد تحقيقها، وأيدت جمعية العلماء ولا تزال تؤيد تأييدا كاملا القضايا العربية كلها وخاصة قضية الحرب في فلسطين ورفعت صوت التأييد والمشاركة الوجدانية في الكفاح الوطني الذي جرى في كل من البلدان العربية مثل تونس، والجزائر، ومراكش وفي أيام أزمة السويس اتخذت جمعية علماء الهند قرارا خاصا بتلاد العدوان الثلاثي وبتأييد حق مصر تأييدا تاما وساهمت الجمعية تحت إشراف هذا الوطني العظيم حفظ الرحمٰن في الترحيب بالشخصيات العربية الاسلامية التي تشرفت الهند بزيارتها السعيدة و في مقدمة هذه الشخصيات البارزة الرئيس جمال عبد الناصر وجلالة الملك سعود وجلالة ملك أفغانستان و

جلالة شاه إيران ورئيس وزراء لبنان السيد رشيد كرامة والسيد أنور السادات السكريتير العام للمؤتمر الاسلامي بالقاهرة وامثالهم وانتهز مولانا هذه الفرص السانحة للترحيب بهم وتبادل الآراء ووجهات النظر معهم حول الشؤون المتعلقة بالعالم الاسلامي بوجه عام، وقام بزيارة حج بيت الله الحرام لاداء فريضة الحج فى ۱۹۲۴ بينما كان مدرسا فى مدارس ثم فى عام ۱۹۵۶ وقام برحلات علمية وثقافية فى عدة بلدان بأفريقيا وآسيا. وكان يتصل دائما بالمكاتبات و المراسلات بالشخصيات العلمية البارزة فى العالم العربي -

وعند وصولى إلى دلهى عائدا من القاهرة فى عام ۱۹۵۵ اقترحت على مولانا المرحوم ومساعده الخاص السيد انيس الحسن وفضيلة مولانا المفتى عتيق الرحمن العثمانى والأستاذ الجليل مولانا محمد ميان والعلامة الفاضل مولانا القاضى سجاد حسين وامثالهم من كبار علماء الهند الافاضل المولعين باللغة العربية وآدابها وشؤون المسلمين فى الهند، ضرورة توثيق عرى التعارف الأخوى والتعاون الثقافى بين المنظمات الدينية والثقافية ورجالها وبين السفارات العربية ورجالها فى عاصمة الهند فلاقت وغنق هذه استحسانا وترحابا قلبيا حارا من مولانا وزملائه ووعد ببذل أقصى الجهود فى هذا السبيل، ثم تلبث أن تكاثرت الزيارات الودية وبدأ تبادل المجموعات العلمية والدينية. بين الجمعية وعدة سفارات عربية سيما سفارة الجمهورية العربية المتحدة، ونرى الآن بالغ الفرح والسرور التبادل الثقافى والعلمى بين الهند والعربي يجرى على قدم وساق ويرجع الفضل الاكبر فى هذا النجاح الباهر إلى الروح الاجتماعية المتنورة لمولانا الفاضل وفكره الثاقب، ولا يسعنا فى معرض الكلام عن عوامل توثيق العلاقات الثقافية والادبية والدينية بين الهند والعالم العربي والشخصيات البارزة التى تلعب دورا هاما فى تحقيق هذا الهدف المنشود، إلا أن نذكر بكل فخار واغتباط الخدمات التى يسديها والمساعى الجميلة التى يبذلها العلامة الفاضل الأديب الكبير مولانا أبو الحسن على الندوى ورجال "ندوة العلماء" لكهنو.

الفساد الطائفي: وعقب تقسيم القارة الهندية الهند والباكستان - وقعت الكوارث المؤلمة فى البلاد واندلعت نيران الطائفية والفتن والفساد فى البلدين وتعرض الآلاف من الأبرياء للقتل والنهب والتشريد فكانت دلهى عاصمة الهند من المدن الرئيسية المنكوبة بتلك الفتن فقام حفظ الرحمن بكل حزم وشجاعة فى وسط المعمعة لخدمة الانسانية المنكوبة واضحياته فى كفة القدر، وكان يعمل ليل نهار لمعالجة المجروحين وإغاثة المنكوبين وبث روح الثقة فى النفوس الضعيفة وإبلاغ السلطات المختصة والجهات الحكومية مجريات الأمور والتطورات فى المناطق المتأثرة بها، وايام الفتن الطائفية فى العاصمة الهندية كان مولانا حفظ الرحمن يزور يوميا المهاتما غاندى فى مقره فى "برلا هوس" بنيودلهى ويطلعه على حقيقة الموقف فى المدينة وتجول مرات مع غاندى وغيره من كبار الدولة فى الاحياء المنكوبة وسعوا لإدخال روح البقاء والثقة فى نفوس العائلات الأقلية، وهكذا وضع حد للجنون الطائفى الذى شوه وجه الوطن العزيز -

وترتب على تقسيم البلاد والفساد الطائفى المشؤوم عدد من المسائل التى تمس الحياة الاجتماعية والاقتصادية والتعليمية للاقلية المسلمة فى الهند من مسألة ممتلكات ضحايا الفساد الطائفى إلى مسألة المساجد والمقابر التى صارت عرضة للتدمير والاستيلاء غير الشرعى من جانب اللاجئين الذين أخرجوا من الباكستان ظلما وعدوانا ولما هدأت الأحوال بفضل مساعى العناصر الوطنية المخلصة من رجال الحكومة وزعماء الأغلبية بدأت الثقة تعود إلى قلوب المسلمين، والممتلكات ترد إلى اصحابها، والجمهور يرجع إلى نداء المنطق والعقل السليم، وليس هذا بعمل هين فى بلد ضخم مثل الهند التى تعيش فيها مئات الطوائف وعشرات الأديان واللغات لا سيما بعد أن حكمها المستعمرون لمدة طويلة تحت شعار: "فرق تسد" ومن واجب كل وطنى غيور من الجيل الحاضر أن يبذل أقصى الجهود لمحو وصمة العار الذى أصاب جبين الهند وسمعتها لقصر النظر من العناصر الطائشة -

وإلى جانب الكفاح الوطنى والسعى للانسجام الطائفى قام مولانا بجهود متواصلة فى الميدان التعليمى فبينما كان

يسعى لرفع مستوى التعليم العام فى البلاد ويساهم مع البرامج الحكومية بوجه عام صرف أهتماما خاصا نحو شؤون التعليم للاقلية المسلمة التى مازالت - ولا تزال - فى مؤخرة القافلة مع أن الاسلام ودستوره القرآن منح للعلم درجة لا مثيل لها فى تاريخ الأديان والدعوات ففرض طلب العلم على كل مسلم ومسلمة ولم يتق الأنفس ودعى إلى التعليم العام الاجبارى "هل يستوى الذين يعلمون والذين لا يعلمون" فبدأ مولانا سعيه لتلافى هذا النقص الوبيل فى جسم الأمة المسلمة فى الهند بقدر المستطاع، وما كان يحتفظ - فى كثير من أنظمة التعليم ومناهجها - بآراء العلماء الجامدين والمقلدين الخامدين بل كان ينظر إليه بعين مفتحة وعقل متنور بحيث تتفق مع المبادئ الاسلامية الحقة لأن العلم منبع الفلاح والجهل مصدر الفشل فى الحياتين -

وبذل مجهودا جبارا فى النهوض باللغة الأردية والدفاع عنها وهى لغة يتحدث بها المسلمون وغيرهم فى معظم أنحاء شمال الهند وفى بعض جهات جنوبها وبصفة كونها تكتب بالحروف العربية ومليئة بالالفاظ العربية والفارسية صارت بمثابة مكتبة عامة للأدب الاسلامى فى الهند وهى الآن إحدى اللغات الدستورية الهندية -

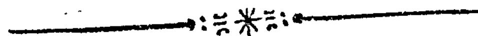
وتتجلى عبقرية مولانا حفظ الرحمن وروحه الوثابة فى تنظيم جمعية علماء الهند وتصريف دفة شؤونها بكل كياسة ومهارة منذ أن تولى منصب السكريتير العام لها فى مارس عام ١٩٤٢ وأن تاريخ جمعية علماء الهند لمرتبط ارتباطا وثيقا بخدمات حفظ الرحمن أكثر من أى شخص آخر من رجالها الكبار وأن روحه لا تزال تنير الطريق أمام القائمين بها والعاملين لها، وهو الذى أخذ بناصية الجمعية إلى شاطئ الأمان فى فترات عويصة قبيل استقلال الهند وبعده -

نشاطه السياسى : إن الميزة الكبرى التى امتازت بها شخصية مولانا حفظ الرحمن - دون كثير من زملائه حب الوطن، ومنذ البداية إلى النهاية كان يتمسك بمبادئ حزب المؤتمر الوطنى الهندى، وواصل كفاحه لأجل حرية الهند تحت رايته مع زملائه العظام غاندى ونهرو وآزاد وامثاله وبدأ نشاطه السياسى كعضو بارز مسموع فى حزب المؤتمر الوطن الهندى منذ عام ١٩٢٢ وسجن وعذب مرات خلال كفاحه الوطنى ففى أول مرة سجن فى بجنور عام ١٩٢٢ ثم فى كل من ميرت (١٩٣٠) وبريلى ومرادآباد ودلهى وراولبندى (١٩٣٦) واستمرت هذه المعاناة إلى عام ١٩٤٢، واشترك فى المظاهرة التى نظمها غاندى ضد قانون الضريبة على صناعة الملح فى عام ١٩٣٠ وسجن فيه مع عدد من كبار زعماء البلاد، وكان حب الوطن جزأ من ايمانه العميق، وكان يواصل مساعيه إلى آخر لحظة فى حياته لأجل نهضة الوطن وتقدمه وناشد إخوانه المسلمين دائما لأن يكونوا دائما فى طليعة الخادمين للوطن والعاملين لأجله، وأعلن مرات بأعلى صوته فى خطبه وأحاديثه : بأننا لا نحب الوطن ونخدمه لأى غرض ذاتى أو مجاراة لأحد ولكننا نقوم به لأن حب الوطن جزء من ايماننا وتعاليم ديننا الحنيف وأن الهند وطننا العزيز ووطن آبائنا وأجدادنا الكرام فعزتنا فى عزته ورفاهيتنا فى رفاهيته، ويذكرهم بقوله تعالى : وإذا خاطبهم الجاهلون قالوا سلاما وإذا مروا باللغو مروا كراما -

وفى شهر يناير عام ١٩٦٢ أصيب مولانا حفظ الرحمن بمرض السرطان ونقل إلى مستشفى السرطان الخاص فى بومبائ وتنافس فى معالجة مولانا الدكاترة المهرة من الهنود والأجانب وسافر مولانا يوم الاثنين الموافق للسادس عشر من شهر أبريل عام ١٩٦٢ إلى أمريكا ودخل فى مستشفى السرطان العالمى فى "مدبين" ولم تستطع القوى البشرية والمواهب الانسانية لدفع حكم القضاء فعاد مولانا إلى الهند من امريكا يوم الثلاثاء الموافق ١٢ يوليه ١٩٦٢ وفى غداة الخميس الموافق للثانى من أغسطس عام ١٩٦٢ انتقل مولانا إلى جوار ربه بعد حياة حافلة زاخرة وذلك فى منزله الحكومى رقم كيننغ لين دلهى الجديدة ودفن جثمان الفقيد مساء الخميس المذكور بجوار ضريح العلامة الشهير المحدث الكبير شاه ولى الله الدهلوى فى مدينة دلهى التاريخية فرحمه الله ولتكن حياته نبراسا للعالمين -

مولانا حفظ الرحمن فی سطور.....

- ولد فی ینایر عام ۱۹۰۰ فی بیت شرف وعلم بمدینة سهواره بولایة اترپردیش بشمالی الهند
- کان والده المولوی شمس الدین عالماً دینیاً ینحدر من عائلة صدیقیة۔
- اسمه معز الدین وکنیته ابو القاسم ولکنه قد اشتهر بلقب "محمد حفظ الرحمن"
- اتم تعلیمه الابتدائی فی مدرسة "الفیض العام" فی موطنه ثم انتقل إلی دار العلوم دیوباند
- تولی منصب التدریس فی مدارس عام ۱۹۲۲ اثناء اقامته هناك وضع مؤلفه الاول فی الأردیة عن الاسلام والمسلمین فی ملیبار وفی عام ۱۹۲۸ عین مدرساً فی داہیل بولایة گجرات بغربی الهند
- فی عام ۱۹۳۶ تولی التدریس فی کلکتة مع امام الهند مولانا ابی الکلام آزاد
- سجن خمس مرات خلال کفاحه الوطنی
- اصبح عضواً فی المؤتمر الوطنی الهندی عام ۱۹۲۲ واستمر فیه الی آخر حیاته
- اشترك مع المهاتما غاندی فی المظاهرة التی نظمها ضد قانون الضریبة علی صناعة الملح فی عام ۱۹۳۰م وسجن فیها
- انتخب لمنصب السکرتیر العام لجمعیة علماء الهند عام ۱۹۴۲م واستمر فی هذا المنصب إلی یوم وفاته۔
- فی عام ۱۹۴۲م سجن فی حرکة "اترکوا الهند" ضد الانجلیز واستمر فی السجن لمدة ثلاث سنوات۔
- أصیب بمرض السرطان فی ینایر عام ۱۹۶۲ء وعولج بایدی مهرة الاطباء الهنود والاجانب فی الهند ثم سافر الی امریکا وقضی ثلاثة اشهر فی المستشفی العالمی للسرطان فی مید لیسن بامریکا وعاد إلی الهند صباح ۱۲ یولیو۔
- توفی صباح یوم الخمیس الموافق للثانی من اغسطس عام ۱۹۶۲م۔
- دفن بجوار ضریح العلامة الشهیر المحدث الکبیر شاه ولی الله الدهلوی مساء الخمیس المذکور بمدینة دلهی۔
- له ابن وخمس بنات۔
- من مؤلفاته باللغة الاردیة ، الاسلام فی ملیبار ، وحفظ الرحمن لمذهب النعمان ، البلاغ المبین فی مکاتیب الرسول الکریم - الاقتصاد فی الاسلام - وقصص القرآن (فی اربعة اجزاء) وسیرة الرسول ، وله عدة مقالات وتصریحات قیمة تتناول شتی نواحی الحیاة فی الهند۔



وحدت کلمہ اور مسلمانوں کی تنظیم

جناب مولانا محمد عاقل صاحب الٰہ آبادی آرگنائزر جمعیۃ علما ہند دہلی

مسلمانان ہند کی تنظیم وقتی سیاسی تعلیمی اصلاحی تقاضوں کے تحت مقامی، صوبہ اور کل ہند پیمانہ پر بنتی بگڑتی رہی یہاں تنظیم کی تاریخ وارتقار کے پہلو سے روشنی ڈالنا مطلوب نہیں۔ بتانا یہ ہے کہ حضرت مجاہد ملت رح کی نگاہ دوررس اس پر گئی کہ تنظیم کی بنیاد ٹھوس و پائیدار ہونی چاہئے کہ وہ تنظیم ہر زمان ومکان میں قائم رہ سکے۔ اور بہ تقاضائے احوال اس کے نظام ومقاصد اور عملی پروگرام کو باقی وجاری رکھا جا سکے۔ جمعیۃ علمائے ہند کی ابتدائی تنظیم مستند علماء دین پر مشتمل اور محدود تھی۔ ان جانباز علماء کرام کی مخلصانہ خدمات کا تقاضا تھا کہ جماعت میں ان کی قیادت ورہنمائی کو برقرار رکھا جائے۔ اس لئے ۱۹۳۸ء سے جمعیۃ کے دستور اساسی میں ترمیمات کا سلسلہ شروع ہوا اور اس کے دائرہ کو ابتداءً میں ۲ر کی ممبری سے پھر ہر کی ممبری سے ہر مسلمان مرد وعورت تک وسیع کیا جاتا رہا، یہاں تک کہ ۱۹۴۸ء میں جمعیۃ علما ہند کو مسلمانوں کی عام تنظیم اور نمائندہ جماعت کی حیثیت حاصل ہو گئی اور اس میں علماء کرام کو سربراہی حاصل رہی۔

مسلمانوں کی یہ ملی تنظیم اسلام کے اوّلین اور بنیادی اصول کلمہ توحید کی بنیاد پر قرار پائی۔ حضرت مجاہد ملت رح نے کارکنوں کی مجلس، خواص سے ملاقات اور عوامی جلسوں میں جمعیۃ کے مقاصد اور اس کی تنظیم کی جب بھی وضاحت فرمائی۔ مسلمانان ہند کی تنظیم کے اس بنیادی پہلو "وحدت کلمہ" کو ضرور کھول کھول کر بیان کر دیا۔ آج ملک میں جمعیۃ علما ہند کے پلیٹ فارم پر مسلم عوام وخواص نظر آ رہے ہیں۔ ماضی میں خواہ وہ کسی تنظیم سے وابستہ رہے ہوں لیکن جمعیۃ علما ہند کو انھوں نے حضرت مجاہد ملت رح کی خدمات ملکی وملی اور اس کی وحدت کلمہ کی بنیاد پر نمائندہ حیثیت سے ضروری مان کر اختیار کیا۔

حضرت مجاہد ملت رح کی زندگی میں دینی تعلیمی کنونشن بمبئی (جنوری ۱۹۵۵ء) میں اسی وحدت کلمہ کی بنیاد پر کامیاب ہوا، اور آج جتنی تعلیمی اصلاحی تحریکیں مسلمانوں میں چھوٹے بڑے پیمانہ پر چل رہی ہیں وہ سب اسی بنیادی اصول کو اپنائے ہوئے ہیں۔ بمبئی میں جمعیۃ علما اسٹیٹ کانفرنس ۸، ۹ مارچ ۱۹۵۹ء کو ہوئی۔ شیخ المشائخ مولانا حکیم دیوان سید عنایت حسین صاحب رح (موصوف اب وصال فرما چکے ہیں) سجادہ نشین حضور خواجہ غریب نواز رح اجمیر نے اپنا مطبوعہ خطبہ صدارت پڑھتے ہوئے فرمایا:-

"مولانا حفظ الرحمٰن صاحب ۔۔۔۔۔۔ یہ قابل احترام ہستی اپنی علمی اور دینی قابلیت، اپنی خداداد ذہانت اور اپنی فعال سیرت کے لحاظ سے اس مرتبہ اور اس کام سے بلند وبالا ہے جس میں حالات کی ستم ظریفی نے ڈال دیا ہے، اگر مولانا حفظ الرحمٰن مدرس بن کر بیٹھ جاتے اور دینی وعلمی تصنیفات کا شغل اختیار کر لیتے تو ایک زبردست تعمیری کام ہوتا۔ ہزاروں تشنگان علم ان سے سیراب ہوتے، ان کے لئے ان کے شاگردوں کی بے پناہ عقیدت ہوتی اور ان کی تصانیف آئندہ نسلوں کیلئے فیض وافادیت دیرپا کی مالک ہوتیں۔ لیکن آپ حضرات نے انھیں مجاہد ملت بنا کر اجتماعی امور کے محاذ پر جھونک دیا ہے جمعیۃ علما ہند کی نظامت حفظ الرحمٰن کے لئے قابل فخر چیز نہیں ہے بلکہ اس عہدہ کو ـــ حفظ الرحمٰن سے چار چاند لگائے گئے ہیں۔ پارلیمنٹ کی ممبری ان کے شخصی عزت ووقار میں کوئی اضافہ نہیں کرتی بلکہ حکومت کے حلقوں میں یہ بھی ایک ذریعہ خدمت ہے۔ جس کے ذریعہ سے وہ عوام الناس کی خدمت انجام دیتے ہیں۔ امت محمدیہ علیہ الصلوٰۃ والسلام اعاظم رجال سے خالی نہیں ہے۔ ہند میں بھی بڑی بڑی شخصیتیں پڑی ہوئی ہیں لیکن وہ اس قول کے مصداق ہیں ؎

زاہد نہ داشت تاب جمال پری رخاں　　کنجے گرفت ویاد خدا را بہانہ ساخت

مولانا حفظ الرحمٰن میں ذاتی صلاحیت وقابلیت بدرجہ اتم تھی اور وہ سیاسیات واجتماعیات سے الگ رہ کر اپنے لئے کافی فراغ وسائل فراہم کر سکتے

تھے۔ درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کو بہانہ بنا کر ایک کونہ میں بیٹھ سکتے تھے۔ جمال پری رُخاں ہند سے نہیں بلکہ دیوان ہند کے آتشیں حملوں سے ان کا سروکار رہتا ہے لیکن درماندہ مسلمانان ہند کی عزت و سربلندی کے لئے انھوں نے اپنی زندگی کو وقف کر دیا ہے یا بالفاظ دیگر اپنے جیون کو دان دیدیا ہے۔

بزرگان ملت! تقسیم وطن کے بعد بھی تعصب کے دیوزادوں نے صرف نسبت محمدی کو پیش نظر رکھ کر سُنی، شیعہ، اہل حدیث، حنفی، شافعی بوہرہ، خوجہ، قادیانی نامی جماعتوں کے افراد کو باہم نفرت کا شکار بنانا چاہا۔ لیکن اس انقلاب نے مسلمانوں کے طبقات کی آنکھیں کھولدی ہیں اور وہ وحدت کلمہ کی حقیقت کے قائل ہو گئے ہیں۔

...... جماعتی حیثیت سے جمعیۃ علما ہند علم کلام کے مسائل اور ایسے عقائد کی بحثوں میں نہیں پڑتی جس سے مسلمانوں میں اختلاف پیدا ہو" (خطبہ صدارت صفحہ ۱۰-۱۱)

مرحوم سجادہ نشین کا یہ پیغام ملت اسلامیہ کی آج بھی رہنمائی کر رہا ہے کہ مجاہد ملت نے جس جماعتی تنظیم کو پروان چڑھایا ہے اس کو اپنی خصوصیات کے ساتھ برقرار رکھا جائے۔

نامی ایم اے علیگ مالیر کوٹلہ

رُخصت ہوا

خیل ملت کا مجاہد پاسباں رخصت ہوا
کارواں کا یعنی مہر کارواں رُخصت ہوا

کام جس کے تھے سیاسیات میں عقدہ کشا
نام جس کا تھا ہر اک کا حرز جاں رخصت ہوا

بندۂ احساں تھے دشمن تک بھی جس کے چل دیا
آہ وہ روح امید دوستاں رُخصت ہوا

دل تڑپ اُٹھتا تھا جس کا بے کسی پر قوم کی
وہ شفیق درد مند و مہرباں رُخصت ہوا

گردش افلاک مژدہ اُٹھ گیا ہے چارہ گر
خوب خوش ہو لے خزاں اب باغباں رخصت ہوا

رہنمائے بے مثال و قائد اعظم مٹا
حفظ رحمٰں، غمگسار این و آں رُخصت ہوا

آہ کھویا قوم نے سالار عالی حوصلہ
مرد کامل صاحب عزم جواں رُخصت ہوا

ہر گرہ کھلتی تھی جس کے ناخن تدبیر سے
وہ کہ تھا دانش وہ دانشوراں رُخصت ہوا

اب ہدایت کون دے بدلے ہوئے حالات میں
امتیاز خیر و شر۔ سُود و زیاں رُخصت ہوا

جرأت حق گوئی لاثانی تھی جس کی آہ وہ
نغز گو، شیریں سخن۔ معجز بیاں رُخصت ہوا

زخمہائے سینہ چاکاں اب نہ ہوں گے مندمل
چارہ گر تھا جو مسیحائے زماں رُخصت ہوا

گرمیوں کو بزم کی ڈھونڈا کریں گے تشنہ لب
جس سے پُر رونق تھی بزم میکشاں رُخصت ہوا

آگیا تھا جس سے نالوں کو رسائی کا شعور
جس سے درد و سوز پائی تھی فغاں رُخصت ہوا

کیا بلائیں سر پہ آتی ہیں کسے معلوم ہے
سایہ افگن تھا جو بن کر سائباں رُخصت ہوا

دیکھنا یہ ہے کہ نامی اب کہاں آتی ہے موت
زندگی کا جو سہارا تھا یہاں رُخصت ہوا

ایک عظیم محب وطن

از شری شام ناتھ ایم اے ایل ایل بی۔ ڈپٹی منسٹر انفارمیشن گورنمنٹ آف انڈیا

مولانا حفظ الرحمٰن کی یاد کے ساتھ ایک ایسے محب وطن کی تصویر آنکھوں میں پھر جاتی ہے جس کے ایثار و قربانی اور ہمت و جرأت کی کوئی مثال مشکل ہی سے ملے گی۔

ہندوستان کی تحریک آزادی میں اُن کی خدمات سنہری حروف میں لکھے جانے کے قابل ہیں۔

حریت اور آزادی کا ایک ایسا جذبہ مولانا کو قدرت سے ملا تھا کہ سخت سے سخت آزمائشوں میں بھی اُن کے قدم نہ لڑکھڑا سکے۔

خوش نصیبی سے اُن کی تعلیم دیوبند کے اُس مشہور دارالعلوم میں مکمل ہوئی جو اپنے طلبار کو مذہبی تعلیم کے ساتھ غیر ملکی حکومت کے خلاف تربیت دینے میں بہت ممتاز رہا ہے۔ شیخ الہند مولانا محمود الحسن اور شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی کی سیاسی اور وطنی خدمات آفتاب کی طرح روشن ہیں۔ انھیں بزرگوں کی سچی یادگار مولانا حفظ الرحمٰن تھے۔ جمعیۃ علمار ہند کے تو وہ روح رواں تھے ہی آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے بھی نہایت سرگرم اور ممتاز اراکین میں اُن کا شمار ہوتا تھا۔ مادر وطن کی پکار کا جواب انھوں نے ہمیشہ عالی ہمتی، جوش اور ولولے کے ساتھ دیا۔ وہ متعدد مرتبہ برٹش جیلوں میں اسیر رہے لیکن قید و بند کی سختیاں اور صبر آزما کلفت کبھی اُن کے ارادوں کو کمزور نہ کر سکیں۔ رہا ہوتے ہی وہ ایک نئی ہمت اور نئے جوش کے ساتھ وطن عزیز کی خدمت میں لگ جاتے تھے۔

۱۹۴۷ء کے ہنگاموں میں انھوں نے دلّی کے مظلوموں اور مصیبت زدہ لوگوں کی مدد اور خدمت بڑی ہمت اور بہادری سے انجام دی۔ وہ اپنی جان کی پروا کئے بغیر مظلوموں کی مدد کے لئے ایسے علاقوں میں پہونچ جاتے تھے جہاں اُن کی سلامتی کے لئے بہت بڑا خطرہ ہوتا۔ ان بے لوث خدمات اور جاں فشانیوں کا اثر گاندھی جی پر بھی بہت گہرا تھا۔ اُن کے دل میں مولانا کے لئے غیر معمولی عزت اور محبت تھی۔ حضرت مولانا آزاد

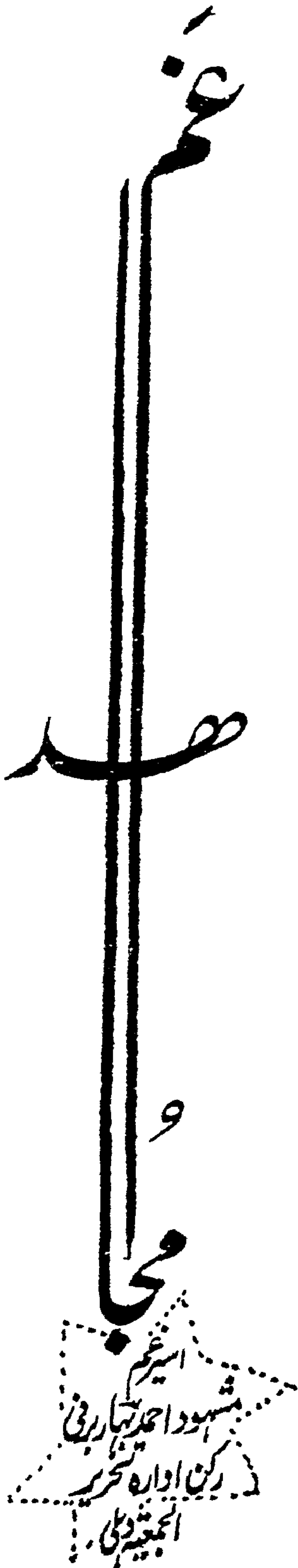
اور ہمارے محبوب وزیراعظم پنڈت نہرو بھی مولانا کے ایثار اور عالی ہمتی کے ہمیشہ قائل اور معترف رہے۔

آزادی کے بعد ہمارے ملک کے سامنے بہت سے اہم معاملات اور مسائل آئے ہر موقعہ پر مولانا کی سیاسی فراست اور دوراندیشی نے الجھنوں کو سلجھانے میں بہت مدد دی۔ مجھے مولانا کے ساتھ بہت سے سیاسی اور سماجی کاموں میں شریک رہنے کا موقعہ ملا ہے میں بڑے احترام اور اعتماد کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ مولانا کے دل میں اپنے وطن اور اہل وطن کی محبت ۔۔۔ کا ایک ایسا پرخلوص جذبہ موج زن رہتا تھا کہ جس پر خود ارض وطن کو ناز ہو سکتا ہے دلّی اور دلّی والوں سے اُن کو شدید محبت تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ خود بھی دلّی والے ہو گئے تھے۔

مولانا تمام سیاسی مسائل میں بہت سلجھی ہوئی اور صاف رائے رکھتے تھے۔ تقسیم وطن کا نظریہ ان کو کبھی پسند نہیں تھا لیکن جب ملک کے ممتاز رہنماؤں نے اسے قبول کر لیا تو مولانا بھی سنجیدگی سے خاموش ہو گئے۔

مولانا ایک بہت بڑے مذہبی عالم تھے اور اپنے مذہب میں اُن کا عقیدہ اٹل تھا لیکن وہ تمام مذہبوں اور فرقوں کے لوگوں سے انتہائی حسن اخلاق اور لطف و محبت سے ملتے تھے، عقیدے کا اختلاف اُن کی دوستی اور وضعداری میں کبھی حائل نہیں ہو سکتا تھا۔ اُن کی ذاتی زندگی ایک درویش کی طرح انتہائی سادہ اور بے تکلف تھی۔ ملک اور قوم کی خدمت کی دُھن میں انھیں اپنے آرام اور صحت و تندرستی کا کبھی خیال ہی نہیں آیا۔ فداکاری کا یہی انداز آخر اُن کی جان لیکر رہا۔ لیکن میرا عقیدہ ہے کہ ایسے صاحب ایثار اور ہمدرد انسانیت محبان وطن مرکر بھی کبھی نہیں مرتے وہ اپنے اچھے کاموں اور اپنی بے بہا قربانیوں کی یاد کے ساتھ ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔

مولانا جیسے عظیم اور بہادر محب وطن سے محبت کرنے والوں کا ایک ہی فرض ہے کہ وہ اُن بلند مقاصد اور خدمات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں جو مولانا کو زندگی بھر عزیز رہے۔ کسی اور یادگار کے مقابلہ میں ایسی یادگار زیادہ حقیقی اور پائیدار ہوگی۔



چھیڑا صبا نے نالۂ سیم کچھ اس طرح ثابت رہے نہ جیب و گریبانِ صبح غم

کیفیتِ الم سے فضا ہی بدل گئی! ہر شے اداس ہے تہہ دامانِ صبح غم

منظر اداس چشمِ نظارہ اداس اداس ہستی ہے ایک خواب پریشانِ صبح غم

آتش بجاں ہیں لالۂ گل سوزِ ہجر سے خوں ہو گیا ہے جوشِ بہارانِ صبح غم

سوسن خموش، نرگسِ شہلا کی آنکھ نم ماتم کدہ ہے صحنِ گلستانِ صبح غم

برپا ہوا ہے فرش سے تا عرش ایک حشر
اس طرح نوحہ خواں ہیں خوش الحانِ صبح غم

نازِ کلام و جانِ خطابت نہیں رہا جوشِ عمل تھا جس سے عبارت نہیں رہا

وہ مہرِ علم و دانش و ماہِ تمام فکر دانائے دیں و رہبرِ ملت نہیں رہا

دل جس کا تھا خلوص و محبت کا آئینہ وہ صاحبِ یقین و صداقت نہیں رہا

جس کی جبیں پہ رقص کناں تھی حیاتِ نو وہ پیکرِ عزائم و حکمت نہیں رہا

وہ نکتہ سنج، نکتہ شناس اور نکتہ رس تھا جو امیرِ فہم و فراست نہیں رہا

وہ جس کی زندگی ہی مسلسل جہاد تھی مسلک تھا جس کا خدمتِ ملت نہیں رہا

میدانِ حریت کا وہ جانباز و جاں نثار ہائے وہ اب مجاہدِ ملت نہیں رہا

میخانہ سوگوار ہے میکش ہیں دم بخود
ساقی کا لطفِ فیض و عنایت نہیں رہا

فی ذمة الله

للشيخ الفاضل مولانا عبد الحميد النعماني

فی صباح الثانی من اغسطس وأنا فی مكتبی فی معهد ملت خاطبنی أحد اصدقائی بالمأساة قائلا ـــــ ان نشرة الاخبار الصباحية من اذاعات الهند اليوم أعلنت ـــ انه انتهى الامر وأن مجاهد الملة فاضت روحه الى جوار بارئه، لم يزد صاحبی على ماقال كلمة ولم يسعنی بما اصابنی بغتة ان استزيده جلست واجما وسقطت السماعة من يدی، كنت أقرأ النشرة عن صحته كل يوم فأجد فيها كلمات تنطق بالرجاء فی ابلاله بعض النظر، ثم تتبعها كلمات تهمس بالخطر.

قد وقع فی معترك الليل ماكنت احذره فانا لله وانا اليه راجعون۔

مات مجاهد الملة فوا اسفاه فقدت البلاد بموته عالما دينيا كاتبا قديرا، خطيبا مصقاعا زعيما مخلصا، وطنيا صادقا، مجاهدا وفيا، تجسمت فی شخصه قوة الايمان وعظمة العمل المتواصل لأنبل غاية من غايات الحياة، كما تجسمت فيه الجرأة والاقدام بالصبر والثبات، مهما تعاكسه الظروف وتدرما تعارضه الاحوال،

قد يكون رجل إدارة، وفرد منظمة، وقيس بنيان قوم، والراحل الكريم رحمة الله عليه كان بملكاته ومواهبه، وهو هذا الرجل، وهو هذا الفرد، هو هذا القيس،

لقبوه بمجاهد الملة، وما أصدق ما لقبوه به فحياته كلها جهاد وكفاح، جهاد ضد الاستعمار البريطانی أيام عهده فی البلاد، وكفاح ضد الاعتداء والعدوان أيام الحرية والاستقلال،

مات مجاهد الملة، فيا لهول الموقف، فقد بموته من قام فی الشطر الاول من حياته على وجه الانجليز وجاهد فی سبيل استقلال الوطن وانقاذه من مخالب الاستغلال الاجنبی واحتمل عقابا على ذلك، من متاعب التضحيات ومتاعب السجن ما احتمل، وكابد فی الشطر الثانی من حياته فی سنه المتقدم من المشقات، وما واجه من الأهوال ما تقشعر منها الجلود، عندما قضت قسوة المقادير بتقسيم البلاد، فتبدلت الارض غير الارض على ايدی المتطرفين المتعصبين من الهندوس، وأصبح المسلمون فی ديارهم كأنهم أغنام فی ارض مسبعة تولى رعيها الاسد،

فرأينا مجاهد الملة ورأى الذين سواء كانوا أنصارا له أو خالفوا خطته، أن تجلت فيه روح العزيمة والجهاد روح التضحية والتفانی، روح تتدفق قوة وايمانا تقاوم وتقاوم العصبية المتطرفة الهندوكية، وطاف بالبلاد من أقصاها الى أقصاها، وخطب الجماهير المحتشدة فی الحفلات وفی البرلمان أمام أعضائه ـ ببلاغته الساحرة، واجتمع بالمسئولين فی المحاكم وقابل الوزراء ورئيس الوزراء وتحدث الى هما تماما غاندی عن كل ماحدثت وعن كل ما اعتدى به المعتدون،

كان يقول ـ رحمة الله عليه ـــ لمن ناقشه فی ذلك فی تلك الأيام ــــ " نحن الذين حاربنا العصبية المتطرفة من المسلمين بالأمس أيام الانجليز غير مبالين بما تجره

علينا من الشدائد، وقفنا على وجهها بكل ما استطعنا
فمن هو أجدر منا اليوم وأحق أن نقاومها إذا صدرت
عن الهندوس، وقام في البرلمان في ٢٩ من مارس
من السنة الماضية فقال فيما خطب ـــ

والذي يتراءى لنا منذ خمس عشرة سنة ونلمسه
حتى يومنا هذا، أن البلاد عمّها العصيان وأنها ضعيفة
الأمن، ضئيلة السلام، والهيئات المسئولة لا تقوم
فيها بالقانون والتنفيذ بالقوة والضبط تمامًا، فأصبحت
عرضة لطوارئ التمرد والتشويش وليس ذلك ما يختص
به عنصر دون عنصر ولا جنس دون جنس، فالهندو
والمسلم والسيخ والمجوسي واليسوعي وما عدا هؤلاء
من المواطنين كلهم يرون ويشعرون أن الحياة
في هذه الأيام بلغت بهم طورًا يحسب حتى للنملة
حسابًا ويقدّر لها ثمنًا، ولا يحسب للإنسان أيّ حساب
ولا يقدر له ولا لماله وعرضه ثمنًا مّا ـــ ما أرهب
الموقف وما آلمه؟ وليس ما يقنعنا ردًّا على ذلك
أن حكومة الهند ليست مسئولة عن هذا وأن على
حكومات الأقاليم أن تعتني بالأمر وتقوم داخل
حدودها باللازم. إنني أرى ان المسئولية في أكبر
درجاتها تعود الى الوزارة الداخلية المركزية و
أنها مفروض عليها أن تحاسب اعمال وزارات
الاقاليم وتراقبها بالدقة اللازمة فتعلم ما بال
الناس يخافون على أنفسهم ويخافون المس بكرامتهم
والعبث بعرضهم ويخافون ضياع اموالهم واملاكهم
وهم أحرار ينعمون بالاستقلال،

وهؤلاء الوزراء أيهم تنقصه في عمله الإجادة
ويفقده التمكين والاتقان فلا يملك جدارة القضاء
على ما يواجهه البلاد نوعًا من الفوضى فليترك مقعده
في غرفة الوزارة وليقدم استقالته"

يا لها من كلمات حق ويا لقائلها من ثقة و
قوة وايمان،

اربعون سنة بكاملها وزد عليها سنتين،
قضاها الراحل الكريم كلها في خدمة الدين وفي
خدمة الوطن، قضاها بصفته وكيلًا عامًّا لجمعية
العلماء وبصفته عضوًا ممتازًا في مجلس الامة الهندي
الوطني وفي بعض لجانها وبصفته مندوبًا في البرلمان
في السنوات الاخيرة ـ

ذهب مجاهد الملة إلى جوار بارئه فلا نحظى
به بعد اليوم ولا نسمع منه خطبة ولا حديثًا ولا
نراه في مكتبه جالسا او متكئًا فقد رحل عنا بجسمه
ولكن بقيت لنا من حياته ذكرى لا تزال، او قل تركت
لنا حياته فكرة لا تنقطع وانما تنمو وتسمو فحياته الحافلة
بجلائل الاعمال رسمت لنا خطة بارزة الخطوط،
واضحة الحدود وهي بجوهرها جمعية العلماء وأهدافها
أدامها الله وابقاها ـ

وليرقد مجاهد الملّة هادئا مستريحا فلدينا من
الامة قد تأصل فيهم ما في حياته وراء غرسه و
نشره فهم يتمون عمله ويبنون فوق اساسه ـ

وليرقد مجاهد الملّة في مضجعه الابدي يظلله
من الله رضوانه ويغشاه غفرانه ـ

مجاہدِ ملّت کا مشن

مسٹر ظہیر الدین صدیقی ایم، اے ایل ایل بی (علیگ)

مسٹر ظہیر الدین صدیقی ایم، اے (علیگ) جن کا مقالہ پیشِ نظر ہے۔ ایک ہونہار اہلِ قلم ہیں۔ ان کو اپنے دورِ طالب علمی ہی سے جمعیۃ علماء اور مجاہدِ ملّت کے ساتھ مخلصانہ تعلق رہا ہے۔ [illegible] میں آپ کو بطور سکریٹری حضرت مولانا مرحوم سے بہت قریب رہنے کا موقع بھی ملا۔ مسلم کنونشن کے شعبۂ نشر و اشاعت کی پوری ذمہ داری حضرت مجاہد ملتؒ نے آپ ہی کے سپرد رکھی۔ اپنے اس قریبی تعلق اور وابستگی کے ساتھ یہ مختصر مقالہ اپنے مجاہد ملت نمبر کے لئے تحریر کیا ہے جو شکریہ کے ساتھ شائع کیا جا رہا ہے۔

(انیس الحسن)

حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ کی رحلت سے مسلمانانِ ہند ایک عظیم مجاہد اور بہی خواہ رہنما سے محروم ہو گئے ہیں۔ مولانا مرحوم جس شدید بے چین رُوح کے ساتھ زندگی بھر مسلمانوں کی بہبود کے لئے جد و جہد کرتے رہے۔ اس نے اُن کی شخصیت کو حسنِ عمل کا ایک ہمہ گیر ادارہ بنا دیا ہے۔ ہمارے ملّی رہنماؤں کی تاریخ میں اتنی فعال، متحرک اور عملی صداقت رکھنے والی شخصیتیں بہت کم نظر آتی ہیں۔ اُن کی بے پناہ جرأت، ایمان کی حرارت، جذبہ کی توانائی، فکر کی پختگی اور اُن کے عظیم کارناموں نے انھیں ملّی تاریخ کا ایک شاندار کردار بنا دیا ہے۔ مسلمانوں کو سربلند کرنے کی اُن کے دل میں ایک سرگرم تڑپ تھی جس نے اُن کو شب و روز متحرک رکھا۔ مسلمانوں سے متعلق کوئی ایسا مسئلہ نہیں جس پر انھوں نے بے خوفی کے ساتھ آواز بلند نہ کی۔ پارلیمنٹ ہاؤس ہو یا پبلک پلیٹ فارم، کانگریس میٹنگیں ہوں یا کلچرل اداروں کی کانفرنسیں ایوان ہائے وزارت ہوں یا تشدد کرنے والے گروہ، جبلپور ہو یا میرٹھ، دارالعلوم دیوبند ہو یا مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، مجلسِ اوقاف ہو یا انجمن ترقی اردو ہند، سیاسی کانفرنسیں ہوں یا سیرت کے اجلاس، طبیعت خواہ مضمحل ہو یا ناساز، وہ ہر جگہ ممتاز ہی نظر آئے۔ حقیقت یہ ہے کہ مولاناؒ ہندوستان کے پانچ کروڑ مسلمانوں کی آواز تھے، اُن کا دماغ تھے، ان کا سہارا تھے اور اُن کی امید تھے۔ وہ اُٹھے تو ایسا لگا گویا اُن کی امیدیں ٹوٹ گئیں، ان کی ڈھارس جاتی رہی۔ مجاہدِ ملّت کی ایک عہد آفریں شخصیت تھی۔ اُن کی زندگی تعمیرِ مستقبل کے فلسفۂ عمل کی تفسیر تھی۔ اُن کی ذات اجتماعی کریکٹر کا شعوری سرچشمہ تھی، وہ جید عالمِ دین تھے، ممتاز سیاسی لیڈر تھے، سحر انگیز خطیب و ادیب بھی۔ لیکن میرے نزدیک ان کی بڑائی کا ایک درراز بھی ہے اور وہ یہ کہ وہ ایک درد مند انسان تھے، گوشت اور ہڈی کے، اصول اور ایمان کے، خلوص اور محبت کے، شفقت اور مروّت کے، شرافت اور اخلاق کے، ایک نظریے اور مقصد کے۔ ظرف کی بلندی اس سے نمایاں تھی کہ کبھی انھوں نے اپنی شخصیت پر خول نہیں چڑھائے ظاہری حسن سے لے کر باطنی جوہر تک، گھر میں، مجلس میں، دفتر میں، ریلوے اسٹیشن پر گاڑی کے کسی ڈبے میں یا جلسۂ عام میں، وہی یکسانیت و یک آہنگی، نہ تصنع اور تکلف کے پردے ہیں اور نہ تضاد و تناقض۔ مسکراتے تو لبوں پر کشادہ اور بلند پیشانی پر رقصاں ہنسی سایہ فگن ہوتی، غصہ فرماتے تو آنکھوں میں دلی شفقت کا طوفان کرن بن کر اُبھرتا۔

جمال و جلال دونوں اُن کی انسانیت کے ہم دوش و رفیق، عفو و درگذر ان کا شیوہ، ان کی محفل میں زاہد، عابد، شاعر، ادیب، لیڈر، امیر، غریب سب ہی موجود رہتے، زندگی کے ہر مسئلہ پر گفتگو ہوتی اور مولانا ایک ایک فرد کو پوری پوری اہمیت دیتے۔ دسترخوان پر نواب صاحب کے ساتھ مولوی حمد اللہ جان کو بھی اصرار و محبت کے ساتھ بٹھاتے اور عوام کے روزمرہ کے مسائل پر دیوتائی ذہن کے ساتھ نہیں بلکہ ایک انسان کی حیثیت سے سوچتے۔ واقعہ یہ ہے کہ میں نے ابھی تک اتنا بڑا آدمی نہیں دیکھا جو ایک ہی وقت اتنا عظیم سیاسی لیڈر، ممتاز عالمِ دین اور بے پناہ صلاحیت اور طاقت والا ہو اور جس نے ہمارے لئے ایک مشن بھی چھوڑا ہو۔

مجاہدِ ملّتؒ نے جمعیۃ علماء ہند کو ایک متحرک اور فعال جماعت کی شکل میں ہمارے درمیان چھوڑا ہے۔ انھوں نے اپنی پوری زندگی، اپنی بھرپور صلاحیتیں اور تمام تر فکری اور عملی قوتیں جمعیۃ علماء کے لئے وقف کر دیں اور وہ جمعیۃ علماء ہند کی وسعت فکر و عمل کی سرگرم ترین علامت (Symbol) بن کر ہندوستان کے افق پر ابھرے۔ جمعیۃ سے اُن کو تفویض ملتی

تھی اور جمعیۃ کو اُن سے فکر و عمل کا فیضان (Inspiration) ملتا رہا۔ مرحوم کی شخصی اور ذہنی صلاحیتیں بہت وسیع تھیں اسی نسبت سے انھوں نے جمعیۃ علماء کے جماعتی دُماغ اور میدان عمل کو بھی وسیع کیا جس طرح وہ عملی سرگرمیوں کے لحاظ سے کسی ایک طبقہ کے (Section) ہوکر نہیں رہے۔ اسی طرح جماعتی سرگرمیوں کا رُخ بھی انھوں نے ہر جانب موڑ دیا۔ واقعہ یہ ہے کہ رہنماؤں کے شخصی عمل کے اُن کی جماعت کے ساتھ ربط کی تاریخ میں یہ روشن ترین باب ہے۔ جس نے جمعیۃ علماء کو آج تمام مسلمانوں کی اُمنگوں اور عزائم کا مرکز بنا دیا ہے۔ اس میں ہر مکتب خیال اور عقائد کے حضرات شامل ہیں سُنی بھی ہیں اور شیعہ، دیوبندی بھی ہیں اور غیر دیوبندی بھی، اہل حدیث بھی ہیں اور سجادہ نشین بھی جدید علماء بھی ہیں اور قدیم بھی۔ جمعیۃ علماء کی اسی خصوصیت نے اس کو ہندی مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت بنا دیا ہے۔ ہمیں مجاہد ملت کے بعد جمعیۃ علماء کی اس خصوصیت کو ہر قیمت پر برقرار رکھنا چاہیے اور مجاہد ملت نے فکر و عمل کی جس نہج پر جمعیۃ کو چھوڑا ہے اس کو نہ صرف قائم رکھنا ہے بلکہ انہیں خطوط کو بنیاد بنا کر تیزی کے ساتھ آگے بھی بڑھانا ہے۔ جوشِ عمل اور فکر و نظر کی اسی وسعت کو باقی رکھنا ہے اور اسی طرح عوام کے ساتھ اپنے رابطۂ تنظیم کو زیادہ سے زیادہ بڑھانا ہے۔

وقت کی سب سے اہم ضرورت یہ ہے کہ جمعیۃ علماء میں مسلمانوں کی نئی نسل کے لئے بھی جگہ نکالی جائے۔ ہندوستان کے مسلم نوجوان ذہنی طور پر مایوسی، انتشار اور ہیجان کا شکار ہیں۔ ان میں ملی مسائل پر غور و فکر کرنے کا رجحان ہے اور نہ اجتماعی فرائض سے آگاہی، حتیٰ کہ تعلیم یافتہ نوجوان بھی مذہبی زندگی اور دینی عمل سے بے نیاز ہوتے جا رہے ہیں۔ اگر یہ طبقہ ہماری اجتماعی زندگی سے اسی رفتار سے بے تعلق ہوتا گیا تو خطرہ ہے کہ آنے والی نسلوں کے مستقبل کا کون ضامن ہوگا۔ ضرورت ہے کہ جمعیۃ علماء اور اس کے رہنما زندگی اور زمانے کے نئے تقاضوں اور رجحانات کا گہرا مطالعہ فرمائیں اور جدید ماحول کے مطالبات کی روشنی میں ایسا طریقہ کار مرتب فرمائیں کہ ہماری جماعت کا نئی نسل کے ساتھ ذہنی ربط قائم ہو سکے۔ عمل کی قوت (Force of action) اور صحیح نظری اور اخلاق و ایثار کو بنیاد بنا کر ہم نوجوانوں کی دینی حس کو بیدار کرنے میں کامیاب ہو سکیں گے اور اُن کی ذہنی تعمیر و تربیت کر سکیں گے اور ان میں حسن عمل کی پرجوش روح اُبھار سکیں گے۔ یہ سب اسی وقت ہو سکتا ہے جب معاشرے کے نئے تقاضوں، غور و فکر کے نئے خطوط، جدید عمل کی نئی بنیادوں اور موجودہ جماعتی تنظیموں کے نشیب و فراز اور خد و خال کا حقیقت پسندانہ مطالعہ کیا جائے۔ ایسا نہیں ہے کہ پوری قوم مردہ ہو چکی ہے یا اس میں سربلند ہونے کی تڑپ فنا ہو چکی ہے یا تمام اچھائیاں ایک ہی جگہ جمع اور محدود ہو کر رہ گئی ہیں یا آج اہل بصیرت زعماء کی قلت ہے۔ اگر آج کمی ہے تو صرف ایسی اسپرٹ کی جو ملت کے منتشر اور بکھرے جوہر کو ایک جگہ مجتمع کر سکے۔ مجاہد ملت نے یہی کر دکھایا اور پوری دنیا نے دیکھا کہ ہندوستان میں آج بھی کتنے مسلمان دانشور ہیں اہل فکر ہیں، اہل دل ہیں۔ مسلم کنونشن مولانا حفظ الرحمٰنؒ اور جمعیۃ علماء کا تاریخ ساز اور عظیم کارنامہ ہے۔ جس سے مسلمانانِ ہند کے نئے عزم و عمل کی مؤثر راہیں متعین ہوئی ہیں۔ وہ مسلمانانِ ہند جو آگ اور خون کے طوفانوں کا مقابلہ کرنے کے بعد آزاد ہندوستان میں نئی حیثیت لے کر اُبھرے۔ نئے ہندوستان میں مسلمانوں کی سیاسی تاریخ کی ابتدا لکھنؤ میں آل پارٹیز مسلم کانفرنس سے ہوئی جو امام الہند حضرت مولانا ابو الکلام آزادؒ کا بہت بڑا مدبرانہ کارنامہ تھا جس میں فرقہ پرستی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دفن کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ مجاہد ملتؒ ایک ناقابل تسخیر طاقت بن کر ہندو اور مسلم فرقہ پرستی سے ٹکراتے رہے اس کے بعد مسلم کنونشن نے مسلمانوں کے روشن مستقبل کی تعمیر کی نشاندہی کی۔ مجاہد ملتؒ نے کنونشن کے داعی کی حیثیت سے جمہوریہ ہند میں مسلمانوں کے لئے طریق کار متعین کیا اور ثابت کر دیا کہ سیکولر ریاست مذہب کی نفی نہیں کرتی۔ افسوس کہ مولانا اللہ کو پیارے ہو گئے مگر وہ مسلمانوں کی تعمیر مستقبل کا مشن جمعیۃ علماء کے سپرد کر گئے۔ ان کا صحیح جانشین پیدا ہونا ممکن نہیں۔ اس لئے اب جمعیۃ علماء اور اس کے ارکان کو اجتماعی فکر اور اجتماعی عمل سے مجاہد ملت کے مشن کو پورا کرنا چاہئے۔ آج جمعیۃ علماء کو مولانا حفظ الرحمٰنؒ نے بے پناہ ذمہ داریاں سپرد کی ہیں۔ نیز ہندی مسلمانوں پر بھی فرض عائد کیا ہے کہ جمعیۃ علماء کے ساتھ اپنی وابستگی کو مضبوط کریں اور اس کی سرگرمیوں کا ایک طاقتور جُزو بنیں۔ یہی مجاہد ملتؒ کا مشن تھا اور یہی قفسِ عنصری سے پرواز کرتی ہوئی اُن کی مقدس روح کا آخری پیغام!

واعتصموا بحبل اللّٰہ جمیعًا
اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑو۔

حضرت مجاہد ملتؒ کی

چند یادگار تقریریں

سبق آموز مکتوب اور بصیرت افروز بیان

یگانۂ روزگار

مجاہد نمبر

روزنامہ الجمعیۃ دہلی

حضرت مجاہد ملت — ۱۹ عیسوی

۱۹ عیسوی

بیادگار برگزیدۂ کرام مولانا حفظ الرحمٰن

۶۲ عیسوی ۱۹

سنواتِ مولانا حفظ الرحمٰنؒ ۔ از محمد حسن بدر سنبھلی غفر اللہ لہٗ

۶۲ عیسوی ۱۹ ـــ ۶۲ عیسوی ۱۹

چند تاریخیں ایک نظر میں

محمد عثمان پورہ معروف اعظم گڑھ

جیسا جانتی ہے کہ حضرت مجاہد ملت کا آبائی وطن سیوہارہ ضلع بجنور ہے لیکن آپ کی آخری آرامگاہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے خاندانی مزار دہلی میں بنائی جاتی ہے آخر کیوں ہے؟ آپ بھی بعد رحلت اپنے وطن منتقل کئے جاسکتے تھے جس طرح حضرت شیخ الہند دہلی سے دیوبند لائے گئے تھے۔ اس میں کھلا ہوا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جو مبارک تحریک ولی اللٰہی شاہ صاحب نے شروع کی تھی مجاہد ملت اسی سلسلہ کی آخری کڑی ہیں۔ قدرت نے ڈھائی صدی کے بعد مجاہد ملت کو شاہ صاحب کی آغوش میں ہمیشہ کر دیا کہ اس لائق سپوت نے اسی پودے کو حاصل مراد کے مستحکم کر دیا جس کی ابتدائی حضرت شاہ صاحب نے شروع کی تھی۔ یہ تحریک اشاعت علم خدمت خلق اخلاص وطن دوستی، جہاد کے فتوے، بالاکوٹ اور شاملی کے میدان ۱۸۵۷ء کے جہاد حریت انڈمان اور مالٹا کی اسارت ریشمی خطوط کی تحریک ترک موالات اور قید و بند کی صعوبات وغیرہ سے گذر کر ۱۹۴۷ء پر ختم ہوتی ہوئی خالص تعمیری پروگرام پر مرکوز ہو جاتی ہے۔ مجاہد ملت کے کارناموں کو سمجھنے کے لئے ڈھائی سو سال پیچھے پلٹنا ہوگا۔ جس کے لئے دفاتر درکار ہیں۔ یہاں اس سلسلہ کی چند اہم تاریخیں بطور فہرست پیش کی جا رہی ہیں تاکہ ایک نظر میں ایک اجمالی خاکہ سامنے آجائے

واقعہ	تاریخ	
حکومت مغلیہ شہنشاہ بابر سے بہادر شاہ ظفر تک	از سنہ ۱۵۲۶ء	تا سنہ ۱۸۵۷ء
ایسٹ انڈیا کمپنی کی انگلینڈ میں بنیاد	۳۱ دسمبر سنہ ۱۵۹۹ء	
بعہد جہانگیر ایسٹ انڈیا کمپنی کا ہندوستان میں قیام	۱۷ جنوری سنہ ۱۶۱۲ء	
ولادت حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی بعہد عالمگیر	سنہ ۱۷۰۳ء / ۱۱۱۴ھ	وفات سنہ ۱۷۶۲ء
ولادت حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ	سنہ ۱۱۵۹ھ	وفات سنہ ۱۲۳۹ھ / ۱۸۲۳ء
ولادت شاہ رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ	سنہ ۱۱۶۳ھ	وفات سنہ ۱۲۳۳ھ
ولادت شاہ عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ	سنہ ۱۱۶۷ھ	وفات سنہ ۱۲۳۰ھ
ولادت مولانا سید احمد صاحب شہید بریلوی رحمۃ اللہ علیہ	سنہ ۱۷۸۶ء	
شہادت مولانا سید احمد و مولانا اسماعیل بمقام بالاکوٹ	سنہ ۱۸۳۱ء	جہاد کی ابتدا ۱۸۲۶ء
جنگ پلاسی	۲۳ جون ۱۷۵۷ء	۵ شوال سنہ ۱۱۷۰ھ
وارن ہیسٹنگز ہندوستان کا پہلا گورنر	سنہ ۱۷۷۳ء	
وفات مولانا فضل حق خیرآبادی بسلسلہ اسارت بجزیرہ انڈمان	۱۲ صفر سنہ ۱۲۷۸ھ / ۱۸۶۱ء	ولادت سنہ ۱۷۹۷ء
ہندوستان کے دارالحرب ہونے کے سلسلہ میں حضرت شاہ عبدالعزیز کا فتویٰ	سنہ ۱۸۰۳ء	
شہادت سلطان ٹیپو	۴ مئی سنہ ۱۷۹۹ء	
ہندوستان کا مشہور جہاد حریت اور انگریزوں کی باضابطہ حکومت	سنہ ۱۸۵۷ء	
علماء دیوبند کا شاملی میں زیر امارت حاجی امداد اللہ جہاد اور حافظ ضامن کی شہادت	سنہ ۱۸۵۷ء	سنہ ۱۲۷۳ھ
شہادت مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی	۱۵ جون ۱۸۵۸ء	۲ ذی قعدہ ۱۲۷۴ھ
مدرسہ دارالعلوم دیوبند کی بنیاد (مسجد چھتہ میں)	سنہ ۱۸۶۶ء	۱۵ محرم سنہ ۱۲۸۳ھ
سرسید نے علی گڑھ کالج کی بنیاد رکھی	یکم جون ۱۸۷۵ء	
کانگریس کی بنیاد	سنہ ۱۸۸۵ء	
مسلم لیگ کی بنیاد	سنہ ۱۹۰۶ء	
تنظیم جمعیۃ علماء ہند، و حادثہ جلیانوالہ باغ	سنہ ۱۹۱۹ء	
تحریک شیخ الہند مولانا محمود الحسن و مفتی اعظم مولانا محمد کفایت اللہ	سنہ ۱۹۱۹ء	
بنیاد جامعہ ملیہ ۔ و تحریک ترک موالات	سنہ ۱۹۲۰ء	

واقعہ	تاریخ	
کانگریس کی مکمل آزادی کا نصب العین	سنہ ۱۹۲۹ء	
جمعیۃ علماء ہند کا کانگریس کے ساتھ مشروط تعاون	سنہ ۱۹۳۰ء	
تحریک انقلاب عرف ریشمی خطوط کی تحریک تا اسارت مالٹا	از سنہ ۱۳۳۳ھ	تا ۲۰ رمضان ۱۳۳۸ھ / ۸ جون سنہ ۱۹۲۰ء
شیخ الہند کا فتویٰ ترک موالات	۱۶ ذی قعدہ سنہ ۱۳۳۸ھ	
آزادی ہند	سنہ ۱۹۴۷ء	
جنگ عظیم اول	از سنہ ۱۹۱۴ء	تا سنہ ۱۹۱۸ء
جنگ عظیم ثانی	۳ ستمبر ۱۹۳۹ء	
ولادت حضرت حاجی امداد اللہ صاحب ظفر احمد	۲۲ صفر سنہ ۱۲۳۳ھ / ۱۸۱۷ء	وفات سنہ ۱۳۱۷ھ / ۱۸۹۹ء
ولادت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی خورشید حسین	سنہ ۱۲۴۸ھ	وفات سنہ ۱۲۹۷ھ
ولادت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی	سنہ ۱۲۴۴ھ	وفات سنہ ۱۳۲۳ھ / ۱۹۰۵ء
وفات مولانا احمد حسن صاحب امروہوی	سنہ ۱۳۳۰ھ	
ولادت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب رہبر دار ریشمی خطوط	سنہ ۱۲۶۸ھ / ۱۸۵۱ء	وفات سنہ ۱۳۳۹ھ / ۱۹۲۰ء
ولادت مولانا عبیداللہ صاحب سندھی	سنہ ۱۲۸۹ھ / ۱۸۷۲ء	وفات سنہ ۱۹۴۴ء
مولانا عبیداللہ صاحب کی ہجرت کابل	سنہ ۱۳۳۳ھ / ۱۹۱۵ء	
مولانا کی پچیس سال بعد مختلف ممالک سے مراجعت ہند	سنہ ۱۹۳۹ء	
ولادت مولانا انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ	سنہ ۱۲۹۲ھ	
ولادت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی	سنہ ۱۲۸۰ھ	
ولادت مفتی اعظم مولانا کفایت اللہ صاحب رحمۃ اللہ	سنہ ۱۲۹۲ھ	وفات سنہ ۱۳۷۲ھ / ۱۹۵۲ء
ولادت امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد فیروز بخت	سنہ ۱۳۰۵ھ / ۱۸۸۸ء	وفات سنہ ۱۳۷۷ھ / ۱۹۵۸ء
ولادت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی چراغ محمد ۱۲۹۶	سنہ ۱۲۹۶ھ / ۱۸۷۹ء	وفات سنہ ۱۳۷۷ھ / ۱۹۵۷ء
وفات سحبان الہند مولانا احمد سعید صاحب	سنہ ۱۳۷۹ھ / ۱۹۵۹ء	
ولادت مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمن صاحب سیوہاروی	۱۰ جنوری سنہ ۱۹۰۱ء	۱۳۱۸ھ
کل ہند مسلم کنونشن طلب کردہ مجاہد ملت	۱۱ جون ۱۹۶۱ء	۲۸ ذی الحجہ ۱۳۸۰ھ
وفات مجاہد ملت ناظم اعلیٰ جمعیۃ علماء ہند	۲ اگست ۱۹۶۲ء	۳۰ صفر ۱۳۸۲ھ

یوم میلاد سرورِ کائنات پر آل انڈیا ریڈیو سے مجاہد ملتؒ کی ایک تقریر

انسان ہمیشہ اپنے بڑوں اور بزرگوں کی یادگار مناتا ہے۔ اپنی تاریخ کے اونچے سے اونچے رہنماؤں اور لیڈروں کی، بادشاہوں اور شہنشاہوں کی، بہادروں اور جرنیلوں کی، باکمال ہنرمندوں اور اپنے وقت کے ہیرو کہلانے والوں کی یاد مناتا ہے۔ اُن کے نام یہ دن منائے جاتے ہیں مجلسیں اور محفلیں منعقد ہوتی ہیں جلسے جلوس، تذکرے اور تقاریر کی رسوم ادا کی جاتی ہیں اور مرنے والوں کے اوصاف و کمالات کو یاد کر کے داد دی جاتی اور اُن کے بقاء دوام کی سبیل پیدا کی جاتی ہے۔

آج کا دن بھی ایک تاریخی جشن مسرت اور دنیائے انسانی کی ایک عظیم الشان یادگار ہے لیکن ایک ایسی یادگار جو اپنی آن و شان میں دوسری یادگاروں سے نرالی اور انوکھی ہے۔

آج ہم اس برگزیدہ ہستی یعنی رسول خدا سرورِ کائنات محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی یادگار منا رہے ہیں جکی اقدس و ارفع شخصیت، جن کی تعلیم و دعوت، قیادت و سیادت اور کمال انسانیت تاریخ عالم کی وہ زندہ جاوید یادگار ہے جو اپنے کسی تذکرہ یا یادگار کے منائے جانے کی محتاج نہیں ہے۔ اگرچہ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اُن کی یاد اور اُن کا تذکرہ ہمارے لئے سرمایۂ سعادت اور آیۂ رحمت ہے۔

ابتدائے آفرینش سے آج تک دنیا میں بے شمار نامور انسان، ہزاروں ریفارمر اور مُصلحین گذرے ہیں لیکن ایک ریفارمر اور ایک سچے نبی و رسول کے درمیان جو سب سے بڑا امتیاز ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ کسی مصلح، ریفارمر، لیڈر یا رہنما کے بہترین کیریکٹر کے لئے یہ وصف کافی سمجھا جاتا ہے کہ جس شعبۂ حیات میں وہ رہنمائی کر رہا ہے اُس میں اُس کی اخلاقی برتری اور کردار و گفتار کی صفائی قابل تقلید ہو باقی دوسرے شعبہ ہائے زندگی میں کتنی ہی خامی، کمی اور کوتاہی کیوں نہ ہو، اُس پر انگشت نمائی نہیں کی جاسکتی۔ لیکن نبوت و رسالت کا منصب اس سے بالکل جدا اور بہت اعلیٰ و ارفع ہے۔ بالخصوص وہ مقدس ہستی جس کی رسالت و نبوت اپنی جلالت شان اور رفعت قدر کے لحاظ سے تمام انبیاء و رسل کے لئے بھی اُسوۂ اور معیار قرار پائی اُس کے لئے از بس ضروری تھا کہ اُس کی خلوت و جلوت اور زندگی کا ہر شعبہ اس درجہ صاف، روشن اور کامل و مکمل ہو کہ نقص و عیب یا خامی و کمزوری کا کوئی سوال ہی پیدا نہ ہوسکے۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ سن و سال کے اعتبار سے اگرچہ پینے چودہ سو سال کی طویل مدت گذر چکی ہے لیکن رسول اکرم، سرور عالم حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مقدس کا ایک ایک لمحہ اور اُن کی زندگی کا ایک ایک ورق آج بھی ہمارے سامنے اسی طرح روشن ہے جیسے آج ہی کی بات ہے۔ اُن کی خلوت اور اُن کی جلوت خانگی اور نجی زندگی بھی اور بیرونی زندگی بھی۔ اُن کے معاملات و اشغال بھی اور اُن کا رہن سہن بھی، اُن کا لین اور دین منع و قطع بھی اور ان کا قول و عمل یا اخلاق و کردار بھی، غرض زندگی کا ہر شعبہ دنیا کی رہنمائی کے لئے آج بھی آفتاب عالمتاب کی طرح چمک رہا ہے۔

ولادت باسعادت سے لیکر زندگی کے آخری لمحات تک آپ کی سیرت پاک لقد کان لکم فی رسول اللہ اُسوۃ حسنۃ کا مرقع اور رُشد و ہدایت کی ایک جیتی جاگتی تصویر ہے۔

آپکے بچپن کی تاریخ دیکھئے تو دنیا کے عام بچوں کی طرح کھیل کود، سیر و تماشہ، لغویات اور بیہودگیوں اور طفلانہ حرکات و مشاغل کی جگہ، سنجیدگی و متانت، کرامت نفس و شرافت، طہارت و لطافت اور برمحل افکار و اشغال کا ایک حیرت انگیز اور قابل تقلید نمونہ آپ کو ملے گا۔

آگے بڑھئے اور نبی کریم کے عہد شباب کا مطالعہ کیجئے۔ ایک انسان کی زندگی میں جوانی کا دور سب سے نازک دور ہوتا ہے لیکن جب آپ محمد عربی فداہ روحی ابی و امی کی سیرت کے اس دور کے ابواب پڑھیں گے تو حیرت ہوگی یہ دیکھ کر کہ وہاں بھی عام انسانی سطح سے بہت بلند، اور غلط جذبات و رجحانات سے بالکل الگ، حلم و بردباری، بیرانہ فراست و دانشمندی، ریاضت و تزکیہ نفس اور مخلوق خدا کی خدمت کا ایک قیمتی سلسلہ ہے جو شب و روز کا عام مشغلہ اور صبح سے شام تک کا کاروبار ہے۔

اور سب سے آخر میں جب آپ نبی کریم کے عہد پیری کا مطالعہ کریں گے تو دیکھیں گے کہ سیرت پاک کے آخری تیئس سال اس عظیم الشان انقلاب کی تاریخ ہیں جو آپ کی حیات مقدسہ کا مقصد و منتہا ہے۔

خاتم الانبیاء، سرکار دوعالم، رسول اکرم محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی

ولادت باسعادت ایک ایسی سرزمین، ایک ایسے گھرانے اور ایک ایسی قوم میں ہوئی جہاں تعلیم، تہذیب، تمدن غرض ارتقاء انسانی کے ذرائع مفقود و نا پید تھے۔ آپ کی ذات مبارک اس عالم میں وجود میں آئی کہ باپ کا دست شفقت شروع سے دیکھا ہی نہیں اور چند سال بعد ہی ماں کے آغوش محبت سے بھی محروم ہو گئے لیکن تاریخ ماضی کے اوراق شاہد ہیں کہ دنیوی اسباب و ذرائع سے یکسر محرومی کے باوجود آپ نے ایک بن کھیتی کی سرزمین میں رہ کر، نہ صرف ایک غیر مہذب اور غیر متمدن قوم کو انسانیت عظمیٰ کے بلند درجہ پر پہنچایا اور گلہ بانوں اور ساربانوں کو جہاں بانی اور انسانی قیادت و سیادت کے جوہر بخشے بلکہ ٹھیک ایسے وقت میں جبکہ کفر و شرک، ظلم و عدوان، زیر دستوں کی مظلومیت اور زبردستوں کا تشدد اور زندگی کی ہر شاخ میں افراط و تفریط کی تاریکیاں دنیا پر چھائی ہوئی تھیں، آپ نے عدل و انصاف، توحید الٰہی، خدمت خلق اور ہمدردی عالم کی روشنی دنیا کو دکھلائی۔ اور کائنات مذاہب و ملل میں ایک ایسا پاک اور عظیم الشان انقلاب پیدا کیا جس نے مذہب، سیاست، معیشت، معاشرت غرض دنیا کی چلتی پھرتی اور متحرک زندگی میں جہالت و تاریکی کو فنا کر کے روشن و تابان آفتاب حقیقت کی طرف رہنمائی کی۔

آپ نے مذہب کی بنیاد خدا پرستی اور عقل و شعور کی افادیت پر رکھی انسانوں کو انسان کی غلامی سے نکال کر خدا کی دی ہوئی صداقت "کلام الٰہی" کی روشنی میں آزادی بخشی۔ آپ نے ظلم و تعدی کو عدل و انصاف سے، تحکم و استبداد کو جمہوریت و شورویت سے، انسانوں کی باہمی کشمکش اور طبقاتی جنگ کو تعاون و مساوات اور اخوت و ہمدردی سے، کفر و جہالت کو خدا پرستی و توحید الٰہی سے بدل کر دنیا کا نقشہ ہی کچھ سے کچھ بنا دیا۔

آپ نے ایک طرف اس دور کے پھیلے ہوئے فسق و فجور، ظلم و جور اور جورع الارض کی شخصی حکومتوں کے تختے الٹ کر انسانوں کو عدل و مساوات کی قدر و عظمت بخشی اور دوسری طرف سادگی اور غربت و مسکنت کو اپنا طغرائے امتیاز بنایا۔ چنانچہ آپ کی پوری زندگی میں آپ کا لباس پیوند لگے ہوئے کپڑے، آپ کا بستر پرانی کھال کا ایک نمدہ اور خدا کا بچھایا ہوا فرش زمین، آپ کا مکان و محل کھجور کی ٹٹیوں کا ایک چھوٹا سا حجرہ اور آپ کی غذا جو کی روٹی، کچھ کھجوریں اور پانی کا ایک پیالہ رہی۔ اسی سادگی اور مسکنت کے عالم میں آپ نے خدا کے بھروسہ اور اپنے دست بازو کے بل پر جائز و حلال روزی بھی کمائی۔ بکریاں بھی چرائیں اور شام کے بازاروں میں تجارت بھی کی اور دوسری طرف قوم و قبائل کے نزاعات کے وہ فیصلے بھی کئے جو عدل و انصاف کے نادر نمونے کہے جا سکتے ہیں۔ آپ کی دیانت و صداقت کا یہ عالم تھا کہ قوم نے امین و صادق کے لقب سے یاد کیا اور آپ کے دشمنوں نے بھی اپنی امانتوں کو محفوظ رکھنے کے لئے آپ ہی کی دیانت اور آپ کی ذات مقدس پر اطمینان کیا۔

آپ ہی کی ذات ستودہ صفات ہے جو انسانی عفت و پاکدامنی، اعتدال و میانہ روی اخلاق و کردار کی صفائی اور محاسن انسانی کا مکمل ترین نمونہ اور انسانیت کے عروج و کمال کی سب سے اعلیٰ مثال ہے۔ خود لسان نبوت کا ارشاد ہے: "بُعثت لاتمم مکارم الاخلاق" ۔ میں دنیا میں اس لئے بھیجا گیا ہوں کہ اخلاق کے حسن و مکارم کی تکمیل کر دوں اور مکارم اخلاق کی ایک زندہ جاوید یادگار دنیا کے سامنے چھوڑ جاؤں۔ چنانچہ آپ کا لایا ہوا وہ پیغام جو انسان کو حقیقت اور سچائی کی راہ دکھاتا ہے اسی اعلیٰ مشن کی تعبیر اور آپ کی سیرت پاک اور اس کی عملی تفسیر ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ نبی کریم کی تعلیمات رشد و ہدایت کے وہ سرچشمے ہیں جو بھلائی انسانیت اخوت و محبت، حق گوئی و حق پرستی، ظالم سے درگذر اور مخلوق خدا کے ساتھ حسن سلوک، مواسات و بھائی چارہ گی، اور ہمدردی و غمخواری، زیر دست و بے نوا کی امداد اور تعدی و دست درازی کے انسداد کے وہ اعلیٰ اصول بتلاتی ہیں جو دنیا میں ہمیشہ انسانی سوسائٹی کی فلاح و بہبود کے لئے لازمی اور بنیادی اصول ہیں

ساڑھے تیرہ یا پورے چودہ سو سال گذر چکے ہیں کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے مکہ کی پہاڑیوں سے اپنی آواز دنیا کو سنائی تھی لیکن وہ آج بھی دنیا میں اسی طرح گونج رہی ہے اس لئے کہ یہی حق و صداقت کی آواز ہے جو کبھی فنا نہیں ہو سکتی اور یہی وہ پیغام ہے جو انسان کو انسانیت اور اخوت و محبت کی راہ بتلاتا ہے کوئی شبہ نہیں کہ اس پیغام رحمت کا لانے والا اور عالم انسانی کو فلاح و بہبودی کی راہ بتلانے والا اور دنیائے انسانیت کا سب سے بڑا محسن تھا اور آج کا دن جبکہ ہم محسن اعظم کی یاد منا رہے ہیں تمام عالم کے لئے عید و مسرت کا دن ہے وما ارسلناک الا رحمۃ للعالمین۔ اللھم صل علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ اجمعین ؕ

لکھنؤ کی تاریخی کانفرنس منعقدہ دسمبر ۱۹۴۷ء میں

حضرت مولانا حفظ الرحمن صاحب کا مجاہدانہ خطاب

کانفرنس کے آخری اجلاس میں جمعیۃ علماء ہند کے ترجمان مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے کانفرنس کی کارگزاری اور تجاویز پر تبصرہ کرتے ہوئے تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ کی ولولہ انگیز تقریر میں فرمایا

جو حالات ہمارے سامنے ہیں کہ انسان خود انسان کے خون کا پیاسا ہے ہم نہیں سمجھ سکتے کہ ان کو کن الفاظ سے تعبیر کریں، وحشت اور درندگی کا لفظ بھی کافی نہیں ہے بلکہ سچ یہ ہے کہ وحشت اور درندگی اس حالت سے شرم کر رہی ہے۔ شیر اور بھیڑیئے جو سب سے زیادہ وحشت ناک درندے مانے جاتے ہیں۔ وہ دوسرے جانوروں کا خون چوس کر درندگی کی پیاس بجھاتے ہیں لیکن اپنے بچوں کو وہ بھی نہیں پھاڑتے، یہ حضرت انسان ہیں کہ خود اپنے ہم جنس بچوں اور عورتوں اور کمزور انسانوں کو ذبح کرتے ہوئے نہیں شرماتے۔

عوام کی وحشت اور درندگی کا علاج حکومت کا فرض ہے لیکن اس کا کیا علاج جب خود معالج اور امن کے ذمہ دار دہشت زدہ ہو جائیں، آج ذبیحہ گاؤ یا ناجائز اسلحہ کا الزام لگا کر جس طرح مسلمانوں کو پریشان کیا جا رہا ہے وہ اسی وحشت زدگی کا نتیجہ ہے۔

جمہوریہ ہند، مساوات یکسانیت آزادی رائے اور آزادیِ ضمیر کے اصول پر قائم کیا گیا ہے۔ کانگریس ان اصولوں کی علمبردار ہے آج یہ فرض کانگریس کا ہے کہ ان اصول کو ملک میں کامیاب کرنے کے لئے جان کی بازی لگا دے۔ جس وقت مسلمانوں پر فرقہ واریت کا بھوت سوار تھا ہم نے ڈٹ کر اس کا مقابلہ کیا۔ ہم خود اپنوں سے ٹکرائے آج مسلمانوں کی فرقہ واریت ختم ہو چکی ہے۔ آج جن سنگھ اور مہاسبھا کی فرقہ واریت ملک کو تباہ کر رہی ہے ہم نے جس طرح مسلم فرقہ واریت کا مقابلہ کیا اسی طرح ہم ہندو فرقہ واریت کو بھی پیروں سے مسل کر دم لیں گے۔ ہم ہندو یونین کے رگ و ریشہ کو فرقہ واریت سے پاک کر کے دم لیں گے ورنہ اس کوشش میں ختم ہو جائیں گے؛

یا تن رسد بجاناں یا جاں زتن برآید

آپ نے مسلمانوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

"یہ کیا بزدلی ہے کہ تم در و دیوار سے دہشت زدہ ہو، تم خود اپنے سایہ سے ڈر رہے ہو، اگر تم کل تک بہادر تھے تو آج بزدل کیوں ہو گئے، اسلام اور بزدلی ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے مسلمان سب کچھ ہو سکتا ہے مگر بزدل نہیں ہو سکتا۔ مسلمان حق بات کہنے میں ہمیشہ دلیر ہوتا ہے مسلمان ناانصافی برداشت نہیں کر سکتا۔ خوف و ہراس، بزدلی اور نامرادی کو دل سے نکال دو یہاں سے یہ عہد کر کے جاؤ کہ ہر ایک ناانصافی کا مقابلہ ڈٹ کر کریں گے۔ بیشک ہم وفادار ہیں، مگر ہم مادر وطن کے وفادار ہیں۔ وفاداری کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ ہم کسی کلکٹر یا کسی سرکاری افسر یا وزیر کے فعل پر کسی قسم کی نکتہ چینی نہیں کر سکتے۔ وہ زمانہ ختم ہو گیا کہ حکام کی چاپلوسی وفاداری ہوا کرتی تھی۔ حکومت وزراء حکومت اور افسران حکومت کا پہلا فرض ہے کہ وہ ملک اور وطن کے وفادار رہیں، اگر ہم وفاداری کے خلاف کوئی حرکت دیکھیں گے۔ تو یقیناً مقابلہ کریں گے۔ کانفرنس نے تمہیں مشورہ دیا ہے کہ مشترک سیاست میں حصہ لو۔ اور کسی سیاسی جماعت میں شرکت کرو جو ہندو مسلمانوں کے لئے مشترک ہو۔ میں کہتا ہوں کہ کانگریس میں شرکت کرو۔ کیونکہ اس سے بہتر کوئی جماعت ہمارے سامنے نہیں ہے مگر کسی خوف یا ڈر کی وجہ سے کانگریس میں ہرگز شریک نہ ہو، اگر تم پناہ ڈھونڈنے کے لئے کسی جماعت میں شریک ہوتے ہو تو اس سے نہ جماعت کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ نہ تمہاری یہ شرکت ملک کے لئے مفید ہو سکتی ہے۔ میں یہ کہہ رہا ہوں کہ فرقہ وارانہ سیاسی پلیٹ فارم غلط ہے۔ اس غلطی کو ختم کرو۔ اور مشترک پلیٹ فارم پر ملک کی مشترک سیاست میں حصہ لیکر ملک کی ترقی پذیر جماعت کی طاقت بڑھاؤ۔ ہمت بلند رکھو خدمت وطن کے سچے جذبے کے ساتھ آگے بڑھو تمہیں انصاف اور حق و صداقت کا سر بلند کرنا ہے، اگر تم نیک مقاصد کے لئے ڈٹ گئے تو خدا کی مدد تمہارے ساتھ ہوگی۔

اخبارات میں یہ تقریر شائع ہوئی تو مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی مدیر صدق نے فوراً ایک کارڈ لکھا جس کے الفاظ بجنسہ یہ تھے۔

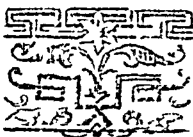
السلام علیکم، مسلم کانفرنس لکھنؤ میں آپ کی تقریر پڑھکر ع

غازی چو توئی رواست کا فر بوذن

جزاک اللہ خیر الجزاء، والسلام۔

دعاگو، دعاخواہ

عبدالماجد — یکم جنوری ۴۸ء



انڈین مسلم کنونشن میں
مجاہدِ ملت کے بصیرت افروز ارشادات

انڈین مسلم کنونشن منعقدہ نئی دہلی ۱۰/۱۱ جون ۱۹۶۱ء میں بحیثیت صدر استقبالیہ مجاہد ملت رحمۃ اللہ علیہ نے اپنا جو گرانقدر خطبہ ارشاد فرمایا وہ مولانا مرحوم کے افکار و عزائم کی ایک روشن تصویر تھی اور ملک و ملت کے نام اِس جانباز مجاہد کا آخری پیغام۔ انڈین مسلم کنونشن جس طرح تاریخ کا رُخ بدلدینے والا واقعہ تھا اسی طرح مولانا مرحوم کے یہ ارشادات بھی تادیر زندگی کی مایوسیوں میں ہدایت و بصیرت کا سروسامان بنے رہیں گے۔ اسی خیال کے پیشِ نظر "مجاہد ملت نمبر" کے صفحات مولانا مرحوم و مغفور کے اِسی آخری پیغام سے آراستہ کئے جارہے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے!

"انیس الحسن"

حاضرین محترم! اس اجتماع میں شرکت کے لئے جو دعوت نامہ آپ کی خدمت میں پیش کیا گیا اس پر داعی کی حیثیت سے متعدد معزز حضرات کے نام درج ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اِس اجتماع کے داعی صرف وہی حضرات نہیں ہیں بلکہ یہ دعوت اُن کروڑوں انسانوں کے دلوں کی آواز ہے جو اس عظیم ملک کے شہری ہوتے ہوئے اور ایک جمہوری دستور کے سایہ میں رہتے ہوئے بھی خود کو زندگی کی راہوں میں پامال اور قدم قدم پر اپنے جائز حقوق سے محروم پا رہے ہیں اور اس صورت حال کے تسلسل نے ان کے اس اضطراب کو اپنی انتہا تک پہنچا دیا ہے کہ کسی طرح ملک و ملت کے سربراہ جمع ہوں اور ان کے درد کا کوئی علاج اور ان کے اضطراب و مشکلات کا کوئی حل تلاش کریں تاکہ کسی صورت، ان کی زندگی بھی سکون و اطمینان سے آشنا ہو سکے۔

حضرات محترم! یہ وسیع اور عظیم الشان ملک جو ہمارا وطن عزیز ہے، صدیوں سے مختلف فرقوں اور ملتوں کا گہوارہ اور مختلف زبانوں اور عقائد و رسوم کا سنگم رہا ہے۔ وطنیت کے لازوال رشتہ نے اِس ملک کی وسیع آبادیوں کو زبان، تہذیب اور رسم و رواج کے تمام اختلافات کے باوجود ہمیشہ ایک اکائی بنائے رکھا ہے، یہی وحدت و اتحاد، باہمی تعلقات کی خوشگواری اور تعاون درحقیقت اس ملک کی سب سے بڑی قوت اور اس کے استحکام اور ترقی کی بُنیاد ہے۔ یہی "وحدت" وہ عظیم طاقت تھی جس کے بل پر ہم نے برطانوی اقتدار سے نجات پائی اور ملک کو آزادی کی نعمت نصیب ہوتی۔ افسوس کہ ملک کی تقسیم نے ہماری اس بے پناہ طاقت کو کمزور کیا اور ہمارے اندر خود بینی، فرقہ پرستی، تنگ دلی و تنگ نظری کے وہ شگاف پیدا کئے، جن سے ہماری "وحدت" کا شیرازہ بکھرا اور دنیا نے ہمارے انتشار کا تماشہ دیکھا۔ تقسیم وطن کے ساتھ ساتھ ملک کے مختلف حصوں میں جو حوادث پیش آئے آج ان کی یاد بھی شریف اور سنجیدہ انسانوں کی نگاہیں شرم و ندامت سے جھکادیتی ہے۔ وہ سب کچھ تنگ دلی اور فرقہ وارانہ تنگ نظری کا ایک وقتی بخار یا ایک ہنگامی سیلاب تھا جو اپنی پوری تباہ کاریوں کے ساتھ ملک کے ایک سرے سے اُٹھا اور دوسرے سرے تک گزرتا چلا گیا۔ آپ کو یاد ہوگا کہ اس وقت بھی جمعیۃ العلمائے ہند نے ملک کو مہلک اثرات سے پاک و صاف کرنے کے لئے مرحوم و مغفور امام الہند حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کی رہنمائی میں پورے ملک کے اصحابِ فکر و تدبیر کی ایک عظیم کانفرنس آزاد مسلم کانفرنس کے نام سے لکھنؤ میں بلائی تھی جس نے ملک بھر میں ایک نئی فضا اور مفید نتائج پیدا کئے۔ کاش کہ وہ صورتِ حال اِس وقت کے ساتھ ختم ہو گئی ہوتی، مگر افسوس کہ اس کے بعد سے اب تک ۱۲ سال کا جو ریکارڈ ہمارے سامنے ہے وہ اس حقیقت کی بیّن شہادت ہے کہ تنگ نظری، فرقہ واریت اور جارحانہ حد بندیوں کے مہلک جذبات اس پورے عرصہ میں کارفرما رہے ہیں۔ پچھلے کچھ عرصہ میں زبان کے نام گجرات و مہاراشٹر اور آسام و بنگال میں اور مذہب کے نام پر یو۔ پی۔ بہار اور مدھیہ پردیش وغیرہ کے مختلف شہروں اور دیہات بالخصوص جبل پور اور ساگر میں جو کچھ ہوا، اس کے بعد شبہ کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ اس صورت حال میں نہ صرف یہ کہ اختلاف زبان و مذہب کے نام پر لاکھوں باشندگان ملک کے لئے

زندگی اجیرن بن رہی ہے بلکہ اس طرح خود ملک کی صحت و سالمیت بھی پنپ نہیں سکتی ۔

پھر جو طبقہ اس فرقہ واریت، تنگ نظری اور مسموم جذبات کا سب سے زیادہ تختۂ مشق بنا ہے وہ اس ملک کی سب سے بڑی مذہبی اقلیت یعنی "مسلمان" ہیں جن کو جمہوری دستور کے مطابق مساویانہ حقوق کے دلانے میں خود اکثریت کے شریف اور سنجیدہ اصحابِ فکر و نظر کی مسلسل کوششیں بھی ابھی تک بار آور نہیں ہو سکیں۔ مسلم اقلیت کے خلاف یہ جارحانہ فرقہ واریت اور معاندانہ جذبات صرف عوامی زندگی میں ہی اثر انداز نہیں، بلکہ زیادہ افسوس کی بات یہ ہے کہ حکومت کے دائروں میں بھی اس کی چھاپ بہت گہری ہے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ جا بجا مسلم اقلیت آئے دن ایک شرپسند گروہ کے ہاتھوں جان و مال اور عزت و آبرو کی یکطرفہ بربادیوں کا شکار ہوتی رہتی ہے، پھر تماشہ یہ ہے کہ فرقہ وارانہ جارحیت اور غنڈہ گردی کی ان وارداتوں کو "ہندو مسلم" فساد کہہ کر حقیقت حال پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی جاتی ہے، حالانکہ واقعتاً (جیسا کہ میں نے ہند پارلیمنٹ میں بھی اور اس کے باہر بھی بار بار کہا ہے) ان واقعات کو ہندو مسلم فساد کہنا ہندوؤں اور مسلمانوں ـ دونوں کے ساتھ ناانصافی کھلی ہوئی توہین اور حقیقت کی غلط تعبیر ہے ۔ ملک کے عوام ـ ہندو اور مسلمان ـ عام طور پر فرقہ پرست عنصر کی ان حرکتوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور ان میں باہم یکجہتی کے رجحانات ابھر رہے ہیں۔ درحقیقت غنڈہ گردی کی یہ تمام وارداتیں اسی مسموم ذہنیت کی ابھاری ہوئی اسکیمیں ہوتی ہیں جو مختلف بہانوں اور تدبیروں کے ساتھ بروئے کار لائی جاتی ہیں اور اکثر و بیشتر مقامی ایڈمنسٹریشن کا تعاون اور پشت پناہی ان کو حاصل ہوتی ہے

ایک طرف ہماری شہری زندگی میں ان حوادث کا تسلسل اور دوسری طرف سرکاری ملازمتوں، تعلیمی اداروں، نصاب کی کتابوں، صنعت و حرفت کے مرکزوں، تجارت کے وسائل اور کاروباری میدانوں تک میں مسلم اقلیت کے ساتھ امتیازی سلوک، حق تلفی، ناانصافی، ملک کے مختلف حصوں میں مسلم اوقاف اور مساجد کی بربادی اور ویرانی نیز مجالس قانون ساز میں ناکافی نمائندگی کی شکایتوں نے جو افسوسناک شکل اختیار کر لی ہے اور پچھلے ۱۲ سال کی سرگذشت نے اس کا جو ریکارڈ بنایا ہے اس سے آپ سب بخوبی واقف ہیں۔ آج اس کی تفصیلات کو دہرانا سراسر غیر ضروری ہے۔

یہ تشویشناک صورت حال نہ صرف یہ کہ مسلم اقلیت کے لئے انتہائی اضطراب کا باعث بن رہی ہے، بلکہ ساتھ ہی ملکی صحت و سالمیت کے لئے بھی کینسر سے زیادہ خطرناک اور تعمیر و ترقی کی راہ میں بڑی رکاوٹ ثابت ہو رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج خود اکثریتی طبقہ کے وہ تمام نیک نہاد افراد جو اس ذہنی گراوٹ اور تنگ دلی سے بالاتر ہو کر معاملات کو دیکھتے، سوچتے اور سمجھتے ہیں۔ اس صورت حال سے اسی قدر نالاں اور پریشان ہیں جس قدر خود مسلم اقلیت بے چین و مضطرب ہے، انہیں بھی یقین ہے کہ اختلاف مذہب و مسلک کے نام پر ملک کی اتنی بڑی آبادی کو پامال اور برباد کرنے کی کوشش پورے ملک کے لئے خودکشی کے مرادف ہے، چنانچہ آج بیرونی خطرات سے پہلے جو اندرونی خطرہ وطن عزیز کے امن و استحکام کو چیلنج کر رہا ہے وہ یہی مسموم ذہنیت اور فرقہ پرستی کے مہلک جذبات ہیں اور یہی وجہ ہے کہ جس طرح آج ہم وطن عزیز کے مستقبل میں سچی جمہوریت اور قومی یکجہتی کو کارفرما دیکھنے کے لئے مضطرب ہیں اور اسی جذبہ کے ساتھ آج یہاں سر جوڑ کر بیٹھے ہیں ۔ اسی طرح بلا لحاظ مذہب و ملت، وہ تمام اصحاب فکر و تدبر جن میں خود ملک کے وزیر اعظم (پرائم منسٹر) کی شخصیت بھی شامل ہے اس سنگین صورت حال سے بہت متاثر اور فکر مند ہیں اور پوری اہمیت کے ساتھ اس سوال پر غور کر رہے ہیں کہ کیونکر جذبات کے اس غلط بہاؤ کو روکا جائے اور ملکی سالمیت اور قومی یکجہتی (نیشنل انٹی گریشن) کو برقرار رکھنے کے لئے ایڈمنسٹریشن اور عوام کے دائروں میں کیا تدابیر اختیار کی جائیں۔

یقیناً ملک کے سچے رہنماؤں کی یہ توجہ ہماری تحسین و تصویب کی مستحق ہے اور ہماری آرزو ہے کہ ان کی کوششیں عملی زندگی میں بہتر نتائج پیدا کر سکیں۔

سامعین کرام! آج ہی نہیں بلکہ آج سے بارہ سال پہلے بھی انہی خطرات و نتائج پر نگاہ رکھتے ہوئے ملک کے تمام دور اندیش رہنماؤں نے دستور ساز اسمبلی میں بیٹھ کر یہ فیصلہ کیا تھا کہ اس عظیم ملک کی فلاح و ترقی کے تمام نقشے سیکولرازم اور جمہوریت کی بنیادوں پر ہی کامیاب ہو سکتے ہیں۔ اسی لئے انہوں نے ملک کے لئے وہ بہترین دستور (کانسٹی ٹیوشن) مرتب کیا جس کا بنیادی تصور ملک کی وحدت (اکائی) ہے اور جو اس ملک میں ایک ایسا ترقی پذیر معاشرہ (سوسائٹی) پیدا کرنا چاہتا ہے جس میں جمہوریت کی فراخدلی کار فرما ہو اور مذہب و خیال کے اختلافات کے باوجود ملک کے تمام باشندے شہری زندگی میں مساویانہ حقوق سے بہرہ مند ہوں کہ ان کے باہمی تعلقات میں خوشگواری قائم رہ سکے اور وہ سب پوری خوش دلی کے ساتھ وطن عزیز کی تعمیر و ترقی کے لئے کام کر سکیں یقیناً یہی نقطۂ نظر صحیح نقطۂ نظر ہے اور آج جو تکلیف اور جو شکایت ہے وہ صرف یہ کہ عملی زندگی میں اس نقطۂ نظر سے مسلسل انحراف ہو رہا ہے۔

ہمارا موقف و مقام

آج ہم اس لئے جمع ہو رہے ہیں کہ گزرے ہوئے تیرہ برسوں کی سرگذشت کو سامنے رکھتے ہوئے سوچیں اور غور کریں کہ وطن

عزیز کی وسعتوں میں سیکولرازم اور جمہوریت کی حقیقی فضا پیدا کرنے اور دستور ہند کے تقاضوں کو بروئے کار لانے کے لئے آخر کیا تدابیر اختیار کی جائیں اور مسلم اقلیت کے ساتھ ہونے والے غیر دستوری، امتیازی سلوک، ناانصافیوں اور حق تلفیوں کا مداوا کیوں کر ہو اور کون سے وسائل کام میں لاتے جائیں کہ ہمیں اس طبقاتی کش مکش، بدامنی، بے اطمینانی اور پامالی کی زندگی سے نکل کر دوسرے باشندگان وطن کے ساتھ ساتھ آبرومندانہ اور مساویانہ زندگی میسر آسکے اور موقع مل سکے کہ ذہنی یکسوئی اور دلی اطمینان کے ساتھ ہم بھی وطن کی خوشحالی، ترقی اور سربلندی کے لئے اپنی بھرپور صلاحیتوں کے ساتھ کام کر سکیں۔

بفضلہ تعالیٰ ہمیں اعتماد ہے اپنی نیت اور اپنے عزائم پر جو وطن کی خیر خواہی اور خیرسگالی کی راہ میں کسی سے پیچھے نہیں ہیں ساتھ ہی ہمیں اعتماد ہے کہ اپنی اس کوشش اور جستجو میں ہم تنہا نہیں ہیں بلکہ ایک خاص عنصر کو چھوڑ کر جو فرقہ پرستی، تنگ نظری اور تنگدلی کی تاریکیوں میں بہت دور رہ جا چکا ہے اور اپنی تمام ذہنی صلاحتیں کھو چکا ہے۔ اُس عنصر کے علاوہ اس ملک کے سب ہی سنجیدہ اور شریف انسان (خواہ وہ کوئی بھی مذہب و مسلک رکھتے ہوں) ہمارے ساتھ ہیں۔ ہماری پریشانیوں اور اضطراب کا اُنہیں بھی احساس ہے۔ سیکولرازم اور جمہوریت کی پامالی سے وہ بھی نالاں ہیں

ان ہی احساسات و عزائم کے ساتھ آج ہم یہاں جمع ہوئے ہیں کہ پوری سنجیدگی، احتیاط اور سچے قومی و تعمیری جذبہ کے ساتھ ان مسائل و معاملات پر غور کریں جو ایجنڈے کی شکل میں پیش کئے گئے ہیں

ہمیں اس وقت اس کا بھی پورا احساس ہے کہ نامساعد حالات میں یہ ایک نہایت اہم اور نزاکتوں سے بھرپور کام ہے، جس کا بیڑا ہم نے اٹھایا ہے، خدا کرے کہ ہم اس ذمہ داری کو خوبی و خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دے سکیں اور ہمارا یہ جرأت مندانہ اقدام ملک و ملت کی راہ میں مفید اور کامیاب اقدام ثابت ہو۔

مسلمانوں سے گزارش

حضرات محترم! مسلمانانِ ہند کے اس عظیم نمائندہ اجتماع کے موقع پر جو خصوصیت سے مسلم اقلیت کے ایک عام اور مسلسل اضطراب کی ترجمانی کے لئے یہاں منعقد ہو رہا ہے بے جا نہ ہوگا کہ خود مسلمانانِ ہند کی خدمت میں بھی گزارش کروں کہ وہ اپنی اس پُرآشوب زندگی میں ظاہری تدابیر و وسائل کو اختیار کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے اندر اعتماد علی اللہ اور صبر و استقلال کی زیادہ سے زیادہ صلاحتیں پیدا کریں۔ اسوۂ رسولِ کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کو اپنا نصب العین بنائیں اور اسلام کی بنیادی تعلیمات سے سبق لیتے ہوئے اپنے اندر وہ اسپرٹ پیدا کریں کہ تکالیف و مصائب کے طوفانوں سے گزر کر بھی وہ احساس کمتری، پامالی اور مایوسی کا شکار نہ ہوں اور ان کے اس یقین میں کوئی تزلزل نہ آئے کہ اپنی وطنی زندگی میں ہمیں جو بھی حوادث و مشکلات درپیش ہیں وہ بہرحال وقتی اور دنیوی مصائب ہیں اور ہمارا حقیقی اعتماد کا رسازِ حقیقی کی رحمت اور اُس کی رضا جوئی پر ہی ہے۔ قرآن حکیم نے ہمیں بتایا ہے۔ اِنَّهٗ لَا يَيْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ ۝ (خدا تعالیٰ کی رحمت سے وہی مایوس ہوتے ہیں جنہیں خدا پر ایمان اور بھروسہ نہیں ہے۔)

اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا۔ ہر تنگی و پریشانی کے ساتھ آسائش و راحت بھی ضرور ہوتی ہے۔

اس عظیم الشان ملک میں جو ہماری طرح اور بھی متعدد مذاہب اور فرقوں کا پیارا وطن ہے۔ "نبی رحمت ﷺ" کے نام لیواؤں اور اس رسول برحق کے امتیوں کا (جس کی شان میں فرمایا گیا ہے۔ اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ (آپ محاسنِ اخلاق کا ایک بے مثال نمونہ ہیں) فرض ہے کہ اپنی زندگی میں اخلاق و کردار کی وہ بلندیاں پیدا کریں کہ دنیا ان کے وجود کو امن و رحمت کا سایہ محسوس کرے۔ ان کی وطن دوستی، خیراندیشی اور اخلاق کریمانہ کو نمونۂ عمل قرار دے اور اس سے سبق حاصل کرے۔

آج پہلے سے زیادہ ضرورت ہے کہ ہمارے اندر اپنے موقف کا صحیح احساس اور شعور پیدا ہو۔ اس پیارے دیش کی ہزار سالہ تاریخ میں ہم برابر کے شریک و سہیم اور اس دعوتِ حق کے علمبردار رہے ہیں جو پورے عالمِ انسانیت کے لئے امن و رحمت کا پیغام اور ہمدردی و خیرسگالی کا سرچشمہ ہے۔ ایک لمحہ کے لئے بھی اس ملک میں ہماری زندگی کسی اجنبی اور تماشائی کی زندگی نہیں ہو سکتی۔ اس کے بناؤ اور بگاڑ کے ساتھ ہمارا چولی اور دامن کا ساتھ ہے۔ اس لئے ملی و وطنی زندگی میں اپنے حقوق کے ساتھ ساتھ اپنے وطنی فرائض سے بھی کوئی غفلت ہمارے لئے جائز نہیں ہو سکتی۔ میرا تو یقین یہ ہے کہ اگر ہمارے اندر وطن کی سچی محبت اور اپنے فرض و منصب کا صحیح احساس بیدار ہے تو کوئی بڑی سے بڑی طاقت بھی ہمیں اپنے حقوق سے دیر تک محروم نہیں رکھ سکتی۔ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّالَّذِيْنَ هُمْ مُّحْسِنُوْنَ ۝ (اللہ کی مدد ہمیشہ ان کے ساتھ ہوتی ہے جو کردار و عمل کے کھرے اور نیکوکار ہوں۔

(ماخوذ از خطبہ استقبالیہ انڈین مسلم کنونشن)

ملکی سالمیت و قومی یکجہتی

جمعیۃ علماء ہند کا اہم کردار

مسلم کنونشن کے بعد مجاہد ملتؒ کا ایک بیان

ہندوستان کی جنگ آزادی کی تحریک میں جمعیۃ علماء ہند کی تاریخ روشن اور شاندار رہی ہے آزادی سے قبل کے دور میں جمعیۃ علماء نے قومی سالمیت کو برقرار رکھتے ہوئے بڑی جرأت و دلیری کے ساتھ جنگ کی۔ وہ ملک کی تقسیم کی برابر مخالف رہی اور اس نے پرانی مسلم لیگ کی دو قومی تھیوری کی شدت کے ساتھ مذمت اور مخالفت کی۔ وہ آزادی کی جنگ میں صف اول کی جماعتوں میں تھی۔ کانگریس کے ساتھ اس کا قریبی تعاون رہا اور اس کے کارکنان نے برطانیہ کے خلاف تمام دوسرے محبان وطن کے ساتھ قومی تحریکوں میں برابر کا حصہ لیا اور ان کی ایک بڑی تعداد نے اس تحریک میں اپنے جان و مال کی قربانی دی۔ آزادی کے بعد سے جمعیۃ علماء نے ہندوستانی دستور کے غیر مذہبی ڈھانچے کی پوری طرح حمایت کی اور قومی سالمیت کے حصول کے لئے نہایت تندہی سے کام کیا اور کر رہی ہے اس طرح ہم جمعیۃ علماء کی تاریخ کو دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک آزادی سے پہلے کی تاریخ اور دوسرے آزادی کے بعد کی تاریخ

آزادی کی تحریک میں عظیم رول

آزادی کی تحریک میں اس نے جو عظیم الشان رول ادا کیا ہے۔ اس پر کوئی دو رائیں نہیں ہو سکتیں آزادی کے بعد ۱۹۴۷ء میں جمعیۃ علماء نے حضرت مولانا ابوالکلام آزادؒ کی رہنمائی میں سیاسی سرگرمیوں سے الگ ہونے کا فیصلہ کیا اور وہ "قانون ساز اسمبلیوں اور دیگر اداروں کے انتخابات سے الگ ہو گئی۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مسلمان سیاست سے بالکل الگ رہیں۔ جمعیۃ کے ممبروں کو پوری آزادی حاصل ہے کہ وہ انفرادی حیثیت سے کسی بھی ایسی جماعت میں حصہ لے سکتے ہیں جو سیکولرزم پر یقین رکھتی ہوں۔ البتہ ان کو اس بات کی اجازت نہیں ہے کہ وہ کسی فرقہ پرست سیاسی جماعت یا ادارے میں حصہ لیں۔

قومی یکجہتی کا استحکام

جمعیۃ علماء کی سرگرمیاں اگرچہ مذہبی، سیاسی اور ثقافتی میدان تک محدود ہیں۔ لیکن اس نے اپنے اغراض و مقاصد میں قومی یکجہتی کے استحکام کا مقصد شامل رکھا اور اسے اہمیت دی ہے جمعیۃ علماء کے دستور کی دفعہ ۵ میں اس بات کو واضح طور پر بیان کیا گیا ہے کہ جمعیۃ علماء ہند، ہندوستان کے مختلف فرقوں میں اتحاد و یکجہتی رکھنے کا کام کرے گی۔ اپنی مذہبی، سماجی، اور ثقافتی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ جمعیۃ علماء نے ہمیشہ قومی یکجہتی کی ضرورت اور اہمیت پر زور دیا ہے۔ جمعیۃ علماء کے تمام ذمہ دار لیڈروں اور نمائندوں نے اپنے قول و فعل سے ہندوستانی دستور کی غیر مذہبی نوعیت کی حمایت و تائید کی ہے اور سیکولر عناصر کے استحکام کے لئے تمام قومی جماعتوں خاص طور پر کانگریس کے ساتھ پورا پورا اشتراک و تعاون کیا ہے۔ جمعیۃ علماء کی یہ قومی اور سیکولر پالیسی آفتاب کی طرح روشن ہے۔

جمعیۃ علماء مسلمانوں کی مذہبی، سیاسی اور ثقافتی جماعت ہے۔ لیکن وہ ان کوششوں سے الگ نہیں ہے جو عوام کی یکجہتی اور قومی سالمیت کے لئے کی جا رہی ہیں۔ جمعیۃ علماء ہند ان تمام طاقتوں کی تائید و حمایت کرتی ہے جو قومی یکجہتی کے لئے کام کر رہی ہیں۔ جمعیۃ علماء کا یہ کردار ایک بے داغ کردار ہے جسے ان تمام ہندو اور مسلمانوں نے سراہا ہے جو اپنے اندر قومی احساس رکھتے ہیں۔

سبق آموز ارشادات

مجاہد ملتؒ کی ایک تقریر کے کچھ اقتباسات

ماضی کی تاریخ اس لئے سامنے لائی جاتی ہے کہ پچھلے واقعات کو سامنے رکھ کر مستقبل کو بہتر بنانے کی کوشش کی جائے۔ جو قومیں صرف پدرم سلطان بود کہہ کر زندہ رہنا چاہتی ہیں وہ تاریخی دنیا میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتیں۔ اسی طرح جو قومیں ماضی کے واقعات کو سامنے نہ رکھیں وہ بھی اپنا مستقبل بہتر نہیں بنا سکتیں اس لئے ہمیں یہ بتانا ہے کہ ان تین دنوں میں اس پلیٹ فارم پر سے جو کچھ کہا جائیگا اور مسلمانوں کے جو معاملات اور حالات سامنے لائے جائیں گے ان کا فرقہ پرستی سے دور کا بھی تعلق نہیں ہو سکتا۔ آج بہت سے آدمی خاص کر ہندو مہا سبھا اور جن سنگھ ایسے ہیں جو ہمارے اوپر فرقہ پرستی کا الزام لگاتے ہیں اور ایسا الزام لگانا بہت آسان ہے لیکن ملک کے دستور اور انصاف کے تقاضوں کے لئے بہت ضروری ہے اور ملک کا قانون ہمیں اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ ہم اپنی مشکلات کو بیان کریں اور ان کو دور کرنے کا مطالبہ کریں جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ فرقہ پرستانہ بات ہے ان کو معلوم ہونا چاہئیے کہ ملک کی آزادی حاصل کرنے والوں نے جمیعۃ العلماء کے پلیٹ فارم سے ہمیشہ بلا لومۃ لائم جس بات کو حق سمجھا ہے کہا ہے اسی لئے آج انہیں حق ہے کہ وہاں معاملات کو سامنے لائیں جن سے مسلمانوں کو تکلیف پہونچ رہی ہے آج جو ان کو فرقہ پرست کہتے ہیں اُن سے زیادہ جاہل کوئی شخص نہیں ہے۔

آج اگر جمیعۃ العلماء ہند مسلمانوں کے معاملات کو اس نظر سے دیکھتی ہے کہ قومی حکومت میں مسلمانوں کا کیا مقام ہونا چاہئیے تو اس کو پورا حق ہے۔ ملک کا بٹوارہ ایک پولٹیکل بات تھی بٹوارہ کے لئے ہندو جماعتوں کو بھی دوش دیا جا سکتا ہے۔ مسلم لیگ اور ہندو مہا سبھا کو بھی دوش دیا جا سکتا ہے لیکن اب جو لوگ ہندوستان میں بس رہے ہیں یہاں کے چالیس کروڑ باشندے ہیں جو ایک بہتے ہوئے سمندر کی طرح ہیں ان میں ہندو بھی ہیں پارسی بھی ہیں سکھ بھی ہیں اور عیسائی بھی ہیں ان سب کا یہ حق ہے کہ وہ یہاں امن اور عزت سے رہیں اور اگر مسلمان بھی یہ بات کہیں کہ وہ بھی اپنے اس ملک میں باعزت مقام حاصل کرنا چاہتے ہیں تو اسے فرقہ پرستی کہہ کر دبایا نہیں جا سکتا۔ جو تعلق اس ملک سے یہاں کی اکثریت کو ہے وہی اقلیت کو بھی ہے جہاں تک ملکی آزادی کا تعلق ہے یہ فرقہ پرست کیا ہمارے مقابلہ میں آسکتے ہیں جمیعۃ کے خدام نے تو اس وقت انگریزی گولیوں کا مقابلہ کیا جب فرقہ پرست بہت بزدلی اور گھبراہٹ کے ساتھ کنڈیاں بند کئے بیٹھے تھے آج ہماری قربانیوں سے ملک آزاد ہے فرقہ پرست ہمیں طعنہ دیں ان کی بیوقوفی ہے۔

مساوی حقوق

آج ملک آزاد ہے سب کو برابر کا حق ہے لیکن ہم ان باتوں کو کہتے ہوئے ڈرتے ہیں خود دیکھتا ہوں کہ مسلمانوں کو اس درجہ ڈی مورالائز کر دیا گیا ہے اس درجہ احساس کمتری اور خوف میں مبتلا کر دیا گیا ہے کہ وہ ان باتوں کو کہتے ہوئے جھجکتے ہیں چاروں طرف نگاہ اٹھا کر دیکھتے ہیں کہ ہماری اس بات سے ہندو خوش ہوگا یا نہیں۔

ہم اس ملک میں رہنے والے ساڑھے چار کروڑ مسلمان یہاں اس لئے نہیں ہیں کہ کسی کی چاپلوسی کریں یا یہ سمجھیں کہ اس سے ہندو خوش ہوگا یا پنڈت نہرو خوش ہوں گے اگر جمیعۃ کے خدام کے دل میں ایک منٹ کے لئے بھی ایسا خیال گذرے تو میں کہوں گا کہ اس سے بڑی بزدلی اور نفاق کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔ ہم کہتے ہیں کہ جس طرح یہ ملک اکثریت کا ہے اسی طرح اقلیت کا بھی ہے۔ جس طرح ہندو کا ہے اسی طرح مسلمان کا بھی ہے۔ جس طرح پنڈت نہرو کا ہے اسی طرح حفظ الرحمٰن کا بھی ہے یہ ایک جمہوری ملک ہے۔

سیکولرازم

۱۴ برس گذر گئے کہ ہم نے اپنا سیکولر آئین بنایا۔ سیکولر کے معنی بہت سے لئے جاتے ہیں کوئی اس کے معنی لادینی حکومت لیتا ہے۔ کوئی ایسی حکومت کے لیتا ہے جو تمام مذاہب کو ختم کر دے گی۔ لیکن ہم اس کی تعبیر یوں کرتے ہیں کہ مذہب کی بنیاد پر یہاں کا دستور اور قانون ملک کے بسنے والوں کے مابین کوئی تفریق نہیں کرے گا۔ اس ملک میں بسنے والی چھوٹی سی چھوٹی ۲ آدمیوں کی اقلیت کو بھی وہی حق حاصل ہوگا جو یہاں کی نوّے ۹۰ فی صدی اکثریت کو حاصل ہوگا۔ مذہب یا کسی اور بنیاد پر کسی کا حق نہیں دبایا جائے گا۔ ہم نے یہ دستور اپنے لئے بنایا ہے اور اس دستور نے یہاں کے ہر بسنے والے کو یہ حق دیا ہے کہ وہ اپنا دستوری حق طلب کرے۔ ہمیں اس بات کا طعنہ کیوں دیتے ہو کہ پاکستان میں تو سیکولر دستور نہیں ہے ہم نے پاکستان بننے سے پہلے پاکستان کی مخالفت کی ہم آخر تک تقسیم وطن کے خلاف

رہے لیکن جب کہ پاکستان ایک ملک بن گیا ہے ہم بھی کہتے ہیں کہ پاکستان والے اپنے ملک میں خوش رہیں ان کے کسی فعل کی ذمہ داری ہم پر عائد نہیں ہوتی ہم پر تو صرف اپنے فعل کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ ہم نے ایک سیکولر جمہوری نظام کو اپنایا ہے یہاں کا ہر بسنے والا برابر کا حق رکھتا ہے۔ جب یہ حقیقت ہے تو ہم جائزہ لیں کہ پارلیمنٹ میں جو قانون بنا وہ ہم پر کسی کا رحم و کرم نہیں ہے۔ وہ ہندوستان کی وہ تاریخ ہے جس کے پیچھے اگر جلیانوالہ باغ ہے تو قصہ خوانی بازار بھی ہے۔ جب بات یہ ہے تو کوئی طعنہ نہیں دے سکتا کہ مسلمان مطالبات کی بحث کیوں کرتا ہے۔ ہر شخص کو ٹھنڈے دل سے غور کرنا ہوگا کہ ۱۴½ فیصدی تو بہت ہوتے ہیں اگر کوئی ۴½ آدمیوں کا معمولی سا فرقہ بھی ہے تو اُسے بھی حق ہے کہ وہ اپنے حق کے لئے آواز بلند کرے اور اُسے اس کا حق دینا ہوگا۔

تاریخ دہرائی جارہی ہے

وقت آگیا ہے کہ تاریخ کے اس موڑ پر ہم کھل کر بحث کریں کہ ملک کی آزادی کو ۴۸ برس گذر گئے ہیں لیکن مسلمان اور مسلم اقلیت مسلسل پریشان ہے ہم پوچھنا چاہتے ہیں کہ آخر کیوں؟

پریشانی کا علاج

اس مسلسل پریشانی کو دور کیا جاسکتا ہے۔ آیئے غور کریں کہ کس طرح اس کے دو پہلو ہیں۔ ایک بات کا تعلق آپ سے ہے اور دوسری بات کا تعلق برادران وطن سے ہے۔

جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے ان کا اپنا ایک ذہن ہے اور وہ ذہن یہ ہے کہ یہ ہمارا بھی اسی طرح وطن ہے اور اس ملک پر ہمارا بھی اتنا حق ہے جتنا کسی دوسرے کا جس طرح ان کو رہنے کا حق ہے اسی طرح ہم کو بھی رہنے کا حق ہے۔ اس سلسلہ میں میں ایک مثال دیا کرتا ہوں اس سے پہلے بھی یہ مثال میں عرض کر چکا ہوں لیکن بات کو سمجھنے کے لئے یہ بات بہت ضروری ہے اس لئے عرض کرتا ہوں۔ یہ میرا جسم ہے اس کے بہت سے حصے ہیں۔ پیر ہیں۔ ہاتھ ہیں۔ سر ہے۔ دل ہے۔ دماغ ہے جگر ہے۔ ہر ہر حصہ کا اپنا اپنا مقام ہے۔ بلاشبہ سر کو یہ حق ہے کہ وہ کہے میں سب سے اوپر ہوں۔ دل کو یہ حق ہے کہ وہ کہے کہ میرے دم سے خون کی گردش کا نظام باقی ہے۔ دماغ کو حق ہے کہ وہ دعویٰ کرے کہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت تو مجھی سے قائم ہے۔ ہاتھ پیروں کو حق ہے کہ وہ اپنا اپنا راگ گائیں لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ یہ سب خوبی اور بڑائیاں اسی وقت تک ہیں جب تک کہ یہ تمام اعضاء ایک دوسرے سے وابستہ اور ایک جسم میں پیوست ہیں بلکہ اس جسم کی حالت تو یہ ہے کہ ایک معمولی سے ناخن میں ایک پھانس چبھ جاتی ہے تو دیکھو کیا حال ہوتا ہے نہ دل کو چین ہے نہ دماغ کو سکون نہ ہاتھ کو راحت ہے۔ نہ پیر کو آرام سارا جسم ہی اس درد سے بے چین رہتا ہے۔ بس اس ملک کی مثال بھی ایک جسم کی مثال ہے اس میں رہنے بسنے والے اس کے ہاتھ پیر دل دماغ ہیں۔ ہمارے ہندو بھائی شوق سے اس جسم کا اپنے کو دل دماغ کہہ لیں۔ اس کے ہاتھ پیر بن جائیں۔ لیکن یہ یاد رکھیں کہ اگر ناخن کے برابر بھی کسی اقلیت کے سینہ میں ذراسی پھانس چبھنے لگی تو وہ بھی چین اور آرام محسوس نہ کریں گے۔ ہمیں یہ شوق نہیں کہ ہم اس جسم کے دل و دماغ کہلائیں۔ اپنی بڑائی جتائیں۔ لیکن ہم ضرور بتادینا چاہتے ہیں کہ ہم کو کیا ہم سے کم اقلیت کو بھی کوئی تکلیف پہونچے گی تو سارا جسم اس وقت تک درد میں مبتلا رہے گا جب تک اس پھانس کو نکال نہ دیا جائے گا۔ آج ہم یہی کہہ رہے ہیں کہ ہمیں ان ۴۸ سالوں میں مسلسل پریشانی کا سامنا کرنا پڑا ہے ان پریشانیوں کو دور کیا جائے ورنہ سارا جسم درد اور بے چینیوں میں مبتلا رہے گا۔ اس درد کا علاج ڈھونڈنا ہوگا۔ اس تکلیف کو دور کرنا ہوگا۔

حبّ وطن

یہ دیش ہمارا دیش ہے یہ ملک ہمارا ملک ہے اس کے ذرہ ذرہ سے ہم کو محبت ہے اس وجہ سے محبت ہے کہ وطن کی محبت ہمارا مذہبی فریضہ ہے میرا مذہب مجھے بتاتا ہے کہ وطن کی محبت ایمان کا جزء ہے۔ ایک حدیث میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب ہجرت فرمارہے تھے تو شہر مکہ معظمہ کی طرف بار بار دیکھتے جاتے تھے اور فرماتے جاتے تھے کہ اے مکہ تو مجھے اتنا عزیز ہے کہ اگر میری قوم مجھے نہ نکالتی تو میں تجھے ہرگز نہ چھوڑتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ وطن سے محبت رکھنا ایمان کی علامت ہے اس لئے میں کہتا ہوں کہ ہمیں سوچنے کا ڈھنگ بدلنا ہے ہمارا ملک آزاد ہے۔ آج اقلیت کی درخواست رحم و کرم کی درخواست نہیں ہے۔ ہم کسی سے بھیک نہیں مانگ رہے ہیں ہم اپنا حق مانگ رہے ہیں۔ ہر شہری کو ہر ایک چھوٹے بڑے کو ہر افسر کو یہ حق ہے کہ وہ اپنا جائز حق مانگے۔ ہمیں اپنے حق کو حاصل کرنے کے لئے کچھ طاقت بنانی ہے وہ طاقت توپ اور بندوق کی طاقت نہیں ہے۔ وہ اٹیم بم اور راکٹ یا میزائل کی طاقت نہیں ہے۔ وہ طاقت ہے اس دل کی یاد رکھیں جس کے پاس دل کی طاقت ہے اُسے کوئی طاقت نہیں دبا سکتی۔

اسی طاقت سے ہمیں اپنے حقوق کی کے لئے لڑائی لڑنی ہے۔ اس ملک کے تمام معاملات کا ہم سے تعلق ہے۔ اس ملک میں اگر کوئی کمزوری ہے تو ہم اُسے دور کریں گے۔

ہم تماشائی بن کر اس کا تماشا نہیں دیکھیں گے۔

گاندھی جی کے آخری ایّام — دہلی میں

حضرت مجاہدِ ملّت رحمۃ اللہ علیہ کا ایک مقالہ

گاندھی جی کا حادثۂ قتل آخری جنوری ۱۹۴۸ء میں پیش آیا۔ اُن کی زندگی کے آخری ایام دہلی میں گذرے اور حضرت مولانا حفظ الرحمن صاحبؒ کو ان ایام میں گاندھی جی سے بہت قرب حاصل رہا۔ اسی لئے ہفتہ وار بیداری مالیگاؤں نے مولانا مرحوم سے فرمائش کی تھی کہ آپ اس عنوان پر کچھ تحریر فرمائیں۔ اس فرمائش کی تعمیل میں حضرت مولانا نے جو مختصر مقالہ مجھے املاء کرایا تھا وہ بعد میں مدینہ اور الجمعیۃ میں شائع ہوا۔ اس کی ایک نقل اب تک میرے پاس محفوظ تھی جو آج خود مجاہد ملت نمبر میں شائع کی جا رہی ہے...... اس لئے کہ اس سے ۱۹۴۷ء کی زندگی اور شب و روز کا نقشہ کچھ یاد آجاتا ہے۔

"سید انیس الحسن"

مہاتما گاندھی ایک انسان تھے۔ لیکن عام انسانوں کی سطح سے بہت بلند! قدرت نے اُن کی طبیعت میں جو انمول خوبیاں کوٹ کوٹ کر بھری تھیں آج دنیائے انسانیت اُن کے بیان کی محتاج نہیں ہے۔

مہاتما گاندھی آج ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں۔ وہ دنیا سے رخصت ہوچکے ہیں لیکن اُن کی زندگی کا کوئی گوشہ ہماری نظر سے پوشیدہ نہیں ہے۔ اُن کا مقصدِ حیات اور وہ مشن جس کو انہوں نے اپنی زندگی کا نصب العین قرار دیا تھا آج ہمارے سامنے پوری طرح روشن ہے۔

اُن کی زندگی ایک ایسی کھلی کتاب ہے جس کا کوئی ورق، کوئی صفحہ، کوئی سطر اور کوئی لفظ پوشیدہ اور مخفی نہیں۔ وہ جو کچھ بھی تھے اور جیسے کچھ بھی تھے! اچھے یا برے! کھرے یا کھوٹے! دنیا کے سامنے اپنی صاف اور صحیح شکل میں کھڑے ہیں، اور اب کوئی بھی لاگ لگاؤ کے بغیر بہت آسانی کے ساتھ فیصلہ کر سکتا ہے کہ گاندھی جی کیا اور کیسے تھے۔!

یوں تو گاندھی جی کی پوری زندگی ایک عظیم الشان مقصد اور ایک پاکیزہ مشن کو کامیاب بنانے میں گذری، لیکن اُن کی زندگی کا سب سے بہتر اور قیمتی دور جو قربانی، خدمت، ایثار اور فداکاری کے اعتبار سے اُن کی عمر بھر کی قربانیوں پر بھاری ہے، وہ اُن کے آخری ایام زندگی ہیں جو انہوں نے دہلی میں گذارے!

عمر و سن کے اعتبار سے اُن کا یہ زمانہ اگرچہ بڑھاپے کا زمانہ تھا لیکن بڑھاپے کے ان ایام میں اُن کی فطری اور طبعی صلاحتیں اور خوبیاں اپنے پورے شباب پر آگئی تھیں! عمر بھر اگر وہ اپنے مشن کے لئے سخت سے سخت آلام و مصائب کا مقابلہ کرتے رہے اور ہر دشوار گذار منزل سے گذرتے رہے تو ان آخری ایام میں انہوں نے ایک عظیم الشان مقصدِ حیات کو کامیاب بنانے کے لئے اپنے ترکش کا آخری تیر بھی چھوڑ دیا۔ یعنی اپنی جان عزیز کی باری لگائی اور آخر کار جان دے کر اپنے مشن کو کامیاب بنایا اور دنیا نے دیکھ لیا کہ گاندھی جی اپنی جان دے کر کروڑوں انسانوں کے لئے صلح و آشتی کی جیتی جاگتی تصویر چھوڑ گئے۔

کمڑ ڈروں نفوس پر مشتمل ایک قوم جو اپنے اعمال سے خودکشی کی تیاریاں کر چکی تھی، راہ بھول چکی تھی، اور بھٹک چکی تھی، اور ہر طرح تباہی کے کنارے پہونچ چکی تھی، گاندھی جی اپنی جان دے کر اس بڑی قوم کو انصاف اور سچی انسانیت کی راہ دکھلا گئے۔ انہیں زندہ رہنے کے گر بتا گئے اور زندگی کے اصول سمجھا گئے۔

آہ! جانے والے! خدا تجھے تیرے احسانات کا بدلہ دے۔!

مجھے یوں تو 1919ء سے کانگریس کے ناتہ کے باعث گاندھی جی سے تعلق رہا ہے اور ان کی رہنمائی میں مسلسل کام کرنے کا موقعہ ملا ہے۔ لیکن ان آخری ایام میں جب وہ دہلی میں رہے حالات نے مجھے ان سے بہت ہی قریب رکھا تھا۔ ان دنوں روزانہ اُن سے ملنے، ساتھ رہنے، گھنٹوں گفتگوئیں کرنے کا موقعہ ملا۔ اور خلوت وجلوت میں اُن کی بلند اخلاقی، صاف دلی، اور ہندوستان کے تمام باشندوں سے یکساں محبت کی سچائی کا جو اثر مجھ پر اور میرے محترم ساتھی حضرت مولانا احمد سعید صاحب پر ہوا اُس کے بیان وتشریح کے لئے بڑی ہمتیں درکار ہیں۔

یہ بھی ایک عجیب اتفاق ہے کہ مہاتما جی کی زندگی کا جو سب سے زیادہ بہترین اور قیمتی دور تھا وہی ہندوستان کی تاریخ کا سب سے بدتر اور شرمناک دور بھی تھا ملک کی یہ حالت تھی کہ اچھے اچھے سنجیدہ دماغ وقت کی رو میں بہہ چکے تھے، انسانی خون کی وہ ارزانی تھی جو دیکھنے اور سننے میں نہیں آتی۔ کشت وخون کا بازار اس قدر گرم تھا کہ کبھی نہ ہوا گا۔ انسانوں کے ہاتھوں پر بربریت اور درندگی کا وہ بھوت سوار تھا کہ معصوم بچپن ہو، یا دلعزیز جوانی، قابل رحم اور ناتواں بڑھاپا ہو یا عصمت دہائی کا واسطہ دے کر امان وپناہ چاہتی ہوئی بے بس نسوانیت! خونخوار انسانوں کی تیغ تیز سب پر برابر چلتی چلی جاتی تھی! آناً فاناً چند ہی دنوں میں سرزمین ہند کا ایک بڑا حصہ خون انسانیت سے لالہ زار ہو چکا تھا۔ اور کونسا گناہ تھا جو ان دنوں ہندوستان کی زمین پر خدا اور خود کو بھولے ہوئے انسانوں سے سرزد نہیں ہوا۔ شاید انسانی جرأت دیدہ دلیری اور بے رحمی اِس سے بھی زیادہ ترقی کبھی نہ کرسکے!

گاندھی جی ان دنوں بنگال سے فارغ ہوکر بہار کے مظلوم وستم رسیدوں کی اشک شوئی و درماں کے لئے گاؤں گاؤں کی خاک چھان رہے تھے کہ یکایک دہلی کی آہیں اور کراہٹ کی صدائیں اُن کے کانوں تک پہونچ گئیں اور اُن کے دل کو تڑپا گئیں۔ فوراً مضطر ہوکر دہلی پہنچے۔

سب سے پہلے جب وہ اسٹیشن پر آئے تو خود اُن کا بیان ہے کہ مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ دہلی میں ایسا حادثہ پیش آیا ہے۔ سردار پٹیل مجھے لینے کے لئے اسٹیشن آئے تھے اُن کا چہرہ اُترا ہوا تھا اور خلاف معمول انہوں نے ملتے ہی اپنی ظرافت آمیز باتیں نہیں کیں! تب مجھے اندازہ ہوا۔

دہلی پہونچکر گاندھی جی برلا ہاؤس میں ٹھیرے۔ اس قیام کے دوران میں سب سے پہلی ضرورت یہ تھی کہ گذرے ہوئے حوادث ان کو دکھائے جائیں اور واقعات کی پوری نوعیت اُن کو بتائی جائے۔

میں پہونچا۔ واقعات سنائے اور پھر ان کو وہ تمام پناہ گزین دکھلائے جو پہاڑ گنج قرولباغ، سبزی منڈی اور دوسری جگہوں سے ظلم وستم اور لوٹ مار کا شکار ہوکر اپنی جانیں بچاکر آگئے تھے اور جامع مسجد، مدرسہ حسین بخش، عیدگاہ، پل بنگش، کوچہ چیلان، نظام پیلیس میں پناہ گزین ہوگئے تھے اور زبان حال سے اپنی دردناک تباہی کی داستان سنا رہے تھے۔

پہاڑ گنج، سبزی منڈی، قرولباغ وغیرہ کی المناک تباہی کے تمام مناظر: دکھلائے، فساد کا شباب تھا، بے گور وکفن لاشیں، خاکستر شدہ عظیم الشان عمارتیں اور برباد شدہ عبادت گاہیں ان کو دکھلائیں۔

گاندھی جی صرف ایک بڑے لیڈر ہی نہیں تھے اور نہ انہوں نے ان تمام مناظر کو محض ایک بڑے لیڈر کی طرح دیکھ کر معاملہ کو یہیں تک ختم کردیا بلکہ وہ تمام انسانیت کے ایک بہت بڑے ہمدرد تھے، انہوں نے دل کی ایسی ہمدردی کے ساتھ ان تمام مناظر کو دیکھا اور واقعات کو سنا گویا تمام تباہی وبربادی خود ان کے گھر کی ہو رہی ہے!

چنانچہ واقعات کی یہ تصویریں اُن کے دل پر نقش ہوگئیں! اور پھر انہوں نے اس کے علاج کے لئے وہ سب کچھ کیا جو شاید ہزاروں اور لاکھوں انسانوں سے نہ ہوسکتا!

جہاں کہیں کوئی حادثہ ہوا وہ خود پہنچے۔ ظالموں کو بھی سمجھایا اور انہیں ظلم سے رکنے کی تلقین کی اور دوسری طرف مظلوموں کی دلداری کی۔ خود جا جا کر اُن سے ملے۔ اُن کی تکالیف معلوم کیں اور پھر بے چین ہوکر اُن کا انتظام کرایا۔

گاندھی جی جب سے دہلی آئے تھے اُس دن سے اُن کی زندگی کے آخری دن تک حضرت مولانا احمد سعید صاحب نائب صدر جمعیۃ العلمائے ہند، میں اور مسٹر سید محمد جعفری رکن مجلس عاملہ جمعیۃ العلمائے ہند اور حافظ محمد نسیم صاحب ٹن والے ان کے پاس جایا کرتے تھے۔ وہ ہم سے ہر روز نئے واقعات کی پوری تفصیل پوچھتے اور پھر اُن کو نوٹ کرکے ضروری بند وبست کراتے۔

ہماری روزمرہ آمد ورفت کے نتیجہ میں انہوں نے ابتدائی دو ہفتوں کے بعد مجھ سے فرمایا کہ میں اگرچہ تم سے پہلے سے بھی واقف ہوں اور دوسرے ساتھیوں سے بھی کچھ نہ کچھ واقفیت ہے تاہم ان حالات میں دماغی توازن کو باقی رکھتے ہوئے جس طرح آپ حضرات نے معاملات میں مبالغہ اور رنگ آمیزی کے بغیر مجھ کو صحیح اطلاعات بہم پہنچائیں۔ بلکہ واقعات سے ایک حد تک کم۔ چونکہ مجھے اپنے دوسرے خصوصی ذرائع سے اس کا اندازہ ہوگیا ہے اس لئے میں مجبور ہوں کہ دہلی کے حوادث سے متعلق آپ ہی لوگوں پر پورا بھروسہ کروں۔

اور پھر (چونکہ ترجمانی اکثر میرے سپرد رہتی تھی) میری طرف ہنستے ہوئے مخاطب ہوئے اور فرمایا کہ آپ کو روز روز کا حساب روز دینا پڑے گا اور دیکھئے یہ خیال کر کے کہ میرا دل دکھی ہوگا آپ کسی بات کو چھپاتے نہیں۔"

ہماری روزمرہ کی آمد و رفت کے باعث گاندھی جی نے ہم پر سے ملاقات کی پابندیاں اٹھالی تھیں اور پھر وقت بے وقت ملاقات کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ گاندھی جی دن کے گیارہ بجے سے ایک بجے تک آرام کیا کرتے تھے ہمارے جانے کا طریقہ یہ تھا کہ ہم اکثر آرام کے وقت سے قبل اور کبھی بعد میں بھی جایا کرتے تھے۔

اُن کی ان تمام ملاقاتوں میں یوں تو ہر دن اُن کی بلند اخلاقی اور تمام انسانوں کے لئے خواہ وہ کسی فرقہ سے تعلق رکھتے ہوں اُن کی دلی ہمدردی اور دلسوزی کے نقشے دل پر نقش ہوتے جاتے تھے لیکن یہ واقعہ عمر کے آخری حصہ تک بھی نہیں بھلایا جاسکتا کہ جب دہلی کے مسلمانوں پر گذرے ہوئے حوادث و واقعات کو انہوں نے دیکھا اور سنا تو ایک دفعہ ایک اہم گفتگو کے بعد (جس میں پنڈت نہرو، مولانا آزاد اور سردار پٹیل بھی شریک تھے) انہوں نے ہم سے فرمایا کہ آپ نہایت اطمینان سے لکھنؤ کانفرنس میں جائیے اور پھر آپ کی واپسی کے ایک آدھ ہفتہ بعد میں آپ کو کوئی صحیح جواب دے سکوں گا۔

لکھنؤ کانفرنس سے واپسی پر جب ہم پہلی مرتبہ پہونچے تو وہ بے حد خوش اور مسرور نظر آتے تھے بار بار کانفرنس کی کارروائیوں کو پوچھتے اور سن سن کر خوش ہوتے تھے۔ کانفرنس کی کامیابی پر مبارکباد دی اور فرمایا جو کچھ ہوا میری خوشی کے مطابق ہوا ہے۔!

غالباً اس کے بعد جب ایک اتوار کو ہم ملنے گئے تو کوئی خاص بات پیش نہ آئی اور حسب معمول ملاقات کے بعد واپس چلے آئے۔ پیر کا دن چونکہ مہاتما جی کی خاموشی کا دن ہوتا تھا اس لئے ہم خاص صورتوں کے سوا وہ پیر کو نہیں جاتے تھے۔ کہ اچانک اس پیر کو پرارتھنا سبھا میں سنا کہ مہاتما جی نے مرن برت رکھنے کا اعلان کیا ہے۔ اگلے روز جب ہم پہونچے اور مولانا آزاد کی موجودگی میں ہم نے گلہ و شکوہ کیا کہ آپ نے ہمیں اطلاع کئے بغیر ایک ایسا اہم قدم اٹھایا ہے جس سے دوسری قسم کے خطرات بھی پیدا ہوسکتے ہیں اور پھر یہ کہ آپ کی زندگی تنہا آپ کی زندگی نہیں ہے۔ بلکہ آپ کی زندگی ہمارے اور انسانی خدمت و محبت کے لئے ایک بیش بہا زندگی ہے

اس پر انہوں نے تبسم فرمایا۔ میں نے ہندوستان کے دونوں حصوں میں حیوانیت کا جو نقشہ دیکھا اور سنا اور پھر دہلی میں جو کچھ گذرا اس کو دیکھ کر میری آنکھیں شرم سے نیچی تھیں۔ میں سر اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا تھا۔ مجھے محسوس ہوتا تھا کہ ہندوستان کے دونوں حصے اپنی حیوانیت سے ہندو دھرم اور اسلام کو جو نقصان پہونچا رہے ہیں دنیا کی آنکھیں اس کو بھلا نہیں سکیں!

آج میں خوش ہوں، آنکھ اٹھانے کے قابل ہوں اور فخر کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ میرے پاس فقط ایک جان ہے۔ آج میں ہندو مسلمانوں میں محبت پیدا کرنے اور اُن کے دلوں کو ملانے کے لئے اور فتنہ فساد کے تمام رشتوں کو ختم کر دینے کے لئے اپنی جان کی بازی لگا چکا ہوں۔ میں یہی کر سکتا تھا۔ اس سے زیادہ میرے پاس کچھ نہیں ہے۔

گاندھی جی نے اپنی زندگی میں بار بار برت رکھا مگر اس دفعہ کے مرن برت کی شان سب سے ممتاز اور سب سے بڑھ کر تھی ہمارے علاوہ گاندھی جی کے تمام ہی مقربین اور مخلصین نے اُن سے یہ سفارش کی کہ وہ اپنا ارادہ بدل دیں لیکن گاندھی جی فرقہ واریت کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو اپنے جس مضبوط ارادے سے جان کی بازی لگا کر ختم کر دینے کا فیصلہ کر چکے تھے کوئی شکایت اور سفارش اُن کے اس ارادہ میں تزلزل پیدا نہ کر سکی۔

چند روز گذر گئے اور اُن کا مرن برت جاری رہا یہاں تک کہ اُن کی قوت اور صحت خطرہ کی طرف جانے لگی اور ملک کے ہر فرقہ اور ہر گوشہ میں اُن کی طرف سے تشویش پیدا ہوگئی۔ مسلمان بھی پریشان تھے اور غیر مسلم بھی!

اور آخر کار مولانا آزاد نے گاندھی جی کی خدمت میں پہونچ کر کہا کہ اگر ہم سب اور تمام ہندو، مسلمان، سکھ مل کر اپنے دلوں میں یہ طے کر لیں اور آپ سے بھی یہ وعدہ کریں کہ ہم اس مشن کو پورا کر دیں گے جس کے لئے آپ نے برت رکھا ہے تو پھر آپ کو برت کھول لینا چاہئے۔

اس پر مہاتما جی نے کہا! کہاں! اگر میں یہ دیکھ لوں گا کہ میری جان کے خوف سے نہیں بلکہ واقعہ میں دلوں کی صفائی اور سینوں کی اصلاح کے بعد ہندو، مسلمان، سکھ، سب مجھ سے پختہ وعدہ کریں گے کہ آئندہ وہ سب بھائی بھائی کی طرح رہیں گے اور جو کچھ ہوچکا اس کو دہرایا نہ جائے گا تو میں برت کھول دوں گا۔

اس کے بعد انہوں نے اپنے برت کو ختم کرنے کی سات شرطیں رکھیں کہ ان کو پورا کرنے کے لئے مجھے اطمینان دلایا جائے وہ ساتوں شرطیں اختصار کے ساتھ یہ ہیں!

(۱) دہلی کے مسلمانوں کو آزادی اور حفاظت کے ساتھ رہنے سہنے اور چلنے پھرنے کی آزادی ہو۔ (۲) پہاڑ گنج، قرول باغ، سبزی منڈی اور ان تمام علاقوں میں بھی اُن کو آنے جانے کی آزادی ہو جہاں آج وہ نہیں جا سکتے! (۳) دہلی کے جو مسلمان ان علاقوں سے برباد ہو کر چلے گئے ہیں اگر وہ آئیں اور پھر اپنے گھروں میں بسنا چاہیں تو ان کو مکانات واپس کر دئے جائیں گے اور اُن کو رہنے کی سہولتیں دی جائیں گی۔ (۴) تمام مسجدیں اور عبادت گاہیں خالی اور محفوظ کر دی جائینگی

(۵) ریلوے اور دوسری سواریوں میں گشت دخون کا سلسلہ ختم کر دیا جائیگا۔
(۶) اور پھر کسی پاداش میں اُن کا اقتصادی یا کسی طرح کا بائی کاٹ بھی نہیں کیا جائیگا۔
(۷) دہلی و نواح دہلی میں مسلمانوں کے جو مذہبی میلے ہوا کرتے تھے (جیسے قطب صاحب۔ مہرولی کا عرس) وہ آئندہ بھی حسب دستور ہو سکیں گے۔

ان شرائط کو دیکھئے ہر ہر شرط اور ہر ہر نکتہ گاندھی جی کی گہرائیوں سے ابھرنے والی اُس عام ہمدردی، محبت اور سب کی بہتری کے لئے یکساں تڑپ اور بے چینی کی ترجمانی ہے جو آج کسی دوسرے انسان کا حصہ نہیں۔ آخر کار سب نے گاندھی جی سے مل کر وعدہ کیا کہ ہم ان شرائط کو پورا کریں گے اور پھر ان کا برت کھلوایا گیا۔

دنیا نے دیکھا کہ گاندھی جی کے اس برت نے وہ کام کیا جو بڑی بڑی طاقتیں نہیں کر سکی تھیں۔ دہلی کی فضا میں غیر معمولی تبدیلی ہو گئی۔ حالات کا رنگ بالکل ہی بدل گیا۔!

ع ادھر سے اُدھر پھر گیا رُخ ہوا کا !

سرشکِ خوں

(اطہر صدیقی۔ دیوبند)

(مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمان کے سانحۂ ارتحال پر ایک تاثر)

زندگی ہے باعثِ غم وجہ اندوہ ملال
درس جو دیتا رہا مہر و محبت کا ہمیں

حسرت و حرماں کی یورش سے مٹا جاتا ہو نہیں
اُف وہ جاں بازِ وطن وہ نازشِ ہندوستاں

آہ کس کی موت سے اے اطہرِ غمگیں نوا
عمر بھر ٹوٹے دلوں کی جو صدا سنتا رہا

"آج ہر شئے میں کسی شئے کی کمی پاتا ہوں میں
نبضِ گیتی پر رہیں جس کی ہمیشہ انگلیاں

عزم و استقلال کا تھا جو کہ اک کوہِ گراں
چھین لی ہم سے اجل نے وہ متاعِ بے بہا

آہ وہ مردِ مجاہد، وہ وحیدِ روزگار
مدتوں روئیں گے جس کو آہ اب اہلِ وطن

وہ مفسرؔ، وہ مفکرؔ، وہ خطیبِ بے مثال
کون ہو گا غمزدوں کا اب رفیق و غمگسار

دردِ ملت سے جو رہتا تھا ہمیشہ بیقرار
کون سلجھائے گا اب گیسوئے دوراں کی شکن

کون ہو گا اب محافظ تیرا اے اردو زباں
فرصتِ یک لحظہ کس نے مانگ کر کے موت سے

کس کو ہو گی تیرے غم میں اتنی آشفتہ سری
چاک داماں کی ترے فرمائی تھی بخیہ گری

مشکلات دور کرنے کیلئے جدوجہد کرو لیکن مایوس نہ ہوں مایوسی سے عملی زندگی معطل ہو جاتی ہے

حکومت ہماری مشکلات دور کریگی، ہم بھیک نہیں اپنا حق مانگتے ہیں حکومت مجبور ہو کر ہمارا حق دیگی!

جمعیۃ علما ضلع گڑگانوہ کی مجلس عاملہ کے اجلاس میں حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی تقریر!

جمعیۃ علما کی ضرورت اور خدمات پر تبصرہ، میوؤں کی مشکلات دور ہونیکی یقین دہانی

۹ر اکتوبر ۱۹۵۲ء کو فیروز پور میں ضلع جمعیۃ علما کی مجلس منتظمہ کا ایک روزہ اجلاس ہوا۔ حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی آمد سے فائدہ اٹھا کر مقامی کانگریس نے حضرت مولانا کی تشریف آوری کی خوشی میں ایک عصرانہ دیا۔ جس میں مولانا موصوف نے ایک تقریر بھی کی مجلس منتظمہ کے جلسہ میں میوؤں کے متعلق کئی قرار دادیں بھی منظور کی گئیں۔ مشکل کو دور کرانے کے لئے میدان میں اتر جاؤ۔ شکایت کرو ضرور۔ ارشاد باری ہے لاتیئسو من روح اللہ (یعنی اللہ کی مہربانی سے مایوس نہ ہو۔ یہ الفاظ حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے سپاسنامہ کے جواب میں کہے۔

تقریر شروع کرتے ہوئے حضرت مولانا نے جلسہ میں اپنی موجودگی پر اظہار مسرت کیا اور کہا کہ میرا جی چاہتا تھا کہ آج ۱۹۴۷ء سے ابتک کی ساری کہانی آپ کو سناؤں کیونکہ اس طرح ہم آنے والے زمانہ کے لئے ایک راہ عمل متعین کر سکیں گے تاریخ اسی کا نام ہے۔ قرآن نے پچھلے واقعات کو اسی نقطہ نظر سے بیان کیا۔ تاریخ اسی لئے بیان کی جاتی کہ انسان اس سے سبق حاصل کر کے اپنے مستقبل کو روشن کرے

مولانا نے فرمایا مجھے یاد ہے کہ سب سے پہلے جس وقت میں فیروز پور جھرکہ پہنچا اس وقت میں آپ میں بہت کم لوگوں سے واقف تھا لیکن جب میں نے سنا کہ میوات میں گولیاں چل رہی ہیں تو مجھ سے نہ رہا گیا اور ناواقفیت کے باوجود جیپ میں بیٹھ کر یہاں پہنچ گیا۔ میں نے اس وقت دیکھا کہ یہاں چاروں طرف لاشیں نظر آ رہی ہیں۔ اس وقت مجھے لوگوں نے یہاں آنے سے روکا تھا لیکن میرا احساس فرض مجھے یہاں کھینچ لایا۔ یہ واقعات میں نے صرف اس لئے بیان کیے کہ آپ مجھے نیا نہ سمجھیں کہ آپ کی حالت اور مشکلات سے واقف نہیں ہوں۔ آپ کی تمام مشکلات اور سارے حالات کا مجھے علم ہے اور ان کو دور کرنے میں میں اور میرے ساتھی برابر کوشش کرتے رہے ہیں۔ خدا کے فضل سے حالات پہلے سے بہتر ہو گئے ہیں۔ آپ نے میرے اور میرے ساتھیوں کی آمد پر سپاسنامہ پڑھا۔ اس کے لئے میں آپ کا شکر گذار ہوں۔ یہ بات میں رسمی طور پر نہیں کہتا بلکہ اپنے قلبی جذبات کا اظہار کرتا ہوں اور خدا سے دعا کرتا ہوں کہ آپ نے میرے متعلق جس حسن ظن کا اظہار کیا۔ وہ مجھے ویسا ہی بنا دے۔

میری زندگی کا ایک مشن ہے میں کہتا ہوں کہ اپنی مشکلات بیان کرو۔ انکو دور کرنے کے لئے میدان میں اتر جاؤ۔ شکایات کرو۔ اپنی مشکلات ضرور بیان کرو لیکن مایوس نہ ہو مایوسی کا تصور بھی نہ آنے دو۔ مایوسی موت ہے۔ مایوسی سے عملی زندگی معطل ہو جاتی ہے۔ لاتیئسو من روح اللہ۔ اللہ کی مہربانی سے مایوس نہ ہو۔ یہ ٹھیک ہے کہ آپ دکھی ہیں۔

سپاسنامہ میں چودھری صاحب وغیرہ نے جو کچھ کہا وہ سب سر آنکھوں پر ہے۔ مگر ناامید نہ ہوجئے۔ حالات بہت بہتر ہو گئے ہیں۔ حالات بہت کچھ بدلے ہیں اور بہتر ہو گئے ہیں۔ خدا کے فضل سے ہم بہت آگے بڑھ چکے ہیں ہم نے پچھلے حالات میں صرف کھانا پینا اور عیش کرنا سیکھا تھا لیکن حالیہ واقعات سے ہمیں ایک جھٹکا سا لگا۔ ہماری آنکھیں کھل گئیں۔ ہم نے صبر و استقلال کی مثال پیش کی کہ آنے والی نسلیں ہمیں ہمیشہ یاد رکھیں گی اور عزت و احترام سے ہمارا نام لیں گی۔

ہندوستان کی ریڑھ کی ہڈی

مولانا نے ۱۹۴۷ء کے واقعات کا ذکر کرتے ہوئے میواتیوں کو یاد دلایا کہ گاندھی جی نے گھاسیڑے کے میدان میں گوپی چند بھارگو سے کہا تھا کہ میو ہند کی ریڑھ کی ہڈی ہیں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کی اہمیت کو گاندھی جی نے بھی تسلیم کیا تھا۔ اور آپکی امداد بحالی کو وہ بھی بہت اہم سمجھتے تھے۔ اور اسپر زور دیتے تھے۔ گاندھی جی کے اس قول نے جتنا اثر کیا وہ کسی سے چھپا ہوا نہیں ہے۔ آج اسے آپ بھی محسوس کر رہے ہیں۔ گاندھی جی اور کانگریس کی خدمات کا اقرار کرنا چاہئے۔ بہت کچھ ہوا۔ اور بہت کچھ ہونا

باقی ہے۔ جو کچھ ہونا باقی ہے، وہ ہو کر رہیگا انشاء اللہ تعالےٰ۔ مگر آپ ہمت نہ ہاریں کسی اور طرف نہ دیکھیں۔ پاکستان کی طرف نظر نہ اٹھائیں۔ حکومت ہماری مشکلات دور کریگی۔ یہ بات صرف ہمارے لئے نہیں بلکہ سارے ملک کے لئے ضروری ہے۔ ہم بھیک نہیں مانگتے کوئی ہمارا آقا نہیں، ہم خود آقا ہیں۔ ہم اپنا حق مانگتے ہیں۔ حکومت مجبور ہو کر ہمیں ہمارا حق دیگی۔

مسجدوں کا مسئلہ

آپ اپنی بات کہتے ہیں میں دہلی کے واقعات بتاتا ہوں وہ تو راجدھانی ہے۔ جہاں دنیا بھر کے ملکوں کے سفیر بیٹھے ہیں۔ وہاں بھی بعض مساجد مقفل ہیں لیکن میں مایوس نہیں ہوں نقشہ میں بارہ آنے رنگ بھرا جا چکا ہے۔ چار آنے رنگ بھرنا باقی ہے۔ جب میں اس بات کو دیکھتا ہوں تو میری ڈھارس بندھ جاتی ہے۔ اور ہم خدا کے فضل پر بھروسہ کرتے ہوئے اپنے وزیر اعظم اور اپنی سیکولر حکومت کے قانون کی بناء پر امید رکھتے ہیں کہ ایک دن ایسا آئیگا جب ہم اپنے حالات پر پورا قابو پالیں گے میں آپکو یقین دلاتا ہوں کہ آپکی مشکلات کا احساس محکمہ بحالیات کو بھی ہے۔ اور وزیر اعظم کو بھی لیکن جس طرح ہمیں کچھ مشکلات درپیش ہیں۔ اسی طرح حکومت کے راستے میں بھی مشکلات حائل ہیں ہمیں امید ہے کہ یہ مشکلات بہت جلد دور ہو جائینگی

جمعیۃ علماء کی تنظیم

جمعیۃ علماء کا ذکر کرتے ہوئے حضرت مولانا نے فرمایا ۱۹۴۷ء کے بعد ملک میں مختلف جماعتیں تھیں۔ میں نے جمعیۃ علماء کے سکریٹری کی حیثیت سے اور ایک مسلمان کی حیثیت سے کئی دن اور کئی راتیں اس فکر میں گذار دیا کہ بدلے ہوئے حالات میں مسلمانان ہند کے لئے جمعیۃ علماء سے بہتر کوئی جماعت ہو سکتی ہے۔ میں دیانت داری کے ساتھ اس نتیجہ پر پہونچا کہ آج کل کے حالات میں مسلمانان ہند کے لئے جمعیۃ علماء سے بہتر کوئی جماعت نہیں ہو سکتی۔ غور کیجیے اگر مسلمان کسی فرقہ پرست جماعت میں شامل ہوں گے۔ تو اکثریت میں فرقہ پرستی بڑھے گی۔ اور نئے نئے شبہات پیدا ہوں گے۔

بدلے ہوئے حالات میں فرقہ پرستی کی کوئی گنجائش نہیں۔ آج کے حالات میں ایسی کوئی جماعت کامیاب نہیں ہو سکتی اکثریت میں بعض فرقہ پرست جماعتیں ہیں لیکن اگر مسلمانوں نے بھی یہ راستہ اختیار کیا تو یہ جماعتیں زیادہ مضبوط ہو جائینگی غرض جس لحاظ سے بھی سوچئے سیاسی پارٹیاں سب فرقوں کی مشترک ہونی چاہئیں البتہ مختلف فرقوں کی الگ الگ مذہبی اور ثقافتی جماعتیں بن سکتی ہیں۔ ہندوستان کے دستور نے ہمیں اس کی اجازت بھی دی ہے کہ مذہبی تعلیم کی حفاظت کے لئے اپنی علیحدہ مذہبی جماعتیں منظم کریں۔ ان حالات کے پیش نظر جمعیۃ علماء پر غور کیجئے اس کا ایک شاندار ماضی ہے۔ زمانہ حال میں اس کے سامنے ایک جامع پروگرام ہے جمعیۃ علماء نے جنگ آزادی میں حصہ لیا ہے۔ اس کا ماضی بہت تابناک ہے۔ اسکی خدمات بہت درخشاں ہیں اس پر فرقہ پرستی کا الزام نہیں لگایا جا سکتا۔ اگر کوئی شخص ایسا کہتا ہے تو اسے حماقت سمجھنا چاہئیے۔ سمجھدار آدمی جانتے ہیں کہ یہ جماعت جو کچھ کہتی ہے فرقہ پرستی کے جذبہ سے نہیں کہتی بلکہ ملک کی تعمیر اور استحکام کے جذبہ سے کہتی ہے۔

وقف بل

اس کے بعد حضرت مولانا نے جمعیۃ علماء کی خدمات پر روشنی ڈالی اور ایک مبسوط اور مدلل تبصرہ میں بتایا کہ وقف بل پارلیمنٹ میں منظور کرالیا گیا ہے جناب صدر جمہوریہ کی منظوری کے بعد ایکٹ بن چکا ہے۔ مشرقی پنجاب میں وقف بل کے نفاذ سے آپکی تمام تعلیمی اور سماجی مشکلات دور ہو جائیں گی۔ اس کی آمدنی سے آپ کے بہت سے مسائل حل ہوں گے اوقاف کی آمدنی بربادی سے محفوظ رہیگی۔ اور آپکی تعلیمی اور دوسری ضروریات کے کام آئے گی۔ وقف بل کے نفاذ سے زمین کے مسئلہ کے سوا مساجد اور اوقاف کے مسائل حل ہو جائیں گے۔

آپ نے بڑھتی ہوئی پارٹی بازی کی مذمت کی۔ اور اس کے نقصانات پر روشنی ڈالی آپ نے فرمایا۔ صرف نکتہ چینی سے مشکلات دور نہیں ہو سکتیں اپنے دماغ کو صاف کرکے خلوص سے مذہبی اور قومی خدمت کرنے کی ضرورت ہے آپ جس مشترک سیاسی جماعت میں چاہیں شامل ہوں لیکن مذہبی تعلیم اور اوقاف کی تنظیم کے کام میں جمعیۃ علماء کا ساتھ دیں اور فرقہ پرست جماعتوں سے الگ رہیں۔ اس بات کا خیال رکھئے کہ ذاتی اغراض میں پھنس کر جماعتی زندگی کو نقصان نہ پہونچے آپ تعمیری نکتہ چینی کیجئے۔ اس کا خیر مقدم کیا جائے گا۔ لیکن تخریب نہ کیجئے اور اسے ناقابل معافی جرم سمجھئے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر آپ حضرات نے سر جوڑ کر کام کیا تو آپ اپنی مشکلات پر قابو پالیں گے۔ لیکن اگر آپ پارٹی بندی کے جھگڑوں میں الجھے رہے تو آپ سخت نقصان اٹھائیں گے۔

میں آپ سے پھر کہتا ہوں کہ آپ اپنی مشکلات ضرور بیان کیجئے۔ ان کو دور کرنے کے لئے جدوجہد بھی کیجئے۔ مگر مایوسی سے بچئے۔ اور مشکلات سے مغلوب نہ ہو جئے۔

دستور یہ ہند میں قومی زبان کے مسئلہ پر مولانا حفظ الرحمٰن کی زبردست تقریر!

صرف ہندستانی ہی اس ملک کی قومی زبان بن سکتی ہے مہاتما گاندھی کی بھی یہی خواہش تھی خود کانگریس بھی تیس سال تک اسی کا پرچار کرتی رہی

ہندی زبان صرف ایک طبقہ کو مرعوب کرنے کے لئے ٹھونسی جا رہی ہے

ہندی پریمیوں کی لچر دلیلوں کا مدلل جواب

"تیس سال تک کانگریس کے پلیٹ فارم سے یہ کہا جاتا رہا ہے کہ اس ملک کی زبان ہندوستانی ہوگی جو فرانٹیر تک شمالی ہندوستان میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اور زبان کا رسم الخط ہندی اور اردو ہوگا۔ مہاتما گاندھی بھی آخر تک اسی زبان کے حامی رہے لیکن آج میں یہ دیکھکر حیران ہوتا ہوں کہ ہم نے کانگریس کے اور مہاتما گاندھی کے اس اصول کو ٹھکرا دیا اور صرف ہندی زبان کو ملک کی قومی زبان بنانے پر زور دینے لگے" یہ تھے وہ الفاظ جو حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب ممبر دستور ساز اسمبلی نے پیر کے دن شام کو ۶ بجے تقریر کرتے ہوئے فرمائے۔

شام کے اجلاس میں ہندوستان کی قومی زبان کا وہ مسئلہ پیش ہوا جس پر پورے ملک کی آنکھیں لگی ہوئی تھیں اور جس نے پچھلے دنوں میں خصوصی اہمیت حاصل کرلی تھی۔

مولانا سے قبل جن دوسرے ممبران نے تقریریں کیں ان میں سیٹھ گوبند داس ہندی ساہتیہ سمیلن کے ممبر بھی ہیں اور مسٹر نذیر الدین احمد کے نام خاص طور سے "قابل ذکر ہیں" سیٹھ گوبند داس نے اُردو کے خلاف اپنے خیالات کا اظہار کیا اور یہ تسلیم کرتے ہوئے کہ وہ صرف مسلمانوں کی زبان نہیں ہے کہا کہ اس زبان میں بھیم ارجن کے ذکر کے مقابلہ میں سہراب اور رستم کا ذکر کیا گیا۔ مسٹر نذیر الدین احمد نے بنگالی یا سنسکرت کو قومی زبان بنانے پر زور دیا اور کہا کہ اگر سنسکرت زبان قومی زبان قرار پاگئی تو اسے سیکھنے میں ہندی اور غیر ہندی علاقوں والوں کو یکساں دشواری پیش آئیگی اور کسی کو کسی پر فوقیت حاصل نہ ہوگی۔

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی ترمیم یہ تھی کہ ہندوستان کی قومی زبان ہندوستانی ہونی چاہئیے۔ جو دیوناگری اور اُردو دونوں رسم الخط میں لکھی جائے۔

مولانا نے فرمایا، زبان کا مسئلہ سارے ملک میں خاص اہمیت اختیار کرگیا ہے کانگریس کی تیس سالہ جنگ آزادی میں جب کبھی یہ مسئلہ زیر بحث آیا تو تمام کانگریس میں اس پر متفق تھے لیکن میں یہ دیکھکر حیران ہوں کہ جس مسئلہ پر ہم کل تک متفق تھے۔ آج اس ایوان کے اندر بھانت بھانت کی بولیاں سننے میں آرہی ہیں۔ مہاتما گاندھی کے نزدیک چار باتیں سب سے زیادہ اہم تھیں ان میں سے ایک یہ زبان کا مسئلہ بھی تھا۔ ابتدا میں گاندھی جی ہندی ساہتیہ سمیلن کے ممبر رہے اور اسکو آگے بڑھانے کی کوشش کی لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ ہندی سے مراد وہ زبان نہیں ہے جسے وہ خود چاہتے تھے بلکہ وہ ایک ایسی زبان ہے جو اپنے دائرہ کو وسیع نہیں بلکہ اُسے تنگ کرتی ہے تو وہ اس سے الگ ہوگئے اور اعلان کیا کہ ہندی سے میرا مطلب اس زبان سے ہے جو شمالی ہندوستان میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اور جسے ہندو مسلمان اور سب لوگ سمجھتے ہیں۔ مہاتما گاندھی نے اس کے بعد ہندی اتھوا ہندستانی کی آواز بلند کی اور ہندوستانی پرچار سبھا کے ذریعہ اس زبان کو فروغ دینے کی جدوجہد شروع کردی۔

۳۰ جنوری ۱۹۴۸ء کے کمیانک حادثہ سے جبکہ مہاتما جی ہم سے چھین لئے گئے تین روز قبل انہوں نے دوران گفتگو میں مجھ سے فرمایا تھا کہ اب امن وامان ہوتا جارہا ہے جس طرح تم لوگوں نے قیام امن کے سلسلے میں میری امداد کی ہے۔ اسی طرح تمہیں ہندوستانی کے پرچار میں بھی ساتھ دینا ہوگا۔ اور ہم نے ان سے اس بات کا وعدہ کیا مگر افسوس وہ ہمیشہ کے لئے ہم سے رخصت ہوگئے۔

خیال تھا کہ مہاتما جی کے زبان کی خواہشات کا احترام کیا جائے گا۔ لیکن مجھے بہت زبردست حیرانی ہے کہ کل تک جو لوگ ہندوستانی کا پرچار کر رہے تھے۔ انہوں نے گاندھی جی کے اصول کو پس پشت ڈالدیا۔ اور آج وہ صرف ہندی کو ملک کی قومی زبان بنانے پر زور دے رہے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس معاملہ میں مہاتما گاندھی کا نام نہ لیا جائے۔ لیکن اس کے لئے میرا جواب یہ ہے کہ مہاتما گاندھی کے نزدیک زبان کا مسئلہ بنیادی اہمیت رکھتا تھا۔

مہاتما جی نے اس زبان کو کبھی ہندی نہیں کہا بلکہ ہمیشہ انہوں نے ہندوستانی کہا انہوں نے بڑی جستجو اور غور وخوض کے بعد یہ نام پسند کیا تھا۔ یہ ایسی زبان ہے۔ جسے قصبات اور دیہات تک میں رہنے والے تمام لوگ سمجھتے ہیں۔ اس کے برعکس

ہندی زبان وہ زبان ہے جس کے دائرہ کو تنگ کیا جاتا ہے۔ ہندی کے پریمی کبھی یہ کہتے ہوئے نہیں تھکتے کہ وہ اس زبان میں دوسری زبان کے الفاظ نہیں رکھیں گے۔ لیکن عملی طور پر کیا ہو رہا ہے اس کی مثال یوپی میں دیکھ لیجئے۔ جہاں ہندی کو سرکاری زبان تسلیم کر لیا گیا ہے۔ عام فہم الفاظ کو نکالا جا رہا ہے جنہیں ہر کس و ناکس آسانی کے ساتھ سمجھتا ہے وہ چن چن کر اُردو کے الفاظ کو نکال رہے ہیں، اس کا ثبوت یوپی میں بلوں اور قرار دادوں کے وہ مسودے ہیں جو اسمبلی میں پیش کئے جاتے ہیں لیکن یہ کوشش کتنی غیر حقیقی ہے۔ اس بات سے ظاہر ہے کہ جو ممبران بلوں کو ہندی کے الفاظ میں پیش کرتے ہیں۔ اپنی تقریروں میں ان الفاظ کو نہیں بولتے۔ فی الواقع آج یوپی میں وزیر اور عدالت جیسے الفاظ کا بولنا بھی ایک جرم سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ اُردو زبان کوئی ایسی زبان نہیں ہے جسے مسلمان اس ملک میں باہر سے لائے ہوں وہ نہ عرب سے لائے اور نہ ایران سے وہ ہمارے پریم و محبت اور باہمی میل کا نتیجہ ہے۔ سیٹھ گوبند داس نے ابھی مجھ سے پہلے کہا کہ اُردو میں ہندوستان کی چیزوں کے مقابلہ میں غیر ملکی چیزوں کا تذکرہ ہوتا ہے۔ یہ قطعی طور پر غلط ہے اور بے بنیاد الزام ہے۔ دنیاوی باتوں کو چھوڑیئے اُردو شعر کہتے . . . . . وقت شاعروں نے اس ملک کو نظر انداز نہیں کیا:

نظیر اکبر آبادی کا شعر سنئے (سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل
بادلوں پر لئے پھرتی ہے ہوا گنگا جل)

اس شعر میں شاعر نے مکہ مدینہ یا آب زمزم کا ذکر نہیں کیا ہے۔ میں نہیں سمجھتا میرے بھائی کے دماغ میں ایسی کونسی چیز ہے جو گاندھی جی کے اصول کو ٹھکرا رہے ہیں نظیر اکبر آبادی کا مصرعہ سنئے

(سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارہ)

موت تک کے اس ذکر میں بھی شاعر نے ہندوستانیت کو مدنظر رکھا ہے اور اس کی نظر غیر ملک پر نہیں گئی۔ اسی طرح خسرو نے جو شاعری کی اس میں ہندوستان ہی کی باتوں کو مدنظر رکھا۔

ہندی زبان کے متعلق میں یہ نہیں کہتا کہ اُسے نہ سیکھا جائے۔ لیکن جس طریقہ پر اس زبان کو ایک ادبی زبان بنایا جا رہا ہے۔ وہ مخصوص طبقہ کی زبان بن جائے گی۔ اور اگر اس طرح اُردو کو بھی ادبی زبان بنایا گیا تو وہ بھی ایک خاص طبقہ کی زبان ہو کے رہ جائے گی۔ صرف ہندوستانی ہی زبان وہ زبان ہے جو ہندوستان کے عوام کی زبان ہے۔ مہاتما گاندھی نے بھی اسی لئے فرمایا تھا کہ ملک کی زبان ہندوستانی ہو سکتی ہے کیونکہ اس میں سب زبانوں کے الفاظ موجود ہیں۔

اس اصول میں کیوں تبدیلی ہوئی اس کا جواب مجھے نہیں مل سکا جہاں تک میں سمجھتا ہوں یہ صرف تقسیم کے اثرات ہیں۔ اگرچہ یہ کہا جاتا ہے۔ کہ ہندی زبان کو رائج کرنے میں فرقہ وارانہ جذبہ کارفرما نہیں ہے۔ لیکن بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ غیر ارادی طور پر فرقہ وارانہ جذبات سے متاثر ہو کر ہم قدم اٹھاتے ہیں جس طور پر اس وقت زبان کا مسئلہ حل کیا جا رہا ہے۔ اس کا مقصد صرف ایک فرقہ کو مرعوب کرنا ہے۔

سنسکرت اور تہذیب

سیٹھ گوبند داس نے ابھی تہذیب اور سنسکرت کا ذکر کیا اور کہا یہ ہے کہ آزادی کے بعد اس ملک کے اندر دو سنسکرتیاں اور تہذیبیں نہیں رہ سکتیں۔ اگر تہذیب اور سنسکرتی کی بنیاد زبان پر ہے تو ہندوستان میں ایک درجن سے زائد زبانیں بولی جاتی ہیں۔ ایک سنسکرتی کے لئے ان سب زبانوں کو ملیامیٹ کر دینا چاہئے۔

حیرت ہے کہ ہم کس طرح تنگ نظری کی پالیسی پر چل رہے ہیں۔ سوئٹزرلینڈ ایک چھوٹا سا ملک ہے وہاں چار زبانوں کو سرکاری حیثیت حاصل ہے میرے بھائی نے روس کا ذکر کیا ہے کہ وہاں صرف ایک زبان اور ایک تہذیب اور ایک ہی جیسے نام بولے جاتے ہیں۔ یہ بالکل صحیح نہیں ہے روس میں ساٹھ سے زیادہ زبانیں بولی جاتی ہیں۔ اور وہاں رہنے والے مسلمانوں کے نام آج بھی عبداللہ اور عبدالرحمن ہیں ان حالات میں ہندوستانی زبان کو ختم کرنا اور اس کی جگہ سخت ہندی رائج کرنا کم از کم میری سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ صرف تقسیم ملک کے اثرات ہیں۔ اور اس ہندی کے جواز کے لئے کوئی دلیل نہیں ہے۔

اس ملک کی زبان اگر کوئی سرکاری زبان بن سکتی ہے تو وہ صرف ہندوستانی ہی ہے جسے اُردو اور ہندی دونوں رسم الخط میں لکھا جائے۔ ہندی رسم الخط کو اول درجہ میں رکھا جا سکتا ہے لیکن ثانوی درجہ میں اُردو رسم الخط ضرور ہونا چاہئے اور اسمبلی۔ عدالتوں وغیرہ میں اس رسم الخط کو قانونی حیثیت ہونی چاہئے۔

جہاں تک انگریزی ہندسوں کا سوال ہے تو جب انگریزی کو پندرہ سال تک برقرار رکھا جا رہا ہے اس کے ہندسے بھی باقی رہیں گے اور اس سے ہمارے کام میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں ہوگی۔ اگر ان کے ذریعہ آسانی پیدا ہوتی ہے۔ تو انہیں ضرور رکھا جائے۔ علاقائی زبانوں کی جو فہرست بنائی گئی ہے۔ اس سے میں پوری طرح متفق ہوں۔"

میں آخر میں پھر اپیل کروں گا کہ ہماری زبان ہندوستانی ہونی چاہئے کیونکہ یہی ایک آسان زبان ہے جو ملک کی زبان ہو سکتی ہے۔ علاوہ ازیں ہمارا دعویٰ ہے کہ ہمارے ملک کی حکومت ایک غیر مذہبی اور سیکولر حکومت ہے اسی دعویٰ کو ثابت کرنے کے لئے بھی ضروری ہے کہ ہم ہندوستانی کو ہی اپنی قومی زبان تسلیم کریں۔ اور اُردو زبان کو جو اس کی ایک شکل ہے دائرہ میں ہندوستانی کے رکھیں۔

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۔ ملک کے نظامِ تعلیم اور نصابی کتابوں کے معاملہ پر

پارلیمنٹ میں ایک بصیرت افروز تقریر!

۵ر مارچ سنہ ۶۱ء کو لوک سبھا میں وزارت تعلیم کے سلطالبات زیر بحث کے دوران حضرت مولانا حفظ الرحمٰنؒ صاحب نے اپنی تقریر میں مرکزی وزیر تعلیم کو نصاب کی کتابوں میں ایک خاص مذہب کے پروپیگنڈے اور دوسرے مذاہب کی اہانت کے مضامین کی طرف خاص توجہ دلائی اور نصاب کی کتابوں کی تیاری کے موجودہ طریق کار پر شدید نکتہ چینی کی۔ ساتھ ہی نصاب کی کتابوں کو خالص سیکولر بنانے پر بھی زور دیا۔ آپ نے اپنی تقریر میں علی گڑھ یونیورسٹی کے بارے میں بھی کچھ ممبروں کے اعتراضات کا نوٹس لیا اور صاف صاف کہا کہ شاید کسی خاص مصلحت کے ماتحت یونیورسٹی کو بدنام کیا جا رہا ہے۔ حضرت مولانا مرحوم کی یہ تقریر ذیل ملبی شائع کی جا رہی ہے

محترم ڈپٹی اسپیکر صاحب! میں آج ایک خاص بات کی طرف محترم ایجوکیشن منسٹر صاحب کو توجہ دلانا چاہتا ہوں۔ میں یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ ان پچھلے چند برسوں میں اس بات کی طرف مختلف موقعوں پر پارلیمنٹ میں توجہ بھی دلائی گئی ہے لیکن ابھی تک اس میں کامیابی نہیں ہو رہی ہے۔ ہمارا کانسٹی ٹیوشن بننے کے بعد یہ بات صاف کر دی گئی ہے کہ جہاں تک تعلیم اور شکشا کا تعلق ہے گورنمنٹ صرف سیکولرازم اور نیشنلزم کے مطابق کتابوں کے کورس کو اپنی تعلیم کے اندر جذب کرے گی۔ کسی کے مذہب اور کسی کے دھرم کی تعلیم کی ذمہ داری حکومت پر نہیں ہے۔ یہ بات ہم نے بہت ہی مفید سمجھی اور یہ صحیح قدم ہے جو کہ یقیناً تعلیم کے سلسلے میں سیکولر اسٹیٹ میں ہونا چاہیے لیکن بدقسمتی سے ٹیکسٹ بک کمیٹی کے ذریعہ جو کتابیں پرائمری ایجوکیشن میں اور مڈل کی تعلیم میں ہندوستان کی مختلف ریاستوں میں جاری ہیں ان میں یہ بات محسوس ہوتی ہے کہ بہت واضح طور پر ان کتابوں میں کسی خاص انداز سے اس طرح کے بیان اور اس طرح کے مضمون لائے جاتے ہیں جن میں خاص طور پر مسلمانوں یا اسلام کے بارے میں جتنا بھی خلاف لکھا جا سکے لکھا جائے۔ ساتھ ہی ساتھ اگر یہ نہ بھی ہو تو کم سے کم اس طریقہ سے لکھا جائے جس سے کسی ایک مذہب کا پروپیگنڈہ ہو اور دوسرے مذہب پر اس کا برا اثر ہو۔ اس بارے میں پچھلے برسوں میں گورنمنٹ آف انڈیا کی ایجوکیشن منسٹری کے سامنے اور ایجوکیشن منسٹر مولانا آزاد مرحوم و مغفور کے سامنے بھی میں نے تقریباً ۲۵، ۳۰ کتابیں مختلف طور سے پیش کر کے ضبط کرائی تھیں۔ ان کی تحقیق کی تو معلوم ہوا اور اسٹیٹ گورنمنٹوں نے بھی تسلیم کیا کہ ہم نہیں کہہ سکتے کہ کس طرح وہ کتابیں داخل کی گئیں۔ اور آخر کار وہ ضبط کی گئیں۔ لیکن ۲۵، ۳۰ کتابیں ضبط ہونے کے باوجود آج ایک سلسلہ برابر سیلاب کے طریقہ سے ہم دیکھ رہے ہیں۔ دانستہ یا نادانستہ جس طرح بھی ہو ایک سیلاب کی طرح کا سلسلہ جاری ہے اور کتابوں میں دونوں چیزیں برابر موجود ہیں۔ پچھلے زمانہ میں تقریباً ۶۵ کتابوں کے بارے میں ایک فہرست بنا کر بھیجی گئی۔ ہم نے یہ بتلایا کہ اس قسم کی کتابیں اس قابل نہیں ہیں جو کہ تعلیم میں رکھی جا سکیں۔ وہ بہت مضر ہیں اور اس سے دوسرے مذاہب کی ہانی بھی ہوتی ہے۔ اور سیکولرازم اور نیشنلزم کے خلاف بھی ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں وہ سیلاب رکتا نظر نہیں آتا۔

جب ہم کبھی کبھی ایسی تقریریں کرتے ہیں تو کتابیں مانگی جاتی ہیں ہم وہ کتابیں مہیا کر دیتے ہیں لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ محکمہ تعلیم یہ سمجھتا ہے کہ صرف ان چند کتابوں کے بارے میں شکایت تھی اور اس نے شکایت دور کر دی۔ حالانکہ صورت حال یہ نہیں ہے صورت حال دو چار دس بیس یا پچیس کتابوں کو یہاں پیش کر دینے تک بھی نہیں۔ آج اگر کوئی کمیٹی بٹھلائی جائے اور اس بارے میں اہمیت کے ساتھ تحقیقات کرائی جائے تو بلا مبالغہ میں کہہ سکتا ہوں کہ پچاس فی صدی کتابیں پرائمری اور مڈل تعلیم کے کورس میں اس قسم کی داخل ہیں جن میں سیکولرازم کے خلاف ایک خاص مذہب کا پروپیگنڈہ کسی کسی طریقے سے ہے۔ یا کھلی ہوئی کسی دوسرے مذہب کی ہانی اور اس کے متعلق اس قسم کی توہین موجود ہے چاہے وہ الہامی کتاب کے بارے میں ہو مثلاً

قرآن کریم یا پیغمبر صلعم کے بارے میں یا مسلمان بادشاہوں کے خاص واقعات کے بارے میں۔

شری پرکاش ویر شاستری گوڑگاؤں۔ کوئی نمونہ پیش کیجئے

مولانا حفظ الرحمٰن۔ میں نمونہ پیش کرنے کے لئے نہیں کھڑا ہوں لیکن اس طرح کی ۲۵، ۳۰ کتابیں ضبط ہو چکی ہیں اور ۵۰ کتابوں کی فہرست دی جا چکی ہے۔ نمونہ کی ذمہ داری میں نہیں لے سکتا لیکن اس کے لئے چیلنج کرتا ہوں کہ اگر ہندوستان کی تمام اسٹیٹوں میں تحقیقات کرائی جائے اور تقریباً ۵۰ فی صدی کتابیں ایسی کورس کے اندر ثابت نہ ہوں تو اس سے زیادہ جرم میرے خلاف یا میری ذمہ داری کے خلاف کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔ یہ چیزیں میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ میں یہاں پر کوئی دو چار کتابوں کا حوالہ نہیں دیتا یہاں ایک وقت وہ بھی تھا جب کتابیں پیش کی گئیں، ان کے اقتباسات بھی پیش کئے گئے لیکن آج میں اس بیماری کو دق کے درجہ کی سمجھ کر یہ گذارش کر رہا ہوں ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کو خاص طور پر چیک کیا جائے۔

مختلف کانفرنسوں میں تجاویز بھی پیش کی گئی ہیں وہ تجاویز مختلف انجمنوں جمعیۃ علماء ہند اور دوسری انجمنوں جیسے انجمن ترقی اُردو کی طرف سے بھی آئی ہیں جن میں دو باتیں کہی گئیں ایک بات یہ کہ ایک سب کمیٹی ہو جو اس قسم کی باتوں کو چیک کرے۔ ابھی ابھی کرانتی کی لہریں" نام کی ایک کتاب ہم نے اپنے ایجوکیشن منسٹر محترم کو ۶ یا ۷ دن ہوئے دی تھی۔ انھوں نے خود ہی مجھ سے اقرار کیا کہ اس کے اندر بہت سخت اور قابل اعتراض مضمون اسلام کے خلاف ہیں اور وہ کئی برسوں سے اتر پردیش میں پڑھائی جا رہی ہے۔ اس کے خلاف آواز اٹھائی جاتی ہے لیکن کوئی بات آگے نہیں بڑھتی۔ اس طرح کے واقعات بہار میں، راجستان میں یو پی میں، مدھیہ پردیش میں اور دوسری اسٹیٹوں میں برابر جاری ہیں اس لئے میں تو دق کے درجہ کی بات کہہ رہا ہوں لہٰذا اس بات کا لحاظ ہونا چاہئے۔ آج مسلمان عوام کہتے ہیں اور ہم کو طعنے دیتے ہیں کیوں صاحب یہ سیکولرازم ہے، یہ سیکولر اسٹیٹ کی کتابیں ہیں جن میں کھل کر اسلام کے خلاف، قرآن کے خلاف، قومی اصول کے خلاف یہ باتیں موجود ہیں۔

معلوم یہ ہوتا ہے کہ ہمارے اس تعلیمی سیکشن کو جو تعلیم ہی کا حصہ ہے اس کو غالباً کسی ایک مذہب کے پروپیگنڈے کے تبلیغی ادارے کی حیثیت سے استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ صورت حال بہت ناقابل برداشت ہے اور تعلیم کے بارے میں تو بالکل ہی برداشت کے قابل نہیں ہے۔ اس لئے کہ تعلیم تو بچے کے دماغ کو شروع سے ہی ایک خاص طریقہ پر کنٹرول کرنے کے لئے ہے۔ ضرورت دو باتوں کی ہے۔ ایک ایسی کمیٹی بنے جو کہ اس چیز کو مختلف ریاستوں میں چیک کرے اور اس قسم کی کتابیں جو ہوں ان سب کو خارج کرائے اور ان کو کورس سے نکال دیا جائے۔ اور دوسرے یہ کہ آئندہ جو ہماری ٹیکسٹ بکس کمیٹی ہو اس میں دو باتیں ہونی چاہئیں یا تو یہ کہ جو مضمون اور جو پیپر لکھا جائے وہ اس مذہب کے آدمی سے لکھوایا جائے۔

اسی سال یہاں دہلی میں ایک کتاب اس قسم کی لکھی گئی۔ جب میں نے اس کی بابت مصنف صاحب سے جا کر بات چیت کی تو یہ پایا کہ واقعی مصنف صاحب بہت سیدھے سادھے آدمی تھے اور ان کا مقصد اسلام کی توہین کرنا نہیں تھا۔ انھوں نے معذرت میں کہا کہ میں کیا کروں مجھے اسلام مذہب کے بارے میں جو باتیں معلوم تھیں وہ میں نے اس میں لکھدی ہیں۔ اور کوشش سے میری کتاب ٹیکسٹ بک کمیٹی کی کتابوں میں شامل ہو گئی۔

بھلا یہ بھی کوئی طریقہ ہے کہ کوئی بھی کتاب ایرا غیرا لکھ مارے اور وہ یوں ہی مذاق کے طور پر ٹیکسٹ بک کمیٹی کی کتابوں میں شامل ہو جایا کرے۔ ایسے شخص سے جو نہ ایکسپرٹ ہو اور نہ جس میں تعلیمی مہارت ہو اس طرح کتابیں لکھوانا کہاں تک مناسب ہے۔ اس لئے ٹیکسٹ بک کمیٹی میں اگر ایسے ماہر جو کہ کسی طرح کا تعصّب نہ رکھتے ہوں اور جو کہ اس مذہب کو صحیح طور پر سمجھتے ہوں۔ ان کے ذریعہ اس طرح کی کتابوں کو لکھوایا جائے تو وہ بہتر طریقہ ہو سکتا ہے۔ لیکن میں چاہتا تو یہ ہوں کہ وہ کتابیں جو ہمارے اسکولوں میں ہوں ان میں سوائے کموشلزم کے دوسری کوئی چیز نہ ہو بیشک مسلمانوں کے نبیوں کا ان میں ذکر ہو بیشک بہتر سے بہتر۔ جو ہمارے ہندوستان میں رشی منی گذرے ہیں ان کا ذکر کرو اور تواریخ کی حیثیت سے ان کا ذکر کرو لیکن ایسے آئیڈیاز نہ بیان کرو اور وہ طریقے نہ بتلاؤ جس سے کہ ایک مذہب کا تصادم دوسرے مذہب سے ہوتا ہو اور ایک مذہب کی توہین دوسرے مذہب کے ذریعے ہوتی ہو۔

یہ کام ان مجلسوں کا ہے جو بظاہر مناظرے ہندو و مسلمانوں کے، سکھ مسلمانوں کے یا سکھ ہندوؤں کے کرا کر ان کو آپس میں لڑاتی رہیں۔ یہ کام ہمارا نہیں ہے گورنمنٹ کا نہیں ہے اور ایک سیکولر اسٹیٹ کا نہیں ہے۔ اس بنا پر میں بہت دکھ سے یہ بات کہنے کو تیار ہوں کہ اس چیز کو بہت ہی معمولی سمجھا جاتا ہے اور وقتی تقریر کے ذریعہ یہ چیز ختم کر دی جاتی ہے۔ اس پر خاص توجہ دینی چاہیے۔

یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے یہ اصول کی بات ہے۔ میں جانتا ہوں کہ سبجکٹ ایسا ہے جس پر صوبوں کو اپنے اپنے طریقہ پر چلنے کا اختیار ہے لیکن اس بات کا خیال تو بہت ضروری ہے کہ تعلیم سیکولرازم کے بنیادی اصولوں کے مطابق ہو۔ تمام ریاستوں کو اس کا خیال رکھنا چاہئے۔

شری سی کے بھٹاچاریہ (مغربی دیناج پور) کیا میں آنریبل ممبر سے یہ معلوم کر سکتا ہوں کہ کیا وہ صرف مذہبی کتابوں کا ذکر کر رہے ہیں یا دوسری زبانوں کی کتابوں کا بھی جن کتابوں کا وہ ذکر کر رہے ہیں ان کے بارے میں انھیں صاف کرنا چاہئے کہ وہ کس زبان

سے تعلق رکھتی ہیں ؟

مولانا حفظ الرحمٰن ۔ جی ہاں ایک نہیں کئی زبانوں میں ایسی کتابیں موجود ہیں

ڈپٹی اسپیکر۔ انھوں نے بتایا کہ یہ کوئی ایک زبان نہیں ہے بلکہ ایک سے زیادہ زبانیں ہیں۔

مسٹر سی بھٹاچاریہ ۔ میرا آنریبل ممبر کہنا یہ ہے کہ ممبر موصوف ہندوستان کی سب زبانوں سے واقف نہیں ہیں۔ اس لئے جب وہ اس قسم کا الزام لگاتے ہیں، تو انھیں ان زبانوں کی وضاحت کرنی چاہیے جن کے بارے میں وہ کہنا چاہتے ہیں۔

مولانا حفظ الرحمٰن ۔ میں نے ہندی زبان کو اس لئے مخصوص نہیں کیا کیونکہ جیسا میں نے کہا گجراتی زبان میں بھی ہیں۔ مراسی (تامل) میں بھی ہیں۔ میں نے کسی خاص زبان کے بارے میں نہیں کہا بلکہ میں نے تو کہا کہ دوسری زبانوں میں بھی اس طرح کی کتابیں ہیں۔

ڈاکٹر کے، ایل شریمالی (وزیر تعلیم)۔ آنریبل ممبر نے کچھ عرصہ قبل ایک خاص کتاب کی طرف توجہ مبذول کرائی تھی جس کو میں نے دیکھا میں سمجھتا ہوں کہ اس کتاب میں بعض قابل اعتراض حصے تھے، میں متعلقہ حکام کو لکھ رہا ہوں کہ وہ اس کی طرف توجہ دیں۔ اگر آنریبل ممبر نے اس قسم کی دوسری کتابوں کی طرف دھیان دلایا تو میں یقیناً ان کی طرف توجہ دوں گا۔ اور متعلقہ ذمہ داروں سے کہوں گا کہ وہ ان کتابوں میں سے قابل اعتراض حصے نکال دیں

مولانا حفظ الرحمٰن ۔ جیسے کہ پہلے بھی کہہ چکا ہوں۔ اس قسم کی بہت سی کتابیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ ایسا سب زبانوں میں ہو رہا ہے۔ گجراتی زبان میں ہو رہا ہے، ہندی زبان میں ہو رہا ہے، اردو زبان میں ہو رہا ہے اور دوسری زبانوں میں ہو رہا ہے۔ ہمارا مطالبہ ہے کہ پرائمری اور مڈل اسکولوں میں جو تعلیم دی جا رہی ہے وہاں پر خاص طور سے دھیان رکھیں کہ ایسی کتابیں بچوں کو نہ پڑھائیں اس بارے میں دو تجاویز ہیں۔ ایک تو یہ کہ ریاستوں میں ایک اس طرح کا سب کمیٹی ہو جو اس بات کی تحقیقات کرے کہ ایسی کون سی کتابیں ہیں جن میں کسی مذہب کی توہین کی گئی ہے۔ یا جن میں کسی ایک خاص دھرم کے لئے کوئی ایسا پروپیگنڈہ ہو رہا ہے جس کا دوسرے مذاہب پر اثر پڑتا ہے۔ دونوں باتوں میں سے اگر کوئی بھی چیز ہو تو ایسی کتابوں کو ٹیکسٹ بک میں سے نکال دیا جائے اور انھیں کورس میں قطعی طور پر شامل نہ کیا جائے۔ دوسرے ٹیکسٹ بک کمیٹی میں ایسے ارکان مستقل طور پر ہونے چاہئیں جو اس بات کی جانچ کریں کہ وہ کتاب جس کو ہم کورس میں شامل کر رہے ہیں وہ دونوں چیزوں سے صاف ہے اور نیشنلزم اور سیکولرازم کے مطابق ہے یا نہیں۔

مسلم یونیورسٹی

یہاں ہاؤس میں مسلم یونیورسٹی کا بھی چرچا ہوا ہے۔ میں بھی اس کے بارے میں کچھ عرض کر دینا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑا دکھ ہوا کہ ایک خاص یونیورسٹی کے لئے کس طرح پر یہاں لوگوں نے اسے کریٹی سائز اور کنڈم کیا۔ شروع سے لے کر آخر تک میں نے دیکھا کہ وہ لوگ جن کی زندگی گاندھی جی کے داہیں اور بائیں گذری اور جن لوگوں نے اپنی زندگی ملک کے لئے تج دی، لاکھوں روپیہ برباد اور تباہ کر کے انھوں نے اپنے ملک اور وطن کی آزادی کو آگے بڑھانے کی کوشش کی۔ بہت ہی معمولی طریقہ سے گویا کوئی بات ہی نہیں ہے، ان کے نام لے لے کر یہاں ان پر نکتہ چینی کی گئی اور ان کے خلاف آواز اٹھائی گئی یہ چیز بہت تکلیف دہ ہے۔ اس طرح اگر یہ چیزیں آتی ہیں تو یقیناً نامناسب ہے۔ اب اگر یہ سمجھا جائے کہ کسی یونیورسٹی کا مالی انتظام یا تعلیمی نظام خراب ہے تو اس کو بہتر بنانے کی کوشش ہونی چاہیئے۔ لیکن اس طرح کھلے طور پر نکتہ چینی نہیں ہونی چاہیئے اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک خاص پروپیگنڈہ ہے جو کسی خاص مصلحت کی بنا پر مسلم یونیورسٹی کو بدنام کرنے کے لئے کیا جا رہا ہے۔

مسلم یونیورسٹی کے بارے میں کہا گیا کہ ایک مکان سے جسے مسلم یونیورسٹی نے خریدا ہے غیر قومی سرگرمیوں کا اڈہ بنا ہوا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہاں طلباء اور اساتذہ کے علاوہ کوئی بھی ایجنسی دیکھی نہیں ہے جو جاری ہو۔ یونیورسٹی میں بہتر طور پر پڑھائی کا کام چل رہا ہے۔ وہاں نیشنلزم اور سیکولرازم اتنی قوت سے جڑ پکڑ رہے ہیں کہ اس کی تاریخ میں اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔

مسٹر پرکاش ویر شاستری۔ کیا یہ صحیح ہے کہ اس مکان میں ایک خاص نقطہ نظر رکھنے والے طلباء اور اساتذہ جاتے ہیں:

مولانا حفظ الرحمٰن ۔ یہ جتنا بیان کیا گیا اس کی حقیقت وائس چانسلر نے بھی بیان کر دی ہے یہ سراسر جھوٹ ہے۔ اس طرح کا جھوٹا اور غلط پروپیگنڈہ ایک خاص مقصد کو لے کر مسلم یونیورسٹی کو بدنام کرنے کے لئے کیا جا رہا ہے۔ آج مسلم یونیورسٹی میں جو سرگرمیاں ہیں ان کے متعلق میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ وہ اینٹی کمیونل اور نیشنل ہیں۔ بڑے افسوس کی بات ہے کہ مسلم یونیورسٹی میں جو سیکولرازم اور نیشنلزم کی سرگرمیاں بڑھ رہی ہیں اس کی کوئی تعریف نہیں کی گئی بلکہ اس کو غلط طور پر کریٹی سائز ہی کیا گیا

دلی میں اردو

چوتھی بات آخری طور پر میں یہ عرض کرنی چاہتا ہوں کہ جہاں تک دلی کا تعلق ہے۔ منسٹر صاحب کو اردو کے بارے میں خاص طور سے توجہ دینی چاہیئے لیکن اس بارے میں کسی دوسرے وقت گذارش کروں گا۔

اس وقت میں کتابوں کے بارے میں توجہ دلانا چاہتا ہوں، اور خاص کر کورس کے بارے میں میرے دل پر چوٹ ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ کو اسکولوں میں کتابیں منظور کرنے کا ایسا معقول اور مستقل انتظام کرنا چاہیئے کہ کوئی شکایت پیدا نہ ہونے پائے ۔

محض لکچروں اور تقریروں میں عمدہ الفاظ ادا کر دینے سے زبان کا مسئلہ حل نہیں ہوگا!

اُردو ہندی کی رقیب نہیں ہے، یہ سمجھنا بھی ٹھیک نہیں کہ اُردو سے ہندی کو نقصان پہونچے گا!

لوک سبھا میں حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی مفصل تقریر!

دہلی، یوپی، اور بہار میں اُردو کو علاقائی زبان کی حیثیت دینے کا مطالبہ

دسمبر ۵۵ء میں لوک سبھا میں حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ نے حد بندی کمیشن کی رپورٹ پر بحث میں حصہ لیتے ہوئے اُردو زبان کے حق میں ایک مدلل تقریر کی اور اُسے دہلی یوپی اور بہار میں علاقائی زبان کی حیثیت دینے کا مطالبہ کیا۔ آپ نے اس بات پر افسوس ظاہر کیا کہ کمیشن نے جس طرح جنوبی ہند میں زبان کے مسئلہ کو اہمیت دی شمالی ہند کے معاملہ میں اس نے اس کو پیش نظر نہیں رکھا۔ حضرت مولانا نے اپنی تقریر میں اس امر کی وضاحت کر دی کہ اردو زبان ہندی کی رقیب نہیں ہے۔ اور نہ ہی اُردو کی ترقی سے ہندی کو نقصان پہونچے گا۔ حضرت مولانا نے اقلیتوں کے تحفظات کو سراہا لیکن محض تحفظات کو ناکافی قرار دیتے ہوئے اقلیتوں کی شکایتوں پر خصوصی طور سے توجہ دینے کی اپیل کی۔ مولانا کی تقریر جو بیس منٹ تک جاری رہی پوری توجہ کے ساتھ سنی گئی۔ اور تالیوں کی گونج میں آپ نے تقریر کو ختم کیا

❊ ❊ ❊

محترم چیرمین صاحب۔ کئی روز سے حد بندی کمیشن کی رپورٹ پر بحث ہو رہی ہے جس زمانہ میں کمیشن کی رپورٹ کا چرچا ہوا تھا۔ اس وقت میرا خیال یہ تھا کہ یہ مسئلہ وقت سے کچھ پہلے ہے۔ بہتر ہوتا کہ ابھی ہم اپنے اقتصادی پنجسالہ پروگرام پر توجہ دیتے۔

محترم پنڈت جی نے حوالہ دیا تھا کہ جس طرح ایک بڑی شخصیت سردار ولبھ بھائی پٹیل نے ۶۰۰ ریاستوں کے مسئلہ کو حل کر کے ہمارے ہندوستان کی یکجہتی پیدا کی ہے اسی طرح ہم لوگوں کو اس مسئلہ کو بھی دیکھنا چاہیے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ بے شک اس عظیم شخصیت نے جس طرح ۶۰۰ ریاستوں کو ختم کر کے ہمارے ہندوستان کی یکجہتی پیدا کی وہ معاملہ آج حد بندی کمیشن کے بارے میں مجھے نظر نہیں آتا۔ میں تو یہ محسوس کر رہا ہوں اور میرا یقین ہو گیا ہے کہ جو کچھ میں نے سوچا تھا وہ ٹھیک تھا۔ اس لئے کہ جو بحث اس وقت تک ہماری لوک سبھا میں آئی اس پر میں نے تو یہ دیکھا کہ بعض دفعہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ لوک سبھا نہیں ہے بلکہ ایسی خنگی کونسل ہے جس میں ایک اسٹیٹ سے دوسری اسٹیٹ کو یا گورنمنٹ آف انڈیا کو الٹی میٹم دیا جا رہا ہے۔ اس سے صاف اندازہ ہوتا ہے کہ کاش اس وقت ہماری توجہ اس کے بجائے اقتصادی پروگرام کی طرف ہوتی تو زیادہ بہتر تھا۔ لیکن جب یہ مسئلہ سامنے آگیا ہے تو مجھے بھی چند باتیں کہنی ہیں:

❊ ❊ ❊

پہلا مسئلہ یہ ہے کہ حد بندی کمیشن کی رپورٹ ہمارے حد بندی یا باؤنڈری کمیشن کے پاس سے سامنے آئی ہے۔ لیکن اس نے زبان پر بھی بہت شکل اور کافی بحث کی ہے اور دکھنی ہندوستان کے اندر لنگویج یا زبان کے مسئلہ پر اسٹیٹ بنانے میں بہت کافی مضبوط اور اہم حصہ لیا ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ شمالی ہندوستان میں اس طرح سے اس مسئلہ کو نہیں لیا گیا۔ ابھی کل ہمارے محبوب لیڈر پنڈت جواہر لال نے اُردو کے بارے میں بہت زبردست تقریر فرمائی تھی۔ لیکن میں ابھی تک یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ اُردو کے مسئلہ کو صرف لیکچر یا تقریروں کے ذریعہ بیان کر دینے سے حل کیا جا سکتا ہے۔ شری ٹنڈن جی نے بھی جس طرح وضاحت کے ساتھ کل اُردو کے بارے میں فرمایا تھا۔ اس سے مجھے بڑی خوشی ہوئی لیکن یہاں تو اگلے قدم کا سوال ہے جس میں شاید ان کو بھی اختلاف ہوگا۔ میں یہ کہتا ہوں زبانوں کے مسئلہ کے بارے میں ایک اسٹیٹ ایک لنگویج کے اصول پر بہت توجہ دی گئی ہے لیکن یہ کوئی چیز نہیں ہے۔ ہم اس پر چلنا نہیں چاہتے۔ اگر ایک اسٹیٹ میں دو یا تین زبانیں ہیں تو ہم ان کی سرکاری حیثیت کو تسلیم کریں۔ جبکہ ہم نے ہندی کو پورے ہندوستان کی سرکاری زبان تسلیم کر لیا۔ قومی زبان تسلیم کر لیا۔ تو کسی بھی زبان کے بارے میں یہ سمجھنا کہ وہ ہندی کا درجہ حاصل کرنا چاہتی ہے۔ ٹھیک نہیں ہے یہ سمجھنا کہ اُردو ہندی کی رقیب ہے۔ اور اگر اُردو کو کوئی علاقہ دیا جائیگا تو اس سے

ہندی کو نقصان پہنچے گا۔ اس پر مجھے اختلاف ہے۔ ہماری چودہ زبانیں ہیں جس طرح بنگلا۔ گجراتی، مراٹھی، تامل، ملیالم وغیرہ کو اسٹیٹ لنگویج کی حیثیت دی جاتی ہے۔ اس طرح کیا وجہ ہے کہ اردو کے مسئلہ میں وہی پوزیشن اختیار نہیں کی گئی۔

میں ادھر توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ محض لیکچروں اور تقریروں میں وعدہ سے علاوہ الفاظ ادا کرنے سے کسی زبان کا مسئلہ سرکاری طور پر حل نہیں ہو سکتا۔ آج ایک مقام اور ایسا علاقہ بتلانا چاہئے جیسے یوپی ہے۔ بہار ہے۔ دہلی ہے۔

جس طرح دوسری زبانوں کے علاقے ہیں جن میں کہ وہ زبانیں سرکاری حیثیت پاکر پھیلیں گی اور پھولیں گی اسی طرح سے اردو بھی سرکاری حیثیت پاکر پھلے گی پھولے گی اور صحیح طور پر اپنے قدموں پر کھڑی ہو سکے گی میں سمجھتا ہوں کہ رپورٹ میں اس کی طرف توجہ نہیں دی گئی ہے۔ اور اس کے ساتھ انصاف نہیں کیا گیا ہے آج اس ہاؤس کو اس طرف توجہ دینی چاہئے۔ اس لئے کہ اس کا کوئی علاقہ ہمارے سامنے موجود نہیں ہے۔ تحفظات میں ضرور اس کا ذکر آتا ہے جیسے کہ یہ کوئی اقلیت ہو گئی ہے۔ جیسے ہندوستان کی اور زبانیں ہیں اسی طرح سے اردو بھی ہے۔ یہ ہندو مسلمان کا سوال نہیں۔ یہ بھارت کی زبان ہے۔ لیکن وہ کسی اسٹیٹ کی زبان نہیں ہے۔ جس طرح اور زبانوں کے پاس ان کے علاقے ہیں اسی طرح سے اردو کے لئے بھی ایک علاقہ ہونا چاہئے۔

ایک آنریبل ممبر:۔ آپ کون علاقہ چاہتے ہیں۔ مولانا حفظ الرحمٰن:۔ میں یوپی کا علاقہ چاہتا ہوں۔ دہلی اور یوپی میں اسکو سرکاری ریجنل لنگویج کی حیثیت حاصل ہونی چاہئے۔ دہلی صوبہ میں بھی اس کو یہی جگہ ملنی چاہئے۔

جناب کل بات کرتے کرتے ہمارے ٹنڈن جی نے توجہ دلائی تھی کہ اردو زبان تو ضرور ہندوستان کی ہے لیکن ان کو اس سے اختلاف ہے کہ رسم الخط بھی ہندوستان کا ہے۔ میں بہت ادب سے ان کی خدمت میں عرض کرتا ہوں کہ یہ ٹھیک ہے کہ اردو رسم الخط ہندوستان کا نہیں ہے وہ عربی سے لیا گیا ہے۔ فارسی سے لیا گیا ہے دونوں ہی رسم الخطوں سے وہ بنا ہے۔ لیکن میں ان کی توجہ اس طرف دلانا چاہتا ہوں کہ کسی زبان کے رسم الخط کا دوسری زبان کے رسم الخط سے فائدہ اٹھانا کوئی عیب نہیں۔ سندھی زبان نے دوسری زبانوں سے فائدہ اٹھایا ہے۔ لیکن جو رسم الخط آج ہم ہندوستان میں اردو کے لئے استعمال کر رہے ہیں وہ عربی رسم الخط نہیں ہے۔ عربی رسم الخط سے ہم نے فائدہ ضرور اٹھایا ہے۔ لیکن اس سے فرق کر دیا ہے جو عربی رسم الخط ہے اس کو نسخ کہتے ہیں اور جو اردو کا رسم الخط ہے اسکو نستعلیق کہتے ہیں۔ اس طرح سے اردو اور عربی رسم الخط میں کافی فرق ہے اردو کو بھی ہندوستان کی ہی چیز سمجھا جاتا ہے اس لئے میں آپ کی اور ہاؤس کی توجہ دلاتا ہوں کہ اردو کا مسئلہ نہایت ضروری ہے۔ اور اس بات کو حل کرنا چاہئے کہ اردو کو کیوں کوئی علاقہ نہ دیا جائے۔

جہاں تک دوسرے سوالات کا تعلق ہے ان میں اقلیت کا سوال بھی آیا ہے میں مانتا ہوں کہ اقلیت کو تحفظات دیکر امداد دی جاتی ہے لیکن بعض موقع ایسے ہوتے ہیں کہ محض حفاظت یا تحفظات سے ہی اقلیت کا کام نہیں چلتا اس کے مطالبہ پر غور کرنا چاہئے۔ کہ جو چیز مانگی جا رہی ہے اور جو چیز طلب کی جا رہی ہے وہ کیا ہے۔ اور اس کو کیا دقت اور کیا پریشانی ہے۔ اور اگر پریشانی ہے تو وہ چیز تحفظات سے حاصل ہو سکتی ہے یا نہیں۔ میں اس مسئلہ کے متعلق مان بھوم کشن گنج کی مثال پیش کرتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہاں ساڑھے تین لاکھ انسان ہیں جن کا مطالبہ یہ ہے کہ ان کو بنگال کا حصہ نہ بنایا جائے۔ میرے نزدیک ایک ہی بڑی وجہ ہے کہ جس سے ان کی پریشانی ظاہر ہوتی ہے ۱۹۵۱ء کے فسادات کے زمانہ میں بنگال میں جہاں بیچارے مظلوم پناہ گزیں آرہے تھے۔ یہاں کے مسلمان بھی فسادات کی بنا پر اکھڑ گئے تھے۔ اس وقت کچھ مسلمانوں کے بسنے کا سوال پیدا ہوا۔ حکومت نے اس پر توجہ دی اور وعدہ کیا کہ وہ مسلمان جو پاکستان نہیں گئے وہ ضرور وہاں بسائے جائیں گے اور ان کو ضرور مکان دیئے جائیں گے۔ لیکن آج آٹھ برس ہو گئے لیکن پھر بھی ہزاروں مسلمان ایسے موجود ہیں جن کے بارے میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ ہوڑہ، دیناج پور، جلپائی گوڑی اور بہت سے ایسے مقامات میں پڑے ہیں جو کہ ہندوستان کے ہی رہنے والے ہیں وہ یہاں کے ہی باشندے ہیں اور پاکستان بھی نہیں گئے اس کے باوجود بھی وہ اپنے گھروں سے محروم ہیں۔ آج تک ان کو گھر نہیں ملے ایک حکم بنگال گورنمنٹ نے نکالا۔ جس میں اس نے کہا کہ جب تک پناہ گزیں کا انتظام متبادل طور پر نہیں ہو جائے گا اس وقت تک ان کو مکانات نہیں ملیں گے۔ میں اس چیز کو صحیح نہیں مانتا۔ ہوں ان کو پناہ گزینوں کے ساتھ ملانا ٹھیک نہیں ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ہندوستان ہی میں رہے ہیں اور پاکستان بھی نہیں گئے۔ یہ آدمی جو اپنے گھروں سے محروم کر دیئے گئے ہیں یہ بیچارے اپنے گھروں کو دیکھ دیکھ کر حیران ہوتے ہیں کہ اپنے ہی گھروں میں ان کو جانے کی اجازت نہیں ہے۔

ایسی حالت کو دیکھکر جو باہر کے بسنے والے ہیں وہ بھی حیران ہوں گے۔ کیوں کہ ہو سکتا ہے کہ پھر یہی چیز ان کے سامنے آئے۔ ان پر اس کا کیا اثر پڑے گا۔ یہ سوچنے کی بات ہے۔ تحفظات سے یہ سوال حل نہیں ہوگا۔

اب میں کچھ دوسرے سوالوں کی طرف آتا ہوں۔ اقلیتوں کا مسئلہ ہے اگر کوئی شخص ایسی بات کہتا ہے جو۔۔۔ فرقہ پرستی کی بات ہو تو میں نہیں چاہتا کہ وہ بات مان لی جائے۔ اس کو بالکل بھی نہیں ماننا جانا چاہئے۔ اسکو پھینک دینا چاہئے۔

اور اسکو پیروں تلے روند دینا چاہئے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اقلیت
والے کوئی بھی بات کہیں اسکو فرقہ پرستی کی بات ہی آپ کہتے جائیں یہ مناسب نہیں
ہے ۔ اقلیتوں کو جو دقتیں ہیں ان کو دور کرنے کی کوشش کی جانی چاہئے ۔ میں سمجھتا ہوں
پنجاب کا مسئلہ ہے وہ بھی ایک اقلیت کا مسئلہ ہے ہماچل کو الگ رکھنا چاہتے ۔
اور پیپسو اور پنجاب کو ایک کر دینا چاہتے ۔ فضل علی صاحب نے رپورٹ دی
ہے اور جو کچھ انہوں نے کہا ہے یا تو وہی مان لیا جائے یا آپ دوسری طرح سے
اسے حل کریں یہ آپ کی مرضی ہے لیکن میں چاہتا ہوں کہ اقلیتوں کا جو مسئلہ ہے اسکو
اس طرح ٹالا نہیں جانا چاہئے بلکہ ان کو جو تکلیف ہیں ان کو جو دقتیں ہیں جو
پریشانیاں ہیں ان کو دور کرنا چاہتے ۔ ان کو ہر طرح سے مطمئن کرنا چاہئے ۔ ان کو
مطمئن کرنے کی بات سوچنی چاہئے ۔ اور ایسا راستہ اختیار کرنا چاہئے جس سے کہ ان
کے دلوں میں بھروسہ پیدا ہو ۔ ہندوستان کے ایک ٹکڑے کو ادھر سے ادھر
کر دینے میں کوئی ہرج نہیں ہے ۔ دقت تب ہوتی ہے جب ان کی ہر بات کو فرقہ پرستی
کہکر ٹال دیا جاتا ہے ۔

مسٹر جوکھم الوا ۔ کیا میں آنریبل ممبر کو متوجہ کر سکتا ہوں کہ اس ایوان میں بحث
کا معیار بہت اعلیٰ رہا ہے ۔ اور خواہ آنریبل ممبر کا کتنا ہی احترام میرے دل میں ہو کیا میں
ان سے درخواست کر سکتا ہوں کہ وہ کسی اور قسم کی باتیں درمیان میں نہ لائیں ۔

مسٹر چیرمین (پنڈت ٹھاکر داس بھارگو) میں سمجھتا ہوں ہر آنریبل ممبر اس بات کو ذہن
میں رکھتا ہے ۔ جب کوئی ممبر تقریر کر رہا ہو اس سے یہ کہنا کہ وہ بحث کا معیار بلند رکھے
اس پر بہتان لگانا ہے یہ مناسب بات نہیں ہے ۔

ایک آنریبل ممبر ۔ ممبر موصوف نے جو کچھ کہا ہے اسے وہ واپس لیں ۔

میں گذارش کر رہا تھا کہ درحقیقت ان مسئلوں کو اس طرح سے دیکھنا چاہئے
اور اس طرح سے ان پر نظر رکھنی چاہتے جس سے کہ اقلیتوں کو تسلی ہو کہ ان کی باتوں
کی طرف بھی دھیان دیا جاتا ہے ۔ اور ان میں بھروسہ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے

تلنگانہ کا مسئلہ) تلنگانہ کا مسئلہ بھی اس قسم کا ہے ۔ میں سمجھتا ہوں کہ وشال آندھر
بنانا ٹھیک بات ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ تلنگانہ کو موقعہ ملنا چاہتے کہ وہ بھی
ایک اسٹیٹ رہ سکے ۔ اور ایک اسٹیٹ کی طرح سے ہی وہ چلے اور اس کے بعد آپ
آہستہ آہستہ وشال آندھرا میں اس کو شامل کر سکتے ہیں ابھی تک اسکو ایک اسٹیٹ کی
شکل میں ہی رہنے دیا جانا چاہئے ۔ اور بعد میں وشال آندھرا میں شامل کریں ۔

یوپی کا مسئلہ) یوپی کا جو مسئلہ ہے اس کے بارے میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مجھے
خوشی ہے کہ آج یوپی ممبران اس بات کو سوچتے ہیں کہ جو بات سارے ہندوستان کے
فائدے میں ہو وہی کی جائے ۔ بہت سے لوگ ہیں جو یہ چاہتے ہیں کہ اس کا پارٹیشن ہو ۔
میں ان میں سے نہیں جو یہ بات چاہتے ہیں کہ پارٹیشن نہ ہو یہ ہم اس کو ایک اور مضبوط
دیکھنا چاہتے ہیں ۔ اگر یوپی کے پارٹیشن سے سارے ہندوستان کو فائدہ پہنچتا ہے تو
اس کے لئے کوئی بھی قربانی ہمیں کرنے کے لئے تیار رہنا چاہئے ۔ لیکن اگر ہندوستان کو
فائدہ نہیں پہنچتا ہے اور صرف اس لئے کہ چند ممبر یہ چاہتے ہیں کہ یوپی کا پارٹیشن ہو ۔
ہمکو یہ نہیں کرنا چاہئے میں اسکو کوئی معقول بات نہیں مانتا ۔

دہلی کا سوال) ۔ جہاں تک دہلی کا سوال ہے مجھے اس میں بہت دلچسپی ہے ۔ کانسٹی ٹیوئنٹ
اسمبلی میں جب لالہ دیش بندھو گپتا جی نے دہلی اسٹیٹ کے بارے میں آواز اٹھائی تھی
اس وقت میں نے ان کی تائید کی تھی میں نے ان کو متنبہ کیا تھا جیسا کہ دوسرے آنریبل
ممبر نے کہا تھا ۱۹۱۸ء میں حکیم اجمل صاحب نے انڈین نیشنل کانگریس میں سب سے
پہلے اس مسئلہ کو اٹھایا تھا ۔ آج محض اس لئے کہ کچھ کانگریسی آپس میں لڑ رہے ہیں اس
واسطے آپ دہلی کو الگ اسٹیٹ نہیں رکھ سکتے ۔ میں اسکو مناسب خیال نہیں کرتا یہ چیز
معقول نہیں ہے ۔ اس طرح سے دہلی کی حکومت کو جو افسران کے ہاتھ میں اور حکام کے
ہاتھ میں سونپ دینا ٹھیک ہوگا ، ۲۰ لاکھ لوگوں کو ان افسروں کے رحم پر چھوڑ دینا اچھی
بات نہیں ہے ۔ ان کو ترقی کرنے کا پورا موقعہ ملنا چاہئے ۔ میں چاہتا ہوں کہ دہلی کو ضرور
ایک مستقل اسٹیٹ کا درجہ دے دیا جائے اسکو ایک کارپوریشن کا درجہ دے کر ٹال
نہیں دینا چاہئے یہ اسٹیٹ جس جمہوری نظام کے قابل ہے وہی نظام اسکو ملنا چاہئے
مدھیہ پردیش کا جو صوبہ بنا ہے اس کا سواگت کرتا ہوں میں سمجھتا ہوں کہ یہ پردیش اسی
طرح سے بنایا جانا چاہئے تھا ۔ جہاں تک گجرات اور مہاراشٹر کا تعلق ہے جس کے
بارے میں یہاں پر بہت زبردست تقریریں ہوئی ہیں ۔ ان کو سن کر تو میں ڈر سا گیا تھا
اور سوچنے لگا تھا کہ خدا جانے اب کیا ہوگا ۔ یہاں پر چیلنج دیئے گئے اور الٹی میٹم دیئے گئے
میں سمجھتا ہوں کہ جو حل کانگریس ورکنگ کمیٹی نے تجویز کیا ہے اس کو مان لینا چاہئے ۔
وہ فیصلہ بالکل صحیح ہے بمبئی اسٹیٹ کو الگ ہی رکھنا چاہئے اسے الگ رہ کر ہی ترقی
کرنے کا موقعہ ملنا چاہئے ۔

یہ میرا خیال ہے جو میں آپ کے سامنے رکھنا چاہتا تھا ۔ اور میں چاہتا ہوں کہ ہاؤس
ان پر غور کرے ۔ اور صحیح فیصلہ کرے ۔ میں ایک بار پھر کہنا چاہتا ہوں کہ جہاں تک
اردو کا تعلق ہے اسکو سرکاری علاقائی زبان کی حیثیت دی جائے جہاں تک
اقلیتوں کا تعلق ہے میں سمجھتا ہوں کہ تحفظات دے دینے سے کام نہیں چلے گا ۔
اس طرح سے ان کے مسئلے حل نہیں ہو سکتے ان کو پوری طرح سے مطمئن کرنا
چاہئے ان چند لفظوں کے ساتھ میں اپنی تقریر ختم کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ جو
خیالات میں نے آپ کے سامنے رکھے ہیں ان پر ہاؤس غور کرے گا ۔ اتنا کہہ کر میں آپکا
شکریہ ادا کرتا ہوں ۔"

فرقہ وارانہ فساد پسند ذہن و کردار کا شرمناک مظاہرہ

آزادی کے بارہ سال کے بعد بھی اگر فرقہ پرستی یوں ہی جاری رہی تو ہم کبھی انسانیت کے کنبہ میں عزت کی جگہ نہ پا سکیں گے

اپریل ۱۹۵۹ء کے ہنگاموں کے بعد مجاہد ملت کا بیان (اقتباس)

مدھیہ پردیش کی راجدھانی بھوپال میں پچھلے ہفتہ جو افسوسناک حوادث پیش آئے ان کو سرسری یا اتفاقی واقعہ کہہ کر نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ چند ہی روز پہلے مبارک پور اور بعض دوسرے مقامات میں فرقہ پرستی اور لاقانونیت کے کھیل کھیلے جا چکے تھے۔ ان سے متصل ہی بھوپال بھی فتنہ و فساد کا اکھاڑہ بن گیا اور وہاں بھی وہ سب کچھ ہوا جس کا اعادہ و بیان نہایت تکلیف دہ اور شرمناک ہے۔

اخبارات میں کچھ خبریں دیکھنے کے بعد مجھے اس کا موقع بھی ملا کہ ۴ر اپریل کو خود بھوپال پہنچ کر وہاں کے عوام و خواص اور مختلف حلقوں سے پیش آمدہ واقعات کی تحقیق کی اور ان کے پس منظر میں ان اسباب و محرکات کا بھی کچھ ادراک کر لیا جنھوں نے کسی سوچے بوجھے مقصد کی خاطر فتنہ و فساد کی آگ بھڑکائی اور بے گناہ عوام کی زندگی اجیرن کر دی۔

مدھیہ پردیش میں سیاسی اقتدار کے لئے مختلف گروپوں کی باہم کشمکش کسی وقت بھی ایسے حادثات کو جنم دے سکتی تھی۔ لیکن اس کے ساتھ بھوپال میں ہندو مہاسبھا کے گزشتہ انتخابات سے فرقہ پرست عناصر کی بے اطمینانی اور بیزاری بھی ایک بڑا سبب تھی کہ بھوپال کو بار بار سیاہ نصیب ہوا ما بابِ زوالی کے سلسلہ کی تیسری کڑی افسوس کہ خود لا اینڈ آرڈر کے ذمہ دار یا حکومت کی مشنری بھی ہے جس کے پردوں پر ابھی تک احساس و فرض منصب کا نکھار پوری طرح روشن نہیں ہو سکا ہے۔ یا جن میں فرقہ واریت کا پیرول ابھی تک خشک نہیں ہوا ہے کہ ہر آنچ کے ساتھ وہ خود بھی تیزی کے ساتھ بھڑکنے لگتے ہیں۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ پریسٹیج کا معاملہ بھی آج کی دنیا میں اہمیت رکھتا ہے۔ حکومت کے لئے یہ آسان نہیں ہے کہ وہ اس بدانتظامی کو برملا تسلیم کرے۔ لیکن بھوپال کے در و دیوار کی خاموش گواہی کو جھٹلانا بھی دشوار ہے۔

افسوس کہ واقعات کی ترتیب اور ہنگاموں کی نوعیت صاف بتاتی ہے کہ مقامی حکام اور پولیس اسٹاف کی یک طرفہ دلچسپیاں ہنگاموں میں برابر شریک رہی ہیں۔

جس ملک میں اقلیت و اکثریت کا چولی دامن کا ساتھ ہو وہاں حکومت کی مشنری فرقہ واریت کے زہریلے جراثیم سے پاک نہ ہو تو امن و انصاف کا نظام آخر کب تک قائم اور محفوظ رہ سکے گا۔

پس اخباری بیان میں واقعات کی تفصیل پیش کر کے کوئی مفید مقصد حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے تفصیلات تک جائے بغیر میں صرف اسی پر اکتفا کروں گا کہ بھوپال میں جو کچھ ہوا وہ بہت افسوسناک اور مدھیہ پردیش کی حکومت کے لئے انتہائی شرم و ندامت کا ایک داغ ہے۔ ان ہنگاموں میں اقلیتی فرقہ کو جس طرح برباد اور مرعوب کیا گیا وہ ہماری اخلاقی گراوٹ اور دماغی افلاس و پستی کا ایک افسوسناک مظاہرہ تھا جس سے اس عظیم ملک کی نیک نامی اور وقار کو صدمہ پہنچا۔ ہم سب ہی کو اپنی اپنی جگہ سوچنا چاہئے کہ آج آزادی کے بارھویں سال میں بھی اگر ہمارے اخلاق و کردار کا یہی ریکارڈ رہا اور فرقہ پرستی کا بھوت اب بھی ہمارے سر سے دور نہ ہوا تو ہمارے مخلص رہنماؤں کی وہ تمام کوششیں جو وہ اس عظیم دیش کو خوش حال اور دنیا میں سربلند و نیک نام بنانے کے لئے مسلسل انجام دے رہے ہیں رائیگاں رہیں گی، اور انسانیت کے کنبہ میں ہم کبھی بھی کوئی عزت کی جگہ نہ پا سکیں گے۔

میں نے دہلی واپس پہنچ کر بعض اخبارات میں دیکھا کہ بھوپال کے مالی نقصانات کا اندازہ ایک ارب یا ایک کروڑ روپے تک ہے۔ یقیناً یہ بہت ہی مبالغہ اور واقعہ کے خلاف ہے جو صحیح واقعات پر برا اثر ڈال سکتا ہے۔ مالی نقصان کتنا بھی ہو اس درجہ تک نہیں پہنچ سکتا اور اس پر بھوپال کے مسلمانوں کو اپنے مالی نقصانات اور بربادیوں کا اتنا احساس نہیں ہے جتنا انھوں نے مقامی پولیس کی لاقانونیت اور جابرانہ تشدد و توہین کی چوٹ کو محسوس کیا ہے۔ اس لئے بھی کہ یہ رمضان المبارک کے ایام تھے اور پولیس کی تمام زیادتیوں کا شکار بھوکے پیاسے روزہ دار ہوئے۔ اس بیان کو ختم کرتے ہوئے ایک جملہ اُن ہتھیاروں کے متعلق بھی کہوں گا جو مسلمانوں کے قبضہ سے برآمد ہوئے اور سرکاری اعلانات کے تحت پریس میں ان کا ڈھنڈورا پیٹا گیا۔ یہ کچھ دستور سا ہو گیا ہے کہ ہر ایسے موقع پر مسلمانوں کو جرم و تقصیر کے گھیرے میں کھینچنے کے لئے ان کے قبضہ سے ہتھیار برآمد کر لئے جاتے ہیں۔ بھوپال میں یہی ہوا۔ لیکن آپ حیران نہ ہوں یہ سن کر کہ اس ریٹی دور میں یہ ہتھیار چاقوؤں اور گھریلو استعمال کی چھریوں سے زیادہ کچھ نہ تھے۔ اسی قسم کے ہتھیار ۱۹۴۷ء میں نئی دہلی کے سینٹرل سکریٹریٹ میں ایک صاحب نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو دکھائے تھے۔ بھوپال میں یوں بھی رام پوری چاقوؤں کا عام رواج ہے۔ ان کا منشا کسی کی جان لینا اور خون کی ندیاں بہانا نہیں ہوتا۔ پھر بھی ایسے معمولی ہتھیار کو اسلحہ یا ہتھیار کے نام سے پروپیگنڈہ کرنا اس پست ذہنیت کی طرف غمازی کرتا ہے جو یقیناً فرقہ پرستی اور ایسے ہنگاموں کی پرورش کرتی ہے اور وہی دراصل ہمارے ملک کی سب سے بڑی مصیبت ہے۔

حوادث جبلپور وساگر کے بعد ہند پارلیمنٹ میں

مجاہد ملتؒ کی پہلی تقریر

(۵ر رمضان ۱۳۸۰ھ - ۲۱ر فروری ۱۹۶۱ء)

پاکستان کا نام لے کر مسلم اقلیت کو دبایا نہیں جا سکتا۔

"میں کہتا ہوں کہ جو کچھ آج میں یہاں کہہ رہا ہوں وہی وہاں جمعیۃ علماء ہند کے اجلاس (اجین) میں کہا گیا، میں اس باڈی کا ذمہ دار ہوں، میں ان تجویزوں اور تقریروں کے لئے ذمہ دار ہوں ان میں کوئی بات نیشنلٹی کے خلاف یا سکولرزم کے خلاف نہیں کہی گئی، وہاں یہ شکایت کی گئی کہ مسلم اقلیت کو دبایا جا رہا ہے، فرقہ پرستی اُبھرتی آرہی ہے جو کچھ کہا گیا ٹھیک کہا گیا ہے۔ اگر آج ان باتوں کے حق میں سیٹھ گوندداس جی یا دوسرے ہندو بھائی نہیں بولتے تو پھر مجبور ہو کر حفظ الرحمٰن کو بولنا پڑتا ہے۔ اس میں اعتراض کی کیا بات ہے۔

فرقہ پرستی اُبھر رہی ہے اور حکومت بے بس ہے۔

درسی کتابوں میں عقائد کی توہین برداشت نہیں کی جا سکتی۔"

جناب ڈپٹی اسپیکر صاحب!

پریسیڈنٹ کے ایڈریس پر کل سے بات چیت ہو رہی ہے، ملی جلی چند باتیں ہیں جن کو اپنے خیال کے مطابق ہر ایک پیش کر رہا ہے۔

چین اور ہندوستان کی سرحد

جہاں تک چین کا معاملہ ہے میں سمجھتا ہوں کہ اس کے متعلق مختلف طریقوں سے ہاؤس میں دوسرے وقت میں بھی بحث ہوئی ہے یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے جس میں دو رایوں کی گنجائش نہیں ہے یہ چین جس کے متعلق ہندوستان نے ہر موقف پر ٹھہراؤ اور ہر موقع پر پورے طریقوں سے اس کا ساتھ دیا۔ اس چین نے چین کی حکومت نے موجودہ چین کی کمیونسٹ حکومت نے ہندوستان کے ساتھ بہت بے وفائی کی اور انتہائی شرافت سے گری ہوئی زندگی کا ثبوت دیا۔

جہاں تک بارڈر کا مسئلہ ہے ہماری حد ایک لمبی لکیر ہے میکماہن لائن اور اس طرف کشمیر کی وہ حدود ہیں جو کہ اس ملک کی سرحد تک ہیں چین کی طرف سے بار بار ان کے بارے میں چھیڑ کی جاتی ہے۔ ایسے قدم اُٹھائے جاتے ہیں جن سے ہندوستان کے مقصد اور کاز کو نقصان پہونچے ان حدود کو مغلوں کے زمانہ سے آج تک بغیر کسی اختلاف کے ہندوستان کی حدود مانا گیا ہے آج ان کے بارے میں بحث کرنا اور ہندوستان کی زمین پر ناجائز قبضہ کی کوشش کرنا اور جس حصہ پر اس نے ناجائز قبضہ کیا ہوا ہے اس کو اپنے ملک کا حصہ بتانا یہ ایسی چیزیں ہیں جو یہ ظاہر کرتی ہیں کہ دنیا میں، دنیا کی زندگی میں جب اخلاق نہ ہو، روحانیت نہ ہو، صرف مادیت پیش نظر ہو تو جتنا بھی کچھ ہو وہ کم ہے۔

حکومت ہند کی پالیسی

ایسے موقع پر اس سے زیادہ کیا کہا جا سکتا ہے کہ اس مسئلہ کو حل کرنے کے دو ہی طریقے ہیں یا تو ہم جنگ کریں یا دوسرے طریقوں سے اپنا مقصد حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ آج ہمارے پرائم منسٹر اور ہر ایک عقلمند آدمی یہ سوچتا ہے کہ آج کے زمانہ میں یہ جنگ ساری دنیا کی جنگ ہو سکتی ہے اور بڑی بڑی تہذیبیں برباد ہو سکتی ہیں۔ اس لئے ایک دوسرے طریقے سے اس کو حل کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ گورنمنٹ کی اس پالیسی کو ہم سپورٹ کرتے ہیں اور پورے طریقہ سے اتفاق رائے کرتے ہیں ——

کہ ایک طرف وہ مضبوط ہے کہ ایک انچ زمین بھی کسی دوسرے کے ہاتھ میں نہیں جانے دے گی اور دوسری طرف اس نے ارادہ کر رکھا ہے کہ اگر کسی ملک کی طرف سے کوئی جارحانہ کارروائیاں ہوئیں تو اُن کا سامنا کیا جائیگا اور جو کارروائیاں اس سلسلہ میں ہو چکی ہیں ان کو حل کرنے کی کوشش کی

جائے گی، اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتا ہے۔

کانگو کا مسئلہ

باہر کے معاملات کے سلسلہ میں کانگو پر بحث ہوئی ہے۔ بیشک وہ ایک مظلوم قوم ہے اور مظلوموں کا ساتھ دینا ہمارا شیوہ، ہمارا شعار اور ہماری عادت ہے۔ ہم برابر ایسا کرتے رہے ہیں اور آج بھی کانگو کے معاملہ میں ہم اسی طرف ہیں جہاں پبلک کا رجحان ہے وہاں پر بلجیم کی طرف سے کالونیلزم کا جو غلط، بھیانک اور گھنونا مظاہرہ کیا جا رہا ہے وہ ناقابل برداشت ہے وہاں پر ایک فارین (بیرونی) طاقت نے ملک کے ایک حصے سے دوسرے حصے کو تباہ کروانے کی کوشش کی ہے اور اس سلسلہ میں مسٹر لومبا اور ان کے کچھ ساتھیوں کو قتل کر دیا گیا ہے۔

اپنے ملک کا معاملہ مدھیہ پردیش کے واقعات

ان باتوں کے متعلق فائیو ایر پلان کے متعلق اور پنچایت راج کے متعلق کہنے کے لئے بہت سے موقع ہیں، کہا جاتا رہا ہے اور کہا جاتا رہے گا۔ لیکن ایک بحث خود بخود ہاؤس کے سامنے آگئی ہے اور آنی چاہئے تھی میں بھی اس پر کچھ کہنا چاہتا ہوں، مجھے اس بات پر مایوسی ہوئی کہ ۳ تاریخ سے لے کر ۹ تاریخ تک جبل پور، کٹنی، ساگر، دموہ، نرسنگھ پور، سرد پا اور کتنے ہی مقامات پر فساد ہوئے، اور بربادی ہوئی آگیں لگیں۔ مکان برباد ہوئے اور دوکانیں جلائی گئیں اور جان و مال کا نقصان ہوا۔ لیکن ۱۴ تاریخ کو پریذیڈنٹ صاحب کا جو ایڈریس آتا ہے اس میں ایک لائن بھی اس سلسلہ میں ہمارے سامنے نہیں آتی ہے اس میں اس بات کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا کہ اس بارے میں کیا طریقہ کار اختیار کیا جائے گا جس سے اس قسم کے واقعات پھر نہ ہوں۔ کیونکہ کسی سیکولر اسٹیٹ کے لئے اس سے زیادہ ندامت اور شرمندگی کی کوئی بات نہیں ہو سکتی کہ یہاں سامپردائیکتا (فرقہ پرستی) اس طرح منہ کھولے کھڑی رہے اور شروع سے آخر تک اس کا سلسلہ کہیں نہ کہیں جاری رہے اور ہم اس کو روک نہ سکیں۔

انفرادی واقعہ کو قومی واقعہ بنانے کا ظلم

جبل پور میں ایک واقعہ ہوا ایک انڈیوجول واقعہ۔ ایک انتہائی شرمناک واقعہ ہوا جس کی سزا ذمہ دار شخص کو ملنی چاہئے۔ لیکن ایکشن اور ری ایکشن کا یہ مطلب کبھی نہیں ہو سکتا کہ ایک انڈیوجول نے ایک بات کی ہو تو پوری کمیونٹی کو تباہ و برباد کر دیا جائے۔ یہ طریقہ کار کسی طریق سے ملک کے مفاد میں نہیں ہے بلکہ وہ انتہائی نقصان دہ ہے۔ اس بنا پر یہ بات بہت قابل توجہ ہے کہ پچھلے دنوں میں اسی مدھیہ پردیش میں بھوپال میں جو فساد ہوا تھا وہاں پر کسی کو سزا نہیں ملی کسی مجرم کو اس کی خطا پر پکڑا گیا۔ کسی غنڈے اور شرارت پسند کو سزا نہیں دی گئی۔ ان حالات میں مختلف مقامات میں فسادات ہوئے ہیں۔ اور وہ لوگ سمجھتے ہیں کہ ہم کھلے دل سے من مانی کر سکتے ہیں جو کچھ چاہیں کر سکتے ہیں حکومت ہمارے مقابلہ میں بے بس ہے اور کچھ نہیں کر سکتی۔ اس کے سوا دوسری کوئی بات نہیں ہے۔

ہندو مسلم فساد نہیں یہ غنڈوں کی اسکیم ہے

میں ایمانداری سے کہہ سکتا ہوں کہ ان فسادات کو ہندو مسلم فسادات کہنا ہندوؤں اور مسلمانوں کی توہین کرنا ہے۔ یہ فساد ہندو اور مسلمان نہیں کرتے ہیں۔ میں آپ سے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ وہاں کی پبلک جس میں ہندو مسلمان دونوں شامل ہیں۔ آج بھی کانوں پر ہاتھ دھر رہی ہے کہ یہ بلا، یہ مصیبت، یہ عذاب کہاں سے نازل ہوا۔ یہ ہندو مسلم فساد نہیں ہے اور ان کو فرقہ وارانہ فساد کہنا بھی غلط ہے۔ غنڈوں اور شرارت پسندوں نے ایک اسکیم بنائی ہے اور اس اسکیم کے ماتحت وہ جب چاہتے ہیں تب فساد کرتے ہیں۔ درحقیقت اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ جب انکوائری ہوگی تو اس میں یہ بات صاف ہو جائے گی۔

ایڈمنسٹریشن کی مجرمانہ چشم پوشی

ایڈمنسٹریشن نے جان بوجھ کر اس میں چشم پوشی کی یا ماتحت پولیس کے افراد نے ساتھ دے کر بربادی کرانے کی کوشش کی۔ اس وقت حکام نے لوکل حکام نے ایڈمنسٹریشن نے اپنی کمزوری بھی دکھائی اور اس سازش میں ان کا حصہ بھی دکھائی دیتا ہے۔ بقول سیٹھ جی کے (سیٹھ گوبند داس) ۳، ۴ تاریخ کو یہ واقعہ پیش آیا تھا اور اس کی روک تھام ہو سکتی تھی! لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ اسپیشل پولیس کے جو دستے بلائے گئے تھے وہ کیوں واپس چلے گئے تھے جس کے نتیجہ میں ۷ تاریخ اور ۸ تاریخ کی درمیانی رات کو اس قدر ہولناک بربادی ہوئی۔ جان بوجھ کر ایک سازش کی اس طریقے سے بربادی کرائی جائے یہ کسی طریقے سے بھی ہندوستان کے لئے زیبا نہیں ہے۔ ہم پاکستان اور اہل عرب کے خلاف اعتراض کریں وہ ہمارا حق ہے کوئی ہمارے معاملہ میں دخل نہ دے۔ ہم میں اتنی طاقت ہے کہ ہم اپنے ہندوستان میں اپنے معاملات کو حل کر سکتے ہیں۔ جنھوں نے ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد میں جان کی بازی لگا کر، ساتھ ساتھ شریک ہو کر ملک کو آزاد کرایا ہے جنھوں

نے "دو نیشن تھیوری" کو ماننے کے لئے جان کی بازی لگائی ہے۔ اپنوں سے گالیاں کھائی ہیں، جیلیں بھگتی ہیں، چاقو کھائے ہیں۔ ان کو آج ان باتوں سے کوئی ڈر نہیں ہو سکتا کہ جب بھی کوئی ایسی فساد کی من مانی بات کی جائے۔ مسلم اقلیت کی تکلیف کی بات آئے تو اخباروں یا تقریروں میں فوراً پاکستان کے حوالے دید یئے جائیں۔ پاکستان ریڈیو کے حوالے دیئے جائیں اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جائے کہ اس کا پاکستان سے جوڑ تھا۔ اس کا فلاں چیز سے جوڑ تھا۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس طریقہ سے حقیقت کو دبایا نہیں جا سکتا اور اگر اس طریقہ سے حقیقت کو دبانے کی کوشش کی جائے گی تو اس سے ملک کو کوئی لابھ اور فائدہ نہیں ہو سکتا بلکہ ملک کو انتہائی نقصان ہو سکتا ہے۔

یک طرفہ بربادی کیوں

اس حالت میں ہمیں اس بات کا کیا خوف ہے کہ کوئی کہتا ہے اور پاکستان کے ساتھ جوڑنے کا تیکنک کیوں اپنایا جاتا ہے ہم اس کے خلاف ضرور آواز اٹھائیں گے۔ کیا ہر جگہ ظلم اور بربادی ہوتی رہے گی اور اس کے بارے میں مسلمان اقلیت کسی بات کو کہے گی تو یہ کہہ کر اس کا منہ بند کر دیا جائے گا کہ پاکستان سے جوڑ ہے۔ پاکستان ریڈیو سے جوڑ ہے۔ اس طریقہ سے حقیقت کو دبایا نہیں جا سکتا ہے۔ یہ بات کوئی معنی نہیں رکھتی کہ اس طریقہ سے ایک اقلیت کو دبانے کی کوشش کی جائے۔ یہ دیکھنے کی بات ہے کہ جبل پور میں ایک سائڈ کی اس طرح بربادی کیوں ہوئی۔ جبل پور میں دو جانب سے کوئی بات ہوئی ہو مگر اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا پھر یہ بھی بتایا جائے کہ کس طرح ۹ تاریخ کو ساگر۔ کٹنی۔ دموہ۔ نرسنگھ پور۔ سردیا اور تمام دیگر مقامات پر ۱۲ سے ۴ بجے تک سازش سے سینکڑوں مکان جلا کر خاک کر دیئے گئے۔ کیا پولیس اور ایڈمنسٹریشن کے موجود ہوتے ہوئے کوئی اس طریقہ سے بربادی کر سکتا ہے۔ اطمینان کے ساتھ پٹرول چھڑکا گیا۔ اطمینان کے ساتھ آگ لگائی گئی۔ بڑی بڑی قلعہ نما عمارتیں خاک سیاہ کر دی گئیں۔

اقتصادی مار

ایک ایک انسان کا دس دس بارہ بارہ لاکھ کا نقصان ہوا۔ کالے خاں محمد حنیف کی کوئی معمولی رقم نہیں تھی دس بارہ لاکھ کا اس کا نقصان ہو گیا۔ اس کی بیڑی کی تجارت تھی وہ مسلمانوں کے ہاتھ میں تھی۔ اس کو اقتصادی مار مار کر برباد کر دیا گیا۔ فیروز آباد میں چوڑیوں کی تجارت تھی۔ وہاں مسلمانوں کی صنعت و حرفت کو تباہ کیا گیا۔ کیا کچھ فرقہ پرست عناصر نے یہ طے کر لیا ہے کہ اس طریقہ سے مسلمانوں کو جو ہو یہ وہ اکانومکس اور اقتصادیات میں خود بدحال ہیں اس ملک میں بالکل تباہ کر کے بھکاری اور فقیر بنا کر چھوڑ دیں اور یہ حکومت بے بس ہو۔ بے چارہ ہو اور کچھ کر نہ سکے۔ سب کچھ ہو جائے تو پھر اس کی انکوائری ہوتی پھرے اور اس کے بعد یہ کرو۔ وہ کرو۔ آخر اتنا بڑا واقعہ ہو کیسے گیا۔ تین ضلعوں میں بارہ جگہ ایسے واقعات کیسے ہو گئے۔ حکومت کو اس پر غور کرنا چاہیئے۔

دلّی کا واقعہ

مجھے اس کا احساس ہو رہا ہے کہ ان معاملات میں کب تک تسلسل جاری رہے گا۔ کیا پورے ہندوستان کو اس میں لپیٹ دیا جائے گا۔ ابھی دو تین دن پہلے دہلی میں بھی یہی تیکنک چلی تھی۔ لیکن وہاں کے ہندو اور مسلمان۔ ہم لوگ جو وہاں رہتے ہیں اچھے رات کو وہاں پہنچ کر تین بجے تک رہے اور ہندو لیڈروں کے ساتھ جو وہاں موجود تھے اس بات کی کوشش کی کہ اس کو کسی طریقے سے آگے نہ بڑھنے دیا جائے۔ میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ جن کے پاس طاقت، شکتی اور مادی پاور نہیں ہے۔ جب وہ اس طریقہ سے اس معاملے کو حل کر سکتے ہیں، تو ایڈمنسٹریشن، حکومت کے افراد۔ لوکل اتھارٹیز اگر چاہیں تو کیا امن قائم نہیں ہو سکتا۔

شرارت پسندوں کی حوصلہ افزائی

اگر حکومت بے بس نظر آتی ہے اور شرارت پسند لوگ جو کچھ چاہتے ہیں کر گزرتے ہیں۔

آج سب معاملوں میں ان کی مخالفت کرنے کے بجائے ان کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ زور شور کے ساتھ پارلیمنٹ میں یہ تو کہا جاتا ہے کہ فرقہ پرستی کو کسی بھی صورت میں برداشت نہیں کیا جائے گا۔ لیکن ہو کیا رہا ہے۔ مسلم اقلیت تباہ بھی ہو رہی ہے اور برباد بھی ہو رہی ہے اور ایکشن اور ری ایکشن کے نام پر شرارت پسند لوگ جو چاہتے ہیں کرتے جا رہے ہیں۔ اس طرح کی باتیں ہونے دینا کسی بھی سیکولر اسٹیٹ کے لئے مناسب نہیں ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔

زندگی کے مختلف پہلو اور مسلم اقلیت کا حال

میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ مسلم اقلیت کا ملازمتوں میں کیا حال ہے۔ کیا آپ نے کبھی اس کی انکوائری کی ہے کہ ان میں اقلیتوں کو کیوں نہیں لیا جا رہا ہے۔ کیا اقلیتوں کے جتنے بھی بچے ہیں۔ مسلمانوں سکھوں اور عیسائیوں کے جتنے بھی بچے ہیں وہ اتنے نالائق ہو گئے ہیں کہ ان کے

لئے کوئی جگہ ہی نہیں ہے۔ اسٹیٹ گورنمنٹس کے گزٹ چھپے ہوئے ہیں گورنمنٹ آف انڈیا کے گزٹ چھپے ہوئے ہیں بتایا جائے کہ ان پچھلے چودہ برسوں میں اقلیتوں کے کتنے لڑکے نوکریوں میں لئے گئے ہیں۔ پہلے تو ان کو انٹرویو میں ہی نہیں بلایا جاتا ہے اور اگر بلا بھی لیا جاتا ہے، تو اُن کو جگہ نصیب نہیں ہوتی ہے۔ وہ تباہ اور برباد ہو رہے ہیں۔ میں یہ مانتا ہوں کہ یہ ریزرویشن کا سوال نہیں ہے۔ لیکن اگر کوئی ایسے حالات میں ریزرویشن کی بات کہتا ہے یا ریزرویشن کی بات کو اٹھاتا ہے تو اُسے فرقہ پرست کہا جاتا ہے اور اس بنا پر کہا جاتا ہے کہ اُس نے ریزرویشن کا لفظ کیوں کہہ دیا۔ میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ سیکولر اسٹیٹ کے وہ لوگ کیا فرقہ پرست نہیں ہیں جو یہ چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کو ملازمت میں نہ لیا جائے اور ان کو تباہ اور برباد کیا جائے ان کی اقتصادیات اور ان کے طریقۂ زندگی کو ختم کیا جائے۔ آج مسلم اقلیت کو بھی یعنی ایک کمیونٹی کو دبانے کے لئے نہ ملازمت میں لیا جاتا ہے نہ تجارت کرنے دیا جاتا ہے روزمرہ کی جو شہری زندگی ہے۔ جو امن کی زندگی ہے اس تک کو بھی دینے کے لئے وہ تیار نہیں ہیں۔ میں پوچھنا چاہتا کہ اس سے زیادہ بھی کوئی فرقہ پرستی دوسری ہو سکتی ہے۔ اس کا کیا مطلب ہے میں یہ نہیں کہتا کہ اکثریت کے سبھی لوگ بُرے ہیں۔ اُن میں سے تھوڑے بُرے ہیں۔ اس میں ہندو مسلمان کا کوئی سوال نہیں ہے، ہندو مسلمان کا کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ دونوں گلے ملنے کو تیار ہیں۔ لیکن چند شرارت پسند لوگ اکثریت میں ایسے ہیں جو کہ اقلیتوں کو اس طرح سے دبانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر ان کی ہاؤس میں بھی مختلف طریقوں سے حوصلہ افزائی کی جائے تو کیا ہوگا۔ کیسے کام چلے گا۔ کیسے ہماری اسٹیٹ سیکولر اسٹیٹ بن سکے گی۔ آخر سیکولر اسٹیٹ کا مطلب کیا ہے صرف سیکولر اسٹیٹ کہہ دینے سے وہ سیکولر اسٹیٹ نہیں بن جاتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ روزمرہ کی جو زندگی ہے اس کو بسر کرنے کا سبھی کو حق حاصل ہو۔ ملازمت سبھی کو پانے کا حق حاصل ہو۔ تجارت کرنے کا سبھی کو حق حاصل ہو۔ لیکن کیا وجہ ہے کہ اقلیتوں کو آج نوکریاں نہیں ملتی ہیں۔ ملک کی اقتصادیات میں تجارت میں پرمٹ نہیں ملتے ہیں۔ فائیو ایر پلان میں کوآپریٹیو سوسائٹیز کو جو جگہ ملی ہوئی ہے ان کے بارے میں ان کو مایوسی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔

نصاب کی کتابیں

اسی طرح ٹیکسٹ بک کی بات ہے۔ اس کے بارے میں ہم نے ایک شکایت کی تھی اور وزیر تعلیم کو ایک کتاب دکھائی تھی اور اُنھوں نے ہماری بات کو صحیح تسلیم کیا تھا اور کہا تھا کہ اس قسم کی کتابیں نہیں پڑھائی چاہئیں۔ سوال یہ نہیں ہے کہ تیوہاروں کا ان میں کیوں ذکر کیا گیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ دیوالی ہی کا، دسہرہ ہی کا کیوں ذکر کیا گیا ہے یہ سب ہندوستان کے تیوہار ہیں۔ کسی کو اس میں کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا۔ لیکن جہاں اکثریت کے تیوہار کا ذکر ہے وہاں مسلمانوں کے جو تیوہار ہیں۔ عید ہے بقرعید ہے شب برات کیا ہے محرم کیا ہے۔ یا سکھوں کے تیوہار ہیں عیسائیوں کے تیوہار ہیں ان کا بھی اُن میں ذکر ہونا چاہیئے تھا۔ اگر یہ کیا گیا ہوتا تو سیکولر اسٹیٹ کے اصولوں کے عین مطابق ہوتا۔ لیکن اس کے برخلاف اس طرح کی باتیں ان کتابوں میں لکھی ہوئی ملتی ہیں کہ آؤ بچو بھگوان کرشن کی پوجا کریں۔ آپ بتائیں کہ مسلمان کے بچے یہ کیسے کریں گے۔ بھگوان کرشن کی پوجا ہندو کر سکتے ہیں۔ لیکن مسلمان سکھ۔ عیسائی کیسے کر سکتے ہیں۔ میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ اس طرح کی چیزیں پڑھانے کا اقلیتوں کے بچوں کو آپکو کس نے حق دیا ہے۔ مسلمان اپنے خداوند قدوس کی عبادت کرتے ہیں۔ سکھ اپنے طریقے سے کرتے ہیں۔ عیسائی اپنے طریقے سے۔ اور ان کو پورا حق حاصل ہے۔ آپ کو کس نے حق دیا ہے کہ آپ دوسرے مذہبوں کی توہین کریں۔ خدا اور رسول کی توہین کریں اور یہ پرچار کریں کہ وہ سب اس طرح کی چیزوں کو پڑھیں۔ آپ کو نہیں چاہیئے تھا کہ آپ کتابوں میں اس طرح کے مضامین لکھواتے اور اس طرح کتابوں کو ٹیکسٹ بکس میں جگہ دیتے مگر ٹیکسٹ بک کمیٹی نے یہ ارادہ کیا اور اس نے اس طرح کی کتابوں کو چُنا۔ ہمیں معلوم ہے کہ محض بعض رشتہ داروں سے بعض جاننے والوں سے اس طرح کی چیزیں لکھوا دیں جو اگرچہ تعصب کی بنا پر نہیں لکھی گئیں۔ تنگ نظری کی بنا پر نہیں لکھی گئی ہوں، بلکہ ناواقفیت کی بنا پر لکھی گئی ہیں۔ میں نے ایک لکھنے والے سے اس کے بارے میں پوچھا اس نے بتایا کہ میں اسلام کے بارے میں جانتا نہیں تھا اس لئے ایسا ہی لکھ دیا ہے۔ چونکہ ٹیکسٹ بک کمیٹی میں کسی کا کوئی رشتہ دار آ گیا تو اُس کی سفارش سے یہ کتاب ٹیکسٹ بک میں آ گئی ایسی کتابیں نہیں آنی چاہئیں اور اس طرح کی چیزوں کو اس میں جگہ نہیں ملنی چاہیئے۔ اس طرح کی چیزوں کے خلاف ہم بولیں گے۔ سیکولر اسٹیٹ کے اندر اس قسم کی کتابیں، خاص طور پر بیسک ایجوکیشن کے اندر اور پرائمری تعلیم کے اندر ہرگز ہرگز نہیں لگنی چاہئیں۔ نہیں پڑھائی جانی چاہئیں۔

جمعیۃ علماء ہند کا اجلاس اجین

سیٹھ جی نے جمعیۃ علماء کے بارے میں کہا کہ وہ بہترین باڈی ہے اور اس نے ہندوستان کی آزادی میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ لیکن اجین میں ایسی تقریریں ہوئی ہیں جن کو پڑھ کر حیرانی ہوتی ہے میں

کہتا ہوں کہ جو کچھ میں آج یہاں کہہ رہا ہوں، وہی سب کچھ وہاں کہا گیا ہے۔ میں اس باڈی کے لئے ذمہ دار ہوں۔ میں اس کی تجویزوں اور رائے کی تقریروں کے لئے ذمہ دار ہوں۔ ان میں کوئی بات نیشنلٹی کے خلاف نہیں کہی گئی ہے وہاں پر یہ شکایت کی گئی ہے کہ مسلم اقلیت کو دبایا جارہا ہے۔ فرقہ پرستی ابھرتی جارہی ہے اور حکومت بے بس ہوتی جارہی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس طرح کی باتیں کہنے میں کون سی اعتراض کی بات ہوسکتی ہے۔ جو کچھ کہا گیا ہے ٹھیک کہا گیا ہے۔ ان باتوں کے لئے اقلیت کے حق میں اگر آج سیٹھ جی نہیں بولتے ہیں یا رگھوناتھ سنگھ جی نہیں بولتے ہیں یا دوسرے ہندوستانی نہیں بولتے ہیں تو پھر مجبور ہو کر حفظ الرحمٰن کو بولنا پڑتا ہے تو اس میں اعتراض کی کیا بات ہے۔ ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ اکثریت خود ان چیزوں کو کہتی۔ لیکن اگر وہ نہیں کہتی ہے اور نہیں کہنا پڑتا ہے کہ اقلیتیں تکلیف میں ہیں۔ ان کی یہ مجبوریاں ہیں۔ وہ بے بس ہیں تو پھر اس پر کیوں اعتراض ہوتا ہے۔ بہرحال اس طرح کی چیزوں کو برداشت نہیں کیا جاسکتا ہے۔

انکوائری کا مطالبہ

بیشک اس کی ضرورت ہے کہ انکوائری ہو اور ہائی لیول انکوائری ہو۔ اگر ایڈمنسٹریشن میں کچھ لوگ اس کے لئے ذمہ دار ہیں۔ انھوں نے کوتاہی کی ہے تو ان کو سزا ملنی چاہیئے۔ آج مدھیہ پردیش کی سرکار فیلیور ہو رہی ہے۔ بھوپال سے لے کر آج تک کے جو واقعات ہوئے ہیں ان کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا چاہیئے کہ اسے کوئی حق حاصل نہیں ہے حکومت کرنے کا۔ اس طریقہ سے تباہ کر کے، کرش کر کے، برباد کر کے ہمیں یہاں رکھا جائے گا تو یقینی طور پر اس کے نتائج اچھے نہیں نکلیں گے۔ میں اسپیکر صاحب اور ڈپٹی اسپیکر صاحب سے درخواست کروں گا کہ وہ کوئی قانونی پوزیشن ایسی لائیں جس سے آسام اور بنگال کے معاملات پر لسانی فسادات کی بنا پر جب یہاں بحث ہوسکتی ہے۔ پارلیمنٹری ڈیلیگیشن وہاں جاسکتا ہے، ویسے ہی مدھیہ پردیش کے فسادات کے بارے میں بھی بحث ہو۔ پی ایس پی نے جمعیۃ علماء نے۔ کمیونسٹ پارٹی نے۔ کانگریس کے افراد نے سبھی نے مانا ہے کہ بہت بڑی تباہی آئی ہے تین ضلعوں کے مختلف حصوں میں ۔۔ اس پر بحث ہونی چاہیئے اور کھل کر بحث ہونی چاہیئے اس سے کوئی نقصان نہیں ہوگا اور اگر بحث ہو تو صفائی کے ساتھ سارے معاملات سامنے آئیں گے۔

پاکستان کا حوالہ بے معنی

جو تجویز بھگت درشن جی نے پیش کی ہے اس کی تو میں تائید کرتا ہوں، لیکن جن معاملات کا میں نے ذکر کیا ہے ان کے بارے میں پھر سے کہتا ہوں کہ پاکستان کا حوالہ دے کر آپ بچ نہیں سکتے ہیں۔ یہ کہہ کر کہ پاکستان کے ساتھ ان کا تعلق ہے، کام چل نہیں سکتا ہے۔ یہ کہا گیا ہے کہ ناگپور ٹائمس میں یہ لکھا ہے۔ مگر کیا آپ نے اسٹیٹسمین میں جو چھپا ہے اس کو پڑھا ہے ہندوستان ٹائمز میں جو چھپا ہے۔ اس کو پڑھا ہے۔ ٹائمس آف انڈیا میں جو چھپا ہے اس کو پڑھا ہے۔ آپ کو چاہیئے تھا کہ آپ اس کو بھی پڑھتے جنھوں نے کہا ہے کہ صرف ایک سائڈ ہی کو برباد کیا گیا ہے۔ جو کچھ ہوا ہے اس کا تقاضا تھا کہ وہاں الیکٹو فائنز لگتے۔ جس طرح کی وارداتیں ہوئی ہیں ان کو کوئی بھی برداشت نہیں کرسکتا ہے یہ طریقہ زندگی کا نہیں ہے۔ اس طرح کے طریقوں کو بدلنا ہوگا اور صحیح معنوں میں سیکولرزم کو لانا ہوگا۔ گاندھی جی کے بنائے ہوئے اخلاقی معیار اور نیشنلزم کو لانا ہوگا۔ میں یہ نہیں کہتا ہوں کہ اکثریت میں سبھی لوگ برے ہیں۔ اکثریت میں جو فرقہ پرست ہیں وہ جو کارروائی چاہے کریں من مانی کریں۔ خوش رہیں اور جو مسلمان اقلیت میں ہیں یا دوسری اقلیتیں ہیں ان کو ہمیشہ ہی دبانے کی کوشش کریں اور پاکستان کا حوالہ دے کر اس کو ایک تیکنیک کے طور پر استعمال کرکے۔ اس قسم کی حرکتیں وہ کرتے جائیں اس کو کبھی برداشت نہیں کیا جاسکتا ہے۔

ہم اس کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں ہاؤس برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہے، ممبر صاحبان برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ سب ہی کو اس کے خلاف آواز بلند کرنی ہے اور یہ کوشش کرنی ہے کہ صحیح معنی میں یہاں پر سیکولرزم قائم ہو۔

(۲۱ رفروری ۱۹۶۱ء ۔ ۵ ر رمضان ۱۳۸۰ھ)



پارلیمنٹ میں دوسری تقریر

۷ شوال ۱۳۸۰ھ - ۲۹ مارچ ۱۹۶۱ء

"امن وامان میں ناکام کانگریسی وزارتوں کو اخلاقی طور مستعفی ہوجانا چاہیئے۔ اگر وہ استعفیٰ نہ دیں تو وزارت داخلہ انکو نااہل قرار دیکر کرسی سے ہٹائے۔"

الجمعیۃ کا پرچہ یہاں (لوک سبھا میں) پڑھ کر سنایا جاتا ہے۔ میں پوچھتا ہوں کیا لکھا ہے اس میں؟ اس میں اتنا ہی تو لکھا ہے کہ جب تم تباہ و برباد ہو رہے ہو تو تم قانون کا احترام کرتے ہوئے اپنی جگہ ڈٹ کر رہنے کے لئے جتنا مقابلہ کر سکتے ہو کرو۔"

مسلمانوں کے بارے میں میں کہہ سکتا ہوں کہ اُن کو اُن کا حق نہیں ملا ہے ان کے ساتھ بالکل انصاف نہیں کیا گیا ہے اُن کو بالکل اگنور کر دیا گیا ہے بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے آپ گزٹ اٹھا کر دیکھیں کتنے مسلمان ملازمتوں میں لئے گئے ہیں۔

"یہ کتنی عجیب بات ہے کہ جس جمعیۃ علماء کے لاکھوں آدمیوں نے اپنی قربانیاں دے کر ہندوستان کو آزاد کرانے میں حصہ لیا۔ سیکولرزم نیشنلٹی قائم کرنے کے لئے جدو جہد کی سیکولرزم کی خاطر ایڑی چوٹی کا زور لگایا اور خون بہایا آج اس کو بدنام کیا جارہا ہے۔

ہم جان دینے کے لئے تیار ہیں اگر ہندوستان سے باہر کا کوئی ملک اپنی آنکھ بدل کر ہندوستان کو دیکھے، گولیوں کے سامنے بھی ہم سینہ تانے رہیں گے۔ لیکن اس کے برعکس ہم اس طریقے سے مسلمان اقلیت کو برباد اور تباہ ہوتے نہیں دیکھ سکتے۔ یہ طریقہ آپ کو بدلنا ہوگا، انصاف دینا ہوگا اور صحیح طور پر انتظام کرنا ہوگا۔

محترم اسپیکر صاحب!

منسٹری آف ہوم افیرز کے بارے میں کئی دن سے بحث جاری ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارا یہ محکمہ بہت ہی اہم ہے ملک کے امن وامان کا تعلق اسی سے ہے اور لوگوں کی معاشی زندگی اور سروسز کا تعلق بھی اسی سے ہے۔ میں بہت افسوس کے ساتھ مجبور ہوں چند ایسی باتیں گذارش کرنے پر جن کے بارے میں جی چاہتا تھا کہ وہ باتیں اگر پیش نہ آتیں تو آج مجھ کو ہاؤس میں کہنی پڑتیں۔

جہاں تک لا اینڈ آرڈر کا تعلق ہے، جہاں تک ملک کے امن و امان کا تعلق ہے، جہاں تک لوگوں کے جان و مال اور آبرو کا تعلق ہے اس معاملہ میں ۱۹۴۷ء سے لے کر اس وقت تک ہم محسوس کر رہے ہیں کہ ایک لا لیس نیس پیدا ہو چکی ہے اور ملک میں صحیح معنوں میں مضبوطی اور قوت کے ساتھ لا اینڈ آرڈر پر عمل نہیں کیا جارہا ہے اس میں کسی ایک فرقے کا سوال نہیں ہے۔ ہندو مسلمان سکھ عیسائی پارسی جتنے بھی بستے ہیں۔ آج کل ایسی زندگی ہوگئی ہے کہ ہر شخص یہ محسوس کرتا ہے کہ ملک میں ایک چیونٹی کی قیمت تو ہو سکتی ہے لیکن انسان کے جان و مال اور آبرو کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ یہ بات بہت خطرناک اور تکلیف دہ ہے اور اس بارے میں یہ کہنا کافی نہیں ہے کہ اسٹیٹ گورنمنٹوں کا کام ہے کہ وہ اپنے اپنے مقاموں پر ان چیزوں کا لحاظ کریں۔ گورنمنٹ آف انڈیا کی منسٹری آف ہوم افیئرز کی ذمہ داری یہ نہیں ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ سب سے بڑی ذمہ داری منسٹری آف ہوم افیرز کی ہے اس کا فرض ہے کہ وہ اسٹیٹس کی ہوم منسٹریوں کے کام کو خاص طور سے چیک کرے۔ وہ دیکھے کہ وہاں کس طرح سے کام ہو رہا ہے اور لوگ اپنے جان و مال اور آبرو کے بارے میں کیوں یہ محسوس کرتے ہیں کہ آج ہم آزاد اور محفوظ نہیں ہیں۔ میں حفظ الرحمٰن ہونے کی حیثیت سے یہ گناؤں کہ پچھلے تیرہ برسوں میں کتنے فسادات ہوئے ہیں۔ اور ان فسادات میں اقلیتوں اور خاص طور پر مسلم اقلیت کا کتنا نقصان ہوا ہے۔ کتنی تباہی ہوئی ہے تو یہ ایسی چیز ہے کہ جبلپور اور ساگر نے اس کو بالکل ننگا کر دیا ہے

واقعات اس طرح ہوئے ہیں کہ آج اُن کو دہرانے کی ضرورت نہیں ہے ہماری خواہش ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ ہاؤس کو بھی یہی خواہش ہے کہ کم سے کم لا اینڈ آرڈر کے بارے میں ایسی مضبوط پالیسی اختیار کی جائے کہ جس سے اسٹیٹس گورنمنٹس بھی اگر ہٹنے کی کوشش کریں تو ہٹ نہ سکیں۔ اسٹیٹس گورنمنٹس میں خاص طور پر ہوم منسٹر جتنے بھی ہیں

جتنے بھی حضرات ہوم منسٹر ہیں اگر ان میں کوئی ایسی کمزوری ہے کہ وہ اس طرح کی چیزوں کو سنبھال نہیں سکتے ہیں تو یہ اُن کا فرض ہے ان کی ڈیوٹی ہے۔ ان کا اخلاقی فرض ہے کہ وہ مستعفی ہو جائیں اور اگر وہ ناکام ثابت ہوئے ہیں تو اس طرح کرسیوں پر بیٹھے نہ رہیں۔

ہمارے سامنے شری لال بہادر شاستری جی کی مثال موجود ہے۔ جب وہ ریلوے وزیر تھے تو کوئی بار ایکسیڈنٹس ہوئے تھے جس طرح سے کہ اور منسٹریوں کے بارے میں ہوتے رہتے تھے لیکن ایک سخت ایکسیڈنٹ ہو جانے کے بعد انھوں نے اپنے آپ استعفیٰ دے دیا۔ انھوں نے محسوس کیا کہ میں ذمہ داری کے ساتھ کام کرنے کی کوشش کروں اور اگر عام طور پر کامیاب نہیں ہوں تو مجھے اس جگہ پر نہیں بیٹھے رہنا چاہیے۔ لیکن بڑے بڑے فسادات ساگر میں، دموہ میں، کٹنی میں، جبلپور میں ہو جائیں اور جو منسٹر ہیں وہ اسی طرح بیٹھے رہیں۔ کرسیوں پر قائم رہیں اور لوگوں کی جان و مال اور آبرو برباد ہوتے دیکھتے رہیں، یہ ان کے لئے کیسے جائز ہو سکتا ہے۔ چاہے یہ اقلیتوں کا سوال ہو یا اکثریت کا۔ ہمیں سبھی کی کی حفاظت کرنی ہے اور خاص طور پر اقلیتوں کی تو پوری قوت اور مضبوطی کے ساتھ کرنی ہے۔ میں یہ ایمانداری کے ساتھ کہتا ہوں کہ یہ پورے ملک کا سوال ہے۔ ملک کی آزادی کا سوال ہے، ملک کے وقار کا سوال ہے، ملک کی شانتی کا سوال ہے، ملک کی سالمیت کا سوال ہے، میں چاہتا ہوں کہ اس طرف خاص طور پر توجہ دی جائے۔

سروسز کا جہاں تک تعلق ہے میری گذارش ہے کہ میں نے پچھلی تقریر میں بھی اس طرف توجہ دلائی تھی کہ آپ مجھ سے فیگرز (اعداد و شمار) نہ مانگیں۔ بلکہ آپ کو اس بات کا پتہ ہونا چاہیے کہ ان چودہ سالوں میں گزیٹڈ پوسٹس اور نان گزیٹڈ پوسٹس میں اقلیتوں کے لوگ اور خاص طور پر مسلمان کس حد تک لئے گئے ہیں مسلمانوں کے بارے میں کہہ چکا ہوں کہ ان کو ان کا حق نہیں ملا ہے ان کے ساتھ بالکل بھی انصاف نہیں کیا گیا ہے ان کو بالکل اگنور کر دیا گیا ہے بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ آپ اپنے گزیٹ اٹھا کر دیکھیں کہ کتنے مسلمان ملازمتوں میں لئے گئے ہیں۔ بجائے اس کے آپ مجھ سے مطالبہ کریں کہ میں فیگرز آپ کو دوں یہ سرکاری گزٹ موجود نہیں ؟ ان سے سارے فیگرز آپ کو مل جائیں گے۔ ہزاروں کی تعداد میں جگہیں نکلتی ہیں اور میں جاننا چاہتا ہوں ان میں کتنے مسلمان لئے جاتے ہیں۔ میں نے پچھلی بار کہا تھا کہ آپ یہ نہیں فرما سکتے ہیں کہ ۱۹۴۷ء کے بعد تمام مسلمان ناقابل ہو گئے ہیں، نااہل ہو گئے ہیں۔ اگر ایسی بات نہیں ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ ان کو ملازمتوں میں نہیں لیا جاتا اور کیا وجہ ہے کہ ان کے ساتھ تعصب برتا جاتا ہے۔ آخر انہیں اس ملک میں رہنا ہے یہاں جینا ہے اور یہیں مرنا ہے تو وہ کہاں روزی پائیں اور ان کے نوجوان کہاں جائیں اور کس طرح سے اپنے آپ کو برباد ہوتے دیکھتے رہیں۔ قابل سے قابل نوجوان مسلمان ہوتے ہیں۔ فرسٹ ڈویژن میں وہ آتے ہیں۔ فرسٹ ڈویژن یونیورسٹی میں ان کی آتی ہے لیکن کوئی ان کو دو کوڑی کو نہیں پوچھتا ہے اور جب اس طرح کی کوئی شکایت کی جائے تو ہم سے فیگرز مانگتے ہیں یہ کہاں تک مناسب ہے کیا یہ ممکن ہے کہ میں تمام ہندوستان میں گھوم کر تمام گزیٹ جمع کروں اور آپ کو لا کر فیگرز بتاؤں۔ گورنمنٹ آف انڈیا کے آفس میں اس کا سکریٹریٹ ہے۔ صوبوں میں اسٹیٹس میں سکریٹریٹ ہیں آپ ان کا ریکارڈ ملاحظہ فرمائیں تو آپ کو پتہ چل جائے گا کہ مسلمانوں کی نسبت یہ کہنا کافی نہیں ہے کہ وہ ملازمتوں کے لئے درخواستیں نہیں دیتے ہیں۔ انٹرویو میں نہیں آتے ہیں۔ یہ بات صحیح نہیں ہے۔ اگر کبھی ایسا ہوا ہے کہ کوئی انٹرویو میں نہیں گیا ہے تو وہ مجبوری کی وجہ سے نہیں گیا ہے۔ اس لئے کہ بہتر سے بہتر پوزیشن کے باوجود چودہ چودہ مرتبہ درخواستیں دینے کے باوجود اگر اس کو انٹرویو تک میں نہیں بلایا گیا اور وہ مایوس ہو گیا ہے تو یہ ایک نیچرل سی بات ہے میں چاہتا ہوں کہ اس طرف خاص طور سے آپ کی توجہ جائے۔

ایک اور بات (میں مختصر طور پر کہہ دینا چاہتا ہوں ایک وقت تھا جب ریلوے ملازموں کے بارے میں اور ساتھ ہی دوسرے ملازموں کیلئے کچھ ایسے احکام ہوئے تھے اگر سی آئی ڈی ان کی رپورٹ کر دے تو ان کو ملازمت سے الگ کر دیا جائے اگر کسی کی ایکٹوٹیز خراب ہوں تو اس کے بارے میں ایسا کیا جاتا

تھا لیکن جب سی آئی ڈی نے اس کو غلط استعمال شروع کیا تو ہم نے ایسے معاملے سردار پٹیل کے سامنے پیش کئے اور ان سے خاص طور پر کہا کہ یہ کیا ہو رہا ہے کہ سی آئی ڈی جس کے بارے میں چاہے اس کے بارے میں بے دلیل کوئی چیز لکھ دے اور اس کو نوکری سے برطرف کر دیا جائے کیا یہ کوئی مسئلے کا ٹھیک حل ہے۔ اس وقت سردار پٹیل نے کہا تھا کہ کیبنٹ نے متفقہ طور پر طے کر دیا ہے کہ سی آئی ڈی کا لکھ دینا کافی نہیں ہوگا جب تک کہ وہ برابر اس کے بدلے میں ریزنز اور دلیلیں نہ دے کہ فلاں فلاں ایکٹوٹیز اس نے دیکھی ہیں جو قومی نقطۂ نظر کے لئے مضر ہیں اور جب تک ایسا نہیں ہوگا ان کے خلاف کارروائی نہیں کی جائے گی لیکن پچھلے دنوں سے ایسا نہیں ہو رہا ہے۔ بلکہ یہی طریقہ چل رہا ہے کہ مسلمانوں کو جماعت اسلامی کا ممبر بتا کر اور کبھی فرقہ پرست ایکٹوٹیز بتا کر تنہا سی آئی ڈی کی رپورٹ پر جس میں کوئی ریزن اور دلیل نہیں دی گئی ان کو الگ کر دیا گیا۔

شری تیاگی (دہرہ دون) ایسا ہوا ہے؟

مولانا حفظ الرحمن۔ سات کیسز میرے پاس ہیں جن میں تین کیس بڑی مشکل سے ٹھیک کرا سکا ہوں۔ چار کیسز ابھی بھی جاری ہیں۔ خدا جانے اور ہندوستان میں اس طرح کے کتنے کیسز ہوں گے یہ تو وہ کیسز ہیں جو میری نظر میں آئے ہیں۔ بہار میں عتیق کا معاملہ تھا جو کہ ڈیڑھ پونے دو سال کے بعد بڑی جدوجہد کے بعد ٹھیک ہوا۔ کوئی ناجائز کارروائی اس نے نہیں کی تھی لیکن ایک لفظ سی آئی ڈی نے لکھ دیا کہ وہ جماعت اسلامی سے تعلق رکھتا ہے اور وہ برخاست کر دیا گیا۔ راجستھان کا کیس موجود ہے اور وہ چل رہا ہے اور اس طرح سے خدا جانے اور کتنے کیس ہوں گے۔ ایک پلان کہئے یا ایک ٹیکنک کہئے جب چاہتے ہیں کسی کو جماعت اسلامی کا ممبر بتا کر یا کسی کو اور بنا پر برطرف کر دیا جاتا ہے باقی سارے کے سارے چاہے وہ جن سنگھ سے تعلق رکھتے ہوں یا ہندو مہاسبھا سے ان کو برداشت کر لیا جاتا ہے۔ اور ان پر کوئی الزام نہیں لگایا جاتا۔

یہ پہلا موقع ہے جب مسلم اقلیت کی تباہی کے بارے میں جبلپور ساگر وغیرہ کے واقعات سے متاثر ہو کر اس ہاؤس کے ہندو مسلم سکھ پارسی وغیرہ سبھی ممبر صاحبان نے اس بات کا اظہار کیا ہے کہ یہ بہت بھاری زیادتی ہوئی ہے اور بہت ہی برا ہوا ہے۔

اور بہت سی جماعتوں نے اسٹیٹمنس (بیانات) دئے بھی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ہوتا کیا ہے کہ اس ہاؤس میں بعض بھائی ہیں جو چاہتے ہیں کہ اس کو ہلکا کرنے کے لئے الٹا مسلم اقلیت ہی کو مجرم قرار دیا جائے۔ کبھی جمعیۃ علماء کا نام لیا جاتا ہے کبھی الجمعیۃ اخبار پڑھ کر سنایا جاتا ہے۔ اس اخبار نے کیا لکھا ہے؟ ایک دھرم کا کوئی قصور نہیں ہے، آرگنائزر کا کوئی قصور نہیں ہے، اس قسم کے اخبارات جو مسلمانوں کو انتہائی طور پر ذلیل کرتے رہتے ہیں ان کو پاکستانی بتاتے رہتے ہیں اور صاف لکھتے ہیں کہ مسلمانوں کے لئے یہاں کوئی جگہ نہیں ہے ان کے رہنے کے لئے کوئی مقام نہیں ہے، ان کو یہاں نہیں رہنا چاہئے اور اسی طرح جن اخبارات میں قتل تک کی دھمکیاں لکھی جاتی رہی ہیں ان کا کوئی جرم نہیں ہے اس میں۔ اس میں اتنا ہی تو لکھا ہے کہ جب تم تباہ و برباد ہو رہے ہو تو تم قانون کا احترام کرتے ہوئے ہر جگہ پروٹیکٹ کر رہنے کے لئے جتنا مقابلہ کر سکتے ہو کرو۔ اس میں یہ نہیں کہا گیا ہے کہ قانون ہاتھ میں لے لو، قانون کا احترام مت کرو۔ لیکن ضرور کہا گیا ہے کہ مایوس نہ ہو ڈیمارلائز نہ ہو ڈٹ کر ڈیفنس کرو۔ ایسا کرنا تمہارا حق ہے۔

میں پوچھتا ہوں کہ اس میں کون سی بری بات ہے جو لکھی گئی ہے یہاں پر الجمعیۃ کے تراشے پڑھے جاتے ہیں۔ میرے پاس بیسوں تراشے ہیں جن کو میں پڑھ کر سنا سکتا ہوں۔ وقت نہیں ہے کہ سبھی کو میں پڑھ کر سناؤں لیکن ایک دو کٹنگ میں پڑھ کر سنانا چاہتا ہوں۔ پرتاپ میں جو لکھا گیا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کبھی مسلمانوں کو پاکستانی بنایا جاتا ہے اور کبھی اور کسی طرح سے اشتعال دلایا جاتا ہے۔ اس میں لکھا ہے:۔

> رہ گیا سوال مسلمانوں کی وفاداری کا۔ اس کا جواب ہندوستان کے مسلمان خود دے سکتے ہیں اور افسوس سے کہا جائے گا کہ ان کے دل میں آج بھی پاکستان کے لئے ہمدردی ہے۔

> آگے چل کر اس نے لکھا ہے:۔

> "پچھلے دنوں بیدر کے شہر میں مسلمانوں نے کھلے بندوں پاکستانی جھنڈا لہرایا اور پاکستان کے حق میں نعرے لگائے اس سے پہلے ایسا ایک واقعہ مدراس میں بھی ہو چکا ہے کیا اس کے بعد بھی سوال کیا جاتے گا کہ کیوں مسلمانوں پر شک کیا جا رہا ہے"۔

حالاں کہ یہ سب الزامات غلط ثابت ہو چکے ہیں ایک جگہ وہ فرماتے ہیں:۔

"مولانا صاحب نے یہ بھی مطالبہ کر دیا کہ نوکریوں میں مسلمانوں کے لئے جگہ مخصوص ہونی چاہیئے، گویا کہ مولانا صاحب بھی اپنے آپ کو ہندوستانیوں کا نمائندہ تصور نہیں کرتے بلکہ صرف مسلمانوں کا، ایسی حالت میں اگر فرقہ پرستی زور پکڑ جائے تو کیا تعجب ہے"۔

آگے چل کر لکھا ہے :۔

کیا یہ واحد واقعہ ہے اپنی قسم کا۔ کیا روزمرہ ایسے واقعات نہیں ہو رہے ہیں۔ ابھی پچھلے دنوں دہلی میں اس طرح کا ایک واقعہ ہوا کیا پردھان منتری بتائیں گے کہ یہ کیوں اور کیسے ہوا۔ اور اس کی بابت سرکار نے کیا کیا۔ کیا یہ امر واقعہ ہے یا نہیں کہ جبلپور کے واقعہ کے بعد ناگپور میں ایسا ہی واقعہ ہوا اور شہر کی پولیس کے آشواسن پر پورا ایک ہفتہ اس واقعہ کو شائع نہ کیا گیا۔ کیا واقعہ ہے یا نہیں کہ پچھلے دنوں پبلک ورکس پر ناسک ضلع کے مالی گاؤں کے مسلمانوں نے پاکستانی جھنڈا لہرایا۔ بیدر میں جو کچھ ہوا اس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ جب سرکار نے ان مسلمانوں کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی تو لوگوں کو ہڑتال کرنا پڑی۔ فیروزآباد میں ایک مسجد سے جنم اشٹمی کے جلوس پر پتھر پھینکے جاتے ہیں جبلپور میں مسجد سے گولی چلائی جاتی ہے اور تیزاب سے بھرے بلب پھینکے جاتے ہیں۔ یہ سب کچھ کیوں ہو رہا ہے ایک واقعہ ہو تو اسے نظر انداز کریں لیکن جب یکے بعد دیگرے ایسے واقعات ہو رہے ہوں اور پولیس حرکت میں نہ آئے کیوں کہ اوپر بیٹھے کانگریسی وزیروں کو مسلمانوں کی ووٹیں چاہئیں اور اس لئے وہ مسلمان غنڈوں کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کر سکتے"۔

ایک جگہ فرماتے ہیں :۔

فرقہ پرستی اور پنڈت نہرو

کانگریس ورکنگ کمیٹی اعلان کرتی ہے کہ جبل پور کے واقعات کی تحقیقات کی جائے گی۔ بیشک یہ ہونی چاہیئے۔ لیکن یہ بھی تو بتا دیا جائے کہ آسام کے حالیہ فسادات کی تحقیقات کیوں نہ کی گئی؟ کیا جبل پور کے واقعات کی تحقیقات اس لئے ہوئی ہے کہ اس میں ہندوؤں کو بھی رگڑا جا سکے گا اور آسام کی اس لئے نہیں کہ وہاں کانگریسی حکومت کی نالائقی اور کانگریسیوں کی جانبداری منظر عام پر آئے گی یہ دوغلی ہے جو کانگریس کو بدنام کرتی ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ آسام کے بدمعاشوں کو تو معاف کر دیا جائے کیوں کہ وہ کانگریسی ہیں اور جبل پور میں لوگوں کو دھر لیا جائے کیوں کہ وہ کانگریسی نہیں۔ ...... یہ نہیں ہو سکتا کہ بدمعاشوں کی تو حوصلہ افزائی کی جائے اور فرقہ پرستوں کو سزا دی جائے، ملک کے کسی بھی کونے میں اگر ایک بھی قصور وار کو معاف کیا جائے گا تو اس کا اثر ملک کے چالیس کروڑ باشندوں پر ہوگا۔ حکومت کرنا بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ پنڈت نہرو اور ان کے ساتھیوں کو سمجھ لینا چاہیئے کہ ان کے اپنے عمل سے فرقہ پرستی بڑھ رہی ہے اور یہ اس لئے بڑھ رہی ہے کہ فرقہ پرست یہ دیکھ رہے ہیں کہ نہرو حکومت میں ان بدمعاشوں کو کوئی پوچھنے والا نہیں جو کانگریسی ہیں یا کانگریسیوں سے وابستہ ہیں۔ تخریبی عناصر سب ایک ہیں چاہے یہ جبل پور رہتے ہوں اور چاہے آسام میں"۔

اس طرح کی اشتعال انگیز تحریریں مسلمانوں کے خلاف لکھنا کیا فرقہ پرستی نہیں ہے اور کیا یہ ٹھیک ہے یہ کونسا طریقہ ہے اس سے امن وامان کیا قائم رہ سکتا ہے کس طرح سے اس کا تحفظ ہو سکتا ہے۔ یہ کتنی عجیب بات ہے کہ جس جمعیۃ علماء کے لاکھوں آدمیوں نے اپنی قربانیاں دیکر ہندوستان کو آزاد کرانے میں حصہ لیا۔ سیکولرزم نیشنلسٹی قائم کرنے کے لئے جدوجہد کی، سیکولرزم کی خاطر ایڑی چوٹی کا زور لگایا اور اپنا خون بہایا آج اسی کو بدنام کیا جائے۔

اگر ایک ایسے موقع پر جب مسلمانوں کی یہ بربادی ہوئی اس نے دو چار آرٹیکلس ایسے لکھ دیئے جس میں کہ مسلمان بالکل ڈیمارلائز نہ ہو جائیں، بے بس نہ ہو جائیں تو وہ فرقہ پرستی ہے اور صبح سے شام تک جو آگ ان کے خلاف برسائی جائے اسے کوئی فرقہ پرستی نہیں کہتا۔

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

سچ کہا ہے کسی شاعر نے ؎ جب کوئی فتنہ زمانہ میں نیا اٹھتا ہے
وہ اشارے سے بتا دیتے ہیں تربت میری

سارا قصور جو ہے وہ مسلمان بیچارے کا ہے۔ اس ہندوستان میں جب سے پارٹیشن ہوا ہے مسلمان سے زیادہ غدار، مسلمان سے زیادہ بے ایمان اور غیر وفادار کوئی ہے ہی نہیں، یہ کس قدر افسوسناک پہلو ہے لیکن اس میں ہماری ہوم منسٹری کی طرف سے کوئی ایسا قدم نہیں اٹھایا گیا جس سے اقلیتوں کو خاص طور پر مسلمان اقلیتوں کو یہ خیال پیدا ہو کہ ہم بھی اس ملک کے برابر کے باشندے ہیں۔ ہم سیکولر اسٹیٹ کو مانتے ہیں، ہم نے اپنی جانیں دی ہیں۔ آج کسی فرقہ پرست کو اس ملک سے کیسے محبت ہو سکتی ہے۔ جب انگریز کی گولیاں چل رہی تھیں تو یہ سب کنڈی اور کواڑ بند کرکے بیٹھے تھے آج ہو سکتا ہے ان کو اپنے ملک سے محبت نہ ہو لیکن جنھوں نے ۱۹۴۲ء میں چاندنی چوک میں کھڑے ہو کر مسٹر علی سپرنٹنڈنٹ سے کہا تھا کہ گولی مار سکے تو مار مگر آزادی کا عہد نامہ پڑھا جائے گا اور جو لوگ ملک کی خاطر جیلوں میں سڑ سکتے ہیں ان سے زیادہ ملک کا دوست کون ہو سکتا ہے مگر آج وہ سارے فرقہ پرست ہیں۔ ان کے اخبار فرقہ پرست ہیں اور وہ لوگ جو کانگریس یا نیشنلسٹ جماعتوں کے صدقے میں اس آزاد ملک میں بیٹھے ہیں اور ہمیشہ فرقہ پرستی برتتے رہے ہیں وہ اسلئے دوسروں کو بدنام کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر یہ سب کیوں ہے، مجھے ان سے شکایت نہیں ہے مجھے ہوم منسٹری سے شکایت ہے، مجھ کو اس کی شکایت ہے کہ اسٹیٹوں کے اندر جو ہوم منسٹر آپ مقرر کرتے ہیں ان کے کام کو دیکھا نہیں جاتا۔ اسٹیٹ کے اندر اگر آپ لا اینڈ آرڈر کی ذمہ داری کسی کو دیں تو آپ کو چیک کرنا ہوگا کہ وہ صحیح طور پر عمل کر رہا ہے یا نہیں، ساری ذمہ داری آپ کے اوپر ہے اسٹیٹ کے اوپر نہیں۔ اگر اسٹیٹ گورنمنٹیں اس طرح کرتی ہیں تو وہاں کانگریس کی گورنمنٹیں ہیں ان کا فرض ہے کہ وہ اخلاقی طور پر وہاں سے مستعفی ہوں اور اگر استعفیٰ نہ دیں تو آپ ان کو اس کرسی سے ہٹا کر کہیں کہ وہ اس قابل نہیں ہیں کہ ذمہ داری لے سکیں۔

آج جبل پور میں جو جوڈیشل انکوائری ہو رہی ہے ہمارے سامنے یہ آیا تھا کہ وہاں تین آدمی اس کے لئے رکھیں جائیں گے ایک جج ہوگی جس میں کوئی نہ کوئی سپریم کورٹ کا جج ہونا چاہیے تھا جس میں خود مدھیہ پردیش کا جج ہونا چاہیے تھا۔ ایک جج صاحب بیچارے آئے۔ میں ان کے خلاف کچھ نہیں کہتا وہ ٹھیک ہی ہوں گے لیکن ایک گوالیار کے جج صاحب مقرر کر دیئے گئے۔ وہ بھی اس حالت میں کہ جبلپور اور ساگر کے سارے حکام جنھوں نے ان مسلمانوں کو تباہ کرنے میں حصہ لیا ہے یا چشم پوشی برتی ہے وہ وہاں موجود ہیں۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، اپنے کانوں سے سنا ہے آج بھی وہ حکام کہہ رہے ہیں کہ اگر ہمارے موافق مسلمانوں نے گواہی نہ دی تو ان کا وارنٹ کاٹ دیا جائے گا اور وہ جیل میں بھیج دیئے جائیں گے۔ آج ان میں سے کسی کا تبادلہ نہیں ہوا ہے۔ ایسی حالت میں لوگوں کو کیسے انصاف ملے گا۔ اگر جوڈیشل انکوائری ہو تو اس میں مہربانی کرکے باہر کے جج رکھے جائیں۔ ایک سپریم کورٹ کا جج ہونا چاہیے ایک ساؤتھ کا جج ہونا چاہیے۔ گوالیر کے جو صاحب موجود ہیں وہ بھی رہیں لیکن تمام حکام کا ٹرانسفر لازمی ہے۔ ورنہ یقینی طور پر اس انکوائری سے کبھی بھی انصاف نہیں ہو سکتا اور ہم کبھی مطمئن نہیں ہو سکتے اور کوئی بھی انصاف پسند ہندو مسلمان مطمئن نہیں ہو سکتا۔ یہ میں ہی نہیں کہتا بلکہ انصاف پسند ہندو کہتے ہیں، سکھ کہتے ہیں کہ یہ کیا انکوائری ہے جس کے اندر ایک آدمی گوالیر سے اٹھا کر بٹھلا دیا گیا اور تمام کے تمام حکام پولیس اور ایڈمنسٹریشن وہی جما بیٹھا ہوا ہے جو کہ لوگوں کو ہیرلیس کر رہا ہے اور مسلمانوں کو دھمکاتا ہے کہ تمہارے اوپر مقدمہ چلا دیں گے اور تمہارا یہ کر دیں گے وہ کر دیں گے آخر اس طرح سے کیسے انصاف ملے گا اور کیسے صحیح گواہ لائے جا سکتے ہیں۔ اس کا انتظام نہیں ہوا تو کیسے کام ہوگا۔

شری تیاگی :- آج بھی وہ کام کرتے ہیں۔

مولانا حفظ الرحمٰن :- وہی لوگ ہیں۔

شری ایس ایم بنرجی (کانپور) :- کسی کا تبادلہ نہیں ہوا ہے ؟

مولانا حفظ الرحمٰن - سب اسی طریقے سے قائم ہیں۔ جب تک جبلپور سے وہ نہیں ہٹیں گے تب تک کسی طرح کا انصاف ملنا ناممکن ہے اگر میں اس چیز کو یہاں نہ کہوں ہاؤس میں نہ کہوں، اپنے ہوم منسٹر سے نہ کہوں جن کا ہم احترام کرتے ہیں جو ہمارے معاملات کو صحیح کرنے میں کوشش کرتے ہیں۔ تو کس سے کہوں۔ ہم ان سے ضرور کہیں گے۔ میں اس موجودہ پوزیشن سے مطمئن نہیں ہوں۔ میں ہاؤس کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر یہی طریقہ جاری رہے گا تو اس طرح سے اطمینان نہیں مل سکتا۔ بھلے ہی آپ اپنا ڈھنڈورا پیٹتے رہیں کہ ہم سیکولر اسٹیٹ ہیں کوئی عقلمند اس بارے میں مطمئن نہیں ہو سکتا۔

ہم جان دینے کیلئے تیار ہیں اگر ہندوستان سے باہر کا کوئی ملک آنکھ بدل کر ہندوستان کو دیکھے۔ گولیوں کے سامنے بھی ہم سینہ تانے رہیں گے لیکن اسکے برعکس ہم اس طریقہ سے مسلمان اقلیت کو برباد اور تباہ نہیں دیکھ سکتے یہ طریقہ آپ کو بدلنا ہوگا، انصاف دینا ہوگا، صحیح طور پر انتظام کرنا ہوگا اور مجھ جیسے بولنے والے کو یہ کہکر چپ نہیں کیا جا سکتا کہ ایسی باتیں کرنا فرقہ پرستی ہے۔ اگر مجھ پر ہزاروں فرقہ پرستیوں کا لیبل بھی لگا دیا جائے تو وہ میری قوم پرستی کو خاک میں نہیں ملا سکتی بلکہ میری قوم پرستی کی آگ میں خود ہی

ہندوستان کا باشندہ ہونے کے باوجود کسی کو جائیداد سے محروم کردینا ناانصافی کی بات ہے

لوک سبھا میں وزارت بحالیات سے متعلق مطالبات زر کی بحث کے دوران مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن کی تقریر۔ مرد

۱۱۔ اپریل ۵۰ء کو لوک سبھا میں وزارت بحالیات سے متعلق مطالبات زر کی بحث میں حصہ لیتے ہوئے حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے ان مسلمانوں کے معاملہ کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا جنھیں وزارت بحالیات نے نکاسی ایکٹ کی دفعہ ۱۶ کے استفادہ سے محروم کر دیا ہے۔ آپ نے اسے ناانصافی قرار دیا اور وزیر بحالیات سے اپیل کی کہ اس سوال پر غور کریں اور دیکھیں کہ محض اصطلاحی بنا پر کسی کے ساتھ بے انصافی نہ ہو۔ حضرت مولانا نے ان مسلمانوں کا تذکرہ کرتے ہوئے جو اپنے ہی وطن میں بے گھر ہو کر رہ گئے ہیں۔ دہرہ دون اور گنگا نگر (راجستان) کے مسلمانوں کے معاملہ پر توجہ دینے کی اپیل کی۔ حضرت مولانا نے یہ بھی کہا کہ کسٹوڈین جنرل کا دفتر مصوری منتقل نہ کیا جائے۔ اگر منتقل کیا ہی جاتا ہے تو اسے لکھنؤ میں منتقل کیا جانا چاہئے۔ حضرت مولانا نے تقریر شروع کرتے ہوئے کہا پرا پرٹی ایکٹ دفعہ ۱۶ کا مفاد یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی جائیداد کے متعلق جس کو کسٹوڈین نے گزٹ کر دیا ہو، کسٹوڈین اور چیف کسٹوڈین کے یہاں ناکام ہو جائے اور منسٹری میں شکایت کرے کہ جائیداد میری ہے تو وہ کیس قابل سماعت ہوتا تھا اور منسٹری اس پر غور کرتی تھی۔ اس طرح اگرچہ ناانصافی بھی ہو جائے تو اطمینان رہتا تھا کہ ہمارے کیس پر پھر سے غور کیا جا سکتا ہے لیکن گزشتہ آٹھ دس ماہ سے اس دفعہ کی نئی تعبیر منسٹری کی جانب سے کر دی گئی ہے۔ جس سے میں حیران ہوں اور اس پر سخت احتجاج کرتا ہوں کہ اب بغیر سماعت کے منسٹری سے یہ کہہ کر درخواست مسترد کر دی جاتی ہے کہ تم نے چونکہ تمھاری جائیداد گزٹ نہیں کی ہے۔ بلکہ پاکستان جانے والے کی جائیداد گزٹ کی ہے اس لئے تمھیں اس کی شکایت کرنے کا کوئی حق نہیں ہے

محترم اسپیکر صاحب غور فرمایئے کہ یہ کتنی ناانصافی کی بات ہے کہ ایک شخص ہندوستان ہی کا باشندہ ہے کبھی پاکستان نہیں گیا۔ اس کے باوجود کسٹوڈین نے اس کی جائیداد کو اپنے قبضہ میں کر لیا ہے اور اگر یہ شخص ہندوستانی شہری کی حیثیت سے اپنی فریاد کرتا ہے تو داد رسی کے بجائے یہ جواب مل جاتا ہے کہ تم کو دفعہ ۱۶ کے تحت درخواست دینے کا حق نہیں ہے۔ میں نے تحریری اور زبانی بھی محترم وزیر بحالیات کو اس ناانصافی کی طرف توجہ دلائی تھی اور وزیر موصوف نے ہمدردانہ غور کرنے کا وعدہ فرمایا تھا۔ لیکن افسوس ہے کہ اس وقت تک سیکڑوں درخواستیں مسترد کی جا چکی ہیں اور دفعہ ۱۶ کے تحت متذکرہ کارروائی کرنے کی طرف توجہ نہیں دی گئی۔

محترم اسپیکر صاحب! آپ کو معلوم ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی بڑی تعداد ایسی ہے جو اپنے ہی ملک میں بے گھر ہو گئے ہیں لیکن ان کی بدقسمتی ہے کہ نکاسی ایکٹ کے پیش نظر وہ پناہ گزینوں کی طرح گھروں میں نہیں آ سکے۔ اب اس بارے میں کوئی بحث کرنا بے کار ہے جب کہ یہ مسئلہ ہی قریب الختم ہے۔ لیکن کیا یہ انصاف کا تقاضہ نہیں ہے کہ اگر اسی ہندوستان میں چند سو مسلمان ایسے موجود ہوں جو اس قابل نہیں کہ کیبنٹ کی فیس دے کر اپنی جگہ سے دلی میں دوڑ کر اور آ آ کر مقدمے کر سکیں تو ایک استثنائی طور پر ان کے ساتھ بھی ریفیوجیوں جیسا معاملہ کیا جائے اور ان کو بسانے کا انتظام کیا جائے۔ لیکن سخت افسوس ہے کہ اس طرف توجہ نہیں دی گئی۔

جولائی ۱۹۴۹ء میں

دہلی میں فرقہ پرستوں کی سرگرمیوں پر ایک بصیرت افروز بیان

کیا میں پوچھنے کا حق رکھتا ہوں کہ جب انڈین نیشنل کانگریس اور حکومت ہند نے کسی پس و پیش کے بغیر یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ انڈین یونین کی حکومت ایک سیکولر (غیر مذہبی) اسٹیٹ ہوگی تو اگر میں سچا کانگریسی ہوں اور قوم پرور خادم ہوں تو کیا میرا یہ فرض نہیں ہے کہ میں اس کو عملی شکل دینے میں حکومت اور قومی جماعت کا پورا پورا ساتھ دوں۔ اگر حکومت ہند اور کانگریس کے اس صاف فیصلہ کے بعد کسی فرقہ کے فرقہ پرست افراد اپنی عددی اکثریت کے بل بوتے پر دوسرے کسی فرقہ کو مرعوب خوف زدہ اور پامال کرنے کے لئے ایک ہی قسم کے حیلے بہانے تراش کر اس ملک میں ظلم کا رواج کرنا چاہیں تو کیا مجھ کو اس لئے خاموش ہو جانا چاہئے کہ یہ زیادتی ایک ایسے فرقہ پر ہو رہی ہے جو میرا ہم مذہب ہے۔

ایک اور پتہ کی بات

میں تو ہندوستان میں اس ہندو راج کو بھی خوش آمدید کہنے کے لئے تیار ہوں جو ہندو دھرم کے صحیح اصولوں کے مطابق قائم کیا جائے۔ اس لئے کہ میرا یقین ہے کہ ہندو دھرم کے صحیح اصول کبھی بھی اس کی اجازت نہیں دے سکتے کہ محض اس بنا پر کہ

مسلمان اقلیت میں ہیں نہ مسرا مذہب رکھتے ہیں یا ان سے ہم مذہبوں نے دوسرے ملک میں ہندو سکھوں پر زیادتی کی ہے۔ اس لئے ہندو سکھ یہاں کے بے قصور مسلمانوں پر طرح طرح کی زیادتیاں کرکے ان میں خوف دہراس پیدا کریں۔ ان کو مرعوب کرنے کی کوشش کریں اور جھوٹے الزامات کا بہانہ بنا کر ان کی عزت وآبرو کو مٹائیں اور اس پر فخر کریں۔

قومی زبان کے مسئلہ پر

کانگریس کانسٹی ٹیوٹ پارٹی میٹنگ میں ایک احتجاجی تقریر

۔یکم ستمبر ۱۹۴۹ء کو دستور ساز اسمبلی کی کانگریس پارٹی میں قومی زبان کا مسئلہ زیر بحث آیا تھا جس میں ہر دو فریق نے پوری سرگرمی سے حصہ لیا۔ اس وقت ڈاکٹر امبیڈکر کا مسودہ تجویز زیر بحث تھا۔ مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے اس ڈرافٹ پر زبردست تنقید کی اور اسے قطعی طور پر غیر منصفانہ قرار دیا آپ نے کہا کہ اس کے باوجود کہ ہم ہر موقع پر مہاتما گاندھی کا نام استعمال کرتے ہیں اس مسودہ میں گاندھی جی کے طے کردہ اصول کی قطعاً خلاف ورزی کی گئی ہے۔

یہ وہ اصول تھے جنھیں گاندھی جی آخر دم تک سچ سمجھتے رہے اور انھیں کا پرچار کرتے رہے۔ یونین کی زبان ہندی ہوگی اور رسم الخط دیوناگری ہوگا۔ یہ نہ صرف گاندھی جی کے اصول کو چیلنج ہے بلکہ کانگریس کی اسی میس سالہ تاریخ کو بھی چیلنج ہے جس میں کانگریس بار بار یہ یقین دلاتی رہی ہے کہ ملک کی قومی زبان ہندستانی ہوگی جو دیوناگری اور اردو دونوں رسم الخط میں لکھی جائے گی۔

یہ کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ اس ڈرافٹ میں زبان کے مسئلہ کو زبان کی حیثیت میں نہیں دیکھا گیا، بلکہ پولیٹکل نگاہ سے دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے اور وہ بھی کچھ اس تنگ نظری اور تنگ دلی کے ساتھ کہ ہندستان کے کروڑوں ہندو، مسلمان باشندوں کی مشکلات کو محض اس لئے نظر انداز کر دیا گیا ہے کہ وہ ردعمل نمایاں طور پر ظاہر ہو جاتے جو پارٹیشن اور تقسیم ہند سے پیدا ہو گیا ہے۔ میرے نزدیک انڈین نیشنل کانگریس کی تاریخ میں یہ سب سے بڑا حادثہ ہے جو آج پیش آیا ہے۔ سیکولر اسٹیٹ اور دن نیشن کے دعویٰ کے باوجود ہندیونین کے کروڑوں انسانوں کی مادری زبان کو جو بلا تفریق مذہب وملت اور بلا امتیاز نسل وخاندان ملک کے گوشے گوشے میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ نفرت اور حقارت سے ٹھکرا دیا گیا ہے۔ اگر ہندستانی زبان کو ہندیونین کی قومی زبان قرار دیا جاتا تو اس میں بلاشبہ ہندی اردو اور ہندیونین کی دوسری زبانیں بھی آسانی سے سما سکتی تھیں اور جنوبی ہند و شمالی ہند کا تفرقہ بھی بیچ میں سے ہٹ سکتا تھا جو اس وقت ہندستانی کے ہٹ جانے کے باعث ہندی اور انگریزی کے مقابلہ کی شکل میں نظر آرہا ہے۔

ہندستانی زبان کا مطلب گاندھی جی کی نظر میں بھی یہی تھا کہ وہ سادہ اور سہل زبان جو اتری ہند میں عام طور پر بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اس زبان کو اگر قومی زبان بنا لیا جائے گا تو اس سے ہندیونین کے تمام باشندوں کے درمیان یکجہتی اور کلچرل یکسانیت پیدا ہوگی جس سے صحیح معنی میں متحدہ نیشنلزم کے نشانات ابھر آئیں گے اس کے برخلاف وہ اُردو اور وہ ہندی جو اپنی اپنی جگہ ادبی ترقیاں کر رہی ہیں ان میں ہرگز یہ صلاحیت نہیں ہے کہ وہ قومی زبان کی جگہ لے سکیں۔

مگر افسوس یہ ڈرافٹ جس کی پشت پر اکثریت کی جذباتی سیاست کارفرما ہے ایسے انتقامی جذبات کا آئینہ ہے جو معقولیت اور سنجیدگی کے تمام پردوں کو چاک کر چکے ہیں۔ اس لئے میں زبان کے مسئلہ پر مزید تقریر کے بجائے اس ڈرافٹ کے خلاف سخت پروٹسٹ کرتا ہوں اور اس سے زیادہ کچھ کہنا نہیں چاہتا۔

مجاہد ملّت نمبر

ماضی وحال کے مضراب کا اک ساز ہے یہ
لوحِ تاریخ پہ لکھا ہوا اک راز ہے یہ
مُلک وملّت کے مجاہد کی ہے رُودادِ عزیز
قلبِ بے چین سے نکلی ہوئی آواز ہے یہ

عزیز حسین بدری (ضلع بجنور)

وزیر بحالیات حکومت ہند کے جواب میں

مجاہد ملت کا تاریخی مکتوب

وزیر بحالیات مسٹر کھنہ نے مسلم کنونشن میں بحالیات سے متعلق قرارداد کے جواب میں کنونشن کے صدر ڈاکٹر سید محمود کے نام دو مراسلات ارسال کئے تھے جن میں ان حقائق سے انکار تھا جن کا اظہار متذکرہ قرارداد میں کیا گیا تھا۔ حضرت مولانا نے ۴ ستمبر ۱۹۶۱ء کو کھنہ جی کے پہلے مراسلہ کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ کھلی ہوئی حقیقتوں کو جھٹلایا نہیں جا سکتا اور نہ کسٹوڈین کے مظالم کی پردہ پوشی ہو سکتی ہے۔ ناجائز طور پر چھینی ہوئی املاک اور جائیدادیں سینکڑوں اور ہزاروں کی نہیں بلکہ کروڑوں روپے کی مالیت کی ہیں۔ یہ ہی نہیں بلکہ مسلمانوں کی مقدس عبادت گاہیں، مذہبی اوقاف، امام باڑے، قبرستان اور درگاہیں سب ہی ان کی لپیٹ میں آ چکے ہیں۔ حضرت مولانا کا پورا بیان مندرجہ ذیل تھا۔

انڈین مسلم کنونشن کی تجاویز میں ایک تجویز وزارت بحالیات سے تعلق رکھتی تھی، جس میں کسٹوڈین ڈپارٹمنٹ کے ہاتھوں ہندوستان کے مسلم شہریوں کے ساتھ کی گئی مسلسل چیرہ دستیوں، زیادتیوں اور سخت گیرانہ پالیسیوں پر افسوس ظاہر کیا گیا تھا۔ یقیناً اس ڈپارٹمنٹ کی سخت گیری اور منتقمانہ کارروائیوں کے نتیجہ میں مسلمانانِ ہند کو بے اندازہ پریشانیوں اور مسلسل مصیبتوں کا سامنا رہا ہے۔ نیک مقصد اور انصاف کے حصول کے لئے کنونشن نے جان بوجھ کر تلخ تفصیلات کو نظر انداز کرتے ہوئے اجمال و اختصار سے کام لیا تھا تاکہ وزارت بحالیات اس ڈپارٹمنٹ کی مسلسل چیرہ دستیوں اور زیادتیوں پر غور کر کے از خود نہیں تو کم از کم توجہ دلانے کے بعد منصفانہ رویہ اختیار کرے اور وزارت کے با اختیار اصحاب ہمدردی اور انصاف پسندی کے ساتھ ان غلط کاریوں کی تلافی کی کوئی راہ نکالیں جو کسٹوڈین ڈپارٹمنٹ نے پچھلے چودہ برس میں وسیع پیمانہ پر مسلمانانِ ہند کے ساتھ روا رکھی ہیں۔

بہت افسوس ہوا یہ دیکھ کر کہ وزیر بحالیات شری مہر چند کھنہ جی نے کنونشن کی اس تجویز کا ہمدردانہ مطالعہ نہیں فرمایا۔ بلکہ اس کے برعکس ڈپارٹمنٹ کی غلط کاریوں، دست درازیوں اور تلخ حقیقتوں پر پردہ ڈالنے کی ناکام کوشش کی ہے۔ اور پھر یہ ہی نہیں بلکہ ان کو صحیح، حق بجانب اور مبنی بر انصاف قرار دینے کا بے محل اقدام کیا ہے۔ اور اس سلسلہ میں انھوں نے ایک طویل بیان جاری کیا ہے جس کی کافی اشاعت کی گئی ہے۔

شری کھنہ جی کے اس بیان نے نہ صرف یہ کہ اصلاحِ حال کی امیدوں کو پامال کیا ہے بلکہ ان ہزاروں زخمی دلوں پر نمک پاشی کی ہے جو کسٹوڈین ڈپارٹمنٹ کی بے لگام چیرہ دستیوں سے پہلے ہی دکھے ہوئے تھے۔

بلاشبہ اس بیان نے ملک کی کوئی مفید خدمت انجام نہیں دی۔ کیونکہ نہ اس طرح کھلی ہوئی حقیقتوں کو جھٹلایا جا سکتا ہے اور نہ کسٹوڈین کے مظالم کی پردہ پوشی کی جا سکتی ہے خصوصاً جب کہ ان بے پناہ زیادتیوں کی عمر چند روزہ نہیں ہے بلکہ ان کا سلسلہ چودہ برس سے جاری ہے اور ان کی زد میں چند افراد ہی نہیں ہیں بلکہ ہزاروں مظلوموں تک ان کا دامن پھیلا ہوا ہے جو ملک کے کسی ایک آدھ مقام پر نہیں بلکہ جہاں تہاں پھیلے ہوئے ہیں۔ ناجائز طور پر ان سے چھینی ہوئی املاک اور جائیدادیں سینکڑوں اور ہزاروں نہیں بلکہ کروڑوں روپے کی مالیت کی ہیں پھر یہ سب دستبرد شخصی مکانوں، شخصی جائیدادوں، زمینوں، باغوں اور کھیتوں ہی کی داستان نہیں ہے بلکہ مسلمانوں کی مقدس عبادت گاہیں، مذہبی اوقاف اور امام باڑے، قبرستان اور درگاہیں سب ہی ان کی لپیٹ میں آ چکے ہیں۔

منتقمانہ سلوک

اس طویل مدت میں کھلے بندوں کسٹوڈین کے منتقمانہ سلوک نے جس وسیع پیمانہ پر مسلمانانِ ہند کو برباد کیا ہے۔ آج اس کا نتیجہ نہ صرف ان کی اقتصادی اور معاشی بحران اور خستہ حالی کی شکل میں ان پر مسلط ہے۔ بلکہ وہ اپنے وطنِ عزیز میں رہتے ہوئے غریب الوطنی اور بے پناہی کے احساسات اور خطرات میں خود کو گھرا ہوا بھی پاتے ہیں۔

آج بھی سینکڑوں مسلمان ایسے موجود ہیں جو اپنے افلاس و غربت کی وجہ سے یا برسوں تک کسٹوڈین ڈپارٹمنٹ میں کھنچتے رہنے کے بعد مایوس ہو کر خود ہی اپنی جائیدادیں چھوڑ بیٹھے اور بہت سے وہ ہیں جو آٹھ آٹھ برس دس دس برس تک کسٹوڈین کے دفتروں کے چکر لگانے اور روپیہ اور وقت ضائع کرنے کے بعد تھک کر بیٹھ گئے ہیں۔ اور جو سخت جان اس راہ میں ڈٹے بھی رہے تو ان کو بھی انتہائی جد و جہد اور صبر آزما محنت کشی کے بعد کہیں نجات مل سکی ہے۔

غرض کہ اس محکمہ کی ایذا رسانیوں کی داستان اتنی دراز اتنی طویل اتنی وسیع اور اتنی واضح اور روشن ہے کہ آج کھنہ جی کے بیان کی بلند بانگی کسی طرح بھی ان کا احاطہ نہیں کر سکتی اور حد تو یہ ہے کہ کسٹوڈین محکمہ کی رہی سہی کسر کمپٹینٹ افسران نے پوری کر دی ہے کہ جو مسلمان کسٹوڈین کی زد سے بچ نکلا آخر کار کمپیٹنٹ آفیسر کے فیصلوں کا شکار ہو کر رہ گیا۔

لیپا پوتی

بہتر یہ تھا کہ کھنہ جی اپنے اس بیان میں کسٹوڈین کی لیپا پوتی کرتے ہوئے اور اپنے ڈپارٹمنٹ کی شان میں قصیدہ پڑھتے ہوئے میرا نام نہ لیتے کہ مجھ جیسا باخبر انسان جو الف سے یا تک اس طلسم ہوشربا کا عینی شاہد رہا ہے اگر اس کی نقاب کشائی کرنے لگے تو تلخ نوائی کا ایک مجلہ تیار ہو سکتا ہے۔

کیا میں شری کھنہ جی کو یاد دلاؤں کہ آج انھوں نے وزارت بحالیات کی جن ہمدردیوں اور بخششوں کو شد و مد کے ساتھ اپنے مضمون میں ابھارا ہے وہ خود ہی کسٹوڈین کی کارگذاریوں پر ایک لازوال شہادت ہیں۔ اس لئے کہ جب محکمہ مذکور کی منتقمانہ ذہنیت اپنی حد سے گذر گئی اور مسلم اقلیت کے لئے اس طرح وبال جان بن گئی کہ بلا تفریق مذہب و ملت ہر ایک شریف اور سنجیدہ انسان نے بلکہ ممبران پارلیمنٹ اور سرکاری ذمہ داران نے بھی ان سخت گیریوں کو محسوس کیا اور ملک کے کونے کونے سے عوام و خواص اور مسلم و غیر مسلم ممبران کے احتجاجات، وفود اور جمعیۃ علماء ہند کی مسلسل اپیلوں اور انتھک کوششوں کی بدولت بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ محترم وزیر اعظم کی شخصی مداخلت کے نتیجہ میں کسٹوڈین کی اس مطلق العنانی کو روکتے ہوئے ان ہندوستانی مسلمانوں کے لئے انصاف اور ہمدردی کی کچھ تدبیریں کی گئیں۔ جو کسٹوڈین کی سخت گیری کا بدترین شکار ہو چکے تھے۔ اگرچہ ان ہمدردانہ تدبیروں کا سلسلہ بھی کسٹوڈین ڈپارٹمنٹ کی مہربانیوں سے کچھ زیادہ دیر نہیں چل سکا اور اکثر و بیشتر محکمہ کی معاندانہ ذہنیت کی بھینٹ چڑھتا رہا ہے۔

یہی وہ ہمدردانہ تدبیریں تھیں جن کا نام لے کر آج شری کھنہ جی اپنے ڈپارٹمنٹ کی عنایات اور بخششوں کے لمبے چوڑے دعوے کر رہے ہیں مگر ساتھ ہی ان تلخ حقیقتوں کو فراموش کر رہے ہیں جن کے پس منظر میں یہ صورت حال کچھ دلوں کے لئے پیدا کی جاتی رہی ہے۔

ان ہی تدبیروں میں سے ایک اقدام وہ بھی تھا جو ہماری جانب سے پیہم شکایات ہونے کے بعد محترم وزیر اعظم ہند کی ہدایت پر عمل میں لایا گیا تھا۔ یعنی سرکاری و غیر سرکاری نمائندوں پر مشتمل ایک ذمہ دار کمیٹی بنائی گئی تھی جو کسٹوڈین جنرل تک کے فیصلوں کے بعد انفرادی کیسوں کو انصاف کے نقطۂ نظر سے جانچتی تھی اور ہندوستان کے شہری مسلمانوں کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کو چیک کرتی تھی۔ اس نے جتنے کیس چیک کئے اور غلط فیصلوں کی اصلاح کی اگر آج اس کا ریکارڈ دیکھا جائے تو بآسانی اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس ڈپارٹمنٹ کے ذمہ دار اصحاب باستثنائے چند نیچے سے اوپر تک کس ذہنیت اور کن جذبات کے ساتھ کھلی ہوئی زیادتیاں کرتے رہے ہیں اور کس کس طرح غیر نکاسی مسلمانوں کو نکاسی بناتے رہے۔ مگر افسوس کہ آخر کار وزارت بحالیات کی تنگ نظری اس کمیٹی کو زیادہ عرصہ برداشت نہ کر سکی اور چھ سات ماہ سے زیادہ اس کی عمر نہ ہوئی۔

ھولناک ذھنیت

اسی سلسلہ کی ایک کڑی یہ بھی ہے کہ حکومت ہند کے انصاف پسند ارباب اختیار نے یہ دیکھتے ہوئے کہ کسٹوڈین ڈپارٹمنٹ نے آٹھ نو سال کے عرصہ میں پوری تیزی کے ساتھ تخلیہ کنندگان کی جائیدادوں کو سمیٹ لیا ہے۔ بلکہ اس سے بھی آگے دست درازی فرمائی ہے۔ ایک اہم فیصلہ کرتے ہوئے یہ اعلان کر دیا کہ ۱۹۵۴ء کے بعد قانون تخلیہ کنندگان کے تحت جائیدادوں کو نکاسی قرار دینے کے لئے نوٹس جاری نہیں کئے جائیں گے۔ تاہم اس ڈپارٹمنٹ کی ہولناک ذہنیت نے پھر بھی قانون میں ایک ایسی دفعہ اپنے لئے مخصوص کر لی جس کے تحت یہ سوچا سمجھا ہوا بہترین فیصلہ زخمی ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور اس مخصوص دفعہ کی بدولت آج تک ہر مسلمان کے سر پر خواہ کتنی ہی مرتبہ انکوائری اور تحقیق و تفتیش کے بعد غیر نکاسی قرار دیا جا چکا ہو۔ از سر نو تحقیق اور انکوائری کا خطرہ قائم اور کسٹوڈین کی جارحانہ گرفت بدستور مسلط ہے۔ میعاد و مدت کا چلتا ہوا ہتھیار اور بعض ٹیکنیکل حربے کسٹوڈین ڈپارٹمنٹ کے لئے اس پوری مدت میں بڑا سہارا بنے رہے۔ کتنے ہی ناواقف سیدھے سادے اور دور دراز دیہات و قصبات کے رہنے والے مسلمانوں کی جائدادیں پوری چابکدستی کے ساتھ صرف اس لئے ہضم کر لی گئیں کہ یہ یقین حاصل کر لینے کے باوجود کہ یہ مسلمان ہندوستان کے شہری ہیں اور بلاشبہ غیر نکاسی ہیں۔ لیکن ان کی درخواست یا اپیل چونکہ مقررہ میعاد کے بعد پیش ہوئی یا اس میں اور کوئی معمولی اصطلاحی خامی رہ گئی ایسے صدہا کیسوں میں وزارت بحالیات نے انصاف کا منشا یہی قرار دیا کہ ان کی جائدادوں کو ہضم کر لیا جائے اور اپنے وطن عزیز ہی میں ان کو ان کے گھروں اور جائدادوں سے محروم کر دیا جائے۔ میں شری کھنہ جی سے کیا یہ دریافت کرنے کی جرأت کر سکتا ہوں کہ جسٹس اور انصاف کا یہی تقاضہ ہے کہ دیدہ و دانستہ شہریوں کی جائدادوں اور ملکیتوں کو ٹائم بارڈ کہہ کر یا ٹیکنیکل بنیاد بنا کر ہضم کر لیا جائے۔

شہر دہلی کے مسلم علاقوں میں مسلمان کرایہ داروں نے برسوں تک یہ التجائیں کیں کہ چونکہ ہمارے رہنے سہنے کے لئے اپنے مخصوص حلقوں کے سوا کہیں اور جگہ نصیب نہیں ہے۔ اس لئے نکاسی مکانوں کو کسٹوڈین کے پورے تخمینے پر ہمیں خریدنے کی

اجازت دی جائے۔ اور ان کو نیلام نہ کیا جائے۔ لیکن برسوں تک ان کی اس جائز مانگ کی کوئی شنوائی نہیں ہوئی۔ البتہ دس بارہ برس گذرنے کے بعد جب کہ انکی جائدادوں کا بہت بڑا حصہ دوسرے لوگوں کو الاٹ یا نیلام کر دیا گیا یا کلیم میں دے دیا گیا تب گنے چنے مکان کسٹوڈین ڈپارٹمنٹ نے کرایہ داروں کے حق میں دینے کا فیصلہ کیا۔ مگر چند ہی مسلم کرایہ دار ایسے مکان خرید پائے تھے کہ کچھ ہی دنوں بعد یہ فیصلہ سنا دیا گیا کہ چونکہ یہ مسلم حلقے سلم ایریا کے تحت ہیں۔ اس لئے تمام جائدادوں کو کارپوریشن کو منتقل کر دیا گیا اور اس طرح مسلمان کرایہ داروں کی بڑی تعداد جو آج تک خریداری پر آمادہ ہے خریداری سے محروم کر دی گئی۔ اور اس طرح دہلی کے باشندوں پر دلی ہی کی سرزمین رہنے سہنے کے لئے تنگ کر دی گئی۔ ان حقائق سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ ہندوستان کے شہری مسلمانوں کے ساتھ انصاف و ہمدردی کی وہ تمام تدبیریں اور سہولتیں بھی جن کو آج شری کھنہ جی نے مسلم کنونشن کی تجویز کے خلاف شدومد کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اور اس طرح کسٹوڈین کے محکمے کے احسانات کو گنایا ہے۔ درحقیقت وہ وزارت بحالیات کی کوئی عنایت نہیں تھی بلکہ برسوں کی کاوشوں اور پیہم احتجاج اور اپیلوں کے بعد محترم وزیر اعظم ہند کی انصاف پسندی اور مداخلت کا نتیجہ تھیں کہ جو بدقسمتی سے وزارت بحالیات کی معاندانہ روش کی بھینٹ چڑھ گئیں اور عملاً جو بھی سہولت یا ہمدردی ایک ہاتھ سے دی گئی کچھ ہی دنوں بعد وہ دوسرے ہاتھ سے چھین لی گئی۔

جائدادوں پر قبضہ مخالفانہ

اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی پیش نظر رہے کہ پورے ملک میں صدہا مسلمان ایسے ہیں جن کو مسلسل جدوجہد کے بعد کسٹوڈین نے ہندوستان کا شہری تسلیم کر لیا اور ان کے ہاتھوں میں آج بھی کسٹوڈین کے محکمہ کے وہ کاغذات موجود ہیں جن میں ان کو ان کی جائیدادوں کی واگذاری کے احکامات دیئے گئے ہیں۔ مگر افسوس وہ احکامات شرمندۂ تعمیل نہیں ہو رہے ہیں۔ کسٹوڈین کے دفتر میں جائیدادوں کی واپسی تسلیم ہے مگر جائیدادوں پر قبضہ مخالفانہ بدستور موجود ہے۔ اگر محترم کھنہ جی اجازت دیں تو ایسے ایک دو نہیں دس بیس سینکڑوں مسلمان ان کی خدمت میں پیش کئے جاسکتے ہیں کہ کسٹوڈین کے کاغذات میں بحال ہو گئے ہیں۔ مگر حقیقت میں ابھی تک بے حال ہیں۔ ایک خاص مسئلہ وقف علی الاولاد کا ہے جس کو کھنہ جی نے اپنے بیان میں اٹھایا ہے۔ سو اس کی حقیقت یہ ہے کہ گذشتہ چودہ برس تک وزارت بحالیات کا قبضہ اور مسلسل عمل یہی رہا کہ وقف علی الاولاد ذاتی جائیداد کی حیثیت رکھتی ہے، اور اس کو وقف نہیں مانا جاسکتا۔ اور اسی طرح چودہ برس تک پورے ملک میں تمام وہ جائیدادیں جو وقف علی الاولاد تھیں بے تامل ہضم کر لی گئیں البتہ گذشتہ چند ماہ میں ایک خاص کوشش اور ایک اعلیٰ عدالت کے فیصلہ کی بنا پر وزارت بحالیات نے مجبوراً چند وقف علی الاولاد جائیدادوں کو وقف تسلیم کر کے ان کے متولیوں کو واپس کرنے کا فیصلہ کیا۔ تاہم ان میں سے بھی بعض کیس ابھی تک زیر بحث ہیں۔

مساجد اور امام باڑے

کسٹوڈین ڈپارٹمنٹ کی زیادتیوں اور جبرہ دستیوں کا سب سے زیادہ افسوسناک پہلو یہ ہے کہ مسلمانوں کی شخصی املاک و جائیدادوں کے ساتھ ساتھ ان کی مسجدوں، امام باڑوں، درگاہوں اور قبرستانوں تک پر دست ستم دراز کیا گیا۔ ان میں سے بہتوں کو نکاسی قرار دے کر ہضم کر لیا گیا یا پاکستان سے آئے ہوئے مظلوم رفیوجیز کے ہاتھوں اس مال غنیمت کا سودا کیا گیا۔ اور ان کو نیلام یا فروخت کر کے ان کی اصل حیثیت کو زائل کر دیا گیا اور اس طرح اس راہ میں عام اخلاقی تقاضوں اور انسانی روایات کو بھی پامال کیا گیا۔ لیکن کس قدر حیرت و افسوس کی بات ہے کہ ہمارے محترم کھنہ جی آج پوری جسارت کے ساتھ یہ اعلان فرما رہے ہیں کہ ایسا کسی جگہ نہیں ہوا۔

چونکہ محترم کھنہ جی کا یہ جرأت آمیز بیان حقائق کے لئے چیلنج کا انداز لئے ہوئے ہے تو ضروری معلوم ہوتا ہے کہ میں اپنے اس بیان کے ساتھ پورے ملک کی مساجد و مقابر، درگاہوں کی فہرستوں میں سے بطور نمونہ صرف شہر اور دہلی کی چند مساجد کے اسماء پیش کر دوں، جن کو کسٹوڈین ڈپارٹمنٹ نے نیلام کر دیا ہے یا محکمہ کے ہاتھوں دیدہ دانستہ بعض کی حیثیت عرفی کو زائل کر دیا گیا ہے اور جن کی واپسی و بحالی کے لئے ہماری جدوجہد اب بھی جاری ہے۔

مغربی بنگال کے مسئلہ کو محترم کھنہ جی نے چونکہ اس بیان سے جدا رکھا ہے۔ اور حال ہی میں اس کے متعلق ان کا ایک بیان الگ سے شائع ہوا ہے۔ اس لئے میں بھی یہ مناسب سمجھتا ہوں کہ مغربی بنگال کے مسئلہ کو سردست زیر بحث نہ لاتے ہوئے اپنے دوسرے بیان میں اس کی حقیقت حال کو واضح کروں۔

بہرحال کھنہ جی کے حالیہ بیان کے پس منظر اور کسٹوڈین ڈپارٹمنٹ کی چودہ سالہ ستم کوشیوں اور ایذا رسانیوں کے اس مختصر تذکرہ کے ساتھ مجھے برملا اعتراف ہے کہ اس سلسلہ میں پیہم اور مسلسل جدوجہد اور اس کے مقابلہ میں محکمہ کسٹوڈین کے حیلے بہانے اور عذر تراشیوں کے بعد محترم وزیر اعظم ہند کو یہ محسوس کرایا گیا کہ غیر نکاسی مسلمانوں کو ناجائز طور پر نکاسی کہہ کر وزارت بحالیات ان کو اپنا شکار بنا رہی ہے، ان کی توجہ اور مداخلت کے نتیجہ میں قانون تخلیہ کنندگان میں بھی اور کسٹوڈین کے طریقہ ہائے کار میں بھی بارہا ایسی ترمیمات اور تبدیلیاں پیدا ہوئیں جن کی بدولت ایک حد تک کسٹوڈین کی مطلق العنانی کا دائرہ تنگ ہوتا رہا اور انصاف کی بے جان امیدیں سانس لیتی رہیں۔ اگرچہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ محکمہ متعلقہ نے حقیقت پسندی کے ساتھ عام طور پر وہ پالیسی نہیں اپنائی جس سے وسیع پیمانے پر بے انصافیوں اور زیادتیوں کی

تلافی اور ردوکد تمام ہو سکتی۔

مجھ کو اس اقرار میں کوئی باک نہیں ہے کہ بعض انفرادی کیسوں میں وزارت بحالیات کی ابتدا سے کراچی تک کا ہے گا ہے اگر ہم نے بہم جدوجہد کے ساتھ یہ واضح کیا ہے کہ ان کیسوں میں قانون کے خلاف کھلی ہوئی ناانصافی کی گئی ہے۔ تو ذمہ دار افسران نے منت و احسان رکھتے ہوئے غریب غیر نکاسی مسلمانوں کو غیر نکاسی باقی رکھنے میں کبھی کبھی عزت افزائی فرمائی ہے۔ لیکن ہر شخص جانتا ہے کہ ہزارہا ناانصافیوں اور زیادتیوں کی تلافی چند آنسو پونچھ دینے سے کبھی نہیں ہو سکتی۔ پس اگر محترم کھنہ جی نے حقیقت پسندی کے پیش نظر اپنے بیان میں یہ جملہ تحریر فرمایا ہے۔

"اگر سہواً کچھ غلطیاں ہوئی ہیں، تو ان کی تلافی کی جا سکتی ہے۔"

تو ایک بار پھر یہ گذارش ہے کہ معاملہ کا ایماندارانہ اور حقیقت پسندانہ حل وہی ہے جو کنونشن کی تجویزوں میں کہا گیا ہے۔ یعنی یہ کہ مسلمانوں کے ساتھ اس ڈپارٹمنٹ کے ہاتھوں جو ناانصافی اور حق تلفی ہوئی ہے اس کا عملاً تدارک کیا جائے۔ اور کاغذی سطح سے بڑھ کر اس کو عمل کے دائروں تک پہونچایا جائے۔ ان شخصی جائدادوں عبادت گاہوں، امام باڑوں اور قبرستانوں کو حسب تقاضۂ انصاف واپس کیا جائے۔ جو اپنے گھروں سے بے گھر کر دیئے گئے ہوں خواہ مغربی بنگال میں ہوں یا دلی پنجاب اور راجستان میں، ان کو پھر سے بسایا جائے۔ اور اس طرح ان کی پریشانیوں کی تلافی کی جائے۔

آخر میں بہت ادب سے یہ گذارش کروں گا کہ ان معاملات کو حقیقت پسندانہ طور پر حل کرنے کا ایک اور صرف ایک ہی طریقہ ہے؛ وہ یہ ہے کہ وزیر بحالیات ایک ایسی کمیٹی سرکاری حیثیت سے بنانے کی تجویز فرمائیں جن میں سرکاری غیر سرکاری دونوں طرح کے افراد شامل ہوں اور اس کمیٹی کو یہ طاقت حاصل ہو کہ وہ گذشتہ ناانصافیوں کو چیک کرکے ان کی تلافی کر سکے اور حکومت اس کے فیصلوں کو تسلیم کرے، ورنہ ظاہر ہے کہ دونوں طرف سے بیانات اور ایک دوسرے کی تردید سے یہ مسئلہ کبھی حل نہیں ہو سکتا۔

محمد حفظ الرحمٰن

"خط کے آخر میں فہرست بھی درج تھی جس کی اشاعت یہاں ضروری نہیں"

محکمہ کسٹوڈین کی چیرہ دستیوں اور بے انصافیوں پر ہندپارلیمینٹ میں ایک بے لاگ تقریر

دہلی ۷ ستمبر ۱۹۵۴ء لوک سبھا میں مولانا نے اپنی اس تقریر میں جہاں نکاسی جائداد ایکٹ سے مسلمانوں کو پیش آنے والی مشکلات پر ممبران پارلیمنٹ اور حکومت کو توجہ دلائی اور یہ مطالبہ کیا کہ اب کسی جائداد کو نکاسی قرار نہ دیا جائے۔ وہاں یہ بھی اپیل کی کہ جو ...... جائدادیں ٹیکنیکل وجوہات کی بنا پر نکاسی قرار دی گئی ہیں۔ ان کی بھی واگذاری ضروری ہے۔ حضرت مولانا نے مخصوص انداز بیان سے امر کی وضاحت کی کہ وہ مسلمانوں کو صرف ان کا حق دلانا چاہتے ہیں۔ پرشارتھیوں سے ان کے حقوق چھیننا مقصود نہیں ہے مولانا نے اس بات پر بھی زور دیا کہ پرشارتھیوں سے حکومت نے جو وعدے کر رکھے ہیں۔ ان کو پورا کرے مولانا کی اس مدلل اور پر زور تقریر کے باعث ایوان کی فضا بالکل بدل گئی جو ممبران مسلمانوں سے انصاف کے شاکی تھے۔ انھیں بھی تسلیم کرنا پڑا۔ کہ مسلمانوں کو ان کے حقوق سے محروم نہ کیا جائے۔ اور کسی کو نکاسی نہ بنایا جائے۔

حضرت مولانا کی تقریر جو انہوں نے ۵ ستمبر کو کی حسب ذیل ہے۔

صدر صاحب میں وزیر داخلہ کے بل پر تائید کرنے کے لئے کھڑا ہوا ہوں میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ بل اس ہاؤس میں بر وقت لایا گیا ہے۔ معاوضہ اور نکاسی جائدادوں کے سلسلہ میں جو دو بل ایک دوسرے کے آگے پیچھے لائے گئے ہیں وہ جیسا کہ ابھی ہمارے منسٹر صاحب نے فرمایا ایک دوسرے کے حصے ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ پاکستان نے وہ طرز عمل اختیار نہیں کیا جو اس مسئلہ کو حل کرنے کے سلسلہ میں اختیار کرنا چاہئے تھا۔ ایسی صورت میں ہمارے پاس دو ہی راستے تھے ایک راستہ یہ کہ دونوں حکومتوں کے درمیان کوئی اگریمنٹ ہو کہ .... جو جائدادیں پاکستان میں ہمارے رفیوجی بھائیوں نے چھوڑی ہیں ان کا اور یہاں کا مقابلہ کرکے ایک انصاف کے ساتھ لین دین ہو جائے۔ لیکن پاکستان اس بات کے لئے آمادہ نہیں ہے۔ تب ہمارے

لئے دوسرا منظر یہ ہے کہ ایک طرف یہاں جتنی جائیدادیں چھوڑی گئی ہیں۔ ان کو ویسٹ کریں اور مالکانہ حیثیت سے اس پر قبضہ کریں تاکہ رفیوجیوں کو جس حد تک ہم معاوضہ دے سکتے ہیں دے سکیں۔ معاوضہ کی بحث پہلے بل میں کافی آچکی ہے۔ اس لئے اسے بار بار دوہرانے کی ضرورت نہیں۔ اس بات کو سب ہی تسلیم کرتے ہیں کہ پاکستان سے آنے والے مصیبت زدوں کو جتنا معاوضہ ملنا چاہئے اس کے مقابلہ میں بہت کم ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ تصویر کا دوسرا رخ یہ بھی ہے کہ نکاسی بل کی وجہ سے ہندوستان کے مسلمانوں کو بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ مختلف مرحلوں پر ایسی صورتیں ہمارے سامنے آئی ہیں کہ ہزاروں وہ آدمی جو غیر نکاسی تھے نکاسی بنا دیئے گئے۔

مثلاً ہم نے دیکھا کہ شروع شروع میں یہ بات تھی کہ قانون کے اندر کوئی شخص بھی اگر اپنی جگہ سے ڈسپلیسڈ ہو گیا اور وہ اس کا انتظام نہیں کر سکتا ہے۔ وہ نکاسی بن سکتا ہے حالانکہ وہ ہندوستان میں ہی ہے۔ صرف ایک جگہ سے اکھڑ کر دوسری جگہ چلا گیا۔ لیکن اس وقت قانون کے پیش نظر یہ بات ضروری تھی اس وجہ سے سیکڑوں اور ہزاروں آدمیوں کو نقصان پہنچا اور وہ تمام جائیدادیں کسٹوڈین کے قبضہ میں آگئیں اس طرح ٹیکنیکل گراونڈ کی بنا پر دوسری مشکلات پیش آئیں۔ مثلاً یہ ... کہ اگر کسی شخص نے واجبات ادا نہیں کئے تو صرف نوٹس بورڈ پر یہ لکھنا کافی سمجھا گیا کہ فلاں جائیداد کو ہم ویسٹ (قبضہ) میں کر رہے ہیں۔ ذاتی طور پر کسی نوٹس کی تعمیل کو ضروری نہیں سمجھا گیا۔ اس کی بناء پر جاہل ان پڑھے آدمی بلکہ میں تو کہوں گا کہ پڑھے لکھے آدمی جن کو نوٹس بورڈ وغیرہ دیکھنے کا موقعہ نہیں ملتا وہ اس کی لپیٹ میں آگئے۔ اگر انہوں نے اپنے لئے کوئی چارہ بھی تلاش کر لیا تو بعض دفعہ ایسا ہوتا تھا کہ ان کو یہ پتہ نہیں چلا کہ ہماری جائداد کب ویسٹ کر دی گئی کب نکلی اور کب نکاسی بنا دی گئی۔ میرا ارادہ نہیں ہے پاکستان جانے کا ایک منٹ اور سکینڈ کے لئے بھی لیکن میری جائداد نوٹس بورڈ پر نکاسی، بنا دی گئی اور مجھے اس کے بارے میں کچھ پتہ نہیں اور دو مہینہ کی مدت گزر گئی اور اس کی اپیل کا وقت بھی نکل گیا۔ ایسی تمام باتوں کو دیکھ کر ایسی سہولتیں بہم پہنچانے کی کوشش کی گئی کہ کسی طریقہ سے ٹیکنیکل گراونڈ پر یا کسٹوڈین کے آرڈر کے مطابق ہزار ہا آدمی جو غیر نکاسی ہیں وہ نکاسی نہ بنا دیئے جائیں یہ ان کے ساتھ انصاف نہیں ہوگا۔ ان کو بھی یہیں رہنا ہے۔ وہ بھی یہاں کے باشندے ہیں۔ جیسا کہ ابھی ایک ممبر نے کہا کہ یہاں کے بسنے والے کسی شخص کو کوئی تکلیف نہیں پہونچانا چاہئے اور کوئی اس کے ساتھ ظلم نہیں ہونا چاہئے۔ لیکن عمل ایسا رہا ہے کہ اس میں ہزاروں آدمی اس ظلم کے نیچے آئے ہیں۔ کس طرح غیر نکاسیوں کو نکاسی بنانے کی کوشش کی گئی۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ حضرت مولانا احمد سعید صاحب جیسے قومی رہنما پر جو ان لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے پاکستان بننے کی مخالفت کی۔ نوٹس تعمیل ہوتا ہے کہ آپ کی جائیداد نکاسی بنائی جا رہی ہے اس لئے کہ آپ پاکستان جا رہے ہیں۔ مجھے اس پر ہنسی بھی آئی اور افسوس بھی ہوا اور اس کے بعد میں نے جا کر کسٹوڈین کے دفتر میں دریافت کیا اور کہا کہ ایک ایسا آدمی جو صبح شام تک حکومت کے تمام معاملات سے تعلق رکھتا ہے جبکہ پاکستان میں جگہ ملنا دشوار ہے اور جس کا کہ ارادہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ وہ پاکستان جائے۔ آپ نے اسکو ادیکوئی بنا دیا تو جواب ملا ہے۔ کہ ہم نے جو کچھ کیا ہے وہ قانون کے مطابق کیا ہے۔ اور قانون کے مطابق ون ٹو آل ہر مسلمان پاکستان جانے والوں میں شمار ہے۔ اب یہ بوجھ اس مسلمان پر ہے کہ وہ اس بات کا جواب دے کہ وہ پاکستان جانے کے قابل ہے یا نہیں، یا وہ پاکستان جائیگا یا نہیں جائیگا۔

میں پرائم منسٹر کی نوٹس میں دیر سے لایا اور انہوں نے مجھ سے فرمایا کہ کاش تم اسے وقت پر لاتے۔ ایک اور مثال مسٹر آصف علی کی ہے کہ ان کی جائیداد بھی نکاسی بنا دی گئی ہے روشن آرا گارڈن کی ایک پارٹی میں مرحوم مسٹر آصف علی نے جب اڑیسہ کے گورنر تھے مسٹر اچیرورام (سابق کسٹوڈین جنرل) سے جو وہاں موجود تھے اور میں بھی وہاں بیٹھا ہوا تھا۔ ہنس کر کہا کہ میری جائیداد بھی نکاسی ہو گئی۔ آپ غور کیجئے کہ کس کس طریقہ سے حالات پیش آئے اور ان حالات کے ہوتے ہوئے بھی انصاف کا تقاضہ تھا کہ کل کو جب حالات نارمل ہوں گے۔ تو آج جو ہماری جائیدادیں کسٹوڈین نے غلط طور پر لی ہیں وہ واپس کی جائیں۔ لیکن ہم نے دیکھا کہ منسٹر صاحب ایک پارٹ سامنے لائے جس میں کہا گیا کہ ہم مالکانہ قبضہ کرنے کے بعد کمپنسیشن پول میں ان تمام جائیدادوں کو دے رہے ہیں۔ تو اس صورت میں قدرتی طور پر ان لوگوں کو جو یہاں کے رہنے والے ہیں اور جو ایک منٹ کو بھی پاکستان جانا نہیں چاہتے ان کا یہ محسوس کرنا قدرتی ہے کہ اب ہم پر پابندی کیوں لگائی جاتی ہے۔ اور اب ہم پر اس قسم کی پابندی کیوں عائد کی جا رہی ہے۔ آخر ہمیں بھی تو کبھی نہ کبھی نجات ملنی چاہئے۔ ساڑھے چار کروڑ کے قریب مسلمان آج اس دیش میں رہ رہے ہیں۔ وہ بھی تو محسوس کریں۔ دستور میں جو ایک برابری کا حق دیا گیا ہے وہ محض ایک کتاب میں لکھی ہوئی چیز ہی نہیں رہ جانی چاہئے۔ بلکہ چلتے پھرتے روزانہ زندگی میں اور بازار میں وہ ہمارا حق نظر آنا چاہئے۔ ہم بھی اس طریقہ سے آزاد ہیں جس طرح ہمارے بھائی دیش باندھے جی آزاد ہیں۔ اپنی جائداد کو بیچنے میں ان پر کوئی پابندی نہیں ہے اسی طرح سے حفظ الرحمٰن کو بھی پوری آزادی ہونی چاہئے۔ اور دونوں میں کوئی فرق نہیں ہونا چاہئے۔

۱۹۶۱ء کا ایک بیان

واقعات کی وضاحت

الجمعیۃ ۱۳ اکتوبر ۱۹۶۱ء

۱۱ اکتوبر ۱۹۶۱ء کو حضرت مولانا حفظ الرحمن صاحبؒ نے اپنے ایک مدلل بیان میں وزیر داخلہ یو۔پی مسٹر چرن سنگھ کے ان الزامات کی پُر زور تردید کی کہ جمعیۃ علماء نے علیحدگی پسندی کا رویہ اختیار کیا ہے اور علی گڑھ، میرٹھ وغیرہ کے فسادات مسلم کنونشن کے نتیجہ میں ہوئے ہیں۔ آپ نے اس ذہنیت پر اظہار افسوس کیا کہ ظالم گروہ کے ساتھ ساتھ مظلوم طبقہ پر بھی الزامات لگا کر ترازو کے پلڑوں کو برابر کیا جائے۔ بیان کا پورا متن یہ تھا:۔

یہ دیکھ کر بہت دکھ ہوتا ہے کہ ہمارے ملک میں صاحب اقتدار ہستیوں میں بہت کم ایسے ہیں اور انگلیوں پر گنے جانے کے قابل ہیں کہ جو جرأت اور ہمت کے ساتھ حق و صداقت کی خاطر سچی بات ظاہر کرتے ہیں۔ ورنہ تو عام طور پر یہ ہو رہا ہے کہ اگر کوئی سچی بات کہتا ہے اور جرأت کے ساتھ ظلم کو ظلم کہنے پر آمادہ ہوتا ہے تو ساتھ ہی ساتھ ترازو کے دونوں پلڑے برابر کرنے کے لئے مظلوم طبقہ پر بھی وہی الزامات عائد کر دیتا ہے جو ظلم کرنے والوں پر عائد ہوتے ہیں۔

کل ہی ہمارے چودھری چرن سنگھ صاحب ہوم منسٹر یو۔پی نے ایک پریس کانفرنس میں موجودہ فسادات کی صحیح صورت حال ظاہر کرتے ہوئے ایک طبقہ کی مظلومیت کا اقرار کرتے ہوئے دو سوالوں کے جواب میں یہ فرمایا کہ ہاں ان فسادات کو مسلم کنونشن کا نتیجہ کہا جا سکتا ہے۔ اور یہ کہ جمعیۃ علماء بھی جو کلچرل، سوشل اور مذہبی جماعت ہے مسلمانوں میں علیحدگی پسندی کے رجحانات پیدا کرتی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ اس وقت جب کہ فسادات کے فرو کرنے میں چودھری صاحب سرگرمی سے مصروف عمل ہیں۔ ان کے بیان پر کچھ تبصرہ کروں لیکن مجھے افسوس ہے کہ ایسے نازک موقع سے ناجائز فائدہ اٹھا کر چودھری صاحب نے جو الزام مسلم کنونشن اور جمعیۃ علماء پر لگایا ہے اس کے غلط ہونے پر حقیقی صورت حال واضح کر دوں یہ کس قدر مضحکہ خیز بات ہے کہ مسلم یونیورسٹی الیکشن کا بہانہ بنا کر باہر کے طلباء جگہ جگہ فساد کریں اور فساد زدہ علاقوں کے اکثر و بیشتر حصوں میں اکثریت کی بھی عام پبلک اس میں دلچسپی نہ لے اور ایسی حالت میں اس فساد کو مسلم کنونشن کے ساتھ جوڑ دیا جائے۔

عام طور پر یہ دیکھا جا رہا ہے کہ فساد سے ہندو مسلم پبلک کوئی دلچسپی نہیں لے رہی ہے بلکہ صرف گمراہ طلباء اور ان کے ساتھ شرپسند عناصر یہ سب کچھ کر رہے ہیں۔ کنونشن کا اثر اگر ہوتا تو عام پبلک پر ہوتا اسی طرح جمعیۃ علماء ہند ۱۹۴۷ء سے قبل و بعد اپنے عمل و کردار میں ہمیشہ علیحدگی پسندی کی مخالف رہی۔ اور آج تک ہے اور ہندوستان میں سیکولرزم کی کامیابی اور قومی یکجہتی کی جانب جہاں نمایاں طور پر سارے ہندوستان میں اپنا کیرکٹر پیش کر رہی ہے اور اس کی شہادت آسانی کے ساتھ شمال و جنوب مشرق و مغرب کے ہر کونے میں ہندو سکھ بھائیوں سے بھی حاصل کی جا سکتی ہے جو جماعتی کاموں میں دلچسپی لیتے ہیں۔ ہاں یہ بات الگ ہے کہ چودھری صاحب یا ان کے دوسرے دوستوں کو یہ بات بھی علیحدگی پسندی نظر آتی ہو کہ مسلمانوں کو امن و زندگی کے تمام شعبوں میں نابرابری سے دوچار ہونا پڑ رہا ہے۔ اس کو دور کرنے کے لئے وہ بیباکی اور جرأت کے ساتھ کیوں جد و جہد کرتی ہے اور خاموش ہو کر اپنے آزاد ملک میں بے کسی و بے بسی کا مظاہرہ کیوں نہیں کرتی! یہ جرم بیشک ایسا ہے جس کے لئے جمعیۃ علماء ناقابل معافی مجرم ہے اور آئندہ بھی رہے گی۔

کاش! کہ آج مہاتما گاندھی زندہ ہوتے تو وہ آپ کو بتاتے کہ جمعیۃ علماء ہند کے کارکنوں نے ۱۹۴۷ء میں ہندوستان میں امن قائم کرنے کے لئے اس کے کارکن کی حیثیت سے کیا کچھ کیا۔ اور ہندوستان میں امن قائم کرنے کے لئے کتنی محنت کی ہے یا ہندوستان کا مسلمہ لیڈر جواہر لال نہرو ان دونوں باتوں میں فرق سمجھتا ہے اور دونوں کو جدا جدا حقیقتیں جانتا ہے۔ میں پھر ایک بار کہوں گا کہ ایسے موقع پر اقتدار کے زعم میں چودھری صاحب کو ایسی باتیں نہ کہنی چاہئیں جو ان کے لئے موزوں نہیں ہیں اور وقت سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش نہ کرنا چاہئے کہ یہ بڑوں کے لئے پسندیدہ اور مستحسن نہیں ہے۔ جمعیۃ علماء میں سینکڑوں کی تعداد میں وہ لوگ شریک ہیں جن کا کردار و عمل قومی یکجہتی میں سب سے زیادہ نہیں تو ان سے کم بھی نہیں ——!

ناپنپارہ ضلع بہرائچ میں

سیرت سرکار دو عالم ﷺ پر ایک مبسوط تقریر

سیرت سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب رحؒ کا خاص موضوع تھا۔ مولانا مرحوم نے اس عنوانِ مبارک پر ملک کے چپہ چپہ پر ہزاروں تقریریں فرمائیں۔ اُن کی ایک مبسوط تقریر جو انہوں نے ۲۹ نومبر ۱۹۵۹ئہ کو نانپارہ ضلع بہرائچ میں تقریباً ڈھائی گھنٹہ مسلسل ارشاد فرمائی ہم ذیل میں شائع کر رہے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آج کے حالات میں وہ اُسوہ رسول کریم ﷺ کے مختلف پہلوؤں کو کس طرح پیش فرمایا کرتے تھے۔ (بشکریہ حاجی مقصود احمد صاحب۔ ساکن نانپارہ۔ ضلع بہرائچ) ....

صدرِ محترم!

بزرگوں اور دوستو! سیرت پاک کے اس مقدس اجتماع میں آپ نے مجھے دوبارہ موقع دیا ہے۔ دو سال پہلے بھی میں آپ کی خدمت میں آچکا ہوں۔ شاید آپ کو یاد ہو۔ میں نے کہا تھا کہ سیرۃ پاک بیان کرنے کے دو طریقے ہیں عقلی اور ایمانی۔ ذکر پاک سے نورِ ایمانی کو رونق بخشنے کا مقصد ایک بابرکت مقصد ہے لیکن جب میں یہ خیال کرتا ہوں کہ آپ نے اس اجتماع کو مسجد میں نہیں بلکہ میدان میں کیا ہے جیسے منڈی کی اس سڑک پر آپ دیکھ رہے ہیں آپ نے ہر شخص کو دعوت عام دی ہوگی اس میں مسلمان بھی ہوں گے اور غیر مسلم بھی سوال یہ ہے کہ اگر میں صرف رسولِ پاک کی عقیدت کا ذکر کر دوں تو غیر مسلم کیا فائدہ حاصل کر سکیں گے ضرورت ہے کہ حسن عقیدت کے ذریعہ سے نہیں بلکہ عقلی حیثیت سے سیرت پاک کو پیش کروں عقل کے ذریعہ دنیا کو سمجھاؤں تاکہ تمام دنیا کے لئے یکساں فائدہ بخش ہو۔

رسول اکرم نے جس کتاب الٰہی کو دنیا کے سامنے پیش کیا اس کے صفحہ اوّل کا پہلا جملہ الحمد للہ رب العالمین پکار کر آواز دیتا ہے کہ اے دنیا کے لوگو سب تعریفیں اس خدا کے لئے ہیں جو تمام عالم کا رب ہے، وہ تنہا مسلمانوں یا کسی قوم کا رب نہیں ہے بلکہ اس کی ربوبیت ہمہ گیر غیر محدود ہے۔ اس کے دائرۂ ربوبیت سے کوئی باہر نہیں ہے اس کتاب الٰہی کا یہ بھی اعلان ہے کہ رسولِ پاک کی ذات رحمۃ للعالمین ہے اس کی رحمت کا دائرہ بھی تمام عالم انسانیت کو محیط ہے۔

اس بنا پر مجھے کہنے کا موقع دیجئے کہ اس انداز سے رسول پاک کی سیرت مبارک کو پیش کروں تاکہ غیر مسلم بھی رحمت عالم کی سچائی کا اعتراف کئے بغیر نہ رہ سکیں۔

رسول کریم نے دنیا کے اندر جو انقلاب پیدا کیا اُسے نماز اور روزہ ہی میں مخصوص کر کے نہیں چھوڑ دیا بلکہ حیات انسانی اور دنیاوی زندگی کے جتنے بھی شعبے ہیں سبھی میں انقلاب پیدا کیا معاشی اور اقتصادی، مذہبی اور سیاسی زندگی کا کوئی ایسا شعبہ نہیں ہے جس میں غیر معمولی انقلاب پیدا نہ کیا ہو۔

رسول کریم نے دنیا کے سامنے اعلان کیا "لا الٰہ الا اللہ" خدا کے سوا کوئی قابلِ پرستش نہیں۔ اس اعلان کی حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ساری دنیا خدا کو ایک ہی مانتی ہے۔ وہ چاہے جس کا نام پکارے نام مختلف ہیں، ذات واحد ہے میرا تو دعویٰ ہے کہ خدا کو ماننے میں صرف مذہب والے ہی نہیں بلکہ منکر خدا بھی خدا کو مانتے ہیں۔ اس بنا پر کہ آپ دیکھیں جب کوئی کہتا ہے کہ "خدا کوئی چیز نہیں ہے" یہ کہنے پر اس کے دل میں کھٹک ضرور پیدا ہوتی ہے

ایک دیوار کو دیکھ کر جب کوئی یہ کہتا ہے کہ دیوار اندھی ہے اور دوسرا برخلاف اس کے کہتا ہے کہ اندھی نہیں ہے۔ پہلا ایک حقیقت کا اظہار کرتے ہوئے کوئی جھجک محسوس نہیں کرتا لیکن دوسرا جب ایک بے حقیقت بات پیش کرتا ہے تو اس کے دل میں کھٹک کا پیدا ہونا لازمی ہے۔ اسی طرح جب کوئی کہتا ہے کہ میں کسی طاقت کو نہیں مانتا تو اس کے دل پر ضرور چوٹ لگتی ہے۔ اکبر الٰہ آبادی نے کیا خوب کہا ہے ؎

تو دل میں تو آتا ہے سمجھ میں نہیں آتا
بس جان گیا میں تیری پہچان یہی ہے

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جس کلمہ کو پیش کر کے انقلاب عظیم رونما کیا وہ کلمہ صرف مسلمانوں کا کلمہ نہیں بلکہ دنیائے انسانیت کے لئے ایک پیغام حیات ہے سارے عالم کو توجہ دلائی کہ اس کلمہ کا تعلق صرف اس بات سے نہیں ہے کہ اسلام یا ایک مذہب ہے کہتا ہے بلکہ بتقاضائے فطرت انسانی اس خدا کی طرف سے پیش ہونے والا کلمہ ہے جس خدا کا قانونِ قدرت دنیا میں مکمل طور پر کار فرما ہے۔ سب اس کے قانونِ قدرت سے بندھے ہوتے ہیں مادی اور روحانی دونوں زندگی میں اسی کی کار فرمائی ہے دنیا دیکھ سکتی ہے کہ ہر ایک کی فطرت بلندی سے پستی کی طرف مائل ہے۔

ڈھیلا، مٹی، پتھر، اینٹ جن کا تعلق مادیات سے ہے کسی بھی قوت کا سہارا لئے بغیر ایک لمحہ کے لئے بھی بلندی حاصل کرنے سے قاصر ہیں۔ میں صرف ایک ٹھیکرے کو اوپر اچھالتا ہوں لیکن وہ اوپر جا کر فوراً نیچے واپس آجاتے گی۔ درخت سے لگا ہوا ناریل شاخ سے جب ٹوٹتا ہے تو اسے نیچے ہی آنا پڑتا ہے اوپر نہیں جاتا جس کے بارے میں ساتویں آٹھویں کلاس کا ایک بچہ تک بھی کہے گا کہ زمین کی کشش کے سبب ایسا ہوتا ہے لیکن اس جواب سے خدا کے ماننے والے کو اطمینان نہیں ہوتا کیونکہ یہ امر جبکہ مسلمہ ہے جس کی تصدیق سائنس بھی کرتی ہے کہ لاکھوں سیارے بیشمار سورج اور چاند جو کہ خلاء میں موجود ہیں ان میں کافی کشش ہے پھر یہ چیزیں اوپر کیوں نہیں جاتیں۔ اس کا جواب سائنس کے پاس نہیں ہے بلکہ مذہب جواب دیتا ہے کہ اے انسان دل کی آنکھ سے دیکھ! بلندی صرف خدائے واحد کو حاصل ہے حیوانات، جمادات اور نباتات کی ہر شے کا مشاہدہ کر یہ درخت جس کے پتے پھول اور پھل بلندی پر نظر آتے ہیں اُن سب کی زندگی کا دار و مدار صرف اسی جڑ پر ہے جو نیچے ہے ہر پرندے کی جھکی ہوئی خوبصورت چونچ ظاہر کرتی ہے کہ درحقیقت میری فطرت پستی کی طرف مائل ہے۔ اے انسان تو اپنے نفس کو ٹٹول دیکھ تیرے ہاتھ بھی تو پستی کی طرف جھکے ہوتے ہیں کہ جن کے ذریعہ تو اپنی قوت کا مظاہرہ کرتا ہے تو اپنے قلب کو بلندی سے پستی کی طرف لٹکتا ہوا پائے گا کہ جس کی حرکت پر تیری زندگی کا دارو مدار ہے۔ دنیا کی کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو بلندی سے پستی کی طرف مائل نہ ہو۔ اس لئے کہ یہ ہر ایک کی فطرت ہے اور کوئی بھی ایسی چیز نہیں ہے جس میں اپنی فطرت کی خلاف ورزی کرنے کی صلاحیت ہو۔

قدرت نے جو انسان کی پیشانی کو بلند بنایا ہے اُس میں ایک مصلحت ہے جب تم آپ انانیت کے جذبہ میں آتے ہیں تو کہہ اٹھتے ہیں کہ شہنشاہ ہوں کسی کے سامنے بھی میری پیشانی نہیں جھکتی۔ قدرت کا اعلان ہے کہ ساری چیزیں تیری خدمتگذار ہیں وہ سب تیرے لئے ہیں مگر تیری پیشانی صرف خدا کے لئے ہے اُسے جو بلندی دی گئی ہے اس لئے نہیں کہ مخلوق کے سامنے جھکے وہ اگر جھکے گی تو صرف خدا کے سامنے ہی جھکے گی۔ لا الہ اللہ کا یہی وہ تصور ہے جو رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کے سامنے پیش کیا۔

ہر شخص مانتا ہے کہ چھوٹا ہی بڑے کے سامنے جھکتا ہے بڑا چھوٹے کے سامنے نہیں جھکتا۔ لیکن انسان مخلوق میں سب سے بڑا ہونے کے باوجود درخت، پتھر، چاند، سورج اور نہ جانے کتنے باطل اور خود ساختہ معبودوں کے سامنے جھکتا ہے۔ اے انسان تو کس قدر گراوٹ پر اتر آیا ہے۔ قدرت کہتی ہے کہ ساری کائنات تیری مٹھی میں ہے تو سائنس کی مدد سے خلاء میں چاند میں اور دوسرے سیاروں میں پہنچ سکتا ہے بلکہ سورج پر بھی فتح حاصل کر سکتا ہے۔ میں نے تیرے ہاتھ میں مخلوق کو مسخر کر رکھا ہے لیکن تو میرے سامنے سجدہ ریز نہیں ہوتا؟

رسول اکرمؐ کی بعثت سے قبل عرب کے لوگ خدا کو مانتے تھے لیکن ان کا کہنا تھا کہ جنگ کی دیوی، صلح کا دیوتا، بارش کی دیوی اور رزق کا دیوتا الگ الگ ہے یہ سب مل کر ایک خدا کی قوت بنتے ہیں اور ساری چیزیں اس کے ید قدرت میں مسخر نہیں وہ ہمہ گیر قوت اور طاقت کا مالک ہے۔

بالآخر رسول اکرمؐ نے دنیا کے سامنے جو نقطہ نظر پیش کیا دنیا کو ماننا پڑا۔ روح اس بات کی خواہشمند ہوئی کہ میرے جسم کو تو غذا اور پھلوں سے طاقت دی جاتی ہے لیکن میں ہوں مجھے معرفت کی غذا چاہیئے۔ اس نے آنکھ اٹھا کر دیکھا کہ متمدن ممالک میں ہندوستان۔ ایران اور رومۃ الکبریٰ کا طوطی بول رہا ہے اُن میں دانش ہے اپنی غذا کی تلاش انہیں میں چل کر کرنی چاہیئے۔ اس روح نے ہندوستان پہونچکر اپنی غذا طلب کی۔ ہندوستان نے کہا کہ مختلف دیوی دیوتاؤں کی پوجا کئے بغیر نہ تو ایک خدا کی عبادت کر سکتی ہے اور نہ اس کی معرفت کی غذا حاصل کر سکتی ہے روح نے منہ پھیر لیا اور کہا کہ جب ایک غلام دو مالک کا بیک وقت فرمانبردار نہیں بن سکتا تو میں ان سینکڑوں کی وفادار کیسے بن سکتی ہوں وہ رومۃ الکبریٰ گئی۔ پاپائے روم نے کہا کہ اے روح تو اپنے صحیح مقصد تک پہونچی ہے لیکن یاد رکھ پہلے تجھے باپ بیٹا اور روح القدس ان تینوں پر ایمان لانا ہوگا پھر انہیں میں تجھے خدا اور اس کی معرفت کی غذا ملے گی۔ روح نے انکار کیا اور کہا کہ ایک تین نہیں ہو سکتا۔ وہ ایران گئی فیثاغورث کے شاگرد زرتشت نے کہا کہ اے روح یاد رکھ یہاں خدا کی دو طاقتیں ہیں نیکی کا خدا یزدان اور بدی کا خدا اہرمن ان کے بغیر تجھے خدا کی معرفت کی غذا نہیں مل سکتی۔ روح

کو یہاں سے بھی ناامید ہونا پڑا۔ اس نے سوچا کہ جب دنیا کے متمدن ممالک میں
جہاں عقل و دانش کے چراغ جل رہے ہیں وہاں ہم کو اپنی غذا نہیں مل سکتی اور کہاں
ملے گی۔ ایک پہاڑ کی بلند چوٹی پر گئی اور طے کیا کہ گر کر مرجانا چاہیئے۔ گرنا ہی چاہتی
تھی کہ ایک کمبل پوش نے تھپکتے ہوئے ریت کے تودوں سے نکل کر ایک تپتی ہوئی
پہاڑ کی چٹان سے پکار کر کہا کہ اے روح خودکشی نہ کر آ تیری غذا میرے پاس
ہے۔ میری سار روح نے کہا متمدن ممالک سے تو خدا کی معرفت کی غذا ملی نہیں یہاں
کہاں ملے گی کملی والے نے کہا: - قل ھو اللہ احد اللہ الصمد لم یلد و
لم یولد ولم یکن لہ کفواً احد ٹھ ہندوستان کی دیوی دیوتاؤں کا محتاج میرا خدا نہیں ہے
کیونکہ ھو اللہ احد اللہ اکیلا ہے روم الکبریٰ کے باپ بیٹا اور روح القدس
کی تثلیث توحید کے منافی ہے اس لئے کہ "لم یلد ولم یولد" نہ وہ کسی کا باپ ہے اور نہ کسی
کا بیٹا۔ ایران کے زرتشت نے بھی یزدان اور اہرمن دو متضاد صفات کے حامل دو
اور برابر کی طاقت رکھنے والی خداؤں کی جو تصویر غلط پیش کی "ولم یکن لہ کفواً احد"
میرے خدا تعالیٰ واحد کی طاقت کے برابر کوئی خدا نہیں ہے وہ قادر مطلق ہے یہ نہ
دیکھ کہ کہاں کا رہنے والا کہہ رہا ہے۔ یہ دیکھ کہ کیا کہہ رہا ہے۔ روح نے اس
کملی والے کی بات کو سنتے ہی اطمینان کا سانس لیا اور پکار اٹھی کہ بے شک میری غذا
تیرے ہی پاس ہے۔

قدرت نے اس ریگستانی پہاڑی اور غیر متمدن ملک میں رسول اکرم ﷺ کو اس
لئے بھیجا تا کہ دنیا یہ نہ کہہ سکے کہ عقل و دانش کے چراغوں سے علم کی روشنی حاصل
کر کے ضابطۂ حیات انسانی پیش کیا ہے۔ خدا کو بیچ میں ڈال کر اعلان نبوت جو کیا ہے
فرضی ہے۔ ساری دنیا متحیر ہے اور جانتی ہے کہ یہ وہی ہستی ہے جس نے کسی کے سامنے
زانوئے ادب تہ نہیں کیا لیکن پھر بھی دنیا میں انقلاب عظیم برپا کر دیا۔

رسول اکرم ﷺ نے عرب کی جاہل اور اجڈ قوم میں جب یہ اعلان کیا تھا کہ
"ساری مخلوق صرف ایک کی ہے تو قوم نے زبردست بغاوت کا مظاہرہ کیا
سارا عرب دشمن بن گیا۔ بقول کارلائل کے کہ "جب تک اعلان نبوت نہیں
کیا تھا سب دوست تھے اور اعلان نبوت پر سب دشمن ہو گئے۔ رسول اکرم ﷺ نے
طائف کے میدان میں تین باتیں پیش کی تھیں ایک خدا کی پرستش (۲) بیواؤں اور
یتیموں کی سرپرستی (۳) اور عفت و عصمت کی حفاظت" لیکن طائف والوں
نے زخمی کیا، سنگباری کرتے پیچھے لگا دیئے۔ گالیاں سنائیں۔ پتھروں کی بارش کی
مگر زبان مبارک سے احد احد کی صدائیں بلند ہو رہی ہیں۔ مورخ کہتا ہے
کہ پتھراؤ کے سبب جب آپ بیٹھ گئے تو حضرت زید ؓ ابن حارثہ پروردۂ آغوش رحمت
دیروانۂ شمع رسالت اس حالت کو دیکھ کر بے قرار ہو گئے اور کہا کہ آپ ان کو
جہنم سے جنت میں لانا چاہتے ہیں اور وہ آپ پر ایسا ظلم ڈھاتے ہیں بد دعا کیجئے
کہ یہ سب برباد ہو جائیں۔ ایک پادری کا کہنا ہے کہ ایک چہیتے
چہرہ بدل گیا اور فرمایا اے زید تو نے کیا کہا کہ یہ لوگ مارتے ہیں تو میں بد دعا دوں
مجھے تو اللہ نے رحمت عالم بنا کر بھیجا ہے ہاتھ اٹھاتے ہیں اور فرماتے ہیں اے
میرے پروردگار میری قوم کو ہدایت دے یہ مجھے نہیں جانتے اور پہچانتے۔ اے
میرے خدا تو ان کو سمجھا اور ان کو ہلاکت میں نہ ڈال ممکن ہے کہ ان میں یا ان کی اولاد
میں کوئی سعید روح پیدا ہو جو تیرا کلام سنے اور قبول کرے میرے مولا تیرے
ہی پاک چہرہ میں پناہ لینا چاہتا ہوں اگر تو میرے ساتھ ہے تو مجھے کچھ خطرہ نہیں"

دنیا کہتی تھی کیا رسول کیا پیغمبر ہماری عقل کافی ہے ہم رات دن روشنی اور
تاریکی کی پہچان خود کر سکتے ہیں تو نبی کی ضرورت نہیں۔

فطرت کی طرف سے جواب ملا کہ عقل و دانش مجبور کرے تب تو ماننا
ہی ہوگا۔ آنکھ میں روشنی موجود ہے لیکن بلب گل کر دیتے جاتیں تو آنکھ کی
روشنی جواب دیدے گی۔ انتہائی تاریکی میں جب ایک ہاتھ کو دوسرا ہاتھ
سجھائی نہیں دیتا اگر کوئی کہے کہ آنکھ تو موجود ہے کیوں سجھائی نہیں دیتا
اس کا جواب یہی تو ہوگا کہ قانون قدرت کا یہی اصول ہے کہ روشنی ہی
سے آنکھ کو روشنی حاصل ہوتی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ مادی زندگی کے لئے
جب یہ اصول ہے تو کیا روحانی زندگی کے لئے باہر کی روشنی کی ضرورت نہیں؟
ماننا ہوگا کہ نبی کی روشنی کے بغیر یہ زندگی نہیں بن سکتی اور نہ ہی خدا کی
سچی معرفت حاصل ہو سکتی ہے۔

انسان کا عجیب عالم ہے گر اوٹ پر آجائے تو دنیا کی ہر چیز کو سجدہ
کرنے لگے اور انانیت پر آجائے تو انا ربکم الاعلیٰ کا دعویٰ کرنے لگے لیکن
رسول پاک نے جو دعوت پیش کی اور جو انقلاب رونما کیا وہ انقلاب انسان
کو اس کے صحیح مقام پر پہنچانا تھا۔ تعلیم دی کہ اے انسان نہ اتنا گھٹ کہ ہر
چیز کے سامنے سجدہ ریز ہو جائے اور نہ اتنا بڑھ کہ خدا بن جائے۔ اے انسان تو
ساری دنیا کا سردار اور تیرا سردار ساری دنیا کا خالق ہے۔ محمد ﷺ خدا کے پیغمبر
اور بندے ہیں یاد رکھ یہ نہ کہنا کہ رسول کی ضرورت نہیں ہے یہ بھی نہ کہنا کہ
رسول خدا کا بیٹا ہے۔

نبی اور رسول کے لئے معصوم ہونا ضروری ہے اس لئے کہ جب دو متضاد
چیزیں ہوتی ہیں تو ان میں درمیانی رابطہ پیدا کرنے والی تیسری چیز کی ضرورت
ہوتی ہے۔ ہڈی اور گوشت دو متضاد چیزیں ہیں ان کے تعلق کو پٹھے اور رگوں
کے بغیر قائم نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح روحانی قانون قدرت بھی یہ ہے

کہ ایک طرف خدا کی ذات ہے اور دوسری طرف انسان درمیانی رشتہ کو قائم کرنے کے لئے کسی واسطے کی ضرورت ہے اسکی سبیل یہ ہے کہ ایک انسان تمہاری طرح کا جو تمہارے ساتھ کھاتا پیتا اور جیتا مرتا ہو جس سے کہ تم مانوس ہو لیکن معصوم ہونے کی حیثیت سے امتیازی شان بھی رکھتا ہو وہی اس ربط کو قائم رکھ سکتا ہے چنانچہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی معصوم ہستی خدا اور انسان کے درمیان رشتہ قائم کرنے والی ایک مضبوط کڑی ہے جسے ہم رسول، نبی یا پیغمبر کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ دنیا قانون قدرت کی اس بات کو تسلیم کئے بغیر خدا سے کوئی رشتہ قائم نہیں کر سکتی۔

دنیا کی کوئی چیز تین حالتوں سے خالی نہیں ہے (۱) آغاز۔ (۲) بتدریج ترقی کرنا (۳) درجہ کمال۔ بچہ پیدا ہوتا ہے یہ اس کا آغاز ہے پرورش پاتا ہے اور بڑھتا رہتا ہے یہ اس کے بتدریج ترقی کرنے کی حالت ہے۔ بچپنے میں اس کے لباس چھوٹے بنتے ہیں اس کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ لباس بھی بتدریج بڑے بنتے رہتے ہیں۔ جب جوانی پر پہنچتا ہے تو باپ کہتا ہے کہ اب تو صاحبزادے کے جسم پر میرے کپڑے بالکل ٹھیک ہوتے ہیں درجہ کمال تک پہونچنے کے بعد جس کا بڑھنا رک جاتا ہے ایسا نہیں ہوتا کہ بڑھتا ہی رہے اس لئے کہ یہی قانون قدرت ہے تاریکی کو دور کرنے کے لئے پہلے چراغ وجود میں آیا پھر شمع کافوری اور موم بتیاں ایجاد ہوئیں۔ گیس آئی آخر میں بجلی نے آکر اپنی روشنی کا ایسا سکہ جمایا کہ کوئی نہ ٹھہر سکا ستارے چمکتے ہیں۔ ہلال چاند کی پہلی رات کو نمودار ہو کر بتدریج ترقی کرتے کرتے چودھویں کی شب میں بدر کامل بنکر تمام عالم کو روشن کر دیتا ہے مگر دنیا کہتی ہے کہ ابھی رات ہے ان میں سے کسی نے رات کو ختم کر دینے والا انقلاب پیدا نہیں کیا۔ لیکن سورج کے نکلتے ہی دنیا بول اٹھتی ہے انقلاب ہو گیا دن نکل آیا۔ یہ تو مادی دنیا کا انقلاب ہے لیکن یاد رہے کہ روحانیت میں بھی یہی قانون قدرت کارفرما ہے۔ انسانوں کی رہنمائی کے لئے آدم کا دیا جگمگایا نوح کی شمع کافوری روشن ہوئی۔ ابراہیم۔ موسیٰ اور عیسیٰ بتدریج ترقی کرتے کرتے بدر کامل بنکر چمکے۔ لیکن انسان کہتا رہا ابھی تو رات ہے یہ کب ختم ہو گی روحانیت کا آفتاب کب نمودار ہوگا۔ قدرت آواز دیتی ہے دیکھ ذات محمدی ﷺ عالم وجود میں آگئی آفتاب رسالت نکل آیا۔ انقلاب رونما ہو گیا اب نہ کہنا کہ رات ہے اس آفتاب رسالت کے بعد اب کوئی ماہتاب یا آفتاب نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ یہی قانون قدرت ہے۔ لیکن یاد رکھو کہ آفتاب عالم تاب کی تمازت سے بچنے کے لئے مئی جون کے مہینوں میں گھر میں چھپکر بیٹھنے کی ضرورت پڑتی ہے۔

لیکن آفتاب رسالت کو ہم نے سراج منیر بنایا ہے یہ آفتاب نور ہے آفتاب نار نہیں اس میں کوئی ایسی تمازت نہ ہو گی کہ جس سے تجھے بچنے کی ضرورت ہو اس سے جتنا بھی کسب کرنا چاہے تو کر سکتا ہے۔

رسول اکرم ﷺ جب دنیا میں تشریف لاتے تین قسم کی غلامی کارفرما تھی۔ (۱) خرید و فروخت کی (۲) ذات و نسل کی (۳) اور اقتصادی زندگی کی۔ آپ ﷺ نے ہندوستان روم الکبریٰ اور ایران کو دیکھا اعلان کیا کوئی غلام نہیں ہے۔ آقا سوائے خدا کے کوئی نہیں ہے۔ غلاموں کو برابری کے درجہ پر لانے کے لئے ہدایت کی کہ جو تم کھاؤ ان کو کھلاؤ۔ جو تم پیو وہ انہیں بھی پلاؤ۔ جو تم پہنو وہ انہیں بھی پہناؤ۔ غلامی کو ختم کرنے کے لئے یہ طریقہ ایجاد کیا کہ جب کوئی گناہ سرزد ہو تو غلام آزاد کر دو۔

دوسرے قسم کی غلامی ذات و نسل کے لحاظ سے تھی جیسے اونچ اور نیچ کے نام سے ہم اور آپ ہندوستان میں دیکھ رہے ہیں۔ پیشہ ور نسلی طور پر ذلیل سمجھے جاتے وہ چاہے جیسا نیک کام کریں مگر اونچے خاندان میں جو پیدا ہوا ہے حالانکہ بدکاری بھی کرتا ہے لیکن اونچا ہے۔ مگر رسول اکرم ﷺ نے کہا کوئی اونچ نیچ نسلی اعتبار سے نہیں ہے برادریاں صرف جان پہچان کے لئے ہیں یہ امتیاز گھمنڈ کا اظہار کرنے کے لئے نہیں ہے۔ اللہ کے نزدیک وہی بندہ اونچا ہے جو پاکباز ہے وہ چاہے جس نسل اور خاندان سے ہو۔ چودہ سو برس گزر گئے آج ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے ریفارمر اس اونچ نیچ کو ختم کرنے کے لئے قانون بناتے ہیں۔

گویا اتنے عرصہ کے بعد آج دنیا کو ماننا پڑ رہا ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے اونچ نیچ کے بارے میں جو بات پیش کی تھی وہ صحیح تھی۔ یورپ میں چرچ کے اندر انجیل کی تعلیم اگر کوئی کالا حاصل کرنا چاہے نہیں کر سکتا ہے۔ لیکن مسلمان ہو کر اگر کوئی مہتر بھی مسجد کی اگلی صف میں آکر بیٹھ جاتا ہے تو کسی سید کی بھی یہ مجال نہیں کہ اُسے وہاں سے اُٹھا سکے۔ آج اس امتیاز کو دور کرنے کے لئے پارلیمنٹ میں کوئی قانون بنتا ہے تو میں کہوں گا کہ ماننا ہو گا۔ رسول اکرم ﷺ کو جنہوں نے پہلے ہی فرما دیا تھا کہ " اے لوگو تم گواہ رہو کہ ساری دنیا کے انسان بھائی بھائی ہیں۔ یہ درس ہمارے رسول نے دیا۔ دنیا میں انقلاب پیدا کیا اور غلامی کی نسل سے چھٹکارا دیا۔ ہر زمانہ میں ہر دولت مند کو غریب آدمی کے مار ڈالنے کا حق تھا۔ رسول اکرم ﷺ نے قیصر روم ہرکلیوس (ہرقل اعظم) کو خط لکھا کہ سلام ہے اس شخص پر جو ہدایت قبول کرے۔ اے بادشاہ اسلام قبول کرلے تو محفوظ رہے گا اور اللہ تعالیٰ تجھ کو دگنا اجر دے گا ورنہ تیری رعایا کا گناہ بھی تیرے ذمے پڑے گا۔ اسی طرح ملک شام میں منذر بن حارث غسانی ایران کے بادشاہ خسرو

پرویز مصر کے والی مقوقس حبش کے نجاشی اور فرماں روائے بحرین منذرین ساذی الغرض بیشمار ممالک کے بادشاہوں تک اپنے خطوط بھیجے اور جہاں تک پیغام رسانی کا تعلق تھا اپنا فرض یوں انجام دیا تاکہ دنیا پیغام الٰہی سے آگاہ ہوکر اونچ نیچ اور طبقاتی جنگ کو ختم کر دے۔

عورتوں کی جو حالت تھی وہ کسی سے پوشیدہ نہیں "کارلائل" کا کہنا ہے کہ بعثت کے قریب پادریوں میں بحث تھی کہ عورت انسان ہے کہ نہیں کئی دن کی بحث کے بعد انسان تو مانا لیکن یہ فیصلہ کیا کہ یہ مردوں کا کھلونا ہے۔ ایران میں زردشت کی تعلیم ختم ہو چکی تھی جب آپ کی بعثت ہوئی تو وہاں عورت نہ کسی کی ماں تھی نہ کسی کی بیٹی۔ صرف عورت مانی جاتی تھی گویا کوئی امتیاز نہیں تھا عورت کی عرب میں کوئی عزت نہ تھی۔ لڑکی پیدا ہوتے ہی زندہ درگور کر دی جاتی تھی۔ ہندوستان میں عورتوں کو اپنے مردہ شوہر کے ساتھ خواہ دو دن کی بیاہی کیوں نہ ہوتی ہو جانا پڑتا تھا۔ عورت کی جگہ جگہ ذلت تھی لیکن رسول اکرمؐ نے وارثت میں سب کو شریک کیا مرد کا دوہرا اور عورت کا اکہرا حصہ اس لئے رکھا کہ باپ لڑکے کو پڑھاتا لکھاتا ہے تاکہ وہ خوشگوار زندگی گذار سکے اور میری خدمت بھی کر سکے کوئی باپ بیٹے کو مصیبت میں مبتلا ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ بیٹا باپ کی قوت بازو ہوتا ہے۔

لڑکا اپنے والدین اور اپنے بیوی بچوں کی کفالت کرتا ہے اس لئے اس کا دوہرا حصہ رکھا اور لڑکی صرف اپنی ہی کفیل ہے اور شادی کر کے دوسرے کی کفالت میں جا سکتی ہے اس لئے از روئے انصاف اس کا اکہرا حصہ رکھا عورت اور مرد میں منصفانہ حقوق قائم کرنے کے ساتھ رسول اکرمؐ نے ہدایت فرمائی کہ عورت گھر کی زینت ہے وہ ضرورت پر پردہ حیا کے ساتھ باہر بھی نکل سکتی ہے لیکن کلب کی رونق نہیں بن سکتی اسی کا نام اعتدال کی راہ اور صراط مستقیم ہے پہلے بیوہ کو نکاح کی اجازت نہ تھی۔ مرد کو دس گیارہ شادیاں کرنے کا حق ہوتا تھا رسول پاک نے فرمایا یہ فطرت انسانی کے بالکل خلاف ہے کہ مرد تو عورت کے مرنے پر شادی کرے اور عورت مرد کے مرنے پر نہ کر سکے۔ ہر مرتبہ بیوہ ہو جانے پر عورت کو نکاح کرنے کا حق ہے اور مرد بیک وقت اگر انصاف قائم نہیں رکھ سکتا ہے تو چار کا حق رکھتے ہوئے بھی ایک سے زائد شادی نہیں کر سکتا۔ طلاق کے مسئلہ میں رسول اکرمؐ نے فرمایا۔ اگر آپس میں جھگڑا ہو جائے تو درگذر سے کام لو سلے نہ ہونے پر عزیز داروں کے فیصلہ کو تسلیم کرو۔ اگر پھر بھی مسئلہ حل ہوتے نظر نہ آئے تو طلاق دیدو مگر جو کچھ دے چکے ہو واپس نہ لو۔ بشرطیکہ وہ خوشی سے واپس نہ کر دے۔

دنیا نے طلاق کا مذاق اڑایا۔ لیکن سترھویں صدی میں یورپ نے وراثت اور اٹھارویں صدی [illegible] جو قانونی [illegible] کر رسول اکرمؐ کی صداقت پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔ آج بیسوی صدی میں ہندوستان بھی ہندو کوڈ بل پیش کر کے وراثت اور طلاق کو تسلیم کر چکا ہے۔ رسول اکرمؐ کے چودہ سو برس پہلے کا دیا ہوا درس آج دنیا کو دہرانا پڑ رہا ہے۔ درحقیقت رسول اکرمؐ نے منصفانہ انقلاب پیدا کیا۔ دنیا رفتہ رفتہ آپ ہی کے بتائے ہوئے راستہ پر آ رہی ہے۔

چاروں طرف بڑی بڑی حکومتیں ہیں۔ سرمایہ دار اور غریب دو طبقہ میں تقسیم ہے۔ سرمایہ دار عیش کر رہا ہے اور غریب نان شبینہ کو محتاج ہے۔ رسول اکرمؐ نے فرمایا اے سرمایہ دار تجھے اپنی رقم کا چالیسواں اور کاشت کا دسواں حصہ غریب کو بلا کسی جھجک کے دینا پڑے گا اگر کوئی غریب نہیں ملتا ہے خلیفہ کے پاس جمع کر دینا ہوگا تاکہ غریب بھی جیتا رہے اور وراثت کے ذریعہ دولت قائم نہ رہ کر تقسیم ہوتی رہے . . . . رسول اکرمؐ نے سود کو حرام قرار دیا ہے۔ آپ کا ارشاد ہے کہ پریشان کو قرض اگر دو تو احسان کر کے نہ دو اس کی بیکسی سے فائدہ نہ اٹھاؤ۔ جو سود کھاتا ہے وہ خدا کو چیلنج کرتا ہے جوئے کو بھی حرام قرار دیا جس کے نتائج سے دنیا واقف ہے۔

رسول اکرمؐ کو اپنا محبوب شہر مکہ چھوڑ کر مدینہ ہجرت کر جانا پڑا وہاں پہونچکر تین قسم کے مخالفین کا مقابلہ کرنا پڑا۔ (۱) یہود (۲) قریش۔ (۳) اور مشرکہ فتنہ و فساد ظلم و بے انصافی۔ بدامنی اور بدی کو مٹانے کے لئے متعدد جنگیں لڑنی پڑیں ایک بار ایسی شرطوں پر بھی معاہدہ صلح کر لیا جو کھلے طور پر کمزوری کے مترادف تھیں مگر آپ کے ہم وطن ان شرطوں پر بھی قائم نہ رہے اور صلح کے برخلاف رسول اکرمؐ کی پناہ میں آتے ہوتے لوگوں کو قتل کر دیا گیا۔ خدا کے پیغمبر کو ان کے خلاف اقدام کرنے کا فیصلہ کرنا پڑا۔ دس ہزار کی فوج کے ساتھ مکہ پر چڑھائی ہوتی ہے ابوسفیان نے صلح کرنی چاہی آپ نے فرمایا اگر ایک ایک مسلمان کو قتل کر دیتے پھر بھی شاید انتقام نہ لیتا لیکن محمدؐ نے جن کو پناہ دی ان کو قتل کر دیا اسے برداشت نہیں کر سکتے حضرت سعد بن عبادہ انصار کی فوج کے علمبردار تھے ابوسفیان کو دیکھ کر کہا کہ آج گھمسان کا دن ہے حق و باطل کا فیصلہ ہوگا آج کعبہ حلال کر دیا جائے گا ابوسفیان نے رسول اکرمؐ کو توجہ دلائی تو جھنڈا لے کر ان کے بیٹے کو دیدیا اور کہا جاؤ ابن عبادہ جاؤ کہو آج جنگ کا دن نہیں ہے آج رحمت عالم کی رحمت کا دن ہے آج کعبہ میں جنگ نہ ہوگی آج کعبہ کو غلاف چڑھایا جائے گا آج کعبہ کی عظمت کا دن ہے رسول اکرمؐ مکہ میں فاتحانہ داخل ہوتے قلب مبارک اپنے خدا کے فضل و

احسان کے بار سے جھک گیا یہاں تک کہ سر قدس ذات کے کجاوے سے جا لگا اہل مکہ گرفتار ہو کر سامنے پیش ہوتے ہیں پوچھا تمہارے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے جواب دیا کہ ہم بہادر ہیں۔۔۔ آپ کے ساتھی اگر ہماری گرفت میں آتے تو ہم سب کو قتل کر ڈالتے اور یہی آپ کو بھی حق ہے آپ نے ارشاد فرمایا میں تمہیں قتل کر دوں؟ خدا نے تو اتنی بھی اجازت نہیں دی کہ تمہیں ملامت کر دوں۔

"آج تم پر کوئی الزام نہیں جاؤ تم ہر جرم و خطا سے بری ہو" مشکیں کھول دی گئیں اور سب آزاد کر دیئے گئے یہ تھی رحمت عالم کی شفقت لاانتہا۔

مؤرخ کہتا ہے کہ تین دن کے بعد اہل مکہ داخل ہوتے اور کہا کہ ہاتھ بڑھایئے تاکہ ہم اسلام لے آئیں۔ ارشاد ہوا کہ تین دن کے بعد کیوں آئے جواب دیا کہ مشکیں کھولنے کے فوراً بعد ہی اسلام لے آتے تو دنیا کہتی مرعوب ہو کر ایسا کیا اور ہمیں یہ بھی دیکھنا تھا کہ دنیا کے دکھانے کے لئے تو درگذر نہیں کیا گیا ہے مبادا دھوکا ہی دیا گیا ہو۔ بعد میں پکڑ کر قتل کر دیا جائے۔ لیکن آج ہم مطمئن ہو کر آئے ہیں اور خوشی کے ساتھ اسلام قبول کر رہے ہیں۔

حضرت سلیمانؑ اور حضرت داؤدؑ نے بادشاہی اور حضرت موسیٰؑ نے فرعونی طاقت کے سامنے استقلال اور مردانگی کا مظاہرہ کیا اور حضرت عیسیٰؑ نے کہا (کہ ایک گال پر اگر کوئی طمانچہ مارے تو دوسرا بھی پیش کر دو۔) رسول اکرمؐ نے دونوں چیزیں پیش کیں کہ بدلہ برابر کا لو۔ اگر معاف کر دو تو اللہ کے نزدیک سب سے محبوب کام ہے لیکن زیادتی کسی حالت میں نہ کی جائے۔

آپ نے فرمایا کہ رہبانیت اور جوگی بننے کی اسلام میں ضرورت نہیں ہے پہاڑ کی کھوہ میں عبادت کرنے والے سے وہ بہتر ہے جو بچوں میں رہ کر دنیاداری کے ساتھ خدا کو نہ بھولے انسان کی تخلیق فطرت الٰہی پر ہوتی ہے۔ اس میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کر سکتا۔ اسلام نے جماعتی زندگی بخشی ہے۔ جماعت کے ساتھ نماز، ایک ہی مہینہ میں روزوں کی اجتماعی طور پر تکمیل ایک ہی مہینہ میں فریضہ زکوٰۃ ادائیگی اور اُسے اجتماعی طور پر بیت المال میں جمع کرنا ایک ہی وقت میں اجتماعی طور پر حج کی ادائیگی۔ یہ سب اسلام کی بخشی ہوئی اجتماعی زندگی کے مظاہرے ہیں۔ میدان عرفات میں دنیا کے گوشہ گوشہ کے ہزاروں زبانیں بولنے والے آتے ہیں لیکن وہاں ایک ہی زبان میں نماز پڑھتے ہیں جس سے عالمگیر اجتماعیت کا مظاہرہ ہوتا ہے۔

اگر ہم جماعتی زندگی بنالیں تو عزت ورنہ رسوائی "اللہ کی رسی ایک ساتھ مل کر پکڑنے سے یہی مراد ہے کہ جماعتی زندگی بناؤ۔

کاش ہم سب رسول پاک کی سیرۃ سے سبق لیں اور خدائے پاک ہم کو اور آپ کو اس کی توفیق مرحمت فرمائے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین



حضرت مجاہد الملتؒ
کے تصور سے مخاطب ہو کر

۱۹۶۲ء

نتیجۂ فکرِ خداداد ـــــ بندۂ احقر سلطان احمد شہباز صدیقی امروہوی

۱۳۸۲ھ ۱۳۷۰ف

حفظِ رحماں! اے زعیمِ کشورِ ہندوستاں کاروانِ حریت کا تو ہے میرِ کارواں
لب پہ ہے ہر عامی و عالم کے تیری داستاں اک زمانہ ہے تری توصیف میں رطب اللساں
ذاتِ پاک تست در آفاق فخرِ روزگار
ہستیت قوم و وطن را مایۂ صد افتخار

ہے وجودِ پاک تیرا پیکرِ علم و عمل راہِ عزمِ راسخ میں گام ہے تیرا اٹل
جوش میں ہے بحرِ ذاخر، استقامت میں جبل درحقیقت تو شیخ الہند کا نعم البدل
فیضِ روحانی ملا ہے تجھ کو ہر استاد سے
انورؒ و اشرفؒ رشیدؒ و قاسمؒ و امدادؒ سے

علم و فن کے مختلف شعبوں کا تو ہے حکمراں تو محدث، تو مفسر، تو فقیہِ نکتہ داں
واقفِ سرِّ معانی، ماہرِ علمِ بیاں تجھ سے حکمت میں ارسطو کی فراست ہے عیاں
فکر فی القرآں میں مستثنیٰ ہے تیری ذاتِ پاک
ذہن پر واضح ہیں تیرے معنیِ آیاتِ پاک

تو ہے اپنے عہد کا علامۂ عالی مقام فاضلِ پاکیزہ سیرت حاجیِ بیت الحرام
محرمِ رازِ تصوف، عالمِ علمِ کلام فنِ تاریخ و تمدن میں ہے فہّام و امام
ایک جانب ہے الٰہیات پر تیری نظر
ایک جانب ہے سیاسیات پر تیری نظر

بحث میں بر آئے تجھ سے کب کسی کی ہے مجال منطق و حکمت میں حاصل ہے تجھے عینِ کمال
روبرو تیرے زبانِ خصم ہو جاتی ہے لال ہو کے قائل بھول جاتا ہے سب اپنی قیل و قال
کیا تری حجت کو رد کرنا کوئی آسان ہے
تیری ہر برہانِ قاطع، قاطعِ برہان ہے

تیری ہر تقریر سے شانِ خطابت ہے عیاں   ہے فصاحت پر تری سحبانِ وائل کا گماں
اعلیٰ و ارفع مضامیں، شستہ و رفتہ زباں   لفظ شیریں، نطق دلکش، صاف اندازِ بیاں

حسبِ موقع اُس میں ہے اطناب بھی ایجاز بھی
سحر کا ہے سحر بھی، اعجاز کا اعجاز بھی

جوش میں دیتا ہے تو جب کوئی پبلک میں بیاں   کوندنے لگتی ہے ہر سو بزم میں برقِ تپاں
اس طرح جوہر دکھاتی ہے تری تیغِ زباں   تیغِ جوہر دار ہو جاتی ہے محتاجِ فساں

زور ہو جاتا ہے پیدا یوں تری گفتار میں
اُٹھتا ہے طوفان جیسے قلزمِ ذخار میں

تیری ہر تحریر بھی ہے بے بہا و لاعدیل   ہے رواں تیری عبارت مثلِ موجِ سلسبیل
تیری ہر ترکیب پختہ، تیرا ہر جملہ جمیل   طرزِ انشاء کی ترے کشتہ ہے انشائے قتیل

اپنے رنگِ خاص میں یکتا ہے تیری ہر کتاب
ضو فشاں چرخِ ادب پر ہے جو مثلِ آفتاب

درس سے اپنے نہ پایا تھا ابھی تو نے فراغ   مل گیا جو تجھ کو آزادی کی صہبا کا ایاغ
جل اُٹھا دل میں ترے حبِّ وطن کا وہ چراغ   جس کی تابانی نے روشن کر دیا تیرا دماغ

یک بیک تو راہِ آزادی کا راہی بن گیا
فوجِ احرارِ وطن کا اک سپاہی بن گیا

ملک میں ہونے لگے جوہر ترے پھر آشکار   قوم میں بڑھنے لگا ہر سو ترا عزّ و وقار
جم گیا قلبِ اکابر پر بھی نقشِ اعتبار   بن گیا مجلس کا اُن کی تو مشیر و مستشار

ہو گیا قائل تری حکمت کا ہر اعلیٰ دماغ
رفتہ رفتہ بن گیا تو قوم کا چشم و چراغ

بڑھ کے مارا تو نے میدانِ سیاست میں قدم   اُٹھا رکھ کر دوش پر اپنے خلافت کا علم
مرحبا یہ تیری شوکت حبذا تیرا حشم   سیف ایک اس ہاتھ میں اُس ہاتھ میں ہے قلم

کی حمایت قوم کی تحریر سے تقریر سے
خوف کچھ کھایا نہ تو نے طوق سے زنجیر سے

ہاتھ میں جب تیرے جمعیت کا آیا انتظام   کر دیا تو نے مذاقِ حریت پبلک میں عام
یعنی پہنچایا یہ گوشِ ہر مسلماں تک پیام   "بندگیٔ غیر" ہے مردِ مسلماں پر حرام

دب کے رہنا غیر سے شانِ مسلمانی نہیں
اس روش میں امتثالِ امرِ قرآنی نہیں

ہو گیا جب تو شریکِ رہبرانِ کانگریس   بادِ صرصر بن کے اُٹھا کاروانِ کانگریس
تیری طاقت سے بڑھی تاب و توانِ کانگریس   تیری ہستی بن گئی روحِ روانِ کانگریس

حریت کا ملک میں ہر شخص شیدا ہو گیا
زور اک تحریکِ آزادی میں پیدا ہو گیا

تو نے کی انگریز سے میدانِ آزادی میں جنگ   کر دیا حربوں سے اپنے قافیہ دشمن کا تنگ
منہ کی کھا کر معرکہ سے اُڑ گئے اہلِ فرنگ   آ گیا میدان تیرے ہاتھ بے تیغ و تفنگ

سربلند آخر وطن کا تو نے جھنڈا کر دیا
تاجِ افرنگ کا بازار ٹھنڈا کر دیا

تو نے قید و بند کی شدت اُٹھائی بار بار   طوقِ فولادی ہوئے اکثر تری گردن کا ہار
اپنی راہِ راست پر لیکن رہا تو پائیدار   خوف کچھ دار و رسن سے بھی نہ کھایا زینہار

حوصلہ ہر آن تیرے دل کا بڑھتا ہی گیا
جذبۂ حبِ وطن پروان چڑھتا ہی گیا

خندہ پیشانی سے غیروں کے مظالم بھی سہے　　حلم عثمانی سے اپنوں کے مطاعن بھی سنے
مال کے نقصان بھی برداشت ہنس ہنس کر کئے　　جان پر بھی آبنی کچھ وقت ایسے بھی پڑے
جو بھی سختی پیش آئی اُس سے منھ موڑا نہیں
ساتھ مُلک و قوم کا، تو نے کبھی چھوڑا نہیں

بعد آزادی بھی تو سیماب فطرت ہی رہا　　روز و شب شغلِ مسلسل تیری عادت ہی رہا
جیل کیا مسند پہ بھی محرومِ راحت ہی رہا　　قوم کے مخدوم! تیرا کام خدمت ہی رہا
مرتے دم تک قوم کی تنظیم تو کرتا رہا
اپنی دُھن میں منہمک جیتا رہا مرتا رہا

ہو رہا تھا جب مسلمانوں کا ہر سو قتلِ عام　　ہاتھ میں فرقہ پرستوں کے تھی تیغ بے نیام
درہم و برہم تھا امن و آشتی کا ہر نظام　　خوف سے غنڈوں کے خواب خور تھا پبلک کو حرام
ہوگیا دل تیرا مضطر قتل و غارت دیکھ کر
دَور میں تہذیب کے یہ بربریت دیکھ کر

آگیا میدان میں تو چھوڑ کر اپنا مکاں　　قلب تیرا نوحہ خواں تھا چشم خونابہ فشاں
جوش کے عالم میں، ہو کر بے نیازِ ہر زیاں　　شیر کی صورت در آیا بھیڑیوں کے درمیاں
آگ کے شعلوں میں ظاہر جرأتِ پروانہ کی
جان اوروں کی بچائی اپنی کچھ پروا نہ کی

قلب مسلم سے مٹایا تو نے ہر خوف و خطر　　گھر کئے آباد اُن کے لُٹ گئے تھے جن کے گھر
جل رہے تھے ظلم کے جو بے گناہوں پر تبر　　بن گیا اُن کی حفاظت کے لئے تو اک سپر
ترک کر کے عیش و عشرت جھیل کر رنج و محن
ہر طرف پھرتا رہا تو باندھ کر سر سے کفن

کمتری کا قوم سے تو نے کیا احساس دور　　بخشا اطمینان اُن کو قلب تھے جو ناصبور
یاس کے ظلمات میں اُمید کا پھیلا کے نور　　کر دیا دار المحن کو غیرتِ بیت السرور
ولولہ بھر کر دلوں میں رفعتِ پرواز کا
حوصلہ تو نے ممولوں کو دیا شہباز کا

درس تو نے قوم کو خود اعتمادی کا دیا　　اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کا عہد اس سے لیا
بارہا للکار کر لوگوں پہ یہ واضح کیا　　جو جیا اوروں کے برتے خاک دنیا میں جیا
مَرد وہ ہے اپنے بل بوتے پہ جو زندہ رہے
راہ میں سیلِ حوادث کی بھی پائندہ رہے

مجلس آئین کا جس دن سے تو ممبر بنا　　قوم کے حق کی حفاظت مشغلہ تیرا رہا
جب بھی مذہب کے مخالف پیش کوئی بل ہوا　　تو نے کی ایوان میں تردید اُس کی برملا
ہمہمہ پیدا کیا وہ جرأتِ بے باک سے
جا کے ٹکرایا جو سقفِ گنبدِ افلاک سے

وصف کیا ہوں ترے اخلاقِ حمیدہ کے رقم — مالکِ جہر و مروت صاحبِ لطف و کرم
پیکرِ اجلال، والا مرتبت، عالی ہمم — عدل پرور، رحم دل، فرخندہ خو، نیکو شیم

دردِ ملت سے ہمیشہ چشم تیری اشکبار
مفلسوں کے دکھ کا ساتھی بیکسوں کا غمگسار

کذب سے بیزار ہے تو صدق ہے تیرا شعار — نقضِ عہد کو تو جانتا ہے ننگ و عار
صاف گوئی پر تری ہر گفتگو کا ہے مدار — تیرا قلبِ پاک ہے شفاف و صاف آئینہ وار

بات ہے تیری زباں پر بھی وہی جو دل میں ہے
رنگ ہے خلوت میں جو تیرا وہی محفل میں ہے

ہر سخن سے ہے ترے ایمان کی جرأت عیاں — سر نہیں ہوتا گریباں میں کبھی تیرا نہاں
بولتا ہے تو کڑک کر بیٹھ ہر خاقان و خاں — جن کے رُکتی ہی نہیں ہرگز تری سیفِ زباں

بحث سے بچتا نہیں تو گفتگو کو ٹال کر
گونجتا ہے شیر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر

آستانہ ہے ترا امید گاہِ خاص و عام — اہلِ حاجت کا جہاں رہتا ہے ہر وقت ازدحام
بات تو سنتا ہے سب کی سب سے کرتا ہے کلام — ہو کے جاتے ہیں تری سرکار سے شادکام

دیتا ہے انجام تو خوش ہو کے اپنے کام کو
کام پر قربان کر دیتا ہے ہر آرام کو

ایک دم فرصت نہیں تجھ کو مسلسل کام سے — بیر ہے فطرت کو تیری راحت و آرام سے
تو کبھی پبلک سے ملتا ہے کبھی حکام سے — گردشِ پیہم ہے وابستہ ترے اقدام سے

ہوتا ہے ظاہر یہ تیرے پیکرِ بیتاب سے
ہے خمیر اس کا مرکب جوہرِ سیماب سے

اب کسی قائد میں تیری شانِ انسانی نہیں — تیری دانش تیری عصمت تیری قربانی نہیں
عزمِ طارقؓ جوشِ خالدؓ حلمِ عثمانیؓ نہیں — یعنی اے آزاد کے ثانی ترا ثانی نہیں

عمرہا باید کہ مردے پختہ کار آید چنیں
در دیارِ ہند فخرِ روزگار آید چنیں

ہست قائم از جلالت رونقِ ایوانِ عشق — نیست در اقطاعِ عالم ہمچو تو سلطانِ عشق
حبذا ایں شانِ زیبائے تو در میدانِ عشق — در کفے جامِ شریعت در کفے سندانِ عشق

کارِ دشوار است در راہِ تو آساں تاختن
"ہر ہوسناکے نہ داند جام و سنداں باختن"

جائے تو معمورۂ امکاں سے آ سکتا نہیں — کھو کے یہ ظالم زمانہ تجھ کو پا سکتا نہیں
مدتوں ہندوستاں تجھ کو بھلا سکتا نہیں — داغ تیرا اپنی چھاتی سے مٹا سکتا نہیں

کون تجھ جیسا ہے اب ہر دلعزیز آفاق میں
تیری منزل ہے دلِ جمہور کے اعماق میں

رو رہا ہے آج تیرے غم میں ہر پیر و جواں — اُٹھ رہا ہے ہر دلِ سوزاں میں آہوں کا دھواں
ملک میں ہے چار جانب شورِ فریاد و فغاں — بن گیا ہے بیتِ احزاں کا نمونہ ہر مکاں

یک بیک دنیا کی دنیا وقفِ ماتم ہوگئی
مرگِ عالم در حقیقت مرگِ عالم ہوگئی

فکر میں تاریخ کی تھا محو شہبازِ حزیں — اشک آنکھوں سے رواں تھے قلب تھا اندوہگیں
اُڑ کے جب فریاد پہنچی تا سرِ عرشِ بریں — بولے رقت خیز لہجے میں یہ جبریلِ امیں

شمعِ محفل کارواں سالارِ آزادی بمرد
۱۳۸۲ھ
حفظ الرحمانؒ مطلعِ انوارِ آزادی بمرد

۶۲ ۱۹ء

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما

حضرت مجاہد ملت رحمۃ اللہ علیہ کی تابناک زندگی پر ایک عالمگیر شہادت

اُردو صحافت کا خراج تحسین

"حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب قدس سرہٗ کے وصال پر اگرچہ ہندوستان اور پاکستان میں اُردو ہندی، انگریزی اور دوسری زبانوں کے تمام ہی اخبارات و رسائل نے اپنے مقالات کے ذریعہ اظہار رنج و ملال کیا تھا، بلکہ بیرونِ ہند میں بھی خاص طور عالم اسلام میں جگہ بہ جگہ روزانہ ۔ سہ روزہ ۔ ہفتہ وار ۔ ماہوار معزز و مشہور اخبارات اور رسائل نے اپنے مقالات کے ذریعہ حضرت موصوف کی عظیم خدمات کو خراج تحسین پیش کیا تھا جن میں قاہرہ کا مشہور روزنامہ الاھرام اور ماہنامہ المسلم مکہ مکرمہ کا ماہنامہ الحج ۔ رنگون کا روزنامہ استقلال قابل ذکر ہیں ـــ تاہم طوالت سے بچتے ہوئے ہم نے صرف برصغیر ہند و پاکستان کے اُردو جرائد ہی پر اکتفا کیا ہے۔ اور ان کے مقالات اگلے صفحات میں ھدیہ ناظرین کیے جا رہے ہیں ۔ اس لیے کہ حضرت مولانا مرحوم خود بھی اُردو کے ایک فاضل مصنف، محقق اور ادیب تھے اور اُردو زبان کی بقا اور ترقی کے لیے انھوں نے اپنی مصروف زندگی میں بہت کچھ کام کیا اور اس کو اپنے مہماتِ مشاغل کا ہمیشہ ایک جز بنائے رکھا۔

ادارہ

روزنامہ الجمعیۃ دہلی — ۳ اگست ۱۹۶۲ء —

یہ اندوہناک خبر سن کر کس کو غم اور ملال نہ ہوگا کہ حضرت مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب جنرل سکریٹری جمعیۃ علماء ہند و ممبر پارلیمنٹ کینسر (سرطان) کے موذی مرض میں طویل عرصہ تک مبتلا رہ کر آج دو ۲ اگست ۱۹۶۲ء کو صبح ۴ بجے نئی دہلی میں انتقال فرما گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون، القلب یحزن والعین تدمع وانا بفراقک یا مولانا لمحزونون!

جو ہونا تھا وہی ہوا۔ اور آپ کینسر کے موذی مرض سے نجات نہ پا سکے، جہاں تک ظاہری اسباب اور تدابیر کا تعلق ہے۔ ان سے پورا فائدہ اٹھایا گیا۔ دہلی سے بمبئی اور بمبئی سے امریکہ تک مشہور ہسپتالوں میں علاج ہوا اور ماہر طبیبوں اور ڈاکٹروں کے مشورہ پر عمل کیا گیا۔ مگر مرض اس قدر حاوی ہو چکا تھا کہ کوئی علاج کارگر نہ ہو سکا۔ جب مولانا امریکہ تشریف لے گئے تو حالت قدرے بہتر تھی، جب واپس آئے تو نقاہت اور کمزوری سے نڈھال ہو چکے تھے۔ دیکھنے والوں نے اندازہ لگایا تھا کہ اگر مولانا ملت کی قسمت سے بچ گئے تو آپ کی زندگی ایک معجزہ ہوگی، ورنہ بظاہر تو مایوسی ہے۔ لیکن انتقال کے دن تک جن لوگوں نے آپ سے ملاقات کی انھیں تصور بھی نہ تھا کہ مولانا چند گھنٹوں کے بعد اپنے پروردگار سے جا ملیں گے۔ عام خیال یہ تھا کہ شاید رشتہ حیات ایک ماہ تک منقطع نہ ہو۔ رات کے دس بجے تک لوگوں سے باتیں کیں اور صبح چار بجے روح مبارک قفس عنصری سے آزاد ہو گئی۔

مولانا کی طویل خدمات کی فہرست پیش کرنا مقصود نہیں، سب جانتے ہیں کہ زندگی بھر اس مرد مجاہد کا رول کیا رہا ہے اور آپ کی قیمتی زندگی کن مشاغل میں گزری، لیکن فی الحال جو احساس دماغوں پر غالب ہے وہ یہ ہے کہ آپ کا کوئی بدل نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ دنیا کا کاروبار عظیم اور جلیل ہستیوں کے اٹھ جانے کے بعد بھی چلتا رہتا ہے۔ آفتاب کے طلوع و غروب میں کوئی فرق نہیں آتا۔ ماہتاب اپنے وقت پر چمکتا ہے ستارے حسب معمول رواں دواں رہتے ہیں۔ سمندر کو اپنی طغیانیوں سے کام رہتا ہے۔ اس کی بلا سے اگر کسی کی کشتی حیات غرق ہوتی ہے غرض کسی کے مرنے سے کائنات کے نظام میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ لیکن اس بات سے انکار نہیں کہ اس قحط الرجال کے زمانہ میں مسلمانوں میں سے جو بھی ہستی رخصت ہوئی اس کا جانشین پیدا نہ ہو سکا۔ جمعیۃ علماء کے اکابر میں حضرت شیخ الہند، حضرت علامہ مفتی محمد کفایت اللہ، حضرت مولانا محمد سجاد، حضرت مولانا احمد سعید، حضرت مولانا ابوالکلام آزاد اور دوسرے بزرگ اور قائدین ایک ایک کرکے رخصت ہوئے۔ مگر ان کی جگہ لینے والا پیدا نہ ہو سکا۔ اب حضرت مجاہد ملت نے رخت سفر باندھا ہے۔ اور چاروں طرف نظر دوڑانے کے باوجود ان کا بدل نظر نہیں آتا۔ خدا ہزار بار غریق رحمت کرے، عجیب انقلابی زندگی پائی تھی۔ سیماب فطرت اگر کسی کو دیکھا ہے تو وہ مولانا ہی کی زندگی تھی۔ مرکزی دفتر میں ہیں تو طلوع آفتاب سے کر نصف شب تک قوم و ملت کے کاموں میں مصروف ہیں، ابھی فون یا تار آیا، فوراً چلنے کو تیار ہو گئے۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ دور دراز کے سفر سے واپس تشریف لائے اور دفتر میں قدم ہی رکھا تھا کہ فون پر بلاوا آیا یا خدمت عالی میں تار پہنچا، فوراً اٹھ کھڑے ہوتے اور ہوائی اڈہ یا ریلوے اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گئے۔ مزاج میں تحقیق اور تنقید تھی اور بحث و مذاکرہ کے بغیر کسی بات کو تسلیم نہ کرتے تھے۔ نرم گرم گفتگو کے بعد کیا مجال کہ مخالف کی طرف سے دل پر غبار آ جائے قلب آئینہ کی طرح صاف تھا۔ دماغ میں بلا کی ذکاوت تھی۔ ذہن کی رسائی میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے سینے میں مظلوموں کی ہمدردی کوٹ کوٹ کر بھری تھی مسلم کش ہنگاموں پر بقائمی ہوش و حواس بڑے مغموم ہوتے تھے۔ فرمایا کرتے تھے کہ ہر طبقہ اور ہر فرقہ کی خدمت کرنا ہمارا کام ہے۔ مگر کیا کریں، اتفاق سے آزادی کے بعد مسلمان ہی تختہ ستم بنائے گئے اس لئے قدرتی طور پر جمعیۃ علماء کی خدمات زیادہ تر مسلمانوں تک محدود رہیں۔ خدمت میں حاضر ہونے والے اور ضرورت مند ہندو بھی ہوتے تھے اور سکھ بھی اور آپ خندہ پیشانی کے ساتھ سب کی خدمت کرتے اور ہر شخص کے کام آتے۔

آزادی سے پہلے آپ نے قوم و ملت کی جو خدمات انجام دیں، وہ شاید قوم کو یاد نہ ہوں مگر ملت ان خدمات کو کبھی فراموش نہیں کر سکتی جو آپ نے آزادی کے بعد انجام دیں قدرت نے آپ کے سینہ کو دل دردمند سے معمور کیا تھا ۱۹۴۷ء کے قتل عام میں آپ نے جان تک کی پروانہ کی اور آگ اور خون میں بے تحاشہ کود پڑے۔ اس کے بعد اب تک آپ نے زندگی کا جو رول ادا کیا۔ اس سے ہندوستان کا بچہ بچہ واقف ہے آپ کی زندگی کا نمایاں وصف بے باکی، جرأت، ہمت اور صاف گوئی تھی۔ منافقت کی دنیا میں آپ نے خلوص کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ مرد حق آگاہ کی طرح ہر میدان میں کودے اور کٹھن سے کٹھن منزل کو طے کیا۔ رعب اور دباؤ سے کبھی متاثر نہیں ہوئے۔ جان گئے انتہائی بے باکی کے ساتھ حق کی نمائندگی۔ اور ترجمانی کی مختلف الخیال لوگوں سے توازن کے ساتھ پیش آنا اور اپنے نقطۂ نظر کو وضاحت کے ساتھ پیش کرنا آپ کی عادت ثانیہ بن چکا تھا۔

آپ نے بیماری کی حالت اور شدت میں بھی ملک کے اہم ترین مسائل کو نظر انداز نہیں کیا ان پر ملک کے رہنماؤں سے برابر گفتگو کرتے رہے۔ امریکہ سے علاج کے دوران اندور کے بارے میں وزیر اعلیٰ اترپردیش کو خط لکھا اور اس کی ایک نقل پنڈت جواہر لال نہرو کے نام بھیجی واپسی کے بعد بھی آپ مختلف مسائل پر غور و فکر کرتے رہے۔ دراصل آپ کی داستان زندگی انقلاب کی ایک پوری

تاریخ ہے تاپ سے بے شمار واقعات تاریخ کے حوالے کئے ہیں اور امت کے لئے علم وعمل کا بہت کچھ اثاثہ چھوڑا ہے۔

دعا ہے کہ رب اکبر مرحوم کی روح کو شاد اور تسکین بخشے اور اس پر اپنی بیکراں رحمتوں کی بارش فرمائے، ہم اس جانکاہ حادثہ پران کے فرزند، ان کی صاحبزادیوں، ان کے بھائی اور جملہ متعلقین واعزہ کے غم میں برابر کے شریک ہیں اللہ تعالیٰ ان سب پرانی خباب سے صبر جمیل کا القا فرمائے اور انھیں اپنی حمایت اور نصرت سے نوازے۔

مدینہ بجنور

امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ نے کیا خوب فرمایا ہے۔

"سفر دو ہیں، ایک شخص کا ایک مقصد کا، اشخاص کی کامیابی یہ ہے کہ وہ اپنا کام کئے جائیں یہاں تک کہ اپنے آپ کو مقصد کے لئے قربان کردیں۔ جب انھوں نے اپنے آپ کو مقصد کے لئے قربان کردیا تو ان کا سفر منزل مقصود تک پہونچ گیا اور کامیاب ہوگئے، اب ان کے لئے یہ سوال باقی نہیں رہتا کہ مقصود حاصل ہوا یا نہیں، اس سفر میں سفر سے نہ تھکنا اور آخر تک چلتے رہنا ہی سب سے بڑا مقصود ہے اور اس لئے جس مسافر نے اس مقصود کو پالیا، اُس نے اپنا کام پورا کردیا۔ یہاں راہ اور منزل دو نہیں ایک ہی ہیں ؎

نہ رواں راخستگی راہ نیست!
عشق ہم راہ است وہم خود منزل است

باقی رہا مقصد کا سفر تو بلاشبہ اس کی کامیابی یہ ہے کہ مقصد حاصل ہوجائے لیکن یہ انسان کا کام نہیں ہے جو بیج بوتا ہے، خدا کا کام ہے جو سورج چمکاتا ہے اور بدلیاں بھیجتا ہے اور اس کا قانون یہ ہے کہ اگر راہ رواں مقصد کامیابی کے ساتھ اپنا سفر کرتے رہے تو مقصد کا سفر بھی ایک دن پورا ہوکر رہے گا۔

اسی طرح ایک جگہ امام الہند نے کہا ہے کہ

"سچا مجاہد وہی راست باز انسان ہے جو انسان کی قوتوں کی ہیبت اور سطوت کے مقابلہ میں کھڑا ہوجائے اور خدا کی عدالت وصداقت کی محبت اس پر اس درجہ چھا جائے کہ وہ اُس کے بندوں کی ہیبت کی کچھ پروا نہ کرے۔"

چنانچہ جب ہم مندرجہ بالا اقوال کی روشنی میں اُس ذات گرامی کو دیکھتے ہیں جسے ہم کل تک مجاہد ملت کہتے تھے تو ہمیں اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ بلاشبہ قوم نے اُسے جس نام سے پکارا تھا اور جس خطاب سے نوازا تھا۔ وہ پوری طرح اس کا اہل ثابت ہوا۔ اُس نے ایک سچے مجاہد کی طرح زندگی گذاری اور بالآخر اپنے آپ کو مقصد کی راہ میں قربان کردیا۔ پس بلاخوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ وہ اس دنیا میں ایک کامیاب انسان کی طرح جیا اور ایک کامیاب انسان کی طرح یہاں سے اپنے مالک حقیقی کے پاس چلا گیا۔

اُس نے جس بانکپن، جس رکھ رکھاؤ، اور جس انداز سے زندگی گذاری۔ خدا کی قسم اُس میں بھی وہ منفرد تھا اور بیماری وعلالت کی شدت نے بھی اُس بانکپن کی مسکراہٹ کو کم نہ کیا تھا۔ اسی لئے اللہ تبارک وتعالیٰ نے ملک وملت کے اس عظیم مجاہد کو وہ درجہ دیا جو جہاد فی سبیل اللہ کا سب سے بہتر انعام ہے۔

شہید ملت

اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے۔

ومن يطع الله والرسول فاولئك مع الذين انعم الله عليهم من النبيين والصديقين والشهداء والصالحين وحسن اولئك رفيقا (۴-۶۹)

اور جس کسی نے اللہ اور رسول کی اطاعت کی تو بلاشبہ وہ ان لوگوں کا ساتھی ہوا جن پر اللہ نے انعام کیا ہے یہ انعام یافتہ جماعت نبیوں کی ہے صدیقوں کی ہے شہداء کی ہے نیک عمل انسانوں کی ہے اور جس کے ساتھی ایسے لوگ ہوں تو کیا ہی اچھی اُس کی رفاقت ہے

(ترجمان القرآن)

امام الہندؒ رقمطراز ہیں کہ "شہید کے معنی گواہ کے ہیں۔ یعنی ایسے انسان جو اپنے قول وفعل سے حق وصداقت کی شہادت بلند کرنے والے ہوں۔"

مندرجہ بالا روشنی میں اگر مجاہد ملت کی حیات دنیوی کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات صاف اور واضح ہوجاتی ہے کہ انھوں نے اپنی زندگی کے تمام اعمال واقوال کو اللہ اور اُس کے رسول کی اطاعت کے سانچے میں ڈھالنے کی پوری پوری کوشش کی۔ اپنے قول وفعل سے آخر دم تک حق وصداقت کی شہادت بلند کی۔ اور اسی راہ میں اپنی جان عزیز کو بھی قربان کردیا۔ اور پھر خداوند تعالیٰ کا یہ کتنا بڑا انعام ہے دنیا میں ہی ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ شہداء وصالحین کے قافلہ سالار حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے خاندانی قبرستان میں جسے ایک بہت بڑے عالم دین کی زبان میں "ہندوستان کا جنت البقیع" کہا جاسکتا ہے، بہترین رفیقوں کے مابین ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جا سوئے۔

علالت کا دور!

یہ بات اب راز نہیں رہی ہے کہ مجاہد ملت کی بیماری کا سلسلہ بہت پرانا ہے۔ سب سے پہلے ستمبر ۱۹۶۱ء میں مولانا کا ایکسرے لیا گیا تو ڈاکٹروں نے کینسر کے شبہ کا اظہار کیا۔ لیکن قومی خدمت کی لگن ایسی تھی کہ احباب کے جبر سے دو چار روز دوا تو پی لیتے تھے مگر کسی صورت آرام کے لئے تیار نہ ہوتے تھے۔ چنانچہ ۱۹۶۱ء سے

لیکر ۱۴ر جنوری ۶۲ء تک مولانا مسلسل دور دراز علاقوں میں سفر کرتے رہے اسی عرصہ میں بمبئی ملابار اور حیدرآباد کا دورہ کیا۔ مغربی یوپی کے فساد زدہ علاقوں کا دورہ تو اس حال میں شروع کیا کہ ڈبل نمونیہ کا اثر تھا، سردی کا موسم تھا، لیکن ابھی یہاں ہی تو ابھی وہاں پھر الیکشنی دورہ شروع کر دیا، آخر ۲۲ر جنوری ۶۲ء کو اس حال میں دہلی پہونچے کہ گاڑی سے اترنا یا اپنے مکان کی سیڑھیوں پر چڑھنا دشوار تھا، پھر بھی عزم و ہمت کا یہ عالم تھا کہ اسی روز رات کو بذریعہ ہوائی جہاز بمبئی جانے پر مصر تھے، بہرحال وہ غشتے ہوتے رہے۔ اپنا سامان لیکر مکان سے باہر نکل آئے۔ بار بار کہتے تھے، میں موت سے نہیں ڈرتا سیٹ بک ہو چکی ہے مجھے جانا چاہیے۔ لیکن مخاعین مولانا کی سیٹ کینسل کرا چکے تھے، اس لئے مولانا کو رکنا ہی پڑا۔ اس کے بعد علاج کا جو سلسلہ چلا اس کا علم سب کو ہے ہی۔ پھر اس علالت میں بھی مولانا تمام مسائل سے باخبر رہے اور کام کراتے رہے۔ حتی کہ امریکہ سے مسٹر سی بی گپتا کو جو خط بھیجا وہ سب کو معلوم ہے۔

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ مولانا کے لاشعور میں مستقبل کی پرچھائیاں پڑنے لگی تھیں اور مولانا چاہتے تھے کہ زندگی کی جو فرصت باقی رہ گئی ہے اس کا ایک لمحہ بھی کسی طرح رائگاں نہ ہونے پائے۔ اور الحمدللہ کہ مولانا اس جدوجہد میں کامیاب رہے اس لئے مولانا سے عمر میں ۲ سال کم اور ۴۰ سال تک قومی جدوجہد میں ساتھ رہنے والے مولانا محمد میاں صاحب کا یہ فرمانا صحیح ہے کہ۔

"مجاہد ملت کی ساری زندگی قومی خدمت میں گذری، ان کی علالت بھی قومی خدمت انجام دیتے ہوئے شروع ہوئی۔ اور اسی بیماری نے ان کی جان لی، اس لئے یہ کہنا درست ہے کہ ان کی وفات قوم کی مسلسل خدمات کے سلسلہ میں شہادت ہے"

بہترین رہبر

مولانا میں قیادت کی فطری صلاحیت تھی اور مولانا نے ابتدائے عمر سے ہی اس کا ثبوت دینا شروع کر دیا تھا۔ لیڈرشپ کی صلاحیت تو بہت سے لوگوں میں ہوتی ہے۔ ماہرین نفسیات نے اس سلسلہ میں بڑی بڑی کاوشیں بھی کی ہیں۔ لیکن اصل سوال یہ ہے کہ اس "فطری صلاحیت" کی تربیت کس طرح ہوتی ہے اور پھر وہ شخص خود اس سلسلہ میں کیا کاوش کرتا ہے۔ مولانا کو خدا کے فضل و کرم سے تربیت گاہ بھی بہترین نصیب ہوئی یعنی شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور پھر شیخ الاسلام مولانا حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے خاص شفقت، محبت اور لگاؤ سے مولانا کی تربیت کی شیخ الہندؒ کی عمر نے زیادہ وفا نہ کی لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ ان کے تربیت دادہ بہت سے حضرات ہیں۔ جو آج ہماری قومی و ملی زندگی میں ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ وہ اس دور کے بہترین استاد تھے۔ ہمارے موجودہ نائب صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب پر بھی انہی کی نگاہ کرم پڑی تھی اور اس جوہر میں جو آب و تاب اس وقت سے پیدا ہوئی وہ محتاج ثبوت نہیں۔

مولانا نے بھی شروع سے تا دم واپسیں اس بات کی کوشش جاری رکھی کہ اپنی زندگی کو قرآن و سنت کے سانچے میں ڈھالیں اور اپنے آپ کو ملت اسلامیہ ہند کی قیادت کی ذمہ داریوں کا اہل ثابت کریں۔ ان کی اس جدوجہد کا پتہ ہمیں ان کے مطالعہ سے بخوبی لگ سکتا ہے۔ مولانا نے سب سے پہلے سیرت پر ایک کتاب لکھی۔ پھر "اسلام کا اقتصادی نظام" اور "قصص القرآن" ہمارے سامنے آئیں۔ اگر ہم بہ نظر غور دیکھیں تو ہمیں پتہ لگ جائیگا کہ مولانا میں تصنیف و تالیف کے لئے بھی ایک فطری رجحان تھا لیکن وہ رجحان بھی مولانا کی لیڈرشپ کی صلاحیت کے تابع ہو کر رہ گیا تھا۔ سوال یہ ہے کہ مولانا نے اپنے مطالعہ اور تصنیف و تالیف کے ذوق کو پورا کرنے کے لئے "سیرت" "اسلام کا اقتصادی نظام" اور "قصص القرآن" کے موضوعات ہی کا انتخاب کیوں کیا اس سلسلہ میں راقم الحروف کا خیال یہ ہے کہ (ہو سکتا ہے کہ اہل علم حضرات اس سے اتفاق نہ کریں) کہ مولانا کا یہ مطالعہ اور اس کے نتائج کا قلم بند کرنا دراصل اپنی تربیت کے لئے تھا، اور پھر ان خطوط پر وہ اپنے نفس اور اپنی صلاحیتوں کی تربیت کر رہے تھے۔ ان کا ملت اسلامیہ کے سامنے آنا بھی ضروری تھا، اس لئے ان کے اس مطالعہ نے تصانیف کی شکل اختیار کر لی۔

بہرحال صورت حال کچھ بھی ہو۔ یہ تصانیف اس بات کا ثبوت مہیا کرتی ہیں کہ مولانا کی "لیڈرشپ" قرآن و سنت کے مخلصانہ اتباع کی ایک کوشش تھی۔ چنانچہ مولانا کی پوری زندگی اس بات کی شاہد ہے کہ وہ اپنی کوششوں میں خدا کے فضل و کرم سے کامیاب و کامران رہے۔

مولانا کی زندگی کچھ ایسی ہنگامی، اور شور و شغب سے معمور تھی کہ اس کی اصل قدر و قیمت کا اندازہ نہ کیا جا سکا، اور اسی لئے اس سے وہ فائدہ نہ اٹھایا جا سکا جو آسانی سے اٹھایا جا سکتا تھا۔

علامہ اقبال نے میر کارواں کے بارے میں کہا تھا کہ

نگاہ بلند، سخن دلنواز، جاں پرسوز
یہی ہے رخت سفر میر کارواں کیلئے

حقیقت یہ ہے کہ مولانا ان تینوں صفات عالیہ کا مظہر تھے۔

عظیم نقصان

بس اس میں ذرا بھی شک نہیں ہے کہ مولانا کی وفات سے ملک و ملت کو عظیم نقصان پہنچا ہے، جو ناقابل تلافی ہے مولانا کے سب سے قریب اور سب سے زیادہ ساتھ رہنے والی شخصیت مفتی عتیق الرحمٰن صاحب کی تھی اور انھوں نے بجا اور درست فرمایا ہے کہ مولانا کی وفات سے "جہاں تک جمعیۃ علماء ہند کا تعلق ہے اس کے یتیم ہونے میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں"

روزنامہ "آزاد ہند" کلکتہ

ایک چراغ اور بجھا —! ایک ستون اور گرا —! ایک سپاہی اور مرا —! تاریکی اور بڑھی — محفل اور سونی ہوئی —!!!

مولانا حفظ الرحمٰن چل بسے — مولانا حفظ الرحمٰن کی وفات، ملک و قوم کا زبردست نقصان ہے۔ اور مسلمانوں کے لئے سانحۂ عظیم۔ ملک، جنگ آزادی کے ایک نڈر سپاہی سے محروم ہو گیا اور مسلمانوں کا ایک غم خوار اور خدمت گار اٹھ گیا۔

مولانا حفظ الرحمٰن کی پوری زندگی قومی خدمت میں گذری۔ جنگ آزادی میں انھوں نے قید و بند کی سخت تکلیفیں برداشت کیں۔ جان تک جوکھوں میں ڈالی۔ وہ ایک سرفروش سپاہی کی طرح ہر آزمائش میں ثابت قدم اترے۔ آزادی کے بعد بھی انھیں چین نصیب نہ ہوا۔ اُن کی لڑائی مرتے دم تک جاری رہی غلامی کے دور میں وہ انگریزوں سے لڑتے رہے اور آزادی کے بعد فرقہ پرستی کے مقابلہ پر ڈٹ گئے۔ یہ راہ بھی پہلی راہ کی طرح بہت کٹھن اور صبر آزما تھی۔ ۱۹۴۷ء دہلی کے مسلمانوں کے لئے ۱۸۵۷ء سے کچھ کم ہولناک نہیں تھا۔ اس ہولناکی میں تنہا حفظ الرحمٰن کی ذات تھی جو مسلمانوں کے لئے ڈھال کا کام دے رہی تھی۔ اُس زمانہ میں انھوں نے دہلی کے مسلمانوں کی ایسی خدمت کی ہے جس کا صحیح اندازہ مستقبل کے مورخ ہی لگا سکتے ہیں۔ مولانا کی خدمت کا دائرہ دہلی ہی تک محدود نہیں تھا۔ وہ پورے ہندوستان کے مسلمانوں کے کام آتے تھے اور جہاں بھی بن پڑتا تھا اپنے اثر رسوخ اور دوڑ دھوپ سے مسلمانوں کی مشکلات دور کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

اس بیماری میں بھی مولانا کو سکون نہیں تھا۔ امریکہ سے انھوں نے اترپردیش کے وزیر اعلیٰ کے نام جو خط — لسانی فارمولا کے متعلق لکھا تھا، اس سے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مولانا کے دل میں اپنی قوم کا درد کس درجہ تھا کہ اُس کے سامنے انھیں اپنی جان لیوا بیماری کینسر کی ناقابل برداشت تکلیف بھی یاد نہیں رہتی تھی۔

پچھلے سال جون میں مولانا نے دہلی میں "مسلم کنونشن" بلایا تھا۔ اس کنونشن کی وجہ سے مولانا کو کانگریس اور سرکاری حلقوں کے علاوہ مسلمانوں کے بعض حلقوں کی شدید مخالفت کا بھی سامنا کرنا پڑا تھا۔ مسلم کنونشن کے بعد مولانا نے ملک کا دورہ کیا تھا۔ اس میں جا بجا اپنی تقریروں میں وہ کنونشن کے اغراض و مقاصد کی وضاحت کے ساتھ مستقبل کے لائحۂ عمل کا خاکہ بھی پیش کرتے تھے۔ افسوس ہے کہ اس کے تھوڑے ہی دن بعد آپ پر کینسر کا حملہ ہو گیا۔ اور وہ مسلمانوں کے لئے آئندہ جو کام کرنا چاہتے تھے، اس سے معذور ہو گئے۔

عجیب اتفاق ہے کہ کل رات پچھلے پہر ہم نے خواب میں دیکھا کہ حافظ ابراہیم صاحب ایک جگہ بیٹھے ہیں اور ہم اُن سے مولانا حفظ الرحمٰن کی خیریت دریافت کر رہے ہیں۔ حافظ جی نے کیا جواب دیا، اس کے الفاظ تو یاد نہیں رہے لیکن جواب بہت مایوس کن تھا۔ یا شاید موت کی خبر تھی کہ اس پر ہماری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد آنکھ کھلی تو اس وقت بھی آنسو بہہ رہے تھے۔ طبیعت بہت مکدر ہو گئی اور مولانا کی صحت کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا کی۔ مگر جب صبح کی خبریں سننے کے لئے ریڈیو کھولا۔ تو مولانا کی وفات کی خبر سنی۔ (انا للہ وانا الیہ راجعون)

مولانا سے بعض موقعوں پر ہمیں بھی اصولی اختلاف رائے ہوا۔ اُن پر تنقید بھی کی لیکن مولانا کی عزت سے دل ہمیشہ لبریز رہا۔ یہ کہنا زیادہ صحیح ہو گا کہ مولانا کی جتنی عزت تھی، اسی قدر اُن سے محبت بھی تھی۔ مولانا بھی عزیزداروں جیسا سلوک کرتے تھے۔ پچھلے مارچ میں عیادت کے لئے جب ہم دہلی گئے تو مولانا بمبئی سے علاج کے بعد واپس آ چکے تھے اور نئی دہلی میں حافظ ابراہیم صاحب کی کوٹھی میں مقیم تھے۔ اس کوٹھی میں مولانا ابوالکلام آزاد صاحب بھی صاحب فراش رہ چکے تھے اور یہیں اُن کا انتقال ہوا تھا۔ مولانا جس کمرے میں لیٹے ہوئے تھے۔ وہ اس کمرے سے ملا ہوا تھا جس میں مولانا آزاد نے وفات پائی تھی۔ ملاقات کے وقت بے اختیار آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ مولانا نے دیکھ لیا تو خود بھی بہت متاثر ہوئے۔ اور آبدیدہ ہو گئے یہ آخری ملاقات تھی اور دل نے کہہ دیا تھا کہ اب یہ چہرہ پھر دیکھنا نصیب نہ ہو گا۔ چلتے وقت دروازے تک مولانا کی نگاہیں پیچھا کرتی رہیں۔ اور جب ہم نے پلٹ کر دیکھا تو اُن کی آنکھوں میں الوداع کہنے کی ایسی کیفیت تھی کہ ضبط کا دامن چھوٹ گیا!

مولانا کے پھیپھڑے میں کینسر ہوا تھا۔ پہلے تجویز تھی کہ مولانا کو علاج کے لئے ماسکو بھیجا جائے۔ ہم نے بھی لکھا تھا۔ پہ بہت زور شور سے لکھا اور وہ راضی ہو گئے تھے لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ روسی ڈاکٹروں نے مولانا کے مرض کا مطالعہ کرنے کے بعد صاف جواب دے دیا تھا اور ماسکو لانے سے منع کر دیا۔ امریکہ کے ڈاکٹروں نے امید دلائی تھی اور اسی امید پر مولانا کو امریکہ لے جایا گیا۔ ڈر تھا کہ پردیس میں مولانا جدا ہو جائیں گے۔ مگر مٹی وطن کی لکھی تھی۔

مولانا حفظ الرحمٰن جہاں جنگ آزادی کے ایک سپاہی، قومی لیڈر اور ممبر پارلیمنٹ تھے، وہیں جید عالم دین بھی تھے۔ انہوں نے کئی مشہور کتابیں

تھیں۔ مولانا کی وفات سے مسلم قیادت میں ایسا خلا پیدا ہو گیا ہے جس کے جلد پر ہونے کی کوئی امید نظر نہیں آتی۔ مولانا پر مسلم قیادت کا ایک دور ختم ہو گیا۔ اللہ تعالےٰ سے دعا ہے کہ مولانا کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور پس ماندگان کو صبر عطا فرمائے۔ (آمین)

روزنامہ آبشار کلکتہ

کسی آدمی میں بیک وقت ساری خوبیاں اکٹھی نہیں ہو جاتیں، کوئی تحریر کے میدان کا مرد ہوتا ہے، تو کوئی تقریر کے میدان کا، کوئی سیاست میں اپنا عدیل ونظیر نہیں رکھتا تو کوئی علم وحکمت کے میدان میں اپنا مدمقابل کسی کو نہیں پاتا لیکن جو ہستیاں بیک وقت بہت سے اوصاف سے متصف ہوتی ہیں، وہ جنہیں یعنی "فطین" کہلاتی ہیں۔ ایسے لوگ بہت دنوں کے بعد پیدا ہوتے ہیں۔ اور ہمیشہ یاد رکھے جاتے ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم ایسے ہی جنیں لوگوں میں تھے جو خطابت، سیاست اور انشا پردازی میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ اور اگر اسی زمرے میں جمعیۃ علماء ہند کے جنرل سکریٹری مولانا حفظ الرحمٰن کو بھی رکھا جائے تو ہمارے خیال میں یہ کوئی مبالغہ آرائی نہیں ہوگی وہ بیک وقت اعلیٰ پایہ کے مقرر بھی تھے، اور مصنف بھی سیاست میں بھی درک رکھتے تھے اور علم و حکمت میں بھی تقصص القرآن، اسلام کا اقتصادی نظام، تہذیب الاخلاق اور بہت سی دوسری کتابیں لکھ کر انہوں نے تحریر کے میدان میں بھی اپنا لوہا منوایا تھا۔ اور جن لوگوں نے ان کی تقریریں سنی ہیں وہ اطمینان اور اعتماد کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اس میدان میں بھی وہ انفرادی حیثیت رکھتے تھے۔

مگر مولانا کی یہ ذاتی خوبیاں ہی انہیں مسلمانوں میں اس قدر ہر دل عزیز اور مقبول بنائے رکھنے کا باعث نہیں بنیں۔ انہوں نے مسلمانوں کی ایسی خدمات انجام دی تھیں جنہیں کوئی بھلا نہیں سکتا۔ یہ خدمات انہوں نے ایسے وقت میں انجام دیں جب ہندوستان کے مسلمان نفسی نفسی کے عالم میں مبتلا تھے۔ کوئی ان کا پرسان حال نہیں تھا۔ کوئی ان کے زخموں پر پھاہا رکھنے والا نہیں تھا۔ کوئی انہیں یہ بتلانے والا نہیں تھا کہ ایسے وقت میں جب کہ ہندوستان کی سرزمین ان کے لئے تنگ ہو رہی تھی۔ اور تقسیم ملک کے نتیجہ میں فرقہ پرست ان کے خون کے پیاسے ہو رہے تھے۔ انہیں کیا کرنا چاہیے، مولانا نے اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر ان کی حفاظت کا سامان مہیا کرایا۔ ان کے ذہنوں کی تاریکی دور کرنے کے لئے امید کی کرن ہم پہنچائی۔ انہیں تسلی دی جھنجھوڑا، ان کی حالت زار کی طرف توجہ دلائی، اور حکومت کو اپنے فرض کا احساس کرنے پر مجبور کر دیا۔

اور پھر جب جبل پور اور ساگر کے مسلمانوں پر قیامت صغریٰ ٹوٹی، تو اس مرد مجاہد نے فرقہ پرستوں کی طرف سے فرقہ پرست کا خطاب پانے اور اپنی حب الوطنی پر سینکڑوں چوٹیں کھانے کے باوجود "مسلم کنونشن" منعقد کرایا اور اپنے خطبہ استقبالیہ میں بے باکی اور بے خوفی کے ساتھ یہ آواز بلند کی۔

"مسلم اقلیت کے خلاف یہ جارحانہ فرقہ واریت اور معاندانہ جذبات صرف عوامی زندگی ہی میں اثر انداز نہیں بلکہ زیادہ افسوس کی بات یہ ہے کہ حکومت کے دائروں میں بھی اس کی چھاپ بہت گہری ہے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ جا بجا مسلم اقلیت آئے دن ایک شرپسند گروہ کے ہاتھوں جان و مال اور عزت و آبرو کی یک طرفہ بربادیوں کا شکار ہوتی رہتی ہے۔"

یہ مولانا حفظ الرحمٰن ہی کا جگر تھا جو لوک سبھا ہو یا جلسہ عام بے خوفی اور بے باکی کے ساتھ مسلمانوں کے مسائل پر بولنے سے نہیں چوکتے تھے۔ کمیونسٹ پارٹی کے ایک متعصب ممبر پارلیمنٹ شری اندرجیت گپتا نے ایک دفعہ کہا تھا کہ لوک سبھا میں واحد شخص جو مسلمانان ہند کے مسائل پر بے خوفی کے ساتھ بولتا ہے، وہ مولانا حفظ الرحمٰن کی ذات ہے۔ افسوس کہ آج یہ زبان ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئی، مسلمانان ہند کا ایک بہت بڑا مخلص خادم آج ان سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گیا۔

"انا للہ وانا الیہ راجعون"

روزنامہ "اخوت" کلکتہ

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کے انتقال پر آج پورے ملک میں اظہار افسوس کیا جا رہا ہے۔ خصوصیت کے ساتھ مسلم اقلیتوں کو ایک زبردست دھکا لگا ہے۔ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کے اٹھ جانے سے ہندوستان میں مسلمانوں کا ایک بڑا ستون گر گیا ہے۔ وہ چراغ بجھ گیا ہے جس نے ہندوستان کو بدترین مایوسیوں کی تاریک گھڑیوں میں امید اعتماد اور یقین کی روشنی عطا کی تھی۔

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کو بجا طور پر مجاہد ملت کا خطاب دیا گیا آپ ہر لحاظ سے اس خطاب کے مستحق تھے آزادی کے بعد قوم پرورانہ مفاد کا پورا لحاظ رکھتے ہوئے مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے مسلمانوں کی بہترین خدمات سر انجام دی ہیں اور ایک نڈر اور بے باک مجاہد کی حیثیت سے ان کی رہنمائی کی۔

آزادی اور تقسیم ملک کے موقع پر ہندوستان میں فرقہ پرستی کی بھیانک آندھیاں چل پڑی تھیں۔ لاکھوں مسلمانوں کے قدم اکھڑ گئے تھے ان کو اپنا مستقبل تاریک نظر آنے لگا تھا۔ اس نازک گھڑی میں مولانا حفظ الرحمن صاحب نے اپنے عزم و استقلال سے مسلمانوں کے گرتے ہوئے حوصلوں کو سہارا دیا۔ ان کے تذبذب کو یقین عطا کیا۔ ان کی مایوسیوں کو امیدوں میں بدل دیا۔ افسوس کہ وہ سالار قافلہ ہم میں نہیں رہا۔

مولانا حفظ الرحمن صاحب نے نہ صرف کانگریس کے باہر بلکہ کانگریس کے اندر بھی فرقہ پرستی کے خلاف زبردست جنگ کی جس طرح آپ نے جن سنگھی اور مہاسبھائی فرقہ پرستی کا مقابلہ کیا۔ اسی طرح آپ نے کانگریس میں کانگریسیوں کی فرقہ پرستی کا بھی دلیری سے مقابلہ کیا۔ اس کی بہترین مثال گذشتہ سال مسلم کنونشن کے موقعہ پر دیکھنے میں آئی۔ فسادات مدھیہ پردیش سے متاثر ہوکر مجاہد ملت نے جب مسلم کنونشن کی تحریک کی تاکہ ہر مکتب خیال کے سربرآوردہ مسلم زعماء ایک جگہ سرجوڑ کر مسلمانان ہند کے مسائل کا حل دریافت کریں تو غیروں نے مولانا حفظ الرحمن کے خلاف اور ان کی نام نہاد فرقہ پرستی کے خلاف جو شور و غل مچایا تھا وہ اپنی جگہ پر تھا۔ اپنوں نے بھی ان کے خلاف ایک طوفان اٹھایا اور کانگریس ہائی کمانڈ کو مولانا کے خلاف گمراہ اور متاثر کرنے کی کوشش کی یہ ایک کھلا راز ہے کہ کانگریس ہائی کمانڈ مسلم کنونشن کے خلاف تھی لیکن مولانا حفظ الرحمن صاحب نے وزیر اعظم جواہر لال جی اور صدر کانگریس شری سنجیوا ریڈی سے مل کر ان کی بدگمانیوں کو دور کردیا اور تمام مخالفتوں کو ہموار کرکے کنونشن کو کامیاب کیا۔ اسی موقعہ پر مولانا حفظ الرحمن نے یہ ثابت کردیا کہ وہ ان نیشنلسٹ مسلمانوں میں سے نہیں ہیں جنھوں نے عام مسلمانوں کی غلط نمائندگی کرکے کانگریس کی نمائندگی اور چاپلوسی کو اپنا شعار بنا رکھا ہے اور جو مظلوموں کے حق میں جائز آواز اٹھاتے ہوئے بھی ڈرتے ہیں کہ ان کو کوئی فرقہ پرست نہ کہہ دے۔

مولانا حفظ الرحمن صاحب کا انتقال ادارہ اخوت کے لئے اور زیادہ سانحہ ہے۔ کیونکہ اخوت کے سرپرست جناب شیخ اکبر علی قریشی سے مرحوم کے مراسم تھے۔ مرحوم وقتاً فوقتاً اپنے قیمتی مشوروں سے اخوت کی رہنمائی فرماتے تھے۔ ہم صمیم قلب سے دعا کرتے ہیں کہ خدا مرحوم کو اپنی جوار رحمت میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے (آمین)



صداقت پٹنہ

۲؍ اگست کی صبح مسلمانان ہند کے لئے کتنی منحوس تھی جب کہ ان کا واحد لیڈر جو زبردست عالم دین بھی تھا موت کے ظالم و بے پناہ ہاتھوں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ان سے چھن گیا۔ مشار الیہ لیڈر مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمن صاحب ناظم اعلیٰ جمعیۃ علمائے ہند کی ذات گرامی تھی۔ مولانا جب امریکہ سے علاج کرا کر مراجعت فرمائے ہند ہوتے تھے تو آپ کی ظاہری حالت اور نیز ماہر فن ڈاکٹروں کی رائے کے پیش نظر ہر شخص آپ کی صحت کی طرف سے مطمئن تھا اور امید تھی کہ بحمد اللہ مولانا مرحوم بہت جلد قومی کاموں کی باگ اپنے دست مبارک میں بدستور لینے کے قابل بن جائیں گے۔

لیکن یہ عارضی افاقہ مرض اور بحالی صحت محض سنبھالا ثابت ہوا چنانچہ ۲؍ اگست کو جب اس سانحہ ہوشربا کی خبر شائع ہوئی تو ہر شخص اپنی اپنی جگہ حیران و مبہوت ہوکر رہ گیا حضرت مولانا کی ظاہری حالت ایسی نہ تھی کہ دست اجل اتنا جلدی انہیں اپنی گرفت میں لے سکتا پھر سن بھی کچھ زیادہ نہ تھا زیادہ سے زیادہ ۶۲ سال کی عمر تھی جو عقل و تجربہ کے لحاظ سے سیاسی زندگیوں کا شباب ہوتا ہے۔ اس بناء پر حضرت کی موت کو بجا طور پر قبل از وقت قرار دیا جاسکتا ہے بلکہ جوانا مرگی سے بھی تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

مجاہد ملت نے قوم و ملک کی جو بیباکانہ اور انتھک خدمات جنگ آزادی کے دوران میں اور اس کے بعد بھی انجام دی ہیں اس نے انہیں ملک و ملت کا صحیح رہنما، قائد، زعیم بنا دیا تھا۔ آپ میں جو سب سے بڑی خوبی ہے جس کا آجکل کے مسلم لیڈروں میں بڑی حد تک فقدان ہے۔ آپ کا ظلم و بے انصافی کو چاہے وہ حکومت کی جانب سے ہو یا عوام کے واسطے سے برداشت نہ کرنا اور شدید احتجاج کرنا تھا۔ آپ دین اسلام کے سب سے بڑے خدمت گذار اور عامۃ المسلمین خصوصاً مسلمانان ہند کے مخلص ہمدرد اور جانثار و دوست تھے۔ آپ کی سیاسی بصیرت اس وقت بھی اتنی ہی انجام بین تھی جتنی آج مشاہدہ کی بناء پر کوئی شخص نتیجہ نکال سکتا ہے۔ مولانا کی اصابت رائے کا اندازہ اس سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ آپ نے تحریک قیام پاکستان کے طوفانی دور میں محض اس بناء پر اس کی مخالفت کی تھی کہ پاکستان جس مقدس و متبرک جذبہ کے ماتحت قائم کرنے کی جد و جہد کی جارہی ہے وہ قیام کے بعد بروئے کار نہیں آسکتا اور مسلمانان ہند کے لئے تو بیکار محض ہی نہیں بلکہ ضرر رساں بھی ہوگا۔ آج ہر شخص اس نظریہ کی صداقت پندرہ سالہ تجربہ کے بعد تسلیم کرنے پر مجبور ہے۔ پھر ان کی اسلام دوستی کا ثبوت بھی اس سے بدرجہ اتم فراہم ہوتا ہے کہ جب ان کے منشاء کے علی الرغم وہ قائم ہی ہوگیا تو انہوں نے اس کی مخالفت ترک کردی اور کبھی اس کی مخالفت اور مذمت میں کوئی کلمہ تمام عمر منہ سے نہ نکالا۔"

حضرت مولانا حفظ الرحمٰن مسلمانانِ ہند کے سیاسی قائد ہی نہ تھے بلکہ ایک زبردست اہل قلم اور فصیح البیان ادیب بھی تھے جس کا بدرجہ اتم ثبوت ان کی گرانبہا تصنیفات سے ملتا ہے۔ جو ان کے قلم سے اب تک نکل چکی ہیں خصوصاً قصص القرآن جو کئی جلدوں میں شائع ہوئی ہے اس میں قرآنی قصص و بیانات کی جو نادر تحقیقات کی گئی ہیں وہ اتنی جامع و یکجائی صورت میں کہیں اور کسی زبان میں دستیاب نہیں ہو سکتیں ان مجلدات میں حضرت مولانا نے جو زبردست دادِ تحقیق مختلف اقوام اور ان کی معاشرت و معتقدات کے متعلق دی ہے اس نے انہیں محققین و مورخین عالم کے صف اول میں کھڑا کر دیا ہے۔ مولانا نے اپنے دعاوی کو مدلل و مستند بنانے کے لئے قدم قدم پر محققین آثار قدیمہ کے بیانات کے حوالے دیئے ہیں۔ اس سے ان کی غایت وسعت نظر کا پتہ چلتا ہے یہی وہ وسعت نظر ہے جس نے انہیں اپنے بعض جلیل القدر معاصرین کے بیانات سے اختلاف کرنے پر مجبور کر دیا ہے بغرض یہ تصنیف مولانا کو محققین عالم کے زمرہ میں زندہ جاوید بنا چھوڑے گی۔

سالہا سجدہ صاحب نظران خواہد بود

اردو زبان سے بھی مولانا کو عشق کی حد تک ہمدردی تھی اس کی مثال بہت کم ہوگی اس زبان اور رسم الخط سے ان کی والہانہ شیفتگی اس سے عیاں ہوتی ہے کہ انہوں نے اس کی مدافعت میں جان کی بازی لگا رکھی تھی۔ پارلیمنٹ میں جب کبھی مخالفین نے اردو پر حملہ کیا تو مولانا کی رگ حمیت پھڑک اٹھتی تھی اور شیرانہ گرج سے مخالفین کو اتنا مرعوب کر دیتے تھے کہ وہ دوبارہ اتنی بے باکی سے اردو زبان پر حملہ کرنے کی جرأت نہیں کرتے تھے۔ دلائل وہ اتنے زبردست پیش کرتے تھے کہ انصاف پسند اراکین پارلیمنٹ ان کی حمایت میں اپنی آواز بلند کر دیتے تھے۔ مولانا کی اردو زبان سے غایت محبت اور والہانہ شیفتگی کا اندازہ اس خط سے بھی کیا جا سکتا ہے جو دوران علالت انہوں نے امریکہ کے شفا خانے سے یوپی کے چیف منسٹر مسٹر سی۔ بی۔ گپتا کو ان کی اس تجویز کے جواب میں ارسال کیا تھا کہ یوپی کے مدارس میں انگریزی کے ماسوا اجنبی زبانوں کے پڑھائے جانے کا مشورہ تھا اس میں اردو کا نام شامل فہرست نہ تھا۔ مولانا نے اپنی تحریر میں اس خامی کی طرف سختی کے ساتھ توجہ مبذول کرائی تھی۔

مولانا کو بہار سے بھی خاص محبت تھی جب کبھی بہار پر کوئی مصیبت نازل ہوئی مولانا بے چین ہو گئے اور فوراً یہاں پہنچنے کے لئے وقت نکالی یا اسی طرح مولانا رحمۃ اللہ علیہ بہار میں اتنی بار تشریف فرما ہوئے کہ یہاں کے اکثر افراد آپ سے مانوس ہو گئے تھے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اہل بہار کو ان کی موت کی خبر سن کر اتنا ہی گہرا صدمہ ہوا جتنا کہ ان کو اپنے کسی چہیتے عزیز کی موت پر ہو سکتا ہے بہرحال دعا ہے کہ خداوند کریم مولانا کو ان کی دین و ملت کی بے نظیر خدمات کے صلہ میں اعلیٰ علیین میں جگہ دے اور ہم غمزدہ پسماندوں کو صبر جمیل اور نعم البدل عطا فرمائے (آمین)

خلافت بمبئی

کون ہوتا ہے حریف مئے مرد افگن عشق
ہے مکرر لب ساقی پہ صلا میرے بعد

امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کی وفات کے بعد اگر ہندوستان کے مسلمانوں کی نظر کسی طرف اٹھتی تھی تو وہ مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن ہی کی ذات تھی لیکن یہ تحریر کرتے ہوئے قلم کانپتا ہے کہ وہ بھی اب ہمارے درمیان نہیں رہے۔ موت نے ان کو ہم سے اتنی دور پہنچا دیا ہے کہ ہماری آہ و زاری اور نالہ و فریاد بھی ان کو واپس نہیں لا سکتے۔ مولانا کی وفات کے اندوہناک سانحے پر نہ تو آسمان کانپ اٹھا نہ زمین تھرائی مگر کروڑوں مسلمانوں کے دل ضرور پاش پاش ہو گئے اب اردو کے تمام پر پنڈت پنت راج رشی ٹنڈن اور سردار پٹیل سے اسی بے جگری کے ساتھ کوئی مقابلہ نہ کرے گا۔ جیسا کہ مجاہد ملت نے کیا جبل پور کے فسادات پر اب کوئی اس جرأت اور بے خوفی کے ساتھ تقریریں نہ کر سکے گا جیسی مولانا نے کی تھیں مسلمانوں کے لئے وہ قربانیاں آنے والی صدی میں بھی کوئی نہ دے سکے گا۔ جو ایک سچے مسلمان مولانا حفظ الرحمٰن نے دیں۔

مسلمان ایک عرصے سے لیڈر شپ کے معاملہ میں بڑے بدقسمت ہیں۔ سالہا سال سے ان کو کوئی ایسی شخصیت نہ مل سکی ہے جو ان کی نمائندگی کر سکے جن کے دل میں قوم کا درد ہوتا ہے۔ انھیں قبول عام نہیں ملتا۔ اور جو جی حضوری ہیں ان سے امید ہی کیا کی جا سکتی ہے۔ لے دے کے ایک مولانا مرحوم ہی تھے جو برے یا بھلے تھے تو بھی ۔۔۔ مگر اب کون ہے؟

فرقہ داریت آج بھی باقی ہے اردو آج بھی اسی طرح ستم کی شکار ہے۔ مسلمانوں کی عام بدحالی کا وہی عالم ہے مگر ایسا کوئی نہیں جو ان تمام باتوں کو دیکھ کر تڑپ اٹھے جس کی آنکھوں میں آنسو آجائیں اور جو زخم کے مرہم کے لئے خود ہی زخمی ہو جائے۔ لکھنے والے بہت کچھ لکھیں گے مگر ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم کیا لکھیں سوائے اس کے کہ ۔۔۔ الٰہی تو مسلمانوں میں کچھ اور محمد علی کچھ اور شوکت علی کچھ اور آزاد اور کچھ حفظ الرحمٰن پیدا کرتا کہ یہ ٹوٹی ہوئی کشتی جو صرف تیرے رحم و کرم پہ چل رہی ہے۔ ساحل سے لگ جائے۔

(ا ن ج۔ ص)

حقیقت لکھنؤ

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے!
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

آخر ہو کر رہا جس کے تصور سے بدن لرز رہا تھا۔ اور وہ منحوس ساعت بالآخر آ کر رہی جس کا آنا اسی دن سے یقینی سمجھ لیا گیا تھا جب اب سے چار ماہ قبل ڈاکٹروں نے متفقہ طور پر کہہ دیا تھا کہ مریض کو کینسر کا مہلک مرض ہو گیا ہے جس سے جانبر ہونا قطعی ناممکن ہے۔ مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی وفات ایک ایسا سانحہ عظیم ہے جس نے دل و دماغ کو اتنا متزلزل کر دیا ہے کہ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کن الفاظ میں اس سانحہ پر غم و الم کا اظہار کیا جائے۔ اور کیا کہہ کر اس ستم رسیدہ قوم کو تسکین و تسلی دی جائے جس کو اب آئندہ پچاس سال میں بھی حفظ الرحمٰن کا نعم البدل نہیں مل سکتا۔ گذشتہ پندرہ سولہ سال کے اندر اور جتنے بھی مسلم قائد و رہنما دنیا سے رخصت ہو گئے ان میں سے ہر بزرگ کی موت کم و بیش ایک بڑا ناقابل تلافی نقصان تھا۔ لیکن یہ حادثہ عظیم تو ایسا ہے کہ اس کے مقابلہ میں اور تمام سابق سانحے بھول جاتے ہیں۔ اور کسی بزرگ قوم کی رحلت پر یہ کہنا کہ اس حادثہ سے جو نقصان ہوا وہ ناقابل تلافی ہے یہ تو ایک حد تک رسمی بات بھی ہو سکتی ہے جس میں مبالغہ کی گنجائش بھی ہے لیکن مجاہد ملت کی موت درحقیقت ایسی ہے گویا روشنی کا ایک عظیم الشان مینارہ تھا جو ایک دم منہدم ہو گیا۔ اور ہر طرف تاریکی ہی تاریکی چھا گئی واقعہ یہ ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد اور حضرت مولانا حسین احمد مدنی کی رحلت سے جو دھچکا ملک و ملت کو پہونچا تھا اس سے کہیں زیادہ شدید اور ناقابل تلافی نقصان مولانا حفظ الرحمٰن کی مرگ بے ہنگام سے ہوا جس موذی مرض نے اس بیش قیمت زندگی کو اس کی عمر طبعی سے بہت پہلے خاک میں ملا دیا اس نے فی الحقیقت ہندوستان کے پانچ کروڑ مسلمانوں کو ایسا یتیم اور بے سہارا و بے بس بنا دیا ہے کہ اب اس بن مری قوم کی صحیح رہنمائی کرنے والا کوئی دوسرا شخص نظر نہیں آتا۔

یوں تو مولانا مرحوم کی وفات ایک ایسا مشترک حادثہ ہے جس کے غم میں ہر طبقہ کے لوگ کم و بیش شریک ہیں لیکن مسلمانوں پر تو اس سانحہ سے ایسا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے کہ عرصہ دراز تک یہ بوجھ ہلکا نہیں ہو سکے گا۔ حضرت جگر مرادآبادی شاید اسی سانحہ کے لئے یہ شعر کہہ گئے تھے:

جان کر منجملہ خاصان میخانہ مجھے
مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ مجھے

مجاہد ملت کی دائمی جدائی سے جو گھاؤ ان کے لاکھوں عقیدت مندوں کے دلوں کو لگا ہے۔ وہ ایسا زخم ہے جو موجودہ نسل کی زندگی میں مندمل ہونے والا نہیں ہے۔ ایسے بلند کردار بے نظیر مدبر ...... ایسے سلجھے ہوئے دماغ اور ایسے دلیر اور نڈر دل گردہ کے انسان صدیوں میں ہی پیدا ہوا کرتے ہیں۔ دوسرا حفظ الرحمان تو اب سو برس میں بھی میسر آنا بہت مشکل ہے۔ ہمالیہ کی چوٹیوں سے راس کماری تک اور بحیرۂ عرب کے ساحل سے بحیرۂ ہند کے ساحل تک ایک خاص فرقہ و ملت کے آٹھ کروڑ انسانوں کی بستی میں ایک شخص بھی ایسا نظر نہیں آتا جو اسلامی زندگی کے کسی ایک شعبہ میں بھی اس قائد اعظم کی جانشینی کر سکے جس کے جسد خاکی کو لاکھوں سوگواروں نے جمعرات ۲ اگست کی شام کو حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے پہلو میں بہ ہزاروں حسرت و یاس سپرد خاک کر دیا۔

بنا کردند خوش رسمے بہ خاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی قومی و وطنی خدمات اتنی روشن ہیں کہ ان کے متعلق کچھ لکھنا عبث ہے۔ مرحوم کی خدمات ملی و وطنی نے ان کو اتنا محبوب اور ہر دلعزیز بنا دیا تھا کہ اکتوبر ۱۹۵۴ء میں مسٹر رفیع احمد قدوائی کی اچانک وفات کے بعد سے آج تک کوئی ایسی موت نہیں ہوئی کہ جس کو ہر شخص یہ سمجھا ہو کہ گویا خود اس کا کوئی عزیز ترین یا مربی و سرپرست دنیا سے رخصت ہو گیا۔ ملک و قوم کو جو زخم مسٹر قدوائی کی موت سے پہنچا تھا وہ گھاؤ مولانا کی رحلت سے تازہ ہو گیا ہے۔ رفیع صاحب کے بعد تو مولانا آزاد۔ مولانا مدنی اور خود مولانا حفظ الرحمٰن موجود تھے جو کسی حد تک اس کمی کو پورا کر سکتے تھے لیکن جو خلا مولانا کی رحلت سے پیدا ہو گیا ہے اس کو پورا کرنے والا تو مسلمانوں میں ایک شخص بھی نظر نہیں آتا۔

جس طرح آج رفیع صاحب مرحوم کو آٹھ سال گزرنے کے بعد بھی لوگ رو رہے ہیں، اسی طرح مولانا حفظ الرحمٰن کی دائمی جدائی بھی ہمیشہ غم کے آنسو رلاتی رہے گی، اتنے بلند کردار ایسے مخلص خادم ملت اور اس قدر سلجھے ہوئے دماغ کا کوئی فرد آج قوم میں نظر نہیں آتا۔ قومی زندگی کا کوئی شعبہ بھی ایسا نہیں تھا جس کو مولانا مرحوم نے اپنی مخلصانہ اور انتھک خدمات سے فیض نہ پہونچایا ہو۔ افسوس۔

آں قدح بشکست و آں ساقی نماند

یوں تو مجاہد ملت کی وفات کے دردناک سانحہ میں پوری قوم تعزیت اور پرسہ کی مستحق ہے۔ کیونکہ موت کے اس بے پناہ وار نے لاکھوں انسانوں کے قلوب کو مجروح اور نیم زندہ کر دیا ہے لیکن خصوصیت کے ساتھ مولانا مرحوم کے متعلقین و وارثان کے پسماندگان پر جو پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے اس بوجھ کو صرف تلقین صبر ہی سے کچھ ہلکا کیا جا سکتا ہے اور یہی بالآخر ایسے سانحۂ عظیم کا انجام ہوتا ہے۔ خدا کی مرضی پوری ہو کر رہی انسان کے بس میں جو کچھ تھا اس آفت ناگہانی سے بچنے کے لئے وہ تمام

تدابیر اختیار کی گئیں مگر ؎

زور ہی کیا تھا جفائے باغباں دیکھا کئے
آشیاں اجڑا کیا اور ہم ناتواں دیکھا کئے

اللہ تعالیٰ حضرت مولانا کی روح پاک کو اپنے دیار رحمت میں درجات عالی عطا فرمائے۔ عزیزوں کو صبر و استقامت کرامت کرے اور ہماری آئندہ نسلوں کو مجاہد ملت مرحوم کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق مرحمت فرمائے (آمین)

امروز کلکتہ



کچھ لوگ اپنی تاریخ آپ بناتے ہیں — مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمن صاحب ان عظیم شخصیتوں میں سے ایک ہیں ورنہ آج سے باسٹھ برس پہلے جب وہ بجنور کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے تو کسے معلوم تھا کہ ایک مولوی گھرانے کا چشم و چراغ ایک دن ہندوستان کا ایک عظیم سپوت اور مسلمانان ہند کا سالار کارواں ہوگا۔ مولانا جب دیوبند میں داخل ہوئے اس وقت بھی ایسی کوئی پیشین گوئی نہیں کی جا سکتی تھی کیونکہ دیوبند اگرچہ انقلابی بزرگوں کا مرکز تھا۔ اگرچہ یہاں کے ہر بچہ کی یہ خواہش تھی کہ انگریزوں کا نحس قدم ہندوستان سے نکل جائے مگر ہر بچہ اتنا بہادر بھی نہیں تھا۔ اور ہر طالب علم اس جذبہ سے سرشار نہیں تھا کہ وہ آگے بڑھ کر آسمان سے آفتاب اور ماہتاب چھیننے کی کوشش کرتا جو آفتاب کو منع کر دیتا کہ تو اپنی روشنی ہر وقت تاج برطانیہ کے زیر نگیں ملکوں پر بکھیرتا رہ۔ یہ کیا مذاق ہے کہ دور دیس کے رہنے والے اتنے بڑے خطۂ زمین پر قابض ہوں کہ وہاں سورج ہی غروب نہ ہو۔ ہر شخص کا یہ حوصلہ نہیں تھا کہ وہ انگریزوں کو للکارتا اور انگریزی فوج اور انگریزی پولیس ان کے سامنے کوئی وقعت اور کوئی حیثیت نہ رکھتی۔

مگر مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمن ان معدودے چند خواص میں تھے جنہوں نے ہمیشہ تاج برطانیہ کے خلاف بغاوت کی جنہوں نے ہندوستان سے انگریزی حکومت کے نکال باہر کرنے میں قدم قدم پر اور زندگی کے ہر لمحہ میں برادران وطن کا ساتھ دیا۔ اور انگریزی فوج، انگریزی پولیس اور انگریزی سنگینیں ان کے حوصلے کا مقابلہ نہیں کر سکیں انقلاب کا نعرہ لگاتے رہے جیل جاتے رہے تکلیفیں برداشت کرتے رہے اور مسکراتے رہے۔"

گوپی ناتھ امن نے درست کہا ہے کہ "جو لوگ سمجھتے ہیں کہ سیاست اور مذہب ساتھ ساتھ نہیں چل سکتے ہیں وہ غلطی پر ہیں مولانا حفظ الرحمن سچے مذہبی آدمی اور مسلمان تھے۔ اور اس کے ساتھ ہی ساتھ زبردست قوم پرور بھی:

وہ ہر طرح کی مشکلات کے باوجود اپنے راستے سے نہیں ہٹے۔ نہ کبھی اپنی زبان سے یہ کہا کہ آزادی کی خاطر انہوں نے کیسی مصیبتیں جھیلی ہیں۔ وہ جب بات کرتے تھے تو ان کی زبان نہیں ان کا دل بولتا تھا۔"

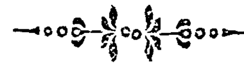
مولانا ایک زبردست مقرر تھے۔ شاید ہی کوئی ایسا ہو جس نے آپ کی تقریر نہ سنی ہو۔ مگر کبھی آپ نے شکوہ نہ کیا۔ یہ نہیں کہا کہ ہم نے بھی آزادی کی راہ میں تکلیف اٹھائی اور ہمیں بھی آزادی کے بعد حق ملنا چاہئے۔ بلکہ آپ نے ہمیشہ یہ کہا کہ اس ہندوستان کے ایک شہری ہم بھی ہیں اور ہندوستان پر ہمارا بھی اتنا ہی حق ہے جو دوسروں کا۔ آپ عالم تھے اور مستحکم مسلمان۔ کبھی سیاست نے آپ کا راستہ نہیں روکا۔ ایک طرف ملک و وطن کا کام ہوتا تھا دوسری طرف ارکان اسلام ادا ہوتے تھے تیسری طرف دین داروں کا کام بھی کرتے تھے۔ نماز کا وقت ہوا بارگاہ خداوندی میں سجدہ ریز ہوتے۔ کوئی بھی مسئلہ ہو تو اس میں شریک رہے اور کسی یتیم، کسی بے کس اور کسی بیوہ کی فریاد کانوں میں پہنچی تو اس طرف بھی لبیک لبیک کہتے ہوئے آگے بڑھے۔ غرضیکہ کسی فرض سے غافل نہیں رہے۔ خواہ وہ انسانی فرائض ہوں خواہ پروردگار عالم کا فرض۔

یوں تو آزادی سے پہلے بھی کروڑوں مسلمان آپ سے اور جمعیۃ علماء ہند سے عقیدت رکھتے تھے مگر آزادی کے بعد تو آپ ہی تنہا سہارا رہ گئے۔ آپ ہر جگہ پہنچتے تھے اور ہر آواز پر لبیک کہتے تھے۔ نہ تو آپ یہ دیکھ سکتے تھے کہ کوئی ہندو کسی مسلمان پر ہاتھ اٹھائے اور نہ یہ منظور ہوتا ہے ایک سچے مسلمان کو کیونکہ اسلام دنیا میں عدل کے لئے آیا ہے۔ انصاف کے لئے آیا ظلم اور استبداد کو ختم کرنے کے لئے آیا۔ مولانا کو لوگوں نے دہلی کے فساد کے وقت بھی دیکھا۔ مولانا کو لوگوں نے جبل پور کے فساد کے وقت بھی دیکھا۔ مولانا علی گڑھ، میرٹھ وغیرہ کے فساد کے موقعہ پر بھی پہونچے۔ مگر کوئی سچا ہندو یہ نہیں کہہ سکتا کہ مولانا کسی فرقہ کی حمایت کے لئے پہونچتے تھے بلکہ مقصد صرف مصیبت زدوں کی امداد اور بے گناہوں کو قتل عام سے محفوظ رکھنا۔ ظالموں کو ظلم سے روکنے کی کوشش اور مظلوموں کا تحفظ ———— سارے مقاصد کے تحت نہ تو آپ کے سامنے ہندو کا سوال تھا اور نہ مسلمان کا بلکہ تمام انسانیت کی خدمت تھی۔ اور یہ خدمت نہایت سچائی سے آپ انجام دیتے رہے۔

نائب صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے آل انڈیا ریڈیو پر مولانا مرحوم کی تعریف میں جو پیام نشر کیا اس میں انہوں نے کہا کہ یہ بات سب جانتے ہیں کہ وہ مہلک مرض میں مبتلا تھے اور محنت و کاوش کے باوجود سب دیکھ رہے تھے کہ وہ موت کی منزل کی طرف جا رہے ہیں۔ مگر سب کو یہ خیال بھی تھا کہ شاید وہ

سفر ملتوی کر دیں۔ اور راہ بدل دیں۔ ان کی آنکھوں کی چمک ان کے دل کی گرمی اور روح کی حرارت ان کو دیکھنے کے لئے جانے والوں کو نئی روشنی بخشتی تھی لیکن کیا، وہ واقعی چلے گئے جبکہ ان کی محبت ہزاروں سا تھیوں کے سینوں، ان کی محبت بے شمار لوگوں کے دلوں اور ان کی ہمدردی کی یاد ہزاروں بیواؤں اور یتیموں کے دلوں کے اندر زندہ ہے۔ جن کے لئے وہ بے سروسامانی میں بھی ہمت کا سرچشمہ تھے۔

مولانا واقعی بے سروسامان تھے۔ انہوں نے عمارتیں نہیں تعمیر کیں۔ انھوں نے اپنے گھر کو مال اور دولت سے نہیں بھر دیا، مگر آج ہندوستان میں ہزاروں آدمی ایسے ہیں جنھیں محض مولانا کی نظر التفات نے کہیں سے کہیں پہونچا دیا، ہزاروں ہی نہیں بلکہ لاکھوں اجڑے ہوئے مسلمان آباد ہو گئے ہیں نہیں معلوم کتنے زمانے کے ٹھکرائے ہوئے انسان آج مولانا کی کوشش سے دوسروں کا سہارا بنے ہوئے ہیں۔ مولانا میں ایک کشش تھی اور وہ کشش دوست اور دشمن سب کو اپنی طرف کھینچتی تھی۔ ہم اسے حقیقت کہیں گے سچائی کہیں گے اور یہ مولانا کا خلوص اور ان کا اظہار حق تھا جس کی طرف لوگ خود کھنچے آتے تھے۔"



رہنمائے دکن حیدرآباد

یہ خبر نہایت افسوس کے ساتھ سنی گئی کہ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب ناظم اعلیٰ جمعیۃ علماء ہند ایک طویل علالت کے بعد جب کہ ان کے صحتمند ہونے کی توقع پیدا ہوگئی تھی کل صبح اپنی قیام گاہ واقع دہلی میں انتقال کر گئے تقسیم ہند کے بعد جب حالات نہایت خطرناک ہو گئے تھے اور مسلمانوں پر ایک قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔ اور اس پریشانی میں مسلمان تقریباً مخبوط الحواس ہو چکے تھے مولانا مرحوم جمعیۃ علمائے ہند کو لیکر آگے بڑھے اور پریشان حال مسلمانوں کی ہر طرح ڈھارس بندھائی اور انھیں ہمت وثابت قدمی سے اپنے مصائب کا مقابلہ کرنے اور اپنے مسائل حل کرنے کی تلقین کی۔ جہاں تک حکومت میں اپنا اثر و رسوخ تھا اس سے کام لے کر کسی بھی موقع پر مسلمانوں کے ساتھ ناانصافی اور ظلم و زیادتی ہوتی وہ حکومت سے اس معاملہ میں داد خواہ ہوتے اور انصاف کا مطالبہ کرتے جس میں اکثر انھیں کامیابی ہوتی وہ ہر معاملہ میں جوش سے زیادہ ہوش سے کام لینے کا مشورہ دیتے اور خود بھی اس پر پوری طرح کاربند تھے۔ پارلیمان کے رکن کی حیثیت سے جب بھی موقع آتا مسلمانوں کی نمائندگی اور ترجمانی کرتے اور یہ سب حکومت کی بہی خواہی میں کرتے اکثریتی فرقہ پرست جماعتیں اور بعض متعصب اور تنگ نظر افراد مسلمانوں پر کوئی الزام لگاتے اور انھیں مطعون کرتے تو وہ ان کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے اور انھیں پاس ہموطنی کا درس دیتے وہ اپنی تقریروں میں ہمیشہ مسلمانوں کو احساس کمتری دور کرنے اور اکثریت سے مرعوب نہ ہونے پر متوجہ کرتے اس میں کوئی شک نہیں کہ آخر وقت تک ان کی زندگی کا ایک ایک لمحہ ملک و قوم کی خدمت میں گزرا مولانائے مرحوم کے اٹھ جانے سے مسلمان ایک مخلص رہنما اور ایک جری ترجمان سے محروم ہو گئے۔ مولانا ابو الکلام آزاد آزادی کے بعد حکومت میں داخل ہو گئے تو مسلمانوں کے مسائل سے زیادہ ان کی توجہ حکومت کی ذمہ داریاں پوری کرنے کی طرف لگی رہتی تھی اور مسلمانوں کی نظریں تمام تر مولانا حفظ الرحمٰن پر رہتی تھیں مولانائے مرحوم کی زیادہ تر توجہ مسلمانوں کی دینی تعلیم کے مسئلہ کو حل کرنے پر مبذول تھی وہ انھوں نے جمعیۃ العلماء کے زیر اہتمام دینی تعلیم کانفرنس منعقد کر کے پہلی مرتبہ مسلمانوں ... ... دینی تعلیم کا مسئلہ حل کرنے کی دعوت دی اور اس بارہ میں جمعیۃ علماء کی ہر امکانی امداد کا سامان کیا۔ غرضکہ وہ ہر محاذ پر قوم و ملک کے ایک جانباز سپاہی کی طرح جمے رہے مولانائے مرحوم ایک عالم دین ہی نہ تھے وہ ایک اچھے سنجیدہ مقرر اور بلند پایہ مصنف تھے۔ مولانا کی تالیف میں قصص القرآن ایک ضخیم اور تحقیقی تصنیف ہے۔ سیرت پاک میں ایک مختصر لیکن جامع تصنیف کی تھی۔ مولانا نے قومی خدمت اور ملک کی سیاست کو خدمت علم میں حارج ہونے نہ دیا جس کے نتیجہ میں ان کی قوم ان کی تصانیف سے مستفید ہوتی رہے گی۔ مسلمانوں کی یہ بدبختی ہے کہ ان کی صف ایسے قائدین سے خالی ہوتی جا رہی ہے اور ان کا نعم البدل تو کجا کوئی بدل نہیں پایا جاتا۔ یہ حقیقت ہے کہ مولانائے مرحوم نے بڑے نازک زمانہ میں مسلمانان ہندوستان کی رہنمائی کی بہرحال آج مسلمانوں کی ایک بڑی شخصیت ان سے جدا ہو گئی جس کا جتنا غم کیا جائے کم ہے۔

سیاست حیدرآباد

ہندوستان کے علماء نے جنگ آزادی میں جو اہم اور نمایاں حصہ لیا تھا اس کی آخری یادگار مولانا حفظ الرحمٰن اس دنیا سے اٹھ گئے۔ مولانا نے پچھلے چند سالوں میں مسلمانوں کے مفادات و مسائل کو سلجھانے کے لئے اپنے کو وقف کر دیا تھا۔ لیکن کسی میں کبھی یہ جرأت نہ تھی کہ انہیں فرقہ پرست کہے چونکہ

ان کی ساری زندگی، قوم پرست تحریکات سے وابستہ رہی ہمارے ملک کی تحریک آزادی میں یوں تو تمام طبقات نے حصہ لیا ہے لیکن علماء کا حصہ لینا ایک غیر معمولی واقعہ تھا۔ اور مولانا اس طبقہ کی آخری شمع تھے یہ شمع بجھ گئی۔ قوم پرست مسلمان قائدین کی صف میں خلاء پیدا ہو گیا جس کے پر ہونے کی بظاہر کوئی امید نہیں۔

جمعیۃ علماء ہند نے آزادی کے بعد اقلیتی طبقہ کو قومی زندگی اور قومی سیاسی تحریکات سے قریب تر کرنے میں اہم حصہ لیا۔ مولانا موصوف کی واحد شخصیت میں پوری .... جمعیۃ العلماء سمٹ کر آ گئی تھی تنظیم کو جو کام انجام دینا چاہئے اور تنظیم سے عوام کو جو توقعات وابستہ ہیں۔ مولانا ان سب کا مجموعہ بنے ہوئے تھے۔ مولانا کو صحیح خراج عقیدت یہی ہو سکتا ہے کہ جمعیۃ علماء ٹھیک طور پر کام کرے۔ مولانا اپنی عمر اور علالت کے باوجود، جمعیۃ علماء کے مقاصد اور مشن کو جس طریقے سے پیش کرتے تھے وہ انہی کا حصہ تھا۔ مولانا نے آخری دم تک اپنی بساط کے مطابق ملک و قوم کی جو خدمت کی وہ انہیں ہماری سیاسی تاریخ میں ایک اہم مقام دیتی ہے۔

خدا بخشے ، بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

"افکار" بھوپال

مسلم اقلیت کو جہاں آئے دن صبر آزما حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ وہیں اس کے لئے یہ حقیقت سوہان روح ہے کہ اس کی وہ عظیم ہستیاں ایک ایک کر کے رخصت ہوتی جا رہی ہیں۔ جنہوں نے نہ صرف یہ کہ جنگ آزادی میں اپنی فکری صلاحیتوں سے قائدانہ رول ادا کیا بلکہ آزادی کے بعد ہمیشہ اس کے لئے کوشاں رہے کہ ہندوستان کے مسلمان احساس کمتری اور شکست خوردگی سے نجات حاصل کر کے اپنے وطن کی تہذیبی، سماجی اور اقتصادی ترقی میں برابر کے شریک ہوں اور اس طرح سے جو ان کا حق ہے وہ انھیں ملے۔

ملک کی آزادی کو ۱۵ سال نہیں گزرے کہ قیادت کی پہلی صف سے رفیع احمد قدوائی۔ مولانا آزاد، مولانا حسین احمد مدنی جیسے بزرگ اٹھ گئے گویا ابھی یہ داستان غم مکمل نہیں ہوئی تھی کہ مشیت ایزدی نے ہمارے درمیان سے مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمن کی عظیم المرتبت شخصیت کو بھی اٹھا لیا اس قحط الرجال اور شدید کرائسس کے دور میں مجاہد ملت کا ہی دل تھا کہ تمام خطرات اور اندیشوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے آپ نے ملت کو فروعی مسائل سے ہٹا کر بنیادی امور کی طرف اسے متوجہ کیا اور جمعیۃ علماء کے پلیٹ فارم سے اس کی نہایت اعلیٰ سوجھ بوجھ اور دانشمندی کے ساتھ رہنمائی کی،

مجاہد ملت ایک عرصہ سے علیل تھے لیکن برادر کشی کی وارداتوں کو روکنے بد امنی اور فرقہ وارانہ ہنگاموں کو فرو کرنے اور مسلم اقلیت کے حقوق کا تحفظ کرنے میں آپ کی توانائی صرف ہو رہی تھی، فسادات کا نہ ختم ہونے والا تسلسل آپ کے تدبر کو آزمائش میں ڈالے ہوئے تھا: پارلیمنٹ کے اندر اور اس کے باہر مجاہد ملت کی وہ آواز گونجتی تھی جس میں ساری قوم کے لئے ایک چیلنج ہوتا تھا جس میں احتجاج ہوتا تھا کہ سالہا سال تک اجنبی راج کے خلاف جہاد کر کے بے مثال قربانی پیش کر کے جس آزادی کا خواب دیکھا گیا تھا یہ خانہ جنگی اس کی تعبیر نہیں یہ وحشیانہ جھگڑے اس کا ثمرہ نہیں۔

یہ حق بھی ہر کسی کو نہیں پہونچتا کہ وہ با اقتدار اصحاب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کوئی چبھتا ہوا سوال کرے، قوم پرستی کی بھٹی میں مجاہد ملت کی طرح جو کندن بن کر نکلے تھے اور جنہوں نے جواہر لال نہرو سے کچھ کم قربانیاں وطن کے لئے نہیں دی تھیں وہی ظلم و ستم کے ہاتھ کو روکنے کے لئے نہرو کے ضمیر کو جھنجھوڑ سکتے تھے یہ حق انھیں کو پہونچتا تھا کہ وہ وطن کے مستقبل کو سنوارنے کے لئے حکومت پر اپنی پرچھائیں ڈالیں۔ مجاہد ملت نے یہ حق کس حد تک ادا کیا اس پر موجودہ حالات کا تنقیدی جائزہ لینے والا مورخ اچھی طرح روشنی ڈال سکتا ہے۔ آج مسلمانان ہند کے لئے ایک روز سیاہ ہے

آج ہمیں ایسی ہستی کے لئے رونا پڑ رہا ہے جس کی ہم نے اس کی زندگی میں پوری قدر نہیں کی۔ آج پیچیدہ مسائل ہمیں پریشان کر رہے ہیں لیکن وہ بزرگ رہنما جاتا رہا۔ جس کا دل ہر لحہ ان مسائل کو حل کرنے کے لئے مضطرب رہا کرتا تھا۔

۳ سال پہلے کی بات ہے۔ راقم الحروف مجاہد ملت کا نیاز حاصل کرنے دلی گیا تو آپ صبح کے وقت جمعیۃ کے دفتر میں سراپا غم بنے بیٹھے تھے۔ مزاج پرسی کی تو فرمایا "بظاہر اچھا ہوں لیکن اندر سے کھوکھلا ہوتا جا رہا ہوں" جب تفصیل چاہی تو فرمایا "یہ ایک حفظ الرحمن کی قسمت ہے کہ چاہے جبلپور ہو یا ساگر، بھوپال، سیتا مڑھی، آخر یا مبارک پور ہو ہر جگہ اسے مسلمانوں کی تباہی و بربادی کا نقشہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ میں بھی انسان ہوں میرا دل بھی متاثر ہوتا ہے اور اعصاب مضمحل ہوتے ہیں"

آج ۳ سال کے بعد موت کے ہاتھوں نے ان اجزاء کو منتشر کر دیا۔ جسے ہم مجاہد ملت کا دل کہتے تھے اور جس کی دھڑکنوں کیساتھ لاکھوں دل دھڑکنے لگتے تھے خدا سے دعا ہے کہ وہ ملت کو اس صدمہ عظیم کو برداشت کرنے کی توفیق دے۔

اردو ٹائمز بمبئی

مولانا ابوالکلام آزاد اور جناب رفیع احمد قدوائی کی جدائی کے بعد مولانا حفظ الرحمن کی وفات مسلمانان ہند کے لئے سانحہ عظیم ہے۔ ایک ایسا نقصان ہے جس کی تلافی دشوار ہے، جب ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ ہندوستانی مسلمانوں سے کیا چھین گیا ہے تو ذہن کانپ اٹھتا ہے اور دل خون کے آنسو رونے لگتا ہے۔

۱۹۴۷ء کے بعد سہمے ہوئے اور گھبرائے ہوئے ہندوستانی مسلمانوں کی رہنمائی آسان کام نہ تھا۔ مسلمان ہر طرف معتوب تھے، مشکوک نظروں سے دیکھے جا رہے تھے۔ ان کی وفاداریوں پر شبہ کیا جا رہا تھا۔ ان کی ترجمانی اور ان کی رہنمائی ایک ایسا بار گراں تھا۔ جسے شاید ناتواں بازو برداشت نہ کر سکتے لیکن وہ مولانا حفظ الرحمن کی ذات تھی جس نے یہ بوجھ سنبھال لیا اور اس طرح سنبھالا کہ اسے زندگی کا مقصد واحد بنا لیا۔ ان کی زندگی کی آخری گھڑی گواہ کہ انھیں نہ اپنی صحت کی فکر تھی۔ نہ علالت کی، نہ زندگی کی پرواہ تھی نہ موت کی۔ وہ اپنا سرمایہ حیات ہندوستانی مسلمانوں کی خدمت کے لئے وقف کر چکے تھے اور اس خزانے کی ایک ایک پائی انھوں نے اس مقصد کے لئے لٹا دی۔

گذشتہ آٹھ دس سال سے مولانا نے پارلیمنٹ کے اندر اور باہر کام کا اس قدر زیادہ بوجھ اٹھایا۔ کہ ان کی صحت جواب دے گئی۔ ڈاکٹروں نے روکا۔ ہمدردوں نے منع کیا، معتقدین نے اس محنت شاقہ سے باز رکھنے کی کوشش کی لیکن وہ اپنی زندگی کے مشن سے باز نہ آئے بلکہ اس میں زیادہ سے زیادہ تیزی اور شدت پیدا کرنے لگے۔

ہندوستانی پارلیمنٹ کا ایوان گواہ ہے۔ اس کے در و دیوار گواہ ہیں کہ مولانا کی طرح ہندوستانی مسلمانوں کو کوئی آتش بیان ترجمان ملنا دشوار ہے۔ جب وہ حقائق اور دلائل کو سامنے رکھ کر بولتے تھے تو مخالفین کی زبانیں بند ہو جاتی تھیں، معاندین پہلو بدلنے لگتے لیکن کسی میں اتنی طاقت نہیں ہوتی تھی کہ اٹھ کر الفاظ کے بہتے ہوئے سیلاب کو روک سکے اپنی اسی حق گوئی کے باعث آخری عمر میں مولانا نے ہر مکتب خیال کے مسلمان رہنماؤں کا اعتماد حاصل کر لیا تھا۔ چند ماہ قبل پارلیمنٹ میں مسلم لیگی صدر اسمٰعیل صاحب اور ایک عمدہ مقرر بدر الدجےٰ کی تقریریں ہوئیں جو صرف مسلمانوں کے مسائل سے متعلق تھیں۔ لیکن ایمان کی بات یہ ہے کہ مولانا حفظ الرحمان گذشتہ سال ہوم منسٹر اور دیگر ارکان کی مداخلتوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے جو کچھ کہہ گئے تھے اس میں اسمٰعیل صاحب اور بدر الدجیٰ صاحب کوئی خاص اضافہ نہ کر سکے۔

پارلیمنٹ کے باہر مولانا کے لئے عمل کا میدان بہت وسیع تھا کسی اور مسلمان رہنما میں یہ جرأت نہ تھی یا کسی کا یہ مقام نہ تھا کہ وہ جا کر جواہر لال کا ہاتھ پکڑتا اور ان سے کہتا کہ آپ کو غلط اطلاعات دی جا رہی ہیں اور واقعات کو چھپایا جا رہا ہے۔ جب علیگڑھ میں گھر لٹے، جلے برباد ہوئے، جبلپور پر قیامت ٹوٹی، چندوسی پر آفت آئی تو ہر جگہ سینہ سپر ہو جانے والا یہی مرد مجاہد تھا، مولانا حفظ الرحمن ہی تھے جو ہر چشم گریاں اور قلب مضطرب کے ساتھ ہر جگہ سینہ سپر ہر جگہ پہونچے اور زخمی دلوں پر مرہم رکھتے رہے۔ چند دن قبل جب مولانا بستر علالت بلکہ بستر مرگ پر دراز تھے۔ وہاں سے انھوں نے جواہر لال کو خط لکھا تو وہ بھی یوپی میں اردو پر کی جانے والی نئی زیادتی کے بارے میں۔ یہ واقعہ اپنی مثال آپ ہے اور ظاہر کرتا ہے کہ ہم سے کیسی عظیم ہستی بچھڑ گئی خدا مرحوم کو جوار رحمت میں جگہ دے اور مسلمانان ہند کو اس عظیم صدمہ کو برداشت کرنے کی توفیق عطا کرے۔ (آمین)

روزنامہ "ناظم" رام پور

زمانے والے دنیا کی بے ثباتی کا شکوہ کرتے آئے ہیں آؤ ایک بار اور زمانہ کی ستم ظریفی کا ماتم کر لو تم سے ایک ایسا عظیم انسان چھین لیا گیا جس نے تقریباً نصف صدی تک ہندوستان کے گیسوؤں کو سنوارا اس کی زلفوں کے پیچ و خم کو درست کیا بے شک مولانا حفظ الرحمن صاحب کی وفات حسرت آیات ایسا قومی نقصان ہے جس پر مدتوں آنسو بہائے جائیں گے۔ اگر آج آنکھیں اشک بار ہیں تو صحیح ہے آہ و نالے کا شور ہے تو درست ہے ہندوستان کے ماتھے پر شکن ہے تو بیجا نہیں ہے۔ اس لئے کہ اشک شوئی کرنے والا رخصت ہو چکا ہے زخموں پر مرہم رکھنے والا خود اپنی زندگی سے روٹھ گیا ہے۔ اور زلفوں کے بل نکالنے والے ہاتھ بے جان ہو چکے ہیں۔ ماتم اسی بات کا نہیں ہے کہ ہندوستان ایک نڈر بے باک سچے۔ مخلص وطن پرست اور جانباز سپاہی سے محروم ہو گیا بلکہ اس بات کا بھی ہے کہ اب کس کی گرج فرقہ پرستوں کے دل دہلایا کرے گی اور کون عصائے موسوی بن کر فرقہ پرستی کے اژدہوں کو نگلا کرے گا۔

یہ صحیح ہے کہ ہندوستان عظیم ملک ہے جس میں رہنما پیدا ہوتے رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے لیکن کیا اب ایسا دل بھی پیدا ہو گا جس میں ہر کس و ناکس کا درد پنہاں ہو جو ظلم پر مچل جائے اور نا انصافی کا مقابلہ کرنے کے لئے

ویرانہ اور اُٹ جائے میدان کارزار میں اگر تنہا ہو تو ہراس قریب نہ پھٹکے ظلمت
اور تاریکیوں کے گہرے سایوں کو انوار صبح سے پاش پاش کرتا آگے بڑھتا رہے
مولانا حفظ الرحمٰن نے آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد کیا نہیں کیا ہمیں
یقین ہے کہ جو بھی اس دنیا میں آیا ہے وہ ایک نہ ایک دن ضرور جائے گا۔
لیکن یہ گمان تک نہیں تھا کہ موت کے ظالم ہاتھ مولانا حفظ الرحمٰن کو عین اس
وقت چھین لیں گے جبکہ قوم کی نیا ڈول رہی ہے اور نا کنارے لگانے
کے لئے ایک پختہ کار ناخدا کی ضرورت ہے اسی لئے آج دلی ہی نہیں سارا
ہندوستان اداس ہے۔ ہندوستان کے طول و عرض میں بے بسی چھائی ہوئی ہے
یہ اداسی اور بے بسی بے سبب نہیں ہے۔

آزادی کے بعد ہندوستان تیزی سے صف اول کے رہناؤں سے خالی
ہوتا جا رہا ہے۔ وہ عظیم لیڈر جنھوں نے ہندوستان کی بیڑیاں
کاٹ کر اس کو آزادی بخشی ہے۔ یکے بعد دیگرے رخصت ہوتے رہے ہیں اگر دل
بیٹھنے لگتا ہے تو صبر کے علاوہ اور کیا بھی کیا جا سکتا ہے۔ مولانا حفظ الرحمٰن کروڑوں
سوگواروں کو اپنے پیچھے چھوڑتے ہوئے اس دنیا سے رخصت ہو گئے انھوں نے
ہندوستان کو کیا دیا ہندوستان کی کھیتی کو کس طرح سرسبز و شاداب رکھا کس طرح
ہندوستان کی سرزمین کو اپنے خون دل سے سینچا یہ ایک طویل کہانی ہے۔ مختصر یہ
ہے کہ مولانا حفظ الرحمٰن کی زندگی کے گذشتہ پچاس برس قوم کے لئے تھے۔
ہندوستان پر کوئی بھی آفت آئی مولانا سینہ سپر ہو گئے۔ ہندوستان کی طرف کسی
نے ترچھی نگاہ سے دیکھا مولانا کے ماتھے پر بل پڑ گئے قوم پرستی ان کے رگ و پے
میں رچ بس گئی تھی وہ ہر اس فرعونی طاقت کا مقابلہ کرنے کے لئے ہر وقت تیار
رہتے تھے جو ہندوستان کے فرقہ وارانہ اتحاد کو نقصان پہونچا کر اقلیتوں میں
خوف و ہراس پیدا کر دے مولانا حفظ الرحمٰن کا پختہ عقیدہ تھا کہ اکثریت اور
اقلیت شیر و شکر ہو کر ہی ہندوستان کو ترقی کی راہ پر گامزن کر سکتی ہیں۔ ان کا
قول تھا کہ جسم کا کوئی بھی حصہ لاغر رہا یا اسے مفلوج کر دیا گیا تو پورے جسم
کو تندرست نہیں کہا جا سکتا۔ بیگانے تو بیگانے بعض اپنے ہی تنگ نظر
۔۔۔۔۔۔ ان پر فرقہ پرستی کا الزام لگانے لگے لیکن مولانا نے فرقہ پرستوں
کے حوصلہ شکن الزامات کی پرواہ نہیں کی۔ مولانا ابوالکلام آزاد اور گاندھی جی کا جو
فیضان انہیں حاصل ہوا تھا اسے وہ قوم کے سامنے پیش کرتے رہے اور آخرکار
نقارخانہ میں طوطی کی صدا سنی گئی۔ آج پورے ملک میں قومی یکجہتی اور قومی اتحاد
کے جو نعرے بلند کئے جا رہے ہیں وہ کس کی انتھک کوششوں کا نتیجہ ہیں۔
انصاف سے دلوں کو ٹٹولئے تو ان نعروں میں آپ کو مولانا حفظ الرحمٰن صاحب
کا سوز پنہاں نظر آئے گا جبل پور ساگر کٹنی کے فسادات کے بعد مسلم کنونشن
کے پلیٹ فارم سے انھوں نے قوم کو جو درس دیا یہ اسی کی تاثیر ہے کہ
تمام سیاسی پارٹیوں کے سربراہ فرقہ پرستی کے استیصال کے لئے میدان
کارزار میں آ گئے ہیں۔

اقبال نے صحیح کہا ہے کہ ہزاروں سال نرگس کے رونے کے بعد کہیں
چمن میں دیدہ ور پیدا ہوتا ہے۔ بلاشبہ مولانا حفظ الرحمٰن دیدہ ور تھے ان
کی چشم حقیقت نگر نے ہندوستانی قوم کے دکھوں کو دیکھ لیا تھا چنانچہ وہ آخر
دم تک اس کا مداوا کرتے رہے یہ ایسی ہی بات نہیں ہے کہ صرف تحریر کر دی گئی
ہے۔ بستر علالت سے انھوں نے سہ لسانی فارمولے میں اردو کو نظر انداز
کرنے پر پنڈت نہرو اور وزیر اعلیٰ اتر پردیش شری سی بی گپتا سے جو شکوہ کیا اس
پر دوست تو دوست مخالف بھی عش عش کر اٹھے اور بے ساختہ زبانوں سے نکلا اللہ
رے قومی خدمت کا اتنا خیال۔

مولانا حفظ الرحمٰن جنگ آزادی کے مضبوط سپاہی نڈر اور بے باک ترجمان
تو تھے ہی ان کی عالمانہ شخصیت بھی حد درجہ بلند تھی وہ سادگی شرافت اخلاص و
محبت آزادی دوررسی اور عرفان جمال کی تمام خوبیوں کا بے مثال مرقع تھے
عقیدت و محبت کی زبان نے انہیں مجاہد ملت کہا تھا لیکن ان کی عظیم شخصیت
ان حدود میں بھی محدود نہیں تھی وادی خیال اور میدان عمل دونوں سے ان کا تعلق
والہانہ رہا اور بہادر سپاہی کی طرح زندگی بھر انہوں نے اس وضع داری کی عزت
رکھی مذہبی عقائد کی شدت کے باوجود زمانہ کے اقتصادی اور معاشی تقاضوں
سے ان کی شخصیت ہم آہنگ اور ہم خیال تھی۔ گو مغربی علوم پر مولانا کو کماحقہ دسترس
نہیں تھی پھر بھی ان کا ناخن تدبر پیچیدہ سے پیچیدہ گتھیوں کو سلجھانے میں کسی سے پیچھے
نہیں رہا سیاست کی باریکیاں اور پیچیدگیاں ان سے کبھی اوجھل نہیں رہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد کے بعد مولانا حفظ الرحمٰن کا رخصت ہو جانا یقیناً ناقابل
تلافی نقصان ہے۔ اور اس پر جس قدر بھی ماتم کیا جائے کم ہے لیکن مشیت
ایزدی کے سامنے کیا چارہ ہم خدا کے حکم کے سامنے سر جھکاتے ہیں۔ آج مولانا
ظاہراً اس آب و گل کی دنیا سے دور جا چکے ہیں لیکن ان کا فیضان ہماری رگ
رگ میں سما چکا ہے اس لئے آج ہم اپنے کروڑوں ہم وطنوں کے ساتھ ایک عظیم
شخصیت اور اپنے نڈر و بے باک ترجمان کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے دست
بدعا ہیں کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جوار رحمت میں جگہ دے۔ اور ان سوگواروں کو صبر
عطا فرمائے جن کی آنکھیں اپنے سچے اور مخلص ہمدرد کے غم میں اشکبار ہیں۔
اور قوم کو ان راستوں پر چلنے کی توفیق دے جن کے دکھانے میں مولانا نے خون دل سے
(آبیاری کی ہے)

قومی آواز لکھنؤ

مولانا حفظ الرحمن کے جنازے کے ساتھ چلنے والوں کو شاید اس بات کا پوری طرح احساس نہ ہو کہ آج اس عظیم شخصیت کو پہنچانے وہ سو سال کی تاریخ آئی ہے جس کے ساتھ گہری غور و فکر ہے بھاری قربانیاں ہیں۔ دور رس قومی حوصلے ہیں اور جاں بار حق پرستیاں ہیں۔ یہ وہ تاریخ ہے جو شاہ ولی اللہ کے زمانے سے چلتی ہے اور جنگ آزادی ۱۸۵۷ء سے ہوتی ہوئی بائیکاٹ کی تحریک اور ستیہ گرہوں سے گزرتی ہوئی تقسیم ہند کی اور دو نیشن کے نظریہ کی مخالفت کرتی ہوئی موجودہ دور تک آتی ہے اور آج قومی یکجہتی کی علمبردار ہے یہ جانے والا اس عظیم تاریخ کے صف اول کے سالاروں میں سے تھا وہ تو جا رہا ہے لیکن ایک دل نشین سبق، ایک روشن مثال اور اُفق تک رہنمائی کرنے والے نقش قوم پہ چھوڑے جا رہا ہے۔

مولانا حفظ الرحمن کی زندگی اس اصول کا پکا نمونہ تھی کہ "در کفے جام شریعت در کفے سندان عشق"۔ ایک طرف انھوں نے مہاتما گاندھی اور جواہر لال جی کے ساتھ آزادی کی جدوجہد میں پورا حصہ لیا، ستیہ گرہ کی، جیل گئے۔ سوشلسٹ طرز کے سماج کی داغ بیل ڈالی، ملکی ترقیات کے منصوبوں کی تعمیر میں حصہ لیا۔ الیکشن میں حصہ لیا۔ غیر مفید اور مضر سیاسی پارٹیوں کا کھل کر مقابلہ کیا۔ آزادی سے پہلے کانگریس کی خارجہ پالیسی کی تعمیر میں حصہ لیا سیکولرازم کے اصولوں کو عملی جامہ پہنانے کی جدوجہد میں معقول لوگوں کا ہاتھ بٹایا اور دوسری طرف انھوں نے مسلمانوں کے مدرسوں، خانقاہوں، قبرستانوں مزاروں، مسجدوں کے بچانے اور بازیابی کے لئے یہ جدوجہد کی۔ دینی تعلیم کی تحریک کی داغ بیل ڈالی اور اس کے لئے ریڈرس تیار کرائیں اور پھر اس اسکیم کو چلانے کے لئے ہندوستان بھر میں گھومتے پھرے۔ انھوں نے خود بھی کئی قابل قدر دینی کتابیں لکھیں۔ سیرت کے موضوع پر ان کی تقریر بہت اعلیٰ ہوتی تھی دینی کتابوں کی نشر و اشاعت کے لئے مولانا نے ندوۃ المصنفین قائم کیا۔ اس طرح مولانا حفظ الرحمن پورے سیاسی لیڈر بھی تھے اور پکے باعمل عالم دینی بھی۔

ہندوستان میں آزادی کی جو جدوجہد چلی وہ طرح طرح کے عنصروں سے مرکب تھی۔ اس میں مذہبی قسم کی عقیدت بھی تھی۔ سیاسی سوجھ بوجھ بھی۔ جوانی سے بھرپور جوش و خروش بھی فلسفہ و فکر بھی۔ تاریخی اور بین الاقوامی نظر بھی۔ تعمیری صلاحیتیں بھی۔ اور اس طرح کے اور بھی بہت سے عناصر۔ اگر یہ جدوجہد اتنے عناصر کا گلدستہ نہ ہوتی تو اس کی کامیابی ممکن نہ ہوتی۔ اس تحریک نے ایسے ایسے لیڈر پیدا کئے جنھوں نے اس جدوجہد کے بعض محاذوں کی سالاری کی ذمہ داری اٹھائی تھی۔ اس بوجھ کے اٹھانے میں مسلمانوں نے بھی اپنے تناسب سے بہتر حصہ لیا۔ ان کی صف سے جو عظیم لیڈر پیدا ہوئے جنھوں نے اس گلدستے کا ایک عنصر بن کر میدان سنبھال لیا ان میں سے ایک بہت بڑے سالار مولانا حفظ الرحمنؒ تھے۔ اگر آزادی کی تاریخ کا ان کی شخصیت کو بھلا کر مطالعہ کیا جائے تو اس میں بہت سی کڑیاں چھوٹی ہوئی محسوس ہوں گی اور ایسا محسوس ہوگا جیسے کسی نے ایک درخت کی تصویر سے ایک بڑی سی شاخ نکال دی ہو جس کی وجہ سے سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ اس کے پتے اور پھل کس چیز سے اٹکے ہوئے ہیں۔

مسلم لیگ نے مذہب خطرے میں ہونے کے نعرے کی بنا پر دو نیشن کا نظریہ چلایا تھا اس وقت اندازہ کرنا مشکل ہے کہ اس نعرے نے سیاسی زندگی ہی کو نہیں قومی اور انفرادی زندگی کو بھی کیا شکل دے دی تھی۔ لیگی مسلمانوں نے غیر لیگی مسلمانوں کے خلاف فتنے اٹھا رکھے تھے۔ ان کا سماجی بائیکاٹ کیا تھا ان پر چھرے چلائے تھے ان کو ذلیل کیا تھا اور گندی گالیاں اچھالی تھیں، اور یہ فضا پیدا کر دی تھی کہ جو مسلمان لیگی نہیں ہے وہ غدار ہے، اس فضا کا سامنا کرنا اپنی عزت، نیک نامی، سیاسی کردار اور جان کو خطرے میں ڈالنا آسان نہیں تھا۔ یہ حالات دیکھ کر بہت سے قوم پرور گوشہ نشین ہو گئے تھے لیکن اس زمانہ میں بھی مسلمانوں کی ایک جماعت ایسی تھی جس نے خطروں کو گوشہ نشینی پر ترجیح دی اور لیگ کی غلط تحریک کا سر ہتھیلی پر رکھ کر مقابلہ کیا۔ اس جماعت میں ایک گروہ علمائے دین کا بھی تھا۔ ان چند چوٹی کے سالاروں میں سے ایک مولانا حفظ الرحمن تھے۔ وہ نہ کبھی جھجکے اور نہ گھبرائے۔ ان کا سیاسی شعور، ان کا نکتہ رس اسلوب اور ان کی آتش بیان تقریر، یہ چیزیں تھیں جنھوں نے لیگ کی آہنی صفوں میں رخنے ڈال دیئے اور جگہ جگہ الیکشن میں اس کے نمائندوں کو شکست دی۔

مولانا حفظ الرحمن مسلم لیگ کے سخت ترین مخالفوں میں سے تھے اور انھوں نے اس تحریک کا دس سال پوری پامردی سے مقابلہ کیا۔ لیکن جب ہندوستان کی تقسیم کے بعد لیگ کی تحریک کا دوسری طرح کا ردعمل ہوا اور فسادوں کی لہر چلی تو انھوں نے کہا کہ آج سے میرے لئے لیگی اور غیر لیگی دونوں یکساں ہیں اور پھر وہ اس اصول پر قائم رہے۔

جب دہلی میں فساد نے قدرتی سیلاب کی شکل اختیار کر لی جس کے

سامنے سوائے گنتی کے چند لیڈروں کے سب کے پاؤں اکھڑنے لگے۔ اس زمانے میں مولانا حفظ الرحمٰن شہر میں گھومتے پھرتے تھے اور جو بھی ممکن تعاون کرتے تھے۔ لیکن حالات بے حد خراب تھے۔ خود ان کا وجود اور ان کا گھرانا خطرے میں تھا۔ ایسے وقت میں مولانا کے بعض قریبی غیر مسلم دوستوں نے مشورہ دیا کہ آپ اپنے کو خطرہ میں نہ ڈالئے۔ آپ یا تو پاکستان چلے جائیں یا کسی اور جگہ۔ باقی مسلمانوں کی حفاظت کے لئے جو کچھ ہم سے ہو سکتا ہے وہ ہم کریں گے۔ مولانا نے اس پر جواب دیا کہ جس زندگی کو میں اس طرح بھاگ کر بچانے جاؤں گا وہ کس مصرف کی ہوگی۔ آپ کیا باتیں کرتے ہیں۔ یہ موقع جان دینے کا ہے یا جان بچانے کا۔

اس زمانے میں مولانا حفظ الرحمٰن اکیلے ذریعہ اطلاع تھے۔ مہاتما گاندھی کے لئے۔ یہ روزانہ وہاں جاتے تھے اور بتلاتے تھے کہ شہر میں کیا ہو رہا ہے گاندھی جی سرکاری اطلاعوں پر بھروسہ نہیں کرتے تھے وہ صرف مولانا کی اطلاعوں پر بھروسہ کرتے تھے۔ یعنی ان ہی کی آنکھوں سے دیکھتے تھے اور ان ہی کے کانوں سے سنتے تھے۔ اور اسی دیکھنے اور سننے کا نتیجہ تھا کہ گاندھی جی نے دہلی والا مرن برت رکھا۔

جب گاندھی جی نے مسلمانوں کے لئے دہلی میں مرن برت رکھا تو انھوں نے مولانا حفظ الرحمٰن سے کہا کہ مولانا صاحب جب آپ روزانہ آکر مجھے مسلمانوں کا حال بتلاتے تھے تو میں دل میں شرمندہ ہوتا تھا کہ میں کچھ کر نہیں پا رہا ہوں۔ اور میں آپ سے آنکھیں نہیں چار کر پاتا ہوں۔ لیکن آج میں شرمندہ نہیں ہوں۔ کیونکہ جو کچھ میں کر سکتا تھا وہ کر چکا۔ اب معاملہ خدا کے ہاتھ میں ہے۔ اس زمانے میں جو لوگ گاندھی جی سے قریب تھے وہ کہتے ہیں کہ ان کے نزدیک مسلمانوں کی اس زمانے میں جو لوگ سب سے زیادہ نمائندگی کرتے تھے وہ تھے مولانا آزادؒ اور مولانا حفظ الرحمٰنؒ۔ ان دونوں میں سے مولانا حفظ الرحمٰن کی پوزیشن میدان جنگ کے سالار کی تھی جو ہر چیز اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے۔

۱۹۴۷ء آزادی لے آیا۔ لیکن آزادی کے ساتھ بہت سے مسائل بھی آئے۔ ان میں سے بعض مسائل ایسے تھے جن کا تعلق مسلمانوں سے تھا سوال یہ تھا کہ ان کو کون حل کرے۔ ہندو فرقہ واریت، لیگ کے ردعمل میں بہت زور پکڑ چکی تھی اور اس نے قوم پروروں کے دلوں میں بھی بہت سی نظریاتی الجھنیں پیدا کر دی تھیں۔ یہاں تک کہ یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ مسلمانوں کے معاملات میں پڑنا بھی فرقہ واریت ہے۔ لیکن مولانا حفظ الرحمٰن نے ان تنگ نظریوں کا خیال کیا اور نہ اس بات کا کہ کس طرح ان کی سیاسی پوزیشن خطرے میں پڑ جائے گی اور وہ بے خطر میدان میں آ گئے۔

عام مسلمانوں کا کیا حال تھا اس زمانے میں؟ انھوں نے دو قومی کے نظریئے کو اسلام کا اہم جزو سمجھ کر اختیار کیا تھا اور یہ نعرہ لگایا تھا کہ مسلمان چونکہ ایک الگ قوم ہیں اس لئے ان کو الگ وطن چاہئے۔ اس لئے ہندوستان کو تقسیم کر دو۔ لیکن جب تقسیم ہو گئی اور لیگ جیت گئی، تو یہ جیت ہی اس کے لئے سب سے بڑی ہار ثابت ہوئی۔ پاکستان میں مسٹر جناح نے جو دو قومی نظریئے کے بانی تھے یہ کہہ کر اس نظریہ کو ختم کر دیا پاکستان کے ہندو اور مسلمان ایک قوم ہیں اور ہندوستان میں یہ نظریہ یوں ختم ہو گیا کہ خود یہاں کے مسلمان محسوس کرنے لگے کہ یہ بات محال ہے کہ ہندوستان کے ۴ کروڑ مسلمان پاکستان چلے جائیں یا وطن تو سمجھیں پاکستان کو اور رہیں ہندوستان میں۔ ایسی صورت میں ہندوستان کے مسلمان کیا کریں۔

دو قومی نظریہ ایک ایسی چیز تھی جس کو لیگی مسلمانوں نے ایک حق سمجھ کر اختیار کیا تھا اب وہ مضحکہ بن گیا۔ اس چیز نے ان کے اعتماد کو پارہ پارہ کر دیا اور وہ سخت پستی اور ذلت کا احساس کرنے لگے۔ اس موقع پر مولانا حفظ الرحمٰن نے ان کا اعتماد بحال کرنے کے لئے ہندوستان کا دورہ کیا۔ کانفرنسیں کرائیں۔ عام جلسے کرائے اور ہر نازک موقع پر پہنچ گئے اور اس کا سلسلہ انھوں نے اپنی بیماری کے وقت تک جاری رکھا۔

۱۹۴۷ء کے فسادوں نے پنجاب کے مسلمانوں کے لئے عجیب و غریب حالات پیدا کر دیئے تھے۔ یہ صرف مولانا حفظ الرحمٰن کی کوشش تھی کہ ان میں پھر یہ یقین پیدا ہو گیا کہ یہ بات ممکن ہے کہ ہندوستان میں اچھے مسلمان بن کر آزادی سے رہو اور غیر مسلموں ہی کی طرح جمہوریت سے فائدہ اٹھاؤ۔

مولانا نے ہمیشہ بہادری اور جرأت سے حکومت پر تنقید کی۔ اس تنقید نے جہاں حکومت کو اس کی غلطیوں کی طرف متوجہ کیا۔ وہاں مسلمانوں کو بھی اس بات کا یقین دلایا کہ ہندوستان کی جمہوریت سچی جمہوریت ہے۔ جہاں حکومت پر ہر قسم کی تنقید کی جا سکتی ہے اور جہاں غیر مسلموں کو بھی دادرسی میں اپنا ساتھی بنایا جا سکتا ہے۔

مولانا حفظ الرحمٰن کے بڑے کارناموں میں سے ایک یہ ہے کہ انھوں نے جمعیۃ علماء ہند کو، جو آزادی کے زمانے میں ایک احتجاجی اور جارحانہ جماعت تھی تعمیری اور تنظیمی جماعت بنا دیا۔ جو لوگ عوامی زندگی سے واقف ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں کہ یہ کام کتنا مشکل تھا۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ ہندوستان بھر میں صرف

یہی ایک جماعت ہے جو اس انقلابی تبدیلی کو سہ کر زندہ رہ گئی اور آج دوسرے قسم کے خاموشی سے چلنے والے اور برسوں میں سرسبز ہونے والے پروگراموں میں لگی ہوئی ہے۔

مولانا حفظ الرحمن کو عام طور سے ایسا لیڈر سمجھا جاتا ہے جو مسلمانوں ہی کے معاملات سے دلچسپی لیتے تھے۔ یہ بات دوسری ہے کہ ان کا نقطۂ نظر ہمیشہ قومی رہتا تھا۔ لیکن یہ خیال اس حد تک صحیح نہیں ہے جہاں تک سمجھا جاتا ہے۔ مولانا حفظ الرحمن نے بہت سے قومی مسائل کے حل کرنے میں حصہ لیا۔ اور ملک کے بہت سے غیر مسلم لیڈروں کی نظروں میں ان کا درجہ قومی لیڈر کا تھا۔ ان کے سامنے شرنارتھی اور مختلف ریاستوں کے ہندو، سکھ اور عیسائی بھی اپنے مسئلوں کو لے کر آتے تھے۔ مولانا کو ایسے معاملوں میں بھی پورا ادراک حاصل تھا وہ ان کو بھی سمجھ لیتے تھے اور حل کرتے تھے۔ اس طرح کانگریسیوں اور غیر کانگریسیوں کے ایک بہت بڑے طبقہ کے نزدیک تقسیم کے بعد والے غلط نظریئے کے مطابق اب وہ فرقہ پرور قطعی نہیں تھے بلکہ ان کی حیثیت گاندھی جی، مولانا ابوالکلام آزاد رفیع صاحب اور جواہر لال کی طرح قومی لیڈر کی سی تھی۔ مولانا حفظ الرحمن کی زندگی اور وفا کرتی تو چند برسوں میں سارا ہندوستان ان کو اسی نظر سے دیکھنے لگتا کیونکہ لوگ یا تو محسوس ہی کرنے لگے تھے کہ مولانا ملک کی گاڑی کا چوتھا پہیا ہیں جس کے بغیر گاڑی اگر چلے گی تو بہت سے خطروں کا سامنا ہوگا۔

مولانا کا ذاتی کردار لیڈر کا نہیں، بلکہ بوریہ نشین درویش کا تھا جس کے دروازے پر کوئی دربان نہیں ہوتا ہے۔ وہاں ہر شخص آسکتا تھا اور ہر وقت آسکتا تھا۔ صرف آ ہی نہیں سکتا تھا قیام بھی کرسکتا تھا اور مولانا سے اپنے گھریلو اور بے حد نجی معاملوں سے لے کر سیاسی معاملوں تک میں مدد کی درخواست کرسکتا تھا۔ اور حد یہ ہے کہ جو لوگ مولانا کی ہر وقت مخالفت کرتے رہتے تھے وہ بھی مدد کی درخواست لے کر آتے تھے اور مدد حاصل بھی کرلیتے تھے۔

مولانا حفظ الرحمن کی آخری سب سے بڑی تمنا یہ تھی کہ ایک انگریزی روزنامے کو بڑے پیمانہ پر قائم کیا جائے۔ جو نیشنل طرز فکر پر اس طرح چلے کہ مسلمانوں کے معاملوں پر خاص توجہ رہے۔ اگر ان کی زندگی وفا کرتی تو اس پہاڑ کو بھی وہ اٹھا لیتے۔ لیکن اب ان کے بعد ان تمام لوگوں کا، جو چاہے مسلم ہوں چاہے غیر مسلم یہ فرض ہے کہ مولانا کی اس تمنا کو جیتی جاگتی شکل دے دیں اور یہ سمجھ کر یہ شکل دیں کہ مولانا کی زندگی کے پیام اور ان کی جدوجہد کو جان تازہ اسی طرح مل سکتی ہے

ہم مولانا حفظ الرحمن کی اہلیہ محترمہ، بچوں اور عزیزوں کے غم میں پوری طرح شریک ہیں اور ان کو یقین دلاتے ہیں کہ مولانا کی شخصیت ان کے خاندانی حدود کی منزلوں آگے جاچکی ہے۔ آج ہزاروں ایسے افراد موجود ہیں جن کو مولانا کے اٹھ جانے کا اتنا ہی غم ہے جتنا ان کی خاص اولاد کو۔ واقعہ یہ ہے کہ اس موقع پر یہ مقولہ بالکل صحیح ہے۔

موت العالم موت العالَم

روزنامہ انقلاب بمبئی

مولانا حفظ الرحمن کا انتقال ایک ایسے ادارے کا انتقال ہے جو بہت سے اوصاف کا مجموعہ تھا۔ وہ صرف مسلمانوں کے یا قومی رہنما ہی نہیں تھے اور نہ ہی ان کی شخصیت جمعیۃ العلماء کے ادارے تک محدود تھی۔ وہ صرف ممتاز عالم، بے باک مقرر، جری سیاست داں اور جنگ آزادی کے دلیر سپاہی نہیں تھے بلکہ ان سب سے بہت کچھ زیادہ اور بہت کچھ اعلیٰ تھے۔ وہ قوم پرست ہندوستانی کے دل کی دھڑکن اور اس کی روح تھے اور اسی لئے آج جب ان کا نحیف جسم سپرد ہوچکا ہے اور وہ وطن عزیز کی مٹی کی آغوش میں پہنچ چکے ہیں ہم میں سے ہر شخص کو یہ محسوس ہو رہا ہے کہ ہم کوئی بہت قیمتی کوئی بالکل دل سے لگی ہوئی چیز کھو بیٹھے ہیں۔ یہ احساس ہمیں ہر رہنما کی موت پر نہیں ہوتا ہے۔ یہ احساس ہمیں اس وقت ہوا تھا جب مولانا آزاد ہم سے جدا ہوئے تھے اور آج ہو رہا ہے جب ان کے دیرینہ رفیق اور ساتھی رخصت ہوگئے ہیں۔

مولانا حفظ الرحمن ہندوستان کی جدوجہد تاریخ کے معماروں میں سے تھے ایسے مجاہدوں میں جن کی زندگی آخری سانس تک قوم و ملک کے کام آئی ہے۔ جنگ آزادی کی تحریک کو انھوں نے اپنی جوانی کا لہو ہی نہیں اس کی ساری امنگیں، جوش اور ولولے نذر کئے اور ایسے وقت میں جب قوم پرستی جرم تھی اس کے پرچم کو بلند رکھا!

ملک کی آزادی سے قبل مولانا حفظ الرحمن ہمارے ملک کے عالموں کے ایک گروہ کے ساتھ قومی تحریک کی لڑائی لڑتے رہے۔ لیکن آزادی کے حصول کے بعد بھی انھیں چین اور سکون نصیب نہیں رہا۔ وطن کی آزادی اپنے ساتھ خونریزی بھی لائی اور نفرت انگیزیاں بھی اور ان سب کے خلاف جدوجہد میں وہ ہمیشہ پیش پیش رہے۔ ان کی ہمت نے بارہا ان کا ساتھ چھوڑ دیا لیکن مولانا ان لوگوں میں سے نہیں تھے جو ہار مان لیتے۔ ان کے بظاہر تنا جسم میں عمل اور جذبے کی ایسی بے پناہ چنگاریاں موجود تھیں جو جدوجہد کی لگن کو اکساتی رہتیں۔

ملاپ دہلی

اگر کہوں کہ محترم مولانا حفظ الرحمان کے دیہانت کی خبر سنتے ہی میرا دل رو اٹھا تو من کی بھاونا بیان نہیں ہوتی۔ روز نا معمولی سی بات ہے۔ کبھی کبھی اس سے من کو سکون بھی ملتا ہے لیکن یہ سوچتے ہی کہ مولانا حفظ الرحمان اب اس دنیا میں نہیں، دل سے ایک ہوک اٹھتی ہے، ایک چیخ جس میں سکون نہیں، شانتی نہیں۔ آج سے چند برس پہلے میں انہیں ذاتی طور پر جانتا نہیں تھا۔ تب جانا تو ایسے محسوس ہوا کہ اس آدمی کے سینے میں نہ صرف اپنے دیش کے لئے عظیم محبت ہے۔ سچی وطن پرستی کے اصولوں کے لئے ایک لا پناہ جذبۂ عقیدت۔ بلکہ ایسی انسانیت بھی جو ہر نزدیک آنے والے کو پیار کی زنجیر میں باندھ لیتی ہے۔ ایک بار جو اُن کے نزدیک آجائے اس کے لئے پھر دور جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا وہ نہ صرف اس جمعیۃ العلماء ہند کے پردھان تھے جس نے سخت ترین آزمائش کے دنوں میں بھی دو قوموں کی تھیوری کے سامنے سر نہیں جھکایا۔ بلکہ ملک کے ایسے رہنما بھی جن کے تدبر پر جن کی قابلیت پر اور جن کی درست روی پر اس ملک کا ہر وطن پرست ناز کرتا تھا میں جانتا ہوں کہ کئی لوگ جو اپنی آنکھ کا شہتیر دیکھ نہیں پاتے، وہ جمعیت العلماء ہند پر کئی طرح کے غلط اعتراض بھی کرتے ہیں — لیکن اس کے باوجود اصلیت یہ ہے کہ مسلم دوانوں کی اس جماعت نے اس وقت بھی ہندوستانی مسلمانوں کو وطن پرستی کے راستہ پر چلانے کی کوشش کی۔ جب فرقہ وارانہ نفرت وحقارت کی آگ شعلہ زن ہو رہی تھی۔ اور جب انگریز کے ایجنٹ کہیں "ہندو دھرم" اور کہیں "اسلام" کا نام لیکر عوام کو گمراہ کر رہے تھے۔ میں نہیں کہتا کہ جمعیت العلماء کو اس معاملہ میں کوئی بہت بڑی سپھلتا ملی۔ اگر ملتی تو یہ ملک تقسیم نہ ہوتا۔ مذہب کے نام پر حیوانیت نہ جاگتی لاکھوں بے گناہوں کا خون نہ ہوتا۔ قریباً ڈیڑھ کروڑ آدمی گھر سے بے گھر نہ ہوتے۔ یقیناً اس بہادر جماعت کو سپھلتا نہیں ملی لیکن جس جرأت اور جوانمردی کے ساتھ اس کے نیتا اور ورکر ملک دشمن طاقتوں سے لڑے۔ اُن کے پے درپے حملوں کے باوجود اپنے عزم صمیم پر چٹان کی طرح قائم رہے، وہ اپنی مثال آپ ہے۔ مولانا حفظ الرحمٰن ان نیتاؤں میں سے نہ صرف ایک تھے۔ بلکہ سب سے قابل احترام بھی۔ فرقہ پرستی کے علمبرداروں نے اور نفرت وحقارت کے پرستاروں نے انہیں گالیاں دیں، انہیں طعنے دیئے، اُن پر جسمانی حملے بھی کئے لیکن کسی کی چنتا کئے بغیر یہ بہادر مہا پرش وطن پرستی کے راستہ پر لگے اور آگے ہی آگے بڑھتے چلے گئے۔ آج جب وہ نہیں ہیں تب ایسے لگتا ہے کہ وہ سامنے بیٹھے ہیں۔ اُن کی وہ پیار بھری آنکھیں ایک عجیب مدبرانہ انداز میں مسکراتی ہوئی دیکھتی ہیں اور اُن کی پیار بھری آواز کہتی ہے سد وطن پرستی کی

اس شمع کو بجھنے نہ دینا۔ اس کے لئے کوئی بھی قربانی بڑی نہیں" — اور اصلیت یہ ہے کہ واقعی وہ اس شمع پر قربان ہوتے۔ پچھلے عام چناؤ سے کافی دیر پہلے کچھ گمراہ شدہ اور گمراہ کن لوگوں نے فرقہ پرستی کی آگ کو از سر نو بھڑکانے کی کوشش کی تو وہ دیش میں جگہ جگہ پہنچے تاکہ اس نئے فتنہ کا مقابلہ کر سکیں۔ لگاتار سفر اور لگاتار تقریریں کرنے سے وہ بیمار ہو گئے۔ اتنے بیمار ہوئے کہ عام چناؤ کے دوران اپنے حلقہ میں بھی جا نہیں سکے عوام نے ان کو کامیاب بنایا تو اس لئے نہیں کہ مولانا اُن کے پاس ووٹ مانگنے گئے بلکہ اس لئے کہ اُن کے دل میں مولانا کے لئے پیار تھا۔ عزت تھی۔ چناؤ کے بعد وہ صحتیاب نہیں ہوتے۔ بیماری کی حالت میں ہی کام کرتے رہے لیکن انہیں بیماری تھی ایسی جس کا کوئی علاج نہیں۔ اُن کے گلے کے نچلے حصہ میں کینسر تھا۔ اس کے علاج کے لئے وہ امریکہ گئے۔ لیکن امریکہ میں بھی اس بیماری کا علاج تو ہے نہیں وہ واپس آئے تو اور زیادہ کمزور و نحیف ہو کر اور آخر . . . جانا سب کو ہے دکھ ہوتا ہے اس وقت جب کوئی مہا پرش چلا جاتا ہے ایسا آدمی چلا جاتا ہے جو اپنے لئے نہیں ملک کے لئے زندہ تھا۔ تب دل میں ایک ہوک اٹھتی ہے ایک ٹیس جاگتی ہے۔ لیکن ایسی حالت میں بھی راستہ تو صرف ایک ہے کہ ہم اس مہا پرش کے پیغام کو اور اس کے مشن کو یاد رکھیں۔ (رنبیر)

تیج دہلی

مشہور محب وطن مولانا حفظ الرحمٰن اللہ کو پیارے ہو گئے۔ آپ کے انتقال کی خبر سے ملک کی راجدھانی میں غم کی گھٹا چھا گئی۔ مولانا حفظ الرحمان صاحب عرصہ سے بیمار تھے۔ علاج میں کوئی کسر نہیں چھوڑی گئی لیکن مرض ایسا موذی تھا کہ اس سے نجات مشکل تھی بہترین طبی امداد کے باوجود مولانا حفظ الرحمٰن سرطان کے مہلک مرض سے نہ بچ سکے۔ مولانا کن صفات کے مالک تھے ان میں وہ کونسی خوبیاں تھیں جن کی وجہ سے ملک بھر میں آپ کا احترام ہوتا تھا۔ ان کا شمار آسان نہیں یہی کہنا کافی ہوگا کہ آپ کی مرتبہ سے ہندوستان کی سیاست میں قومی سماج میں جو خلا پیدا ہو گیا ہے وہ پر نہ ہو سکے گی۔ آپ کا سارا جیون سادہ جیون سے پیدا شدہ اسلئے کیریکٹر سنجیدگی اور متانت۔ ملک کی بھلائی کی لگن آپ کے جیون کے درخشاں پہلو تھے۔ آپ کا شمار یوں تو ہندوستان کے چوٹی کے قوم پرست مسلمانوں میں ہوتا تھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ آپ فرقہ پرستی سے اتنا دور تھے کہ آپ کے نام کے ساتھ فرقہ یا جماعت کا نام وابستہ کرنا موزوں معلوم نہیں ہوتا ٹھیک ہے کہ آپ نے ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے بہت کچھ کیا۔ آپ کی عدم موجودگی کو مسلمانوں ہی میں محسوس کیا جائے گا۔ لیکن مولانا حفظ الرحمان کی سرشت میں اعلیٰ جذبہ قوم پرستی کا ہوتا تھا۔ مولانا صاحب کا

طریق کار شروع سے کر آخر تک قوم پرستانہ ہی ہوتا تھا۔ فرقہ پرستی کے طوفان آتے تھے اور چلے جاتے تھے۔ بعض اوقات یہ طوفان اتنے مہیب ہوتے تھے۔ کہ تھپیڑے لگتے تھے۔ بعض اوقات ایسا بھی معلوم ہوتا تھا کہ فرقہ پرستی کا سیلاب مولانا کو بہائے جائے گا۔ لیکن نہیں مولانا ہر نازک صورت حالات کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ کرتے رہے۔ مولانا کی حب الوطنی اور قوم پرستی میں شک و شبہات پیدا بھی ہوتے تو قائم ہرگز نہ رہ سکے مولانا کا دامن بے داغ ہی رہا۔

ہندوستان کی قومی تاریخ میں قوم پرست مسلمانوں کا بھی ایک باب ہے ہمیں یہ کہنے میں ذرا بھی باک نہیں کہ اس باب کا اگر صحیح طور پہ مطالعہ کیا جائے تو معلوم یہی ہوگا کہ جنگ آزادی کی ابتدا میں مولانا حفظ الرحمان صاحب نے جو پوزیشن اختیار کی تھی۔ دوران جنگ، جنگ میں کامرانی کے بعد اور خصوصا حالیہ ملک کی ترقی کے دور میں جب کہ ایک بار پھر رجعت پسندی اور فرقہ پرستی نے سر اٹھا لیا تھا مولانا نے اختیار کردہ پوزیشن کو خوب نبھایا اور ایک قابل تقلید مثال قائم کر دی۔ مولانا کی سیاسی زندگی سے قطع نظر آپ کی عام زندگی انسانی قدروں سے پر تھی۔ مولانا کی بے وقت موت سے کیسے نقصان ہوا یہ کہہ لیجیے کہ ہر جماعت اپنی اپنی جگہ دکھی ہے۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ عظیم نقصان ان اعلیٰ قدروں کو ہوا ہے جن کا عام قومی جیون میں فقدان ہے۔ مولانا کی موت سے انسانی قدروں کا علمبردار اٹھ گیا ماضی اور حال کو وابستہ رکھنے والی زنجیر کی بیشتر کڑیاں پہلے ہی ٹوٹ چکی تھیں۔ مولانا حفظ الرحمان کے چلے جانے سے زنجیر اور بھی کمزور ہو گئی ہے واقعی مولانا کی موت قومی سانحہ ہے۔ دعا ہے کہ خداوند کریم مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور پس ماندگان کو صبر کی توفیق عطا کرے۔

پرتاپ دہلی

ملک بھر نے یہ خبر بڑے رنج سے سنی ہے کہ جمعیت العلمائے ہند کے جنرل سکریٹری لوک سبھا کے ممبر اور سرکردہ قوم پرست مسلم لیڈر۔ مولانا حفظ الرحمن وفات پا گئے ہیں۔ ان کے پھیپھڑے میں سرطان تھا۔ اس لئے وہ اپنا جہاد بھی نہ لڑ سکے تھے۔ اور علاج کرانے کو امریکہ چلے گئے تھے وہاں جو کچھ کیا جا سکتا تھا کیا گیا۔ مگر مولانا کے دن پورے ہو گئے تھے اس لئے کوئی علاج کارگر نہ ہوا۔ اس سے جمعیت العلمائے کو تو نقصان پہنچے گا ہی۔ قوم پرست مسلمانوں میں بھی ایک ایسا خلا پیدا ہوا ہے جو شاید ہی پر ہو سکے۔ مفتی کفایت اللہ صاحب اور مولانا احمد سعید کی وفات کے بعد جمعیت العلمائے کو چلانے کی ذمہ داری مولانا حفظ الرحمان کے کندھوں پر آن پڑی تھی۔ اور انہوں نے اسے کمال خوبی سے نبھایا۔ مولانا مسلمان تو تھے ہی۔ قوم پرست بھی تھے۔ اور اپنے ان دو فرائض کو ٹکرے سے بچانے کے لئے انھوں نے یہ تیکنیک اپنائی تھی کہ اگر مسلمانوں کو کوئی شکایت پیدا ہوتی تو اس کا اخبارات میں رونا رونے کے بجائے وہ چٹھی کے ذریعے پنڈت نہرو کا دھیان اس طرف دلایا کرتے تھے۔ اور اس شکایت کی فوری تلافی ہو جاتی تھی پچھلے دنوں اتر پردیش کے کمبہ منتری شری چندر بھان گپتا نے کہا کہ اس پردیش میں تین بھاشائیں پڑھائی جائیں گی جن میں انگریزی اور ہندی کے ساتھ دکھن بھارت کی بھی ایک بھاشا ہوگی اور کوئی طالب علم اردو پڑھنا چاہے گا تو چوتھی زبان کے طور پر ہی پڑھ سکے گا۔ اس پر مولانا نے بستر علالت سے پنڈت نہرو کا دھیان شری گپتا کے اس بیان کی طرف دلایا۔ جنھوں نے شری گپتا کے اس بیان پر فوراً یہ اعلان کر دیا کہ اردو تین زبانوں میں شامل ہوگی۔ مولانا ایک اچھے کوٹی کے عالم تو تھے ہی باعمل بھی تھے۔ بڑی سوجھ بوجھ کے مالک تھے۔ حرارت پیدا نہیں کرتے تھے روشنی دیتے تھے۔ اس لئے ہندو بھی ان کے مداح تھے۔ مسلمانوں نے دیکھ لیا کہ مولانا کا ماتم منانے میں ہندو ان کے ساتھ برابر کے شریک ہیں۔

کوہستان

راولپنڈی، لاہور، ملتان

مسلمانانِ ہند کے مشہور رہنما اور بھارتی پارلیمنٹ کے ممتاز رکن مولانا حفظ الرحمان سیوہاروی کا انتقال پر ملال صرف بھارتی مسلمانوں ہی کے لئے نہیں ساری دنیائے اسلام کے لئے ایک بہت بڑا قومی اور ملی سانحہ ہے۔ اللہ تعالےٰ مولانا مرحوم کی تربت پر اپنے انوار کی بارش کرے۔

مولانا حفظ الرحمانؒ ایک بے خوف، نڈر صاحب کردار اور ایثار پیشہ رہنما تھے۔ امر واقعہ ہے کہ مختلف اسلامی ملکوں میں اس وقت جو حضرات مسلمانوں کی رہنمائی کا فرض ادا کر رہے ہیں۔ ان میں جہاں تک حق گوئی اور ایثار پیشگی کا تعلق ہے، شاید کوئی ان کے مرتبے تک پہنچ سکے۔

آزادی کے بعد جب بھارت کی سرزمین فرزندانِ توحید پر تنگ کر دی گئی تو مولانا ان برگزیدہ نفوس میں تھے، جو دشمنانِ اسلام کے خلاف سینہ سپر ہو گئے اور ان کے خلاف بڑی پامردی کے ساتھ جہاد کیا۔ وہ۔ بھارتی پارلیمنٹ کے ممبر تھے اور کانگریس پارٹی کے رکن ہونے کے باوجود انہوں نے سی۔ پی۔ میں مسلمانوں پر جو قیامت گذری تھی نہ صرف اس کے خلاف آواز اٹھائی بلکہ موقع پر پہنچے اور مقامی حکام اور فرقہ پرستی کو پوری طرح بے نقاب کیا۔

مولانا حفظ الرحمان مجاہد ہونے کے علاوہ ایک بلند پایہ مصنف بھی تھے۔ انہوں نے اسلامی موضوعات پر چند نہایت عمدہ کتابیں تصنیف کی ہیں۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دیں۔

انجام کراچی

افسوس ہے کہ مسلمانان ہند کے مشہور رہنما اور جمعیۃ علماء ہند کے ناظم اعلیٰ جناب مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے دار فانی سے منہ موڑ کر سفر آخرت اختیار فرمایا۔

انا للہ وانا الیہ راجعون ط

مولانا مرحوم عرصہ سے مرض سرطان میں مبتلا تھے دہلی اور بمبئی میں جب تجربہ کار ڈاکٹروں کی بہترین کوششیں مرض پر قابو نہ پاسکیں تو مولانا علاج کی غرض سے امریکہ تشریف لے گئے وہاں ایک مشہور ہسپتال میں کئی ماہ تک زیر علاج رہنے کے بعد جب مولانا ہندوستان واپس آئے تو شدید ضعف (نقاہت) کے سوا کوئی علامت مرض ظاہر نہ ہوتی تھی۔ اور عام توقع یہی تھی کہ مولانا کی صحت بہت جلد اگر کلی طور پر نہیں تو بڑی حد تک ضرور بحال ہو جائے گی۔ روزنامہ الجمعیۃ میں مولانا کی رفتار صحت کے متعلق جو اطلاعات شائع ہوتی تھیں وہ بھی امید افزا تھیں۔ چنانچہ الجمعیۃ مورخہ ۳۰ جولائی کا جو پرچہ ہمیں ۴ اگست کو ملا اس کی عبارت حسب ذیل ہے۔

مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب مدظلہ کی طبیعت پہلے کے مقابلے میں آج بھی نسبتاً بہتر رہی صبح کے وقت طبیعت بحال تھی مگر گرمی اور حبس کی شدت کے باعث ٹمپریچر بڑھ گیا۔ شام کو حالت بہتر رہی اور بات چیت کرتے رہے مخلص اور ہمدرد حضرات دعا فرماتے رہیں کہ خداوند پاک حضرت مجاہد ملت کو شفائے کاملہ و عاجلہ عطا فرمائیں۔ (آمین) افسوس ہے کہ معاصر "الجمعیۃ" کی یہ اطلاع پڑھ کر ہم ابھی دل ہی دل میں خوش ہو رہے تھے اور حضرت مولانا کے لئے شفائے کاملہ و عاجلہ پر سچے دل سے آمین کہنے ہی والے تھے کہ اے پی پی نے ٹیلی پرنٹر پر یہ المناک خبر سنائی کہ دنیائے اسلام ایک بلند پایہ عالم دین کے سایۂ کرم سے محروم ہو گئی وہ ہستی اٹھ گئی جس نے حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ۔ مولانا حسین احمد مدنی اور مولانا احمد سعید کے بعد جمعیۃ علماء ہند کی رونق برقرار رکھی تھی۔ وہ جانباز بہادر سپاہی دنیا سے رخصت ہوا۔ جو ہندوستان کی جنگ آزادی میں گاندھی اور نہرو کے دوش بدوش تھا وہ شکل نورانی پردہ اجل میں پنہاں ہو گئی۔ جو مسلمانوں کے لئے نور امید تھی۔ مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی عالم فانی کی کرشمہ سازیوں کی خلعت سے ٹھکرا کر عازم باغ بہشت ہوئے۔ اور ملت اسلامیہ ہند حقیقی معنے میں یتیم ہو گئی تقسیم سے بیشتر مولانا سے ہمارے شدید سیاسی اختلافات رہے مگر یہ اعتراف نہ کرنا بددیانتی ہے کہ مولانا مرحوم نے تقسیم ہند کے بعد مسلمانوں کی جو خدمات انجام دیں۔ وہ ناقابل فراموش ہیں چونکہ جنگ آزادی کے سلسلہ میں ان کی بیش بہا قربانیوں کا اعتراف کانگریس کے بھی ارباب اقتدار کو تھا اور خود وزیر اعظم پنڈت نہرو بھی مسلمان رہنماؤں میں مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کے بعد سب سے زیادہ مولانا حفظ الرحمٰن کی عزت کرتے تھے اس لئے اعلیٰ سرکاری حلقوں میں ان کا اثر و رسوخ بہت کچھ مسلمانوں کے کام آجاتا تھا۔ مولانا حفظ الرحمان کی وفات ایک بہت بڑا سانحہ اور درحقیقت مسلمانان ہند کی بدنصیبی کا دوسرا نام ہے جس کا ماتم جتنا بھی کیا جائے کم ہے ہم اس سانحہ عظیم پر تہ دل سے مغموم ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ مولانا حفظ الرحمٰن مرحوم کو ان کی دینی و ملی خدمات کے صلہ میں باغ فردوس اور مسلمانان ہند کو نعم البدل عطا فرمائے (آمین)

"تاجر" راولپنڈی

مشہور عالم دین اور بے بس بھارتی مسلمانوں کے بیباک ترجمان مولانا حفظ الرحمٰن ایک طویل جدوجہد اور علالت کے بعد اس جہان فانی سے رحلت کر گئے۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

مولانا کی ذات محتاج تعارف نہیں۔ ان کی سیاسی پالیسی سے ہزار اختلاف سہی اور تقسیم سے قبل مرحوم نے جو کچھ بھی کہا اس سے برصغیر کے مسلمانوں نے مکمل طور پر ان سے اختلاف کیا۔ لیکن آزادی کے بعد انہوں نے پر آشوب دور میں مسلمانان ہند کی جس بے باکی سے خدمت کی ہے۔ اور ان کے حقوق کی حفاظت کے لئے جہاد کیا ہے۔ اس کی مثال شاذ و نادر ہی ملتی ہے۔

مولانا کی وفات حسرت آیات سے بھارتی مسلمان اپنے بیباک اور مخلص ترین ترجمان سے محروم ہو گئے ہیں۔ اور اس المناک حادثے پر ہمیں مولانا کے متعلقین کے ساتھ ہی ساتھ بھارتی مسلمانوں سے بھی دلی ہمدردی ہے۔

آسماں تیری لحد پہ شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

آفاق لاہور

جمعیۃ علماء ہند کے سکریٹری اور بھارتی مسلمانوں کے حقوق و مفادات کے تحفظ کے علمبردار مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی اچانک اپنے لاکھوں مداحوں کو داغ مفارقت دے گئے انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مولانا کی عمر کوئی ایسی زیادہ نہ تھی مرحوم نے حیات مستعار کی صرف باسٹھ بہاریں دیکھی تھیں اور ان کا عزم

ولولہ اور جوش و خروش دیکھ کر کسی کو گمان تک نہ تھا کہ بھارتی مسلمانوں کا یہ محبوب قائد اس قدر جلد انہیں خارزار سیاست میں یکہ و تنہا چھوڑ جائے گا۔ حال ہی میں جب وہ علاج کے بعد امریکہ سے واپس آئے تو خاصے صحت مند معلوم ہوتے تھے لیکن کسے خبر تھی کہ مریض غم کے جسم کی یہ تابانی چراغ آخر شب کی آخری جھلملاہٹ ثابت ہوگی۔ مولانا، بھارتی مسلمانوں کے سرد و گرم چشیدہ اور آزمودہ رہنما تھے۔ انہوں نے ۱۹۲۱ء میں میدان سیاست میں قدم رکھا اور اپنی مستعدی اور جوش کرداری کی وجہ سے جلد ہی سیاسی حلقوں میں انہیں ایک ممتاز مقام حاصل ہوگیا۔ مولانا نے تحریک خلافت میں بھی سرگرم حصہ لیا اور اس کے بعد سیاست ان کا جزو زندگی بن گئی تھی۔ برصغیر کی آزادی اور بالخصوص مولانا ابوالکلام آزاد کے انتقال کے بعد ان کی شخصیت مرجع خلائق بن گئی تھی۔ مرحوم نے پارلیمنٹ کے اندر اور پارلیمنٹ کے باہر بھارتی مسلمانوں کی نہایت بے جگری اور دردمندی کے ساتھ ترجمانی کی اس وقت مسلمانوں کو ایسے مخلص اور بیباک رہنما کی اشد ضرورت تھی۔ ان کی موت بھارتی مسلمانوں کے لئے ایک ناقابل تلافی نقصان ہے اور اس سے ایک ایسا خلاء پیدا ہوگیا ہے جس کے مستقبل قریب میں پُر ہونے کی امید نظر نہیں آتی۔ (آفاق لاہور)

وفاق لاہور

برصغیر ہند و پاکستان کے مسلمانوں کے لئے مولانا حفظ الرحمن کے انتقال کی خبر بے حد المناک ہے۔ مولانا حفظ الرحمن جو ایک طویل مدت سے پیٹ کے سرطان میں مبتلا تھے، جمعرات کو دہلی میں انتقال فرما گئے۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

مولانا حفظ الرحمن نے تقسیم ملک کے بعد بھارت کے مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے جو جدوجہد کی۔ اسے بھارتی مسلمان کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ مولانا حفظ الرحمان کا وجود بھارتی مسلمانوں کے حوصلے بڑھاتا تھا۔ اور ان کی ناامیدی اور مایوسی دور کرتا تھا۔ مولانا حفظ الرحمن کی موت بھارتی مسلمانوں کے لئے بہت صدمہ کا باعث ہوگی انہوں نے مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے میدان میں گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ ہم اس صدمہ میں اپنے مسلمان بھائیوں کے شریک غم ہیں اور مرحوم کی مغفرت کے لئے دعا کرتے ہیں۔

امروز لاہور

تحریک آزادی کے صف اوّل کے رہنما، ہندوستان کے مسلمانوں کے درد مند غمخواہ مولانا حفظ الرحمن دو اگست کی صبح کو تین بجے کے قریب رحلت فرما گئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ آپ ہندوستانی پارلیمنٹ کے رکن اور جمعیت علمائے ہند کے جنرل سکریٹری تھے۔ مولانا حفظ الرحمن ۱۹۰۱ء میں سیوہارہ (بجنور) میں پیدا ہوئے۔ دینی علوم کی تکمیل کی اس زمانے میں برصغیر میں آزادی کی تحریک زوروں پر تھی، دوسرے علماء کی طرح آپ نے بھی آزادی وطن میں مقدور بھر حصہ لیا۔ ابھی آپ کی عمر بیس برس کے لگ بھگ ہی تھی کہ تحریک خلافت سے منسلک ہوگئے۔ اور پھر آزادی کی راہ میں طرح طرح کی صعوبتیں برداشت کیں۔ کئی بار گرفتار ہوئے اور قید و بند میں مبتلا ہوئے لیکن کسی مرحلہ پر بھی اُن کے پائے ثبات میں لغزش نہ آئی آپ کا شمار ہندوستان کے سرکردہ کانگرسی رہنماؤں میں ہوتا تھا۔ آزادی کے بعد آپ نے ہندوستانی مسلمانوں کے حقوق و مفادات کا بیڑہ اٹھایا اور اس سلسلہ میں آخر دم تک اپنے فرائض انجام دیتے رہے۔ گذشتہ برس آپ نے نئی دہلی میں مسلمانوں کا ایک کنونشن طلب کیا تھا۔ جس میں مسلمانوں کے مسائل پر غور کیا گیا اور حکومت ہند پر زور دیا گیا کہ مسلمانوں سے جو مسلسل ناانصافی کی جا رہی ہے اور اُن کے حقوق و مفادات کو جس طرح پامال کیا جا رہا ہے۔ اس کا سدباب کیا جائے اور انہیں آزاد شہریوں کی طرح زندگی بسر کرنے کے مواقع مہیا کئے جائیں۔ مولانا مرحوم کو پھیپھڑوں کا سرطان ہوگیا تھا۔ دہلی اور بمبئی کے مشہور ڈاکٹروں کے علاج سے افاقہ نہ ہوا تو احباب کے اصرار پر امریکہ گئے۔ اور وہاں کے ایک بڑے ہسپتال میں کئی ماہ تک زیر علاج رہے۔ جب آپ ہندوستان واپس آئے تو ضعف و نقاہت کے سوا مرض کی کوئی علامت ظاہر نہ ہوتی تھی اور عام خیال یہی تھا کہ خدا کو منظور ہوا۔ تو آپ بہت جلد شفا یاب ہو جائیں گے۔ "الجمعیۃ" آپ کی بحالی صحت کے بارے میں برابر اطلاعات مہیا کرتا رہا۔ جو امید افزا تھیں لیکن یکایک اُن کی حالت خراب ہوگئی اور آپ اس دار فانی سے کوچ کر گئے آپ کے پسماندگان میں ایک بیوہ، ایک لڑکا اور ۵ لڑکیاں ہیں۔

قطعہ تاریخ وفات حضرت مجاہد ملت علیہ الرحمۃ

افتخار جماعت علماء — حفظ رحمٰں، گذشت صد افسوس

گفت راغب بمژدہ ہاتف — للہ الحمد رفت در فردوس

۸۲ ھ ۱۳

از جناب حکیم سید نور العین حسن راغب بھیاروی۔ (علیگڈھ)

ہفت روزہ الاعتصام لاہور

یہ خبر ہم نے انتہائی حزن وملال کے ساتھ سنی کہ ۲ راگست ۱۹۶۲ء کو مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی ۶۲ سال کی عمر پاکر انتقال کر گئے۔

مولانا حفظ الرحمان جنہیں مرحوم لکھتے وقت قلم کا کلیجہ شق ہوتا ہے۔ جمعیۃ علمائے ہند کے ناظم اعلیٰ اور ہندوستان کی پارلیمنٹ کے رکن تھے۔ وہ ہندوستان کے مسلمانوں کے نہایت مخلص خادم تھے، اور اپنے ملک کی معروف اور نیک نام شخصیت تھے۔ مرحوم کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ ہندوستان کے گذشتہ انتخابات کے موقعہ پر اپنے حلقہ سے سیکڑوں میل دور بمبئی کے ایک ہسپتال میں بیمار پڑے تھے اور ایک دن کے لئے بھی اپنے حلقہ انتخاب میں نہیں جا سکے تھے۔ مگر جب نتیجہ نکلا تو کئی کئی ہزار ووٹ کے فرق سے ان کے حریف شکست کھا چکے تھے۔ اور بعض کی ضمانتیں بھی ضبط ہو گئی تھیں۔ وہ کئی ماہ سے بیمار تھے اور ہر شخص ان کی بیماری سے پریشان اور ان کی صحت کے لئے اللہ کے حضور دست بدعا رہتا۔ ڈاکٹروں کی تشخیص کے مطابق انہیں پھیپھڑے کے سرطان کا خطرناک مرض لاحق ہو گیا تھا ابتداء میں وہ بمبئی کے ایک ہسپتال میں تجربہ کار اور مشہور ڈاکٹروں کے زیر علاج رہے، اس کے بعد ان کے احباب اور مخلصین کے اصرار سے انہیں امریکہ بھیجا گیا، اور وہاں کے نامور ڈاکٹر پوری توجہ اور انہماک سے ان کے علاج میں مصروف رہے۔

وہ چند ہفتے قبل امریکہ سے دہلی آئے تھے، ان کی بیماری کے بارہ میں جو خبریں ہندوستان کے اخبارات میں آرہی تھیں، وہ پریشان کن تو تھیں لیکن اتنی تشویشناک نہیں تھیں۔ ان کی خبر وفات ایک طرح سے ہمارے لئے ناگہانی تھی، اور اسی بنا پر قلبی و ذہنی طور پر بہت ہی اذیت کا باعث بنی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

ہندوستان کے مسلمانوں کو آزادی کے بعد ایک تسلسل اور تواتر کے ساتھ جو تکلیفیں پہنچی ہیں ان میں ایک بہت بڑی تکلیف یکے بعد دیگرے مسلمان قائدین کی وفات کی تکلیف ہے۔ مولانا مفتی کفایت اللہ، مسٹر آصف علی مسٹر رفیع احمد قدوائی، مولانا احمد سعید، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا ابوالکلام آزاد وہ عظیم شخصیتیں تھیں جو ہندوستان پر اپنا ایک خاص اثر رکھتی تھیں۔ اور جن کے انتقال سے مسلمانوں کو عظیم صدمہ پہنچا، انہیں اونچے درجے کے رہنماؤں میں مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی کا نام نامی بھی تھا۔ بلکہ جہاں تک ہمارا تاثر ہے اس کی رو سے کہنا چاہیئے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کے ممتاز اور عظیم راہنما ایک حیثیت سے صرف مولانا حفظ الرحمن مرحوم ہی تھے۔ اس لئے کہ یہ سرکاری مجبوریوں سے آزاد تھے۔ اور ان کا تعلق بغیر کسی واسطے کے براہ راست عوام سے تھا۔ مسلمانوں کو ہندوستان کے جس مقام پر بھی کوئی تکلیف پہونچتی، یہ اپنے آپ کو تکلیف میں ڈال کر فوراً وہاں پہونچتے اور تمام حالات کا جائزہ خود لیتے اور حکومت اور سیاسی لیڈروں سے مل کر اس کا کوئی مناسب حل تلاش کرتے۔ مرحوم انتہائی محنتی، مستعد، حق گو اور بہادر رہنما تھے اور سیاسی ہونے کے باوجود اللہ نے ان کو اخلاص اور دردمندی کی نعمت سے پوری طرح نوازا تھا۔ آزادی کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں کی جو خدمت جس تگ و دو اور شجاعت کے ساتھ انہوں نے کی اس کی نظیر نہیں ملتی اس قسم کے بے ریا اور بے لوث راہنماؤں کی ہندوستان کو اس دور میں سخت ضرورت تھی۔ یہ اس وقت اللہ کو پیارے ہوئے ہیں جبکہ اس دنیا والوں کو ان کی شدید ضرورت تھی"

ان کے گوناگوں اوصاف کی وجہ سے حکومت بھی ان سے بہت متاثر تھی۔ ہندوستان کی مختلف جماعتوں کے لیڈر بھی ان کا احترام کرتے اور ان کی بات کا وزن محسوس کرتے تھے۔ وہاں کے تمام طبقوں کے عوام بھی ان کی قدر کرتے اور ان کی مخلصانہ خدمات کی وجہ سے ان سے تعلق خاطر رکھتے تھے۔

ان میں ایک خوبی یہ تھی کہ یہ بہت بڑے عوامی لیڈر اور شعلہ نوا خطیب ہونے کے ساتھ ساتھ عالم دین اور بہترین مصنف بھی تھے۔ متعدد علمی کتابوں کے مصنف تھے۔ قصص القرآن، فلسفۂ اخلاق اور اسلام کا معاشی نظام وغیرہ ان کی مشہور تصنیفات ہیں۔ جو نہایت محنت اور تحقیق سے لکھی گئی ہیں۔

ان سطور کے راقم کو ان کو قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا پہلی دفعہ موقع ستمبر ۱۹۴۵ء میں ملا، یہ وہ زمانہ تھا جب کہ دوسری جنگ عظیم ختم ہو چکی تھی، اور اتحادی طاقتیں فاتح کی حیثیت اختیار کر چکی تھیں۔ ہندوستان کی آزادی کا وقت قریب آگیا تھا۔ اور ملک کی مختلف سیاسی جماعتیں میدان انتخاب میں اترنے کے لئے کمربستہ ہو رہی تھیں اس دور میں جمعیۃ علماء ہند نے نیشنلسٹ مسلمانوں کی ایک میٹنگ بلائی تھی جس کا مقصد گذشتہ واقعات کا جائزہ لینا اور آئندہ کے لئے لائحہ عمل مرتب کرنا تھا۔ نیز اس میں اس مسئلہ کو زیر بحث لانا مقصود تھا کہ انتخابات میں حریت پسند مسلمانوں کو کیا قدم اٹھانا چاہیئے۔

اس میٹنگ میں اپنے علاقہ کے نمائندہ کی حیثیت سے ان سطور کا راقم بھی مدعو تھا۔ یہ میٹنگ جس میں ہندوستان کی تمام آزادی خواہ جماعتوں کے رہنما شریک تھے کئی روز جمعیۃ علماء ہند کے مرکزی دفتر میں جاری رہی۔ اس زمانہ میں مولانا مفتی کفایت اللہ (مرحوم) جمعیۃ علماء کی صدارت سے اور مولانا احمد سعید (مرحوم) نظامت اعلیٰ سے الگ تھے۔ مگر اس میٹنگ میں شریک تھے، ان کے بجائے مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) صدر مولانا سید داؤد غزنوی نائب صدر اور مولانا حفظ الرحمان بحیثیت ناظم اعلیٰ کے جو عظیم ذمہ داریاں عائد تھیں ان کو وہ حسن و خوبی کے ساتھ انجام دے رہے تھے اور اس میٹنگ میں ان کا کردار بہت ہی نمایاں تھا۔ ان کی تقریروں اور تحریروں سے سب لوگ خوش تھے۔ وہ جو بات کرتے تھے، نہایت صفائی اور سلجھاؤ سے کرتے تھے۔

اس کے بعد مارچ ۱۹۴۷ء میں جبکہ عبوری حکومت قائم ہو چکی تھی ہم چند آدمی ریاستی پرجا منڈل کے سلسلے میں ایک ضروری کام سے مولانا ابوالکلام آزاد کی خدمت میں دہلی گئے۔ اس اثناء میں مولانا حفظ الرحمٰن سے کئی دفعہ ملاقات اور گفتگو کا شرف حاصل ہوا۔ ان سے آخری ملاقات اگست ۱۹۴۶ء میں ہوئی ان دنوں ہندوستان کی ریاستوں کے سرکردہ مسلمانوں کا ایک اجتماع (عربک کالج، دہلی میں مسٹر منظور عالم وغیرہ نے بلایا۔ مسٹر منظور عالم آزادی سے قبل آل انڈیا اسٹیٹس مسلم لیگ کے صدر تھے۔ اس اجتماع میں راقم الحروف کو بھی ریاست فرید کوٹ کے نمائندہ کی حیثیت سے دعوت شرکت تھی۔ راقم کو اس اجتماع سے تو کوئی خاص دلچسپی نہ تھی! کیونکہ سیاسی طور پر راقم کا تعلق آل انڈیا ریاستی پرجا منڈل یا آل انڈیا اسٹیٹس پیپلز کانفرنس سے تھا۔ لیکن ان دنوں مولانا حفظ الرحمان صاحب مرحوم کی خدمت میں حاضری اور ان کے خیالات معلوم کرنے کا خاصا موقع ملا۔ وہ بڑا ہی ہنگامی دور تھا۔ مولانا مرحوم مسلمانوں کے بارے میں سخت پریشان تھے۔ بے شمار مسلمان جو آنے والے حالات سے خوف زدہ تھے، ان کے پاس آتے اور کام کراتے تھے، جو جہاں جانا چاہتے جاتا۔ وہ ہر ایک کا کام توجہ اور محنت سے انجام دیتے تھے۔ اس دوران میں معلوم ہوا کہ یہ شخص مسلمانوں کا کتنا ہمدرد اور کس قدر محنتی ہے۔

مولانا مرحوم بہت ہی خوبیوں کے مالک تھے۔ وہ جری اور بے خوف رہنما تھے۔ انگریز کے دور میں انھوں نے ہندوستان کی آزادی کی خاطر جو تکلیفیں برداشت کیں ان سے اتنے پریشان نہیں ہوئے ہوں گے جتنے وہ اب آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کے حالات سے متشوش اور پریشان تھے۔ یہی پریشانی اور بھاگ دوڑ ان کی بیماری کا باعث بنی اور ہندوستان کے مسلمانوں کی خدمت کا جذبہ صادق ہی انہیں موت کے آغوش میں لے گیا۔

ان کے انتقال سے ہندوستان کے مسلمان ایک بہت بڑے مخلص حق گو اور سنجیدہ عزم و فکر کے مالک رہنما سے محروم ہو گئے ہیں۔ ان کی موت ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے قلق و اضطراب کا موجب ہوگی لیکن اللہ کی مشیت کے سامنے کوئی دم نہیں مار سکتا۔ وہ اپنی مصلحتوں کے مطابق جو کچھ کرتا ہے ٹھیک ہی کرتا ہے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالےٰ مولانا مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور ان کے پس ماندگان کو جس میں ان کے اہل خانہ ہی نہیں ہندوستان کے تمام مسلمان شامل ہیں، صبر کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

ایشیا، لاہور

مولانا حفظ الرحمٰن سکریٹری جمعیت علماء ہند رکن پارلیمنٹ بھارت کی وفات کا سانحہ المیہ بھارت کے مسلمانوں کے لئے ایک عظیم ترین حادثہ ہے۔

مولانا حفظ الرحمٰن مرحوم نے عنفوان شباب ہی میں جب کہ وہ ابھی دارالعلوم دیوبند کے طالب علم تھے اپنے لئے مستقبل کی راہ زندگی کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اور وہ جہاد وطن کے بے باک سپاہی بن گئے تھے۔ تقسیم ہند کے وقت تک وہ زیادہ نمایاں نہ ہوئے۔ وہ مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے دست راست اور وفادار اسسٹنٹ تھے۔ لیکن تقسیم کے بعد ان کی سرگرمیوں کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا تھا۔ وہ ایک طرف کانگریس کے معتمد علیہ تھے دوسری طرف جمعیۃ علماء ہند کے جنرل سکریٹری تھے اور تیسری طرف وہ بھارت کے مسلمانوں کی مشکلات و مصائب میں سینہ سپر، بھارت کے کسی مقام پر مسلمانوں کے کانٹا بھی چبھتا تو وہ بے چین ہو جاتے اور ان کے حقوق اور عافیت کی حفاظت کے لئے اپنے کانگریسی ساتھیوں سے بھی لڑ جاتے۔ یہاں تک کہ ان کو فرقہ پرستی کا طعنہ بھی سننا پڑتا۔ تاہم کانگریس ہائی کمان ان کے خلوص حب وطن اور ملت پروری کی معترف تھی اور ان کے مشوروں کو بالعموم قبول کر لیتی تھی۔ ان کی بیماری میں بھارت کے مسلمانوں کے ہر طبقے نے جس طرح درد دل سے ان کے لئے دعائیں کی ہیں وہ ان کی ہمہ گیر محبوبیت کا نشان ہے۔ کئی برس سے وہ علیل رہنے لگے تھے۔ پچھلے سال ان کے پھیپھڑوں میں کینسر کا شبہ کیا گیا وہ بمبئی علاج کے لئے گئے ان کی عدم موجودگی میں ہی

انتخابات عام ہوئے اور ان کے مسلمان مخالفوں کی ضمانتیں ضبط ہو گئیں۔
اس کے بعد وہ امریکہ گئے کہ کینسر کا علاج کرائیں اور پچھلے دنوں ہی واپس آئے تھے
تاکہ اپنے وطن میں داعی اجل کو لبیک کہیں اور خاک وطن ہی میں دفن ہوں۔
انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اس حادثہ المیہ میں بھارت کی پوری
ملت اسلامیہ سے دلی ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں۔ مولانا کی موت علم عمل
حب وطن عشق آزادی اور دلسوزی ملت کی موت ہے۔ اللہ تعالیٰ ان
کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور ملت اسلامیہ بھارت کو صبر جمیل عطا
فرما کر ان کی خالی جگہ کو پر کرنے کا سامان کرے۔ (آمین)

ندائے ملت لکھنؤ

آل انڈیا ریڈیو کے ایک نشریہ سے معلوم ہوا کہ مجاہد ملت حضرت مولانا
حفظ الرحمٰن سیوہاروی کا آج صبح ۸ بجے طویل علالت کے بعد اپنے مکان پر انتقال
ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا جنگ آزادی کی ان منفرد شخصیتوں میں سے ایک تھے جن پر ہندوستان
کی آزادی کو بجا طور پر ناز رہے گا۔ مولانا حفظ الرحمٰن ہندوستان کے ان رہنماؤں
میں تھے جو بے تکان اور مسلسل کام کرنے میں اپنی مثال نہیں رکھتے تھے جن لوگوں
کو ان کی قربت حاصل رہی ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ مولانا کا کھانا پینا۔
اوڑھنا، بچھونا صرف خدمت ہو کر رہ گیا تھا۔

تقسیم ہند کے وقت جب دہلی سلگ رہا تھا۔ مولانا اپنی جان کی
بازی لگائے ہوئے ان محلوں اور گلیوں میں ایک نڈر مجاہد کی طرح ادھر سے
ادھر دوڑتے پھر رہے تھے۔ اور مسلمانوں کو مخدوش علاقوں سے نکال کر محفوظ
مقامات پر پہونچانے کے انتظامات میں مصروف تھے۔

وہ اس سلسلہ میں کبھی گاندھی جی سے ملتے کبھی پنڈت نہرو سے کبھی مولانا
آزاد سے ملتے کبھی سردار پٹیل سے امن وامان کی فضا کو قائم ہو جانے کے بعد
بھی مولانا کا کام ختم نہیں ہوا۔ اور وہ بہت سی مکانات کی واگذاشت مساجد
کے تخلیہ جائدادوں کی واپسی میں ستم رسیدہ مسلمانوں کے اہم مسائل اور
ہزاروں مسئلوں میں منہمک ہو گئے۔ مولانا کی علمی خدمات میں ان کی کتابیں
قصص القرآن اسلام کا اقتصادی نظام اور فلسفۂ اخلاق خاص
طور پر یاد کی جاتی رہیں گی۔

حضرت مولانا کافی عرصہ سے کینسر جیسے مہلک مرض میں مبتلا
تھے اور اپنے الیکشن کے ایام میں بھی صاحب فراش رہے۔ دوران علالت
حضرت مولانا نے ایک خواب دیکھا جس کا مفہوم یہ سمجھا گیا کہ اب مرض دوا علاج
کی گرفت سے باہر ہو چکا ہے۔ اور مولانا صرف دعا کے سہارے زندہ
ہیں۔ اس خواب کا اکثر اخبارات میں ذکر آ چکا ہے۔ مولانا کو دہلی کے معالجین
نے باصرار امریکہ بغرض علاج بھیجا جہاں سے کیفیت مزاج کی اطلاع آتی
رہی اور مولانا کی صحت کی خبروں سے قلب میں ایک سکون محسوس ہونے لگا
امریکی معالجین نے اپنا کورس پورا کرنے کے بعد حضرت مولانا کو
وطن واپسی کی اجازت دیدی اور حضرت مولانا ۱۲ جولائی بروز جمعرات
صبح ساڑھے پانچ بجے دہلی تشریف لے آئے۔

واضح رہے کہ یوپی میں سہ لسانی فارمولے کے اجراء کی خبر مولانا
کو امریکہ میں ہی ملی۔ آپ نے وہیں سے وزیر اعلیٰ سی بی گپتا کو ایک خط لکھ کر
اس فارمولے سے اردو اور مسلمان بچوں پر پڑنے والے مضر اثرات
کی نشاندہی فرماتے ہوئے لکھا کہ آپ تیسری زبان اردو کو ہی قرار دیں۔
اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا ہندوستان اور ہندوستانی مسلمانوں کے
کسی بھی مسئلے سے آخر تک بھی غافل نہیں رہے۔ مولانا نے اپنے پسماندگان
میں اہلیہ محترمہ ایک صاحبزادے اور ۵ صاحبزادیاں چھوڑی ہیں۔

دعا ہے کہ اللہ غفور الرحیم حضرت مجاہد ملت کو کروٹ کروٹ
جنت نصیب فرمائے اور درجات بلند فرمائے۔ نیز پسماندگان کو صبر
جمیل اور امت مسلمہ کو مولانا کا نعم البدل عطا فرمائے۔ (آمین)

صدق جدید لکھنؤ

پرچہ پریس میں جا رہا تھا۔ اور سب نوٹ لکھے جا چکے تھے کہ دہلی سے اس
حادثہ کی خبر آگئی جو حادثہ عظیم کسی ایک خاندان یا ایک برادری کے لئے
نہیں بلکہ ہندوستان کی ساری ملت اسلامی کے لئے ہے اور خود ملک ہندوستان
کے لئے ہے۔

مولانا حفظ الرحمٰن مرحوم ایک ہی وقت میں پختہ مسلمان بھی تھے اور پر جوش
نیشنلسٹ بھی، وطن کی خدمت میں پورے انہماک کے باوجود کسی طرح اپنی
ملت اور اپنے عقائد پر زد آنے کے وہ روادار نہ تھے۔ اردو کے مقدمہ
اور چھوٹے بڑے بیسیوں پچاسوں معاملوں کو جس جرأت وہمت اور ساتھ
ہی خوش تدبیری اور سوجھ بوجھ کے ساتھ انھوں نے پیش کیا وہ انھیں
کا حصہ تھا اور تنظیم وفعالیت کے تو گویا بادشاہ تھے۔ مسلمانوں کے
عام قومی مزاج کے برخلاف وہ باتیں کم کرتے اور کام زیادہ اور ہر وقت

مشغول عمل ہی رہا کرتے۔ ایک زمانہ میں صاحب قلم تھے اور علمی دینی رنگ کی
تصنیف و تالیف میں لگے رہتے۔ لیکن اب عملی کاموں کی اہمیت نے برسوں سے
ان مشغلوں کو دشوار کر رکھا تھا۔ اب وہ "مجاہد ملت" رہنما نہیں - واقعہ کے
لحاظ سے تھے ۔ ہر ایک کے ہمدرد و خدمت گذار تھے ۔ اور بڑے منکسر
متواضع اور مہمان نواز۔ اللہ بڑے بڑے درجات سے سرفراز فرمائے
تدفین کے لئے بابرکت شب جمعہ ملی۔

ہفت روزہ پیام مشرق دہلی

قدرت کی ان ڈھکی مصلحتوں کے آگے سر جھکانا ہمارا ایمان ہے اور
ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ تخریب سے تعمیر ہوتی ہے۔ لیکن سراپا عجز و نیاز بن کر مولانا
کی جناب میں یہ کہنے کو بے اختیار جی چاہتا ہے کہ چند کروڑ ہندی مسلمانوں
اور کروڑوں ہندوستانیوں کی روحیں قبض کرلی ہوتیں لیکن ایک روح ان
کے عوض بخش دی جاتی جو روح اعظم تھی اور جس کا نام حفظ الرحمن تھا۔
مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسین احمد مدنی جناب رفیع احمد قدوائی
کی موتوں پر ہم نے صبر کیا۔ لیکن آج مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمن کی موت
پر صبر کہاں سے لائیں ملت لٹ گئی ہندوستان کی قومی مجلسیں سونی ہوگئیں۔
اور رزم و بزم کا وہ شبیر جس کی گرج نے کم و بیش چالیس سال تک باطل کو
لرزایا ہم سے چھن گیا۔ آج اس کی اور اس کے کارناموں کی یاد باقی ہے۔

اک تیر ایسا سینہ میں مارا کہ ہائے ہائے

جب "پیام مشرق" کی یہ عادت ہوگئی تھی کہ مولانا حفظ الرحمن زندہ
باد کا نعرہ دل کی گہرائیوں سے بلند کیا کرتا تھا، آج اس کا حفظ الرحمن ابدی
نیند سو رہا ہے۔ اس کے سیاسی خیالوں اور خوابوں کا سر دو داغ مفارقت
دے چکا ہے۔ ہم کہاں اور وہ کہاں؟

آج اس درد کی دوا کیا ہے۔

مولانا حفظ الرحمن کا پیام مشرق اور پیام مشرق والوں سے تعلق
اغراض کی بناء پر نہیں تھا، عالم آب و گل کا واسطہ نہیں تھا، بلکہ معنویات
کی دنیا کا رابطہ استوار تھا۔ فکر کا ایک موضوع چھن گیا، قلم کار کا ایک
جلی عنوان مٹ گیا۔ بات یہ نہیں تھی کہ مجاہد ملت نے ہم پر انعام و اکرام کی
کوئی بے پناہ بارش کی ہو بلکہ بات فقط اتنی تھی کہ ان کا کردار، ان کا غصہ
ان کی برہمی، ان کی تندی، ان کی نرمی، غرضیکہ ان کی ہر ادا ہمیں پیاری
لگتی تھی، اس پیار میں اخلاص کارفرما تھا، بے ریا تھا، مدت کی رات
کو مولانا نے جب اشارہ سے اپنے پاس بلایا۔ تو یہ اشارہ ہی دل میں بس گیا، ہر
وقت محسوس ہوتا ہے کہ عالم ارواح سے کوئی سعید روح اشارہ کر رہی ہے۔

ان کے جو ساتھی تھے ان کا تو کہنا ہی کیا، انہیں مولانا کن کن موقعوں پر یاد
آئیں گے لیکن جن لوگوں نے مولانا کی بزم آرائیاں دیکھی ہیں ان کے تیور یاد آئیں
گے۔ مولانا حفظ الرحمن کو ہم بہت دنوں سے جانتے ہیں لیکن حق یہ ہے کہ
۱۹۴۷ء کے بعد انہیں پہچاننے کا موقع ملا۔ امیر و غریب کا ان کے یہاں کوئی
امتیاز نہ تھا۔ پارٹی اور جماعت کا کبھی کوئی فرق نہ تھا۔ بلا امتیاز مذہب و ملت
مدد کریں گے بے دھڑک اور بے تحاشا مدد کریں گے۔ کبھی معتبر کارکنوں کو
ارباب اقتدار کے یہاں بھیج رہے ہیں، کبھی جیپ میں کبھی تانگے پر کبھی پیدل،
مدد ضرور ہوگی، چاہے جس حال میں ہو اور جس حیثیت پر ہو لاکھوں آنکھیں آج
بے سبب اشکبار نہیں ہیں کہ ان کا غمگسار نہیں رہا۔ مولانا حفظ الرحمن کا بدل
پیدا ہوسکتا ہے لیکن وہ ہمدردیاں، وہ محبت، وہ اخلاص، نازک موقعوں
پر آڑے آنے کی ادا شاید پیدا نہیں ہوگی۔

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

لوگوں نے مولانا کو شاید کانگرسی حکومتوں کا نیاز مند ازلی سمجھا ہو، لیکن ہم نے
اپنے کئی سال کے صحافی تجربوں میں ایسا حق گو، ایسا بیباک، ایسا نڈر لیڈر
نہیں دیکھا۔ جو علانیہ تو بہت محتاط تھا لیکن تخلیوں میں اتنا ہی غیر محتاط تھا
الفاظ بھی تند ہیں، تیور بھی بگڑے ہوئے ہیں، ہونٹ بھی تھرتھرا رہے ہیں،
آواز بھرائی ہوئی ہے لیکن کہیں گے وہی جو انہیں کہنا ہے اور کمال یہ کہ جب گفتگو
ختم ہوئی تو تلخی نام کو نہیں، قلب آئینہ تھا۔ جیسے مومن کا قلب آئینہ ہوتا ہے۔
پیارے نبیؐ کے نام لیوا جو تھے۔ اسلامی روایات کی آغوش میں جو پلے تھے۔
مجاہد اور مومن کی شان اس بیسویں صدی میں مجاہد ملت، مجاہد وطن مولانا حفظ الرحمن
کی تھی ۱۹۴۷ء کے بعد ہندوستان کے سیاسی معتقدات کا زہر پھیلا، لیکن کوئی
بتا دے کہ ہندی مسلمانوں کی تمام محرومیوں، مجبوریوں کے باوجود مولانا حفظ الرحمن
نے کبھی کوئی زہریلی بات کہی ہو۔ انتہائی غصہ کی حالت میں بھی کسی فرقہ کی دل آزاری
کی ہو، اس کے مذہبی جذبات کو ٹھیس لگائی ہو۔ مولانا حفظ الرحمن آغاز کار سے
ہندو مسلم اتحاد کے علمبردار تھے، اور آخری سانس تک علمبردار رہے ان کی
روح پاک ان کا شعور بالغ ان کی نظر پاک، ان کا کردار بلند، کوئی ہے مولانا
کی ہمسری کا دعویٰ کرنے والا۔

"پچھلے دنوں ایک صاحب نے فرمایا کہ سیاست کے ایک جلسہ میں سرزار

پٹیل آنجہانی نے مسلمانوں کے متعلق کچھ نامناسب باتیں کہیں اور مولانا جلسہ میں موجود تھے خاموش رہے۔ ہم نے گذارش کی کہ مولانا کی سیاست دفاعی تھی اقدامی نہ تھی اور جب اقدام کا وقت آیا تو وہ مولا کو پیارے ہوگئے۔ لیکن اس سلسلہ کی جو بات کہنے کی تھی وہ یہ تھی کہ سردار پٹیل کی اصلاح میں اور ان کے انداز سیاست کی تردید میں مولانا نے جو رول ادا کیا وہ کسی لیڈر نے نہیں ادا کیا۔

ہم ایک بار پھر کہیں گے کہ ایک عوامی لیڈر کا رول مولانا نے پچھلے چودہ برسوں میں جو ادا کیا وہ کسی سے ادا نہ ہو سکا۔ مولانا ابوالکلام آزاد مفکر اور مدبر تھے مولانا حفظ الرحمٰن مجاہد اور مدبر تھے۔ ان میں مولانا جمال الدین افغانی کی فراست تھی، مولانا محمد علی مرحوم کا جوش و خروش تھے، حکیم اجمل خاں کی متھاس تھی۔ ڈاکٹر انصاری کا وہ سلیقہ تھا جو الجھے کاموں کے لئے ذرائع و وسائل فراہم کر لیتا تھا پنڈت نہرو اگر انقلاب پسند ہیں تو ان کی انقلاب پسندی کے لئے ماحول ساز گار تھا۔ مولانا اگر انقلاب پسند تھے تو ان کی انقلاب پسندی حالات کی نامساعدت کے باوجود تھی۔ سچی بات یہ ہے کہ ۱۹۴۷ء کے بعد مولانا جس حد تک انقلاب پسند رہے پنڈت نہرو بھی نہ رہ سکے یہ قطعاً احسان ناشناسی ہے کہ مسٹر سنجیوا ریڈی اور مسٹر سنجیویا تو آل انڈیا کانگریس کے صدر ہوں اور مولانا حفظ الرحمٰن صدر نہ ہوں مذہب و ملت کی تمیزیں انہی موقعوں پر دلوں کو برماتی ہیں اور محسوس ہوتا ہے کہ سیکولر ہندوستان کی نشوونما صحیح نہیں ہو رہی ہے۔

آہ مولانا حفظ الرحمٰن! آسمان آپ کی یاد میں خون کے آنسو بہائے گا۔ موجودہ اور آئندہ نسلیں آپ کی یاد میں روئیں گی۔ قوم قیامت تک آپ کو یاد کرے گی۔ ہندی مسلمان آپ کی جدائی پر سدا سوگوار رہیں گے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی موت کا ایک دنیا نے غم منایا لیکن ہمارا سرمایۂ تسکین یہ تھا کہ مولانا حفظ الرحمٰن زندہ ہیں اور ان کے دم سے قیادت کو چار چاند لگیں گے لیکن آج آپ کی وفات حسرت آیات کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد کی مفارقت کا زخم ہرا ہو گیا ہے۔ ماتم یہ ہے کہ چالیس سال تک جو رول مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا حفظ الرحمٰن نے ادا کیا وہ اب کون ادا کرے گا۔ کہاں سے لائیں گے ہم اس حفظ الرحمٰن کو جو یتیموں کا وارث، بیواؤں کا سہارا، غریبوں کا غمگسار، اپنے رفیقوں کا ہمدرد تھا۔ جمعیۃ علماء ہند کی پناہ گاہ ٹوٹ گئی۔ "دیو بندیت" اگر کسی مجاہدہ اور مقصد کا نام تھی، تو وہ آج بے بس ہے۔ دفتر کے ایک معمولی سے معمولی چپراسی کا دل بڑھانے والا نہ رہا، مسلمانوں کی اکھڑی ہوئی عوامی زندگی کو توانائی بخشنے والا نہ رہا۔ دنیا اس نام کو رو دے گی جو عظمت و جلال کا جلی عنوان تھا جس نے شبانہ روز کی محنت شاقہ سے ویرانوں میں آبادی کی شان پیدا کی تھی، تخریب میں تعمیر کا انداز پیدا کیا تھا، جو بیسویں صدی کا بہت بڑا مجاہد وطن اور مجاہد ملت تھا۔

اک حسرت تعمیر ابھی باقی ہے

اور ان حسرتوں کی داد آج کون دے گا، جو کام مولانا حفظ الرحمٰن یکا و تنہا کر لیتے تھے وہ بڑی بڑی فوجیں بھی نہیں کر سکتی تھیں۔

عالم باعمل ایسے کہ قومی زندگی میں شرعی مسائل کی بال کی کھال نہیں نکالی لیکن کیا وہی جو ایک عالم دین، ایک مفکر اسلام، ایک ہندوستانی کو کرنا چاہیے تھا نوجوانی میں ایک رنگ اختیار کرنا اور چالیس بیالیس سال تک اس رنگ کو کبھی بے رنگ نہ ہونے دینا مولانا حفظ الرحمٰن ہی کا مخصوص حصہ تھا۔ خطابت نے زور دکھایا تو آسمانوں سے چاند تارے نوچ لائے۔ پانی میں آگ لگائی۔ بھڑکتی ہوئی آگ پر پانی ڈالا اور مردوں میں جان ڈال دی، پارلیمنٹ میں تقریر کی تو ایسی کہ سند بن کر رہ گئی۔

ہم ایسے کو روتے ہیں جس نے قوم کو اپنا شباب دیا، اپنی پوری زندگی دی۔ کسی کی موت کے بارے میں اگر یہ کہہ سکتے ہیں کہ عوامی زندگی کے مجاہدوں نے اس کی زندگی مختصر کر دی۔ تو وہ مولانا حفظ الرحمٰن کی زندگی ہے جو عافیت کدوں سے بیزار تھی، میدانوں میں منزلیں طے کرتی تھی۔ بگولا ان کے اڑاتی تھی اور دنیا پر چھا جاتی تھی۔ طوفان کا مقابلہ کرنے والے ہندوستان میں پیدا ہوئے لیکن مولانا حفظ الرحمان نے طوفانوں کا مقابلہ جس عزم و استقلال سے کیا، وہ ایک تاریخ ہے اور اس تاریخ میں شرارے ہیں، انگارے ہیں، بے قراریاں ہیں تب و تاب جاودانہ ہے۔ مولانا حفظ الرحمٰن نے قوم کے لئے جو لازوال جائداد چھوڑی ہے وہ یہی تاریخ ہے

اللہ ان کا درجہ بلند کرے، ان کے پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق ارزانی فرمائے اور اس قوم کا حوصلہ بڑھائے جو فریادی ہے کہ ؎

دے داد اے فلک دل حسرت پرست کی
ہاں کچھ نہ کچھ تلافی مافات چاہیے

نقیب کو دکھ

نقیب کا یہ پرچہ مرتب ہو چکا تھا اور کاپی پریس کو جانے والی تھی کہ ابھی ابھی ڈیڑھ بجے دلی ریڈیو نے یہ روح فرسا خبر سنائی کہ امت کو جس مصیبت عظمیٰ کا کھٹکا تھا وہ ٹل نہ سکا اور موت کے بے رحم ہاتھوں نے اس قیمتی متاع کو اس سے چھین لیا جسے ہم مجاہد ملت کہتے تھے جس کا نام حفظ الرحمٰن تھا۔ جو تھا جمعیۃ علماء ہند کا ناظم

اور پارلیمنٹ کا ممبر لیکن اس کا اصل کام گزشتہ پندرہ برسوں سے یہ ہو گیا تھا کہ وہ امت کی مظلومی کو دنیا پر ظاہر کردے اور ظالموں سے بھرپور لڑائی کرے اعصابی جنگ کے اس دور میں امریکہ اور روس گولوں اور مشینوں کو حرکت نہیں دے سکتے بے چارا حفظ الرحمن یہ کیسے سوچ سکتا تھا لیکن اس ایٹمی دور میں اعصابی طریقہ جنگ جو رائج ہو گیا ہے اس کا کوئی داؤ اور کوئی پیچ اس نے نہیں چھوڑا جو اس نے ظالموں کے خلاف استعمال نہیں کیا ہو لیکن اس کی فوج بہت تھوڑی تھی اور شکستہ حال بھی وہ سترسال نہ ہوا وہ غم کھاتا رہا اور چلاتا رہا۔ ظلم کی ناؤ ڈوب کر رہے گی، مظلوموں کی آہ سے بچو۔ جس ملک کو اونچا کرنے کے لئے ہم نے گولیوں کے سامنے سینہ تان دیا۔ جس کی کوٹھری میں زندگی گزاری، اس ملک کو دنیا کے سامنے روسیاہ نہ کرو۔ وہ چیختا رہا چیختا رہا کسی نے نہیں سنا۔ آخر اس کے پھیپھڑے میں کینسر ہو گیا۔ وہ تڑپتا رہا، معالج ناکام رہے یہاں تک کہ اس کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ وہ بہادر تھا۔ وہ مخلص تھا وہ خدمت پر یقین رکھتا تھا۔ وہ حق بات کہنے سے کبھی نہیں جھجکا، اس کے دل میں کسی کے خلاف نفرت نہیں رہی اس نے کبھی آرام نہیں کیا۔ اب قوم مدتوں ماتم کرے گی، کف افسوس ملے گی، تلاش کرے گی حفظ الرحمن نہیں تو حفظ الرحمن کی طرح کوئی مل جائے۔ لیکن وہ اس کا سایہ بھی نہیں پائے گی حفظ الرحمن بارگاہ رب العزت میں پہنچ چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے مغفرت فرمادی ہے۔ وہ کہہ رہے ہیں یٰلیت قومی یعلمون بما غفرلی ربی وجعلنی من المکرمین۔ ترجمہ: اے کاش میری قوم جانتی کہ میرے رب نے مجھ کو بخشا اور مجھ کو عزت والوں میں بنایا۔ سورہ یٰسین۔

مولانا سے ایڈیٹر "نقیب" کے تعلقات ۱۹۳۵ء سے تھے جبکہ مولانا کا قیام کلکتہ میں تھا۔ مولانا کو وہ ایک رہنما، ایک استاد، ایک سرپرست ایک دوست سمجھتا تھا۔ مولانا سے اتفاق خیال بھی ہوا اور اختلاف خیال بھی لیکن ان کی یہ حیثیتیں اس کی نظروں میں نہیں بدلیں۔ کتنوں کا سہارا ٹوٹ گیا، ایک اس کا سہارا ٹوٹا تو کیا ٹوٹا۔ اللہ تعالیٰ نعم البدل عطا فرمائے (آمین)

ہماری زبان علی گڑھ

نئی دہلی ۲ اگست۔ جنگ آزادی کے زبردست مجاہد، ملک کے مقتدر لیڈر اور اردو کے پرجوش حامی مولانا حفظ الرحمن کا آج صبح فجر کے وقت نئی دہلی میں انتقال ہو گیا۔ ۵ بجے شام کو شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے جوار میں ان کو سپرد خاک کیا گیا۔

ہر آمد روزگارے ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید نہ آید

گزشتہ کئی مہینے سے مولانا کینسر کے مرض میں مبتلا تھے جس کا علاج کرانے وہ امریکہ بھی گئے تھے۔ اور حال ہی میں واپس آئے تھے۔ انتقال کے وقت ان کی عمر ۶۲ سال تھی۔

مولانا حفظ الرحمن ایک مخلص رہنما پایہ عالم زبردست مقرر اور اردو کے اچھے مصنف بھی تھے۔ ملک کے علمی، ادبی اور تعلیمی اداروں سے عموماً اور انجمن ترقی اردو ہند سے خصوصاً ان کو گہرا تعلق تھا۔

مولانا کے انتقال کی خبر سنتے ہی انجمن کے کارکنوں کا ایک فوری تعزیتی جلسہ ہوا، جمعیۃ علماء اور مولانا کے پسماندگان کے نام تعزیتی تار بھیجا گیا اور ان کے سوگ میں انجمن کا دفتر بند رہا۔

مختصر حالات زندگی

مولانا حفظ الرحمن ۱۰ جنوری ۱۹۰۱ء کو قصبہ سیوہارا ضلع بجنور میں پیدا ہوئے۔ اردو کے مشہور جوانا مرگ ادیب ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری کے وہ قریبی عزیز تھے۔ ابتدائی تعلیم سیوہارے ہی میں حاصل کی۔ پھر ملک کی مشہور انگریز دشمن دینی درسگاہ دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے۔ اور وہیں سے فضیلت کی سند لی۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد دارالعلوم دیوبند ہی میں مدرس ہو گئے۔ مدرسہ ڈابھیل (گجرات) اور مدرسہ عالیہ (کلکتہ) میں بھی کچھ عرصے تک استاد کے فرائض انجام دیتے رہے۔

ملک کو غلامی سے نجات دلانے کی تڑپ مولانا حفظ الرحمن کو وراثتاً ملی تھی دیوبند کی تعلیم نے ان کے پاک جذبے کو تیز کردیا۔ چناں چہ کم عمری ہی سے انھوں نے ملک کے سیاسی معاملات میں دلچسپی لینی شروع کردی تھی۔ خلافت کی تحریک سے ان کی عملی سیاسی زندگی کا آغاز ہوا۔ اسی تحریک کی راہ میں وہ کانگریس میں داخل ہوئے۔ گاندھی جی کی تمام تحریکوں میں پرجوش حصہ لیا۔ اور قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ سنہ ۱۹۳۷ء سے پہلے ہی وہ یوپی کی صوبائی کانگریس کے ممبر منتخب ہوتے اور مختلف عہدوں پر فائز رہے سنہ ۱۹۳۶ء سے اس وقت تک یوپی ہی سے وہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ممبر منتخب ہوتے رہے۔

جمعیۃ علماء ہند کے ابتدائی دور ہی سے مولانا حفظ الرحمن کو اس ادارے سے گہرا تعلق رہا تھا۔

سنہ ۱۹۳۲ء میں وہ جمعیۃ کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر اور سنہ ۱۹۴۲ء میں جنرل سکریٹری

منتخب ہوئے۔ زندگی کے آخری لمحے تک تن دہی و سرگرمی سے وہ اس عہدے کے فرائض انجام دیتے رہے۔

۱۹۴۶ء میں مولانا حفظ الرحمٰن یوپی اسمبلی کے ممبر، اور حصولِ آزادی کے بعد دستور ساز اسمبلی اور پارلیمنٹ کے ممبر منتخب ہوئے۔ دستور کے نفاذ کے بعد وہ امروہہ ضلع مرادآباد، کے حلقۂ انتخاب سے ہندوستان کی پہلی پارلیمنٹ کے ممبر چنے گئے اور آخری وقت تک اسی حلقہ انتخاب کی نمائندگی کرتے رہے۔

مولانا حفظ الرحمٰن کو سیاست کے ساتھ ساتھ ملک کے علمی، ادبی تعلیمی اور ثقافتی مسائل سے بھی گہری دلچسپی تھی۔ وہ ندوۃ المصنفین کے بانیوں میں سے تھے جو آج ملک کا مقتدر علمی ادارہ ہے۔ دارالعلوم دیوبند اور مختلف دینی مدارس کے علاوہ جامعہ ملیہ اسلامیہ اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے کورٹ اور ایگزیکٹیو کونسل کے بھی وہ ممبر تھے۔

اردو سے مولانا حفظ الرحمٰن کو قدرتی طور پر گہرا لگاؤ تھا۔ متعدد قابل قدر اردو کتابوں کے وہ مصنف بھی تھے۔ ان کی تصانیف میں اسلام کا اقتصادی نظام، قصص القرآن اور سیرۃ رسول قابل ذکر ہیں۔

مولانا حفظ الرحمٰن مرکزی انجمن ترقی اردو کی مجلس عاملہ اور اس کی مختلف کمیٹیوں کے سرگرم رکن تھے۔ اردو ہی کے سلسلہ میں انھوں نے بستر مرگ سے یوپی کے وزیر اعلیٰ کو سہ لسانی فارمولا کے متعلق ایک پر درد خط لکھا تھا انھوں نے اس خط کی ایک نقل وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کو بھی بھیجی تھی۔ وزیر اعظم نے مولانا کو جو جواب لکھا ہے وہ سہ لسانی فارمولا کے سلسلہ کی ایک اہم دستاویز اور مولانا حفظ الرحمٰن کی زندگی کا آخری کارنامہ ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے زندگی کے آخری لمحوں تک اردو کے ساتھ اپنی علمی دلچسپی جاری رکھی تھی۔

ایشیا ویکلی دہلی

حضرت مولانا حفظ الرحمٰن مجاہد آزادی رہنمائے ملک و ملت آخر طویل علالت کے بعد ہم سب کو داغ مفارقت دے گئے۔ خدا نے اپنی امانت ہم سے لے لی ہم اس امانت کے قابل نہ تھے۔ دوائیں دعائیں سب بے اثر گئیں ابھی تو اس کاروان کو سالار کی ضرورت تھی مگر اللہ کی مشیت کے سامنے کون زبان کھولے۔

دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام
کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے!

افسوس اتحاد و یگانگت کا وہ ستون خاموش ہو گیا جس کی صداؤں نے حق و صداقت کو ہوش مندی کے ساتھ بلند کیا۔

آہ! وہ جو متحدہ اور مشترکہ ہندوستان کی تعمیر میں ایک نئی زندگی کی بنیاد رکھ رہا تھا۔ اب نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ جس کے پائے ہمت نے کبھی لغزش نہ کھائی جس کے دل میں ہندوستان اور انسانی ہمدردی اور محبت کا جذبہ ہر وقت موجزن رہتا تھا۔ آج وہ رخصت ہو گیا افسوس متاع کارواں جاتا رہا۔ اسلام کی پاکیزہ تعلیم اور پیام کا علمبردار اور رہنما اٹھ گیا۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

ترجمان علی گڑھ

دہلی ۲۔ اگست ۱۹۶۲ء رات ۳ بجے حضرت مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن نے داعی اجل کو لبیک کہا انا للہ وانا الیہ راجعون مجاہد ملت ہندوستان کے ایک جلیل القدر فرزند جنگ آزادی کے نڈر سپاہی ایک سچے محب وطن پرستار دین فدائے ملت اور سیاسی رہنما ہونے کے باوجود با ایمان مرد مسلمان تھے۔

مولانا کی زندگی بڑے بڑے خطرات سے گزری جب کہ بڑے سے بڑے لیڈر اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھے ہیں لیکن مولانا نے ہر نازک موقعہ پر اپنے تدبر اور فکر کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ ان کی زندگی ۱۹۴۷ء سے قبل ایک طرف انگریز سے دست و پیکار تھی، تو دوسری طرف تقسیم وطن کے ندا کاروں سے نبرد آزما تھی ۱۹۴۷ء کے بعد جب دہلی کی سرزمین مظلوموں کے خون سے لالہ زار بنی ہوئی تھی۔ اور ملک کے کچھ رہنما اپنے ہوش و حواس کھو کر در پردہ شیطانی طاقت کے معاون تھے۔ اس وقت بھی مولانا نے کلمۂ حق کے اظہار میں مصلحت کا سہارا تلاش نہیں کیا۔ اور ۱۹۴۷ء سے لے کر آج تک ملک میں جس قدر فرقہ وارانہ فسادات ہوتے اس کا بڑی بے جگری سے مقابلہ کیا مولانا کی آواز حکومت کے ایوان میں گونجی وہاں کھل کر ظالموں کی نشاندہی کی ایوان کے باہر بھی اقلیتوں کے تحفظ کے لئے ہر جگہ بیانگ دھل مجرموں کو مجرم کہا مظلوموں کو مظلوم کہا وہ سچائی جرأت اور کردار کے علمبردار تھے۔

مولانا کی تمام زندگی قوم اور وطن کی خدمت کرنے میں بسر ہوئی وہ بلا امتیاز ہر ایک کے کام آنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ اور بالخصوص تقسیم وطن کے بعد مسلمانانِ ہند کی تکالیف اور زخموں کا وہ مرہم تھے۔ ملک کے کسی بھی حصہ میں مسلمانوں کے جیب جان و مال سے کھیلا جاتا وہ تڑپ جاتے

اور کسی بھی حالت میں ہوتے مظلوموں کی دادرسی کے لئے پہنچ جاتے تھے۔ آہ اب کون ایسا مخلص ہے کانگریسی مسلمانوں میں ایسا جو مسلمانوں کے زخموں پر مرہم رکھے گا۔ کون ہے جو عصر حاضر کی بساطِ سیاست کے مہروں کی چالوں کو سمجھ سکے گا آہ کون ہے اب جو بستر مرگ پر بھی اُردو کے تحفظ کے لئے کروٹیں بدلیگا کون ہے اب جو ایوانِ حکومت میں دلیری اور جرأت سے مسلمانوں کی تکالیف کو بیان کرے گا۔ کس کی نظر ہے جو اب مسلمانوں کے دینی اور اقتصادی گہرائیوں کو دیکھ سکے گی کس کی زبان ہے جو مسلمانوں کو آنے والے اسلام کش دور سے آگاہ کر سکے گی۔ کس کی آواز ہے جو ملت اسلامیہ کے اتحاد اور عظمت ناموس رسول کے تحفظ کے لئے گونجے گی۔

آہ:- مجاہد ملت خدا تیری روح کو اپنی لامحدود رحمتوں سے نوازے۔ باریتعالیٰ تیری جرأت تیری حق گوئی تیرا العزم البدل ہندی مسلمانوں کو دے خدا تیرے متعلقین کو صبر جمیل کی توفیق عطاء فرمائے　(آمین)

بھوپال پنچ بھوپال

غالباً ایک سال پہلے کی بات ہے کہ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب بھوپال تشریف لائے اور جمعیۃ علماء بھوپال کی طرف سے آپ کو نسترن بانو کی مسجد میں ظہرانہ دیا گیا۔ اس ظہرانہ میں ہم لوگ شریک تھے۔

مدیر پنچ تو ٹھہرا منہ پھٹ آدمی۔ دسترخوان پر بیٹھتے ہی اس نے منتظمین سے دریافت کیا کہ یہ کھانا قوم یتیم کی ملکیت ہے یا آپ لوگوں نے اپنی جیب سے اس کا انتظام کیا ہے۔

یقین جانئے کہ میرے اس جملے پر ہنسنے والے تو بہت سے تھے لیکن چوٹ تک جانے والا شاید مولانا حفظ الرحمٰن کے علاوہ کوئی اور نہیں تھا۔

مولانا حفظ الرحمٰن ہی جاگتا ہوا ذہن اور ٹیسیں محسوس کرتا ہوا دل لے کر پیدا ہوئے تھے۔

ہمیں یاد نہیں پڑتا کہ ۱۹۴۷ء کے بعد سے اب تک مسلمانان ہند کا کوئی مسئلہ ابھرا ہو اور اس پر مولانا کی پرچھائیں نہ پڑی ہو۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جگر نے یہ مشہور عالم اشعار اگر کسی مخصوص شخصیت کو سامنے رکھکر کہے تھے۔ تو وہ مولانا ہی کی ذات تھی۔

وہ کب کے آئے بھی اور گئے بھی نظر میں اب تک سما رہے ہیں
یہ چل رہے ہیں وہ پھر رہے ہیں یہ آ رہے ہیں وہ جا رہے ہیں

اور

کبھی شاخ و سبزہ و برگ پر کبھی گلشن و گل و خار پر
میں چمن میں چاہے جہاں رہوں مرا حق ہے فصل بہار پر

مرحوم مسٹروں کے بھی ممدوح تھے اور مولاناؤں کے بھی۔ وہ شری اور کامریڈوں کی نظر میں بھی لائق عزت تھے اور اچاریوں اور پنڈتوں کی نگاہ میں بھی۔ اور یہ سب عزت و توقیر اس وجہ سے تھی کہ خدا نے انھیں تڑپنے والا دل اور سرگرم رہنے والا وجود عطا کیا تھا۔

دارالعلوم دیوبند اپنے آغاز سے لیکر اب تک بلا مبالغہ کوئی بیس ہزار فاضل پیدا کرچکا ہوگا۔ لیکن اس میں شیخ الہند مولانا مدنی اور مولانا حفظ الرحمٰن بس گنتی ہی کے پیدا ہوئے یہ ایسے "کوہ نور" تھے کہ جس کی ٹوپی میں بھی لگ گئے اسے تاجدار بنا دیا۔ انھوں نے سب سے اپنی شخصیت کا لوہا منوایا اور جب گئے تو سب ہی کی محفلیں سونی ہوگئیں۔ انھیں نہ تو ندوہ نے غیر سمجھا اور نہ ہی علی گڈھ نے۔ وہ دیوبند میں جتنے مقبول تھے بریلی اور اجمیر میں بھی اتنے ہی مقبول ہوئے۔

آج مولانا ہم سے جدا ہوچکے ہیں اور وہاں جاچکے ہیں جہاں ہم سب کو جانا ہے لیکن ان کی یاد عرصہ تک باقی رہے گی۔

راہِ فانی کی پہلی منزل سے گزر جانے والے اس مسافر کو ہمارا اسلام پہنچے کہ اس نے سلامتی کے ساتھ یہ کٹھن منزل گزار دی۔

یہ دنیا آنی جانی ہے یہاں جو بھی پیدا ہوا اسے دیر سویر ایک نہ ایک دن جانا ہی ہے۔ دنیا کے اس چمن کا مالی اپنے وقت پر پودوں کو اگاتا اور اکھیڑتا رہتا ہے۔ اس کے اس منصوبے کے سلسلہ میں یہ کہنا تو شاید شکوہ سنجی اور گستاخی ہوگی۔ کہ کسی کی موت قبل از وقت ہوئی ہے وہ تو اپنے وقت ہی پر ہوتا ہے خواہ وہ ہم کم فہموں کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔ اللہ اپنی محفل کو سونا ہوتے دیکھکر بھی چاہتا ہے یہی کہنے کو۔

ہاں اے فلک پیر جواں تھا ابھی عارف
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

خدا مولانا مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اُن کی غلطیوں سے درگذر فرمائے اور ان کی حسنات کو ان کی کمزوریوں پر غالب فرماکر اپنے دامنِ رحمت میں لپیٹ لے کہ اس کی مغفرت اور رحمت کے دامن میں پناہ پا جانا ایک مومن کی حقیقی کامیابی ہے۔

بیباک سہارنپور

ایک فرد کی ذات میں جماعتیں محفوظ تھیں ایک ذات جو صداقت و امانت جرأت اور عزیمت، محبت و اخلاص، سخاوت و مروت، ہمت و استقلال، شجاعت و اولو العزمی، جلال و جمال اور انسانیت کے بہترین اوصاف کے لئے قدرت خداوندی کے خزانۂ بخشش و عطا کا نمونہ اور اسوۂ رسول اور صحابۂ کرامؓ کی مجاہدانہ زندگی کی ترجمان تھی۔ ایک وجود جس میں زندگی ہی زندگی، عمل ہی عمل اور مسلسل جدوجہد کی بے پناہ قوتیں اور حیرت انگیز صلاحیتیں ودیعت کردی گئی تھیں اور جس کے اندر ہمہ وقت یہ احساس زندہ و متحرک رہتا تھا کہ انسان اس کائنات کا سربراہ ہے اسے بہرحال و بہر صورت ممتاز و معزز رہنا چاہئے۔ آسمان و زمین کے درمیان جو کچھ ہے وہ اسی کی خدمت و تابعداری کے لئے پیدا کیا گیا ہے اور کسی انسان کو اپنے ہی جیسے انسان کی غلامی و محکومی پر مجبور نہیں کیا جاسکتا۔ سب انسان خدا کے بندے اور اسکی عیال ہیں۔ اور ان کی گردنیں اسی لئے ہیں کہ وہ صرف اس کی بارگاہ جلالت و عظمت میں جھکی رہیں اور کسی کمزور سے کمزور انسان کو یہ تصور بھی برداشت نہ کرنا چاہئے کہ اس کی گردن اطاعت کسی بڑے سے بڑے انسان کے آگے خم ہو خواہ وہ دنیوی بڑائی کی اصطلاح میں وقت کا فرعون و شداد ہی کیوں نہ ہو۔

آہ! وہ ذات اور وہ وجود — جسے ۶۲ سال تک دنیا نے محمد حفظ الرحمٰن کے پیارے نام سے پکارا اور جس نے عالم شعور میں قدم رکھتے ہی انسانی مجد و شرف اور اس کے حقیقی تقاضوں کی تکمیل کے لئے خود کو حوادث و آلام کے طوفانوں کے حوالہ کردیا۔ اس نے جب ہوش کی آنکھیں کھول کر دیکھا کہ اس کا عظیم ملک اور اس کی عظیم آبادی اپنے ہی جیسے مٹھی بھر انسانوں کی محکومی اور غلامی پر مجبور ہے

اور غیر ملکی اقتدار ہندوستان کی تاریخی غیرت و حمیت کے احساسات کو کچلتے کچلتے فرعونیت کے آخری مرحلہ تک پہنچ گیا ہے تو شباب جوانی اور جوانی کی ساری عیش طلبیاں اس کے جذبۂ غیرت و حمیت کے آگے اعتراف شکست کرچکی تھیں اور وہ مرد مجاہد اپنے ان اکابر کے سامنے جانبازی و سرفروشی کا حلف لے رہا تھا۔ جو حریت و انقلاب کی خاموش بجلیاں ملک کے گوشے گوشے میں پھیلانے میں مصروف تھے اور جنہوں نے صرف خدا کی رضا کے لئے اپنی جانوں کو حریت و آزادی کے مقصد کے لئے وقف کردیا تھا۔

حفظ الرحمٰن نے دار العلوم کی چٹائیوں پر بیٹھ کر اپنے بزرگ اور مجاہد اکابر سے جو کچھ پڑھا اور سیکھا، اس کا ایک مختصر سا خلاصہ انہوں نے خود ہی اخذ کرلیا اور وہ صرف اتنا تھا کہ انسان صرف خدا کی بندگی اور محکومیت کے لئے ہے اس کے بعد وہ ساری کائنات کا تاجدار اور مخدوم ہے یہ سمجھ لینے کے بعد انہوں نے اپنی اس زندگی کا آغاز کردیا جو شجاعت و جوانمردی کی زندگی تھی جس میں انسانی عظمت و جلالت کے زندہ متحرک اور مکمل احساسات تھے۔ اور جو دنیا کی بڑی بڑی مادی اور فرعونی قوت کا ہمہ وقت مقابلہ کرسکتی تھی۔ شباب و جوانی کا وہ سرمایہ جو عیش کوشیوں اور راحت طلبیوں کے لئے بھی وقف ہوسکتا تھا۔ اور جسے جوانی کا تقاضا بھی کہا جاسکتا تھا محض جہاد حریت کی سرگرمیوں کے لئے مخصوص ہو کر رہ گیا اور اس کے بعد دنیا نے دیکھا کہ ایک فرد واحد زندگی کے کس کس شعبے میں سرگرم عمل ہے۔ اگر وہ تصنیف تالیف کے منصب پر متمکن ہے تو اس کی عظمت کا اظہار "اخلاق و فلسفہ و اخلاق" "اسلام کا اقتصادی نظام" اور "قصص القرآن" جیسی تاریخی تالیف سے ہوتا ہے۔

اور اگر اس کی اسلامی فراست سیاسیات میں کارفرما نظر آتی ہے تو وہ ہندوستان کی تقسیم کی ہلاکت خیزیوں کا اس وقت تک اعلان کرتا رہتا ہے جب اسے کانگریس کے بڑے بڑے رہنما حتیٰ کہ پنڈت نہرو اور مہاتما گاندھی جیسے اکابر بھی تسلیم کرنے پر آمادہ ہوجاتے ہیں۔

حفظ الرحمٰن نے جس آزادی کے لئے اپنی زندگی کا پورا سرمایہ لگا دیا جس کے لئے قید و بند کی طویل صعوبتیں برداشت کیں اور جس کی تلاش و جستجو میں بڑے بڑے اذیت دہ خارزاروں سے گذرنا پڑا جب وہ آزادی سامنے آئی تو اس کی شکل و صورت کس قدر بھیانک اور کتنی ڈراؤنی تھی اس کا تخت کتنی انسانی لاشوں اور انسانی ناموس کی کیسی کیسی بربادیوں پر بچھا ہوا تھا۔ پاکستان میں ہندوؤں اور سکھوں پر اور ہندوستان میں مسلمانوں پر کیسی کیسی قیامتیں ٹوٹ رہی تھیں، اور وہ قوم جو پوری ایک صدی تک آزادی کے لئے ہر طرح کی قربانیاں دیتی رہی، آزادی حاصل کرنے کے لئے ہر طرح کی قربانیاں دیتی رہی، آزادی حاصل کرنے کے بعد کس قدر

.. آزاد ہوگئی تھی؟ ہر طرف موت اور ہلاکت کا دور دورہ تھا انسانیت کے لئے کسی گوشہ میں پناہ نہ تھی۔ اور رہنما تک گھروں کے سب سے محفوظ خانوں میں چھپے بیٹھے تھے۔ اس وقت جب دلی کے گلی کوچوں میں اور بازاروں میں قتل و غارتگری کا ایک ہمہ گیر ہنگامہ بپا تھا۔ جب سرکاری قوتیں بھی ارادی یا غیر ارادی طور پر ہر قسم کی جرأتوں سے محروم ہوچکی تھیں۔ سڑکوں اور گلیوں میں دھڑا دھڑ انسانی لاشیں گر رہی تھیں۔ اور فائرنگ کا سلسلہ موسلا دھار بارش کی طرح جاری تھا۔ اس وقت کون تھا جو موت کے تصور سے بے نیاز بغیر کسی فورس کے گولیوں اور حملہ آوروں کے ہجوم میں کچھ انسانوں کو بچاتا اور بے شمار انسانی لاشوں کو سمیٹتا پھرتا تھا؟ کس کے دل کا اضطراب ایک طرف پنجاب سے آنے والے ہندوؤں اور سکھوں کے لئے وقف تھا۔ اور دوسری طرف دلی کے مظلوم مسلمانوں کی جانوں

مالوں اور عزت و ناموس کو بچانے کے لئے صرف ہو رہا تھا۔؟

اور اس کے بعد سے آزاد ہندوستان میں ہندوستان کے وقار، اس کے سیکولرزم اور اس کے عدل و انصاف کی عظمت کو جس جس طرح برباد کیا جاتا رہا۔ اس کے خلاف سب سے زیادہ اور انتہائی جرأت و جوانمردی کے ساتھ کون آوازۂ حق بلند کرتا رہا؟ کس کی صدائیں ملک کے سرکاری اور غیر سرکاری اداروں میں حق کی نمائندگی کرتی رہیں اور کس نے "اپنوں" کی قہرمانیوں کے مقابلہ میں ڈٹ کر سچائی اور صداقت کے تقاضوں کو کما حقہٗ پورا کیا؟ یہ تھے مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن خدا ان کی قبر کو اپنے انوار و برکات سے معمور فرمائے۔ اور ہندوستان میں اُن کے جذبۂ ایمانی کو عام کردے!

عوامی دور دہلی

ابھی مولانا حفظ الرحمٰن کے مرنے کے دن نہ تھے اور جو بھی آن سے اُن کی زندگی کے ان آخری دنوں میں ملا تھا، جب کینسر جیسا مہلک مرض ان کے پھیپھڑوں کو کھائے جا رہا تھا، وہ محسوس کرتا تھا کہ جسمانی نقاہت اور ضعف کے باوجود مولانا کا ذہن اور اُن کی روح تابناک اور شفاف ہیں اور ان کی نرم مسکراہٹ اور میٹھی ہنسی کے پیچھے وہی آہنی ارادے اور سنگین عزم چھپے ہوئے ہیں، جن کا انھوں نے اس وقت اظہار کیا تھا جب وہ اپنی طالب علمی کے زمانے میں وطن کی آزادی کی لڑائی میں ایک نڈر، صاف دل اور جری سپاہی کی طرح بے محابا کود پڑے تھے۔

مولانا حفظ الرحمٰن ہندوستان کے مسلمانوں کے ایک سیاسی اور سماجی رجحان کے بہترین ترجمان اور رہنما تھے۔ جس کے نزدیک ہندوستانی مسلمان ایک واحد ہندوستانی قومیت کا جزو لاینفک ہیں اور یہ کہ اُن کا وجود اور ان کی ہستی پوری

ہندوستانی قوم کی آزادی، ملک میں جمہوریت انصاف اور رواداری کے فروغ اور جدید طریقوں پر ملک کی صنعتی معاشی ترقی کے ساتھ وابستہ اور پیوستہ ہے اس طرح اگر ایک طرف برطانوی سامراج کی مخالفت اور دشمنی اور وطن کو بیرونی حکمرانوں سے آزاد کرانے کی لگن ان کے دل میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی، اور یہ جذبہ اور احساس اُن کو علمائے ہند کی اس درخشاں روایت سے ورثہ میں ملا تھا جس نے انگریزی شہنشاہیت کی انیسویں صدی کے شروع سے ہی مجاہدانہ اور سرفروشانہ مخالفت کی تھی اور بار بار اپنا خون بہا کر وطن کی سرزمین میں آزادی کے بیج بوئے تھے، تو دوسری طرف مولانا مرحوم میں اس کی صلاحیت اور لیاقت بھی تھی کہ جب وطن کی تعمیر نو کا مسئلہ سامنے آئے تو وہ جدید جمہوری، سائنسی اور سوشلزم کے نظریوں کو ہمدردی کی نظر سے دیکھیں اور خود اسلام کی ابتدائی معاشی جمہوریت اور اس کے اخوت اور مساوات کے نظریات کی روشنی میں ان کا جواز ڈھونڈیں۔ اس تفتیش اور جستجو کی جھلک مولانا مرحوم کی مشہور کتاب "اسلام کا معاشی نظام" میں ملتی ہے اور اس بات میں کہ کانگریس کے ایک معزز رکن اور رہنما کی حیثیت سے انھوں نے جواہر لال نہرو کے پیش کئے ہوئے سوشلزم کے نظریئے اور نصب العین کو بطیب خاطر اور بہ سمجھ بوجھ کر ایمانداری اور یقین کے ساتھ قبول کیا تھا؟

برخلاف اُن گندم نما جو فروش کانگریسیوں کے جن کے ہونٹوں پر سوشلزم کا نعرہ ہوتا ہے لیکن جو دن رات اس سرزمین پر سرمایہ داری کو قائم کرنے اور سرمایہ داری کی ہوا خواہی میں مشغول ہیں۔

یہ میری خوش قسمتی تھی کہ سنہ ۱۹۳۶ء سے لے کر سنہ ۱۹۴۸ء تک آزادی کی جدوجہد کے معرکوں میں میں مولانا مرحوم کے بہت قریب رہا۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی اور یوپی کی کانگریس میں کانگریسی مسلمانوں کا جو بہت بڑا گروہ تھا مولانا اس کے ممتاز ترین افراد میں سے تھے۔ مولانا حسین احمد صاحب مدنی مولانا ابوالکلام آزاد، ہم پر شفقت اور عنایت کی نظر رکھتے تھے لیکن وہ ہم سے بہت اونچے تھے۔ رفیع احمد قدوائی مرحوم ہمارے قریب تھے لیکن کانگریس کی سیاسی بساط پر مہرے سنبھالنے اور اٹھانے اور وزارت کے کاموں میں پھنسے رہتے تھے۔ اس لئے اکثر اوقات کانگریس اور اس کی کمیٹیوں کے جلسوں میں سے مولانا حفظ الرحمٰن ڈاکٹر اشرف اور میں وقت نکال کر دنیا بھر کے مسائل، سیاست فلسفے، مذہب، مارکسزم پر بحثیں کیا کرتے تھے۔ ڈاکٹر اشرف میرے مقابلے میں مولانا سے بہت زیادہ قریب تھے دونوں ایک دوسرے کو تم کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ اور . . . ان دونوں میں بڑے پیار اور محبت کے ساتھ نوک جھونک ہوتی تھی، اشرف مولویوں کا مذاق اڑاتے تھے اور مولانا کمیونسٹوں پر چھینٹے کستے تھے، اس لئے کہ دونوں ہستیاں مقرر تو تھی ہی گفتگو کا فن بھی خوب جانتے تھے۔ تب بہت ہی لطف آتا تھا۔ ایک مرتبہ شاید فیض پور میں کانگریس کا سشن تھا۔ کافی سردی تھی۔ اشرف اور میں مولانا کے کیمپ میں رات کو بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ دو چار پائیوں پر کمبل اوڑھے ہم تینوں بیٹھے تھے اور مولانا کوئی بہت ہی سنجیدہ بات کہہ رہے تھے۔ ہم دونوں سر جھکائے سن رہے تھے۔ کہ اشرف کُنمنانے لگے انھوں نے اپنی گھڑی دیکھی اور بات کاٹ کر بولے ۔۔ "اٹھو بھئی حفظ الرحمٰن تمہارا وقت ہو گیا"! مولانا چپ ہو گئے اور تعجب سے اشرف کی طرف دیکھنے لگے۔ "وقت ہو گیا کس چیز کا ہو گیا؟ مجھے تو اب کہیں نہیں جانا ہے"، انھوں نے کہا اشرف کے لہجے میں تندی تو تھی ہی بہت سنجیدہ ہو کر "لوٹا سنبھالو، وضو کرو، عشا کا وقت ہو گیا اور کس کا؟ اب ہم کمیونسٹ تم کو یہ بھی یاد دلائیں؟ مولانا بے ساختہ ہنس پڑے۔ کمبل الگ پھینک

کراٹھ کھڑے ہوئے اشرف کو گلے سے لگالیا اور بولے " اللہ تمہیں راہ راست پر لائے اشرف!

مولانا حفظ الرحمٰن کی زندگی ایک بے مثال زندگی ہے۔ اس کا ایک ایک نقش ایسا ہے جسے یاد رکھنا چاہیئے اور جس سے سبق لینا چاہیئے۔

انھوں نے اپنا تن من دھن سب کچھ اپنے وطن کی آزادی کی جدوجہد اور اپنی قوم کے مظلوم ترین انسانوں کی خدمت کے لئے لگا دیا۔ وہ سب کے مددگار تھے۔ صرف ظالموں کے مخالف تھے۔ ان کے وعظ، پند و نصائح سے زیادہ اُن کا اعلیٰ کردار، مظلوم کی پکار پر ہمیشہ لبیک کہہ کر اس کی مدد کے لئے کمر بستہ ہو جانے کی اُن کی ریت، انکسار، ایثار، نفس، علم و تقدس اور تقویٰ کے باوجود ان کی انکساری اور اُن کی گہری انسانیت ایسی چیزیں ہیں جو ہم کو اُن کے بدنصیب پس ماندگان اور ان کی ساری قوم کو بہتر ہندستانی اور بہتر انسان بننے کی دعوت دیتے رہیں گے۔

سجاد ظہیر ۱۸ اگست ۱۹۶۲ء

دہ روزہ "جمہور" علیگڈھ

مجاہد ملت مولانا محمد حفظ الرحمٰن کی وفات ملک و ملت کے لئے ایک ایسا عظیم حادثہ ہے جس کی تلافی طویل زمانے تک محال نظر آتی ہے وہ دل و دماغ کے بہت سے اوصاف کے حامل اور بہت سی خوبیوں کے جامع تھے۔ انہوں نے دارالعلوم دیوبند میں تعلیم حاصل کی تھی اور اسی وقت سے ملک و ملت کے مسائل میں دلچسپی لینے لگے تھے۔ تحریک خلافت اور عدم تعاون میں انھوں نے اپنی نوجوانی ہی میں پورے جوش اور انہماک سے حصہ لیا اور بار بار قید و بند کے مصائب برداشت کئے۔ جمعیۃ العلماء ہند سے ان کا تعلق بہت قدیم تھا۔ وہ ۱۹۴۲ء سے اپنی زندگی کی آخری سانس تک اس کے ناظم اعلیٰ رہے اور ادھر کئی سال سے تو گویا اس کے روح رواں اور اس کا سب سے مضبوط اور سب سے اہم ستون تھے۔ کانگریس میں بھی ان کا مقام بہت اونچا تھا۔ وہ مسلسل ۱۶ سال سے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے رکن اور ۱۰ سال سے اس کے ٹکٹ پر لوک سبھا کے ممبر تھے۔ کافی عرصہ تک یوپی کانگریس کے نائب صدر، یوپی اسمبلی کے ممبر اور دستور ساز اسمبلی کے رکن رہے تھے۔

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب فرقہ پرستی کے بہت بڑے دشمن اور قومی ایکتا اور یک جہتی کے بہت بڑے مبلغ تھے۔ انھوں نے ۱۹۴۷ء سے پہلے مسلم فرقہ پرستی اور ۱۹۴۷ء کے بعد ہندو فرقہ پرستی کا مقابلہ جس بے جگری، پامردی اور ہمت و استقلال سے کیا وہ ان کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ یہ بات تاریخ کے صفحات میں محفوظ رہنی چاہیئے۔ کہ تجویز تقسیم پیش ہوئی تو جو دو آوازیں اس کی مخالفت میں سب سے زیادہ بلند آہنگی سے اٹھیں وہ مولانا حفظ الرحمٰن اور شری پرشوتم داس ٹنڈن کی آوازیں تھیں لیکن فرق یہ تھا کہ جب ملک کی تقسیم عمل میں آگئی تو ٹنڈن جی اس راستے پر چل کھڑے ہوئے جو مسلم لیگ کا منشاء موقف تھا اور مولانا حفظ الرحمٰن نے اپنا ذہنی توازن قائم رکھا اور وہی کیا جو ایک سچے دیش بھگت کو کرنا چاہیئے تھا۔ ۱۹۴۷ء کے فرقہ وارانہ جنون کے دور میں دہلی میں مہاتما گاندھی کو جن چند لوگوں سے اپنے کام میں مدد ملی ان میں مولانا حفظ الرحمٰن کا نام نامی پیش پیش تھا اس کے بعد بھی قوم پروری کے ہر محاذ پر مولانا نے فرقہ پرستی کے خلاف زبردست مورچہ لگایا۔ اور اس پر پوری ہمت اور مردانگی سے جمے رہے۔ چاہے فرقہ وارانہ فسادات کا مسئلہ ہو چاہے مساجد و مقابر کی واگزاشت کا، خواہ نکاسی جائداد کے معاملات ہوں، خواہ لسانی، ثقافتی اور تعلیمی بدعنوانیوں کے جھگڑے، ان کے ناخن تدبیر نے ہر گتھی کو سلجھانے کی کوشش کی اور کون کہہ سکتا ہے کہ ان کی کامیابیاں ناکامیوں پر حاوی نہیں رہیں؟

مولانا حفظ الرحمٰن کی سیاسی حیثیت ان کی دوسری حیثیتوں پر حاوی آگئی تھی، ورنہ وہ ایک فاضل مصنف ایک زبردست مقرر اور ایک جید عالم بھی تھے، ان کی تصانیف میں اسلام کا اقتصادی نظام، "سیرت" اور قصص القرآن کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ جن کی وجہ سے وہ علمی حلقوں میں بہت عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ سیرت پاک پر ان کی عالمانہ تقریریں بے نظیر ہوتی تھیں اور اگر ان کا کوئی مجموعہ تیار ہو سکا تو وہ اس صنف ادب میں ایک بیش بہا اضافہ ہوگا۔ مسلمانوں کے تعلیمی مسائل میں انھیں گہری دلچسپی تھی اور اس معاملے میں وہ قدیم و جدید کے درمیان ایک پل کی حیثیت رکھتے تھے۔ علاوہ اور تعلیمی اداروں کے مسلم یونیورسٹی علیگڈھ سے ان کا تعلق بہت قریبی اور گہرا تھا۔ وہ اس کے کورٹ اور اگزیکیٹو کونسل کے رکن اور ادارہ علوم اسلامیہ کی مجلس انتظامیہ کے ممبر تھے۔ یونیورسٹی کے علمی اور انتظامی حلقوں میں ان کی رائے کا وزن محسوس کیا جاتا تھا۔ اور اسے بہت اہمیت دی جاتی تھی۔ بعض نازک مرحلوں پر انہوں نے مسلم یونیورسٹی کی بڑی قابل قدر خدمت نہایت خاموشی اور متانت سے انجام دی۔

مولانا حفظ الرحمٰن کی سب سے اہم خصوصیات ان کی جرأت و حق گوئی، بے تعصبی رواداری خلوص و جذبۂ خدمت اور ایثار و بے نفسی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ ملک و قوم کے ہر طبقے نے ان کی موت کا اس قدر ماتم کیا ہے اور انھیں ملنے

شاندار الفاظ میں خراج عقیدت ادا کیا ہے۔ اسلامی نظریئے کے مطابق سب سے اعلیٰ جہاد سلطان جابر کے سامنے کلمۂ حق کہنا ہے۔ مولانا حفظ الرحمٰن نے کلمۂ حق کہنے میں نہ کبھی غیر ملکی استبداد کی پرواہ کی، نہ اپنے ہم مذہبوں کے فرقہ وارانہ تعصب کی اور نہ برادران وطن کی تنگ نظر اور بے راہ روی کی، اس لحاظ سے وہ بلاشبہ "مجاہد ملت" تھے۔ اللہ تعالیٰ انھیں ان کے حسنات کا زیادہ سے زیادہ اجر عطا فرمائے اور درجات بلند کرے۔

مسلم یونیورسٹی گزٹ علی گڑھ

صد افسوس حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب ایم پی نے ۲ر اگست ۱۹۶۲ء کو صبح ۳ بجے اپنی رہائش گاہ کیننگ لین نمبر ۱ نئی دہلی میں طویل علالت کے بعد انتقال فرمایا۔ تکفین کے بعد صبح ۸ بجے مرحوم کی میت کو مکان کے ایک کھلے کمرہ میں رکھ دیا گیا تھا جہاں شام تک کم و بیش ایک لاکھ مسلم و غیر مسلم عوام و خواص نے آپ کا آخری دیدار کیا۔ ان میں وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو، مرکزی وزیر داخلہ مسٹر لال بہادر شاستری، وزیر خزانہ مسٹر مرار جی ڈیسائی، حافظ محمد ابراہیم صاحب جنرل شاہنواز صاحب اور دیگر معزز ارکان کابینہ کے علاوہ ممبران پارلیمنٹ سفراء ممالک مقیم دہلی نیز ہندوستان کی وہ مشہور ہستیاں بھی شامل ہیں جو مرحوم کی خبر وفات سن کر بر وقت دہلی پہونچ گئیں تھیں۔

شام کو ۵ بجے مکان سے مرحوم کا جنازہ روانہ ہوا جو دہلی کی مختلف شاہراہوں سے گزرتا ہوا فیروز شاہ کوٹلا گراؤنڈ پر جم غفیر کے ساتھ پہونچا۔ ساڑھے چھ بجے شام دار العلوم دیوبند کے مہتمم مولانا قاری محمد طیب صاحب نے نماز جنازہ پڑھائی اور قبل مغرب آپ کو درگاہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی مرحوم کے احاطہ (بیرون دہلی دروازہ) میں سپرد خاک کیا گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

۲ر اگست کی صبح ہی کو مولانا کے انتقال پر ملال کی خبر علی گڑھ اور تمام یونیورسٹی میں مشہور ہوگئی۔ کرنل بشیر حسین زیدی صاحب وائس چانسلر نے اسی وقت ایک تعزیتی پیغام جاری کیا۔ یونیورسٹی میں عام تعطیل کا اعلان کیا۔ اور بغرض آخری دیدار و شرکت نماز جنازہ آپ فوراً بذریعہ کار دہلی روانہ ہوگئے۔

مرحوم کا یونیورسٹی سے دیرینہ اور خصوصی تعلق ہونے کی وجہ سے یونیورسٹی ایریا میں مرحوم کا انتہائی افسوس کے ساتھ غم منایا گیا۔ مختلف شعبہ جات میں تعزیتی جلسے منعقد ہوئے۔ بعض مساجد میں جماعت کیساتھ غائبانہ نماز جنازہ ادا کی گئی! اور تمام یونیورسٹی کھیل کود اور تفریحی پروگرام بند رہے۔ ۳ر اگست کو ۵ بجے شام مقامی ممبران کورٹ و ایگزیکیٹو کونسل اسٹاف اور طلباء یونیورسٹی کی جانب سے ایک تعزیتی جلسہ زیر صدارت جناب سعید الملک نواب صاحب چھتاری پرو چانسلر منعقد ہوا جس میں مقامی ممبران کورٹ وائس چانسلر پرو وائس چانسلر آنریری ٹریزرر رجسٹرار ممبران اسٹاف اور طلباء یونیورسٹی نے کثرت سے شرکت فرمائی۔

جلسہ میں پہلے مسلم یونیورسٹی اسٹوڈنٹس یونین کے آنریری سکریٹری مسٹر بشیر احمد نے مولانا مرحوم کی دیرینہ قومی ملی اور سیاسی خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے وفات پر غم و افسوس کا اظہار کیا۔ آپ کے بعد جناب عبد المجید خواجہ صاحب بیرسٹر نے مرحوم کی ان خصوصی خدمات کا افسوس کے ساتھ ذکر کیا جن پر آج ملک و قوم فخر محسوس کر رہا ہے بعدہٗ جناب کرنل بشیر حسین زیدی صاحب وائس چانسلر نے مرحوم کی دیرینہ وابستگی اور تعلقات وانہماک کا احترام کیا تھا اعتراف کرتے ہوئے مندرجہ ذیل تعزیتی تجویز پیش کی جو بالاتفاق دو منٹ خاموش کھڑے ہو کر پاس کی گئی:

"مسلم یونیورسٹی کے طلباء۔ اساتذہ ممبران کورٹ اور جملہ کارکنان کا یہ جلسہ حضرت مولانا حفظ الرحمٰن کی وفات پر انتہائی غم و الم اور ان کے پسماندگان سے دلی ہمدردی کا اظہار کرتا ہے۔ مولانا جنگ آزادی کے عظیم مجاہد۔ روشن خیال عالم اور بلند پایہ خطیب تھے۔ انھوں نے جنگ آزادی کے راستہ میں قید و بند کی ہر تکلیف کو بے نیازی کے ساتھ برداشت ہی نہیں کیا بلکہ انھیں جرأت اور پامردی کے ساتھ دعوت بھی دی۔ وہ بجنور کے ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتے تھے جو علم و فضل میں ہمیشہ ممتاز رہا ہے۔ خلافت اور کانگریس کی تحریک کے سلسلہ میں مولانا کی قربانیاں اتر پردیش اور ہندوستان کی تاریخ میں یادگار رہیں۔ وہ ہندوستانی قومیت کے زبردست حامی تھے۔ ملک کی تقسیم کے بعد انہوں نے جس طرح ہندوستانی قومیت اور جمہوریت کے تصور کو اس ملک میں قائم کرنے کی جد و جہد کی وہ ہندوستان کی تاریخ کا ایک نہایت روشن باب ہے۔ ۱۹۲۲ء سے لیکر آخری لمحوں تک مولانا نے ان مقاصد کے لئے صحیح معنوں میں جہاد جاری رکھا۔ مولانا کی علمی خدمات نہایت گراں قدر ہیں۔ علمی اداروں کی خدمات اور اساتذہ کی بہبودی کے لئے انہوں نے اپنی ذات سے جو کچھ کیا وہ انجمن اور جماعت نہ کرسکتی۔ وہ ایک بڑے روشن خیال بزرگ تھے جس کا ایک بڑا ثبوت یہ ہے کہ انہوں نے دیوبند کے تصور کو علی گڑھ پر اور علی گڑھ کے تصور کو دیوبند پر کبھی مسلط نہیں کیا وہ جہاں پرانے علوم کا احترام کرتے تھے وہاں مغربی علوم کی ضرورت اور اہمیت کے معترف اور ان کے ماہرین کے سچے قدر دان تھے۔ ان کی رواداری اور وسیع النظری میں چھوٹے بڑے کا سوال نہیں تھا۔ وہ امیر اور غریب عالم اور جاہل سب کے غم خوار

[illegible]

تعزیتی تار مرادآباد

[illegible]

تعزیتی جلسہ دہلی

[illegible]

[illegible]

کی تاریخ ہے ۔ سیوہارہ ، دیوبند اور ڈابھیل کی علمی اور تعلیمی زندگی ۔ تحریک آزادی میں بے خوف و خطر کود پڑنا ۔ مدارس امروہہ تک کا سینہ گرہ قید و بند کی صعوبتیں مسلم فرقہ پرستی کے خلاف ان تھک جدوجہد ۔ پھر آزادی کے بعد ہندو فرقہ پرستی کا مقابلہ ۔ اس سیلاب کے مقابلہ پر چٹان کی طرح ڈٹے رہنا اس کے ساتھ مسلمانوں کو گمشدہ فضا میں بحال کرنے کی کامیاب جدوجہد ان کی کتاب زندگی کے چند باب ہیں یہ مجاہد ملت کے کارنامے اتنے ہیں کہ صفحات میں ان کی شمار ممکن نہیں ۔ مولانا مرحوم نے ہندوستان کی تاریخ پر جو گہرا اثر ڈالا ہے اس کی تفصیل بھی یہاں ان چند صفحات میں ممکن نہیں لیکن بلاخوف تردید اتنا کہا جاسکتا ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی نئی نسل کو جتنا انھوں نے متاثر کیا کوئی اور شاید نہیں کرسکتا ۔

کم و بیش ۴۳ سال تک مجاہدانہ زندگی گذارنے اور علم و عمل کی دنیا میں سر بلندی حاصل کرنے کے بعد مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمن صاحبؒ ۲ اگست کو ۳ بجے قبل فجر ابدی اور دائمی راحت حاصل کرلی ۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

موت العالم موت العالم کے مصداق جیسے ہی اس المناک حادثہ کی اطلاع راجدھانی کے کوچہ و بازار میں پھیلی ، رنج و غم کی گھٹائیں چھاگئیں ۔ دکانیں بند ہونے لگیں اسکول اور دوسرے تعلیمی اداروں میں تعطیل کردی گئی ۔ حضرت مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمن صاحب نے اپنی زندگی کا آغاز جہاد ہی سے کیا تھا اور وہ آخر دم تک ہمیشہ جہاد ہی میں مصروف رہے ۔ ہندوستان میں آزادی کی تحریک کا آغاز ہوا تھا کہ ایک نوخیز اور نوجوان رضاکار کی حیثیت سے مردانہ وار تحریکات میں شریک ہوگئے اور تمام مصائب برداشت کرتے رہے جو کہ برطانوی دور دہشت میں بڑے بڑے لیڈروں نے برداشت کیں آپ نے علوم دین کی تکمیل دیوبند میں کی ۔ اسی کے ساتھ ساتھ عملی جہاد بھی جاری رکھا دارالعلوم سے فارغ ہوتے تو جس طرح علم میں فاضل و کامل تھے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ اسی طرح عمل کے لحاظ سے بھی آپ نے جلد ہی ہندوستان کی سیاست سیاسی رہنماؤں اور سربراہوں میں ایک خاص مقام حاصل کرلیا اور ہندوستان و ملت اسلامیہ کے صحیح معنوں میں رہنما ہوگئے ۔ جمعیۃ علماء ہند کی مجلس عاملہ میں کوئی رکن اس قدر کم سن نہ ہوگا ۔ اور عجیب بات یہ ہوئی کہ اس کم سنی کے ساتھ جمعیۃ علماء کے اکابر کے مشیر رہتے تھے ۔ اور اکابر آپ کے مشوروں پر عمل کرتے تھے ۔ جہاد آزادی کامیابی کے ساتھ ختم ہوا ۔ اور اب اس کے مقصد کے ظہور کا وقت آیا جس کے لئے جہاد کیا گیا تھا یہ وقت جو بہت مبارک ہونا چاہیے تھا ایک قیامت خیز دور ثابت ہوا ۔ اس کی ہولناکی اس درجہ بڑھی کہ بڑے بڑے بہادروں کے قدم ڈگمگا گئے اور وہ سوچنے لگے کہ ہندوستان میں رہیں یا ترک وطن کریں ۔ اس وقت بہت سے حضرات ثابت قدم رہے لیکن وہ شخص جس نے ثابت قدم رہنے کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں مسلمانوں کے باعزت رہنے کو اپنا نصب العین بنایا تھا ۔ وہ مولانا حفظ الرحمن تھے جن کو آج ہم رحمۃ اللہ علیہ کہنے پر مجبور ہوگئے ہیں ۔

حضرت مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمن صاحب آزادی کے بعد ہی سے پارلیمینٹ کے ممبر رہتے چلے آرہے تھے ۔ ایک عرصہ تک آپ یوپی کانگریس کمیٹی کے صدر رہے ۔ قومی دنیا مجاہد ملت کو خراج عقیدت پیش کرتا ہے اور ان کے درجات کی بلندی کے لئے دعا کرتا ہے ۔

ہفتہ روزہ للکار دہلی

اس ہفتہ مولانا حفظ الرحمن صاحب کا انتقال ہوگیا وہ کینسر کے منحوس مرض کا شکار تھے ۔ بدقسمتی سے اس وقت کینسر کا کوئی علاج موجود نہیں ہے چنانچہ مولانا بھی اس مرض سے نہ بچ سکے ۔ مولانا مسلمانوں کے مقبول لیڈر تو تھے ہی لیکن وہ ہندوؤں اور سکھوں میں بھی مقبول شخصیت کے مالک تھے ۔ ساری زندگی قوم پرست رہے کوئی مصلحت اور کوئی لالچ ان کو خرید نہ سکا ۔ اور کسی دھمکی سے وہ مرعوب نہ ہوسکے ۔ انہوں نے ساری زندگی منی نفتوں کا مقابلہ کیا اور مخالفین کا مقابلہ کرتے رہے ۔ ان کی خدمات اور قربانیوں کا سب سے زیادہ شاندار زمانہ وہ ہے جب ۱۹۴۷ء میں وہ مہاتما گاندھی کے ساتھ ان کی سرکردگی میں دورہ کرتے پھر رہے تھے ۔ انہوں نے دلیری اور جرأت کے ساتھ فساد زدہ علاقہ میں امن اور سچائی کا پیغام پہونچایا اور عوام کی خدمات کیں ۔ مذہب سے بالاتر ہوکر انہوں نے سیکولر تحریک کو فروغ دیا ۔ اور اس کے لئے قربانیاں دیں انھوں نے بہت کم عمری کے زمانہ میں تحریک آزادی کی جدوجہد میں حصہ لیا ۔ کانگریس کے ساتھ رہے تو ان کو چومکھی جنگ لڑنی پڑی ۔ ایک طرف انگریزوں سے مقابلہ تھا اور دوسری طرف مسلم لیگ کی فرقہ پرست پالیسی سے ٹکر لی ان کو بدنام کرنے کی سازشیں کی گئیں ۔ لیکن وہ اپنے ارادہ اور عزم میں ایک مضبوط چٹان کی طرح قائم رہے

وہ ۱۹۴۲ء میں جمعیۃ علماء کے جنرل سکریٹری چنے گئے تھے اور مرتے دم تک وہ اس عہدے پر قائم رہے ۔ درحقیقت ان کی موت سے دیش اور اس کی ایکتا کا کام کرنے والوں میں ایک اہم جگہ خالی ہوگئی ہے ایسی جگہ کو پُر کرنا مشکل ہے ۔

پندرہ روزہ ہمدرد دہلی

انسانی زندگی میں موت ایک ایسا فطری عمل ہے جسے ہر شخص صبر و شکر کے ساتھ برداشت کر لینے کا عادی ہو چکا ہے۔ وہ اپنے قریب ترین عزیز کے انتقال پر بھی اسے دھیرے دھیرے بھلا کر تسکین حاصل کرنے کا کوئی ذریعہ تلاش کر لیتا ہے لیکن اس دنیائے فانی سے مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی رحلت تو ملک و قوم کے لئے ایک ایسا صدمۂ عظیم ہے جو عرصہ دراز تک لوگوں کے ذہن سے محو نہیں ہو سکے گا۔ اور سب کی نگاہیں اپنے اس مذہبی اور سیاسی رہنما کو بار بار تلاش کریں گی جس نے کبھی کسی طاقت کے سامنے سر نہیں جھکایا اور جو اپنی زندگی کے آخری لمحات میں بھی قوم کی خدمت کرتا رہا اور موت کا مردانہ وار مقابلہ کرتا رہا۔

کس کا دل ہے جو خاموشی سے قوم کے ایک ایسے محسن کی جدائی برداشت کر لیگا جس نے اپنی زندگی میں دوست اور دشمن سبھی کی یکساں رہنمائی کی۔ جو سب کو اپنا اور اپنے کو سب کا سمجھتا تھا۔ یقین کرنے کو دل نہیں چاہتا کہ مولانا مرحوم اب ہمارے درمیان نہیں رہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے وہ قوم کے درد سے بے چین ہو کر چند روز کے لئے دہلی سے کہیں باہر گئے ہوں اور عنقریب واپس آ جائیں گے کیونکہ ان کا یہ معمول تھا، آرام کو وہ واقعی حرام سمجھتے تھے، ملک کے کسی بھی گوشہ سے کسی وقت بھی بلاوا آئے۔ مرحوم ہر حال میں سفر کے لئے تیار ہو جاتے تھے۔ آج کون نہیں جانتا کہ مجاہد ملت کی وفات کا ایک سبب ان کا یہی جذبہ تھا۔ اگر وہ عام لیڈروں کی طرح اپنے معالجوں کے مشورہ پر مرض کے شروع میں تھوڑی احتیاط سے بھی کام لیتے تو ممکن تھا کہ وہ ابھی اور جیتے لیکن وہ تو حقیقی معنوں میں مجاہد تھے۔ وہ بیماری کو آرام کرنے کا عذر بنانے کو انسان کی سب سے بڑی کمزوری سمجھتے تھے۔ وہ زندگی کے قدیم اور جدید نظریات کا ایک دل کش امتزاج تھے، ان کی فکر میں اتنی گہرائی اور نظر میں ایسی وسعت تھی کہ وہ ہر مکتبہ فکر کے لوگوں کو اپنا ہم خیال معلوم ہوتی تھی۔

ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن سے تو مولانا مرحوم کا ایک خاص تعلق تھا ہمدرد وقف کی مجلس اعلیٰ میں وہ نہ صرف ایک رکن کی حیثیت سے شامل تھے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ مرحوم اس وقف کے سچے ہمدرد اور سرپرست تھے وہ ہمارے لئے بہت کچھ تھے۔ وہ تو بلا شبہ سب کے لئے تھے اور سب کو انہیں اپنا سمجھنے کا فخر حاصل تھا۔ ان کی رحلت سے ملک کے کروڑوں انسان ایک ایسے سرپرست سے محروم ہو گئے ہیں جو اپنے یا اپنے گھر والوں کے لئے نہیں بلکہ ہمیشہ اور صرف دوسروں کے لئے زندہ تھا۔

خدا سے دعا ہے کہ مرحوم کے درجات وہاں بھی بلند فرمائے اور ان کی بیگم اور صاحبزادہ اور صاحبزادیوں کو صبر عطا فرمائے اور سب کو ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق دے، (آمین)

نوائے ہند امروہہ پندرہ روزہ

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی نا وقت موت نہ صرف مسلمانوں کے لئے بلکہ بحالات موجودہ پورے ملک کے لئے ایک بڑے المیہ کی حیثیت رکھتی ہے یوں تو موصوف کی وہ سیاسی اور علمی خدمات بھی کچھ کم نہیں جو آزادی ہند سے قبل موصوف نے انجام دیں، بلند پایہ تصانیف اور جنگ آزادی کا مجاہدانہ کردار بجائے خود ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔ لیکن آزادی کے بعد مرحوم نے انتہائی صبر آزما اور ہمت شکن حالات میں اپنی اصابت رائے، استقلال مزاج جوش کار اور حب الوطنی کا جو شاندار مظاہرہ کیا اس نے ان کی شخصیت کو کم از کم مسلم رہنماؤں کی صف میں ضرور منفرد بنا دیا تھا۔ موصوف کی وطن دوستی اگرچہ ایک امر مسلم تھی لیکن تقسیم کے بعد چونکہ وہ طبقہ جس سے خود مرحوم متعلق تھے انتہائی نازک حالات سے دوچار تھا۔ اس لئے موصوف نے اپنی زندگی کا بنیادی مقصد ہی مظلوم اقلیت کا تحفظ قرار دیدیا تھا اور اس راہ میں کوئی مخالفت کوئی تنقید، کوئی اندیشہ ان کا راستہ نہ روک سکا۔ وہ جو کچھ اپنے نزدیک صحیح سمجھتے تھے اس پر عمل کرنے سے کبھی نہ جھجکتے تھے، اکثر انتہائی پرخطر حالات میں مرحوم نے سر ہتھیلی پر رکھ کر اصلاح حال کی کوشش کی۔ واقعہ یہ ہے کہ فسادات کے مواقع پر جب اسمبلی اور پارلیمنٹ کے مسلم ممبران تحفظاتی تدابیر کا انتظام تو درکنار زبانی ہمدردی کی جرأت بھی نہ دکھلا سکے اکیلے مولانا موصوف تھے جو سر بکف آگ اور خون کی بارش میں کود پڑتے تھے اور کم از کم جتنا ان کے بس میں تھا اتنا کر گزرتے تھے اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں کی ایک خاصی بڑی تعداد کو ان سے ہمیشہ یہ شکایت رہی کہ وہ ایک پختہ کار کانگریسی ہونے کی بناء پر انتہائی برے حالات میں بھی مسلمانوں کی دلجوئی کرنے اور مقامی طور پر فسادات کو فرو کرنے کی تدبیر تو کرتے ہیں لیکن اعلیٰ سطح پر مسلمانوں کی اجتماعی ناراضگی کے اظہار احتجاج اور ارباب اقتدار پر سیاسی دباؤ ڈالنے کی جرأت نہیں کرتے لیکن اگر اس دلیل میں کچھ وزن بھی ہو تب بھی مولانا کی نیت میں شک نہیں کیا جا سکتا ان کے نزدیک جو صحیح ترین طریق کار تھا وہ انہوں نے بلا خوف لومۃ لائم اختیار کیا اور کردار کی یہی مضبوطی تھی جس نے ان کی شخصیت کو اتنا بلند

اور ارفع بنا دیا موصوف کا طریق کار ایک خاص سنجیدگی کا حامل تھا۔ وہ حالات کی نامساعدت سے مشتعل ہو کر غیر متوازن طریق کار اختیار نہ کرتے تھے اور حالات کی ناخوشگواری کو ہنگامی اور وقتی خیال کرتے تھے مستقبل کے بارے میں ان کا نقطۂ نظر امید پسندانہ تھا۔ وہ خوب جانتے تھے کہ انتقام و اشتعال کی پالیسی ہند مسلم اتحاد کی راہ میں ایک ایسا سنگِ گراں بن سکتی ہے جس کا ہٹنا شاید دیر تک ممکن نہ ہو۔ اس لئے اکثر دل ہلا دینے والے حادثات پر بھی وہ ایک ذمہ دار قائد کی طرح توازن و دماغ برقرار رکھتے تھے تقسیم کے بعد اتنے لاتعداد مسائل ان کے سامنے تھے کہ وہ اُن کا احصار نہ کر پاتے تھے ہر وقت پا در رکاب رہتے تھے۔ اور بڑھاپے میں یہ حد سے بڑھی ہوئی محنت بھی اُن کے لئے جان لیوا ثابت ہوئی۔ بدقسمتی سے مرض اس حد تک ترقی کر گیا کہ امریکن معالجین کی آخری تدابیر بھی ان کی جان لیوا ہی ثابت ہوئیں، مشیّت کا فیصلہ بہر حال اٹل ہے۔

آج مولانا ہمارے درمیان موجود نہیں لیکن ان کا مسلک اُن کا طرز فکر اُن کا انداز کار اور اُن کا مطمع نظر ہمارے سامنے ہے۔ دلوں میں اخلاص حوصلہ مندی اور جرأت کا رسوتو ہر شخص حفظ الرحمٰن بننے کی کوشش کر سکتا ہے کام بھی بہت ہے۔ اور کام کرنے کی راہیں بھی متعین ہیں، سب سے بڑا خراج عقیدت جو اُن کی قیمتی خدمات کے لئے پیش کیا جا سکتا ہے وہ یہی ہے کہ لوگ مرحوم کی بلند پایہ روایات کو اپنے لئے شمع راہ بنائیں۔ ادارہ "نوائے ہند" مرحوم کی پسماندگان اور جمعیۃ علماء ہند کے تمام وابستگان کے ساتھ اس صدمہ میں شریک ہے۔ اور بارگاہِ رب العزت میں دست بدعا ہے کہ مرحوم کو جوار رحمت میں جگہ دے۔ (آمین)

پندرہ روزہ مسیحا بمبئی

جنگ آزادی کا ایک بہادر نڈر سپاہی ملک وملت کی بے بہا خدمات انجام دیتے ہوئے بالآخر ۲ اگست کی ۳ بجے صبح کو ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی موت کا سبب کینسر یا اسی طرح کی بیماری بتایا جاتا ہے لیکن جو لوگ مولانا سے قریب سے واقف ہیں وہ یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ آزادی کے بعد اہلِ وطن کا جو طرز عمل رہا وہ ان کے سینہ میں ناسور بن کر رستا رہا۔

ملک کی جس آزادی کے لئے انھوں نے ہر قسم کی تکلیفیں اٹھائی تھیں اس کے حاصل ہونے کے بعد ملک پر جو قیامت ٹوٹی اور خاص کر انھیں کی دلی میں ان کی آنکھوں کے سامنے جس درندگی اور سفاکیت کا مظاہرہ کیا گیا وہ انھیں زندگی بھر خون کے آنسو رلاتا رہا۔

اس طرح کے موضوع پر جب کبھی بھی مولانا سے گفتگو کا موقع ملا میں نے دیکھا کہ انھوں نے ہمیشہ ایک آہ سرد کھینچی اور یہ آہ ان کے دل کے ایک گہرے گھاؤ کی برابر غمازی کرتی رہی۔

طب کے سلسلے میں جو مسلسل ناانصافیاں برتی جا رہی ہیں۔ میں نے مولانا کی توجہ کئی بار منعطف کرائی ایک مرتبہ انھوں نے فرمایا کہ ملک کی اس بدقسمتی کو کیا کہئے کہ حکیم اجمل خاں مرحوم سے جو لوگ بہت قریب رہے ہیں اور ان کے مشن سے بڑی حد تک واقف ہیں۔ وہ لوگ بھی طب دشمنی میں آج پیش پیش ہیں۔ ناواقفوں کو سمجھایا جا سکتا ہے۔ لیکن جو لوگ عقد و انتقام سے بدحواس ہو کر اپنا دماغی توازن کھو چکے ہوں ان کو کون سمجھا سکتا ہے۔!

آخری مرتبہ علاج کے سلسلہ میں جب وہ بمبئی تشریف لے آئے اور ٹاٹا میموریل ہسپتال میں زیر علاج تھے۔ تو ایک دن دوران گفتگو فرمانے لگے، نہ مایوس ہونے کی ضرورت ہے اور نہ بددل ہونے کی اپنی تنظیم کو اور مضبوط کیجئے۔ اور پوری تندہی کے ساتھ اپنی جدوجہد کو جاری رکھئے انشاء اللہ ایک نہ ایک دن ضرور کامیابی ہوگی اس کو یقین رکھئے کہ غلط جذبات کے تحت آج طب کو نقصان پہنچایا جا سکتا ہے لیکن اس کی خوبیوں کی وجہ سے اس کو مٹایا نہیں جا سکتا۔ اطبا عوام کو ساتھ لے کر اگر اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کی کوشش کریں تو مستقبل سے ناامید ہونے کی ضرورت نہیں۔ مسیحا کے اجراء کے وقت بھی اسی طرح کا ایک پُر امید بیان مولانا نے دلی سے بھیجا تھا۔

آج مولانا ہمارے درمیان نہیں ہیں لیکن انھوں نے اخلاص و ایثار سے بھرپور جو مثالی زندگی ہمارے سامنے رکھی ہے اس سے آج بھی ہم بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔"

اللہ تعالیٰ انھیں اپنی خوشنودی کی جنت نصیب فرمائے اور ملک وملت کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے۔ (آمین)

ہمدرد صحت دہلی

مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن کی وفات نہ صرف قوم اور ملک کے لئے ایک سانحہ عظیم ہے بلکہ ادارہ ہمدرد کے لئے بھی ایک ایسا اندوہناک واقعہ ہے جسے نہ صرف برسوں تک بلکہ شاید آنے والی نسلوں تک نہ بھلایا جا سکے

مولانا مرحوم ایک متبحر عالم دین ہونے کے ساتھ ساتھ وطن کے بے لوث خادم اور تمام ہندو مسلمانوں کے مخلص رہنما اور سچے بہی خواہ تھے اور اس حیثیت سے نہ صرف ملک کی اجتماعی خدمت کرتے رہے، بلکہ انفرادی طور پر بھی بلا امتیاز ہندو مسلمان سب کے کام آتے رہے، وسیع النظری اور ملک کی مجموعی فلاح و بہبود اُن کی زندگی کا سب سے پیارا نصب العین تھا۔ جس کے لئے انھوں نے ہر طرح کی قربانی کی۔

ادارہ ہمدرد سے مولانا مرحوم کو ایک خصوصی تعلق تھا۔ اور ۱۹۴۸ء میں ہمدرد دواخانہ کے وقف ہوجانے کے بعد ان کا یہ تعلق اور بھی مستحکم ہوتا گیا۔ مرحوم نہ صرف ہمدرد وقف کی مجلس اعوان کے رکن اور عملاً سچے ہمدرد اور سرپرست تھے۔ بلکہ ہمدرد دواخانہ ملک کی جو صحتی، طبی اور فنی خدمات انجام دے رہا ہے اُن کے ایک پر خلوص مداح بھی تھے۔ مولانا مرحوم جناب حکیم عبدالحمید صاحب متولی ہمدرد کے خصوصی اور سچی احباب میں تھے۔ اور موصوف کے جذبۂ خدمت کو بہ نظر تحسین دیکھتے تھے۔ ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن سے مولانا کو دلی لگاؤ اور گہری دلچسپی تھی؛ جو نہ صرف ادارہ ہمدرد، بلکہ فن طب کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گی۔ ادارہ ہمدرد کو اس کا ناقابل اظہار رنج و ملال ہے کہ مولانا مرحوم کی وفات سے موصوف کے ساتھ ادارہ کے یہ رشتے منقطع ہوگئے اور ہندوستان ایک ایسے سچے ایمان دار اور مخلص خادم وطن سے محروم ہوگیا جس نے زندگی بھر فرقہ واریت کے خلاف جہاد کیا اور ملک کی سیکولر طاقتوں کو مضبوط بنانے کی ان تھک جدوجہد کی یوں تو مولانا مرحوم کی خوبیاں بے شمار تھیں مگر کردار کی یہ بلندی کسی کسی میں ہی دیکھنے میں آتی ہے کہ مولانا مرحوم اپنے بیگانے، دوست اور دشمن اور ادنیٰ و اعلیٰ سب کے بہی خواہ تھے اور سب سے بلا امتیاز یکساں طور پر ملتے تھے۔ اور سب کے کام آتے تھے۔ مولانا مرحوم صحیح معنوں میں ایک عوامی رہنما تھے جس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ ہر فرد بے روک ٹوک کسی بھی موقع پر ان کے پاس پہنچ جاتا تھا۔ اور وہ اس کی حتی الامکان مدد کرتے تھے۔

مولانا مرحوم عرصہ سے کینسر کے مریض تھے اور بہ غرض علاج متحدہ امریکہ گئے تھے جہاں سے حال ہی میں واپس آئے تھے۔

مولانا مرحوم کی وفات سے ملکی قومی اور علمی زندگی میں جو خلاء پیدا ہوگیا ہے، شاید ہی وہ پُر ہوسکے۔ دعا ہے کہ حق تعالیٰ آخرت میں ان مرحوم کے درجات بلند فرمائے اور ان کے پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ (آمین)

(ادارہ)

ماہنامہ بُرہان دہلی

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ۔ آہ! کیونکر کہیئے! جس کا کھٹکا شروع سے لگا ہوا تھا آخر وہی ہو کر رہا۔ آٹھ نو مہینہ کی اس درمیانی مدت میں وہ کون سا اعلیٰ سے اعلیٰ علاج تھا جس میں کوئی دقیقہ اٹھا کے رکھا گیا ہو۔ سیکڑوں ختم بخاری شریف کے ہوئے، ہزاروں لاکھوں اللہ کے نیک بندوں نے دعاء ہائے شبانہ کیں اکابر و بزرگان ملت نے غلاف کعبہ پکڑ کر منتیں مانیں مگر مشیت کا فیصلہ تھا وہ ہو کر رہا اور ۲ راگست کو آخری شب میں ملت اسلامیہ کے ترکش کا خدنگ آخری، علم و فضل کے خزانے کا گوہر شب چراغ، دُرج شرف و مجد کا دُرِّ تابندہ اخلاق و فضائل کا پیکر، ملک اور قوم کی وہ ساری متاع گرانمایہ اس عالم ناسوت کو خیر آباد کہہ کر ہمیشہ کے لئے جدا ہوگیا اور دنیا کو ایک ماتم سرا بنا گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

عربی کے مشہور شعر میں قیس کی جگہ "حفظ" رکھ دیجئے تو معلوم ہوگا کہ یہ شعر عرصہ پہلے کسی نے اسی موقع کے لئے کہا تھا۔

وما كان حفظٌ هلكه هلك واحد
ولكنه بنيان قوم تهدما

مولانا حفظ الرحمن یوں ہونے کو تو کیا نہیں تھے۔ علوم و فنون اسلامیہ کے بلند پایہ عالم، نامور مصنف، ولولہ انگیز خطیب اور مقرر، جنگ آزادی کے سپہ سالار اور ہیرو، مخلص اور بے لوث خادم ملک و ملت سبھی کچھ تھے مگر ملک کی آزادی کے بعد انھوں نے جو رول ادا کیا ہے اُس کی تاریخ اس قدر شاندار ہے کہ اس میں کوئی ایک شخص بھی اُن کا حریف و سہیم نہیں ہوسکتا بے لوث اور جانبازانہ خدمت کی وجہ سے اُن کے قومی کارناموں کا ریکارڈ اس درجہ بے داغ تھا کہ اُن کا بڑے سے بڑا مخالف بھی اُس پر حرف گیری نہیں کرسکتا تھا۔ اس کے علاوہ صاف دماغی اور معاملہ فہمی کا یہ عالم تھا کہ اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات اور بلند پایہ ارباب سیاست کے مجمع میں بیٹھتے تھے اور ان سے اپنی بات منوا کر اٹھتے تھے۔ پھر حق گوئی اور جرأت کی یہ شان کہ جس چیز کو حق سمجھا اسے برملا کہا اور ہر جگہ کہا۔ اس راہ میں اُن کو نہ اپنوں کی پروا ہوئی اور نہ پرایوں کی۔ فکر کی بلندی و آزادی اور جرأت حق گوئی کے باوجود اُن کا ظرف اس درجہ وسیع اور قلب اس قدر فراخ اور کشادہ تھا کہ بغض و عناد کبھی کسی شخص سے نہیں رکھا۔ دشمن سے بھی اسی خندہ پیشانی سے

ملتے تھے۔ جس سے اُن کے دوست بہرہ مند تھے۔ اور وقت پڑتا تھا تو اُن کی جو مدد بھی وہ کرسکتے تھے۔ بے دریغ کرتے تھے۔ خدمت کی راہ میں اپنے اور غیر دوست اور دشمن موافق اور مخالف اُس کا امتیاز انھوں نے کبھی روا نہیں رکھا۔ کام سے نہ کبھی گھبراتے اور نہ اکتاتے تھے۔ اُن کی زندگی ایک مشین کی طرح تھی جو برابر متحرک رہتی تھی۔ کھانا پینا آرام اور راحت، چین اور سکون اس کی کبھی پرواہ نہ کی یہ وہ خاص اوصاف و کمالات تھے جن کے باعث وہ عوام میں اور خواص میں حکومت میں ہندوؤں میں اور مسلمانوں میں ہر طبقہ اور ہر گروہ میں بے حد عزت واحترام سے دیکھے جاتے تھے۔ ان میں مقبول اور ہر دلعزیز تھے اور اُن کی بات کا ہر ایک پر اثر ہوتا تھا۔ اُن کی زندگی بالکل عوامی زندگی تھی۔ نہ دربان نہ کوئی روک ٹوک۔ ہر شخص میں یکجا نظر آئینگے اسی وجہ سے اُن کی شخصیت سب سے نمایاں اور برتر اور بڑی حسین و دلکش اور جاذبِ نظر تھی۔ وہ صرف "مجاہد ملت" نہیں تھے۔ جیسا کہ لوگ عام طور پر انھیں سمجھتے اور لکھتے تھے۔ بلکہ درحقیقت اس خود غرضی کی مادی دنیا میں انسانی شرف و مجد کی آبرو، اعلیٰ اقدار حیات کی عزت اور شرافت ونجابت کی مکمل تصویر تھے۔ اس لئے صرف مسلمانوں کے لئے ہی نہیں بلکہ ملک و وطن کے ہر فرد اور ہر شخص کے لئے اُن کی زندگی نمونۂ عمل اور لائق تقلید تھی! کانگریس اور جمعیۃ علماء کی ہنگامہ آفریں تاریخ میں بار ہا ایسے نازک اور پیچیدہ مواقع آتے ہیں۔ جب کہ اُن کے ناخن فہم وتدبر نے عقدہائے مشکل کی گرہ کشائی کرکے ان دونوں اداروں کو عظیم خطرات سے بچالیا ہے۔ چنانچہ ۳ اگست کی شام کو دلی کے دربار ہال میں تعزیتی تقریر کرتے ہوئے موجودہ صدر کانگریس شری سنجیوا ریڈی اور ہوم منسٹر لال بہادر شاستری جی نے اور اس کے بعد ایک اور جلسہ میں پنڈت جواہر لال نہرو اور دوسرے زعمائے صاف لفظوں میں اس کا اعتراف کیا ہے وہ جمعیۃ علماء ہند کے جنرل سکریٹری منتخب ہوئے تو آخر تک رہے پارلیمنٹ کے ممبر چنے گئے تو اسی حالت میں دنیا سے رخصت ہوئے۔ وجہ یہی ہے کہ جس کام کو ہاتھ میں لیتے تھے اسے خوبی، تندہی اور خلوص و قابلیت سے انجام دیتے تھے۔ کہ پھر اُن کی قائم مقامی کرنے کے لئے کوئی دوسرا شخص نظر نہیں آتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد کے بعد یہ دوسرے شخص تھے جنھوں نے مدرسہ کے بوریوں پر بیٹھ کر قدیم تعلیم حاصل کرنے کے باوجود عام ہندو اور مسلمانوں کے علاوہ انگریزی کے اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ کو بھی اپنی ذہانت، وذکاوت، معاملہ فہمی ودوراندیشی اور قوتِ عمل سے اس درجہ غیر معمولی طور پر متاثر کیا تھا۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ تعلیم قدیم وجدید کا فرق کوئی فرق نہیں ہے۔ دماغ روشن اور دل بیدار ہو تو انسان ہر مجلس میں ممتاز اور قائدین کر رہ سکتا ہے۔

یہ تو مولانا کے وہ اوصاف وکمالات ہیں جو اُن کی پبلک زندگی سے واقفیت رکھنے والا ہر شخص جانتا اور محسوس کرتا ہے ان کے علاوہ ہم لیس رہروانِ کاروان عدم نے رفقائے کار کی حیثیت سے خلوت میں جلوت میں گھر میں اور دفتر میں غرض کہ زندگی کے ہر مرحلہ اور ہر موڑ میں کم وبیش مسلسل چالیس برس تک مرحوم میں کیرکٹر کی بلندی، کردار کی پختگی، خوبی اور قلب ونظر کی پاکبازی وپاک طینتی کے جو حسین و دلکش اور گوناگوں مناظر دیکھے ہیں انہیں قلم بند کرنے کے لئے فرصت اور ایک دفتر درکار ہے صحیح معنی میں ہر بڑے انسان کی پبلک زندگی میں اُس کا جو کردار نظر آتا ہے۔ وہ دراصل صرف ایک پرتو ہوتا ہے اُس کے جوہر فطرت وطبعیت کا جس کے سورج کا مطلع خود اس کا اپنا گھر ہوتا ہے" آہ! اب اُن کی کس کس بات کو یاد کرکے روئیے اور کس کس خوبی کا تذکرہ کرکے دامانِ دل کو خونابہ جگر کے قطروں سے لالہ زار بنایئے۔ ان سطور کی تحریر کے وقت جب کہ قلب ودماغ پر حسرت کے ساتھ گمشدگی وحیرت کی جو کیفیت طاری ہے قلم آخر لکھے تو کیا لکھے۔

سماں کل کا رہ رہ کے آتا ہے یاد
ابھی کیا تھا اور کیا سے کیا ہو گیا

اللہ اکبر! آپ کا شوقِ تیز رفتاری بھیا! اور ہر چیز میں یہاں تک کہ کھانے پینے، چلنے بولنے اور تقریر کرنے میں بھی اپنے ساتھیوں پر سبقت لے جانے کا جذبہ! آخر یا ایتھا النفس المطمئنۃ ارجعی الی ربک کی دعوت پر لبیک کہنے میں بھی وہی جذبہ کارفرما رہا۔ اور اس منزل میں بھی اپنے ساتھیوں سے پیچھے رہنا طبع غیور کو گوارا نہ ہوا۔ اچھا خیر! یہی سہی۔ مگر پھر یہ طعنۂ پسماندگی کیا؟ آپ عقلمندوں کے عقلمند اور فرزانوں کے فرزانہ تھے! مگر آج عمر میں پہلی بار اور آخری بار بھی غالب کے لفظوں میں آپ کو نادان کہنے کو جی چاہتا ہے۔ ہر چند کہ اس گستاخی پر طبیعت شرمندہ اور منفعل ہی ہے۔"

نادان ہو جو کہتے ہو کہ کیوں جیتے ہیں غالب
قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور

معارف اعظم گڑھ

جس حادثہ کا دھڑکا عرصہ سے لگا ہوا تھا بالآخر وہ پیش آ ہی گیا۔ اور مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب ۲ اگست ۱۹۶۲ء کو صبح صادق کے وقت اپنے رب کے حضور میں حاضر ہو گئے۔ موت کوئی غیر معمولی واقعہ نہیں ہر وقت اس کا بازار گرم رہتا ہے، روزانہ ہزاروں لاکھوں انسان مرتے رہتے ہیں، مگر کسی کو اس کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ لیکن بعض موتیں وہ ہوتی ہیں جن سے ایک قوم اور ایک ملت کی پوری عمارت متزلزل ہو جاتی ہے۔ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی وفات بھی انہی میں سے ہے۔

فما کان قیس هلکه هلك واحد
ولکنه بنیان قوم تهدما

ان کی موت سے ہماری قومی و ملی عمارت کا بہت بڑا ستون گر گیا۔ مولانا کی پوری زندگی اور زندگی کا ہر لمحہ ملک و ملت کی خدمت میں گذرا، حتیٰ کہ مرض الموت میں بھی اس سے غافل نہ رہے اور اپنی ان تھک محنت سے اس راہ میں جان تک دیدی، اس لئے اگر زندگی میں وہ مجاہد ملت تھے تو موت کے بعد شہید ملت ہیں۔

ان کی پوری زندگی ایک سعی پیہم اور جہد مسلسل تھی جس سے ان کو ہندوستان کی آزادی کے بعد بھی نجات نہیں ملی۔ آزادی نے جنگ آزادی سے بھی زیادہ مشکل اور پیچیدہ مسائل پیدا کر دیئے تھے، ایک طرف فرقہ پرستی کا سیلاب تھا جو آزادی کے اصل مقصد ہی کو خس و خاشاک کی طرح بہائے لئے جا رہا تھا، دوسری طرف مسلمانوں کے سنگین مسائل تھے۔ تیسری جانب ملکی و وطنی مصالح اور صحیح جمہوری اور سیکولر بنیادوں پر آزاد ہندوستان کی تعمیر تھی۔ اس بحرانی دور میں ان سب سے عہدہ برآ ہونا آسان نہ تھا۔ فرقہ پروری نے بڑے بڑے قوم پروروں کے قدم اکھاڑ دیئے تھے۔ مگر اس وقت بھی مولانا صحیح قومی اصولوں پر قائم رہے اور ان سارے فرائض کو اس خوش اسلوبی سے ادا کرتے رہے کہ ان کا کوئی مخالف بھی حرف گیری نہیں کر سکا۔

مسلمانوں کی اس بے بسی کے دور میں مولانا کی ذات بہت بڑا سہارا تھی اور اس راہ میں ان کے کارنامے بے نظیر ہیں، ان کے بعد کوئی ایسی شخصیت نظر نہیں آتی جو مسلمانوں کی مظلومیت اور حق تلفی پر اس جرأت و بیباکی کے ساتھ آواز بلند کر سکے اور وہ موثر بھی ہو، یوں تو زبانی شور و غوغا کرنے والے بہت ہیں، لیکن اس کی حیثیت صدا بصحرا سے زیادہ نہیں ہے۔

مولانا ہندوستان کی جنگ آزادی کے ممتاز سپہ سالاروں میں تھے، انھوں نے چوٹی کے لیڈروں کے دوش بدوش کام کیا تھا۔ ان کا دامن فرقہ پرستی کے داغ سے بالکل پاک تھا۔ ان کی پشت پر خدمات اور قربانیوں کی ایک پوری تاریخ تھی۔ اس لئے ان کی آواز میں قوت بھی تھی۔ اور ایک حد تک اثر بھی تھا۔ ان کے بعد کوئی ایسی شخصیت باقی نہیں ہے۔ ہر طرف سناٹا نظر آتا ہے۔

ع افسوس کز قبیلۂ مجنوں کسے نماند

اس لئے ان کی موت ملک و ملت خصوصاً مسلمانوں کا ایسا نقصان عظیم ہے جس کی تلافی نہیں ہو سکتی، اللہ تعالے اس مجاہد ملت کی خدمات کو قبول اور عالم آخرت کی سربلندیوں سے سرفراز فرمائے۔ (آمین)

"تجلی" دیوبند

کچھ لوگ مرتے ہیں تو ایک آنکھ بھی ان پر رونے والی نہیں ہوتی۔ کچھ لوگ مرتے ہیں تو احباب و اقربا کا ایک محدود حلقہ ان پر آنسو بہا لیتا ہے۔ لیکن کچھ لوگ مرتے ہیں تو ادھر سے ادھر تک فضاء میں اندوہ ملال کا غبار بکھرتا چلا جاتا ہے۔ اور کوئی نہیں گن سکتا کہ کتنی آنکھیں اشکوں سے نہا گئیں ان کی موت پر روحیں تڑپ اٹھتی ہیں۔ دماغ لو دے جاتے ہیں اور احساس کے ماتھے پر پگھلی ہوئی چنگاریاں پسینہ بن کر پھیل جاتی ہیں۔

کیا شک ہے کہ مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن قدس اللہ سرہ العزیز ایسی ہی بلند مرتبہ اور ذی شان ہستیوں میں سے تھے۔ جن کی موت نے ہر اس شخص پر غم کا پہاڑ توڑ دیا ہے۔ جسے مرحوم و مغفور کے اوصاف عالیہ اور محاسن و محامد کا ادراک ہے۔ جس کے سینہ میں دل مر نہیں چکا ہے اور جو اپنے ملک و ملت کے مخصوص حالات و مسائل کا شعور رکھتے ہوئے اس حقیقت کو سمجھتا ہے کہ مولانا حفظ الرحمٰن طاب اللہ ثراہ کا وجود نامساعد حالات کی ماری ہوئی امت مسلمہ کے لئے آج کس قدر اہم تھا۔

کوئی برا مانے یا حیرت کرے ہم تو بلا خوف تردید عرض کریں گے کہ مولانا آزاد علیہ الرحمۃ کی موت کا حادثہ اگرچہ بہت بڑا تھا۔ لیکن اثرات و نتائج کے اعتبار سے مجاہد ملت کی موت امت مسلمہ کے لئے زیادہ کاری زخم ہے مولانا آزاد اپنے پیچھے اور تبرے ہلکے اور بھاری اعمال کا سرمایہ سونپ گئے۔ دوسری دنیا میں جا چکے ان کے لئے سوائے حسن ظن سوائے عقیدت ہوائے

دعلمائے مغفرت کے ہمارے پاس اب کچھ نہیں ہے ان کے علم وفہم، ان کی ذکاوت وجودت انکی تحریر وتقریر ان کی امتیازی آن بان سے صرف نظر تو بھلا کون کم سواد کر سکتا ہے۔ لیکن یہ صداقت بہرحال اپنی جگہ ناقابل تردید ہے کہ انکی رنگا رنگ صلاحیتوں کا پورا شباب، ان کی ساری توانائیاں جنگ آزادی کی نذر ہوتی رہیں اور جب آزادی کا سورج ہم پر طلوع ہوا تو وہ اپنی بیش بہا صلاحیتوں کا دامن سمیٹ کر اعزاز ومنصب کی ان بلندیوں پر جا بیٹھے تھے۔ جو اگرچہ بجا طور پر فاتح سورماؤں کا حصہ ہوا کرتی ہیں، لیکن تاریخ کے چند منفرد اور خال خال مثالوں کے سوا وہاں تک عوام کے دل کی دھڑکنیں اور جمہور کے احساسات کی آہٹیں کبھی پہنچا نہیں کرتیں

لیکن مولانا حفظ الرحمٰن نوراللہ مرقدہٗ تو ان مجاہدوں میں تھے جنھوں نے عین میدان جنگ میں جان دی یہ محض استعارہ نہیں ایک سامنے کی حقیقت ہے کہ آزادی کے بعد بھی تعصب، تنگ نظری، فرعونیت اور ظلم کی طاقتوں کے ہاتھوں ہمارا وطن امت مسلمہ کے لئے ایک جنگاہ، ایک کارزار بنا ہوا ہے۔ جہاں مسلمان مسلسل مداہنت، فریاد واحتجاج اور کرب واضطراب کا مجسمہ بن کر رہ گئے ہیں۔ اور ایک جارحانہ ذہن بے تکان ان پر جبر وجور کے ترکش خالی کر رہا ہے۔ مولانا حفظ الرحمٰن علیہ الرحمۃ ظلم وطغیان کی ان طاقتوں سے بزد آزمائی کرنے والوں کی صف اول کے مجاہد تھے۔ وہ جسمانی اعتبار سے نحیف لیکن جرأت وہمت کے لحاظ سے بڑے شجاع تھے۔ شیر دل تھے، جیالے اور نڈر تھے۔ ان کی زندگی کے تقریبًا چالیس سال اسی جنگ میں اس سورما کی طرح گزرے ہیں جو اپنا کفن سر سے باندھے حریف کے آگے مستقل ڈٹا ہوا ہو۔ انھوں نے دوہری انتہائیں جھیلیں ہیں۔ جو ملکی جنگ لڑی ہے۔ ایک طرف انھیں اپنی ہی ملت کے افراد سے دست وگریباں ہونا پڑا۔ جو ان کی دانست میں غلط فکر ونظر کے علمبردار تھے۔ تیکھی عناصر کے حاملوں سے وہ بڑی بے جگری کے ساتھ نبرد آزما رہے ہیں۔ اور دوسری طرف امت مسلمہ کو باطل اور جارحانہ عزائم کے بے تحاشہ برسنے والے تیروں سے بچانے کی انتھک جدوجہد انہوں نے اس وقت تک جاری رکھی جب تک تقدیر الٰہی نے انھیں بستر کا پیوند بن جانے پر مجبور نہیں کردیا۔ اللہ اللہ کیسے انتھک۔ بیباک، سیماب وش، سرگرم اور جفاکش تھے۔ مولانا حفظ الرحمٰن رحمۃ اللہ تعالیٰ ایک شعلۂ جوالا۔ ایک موج رواں۔ ایک جہد مجسم۔ ایک نہ سرد ہونے والی لگن۔ ایک ایسا پیکر امید جس نے انتہائی مایوس کن حالات میں بھی امید کا دامن نہیں چھوڑا۔ اور مسلمانوں کو للکارا کہ نادانو! محکومت، خوف زدہ مت ہو، یہ ملک تمہارا ہے، یہ زمین وآسمان تمہارے ہیں۔ متحد ہو کر ظلم کی طاقتوں کا مقابلہ کرو۔ اور ثابت کرو کہ وطن کی محبت میں ہم کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔

ہم اس حقیقت کو چھپانا نہیں چاہتے کہ جمعیۃ العلماء کے سیاسی فکر سے ہمیں کامل اتفاق نہیں اور کبھی نہ ہوا۔ ہمارے پاس اختلاف کے متعدد دلائل تھے اور ہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ اس اعتراف سے بھی ہمیں کوئی روک نہیں سکتا کہ مولانا حفظ الرحمٰن خداداد صلاحیتوں اور قابل رشک محاسن ومحامد کے اعتبار سے بہت ممتاز تھے۔ ان کے اخلاص اور دردمندی میں بھی دو رائے کی گنجائش نہیں ہے۔

ان کی حیات قوم وملت کے لئے بڑی قیمتی تھی وہ مضبوط سہارا تھے۔ اور آج جب کہ وہ اپنے اعمال کا دامن سمیٹ کر اپنے رب سے جا ملے ہیں۔ تو یہ ہمارے لئے ایک یاس انگیز ساعت ہے، ایک کربناک لمحہ ہے ایک حادثہ عظیم ہے موت کا فرشتہ اگر اللہ جل شانہٗ کا تابع فرمان نہ ہوتا تو ہم فرط غم میں یہ کہنے سے بھی نہ چوکتے کہ مجاہد ملت کی روح قبض کرنے میں اس نے جلد بازی کی ہے۔ موصوف اگرچہ جواں سال نہیں تھے۔ کہ ہم غالب کی زبان میں کہیں ؎

ہاں اے فلک پیر جوان تھا ابھی عارف
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

لیکن اتنے عمر رسیدہ بھی نہیں تھے کہ دس سال اور جیتے تو عجوبہ کہلاتا مگر ہمارے منہ میں خاک کوئی بڑے سے بڑا حادثہ اور عظیم سے عظیم ابتلاء بھی خالق حکیم ودانا کی مصلحتوں سے خالی نہیں ہوا کرتا۔ جو قیامت ہم پر ٹوٹتی ہے اس کا حق ہے کہ ٹوٹے کیونکہ جو کچھ جب وقت ہوتا ہے وہ اسی لائق ہے کہ اسی وقت ہو۔ تقدیر الٰہی میں جہاں انحراف نہیں وہیں خطا بھی نہیں تعالیٰ اللہ عزوجل۔

حاصل تعزیت یہ ہے کہ جب وقت ہمیں شیر دل اور مخلص مجاہدوں کی سب سے زیادہ ضرورت تھی اس وقت مولانا حفظ الرحمٰن جیسے سخت کوش بلند حوصلہ اور انتھک بزرگ کا اٹھ جانا ایک ایسے ستون کا گرجانا ہے جو ملت مسلمہ کے عزم وہمت کی گرتی ہوئی دیواروں کا سہارا بنا ہوا تھا جس نے ۱۹۴۷ء کی قیامت صغریٰ میں آگ اور خون کے سیل تند سے گذرتے ہوئے بے شمار انسانوں کو پیام حیات دیا تھا۔ اور اس کے بعد سے مسلسل اب تک وہ ہر محاذ پر اپنی تمام صلاحیتوں کو اپنے نقطۂ نظر کے مطابق ملک وملت ہی کی خدمت اور عدل وصداقت ہی کے گیسو سنوارنے پر کھپا رہا تھا۔

ستم ظریفی یہ ہے کہ ہماری قوم ایک طویل عرصہ سے مردہ پرست ہے!

وہ زندوں کو بہت کم شمار میں لاتی ہے۔ مگر جب وہ مر جاتے ہیں تو ان کی عقیدت و محبت کا پرچم ساتویں آسمان پر پہنچا دیتی ہے۔

آپ دیکھتے ہی ہیں کہ جب کوئی بزرگ دار فانی سے تشریف لے جاتے ہیں تو کتنے ہی دنوں تک ماتم سرائی کا وہ غلغلہ بلند رہتا ہے کہ گویا سینے پھٹ جائیں گے۔ اور دل و جگر اشک بن کر بہہ جائیں گے۔ جا اور بے جا صحیح اور ہر طرح کی تعریفوں کے پل باندھ دیئے جاتے ہیں۔ نظم و نثر کی ساری استعداد ختم کر دی جاتی ہیں لیکن مرنے والے کی زندگی میں ان قصیدہ سرائوں نے کس حد تک عقیدت و انقیاد کا ثبوت دیا اور عملاً اس کے کاز کو کتنی تقویت پہنچائی۔ یہ سوال دردناک ہی دردناک ہے خود مولانا حفظ الرحمٰن کو بھی زندگی میں یہی ملال رہا کہ جس محاذ پر انھیں زبانی جمع خرچ کی نہیں عملی تعاون کی ضرورت تھی وہاں وسیع معنوں میں انھیں تعاون نہ مل سکا۔

جو لوگ مولانائے مرحوم کی محبت کے دعویدار ہیں انھیں آہ و شیون اور قصیدہ سرائی سے جلد فراغت حاصل کر لینی چاہئے۔ اگر حضرت حسین رضی اللہ عنہ جیسے بزرگ کا صدہا سالہ ماتم کسی مریض کا علاج نہیں بن سکا تو اور کسی کی طرح میں عزاداری کیا ثمر دے گی۔ محبت کا حقیقی تقاضا یہ ہے کہ جس جس مسلک کو مرحوم نے اپنایا تھا آپ بھی اسی کو حرزِ جان بنائیے۔ آپ اگر نظریاتی پہلو سے ان سے کچھ اختلاف بھی رکھتے ہیں تو جدوجہد، سرگرمی، تہور، تندہی اور ایثار و اخلاص میں تو بہرحال ان کی تقلید امر لازم ہے۔ اگر انہیں دوسروں کی طرح مرثیے ہی پڑھتے ہیں تو سمجھ لیجئے مرحوم کی روح آپ کی طرف سے کبھی مطمئن نہ ہوگی۔ اللہ تعالیٰ انھیں اپنے فضل و رحمت سے نوازے اور ہمیں آپ کو خدمت ملک و ملت کی توفیق دے مولانائے مرحوم کے پس ماندگان سے ہم تہہ دل کے ساتھ اپنی غمگساری اور نیک خواہشات کا اظہار کرتے ہیں۔ نیز جمعیۃ علماء کے ارباب حل و عقد سے ملتمس ہیں کہ مایوس و دلگرفتہ نہ ہو جائیں۔ انسان مرنے ہی کے لئے پیدا ہوا ہے۔ جدوجہد کا میدان بہرحال جوں کا توں ہے۔ مایوسی اور باہمی جنگ کے انتشار سے دامن بچا کر مولانائے مرحوم کے کاز کو تکمیل تک پہنچانا ہی چاہئے۔ اور اگر طبع نازک پر گراں نہ ہو تو یہ گزارش بھی ہم ادب کے ساتھ کریں گے کہ نظری اور عملی اعتبار سے بعض خامیاں جمعیۃ العلماء میں پائی جاتی ہیں ان پر بھی بے نفسی اور دیانت کے ساتھ توجہ کرنی چاہئے۔ خود تنقید ترقی کا زینہ ہے۔ اگر جمعیۃ کے ارباب حل و عقد خلوص کی سطح پر آکر غور کریں گے تو انھیں پہلے ہی مرحلے میں اس کی ضرورت محسوس ہوگی۔ کہ بگڑے بندھے خطوط عمل میں کچھ نہ کچھ تبدیلیاں ضرور ہونی چاہئیں۔ یہ محض اشارہ ہے تفصیل پر غور کرنا ارباب جمعیت کا کام ہے۔

تذکرۂ دیوبند

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ میرے ہم وطن بھی تھے اور مخصوص تعلقات کی بناء پر مجھے ابتدائے ہوش سے ہی ان کو بہت ہی قریب سے دیکھتے رہنے کا مسلسل موقعہ بھی ملتا رہا ہے چنانچہ اپنی اس دیرینہ واقفیت کی بناء پر میں پورے وثوق کیساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ان کی وفات حسرت آیات سے نہ صرف یہ کہ ہم ملک و ملت کے ایک عظیم راہنما جلیل القدر مفکر بلند پایہ مصنف اور وسیع النظر عالم نیز بے مثل خطیب اور نامور ادیب سے محروم ہو گئے ہیں بلکہ اس کے ساتھ ہی ایک پیکرِ وفا، مجسمۂ ایثار شخصیت بھی ہم سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئی۔ وللہ ما اخذ ولہ ما اعطیٰ

اس موقعہ پر قلب مضطر کا بے اختیار تقاضہ ہوا کہ ان کی یاد میں سوانح حیات کے حیات افروز واقعات قطرات غم کے طور پر نذر قرطاس کروں۔ پیش نظر یہ غیر مربوط سطور اسی اضطراب دلی کا نتیجہ ہیں۔

حضرت مولانا کا اصلی نام معز الدین تھا۔ آپ کے سب سے بڑے بھائی ڈپٹی فخر الدین صاحب ہیں جو اب بھی بقید حیات ہیں۔ مجھلے بھائی مولوی بدر الدین صاحب وکیل تھے۔ جن کا انتقال ہو چکا۔ ان سے چھوٹے مولانا اور مولانا سے چھوٹے حکیم صلاح الدین صاحب ہیں۔ جو ضلع بجنور کے مشہور اور حاذق اطباء میں سے ہیں "حفظ الرحمٰن" مولانا کا تاریخی نام تھا، جو اصل نام پر غالب ہو چکا تھا مولانا فرمایا کرتے تھے کہ ان کے تاریخی نام میں رحمان کے رسم الخط میں الف شامل ہے، اس طرح مولانا کا سن ولادت ۱۳۱۸ھ ہے آپ کے والد ماجد حاجی شمس الدین صاحب قصبہ سیوہارا کے مشہور زمیندار اور معززین میں سے تھے۔ اور علمائے حق اور اکابر اہل اللہ کیساتھ ہمیشہ وابستہ رہتے تھے حاجی صاحب مرحوم حضرت مولانا فضل الرحمٰن گنج مراد آبادی قدس سرہٗ سے بیعت تھے۔ خاندانی اعتبار سے مولانا صدیقی النسل تھے۔ مولانا کا خاندان ہمیشہ سے علمی خاندان رہا اور نامور علماء ادباء آپ کے خاندان میں ہوتے چلے آئے ہیں، مولانا کے والد ماجد حاجی صاحب مرحوم نے مولانا کو ہونہار اور ذہین دیکھ کر ارادہ کیا کہ مولانا کو علوم عربیہ کی تعلیم دلائی جائے۔ چنانچہ یہ انتخاب نتیجہ خیز ثابت ہوا۔ شروع میں اپنے مکان ہی کے مکتب میں ابتدائی تعلیم حاصل کی اس کے بعد کچھ تعلیم شاہی مسجد مراد آباد میں حاصل کی

ازاں بعد دورہ حدیث تک مدرسہ فیض عام سیوہارہ میں مشغول تعلیم رہے اور دورہ حدیث کی تکمیل حضرت مولانا سید عبدالغفور صاحب سیوہاروی تلمیذ رشید سید العلماء مولانا سید احمد حسن صاحب امروہی قدس اللہ سرہ العزیز سے کی ازاں بعد مولانا مرحوم ازہر ہند دارالعلوم دیوبند تشریف لائے اور بحرالعلوم حضرت مولانا سید انور شاہ کشمیری قدس سرہ اور حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہم سے دوبارہ دورۂ حدیث وغیرہ کی تکمیل فرمائی۔ اور اپنی مخصوص ذکاوت کی بنا پر ان اکابر کے مخصوص تلامذہ میں آپ کا شمار ہوا۔ مولانا کی ایک خصوصیت جو کم حضرات کو حاصل ہو سکی ہے یہ ہے کہ ابتدائے طالب علمی سے لیکر انتہائے تکمیل تک، تمام اساتذہ آپ پر بے حد مہربان رہے ہیں، اور آپ ہر ایک کی خصوصی توجہات کا مرکز بنے رہے ہیں۔ اسی کے ساتھ حضرت مولانا پر حضرت حق جل مجدہ کا یہ بھی خاص انعام تھا کہ وقت کے اہل اللہ کو آپ سے دلی تعلق رہا ہے، اس سلسلے کا ایک واقعہ یاد آتا ہے کہ تقریبًا دس بارہ سال ہوئے سیوہارہ میں احقر کے غریب خانہ پر، عارف باللہ شیخ اکمل حضرت مولانا شاہ عبدالقادر صاحب رائپوری قدس اللہ سرہٗ رونق افروز تھے مجلس میں مولانا کا ذکر آگیا۔ حضرت شاہ صاحب نے ارشاد فرمایا کہ فسادات کے زمانہ میں دہلی کے اندر مسلمانوں کے بچانے کے سلسلے میں مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے جو خدمات انجام دی ہیں میں ان کے بدلے میں اپنی پوری عمر کے اذکار واشغال نثار کرنے کو تیار ہوں الفاظ میں شاید فرق ہو لیکن مفہوم یہی تھا۔ اللہ اکبر ایک عارف باللہ شیخ کامل کا یہ ارشاد حضرت مولانا کی عند اللہ مقبولیت کی کس درجہ اہم سند اور شہادت ہے۔

خوب یاد ہے کہ ایام طالب علمی میں صبح کے وقت مولانا مدرسہ فیض عام میں تشریف لائے اور حضرت الاستاد حافظ احمد حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے جو ایک صاحب نسبت بزرگ بھی تھے۔ اپنا تازہ خواب بیان کیا کہ آفتاب آہستہ آہستہ نیچے اتر کر میرے سامنے آگیا ہے۔ اور میں اس کو نگل گیا ہوں، حافظ صاحب نے فیضان علم کی بشارت دی۔ حضرت مولانا میں ابتدا ہی سے خدمت خلق بالخصوص بے کس و بے بس مخلوق کی خدمت کا بے پناہ جذبہ موجزن رہتا تھا۔ اور جب بھی کسی عام یا خاص پریشانیوں کا زمانہ آتا تھا، مولانا پوری جانبازی وجانثاری کے ساتھ خود کو پیش کردیا کرتے تھے، یہی جذبہ آئندہ چل کر ملکی وملی تحریکات میں ان کی قیادت اور پیش پیش رہنے کا باعث ہوا غالبًا مولانا کے ایام طالب علمی ہی کا یا اس کے کچھ بعد کا واقعہ ہے کہ سیوہارہ میں ایک نومسلم جذامی کے انتقال کی پولیس نے اطلاع دی، مولانا چند اشخاص کو ساتھ لیکر کوڑھی بستی میں پہونچ گئے، مرحوم نومسلم کی یہ دردناک کیفیت دیکھنے میں آئی کہ اعضاء بدن بڑی حد تک جذام سے گل چکے تھے، اور اس قدر بھیانک نقشہ تھا کہ ہر کوئی پاس جاتے ہوئے گھبراتا تھا۔

مولانا نے ایک سقہ کو پانی لانے کے لئے مامور کیا اور کپڑے کے دستانے پہن کر بسم اللہ توکلت باللہ، کہکر بلا تکلف غسل مسنون دینا شروع کردیا، سقہ دور سے پانی کی دھار چھوڑ رہا تھا۔ اور مولانا اور ایک دو شخص ان کے ساتھ پورے اطمینان سے اپنے ہاتھوں سے اس کو غسل دیکر اس کو کفن پہنا کر چارپائی پر لائے اور نماز پڑھکر دفن کیا، اس قسم کے واقعات سے مولانا کی زندگی بھرپور ہے۔

احترام اکابر حضرت مولانا کی زندگی میں ہمیشہ نمایاں رہا ہے اور یہ جذبہ فداکاری وجانثاری کی حد تک پہونچا ہوا تھا۔ ۱۹۴۷ء سے پہلے کا واقعہ ہے کہ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی قدس اللہ سرہٗ کے ساتھ مولانا ریل میں تشریف لا رہے تھے، مشرقی پنجاب کے ایک اسٹیشن پر جب ٹرین پہونچی تو ایک مخالف مجمع نے جس کا اختلاف سیاسی نوعیت کا تھا، حضرت شیخ الاسلام رح پر سنگباری شروع کردی، مولانا نے حضرت شیخ رح کو آڑ میں لے کر خود کو بلا تامل مجمع کے سامنے پیش کردیا۔ اور اب مولانا پر براہ راست پتھر برسنے لگے حتی کہ ایک پتھر نازک موقع پر آکر لگا، فرماتے تھے کہ یہ تہیہ کر چکا تھا کہ جب تک حفظ الرحمٰن کے بدن میں جان موجود ہے، حضرت شیخ پر آنچ نہ دونگا۔ اسی سنگباری کے سلسلے کا ایک واقعہ یہ بھی ہے کہ جو مجھ سے حضرت اقدس مولانا رائے پوری دامت برکاتہم نے بیان فرمایا کہ پاکستان میں کسی مقام پر ایک شخص ان کو ملا اور بے اختیار رونے لگا۔ دریافت کرنے پر اس نے یہ داستان سنائی کہ وہ مشرقی پنجاب کا رہنے والا ہے اور جس مجمع نے حضرت شیخ پر سنگباری کی تھی بدبختی سے یہ بھی اس میں موجود تھا۔

اس نے بتلایا کہ اس مظاہرہ کے موقع پر اپنی تشفی غیظ کیلئے اس نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ برہنہ ہوکر حضرت شیخ رح کے سامنے ناچنے لگا۔ واقعہ رفت وگذشت ہوگیا لیکن لا یضل ربی ولا ینسیٰ کچھ عرصہ بعد جب پنجاب میں ہولناک فسادات ہوئے تو سکھوں نے اس کے

ساتھ یہ طریقہ برتا کہ اس کو ایک ستون سے باندھ دیا گیا اور گھر کی بہو بیٹیوں کو اس پر مجبور کیا کہ وہ برہنہ ہو کر اس کے اور مجمع کے سامنے ناچیں، وہ کہتا ہے کہ اس وقت میرا ذہن اس طرف منتقل ہوا کہ آج کا یہ ناچ اس برہنہ ناچ کا قدرتی انتقام ہے، جو حضرت "شیخ الاسلام" کی اہانت کی غرض سے میں نے کیا تھا۔

حضرت مولانا پیکر وفا اور مجسمۂ شرافت وانسانیت تھے۔ انتقام سے آپ کا قلب قطعاً نا آشنا تھا، میری نگاہ میں ایسی بہت سی مثالیں موجود ہیں کہ تحریکات کے زمانہ شباب میں لوگوں نے مولانا کو اذیتیں پہونچائیں اور توہین و تذلیل کے طریقے اختیار کئے لیکن آزادی ہند کے بعد انہیں اشخاص نے اپنی ضرورتوں میں مولانا سے امداد طلب کی اور بلا دریغ بغیر کسی ادنیٰ تامل کے مولانا نے ان کی مدد کی اور حرف شکایت کا زبان پر لانا تو در کنار کبھی پیشانی کی چتونوں سے بھی اس شکایت کی یاد تازہ نہ ہونے دی، بلکہ نہایت خندہ پیشانی سے ہمیشہ ان کے ساتھ پیش آتے رہے۔ حتیٰ کہ مولانا کے ان اخلاق کریمانہ سے متاثر ہو کر وہ لوگ مولانا کے گرویدہ اور شیفتہ بن گئے۔

حضرت مولانا نہایت جری انسان تھے، اور اعتماد علی اللہ سے ان کا قلب معمور تھا، آزادی ہند کے بعد بگڑے ہوئے حالات میں یہاں کے مسلمانوں کو یہی وہ جرأت، خودداری اور اعتماد علی اللہ کا درس دیا کرتے تھے۔ اور بھارت کے مسلمانوں کی مشکلات کا ان کے نزدیک یہی واحد علاج تھا۔ سن سینتالیس ۱۹۴۷ء اور اس کے بعد کے ہنگاموں میں۔ حضرت مولانا نے جرأت واستقامت کا جو اعلیٰ کردار پیش کیا ہے وہ ان کی سوانح حیات کا نہایت روشن باب ہے، اور مسلمانان ہندوستان اس سے بخوبی واقف ہیں۔ ۱۹۴۷ء کے ہنگاموں سے متعلق ایک مرتبہ میں نے مولانا سے دریافت کیا کہ دہلی میں گولیوں کی بوچھار اور تلوار کی جھنکار میں سے آپ کس طرح گذر جایا کرتے تھے۔ اس سوال کے جواب میں جو کچھ فرمایا، اس سے ان کی انتہائی حوصلہ مندی اور اعتماد علی اللہ کا اظہار ہوتا ہے۔ اسی سلسلہ میں یہ بھی فرمایا کہ ایک خدا رسیدہ بزرگ نے مجھکو (سورۂ اخلاص کا) ایک خاص عمل تلقین فرمایا تھا، اس دور میں وہ عمل میرے ورد میں رہتا تھا۔

مجاہد ملت حضرت مولانا پرانے بزرگوں کی مانند وضع داری میں بہت پختہ تھے، جس کسی جگہ ایک دفعہ بھی تعلق اور ربط پیدا ہو گیا تو ہمیشہ اس کو نبھایا۔ اس ذیل کا ایک واقعہ یہ ہے کہ تقریباً تیس سال سے بھی زائد عرصہ تک حضرت مولانا کا یہ معمول رہا کہ دن کی ٹرین سے جب بھی سیوہارہ تشریف لاتے، تو اسٹیشن سے اول برادر محترم حاجی حبیب الرحمٰن صاحب مرحوم کے پاس رونق افروز ہوتے، بھائی صاحب مرحوم مولانا کے مخصوص ترین دوست اور بقول حضرت مولانا کے لنگوٹی دوست تھے، پھر صبح نو بجے سے دو پہر تک اور عصر سے تقریباً عشا تک تقریباً روزانہ غریب خانہ ہی پر وقت گذارتے تھے اور یہی معمول بھائی صاحب کی وفات کے بعد رہا، مجھے یاد نہیں کہ کبھی اس معمول میں تخلف ہوا ہو۔

حضرت مولانا کی یاد میں بے شمار انسان مضطرب وبے قرار ہیں اور ان کے اعزہ و احباب نیز متعارفین کی لامتناہی تعداد ان کے لئے آج غمگسار ہے۔ ان متعارفین میں بادشاہ اور امرا اور وزرا بھی ہیں اور علماء و فقرا بھی ہیں اور عام پبلک بھی، لیکن سب سے زیادہ مضطر مظلومین کا وہ طبقہ ہے، جن کے لئے حضرت مولانا پشت پناہ تھے۔ ان میں وہ بے بس و بے کس اور لاوارث بازیافتہ مسلمان خواتین بھی ہیں جو حضرت مولانا کو اپنا باپ سمجھتی تھیں اور جیسا کہ مجھکو معلوم ہے۔ حضرت مولانا فی الحقیقت ان کے لئے ہر طرح مثل باپ ہی کے تھے، ان بے بسوں اور بے کسوں کے غم واضطراب کا بجز ان کے اور کون اندازہ کر سکتا ہے۔

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی سیاسی زندگی کا آغاز تقریباً سن ۳۸ھ ہجری سے تحریک خلافت میں شمول سے ہوا ہے اس کے بعد جب جمعیۃ علماء ہند قائم ہوئی تو حضرت مولانا ہمیشہ کے لئے اس سے وابستہ ہو گئے اور جمعیۃ کے راستے سے وہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی سے منسلک ہوئے اور افق ہند پر آفتاب بن کر چمکے۔ اس پورے دور کی تاریخ ارتقاء امید ہے کہ ان کے رفقاء کار بیان فرمائیں گے۔

حضرت مولانا کی علمی اور تصنیفی خدمات کا آغاز میسرم بیٹ مدراس سے ہوتا ہے، غالباً حفظ الرحمٰن لمذہب النعمان حضرت مولانا کی سب سے پہلی جلیل القدر تصنیف ہے جس میں دلائل و براہین کے ساتھ حضرت مولانا نے ان الزامات کا دفاع کیا ہے جو حنفیت پر مخالفین کی جانب سے کئے گئے ہیں۔

دل چاہتا تھا کہ حسب عادت حضرت مولانا کی تاریخ وفات کہہ کر دل کی بھڑاس نکالوں لیکن غمگسار طبیعت نے ساتھ نہ دیا اس لئے ایک مادۂ

تاریخ کو جو دارالعلوم دیوبند سے متعلق ایک بزرگ کے سلسلۂ وفات میں نے لکھا تھا موزوں کرنے پر اکتفا کرتا ہوں۔

قطعۂ تاریخ وفات

حفظ رحمٰن مجاہد ملت — عازم خلد ہوگئے واللہ
اس جہانِ تلق سے کرکے سفر — چین کی نیند سوگئے واللہ
بولا رضواں کہ لکھئے سال وفات — داخلِ خلد ہوگئے واللہ

۱۳ ھ ۸۶

آستانہ دہلی

آہ مجاہدِ ملت!

مجاہد ملت حضرت مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی وفات حسرت آیات ہندوستانی مسلمانوں کی تقدیر کا ایک المیہ ہے کہ اس نازک دور میں جبکہ قومی زندگی کی آستین میں "دشنہ" بھی پنہاں ہے اور ہاتھ میں نشتر بھی کھلا ہے۔ وہ عالمِ اسباب میں مسلمانوں کی ایک سپر تھے۔ ایک سہارا تھے، ایک ڈھارس تھے اور افسوس کہ آج یہ سہارا ٹوٹ گیا ہے۔ اور وہ آفتاب ڈوب گیا ہے جس کی روشنی میں ہندوستانی مسلمان، قومی زندگی کی متعین راہوں پر بے جھجک آگے بڑھ رہے تھے۔ بے شک کسی کے بچھڑنے سے زندگی کا کارواں رکتا نہیں، بے شک قافلۂ حیات اپنی رفتار سے چلتا ہی رہتا ہے لیکن حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب رح کی جدائی ایک فرد کی جدائی نہیں ہے۔ وہ اپنی ذات سے ایک انجمن تھے، ایک تاریخ تھے، ایک تاریخ کا۔ ایک دور کا جلی عنوان تھے، ایک انقلاب آفریں شخصیت کے جمال و جلال کا دلآویز مرقع تھے۔ اور اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ آج اس مٹی سے نشو و نما کی توانائی چھن گئی ہے شیخ الہند رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی پُر جوش اور مہم پسند طبیعت نے حب الوطنی حکمت و دانش، اور ایثار و قربانی کی کشادہ پیشانی سے ٹپکتے ہوئے گرم پسینہ میں گوندھ کر جمعیۃ العلماء ہند کے ضمیر کا خمیر اٹھایا تھا آج صرف مولانا حفظ الرحمٰن رح ہی کی آنکھ بند نہیں ہوئی، تاریخ کا ایک دور ختم ہوگیا اور یہ محسوس ہوا کہ جمعیۃ العلماء کے جسدِ خاکی سے زندگی کی روح پرواز کر گئی ہے۔ بزم علماء کی وہ شمع گل ہوگئی ہے۔ جس کی جوت سے دلوں کے کنول اور دماغوں کے فانوس جگمگا رہے تھے، اور جس کی کرن سے حب الوطنی کی اس وادی میں قوم پرستوں کے آبلہ پا کارواں کی راہیں چمک رہی تھیں جس میں دو قومی نظریہ کے زہریلے اور نوکیلے کانٹوں کا دبیز فرش بچھا ہوا تھا۔ دم لینے کیلئے اور گھڑی بھر کوئی سایہ نہ تھا، کوئی چھاؤں نہ تھی!

ماتم ایک شخص کا ماتم نہیں ہے۔ ایک تاریخ ایک دور اور ایک [illegible] عظیم شخصیتوں کا اجتماعی ماتم ہے۔ جن کی حب الوطنی، قوم پرستی اور سرفروشیوں کا مولانا حفظ الرحمٰن رح ایک عنوان بن گئے تھے، ان کی اپنی شخصیت بھی انفرادیت اور فکر و عمل کا ایک دمکتا ہوا چراغ تھی۔ لیکن اس چراغ کی لو سے جو نور برس رہا تھا اس کے دامن میں ہفت رنگ شعاعیں تھیں ایک سرخی تھی شاملی کے سرفروش مجاہدین حریت کے ابلتے ہوئے گرم اور تازہ خون کی ایک ضو تھی، ضامن اور قاسم رح کی جرأت و شجاعت کی ایک کرن تھی فراست محمود و قیادت آزاد رح کی ایک شعاع تھی عزم انصاری رح و حلم اجمل رح کی اور اس طرح یہ ایک چراغ، دانش و حکمت، تدبر و فراست ایثار و قربانی، جرأت و شجاعت، مروت، محبت اور قوم پرستی کی راہ میں عمل پیہم اور یقین محکم کا [illegible] چراغ تھا۔ جو یکم اگست کا دن گزار کر رات کو تین بجے ہوا کے تند اجل سے ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگیا!

اس حقیقت سے انکار نہیں، کہ قومی زندگی کی کچھ راہیں ہیں، جو ملک کے دستور نے متعین کر دی ہیں اور ۴۶ کروڑ انسانوں کا کارواں جس میں ہندوستانی مسلمان بھی شامل ہیں پنڈت نہرو کی قیادت میں آگے بڑھ رہا ہے لیکن اسی کے ساتھ یہ واقعہ بھی ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کے خون آلود تلووں میں یاس و قنوطیت کے چبھے ہوئے کانٹے بھی ہیں اور نا امیدی و نامرادی کے پرسوز آبلے بھی ہیں اور یہ مولانا تھے جو اپنی چٹکی سے یہ کانٹے بھی نکال رہے تھے۔ جن میں وہ آگ بھری ہے جو بھڑکتی ہے تو ایک قوم کا ذہن جلتا ہے۔ تن اور من جلتا ہے۔

یہ کہنا کہ آج ہندوستانی مسلمانوں کی زندگی میں کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ کوئی خطرہ نہیں ہے، بالکل ہی درست نہیں ہے، اندیشے بھی ہیں وسوسے اور خطرے بھی ہیں، لیکن المیہ یہ ہے کہ اندیشوں سے باخبر کرنے والا اب خاموش ہو چکا ہے۔ روکنے اور ٹوکنے والا چپ ہوگیا ہے، ہاتھ پکڑ کر صحیح راستہ پر لانے والا زمین کی گود میں سو چکا ہے۔ اس لئے قومی زندگی کے رواں دواں قافلہ کے ساتھ قدم اٹھانے میں مسلمانوں کو بڑی احتیاط کی ضرورت ہوگی۔ اور قدم قدم پر مولانا حفظ الرحمٰن کی احتیاطیں یاد آئیں گی، ان کی سعی و محنت اور قیادت و فراست یاد آئے گی اور اگر ہندوستانی مسلمانوں میں فہم و فراست کا فقدان نہیں ہے تو یہ یاد بھی ایک رہنما کا کام دے سکے گی۔

مولانا حفظ الرحمٰن رح کیا تھے؟ اور ہم کس بیش قیمت سرمایہ سے محروم ہو گئے اس کا اندازہ آج بھی ہے۔ اور شاید کل اس سے زیادہ ہوگا۔ اس لئے کہ وہ کڑی جس نے حکومت کو مسلمانوں سے اور مسلمانوں کو حکومت و قیادت سے جوڑ

رکھا تھا اچانک ٹوٹ گئی ہے اور اس کی جگہ لینے والا بظاہر اب کوئی موجود نہیں ہے اور یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی قیادت ایک ویرانہ ہے جس کے سناٹے میں دل دہل رہے ہیں جس شیر کی آواز سے رن گونجتے تھے آج اس کی آواز بھی ایک سناٹے میں کھو گئی ہے۔

حضرت مولانا کے ذاتی صفات کے بیان میں اگر کچھ کہا جا سکتا ہے تو صرف یہ کہ وہ سچے مسلمان تھے اور سچے مسلمان ہی کا دوسرا نام مومن، مجاہد اور مکمل انسان ہے، یہی وجہ ہے کہ صرف دوست ہی نہیں دشمن بھی اس حقیقت کے اعتراف میں گردنیں جھکاتے ہیں، کہ حضرت مولاناؒ کی کتاب سیرت کا ورق ورق اتنا پاک اور اتنا صاف ہے کہ جسکی مثالیں کم ہی ہوں گی۔

مولانا حفظ الرحمنؒ کی شخصیت کی تعمیر، درحقیقت ہندوستانی مسلمانوں ہی کے سیاسی مذاق و سماجی مزاج کا ایک آئینہ تھی، وہ ملتِ اسلامیہ کے پاکیزہ عمل و کردار کی ایک مقدس علامت تھے، اور جو لوگ مولانا حفظ الرحمنؒ کو سمجھتے ہیں یا حب الوطنی و قوم پرستی کی اس تعریف کو سمجھتے ہیں جو مجسم ہو کر "حفظ الرحمنؒ" بن گئی تھی۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ حب الوطنی میں کس حد تک مسلمان بڑھتے ہیں اور کس شان سے بڑھتے ہیں؟ آج اگر بعض سرپھرے عناصر، جو جارحانہ قوم پرستی میں وہ عقیدہ رکھتے ہیں جس پر فاشیت کا رنگ چڑھا ہوا ہے۔ بزعم اکثریت یہ سوال کریں کہ ہندوستانی مسلمانوں کی قوم پرستی کیا ہے؟" تو اس کا جواب ہے "حفظ الرحمنؒ" اور بے شک یہ جواب سب سے عناصر کی اکڑی ہوئی گردنوں کو جھکا دینے کی توانائی رکھتا ہے

۱۹۱۶ء سے ۱۹۴۷ء تک حضرت مولاناؒ کی سیاسی زندگی ایک طوفان تھی ایک آندھی، ایک آندھی، ایک بگولہ اور ایک شعلہ تھی کہ سامراج کا گھر پھونکتا تھا لیکن ۱۹۴۷ء اور اس کے بعد کے برسوں میں، جبکہ خون کی بوچھار ہو چکی تھی، فسادات کی آگ لگ چکی تھی، زمین وطن کے ساتھ اہل وطن کے دل اور تقدیریں بٹ گئی تھیں۔ حضرت مولاناؒ کی سیاسی زندگی، ہر چند کہ ایک دردِ مسلسل تھی لیکن اس مرد مجاہد نے مایوسیاں جس کے قریب نہ تھیں، جرأت و استقلال پامردی و ہمت اور خدا پر بھروسہ جس کے مزاج میں شامل تھا سخت سے سخت حالات میں بھی تخریب ہی سے تعمیر کے وہ عنوان پیدا کئے جسے مستقبل کا مورخ ایک غمزدہ اقلیت کے حوصلہ مند رہنما کے قوم پرور ذہن و دماغ کی قابل تعریف . . . ایجاد کہے گا۔ اس لئے کہ یہی وہ عنوان ہے جس پر ہندوستان کے سیکولرازم، پنڈت نہرو کی قیادت اور ہندوستان کے بین الاقوامی وقار کی بقاء منحصر ہے۔

مسلم کنونشن ان ہی عنوانوں میں سے ایک عنوان تھا جس کی تعمیری آواز نے سیاست و قیادت کے ڈگ مگوں اور حکومت و اقتدار کے شیش محلوں میں بھی یہ زندہ احساس پیدا کیا کہ ہمارا ماضی ہمارے حال سے الگ نہیں ہے اور فرقہ پرستی کے رجحانات، لسانی و ثقافتی تعصبات کے نئے چولے بدل رہا ہے، اور قومی اتحاد و ملکی سالمیت کے لئے علاقائی امتیاز و تفریق کا نیا خطرہ معرض وجود میں آ رہا ہے۔

حضرت مولانا حفظ الرحمنؒ کا یہ آخری کارنامہ صرف مسلمانوں ہی کے لئے نہیں پورے ملک کے لئے کتنا مفید ثابت ہوا ہے اور مسلم کنونشن کی تعمیری آواز نے پوری قوم کے ذہن پر کس حد تک تعمیری اثر مرتب کیا ہے اس کا اندازہ جذباتی یکجہتی اور قومی اتحاد کے متعلق مرکزی کونسل کے قیام سے کیا جا سکتا ہے جس پر فرقہ پرستی کے استیصال کی ذمہ داری عاید ہوتی ہے۔ کاش! حضرت مولاناؒ کچھ دن اور زندہ رہتے اور قومی اتحاد کونسل جس تعمیری نتیجہ کو حاصل کرنے کی جد و جہد کر رہی ہے۔ اس کے آب و رنگ کو اپنی آنکھ سے دیکھ سکتے کہ ۱۹۴۷ء کے بعد ان کی پوری سیاسی زندگی کا یہ معنوی خلاصہ ہے جسے "قومی اتحاد کونسل" کہا جاتا ہے۔

آہ! وہ معصوم چہرہ آج آنکھوں میں بسا ہوا ہے جس پر صداقتیں اور شرافتیں نثار ہوتی تھیں، جس پر پرستی ہوتی اداسیاں دیکھ کر ہی گاندھی جی نے دلی میں برت رکھنے کا فیصلہ کیا تھا اور جس برت نے ملک کی فضا بدل دی تھی وہ پُر درد آواز آج کانوں میں گونج رہی ہے جو جبلپور کے فساد کے بعد پارلیمنٹ کے ایوان میں بلند ہوئی تھی! اور جس نے پورے ملک کو بیدار کر دیا تھا

وہ پاکیزہ ہاتھ جو اٹھتے ہی نہ تھے مگر مظلوموں کی مدد کے لئے جو بڑھتے ہی نہ تھے۔ مگر بیواؤں کے سروں پر ردا ڈالنے کے لئے بچوں کی آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسو سکھانے کے لئے، آہ وہ مضبوط قدم جو قوم پرستی کی راہ میں اٹھتے اور قومی تعمیر کے راستے پر بڑھتے آج موت کی آغوش میں سرد ہو چکے ہیں۔ لیکن اپنے نقوش میں وہ داستانیں چھوڑ گئے ہیں، جن کو مدتوں دہرایا جائے گا۔ اور جو دلوں میں نئی زندگی پیدا کریں گی۔ نئی آرزوئیں جگائیں گی! خود مولانا حفظ الرحمن نہ سہی لیکن مولانا حفظ الرحمن کی یاد ہمیشہ ہی زندہ رہے گی۔ اور موت ان نقشوں کو نہ چھین سکے گی، جو قوم و وطن کی آنکھوں میں آنسو بن گئے ہیں۔

مولانا حفظ الرحمنؒ اپنی شخصیت کے اعتبار سے یکتا حیثیت رکھتے تھے اور انہوں نے نہ صرف یہ کہ صرف کہ مجاہدانہ عزم کے ساتھ برطانوی سامراج کے مقابلہ میں فاتحانہ جنگ لڑی۔ بلکہ مسلم فرقہ پرستی اور ہندو فرقہ پرستی کے مقابلہ میں وہ معرکے بھی سر کئے، جس کی آزاد ہندوستان کی تاریخ میں کوئی نظیر نہیں ہے۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

تا سحر تو نے نہ چھوڑی وہ بھی لے بادہ بہار
یادگار رونق محفل تھی پروانہ کی خاک

خاتونِ مشرق دہلی

تمام مشرقی بہنوں اور بھائیوں کو ہند اور پاکستان کے ریڈیو، اخباروں اور دیگر ذرائع سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ جمعیۃ علماء ہند کے ناظم اعلیٰ اور ہندوستان کی پارلیمنٹ کے ممبر مجاہدِ ملت حضرت مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب کا ۲ اگست کو بمقام دہلی میں انتقال ہو گیا ہے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون

مجاہدِ ملت مرحوم چند ماہ سے کینسر کے موذی مرض میں مبتلا تھے۔ سب سے پہلے دہلی اور بمبئی میں علاج ہوا۔ پھر آپ کو امریکہ لے جایا گیا۔ امریکہ کے مشہور اور تجربہ کار ڈاکٹروں نے علاج کیا۔ اگرچہ وہاں عارضی فائدہ ہو گیا تھا اور کچھ صحت بھی بحال ہو گئی تھی۔ اس لئے امریکہ سے دہلی واپس آگئے یہاں واپس آکر کینسر پھر پیدا ہو گیا۔ ہر قسم کا علاج کیا گیا۔ مگر موت کا وقت مقرر تھا مرحوم جانبر نہ ہو سکے۔ آخر کار ۲ اگست کی صبح کو مذہب وسیاست کا درخشندہ ستارہ اور ہندوستان کے مظلوم مسلمانوں کا مددگار رخصت ہو گیا جس نے ۱۹۴۷ء کے خونیں انقلاب میں اپنا سر ہتھیلی پر رکھ کر دہلی کے مسلمانوں کی مدد کی۔ جو فوج اور پولیس اور بلوائیوں کی گولیوں سے نہیں ڈرا۔ اور جس پر اکتوبر ۱۹۴۷ء میں کھاری باؤلی۔ چاندنی چوک۔ ریلوے اسٹیشن بارہ کھمبا روڈ۔ کناٹ پلیس پر قاتلانہ حملے ہوئے مگر اس مردِ مجاہد نے مسلمانوں کو بچانے کے لئے حوصلہ نہیں ہارا۔ وہ ہم سے جدا ہو گیا ۲ اگست کو شہر دہلی ماتم کدہ بن گیا اور حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی خانقاہ میں ہزاروں مسلمانوں نے بادیدہ پرنم مجاہدِ ملت کو خدا کے سپرد کر دیا۔ خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں۔ مشرقی بہنیں اور بھائی تین مرتبہ سورہ فاتحہ پڑھ کر مرحوم کی روح کو ثواب پہنچائیں توفیق

دین دنیا دہلی

حضرت مجاہدِ ملت مولانا حفظ الرحمٰن کی موت کا حادثہ ہندوستان کے لئے عموماً اور مسلمانوں کے لئے خصوصاً اتنا بڑا حادثہ ہے جسے زمانہ دراز تک فراموش نہیں کیا جا سکے گا۔ ہندوستان کی آزادی کی تاریخ میں جن چند سرفروش مجاہدوں کا نام سرِ ورق پر لکھا جائے گا۔ ان ہی میں سے ایک مولانا حفظ الرحمٰن بھی ہیں۔ مولانا حفظ الرحمٰن جنگ آزادی کے وہ لائق سپہ سالار ہیں جو ہوش سنبھالنے سے لیکر موت تک شیطانی قوتوں سے جنگ کرتے رہے اور آخر اسی جنگ میں شہید ہو گئے۔

مولانا مرحوم کی زندگی کا ابتدائی دور وہ تھا جب آپ گاندھی جی مولانا ابوالکلام آزاد۔ پنڈت نہرو۔ ڈاکٹر انصاری اور دیگر صفِ اول کے رہنماؤں کے دوش بدوش انگریزی کی سامراجی طاقت سے جنگ کرتے رہے اس کے بعد دوسرا دور وہ آیا جب اس ملک میں دو قوموں کی تھیوری نے تفریق کا بیج بو دیا اور پاکستان کے قیام کا نعرہ بلند ہوا اس دور میں مولانا برابر دو قوموں کے نظریہ کی مذمت کرتے رہے۔ اور بڑی دلیری کے ساتھ اس ہندو فرقہ پرستی اور مسلم فرقہ پرستی کے خلاف جہاد کرتے رہے جس نے کہ وطن عزیز کے دو ٹکڑے کر دیئے پھر تقسیم ہند کے بعد ایک ایسا وقت آیا جب ہندو فرقہ پرستی نے ملک کے امن وامان کو غارت کر دیا۔ ملک میں جا بجا یکطرفہ ہنگاموں کا دور شروع ہوا اور ملک کا کوئی حصہ ایسا باقی نہ رہا جہاں ہندو فرقہ پرستی نے سر نہ اٹھایا ہو۔ یہ مولانا کے لئے نازک ترین وقت تھا۔ وہ تن تنہا ملک کے ایک کونے سے لیکر دوسرے کونے تک دوڑتے پھرتے تھے۔ ملک میں جہاں بھی کوئی یکطرفہ ہنگامہ ہوتا تھا۔ ایک جانباز سپاہی کی طرح اس کی آگ میں کود پڑتے تھے اور اس وقت تک انہیں چین نہیں آتا تھا۔ جب تک کہ فرقہ پرستی اور باہمی منافرت کی آگ کو اپنی آنکھوں کے سامنے نہیں بجھا دیتے تھے۔ چنانچہ یہی فیروز آباد میں ہوا۔ اور یہی بھوپال میں ہوا۔ اور اس کے بعد جب جبل پور میں یکطرفہ فسادات کی آگ بھڑکی تو مولانا مرحوم ہی نے اس خطرناک آگ کو بجھایا۔ جو نہ صرف جبلپور میں بلکہ مدھیہ پردیش کے مختلف علاقوں میں پھیل چکی تھی۔ اس کے بعد ۱۹۶۱ء میں جب علیگڈھ۔ چندوسی۔ اور میرٹھ میں فسادات کی آگ بھڑکی تو یہ وہ زمانہ تھا جب مولانا کینسر کے موذی مرض میں مبتلا ہو چکے تھے اور رفتہ رفتہ آپ کی صحت جواب دے رہی تھی لیکن اس کے باوجود مولانا مرحوم کے جوشِ عمل میں کوئی فرق نہ آیا۔ وہ جان کی بازی لگا کر علی گڈھ گئے اس کے بعد چندوسی پہنچے اور پھر میرٹھ میں اس وقت تک رہے جب تک وہاں فسادات کی آگ بالکل سرد نہ ہو گئی۔ اور واقعہ یہ ہے کہ مولانا مرحوم کا مرض اسی آخری تگ ودو اور مصروفیت کے دوران میں بڑھ کر ناقابلِ علاج بن گیا۔ غرضکہ مولانا مرحوم اس وقت تک ملک کی فرقہ پرستی سے جنگ کرتے رہے۔ جب تک کہ آپ بالکل ہی صاحبِ فراش نہ ہو گئے اور جب مرض حد سے زیادہ بڑھ گیا تو آپ کو دہلی اور بمبئی کے ہسپتال میں داخل کیا گیا اور بعد میں علاج کے لئے امریکہ لیجایا گیا لیکن مولانا کیسے تندرست ہو سکتے تھے، ان کی قسمت میں تو شہادت کا بلند درجہ لکھا ہوا تھا۔ چنانچہ امریکہ سے واپسی کے دو ہفتہ کے بعد اس مردِ مجاہد نے ایک جانباز سپاہی کی طرح ملک اور ملت پر اپنی جان قربان کر دی۔

ایڈیٹر دین دنیا کا حضرت مجاہدِ ملت سے بہت ہی قریب کا تعلق رہا ہے

اور مولانا موصوف کو قریب سے دیکھنے کے بعد بلا خوف تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہماری نظر سے کوئی ایک متنفس بھی مولانا مرحوم کی طرح سچی قومی تڑپ رکھنے والا ۔ نڈر اور بے باک، ایثار پیشہ اور صاحب عقل و فہم آج تک نہیں گذرا ان کے قلم میں بھی بلا کی طاقت تھی، اور تقریر میں بھی ایک جادو تھا حق گوئی اور حق کوشی ان کا شیوہ تھا حقیقت یہ ہے کہ مولانا کی بے وقت وفات ملک و قوم کا اتنا بڑا نقصان ہے جس کی شاید کبھی بھی تلافی نہیں ہو سکیگی ۔ مولانا مرحوم اب ہم سے جدا ہو چکے ہیں لیکن ہمارے لئے ایک بہت بڑا کام چھوڑ گئے ہیں اور وہ یہ ہے کہ ان کے نقش قدم پر چل کر ملک و وطن کی بے غرضانہ خدمت کی جائے اور اس جمعیۃ علماء کو زیادہ سے زیادہ مضبوط بنایا جائے جس سے کہ مولانا کو عشق تھا ۔ اب دیکھنا ہے کہ مولانا مرحوم کے قدرداں کس حد تک اپنے فرض کو پورا کرتے ہیں۔"

پیام حق کراچی

جمعیۃ علماء ہند کے سکریٹری اور بھارتی مسلمانوں کے دکھ درد کا مداوا مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی دنیائے فانی سے منہ موڑ گئے ۲ اگست ۱۹۶۲ء کو بھارت کے مجبور و مقہور مسلمانوں کو آپ کی وفات سے جو صدمہ پہنچا ہے اس کی تلافی خدا ہی کرے تو ہو ورنہ بظاہر کوئی امید نظر نہیں آتی۔

مولانا کی وفات سے بھارت کے مسلمانوں کا یقیناً دل ٹوٹا ہے اور یہ ایسا سانحہ ہے جسے سنکر پاکستانی مسلمان بھی تڑپ اٹھے ــــ مگر جو اللہ چاہتا ہے وہ ہوتا ہے ۔ مفتی کفایت اللہ، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا احمد سعید اور مولانا ابو الکلام آزاد کے بعد مولانا کی ذات بھارتی مسلمانوں کے لئے بہت بڑا سہارا تھی ۔ افسوس وہ سہارا ٹوٹ گیا ۔ مسلمانوں کی خدمت سبھی نے کی تھی ؛ لیکن مولانا سیوہاروی مرحوم نے انتہائی خطرناک اور نا مساعد حالات میں جس طرح اپنی کوششوں کو جاری رکھا تھا اسے تاریخ میں ایک درخشاں باب کی حیثیت حاصل رہے گی۔"

بھارتی مسلمانوں پر کانگریسی ہندوؤں کی طرف سے زیادتیاں ہوں یا مہا سبھائی درندے حملہ کریں ۔ مسلمانوں کو تیر ستم کا نشانہ دہلی میں بنایا جائے یا یوپی، سی پی کے کسی شہر میں مولانا ہر جگہ جان ہتھیلی پر رکھ کر پہونچے، اپنے اثر و رسوخ سے کام لیتے اور حکام ضلع کو جھنجوڑتے، پارلیمنٹ میں شور مچاتے، وزیر اعظم اور صدر سے ملتے اور صوبائی وزراء اور حکام کے نام احکام نافذ کراتے یہ سب کچھ صرف اسی لئے کرتے کہ بھارت کی مجبور مسلم اقلیت پر ظلم کے دروازے بند ہوں اور وہ چین کا سانس لے سکے ۔"

مولانا مرحوم کئی ماہ سے علیل تھے ۔ بہت دن تک کام کی کثرت نے علاج ہی کا موقعہ نہیں آنے دیا ۔ اور جب توجہ کی تو مرض اتنا بڑھ چکا تھا کہ ایک ماہ امریکہ میں علاج کرانے کے بعد بھی صحت یاب نہیں ہو سکے ۔ بلاشبہ بھارت میں مسلمانوں کی تکلیف کا احساس ۔ کام کا دباؤ اور بھارت کے متعصبین کی معاندانہ روش، مولانا کو اندر ہی اندر گھن کی طرح کھاتی رہی، اور مولانا کی معمولی بیماری بڑھتے بڑھتے موت کا پیام بن گئی ۔

خدا کے فضل سے بھارت میں آج بھی کئی کروڑ مسلمان موجود ہیں ۔ جمعیۃ علمائے ہند بھی ہے ۔ اور دینی مرکز دیوبند بھی ہے ۔ مگر شعلہ بیان اور مخلص رہنما کی وفات نے جو خلا پیدا کیا ہے اس کے دور ہونے کی جلدی امید نہیں معلوم ہوتی۔"

مولانا زبردست عالم، بے مثال مقرر اور بہت نامور مصنف تھے ۱۹۲۱ء سے سیاست میں قدم رکھا بڑے بڑے نازک موقعے آئے مگر ہمیشہ ثابت قدم رہے، نہ زبان رکی اور نہ قلم میں کمزوری آئی ۔ اللہ تعالیٰ مولانا کی مغفرت فرمائے اور مسلمانوں کی رہنمائی کے لئے ان کا صحیح جانشین پیدا فرمائے ۔

ادارہ پیام حق حضرت مولانا کے ورثا سے اس صدمہ عظیم کے سلسلہ میں اپنے رنج و غم کا اظہار کرتا ہے اور بھارت کے مسلمانوں سے درخواست کرتا ہے کہ وہ مایوس نہ ہوں ۔ اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھیں اور جمعیۃ علمائے ہند کے زیر علم و ہدایت منظم و متحد رہنے کی کوششوں کو کسی وقت فراموش نہ ہونے دیں ۔ اللہ تعالیٰ ان کا مددگار اور کارساز ہے

انوارِ اسلام بنارس

انوار اسلام کے اس خصوصی صفحہ کو ہم اس مرتبہ حضرت مجاہد ملتؒ کی نذر کر رہے ہیں ۲ اگست کو مولانا حفظ الرحمٰن کا انتقال ہو گیا کتنی مختصر اور چھوٹی سی بات ہے ۔ دو لفظوں کی لیکن یہی چھوٹی سی بات کتنی بڑی بات ہے ۔ اپنے اندر کتنی شرح و تفصیل لئے ہوئے ہے کتنی ہنگامہ خیز تاریخ کی حامل ہے ۔ کتنا بڑا المیہ ہے اور ملت اسلامیہ کا کتنا عظیم حادثہ ہے ۔ مولانا ابو الکلام آزادؒ اور حضرت مولانا مدنیؒ کے بعد ملت اسلامیہ کے سینے کا یہ تیسرا زخم ہے ۔ نہ وہ دونوں زخم بھرے نہ یہ بھرے گا ۔ نہ مولانا آزاد اور مولانا مدنیؒ کا کوئی بدل تھا ۔ اور نہ مولانا حفظ الرحمٰنؒ کا کوئی بدل ہے ۔ وہ بھی منفرد تھے اور یہ بھی منفرد ۔ مسلمانان ہند کی تاریخ کے اس تاریک دور میں مولانا حفظ الرحمٰنؒ جل جل کر

پگھلنے والی اور تنگل پگھل کر جلنے والی ایک شمع تھے جو اس اندھیری رات میں مسلمانوں کے تاریک دلوں میں زندگی کے عزم و استقلال کی شمع روشن رکھتے تھے، ان کی وفات سے ملت اسلامیہ پر ایک گہری تاریکی چھا گئی ہے۔

جمعیۃ العلماء کی ایک عظیم الشان تاریخ ہے۔ مولانا حفظ الرحمٰنؒ اس تاریخ کا آخری صفحۂ زریں تھے۔ اس آخری دور میں جمعیۃ العلماء عبارت تھی مولانا حفظ الرحمٰنؒ کی ذات سے۔ جمعیۃ کا نظام ملک بھر میں پھیلا ہوا ہے مسلمان علماء، خواص اور عوام کی ایک کثیر تعداد اس سے وابستہ ہے۔ مگر وہ ایک جسد ہے۔ جمعیۃ کی روح رواں مولانا حفظ الرحمٰن تھے۔ مولانا حفظ الرحمٰنؒ کا سب سے بڑا ملی کردار اس وقت ظاہر ہوا جب ۱۹۴۷ء میں مسلمانوں کی حد تک آٹھویں بار دہلی لوٹی گئی۔ مغل سلطنت کی تباہی کے بعد یہ دوسرا ایسا دن تھا جو مسلمانوں کو دہلی میں دیکھنا پڑا۔ اس وقت مولانا حفظ الرحمٰن نے اسی کردار کا مظاہرہ کیا جس کا مظاہرہ امام ابن تیمیہؒ نے بغداد کی تباہی کے وقت کیا تھا۔ مولانا کے نزدیک اپنی جان کے لئے نہ کوئی خطرہ خطرہ تھا اور نہ کوئی حادثہ حادثہ، ان کو فکر تھی تو مسلمانوں کے بچانے کی، وہ ان کو بچانے کے لئے ہر خطرہ میں بے باکانہ کود پڑتے تھے، نہ ان کو دن کے کھانے کی فکر تھی نہ رات کو سونے کی۔ اگر یادہ ایک خدا کے مامور کئے ہوئے فرشتے تھے جن کا صرف یہی کام تھا، اس لئے مولانا نے جو کارنامہ انجام دیا وہ اپنی حقیقی صورت میں تاریخ کے صفحات پر نہ آسکے گا۔ اِلّا یہ کہ مولانا کے قریبی کوئی تمام حالات سے باخبر جیسے مولانا محمد میاں صاحب، مولانا کے سوانح حیات لکھیں اور اس میں دہلی کے اس حادثہ کے پس منظر اور پیش منظر کے خد و خال کو پوری وضاحت کے ساتھ پیش کریں جس میں مولانا آزادؒ کی کتاب "انڈیا ونس فریڈم" سے بھی خصوصی مدد لی جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ دہلی کے اس ہنگامے میں بظاہر صرف مسلمانان دہلی کے تحفظ کے لئے کام کیا لیکن دراصل مسلمانان دہلی کی تباہی کے پس منظر میں پورے ملک کے مسلمانوں اور خود ملک کی تباہی مضمر تھی۔ دہلی ہندوستان کا قلب ہے۔ قلب کی حالت بگڑ جاتی ہے تو جسم کی جو حالت ہو جاتی ہے۔ وہ معلوم ہے۔ دہلی کی آگ دہلی میں نہ بجھ جاتی تو وہ پورے ملک کو اپنے لپیٹ میں لے سکتی تھی۔ اس آگ کے بجھانے میں گاندھی جی کے خون کے ساتھ مولانا آزاد اور مولانا حفظ الرحمٰن کے ہاتھ نے برابر کا کام کیا۔

دہلی کے بعد جب ملک کے مختلف حصوں میں مسلمانوں پر پے بہ پے مصائب اور حادثات کے پہاڑ ٹوٹنے لگے تو مولانا حفظ الرحمٰن رح سراپا برق بے تاب بن گئے۔ پھر تو ان کی تڑپ اور بیقراری کی انتہا نہ رہی۔ وہ کبھی ملک کے ایک حصے میں ہیں تو کل دوسرے حصے میں۔ جیسے انھوں نے پوری ملت کا بار تنہا اپنے سر اٹھا لیا۔ مولانا کی ملی خدمتیں اتنی عظیم ہیں کہ وہ جہاں پہنچتے وہاں کی زمین ایک وزن محسوس کرتی۔ کانگریسی لیڈر اور حکومت کے عمال بھی ان کا احترام کرتے، مسلمانوں کے پست حوصلے بلند ہو جاتے اور ان کی ٹوٹی ہوئی آس بندھ جاتی۔ غم ہے تو یہ ہے کہ مولانا کے بعد اب پوری ملت میں ان کے جیسی ملک گیر باوزن اور بلند بانگ کوئی شخصیت موجود نہیں ہے۔ مولانا کی گوناگوں خصوصیات میں سے ایک خصوصیت یہ تھی کہ وہ دین کے جتنے بڑے عالم تھے اتنے ہی بڑے صاحب زبان وقلم بھی تھے، اللہ تعالیٰ مولانا کو اپنی خصوصی رحمتوں سے نوازے اور اپنے نزدیک بلند مقام عطا فرمائے۔!

ماہنامہ میثاق لاہور

اخبارات سے یہ معلوم کر کے بڑا صدمہ ہوا کہ جمعیۃ علماء ہند کے ناظم اعلیٰ مولانا حفظ الرحمان صاحب سیوہاروی کا انتقال ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ یہ حادثہ مسلمانوں کی پوری قوم کے لئے ایک بڑا اہم حادثہ ہے۔ جو لوگ آج پاکستان کے گوشۂ امن و عافیت میں پہنچ کر بھارت میں اپنے چھ کروڑ مسلمان بھائیوں کو دلوں سے نکال بیٹھے ہیں وہ تو اس حادثہ کی اہمیت کا کماحقہ اندازہ نہیں کر سکیں گے لیکن جو لوگ ہند کے مسلمانوں کو بھولے نہیں ہیں اور انہیں اس مظلومیت کا بھی اندازہ ہے جس میں اس وقت ہمارے یہ بھائی مبتلا ہیں۔ وہ کچھ اندازہ کر سکیں گے کہ مولانا مرحوم کی ذات ان کے لئے اس دور ابتلا میں کتنا بڑا سہارا تھی۔ وہ فی الواقع ایک نڈر اور بہادر مسلمان تھے۔ انہوں نے تقسیم ملک کے بعد کے خطرناک حالات کا نہایت دانشمندی، نہایت بردباری، نہایت صبر و استقلال اور نہایت عزم و حوصلہ کے ساتھ مقابلہ کیا اور اپنی قوم کا حوصلہ قائم رکھنے کے لئے جان کی بازی لگا دی میرا ذاتی تاثر تو یہ ہے کہ قیام پاکستان کے بعد بھارت کے مسلمانوں کی خدمت کی جو توفیق انہیں میسر آئی اس میں کوئی دوسرا مشکل ہی سے ان کے برابر ہو سکے گا انہوں نے ملک کی مشترک جد و جہد آزادی میں جو نمایاں خدمات انجام دی تھیں اس کی وجہ سے کانگریسی حلقوں پر ان کا خاصا اثر تھا۔ انہوں نے اپنے اس پورے اثر کو بالکل بے لوث اور بالکل بے خوف ہو کر اپنی قوم کی حمایت و مدافعت میں صرف کیا۔ اللہ تعالیٰ مولانا کی خدمات کو قبول فرمائے پوری قوم کی طرف سے ان کو جزائے خیر دے اور ہند کے مسلمانوں کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے۔ ایک زمانہ میں مولانا مرحوم کے ساتھ راقم کے ذاتی تعلقات بھی تھے۔ اب یہ

تعلقات تو دوری کے سبب سے ختم ہو چکے تھے لیکن اس دور میں مسلمانوں کی جو خدمت وہ کر رہے تھے اس کے سبب سے ان کی محبت اور ان کی قدر و عزت دل میں پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گئی تھی۔ اللہ تعالےٰ مولانا کی مغفرت فرمائے اب یہ دعائے مغفرت ہی واحد سوغات ہے جو اس مجاہد ملت کے لئے اتنی دور سے ہم بھیج سکتے ہیں ہم میثاق کے تمام قارئین سے بھی مولانا کے لئے دعائے مغفرت کی درخواست کرتے ہیں۔

فاران کراچی

اب سے تیس سال پہلے کی بات ہے جب حضرت مولانا انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ حیدرآباد دکن تشریف لے گئے تھے اور وہاں کے مشہور زمیندار وکیل مولوی فیض الدین مرحوم کے یہاں قیام فرمایا تھا۔ انہی کے ساتھ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب حیدرآباد پہلی مرتبہ آئے۔ اس وقت انہیں عوام بہت ہی کم جانتے تھے۔ یہ ان کی شہرت کے آغاز کا زمانہ تھا۔ پھر حضرت مولانا انور شاہ صاحب کی عظیم شخصیت کے ہوتے ہوئے مولانا حفظ الرحمٰن کی طرف عوام اور خواص کے متوجہ اور رجوع ہونے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔

میں نے انہیں حیدرآباد میں دو بار دیکھا۔ مولوی فیض الدین کے یہاں اور عابد شاپ کے سامنے سے گذرتے ہوئے کھدر کا کرتا۔ کھدر کا پاجامہ اور راسی کی ٹوپی گھنی ڈاڑھی۔ ان کی صورت، چال ڈھال اور وضع قطع کو دیکھ کر ان کی طرف دل کھنچتا تھا۔ تقریباً چودہ سال کے بعد جب میں حیدرآباد چھوڑ کر اور بمبئی میں فلم کے چکر سے نکل کر دلی آگیا تو مولانا حفظ الرحمٰن مرحوم سے حصول نیاز کے بارہا موقعے ملے۔ وہ جب بھی ملتے بڑی خندہ پیشانی اور تپاک کے ساتھ ملتے! دلی کی جامع مسجد کے سامنے بالا خانہ پر ادارۂ شرقیہ تھا۔ وہاں ہر جمعہ کو ندوۃ المصنفین کے ارکان اور دوسرے اہل علم اور احباب جمع ہوتے چائے کا دور چلتا اور دو چار شاعر آ جاتے تو چھوٹی سی بزم شعر و سخن بھی منعقد ہو جاتی۔ اسی بزم احباب میں مولانا مرحوم سے ملاقات ہوتی رہی۔ شعر کا وہ خاص ذوق رکھتے تھے اور اچھے شعروں پر ان کی داد دینے کا انداز بتاتا تھا کہ وہ سخن فہم ہی نہیں، شعر کے ناقد بھی ہیں اور کیا عجیب ہے کہ اپنی جوانی کے آغاز میں انہوں نے شعر بھی کہے ہوں۔

مولانا مرحوم سے میری مفصل اور طویل ملاقات آگرہ میں ہوئی یہ غالباً ۱۹۳۵ء کا واقعہ ہے میں اپنے ایک عزیز کے یہاں ریاست رام پور میں مقیم تھا ان دنوں وہاں بڑی دھوم دھام کی نمائش ہو رہی تھی، آل انڈیا مشاعرہ بھی تھا۔

جناب اعجاز صدیقی مدیر "شاعر" کا دعوت نامہ ملا کہ سال کے سال قصر الادب کی جانب سے سیرت النبی کا جلسہ اور نعتیہ مشاعرہ ہوا کرتا ہے۔ تمہیں اس میں ضرور شریک ہونا پڑے گا۔ میں نے جواب دیا کہ مشاعرے میں شریک نہ ہو سکوں گا ہاں! سیرت کے جلسہ میں شرکت کی سعادت ضرور حاصل کروں گا۔ اور جو نعتیہ کلام میں مشاعرے میں سناتا۔ وہ جلسہ میں سنا دوں گا۔ بات پکی ہو گئی۔ میں رام پور سے آگرہ پہنچا اور مجھے ہوٹل کے جس کمرے میں ٹھیرایا گیا۔ اس میں مولانا حفظ الرحمٰن مرحوم پہلے سے قیام فرما تھے۔ علیک سلیک کے بعد مصافحہ معانقہ ہوا۔

یہ وہ دور تھا کہ مسلم لیگ اور کانگرس کے درمیان اختلافات کی خلیج اتنی گہری تھی کہ اس کی تھاہ نہ ملتی تھی۔ مولانا اس جمعیۃ علماء کی روح رواں تھے جو کانگرس کی ردیف بلکہ اس کا دست و بازو تھی۔ جمعیۃ علماء اس کا ساتھ چھوڑ دیتی تو ....

... ...

.... انڈیا کانگرس" آل انڈیا ہندو کانگرس" بن کر رہ جاتی۔ مولانا مرحوم سے اس وقت کے سیاسی مسائل پر تبادلہ خیال ہوتا رہا۔ بعض اکابر دیوبند اور جمعیۃ العلماء سے جماعت اسلامی کے اختلافات اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کا بھی ذکر آیا ان کی عالی ظرفی تھی کہ میری بعض تند و تیز باتوں پر وہ چیں بہ چیں نہیں ہوئے رات کا کھانا ساتھ ہی کھایا۔ پھر ہم ساتھ ہی جلسہ گاہ میں پہنچے۔ شعیب محمدیہ ہائی اسکول کے کمپاؤنڈ میں شامیانہ تنا ہوا تھا۔ حاضرین کی تعداد خاصی تھی۔

اس جلسہ کا یہ واقعہ جب بھی یاد آتا ہے تو ہونٹوں پر بے ساختہ مسکراہٹ آجاتی ہے۔ کہ قصر الادب اکبرآباد کے زیر اہتمام سیرۃ النبی کا یہ جلسہ شروع ہی ہونے والا تھا کہ ایک صاحب خوش پوش، خوش شکل ہاتھ میں موٹی سی چھڑی لئے ہوئے اسٹیج پر پہنچے اور پہنچتے کیا خود ہی لمبی لمبی ڈگیں بھرتے دراتے ہوئے علماء کی صف میں جا دھمکے، اور فرمایا کہ میں تقریر کروں گا! ان کا چہرہ خاصہ وجیہ تھا۔ ڈاڑھی سے، لباس سے اور وضع قطع سے عالم نظر آتے تھے۔ ان کا نام پوچھا گیا۔ گرجدار آواز میں ارشاد ہوا۔

"اورنگ زیب عالمگیر"

قرآن کریم کی تلاوت کے بعد وہ صاحب تقریر کے لئے کھڑے ہوئے اور آغاز ہی بے ربط جملوں سے کیا۔ ابہام و بے ربطی کی یہ "لے" بڑھتی ہی چلی گئی یہاں تک کہ مجمع کے اضطراب اور ناپسندیدگی کو دیکھ کر انہیں تقریر کرنے سے روک دیا گیا! بعض بے تکے شاعروں کو تو مشاعروں میں ذلیل ہوتے دیکھا ہے مگر کسی مقرر کی ایسی ذلت دیکھنے میں نہیں آئی!

اس جلسہ کی کامیابی کا سہرا مولانا حفظ الرحمٰن مرحوم کے سر رہا۔ ایسی دل آویز

اور کیف انگیز تقریر کی کہ سننے والے جھوم جھوم گئے ۔ اس واقعہ کے دو سال بعد ہندوستان کی تقسیم عمل میں آگئی اور ملک کے طول و عرض میں وہ خونیں ہنگامہ برپا ہوا۔ جس کی مثال تاریخ میں کم ہی ملے گی۔ اس کو ہجرت کہئے، فرار سے تعبیر کیجئے۔ لاکھوں مسلمانوں کی طرح میں بھی پاکستان چلا آیا۔ یہ ۱۹۴۷ء کے آخر کی بات ہے۔ اب ۱۹۶۲ء ہے اس پندرہ سال کی مدت میں مشاعروں کے طفیل تین بار ہندوستان جانا ہوا۔ مگر کہاں؟ مدراس، بمبئی، احمدآباد، اپنے وطن کے دیکھنے کے لئے اب تک دل و نگاہ ترس رہے ہیں۔ ... ضلع بلند شہر اور دلی کا سرانہ قریب قریب ملا ہوا ہے۔ دلّی سے ریل میں چلے، شاہدرہ پہونچے، پھر غازی آباد آیا۔ اس کے بعد بلند شہر کی سرحد شروع ہو جاتی ہے اُدھر جانا ہو جاتا تو دلّی ضرور جاتا اور مولانا حفظ الرحمٰن مرحوم سے لازمی طور پر نیاز حاصل کرتا! یہ تمنا دل کے دل ہی میں رہ گئی! عالم برزخ میں روحوں کا ایک دوسرے سے ملنا ہوتا ہوگا۔ یہ تمنا مرنے کے بعد ہی پوری ہو سکے گی۔

مولانا حفظ الرحمٰن مرحوم نے دارالعلوم دیوبند میں تعلیم پائی۔ طالب علمی کے زمانے ہی سے وہ اپنی ذہانت تقریر اور علمی شغف کی بدولت دینی حلقوں میں متعارف ہو گئے تھے اور ان کا شمار ممتاز ترین طلباء میں ہوتا تھا۔ درس نظامی کی تکمیل کے بعد انہوں نے درس و تدریس اور دینی علوم کے مطالعے کے سلسلہ کو جاری رکھا۔ ان کی شخصیت میں بڑی جامعیت پائی جاتی تھی۔ وہ دینی رہنما تھے، سیاسی لیڈر تھے، شعلہ بیان مقرر تھے اور ساتھ ہی بلند پایہ مصنف بھی! ندوۃ المصنفین جیسے اونچے درجے کے علمی ادارے کی بنا انہی نے ڈالی تھی۔ ان کی تحریر میں علمی سنجیدگی اور دینی فکر کے ساتھ ادبی دل کشی بھی پائی جاتی تھی ان کی تصانیف میں "قصص القرآن" کو بڑی شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی۔ تقریر و خطابت میں وہ آپ اپنا جواب تھے، شعلہ نوا بھی اور شبنم فشاں بھی! تقریر، تحریر، اور ذہانت میں مولانا ابوالکلام آزاد سے کم مگر دینی شغف اور ارکان شریعت کی پابندی میں ان سے بڑھ کر! انگریزی دور حکومت میں آزادی و بے باکی اور حق گوئی کے جرم میں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں! سیاسی مسلک میں حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمتہ اللہ علیہ کے قدم بہ قدم پیرو، مسلم لیگ کی مخالفت کی سرگرمی اور شائستگی کے ساتھ! تقسیم ہند کی مخالفت انھوں نے کسی لالچ میں آکر نہیں کی، وہ نیک نیتی کے ساتھ یہی سمجھتے تھے کہ ملک کے اس بٹوارہ سے مسلمانانِ ہند کو نقصان پہونچے گا۔ پاکستان بن گیا تو دینی اخوت کی بنا پر اس کے استحکام و بقاء کے متمنی اور خیر خواہ رہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی زندگی میں بھی ہندوستان کے مسلمانوں کی نگاہیں مولانا حفظ الرحمٰن کی طرف اٹھتی تھیں اور مولانا آزاد کی وفات کے بعد تو انہی کے تنہا ذات وہاں کے مسلمانوں کا مرجع سمجھی جاتی تھی، آخری زمانے میں انھوں نے بھارت کی پارلیمنٹ کو اپنی تقریروں سے ہلا ہلا دیا۔ کس قدر جرات و بیباکی کے ساتھ حکومت پر تنقید کی! خاص طور پر اردو زبان کی حمایت میں ان کا جوشِ عمل اور سرگرمی مثال اور یادگار بن کر رہے گی۔ چند سال سے تو وہ ملک و ملت کی ملکیت و متاع اور سراپا خدمت خلق بن کر رہ گئے تھے۔ دن رات کا زیادہ وقت دوسروں ہی کے کام آتا تھا اُن کی صحت لوگوں کی غمخواری ہی کی نذر ہو گئی! بھارت کے سب سے بڑے نیتا پنڈت جواہر لال نہرو سے ان کی انتہائی خوشگوار تعلقات تھے۔ ہندوستانی حکومت میں مولانا مرحوم کی بڑی عزت تھی۔ ان کی بلند پایہ شخصیت کے سامنے حکومت کے وزیر تک کچھ نہ کچھ دبتے ہوئے ہی نظر آتے تھے۔

آہ! وہ اس وقت دنیا سے رخصت ہوئے، جب ہندوستان کے مسلمانوں کو اُن کی بہت زیادہ ضرورت تھی۔ ان کی موت نے کروڑوں دلوں کو سوگوار بنا دیا۔ اللہ تعالےٰ آخرت میں ان کے درجات بلند فرمائے (آمین)

جسم وقفِ خدمتِ خلقِ خدا
اور دل مصروفِ ذکرِ الالہ
ہاتفِ غیبی نے فرمایا لکھو!
چل بسے ملت کے وہ پشت و پناہ

۱۳۸۲ ھ

(از مولانا مفتی جمیل الرحمٰن سیوہاروی)

نوحۂ غم

اپنے عم مکرم حضرت مولانا حفظ الرحمان کی یاد میں

ہے زمیں کی آنکھ نم گردوں کو رونے کیلئے
صبر ہے خنجر لئے اپنے چبھونے کیلئے
حوصلے تیار ہیں خود جان کھونے کیلئے
دل میں گنجائش نہیں اب غم سمونے کیلئے
ضبط و تسکیں کی کرے تلقیں کسے فرصت ہے آج
وجہ تسکینِ جہاں کی ہم سے خود رخصت ہے آج

ہر فرنگی کو ابھی تک اس کی ہمت یاد ہے
گوش ایوان حکومت کو وہ جرأت یاد ہے
طالبانِ علم کو اس کی محبت یاد ہے
جو ملے اک بار ان کو اس کی صورت یاد ہے
ہے تصور اس کا آنکھوں میں کہ تصویر وفا
اس کا سایہ تھا سروں پر یا کہ تھا ظل خدا

وہ کہ جسکی بات میں فوجِ حسینی کا تھا زور
تھی زباں یا ذوالفقار کربلا اب تک ہے شور
ناتواں تھا گئے دشمن مثالِ جان مور
اسکی اک جنبش زباں کی، اس طرف باتیں کرور
کانپتے تھے دشمن حق اس کا جب نام آگیا
وہ سپاہی آہ پر میدان میں کام آگیا

طول و عرض ملک میں پھرتا تھا مثلِ پاسباں
آج آیا ہے یہاں تو کل کو جانا ہے وہاں
تا نہ اس کے ہوتے پہنچے قوم و ملت کو زیاں
بے زبانی کا کرے شکوہ نہ کوئی بے زباں
بن کے دامن پونچھتا تھا دیدہ گریاں کو وہ
دیکھ سکتا تھا نہ مشکل میں کسی انساں کو وہ

بے لحاظ مذہب و ملت غریبوں کا رفیق
جن کے سر پر باپ کا سایہ نہ ہو انکا شفیق
ڈانٹتے، ٹھکارتے ہوں سب جنھیں اُن سے خلیق
کون ہوگا اشک بیوہ کی طرح دل کا رقیق
اپنی چادر غیر کے زخموں پہ اب ڈھانپے گا کون
بے سہاروں کو کمر پر اپنی اب لادے گا کون

خدمتِ قومی کو اُٹھیں گے ابھی لاکھوں بشر
پر کہاں سے لائیں گے وہ اسکا دل اسکا جگر
مسئلے سلجھانے کی خاطر کھپائیں گے وہ سر
اپنی ہمت تک کریں گے جستجو ہیں سنو مگر
جو کبھی پوری نہ ہوگی وہ کمی رہ جائے گی
ہاتھ ملتی رہبروں کی رہبری رہ جائے گی

از:- محمد عرفان

مجاہدِ ملّت کلکتہ کے اجلاس میں — فروری ۱۹۵۵ء کا ایک تاثر

مولانا اخلاق حسین قاسمی



سفر کی حالت میں ساتھی کا تجربہ ہوتا ہے اور کانفرنسوں کے موقعہ پر لیڈروں کی صلاحیتوں کا۔ کلکتہ میں جمعیۃ العلماء ہند کی سالانہ کانفرنس ہوئی۔ اس میں ملت کے تمام رہنما اکابر جمع ہوئے۔ ہر مکتب خیال کے علماء و مشائخ ہر نقطۂ نظر کے حامی و علمبردار۔ اور پھر ایسے اکابر بزرگ جن میں ہر بزرگ اپنے رنگ میں ممتاز۔ اپنی صلاحیتوں میں نرالا۔ ان سراپا اخلاق و ایثار بزرگوں کے درمیان فرق کرنا نہ تو اپنے بس کی بات ہے نہ اپنے لئے موزوں ہے۔ البتہ اس بات کے اظہار کے لئے قلم بے تاب ضرور ہے کہ جو شخصیت کانفرنس کے ہر منظر میں نمایاں ہر کام میں آگے اور ہر نظر کا مرکز تھی وہ وضع قطع کی ایک بالکل سادہ سی شخصیت تھی جسے حفظ الرحمٰن کہتے ہیں۔ مہمانوں کا خیال اُن کا استقبال، کھانے پینے کا دھیان۔ قیام گاہ پر بڑے چھوٹوں کی دیکھ بھال سیر رضاکارانہ کام ہیں۔ ان میں ایک مستعد سپاہی کی طرح بھاگ دوڑ۔ مجلس مضامین میں بحث و مباحثہ، اجلاس عام میں خطاب و تقریر، یہ عالمانہ اور مدبرانہ ذمہ داریاں ہیں۔ ان میں ایک کامیاب قومی اور ملّی وکیل کی طرح حکومت اور عوام دونوں کے حقوق کی ترجمانی خدمت و عظمت کے ان دونوں موقعوں پر نمایاں۔ ممتاز و اول بر چھایا ہوا اگر کسی کو دیکھا تو وہ مجاہدِ ملت تھے۔ ہم ان کے بے پناہ جذبۂ عمل کے پیش نظر انہیں مجاہدِ ملت کہتے ہیں۔ حالانکہ وہ جس درجہ کے عملی آدمی ہیں اسی درجہ کے صاحب فکر و فہم بھی ہیں، کلکتہ کے اجلاس میں میرے ساتھ بعض ایسے دوست بھی تھے جنہوں نے دلّی سے باہر سالانہ اجلاس کی گہما گہمیوں اور مختلف انتظامات کی مصروفیتوں میں پہلی مرتبہ مولانا کو اتنے قریب سے دیکھا۔ ایک انتھک کام کرنے والے لیڈر کی حیثیت سے انہوں نے مولانا کو ہمیشہ دیکھا تھا اور دلّی والوں سے زیادہ مولانا کی مجاہدانہ سرگرمیوں سے واقف بھی کون ہو سکتا ہے۔ لیکن ایک حقیقی جمہوریت پسند ملک و ملّت دونوں کے محبوب۔ ملّی وحدت کے واحد علمبردار رہنما کے روپ میں دیکھنے کا پہلا موقعہ تھا جو انہیں کلکتہ کانفرنس میں نصیب ہوا۔ ارکان مرکزیہ کی میٹنگ میں جمعیۃ العلماء ہند کے دستور پر بحث جاری تھی۔ ترمیمات کے سلسلہ میں مختلف صوبوں کی نمائندگی کا مسئلہ زیر غور تھا۔ معاملہ کی نزاکت نے ہاؤس میں گرما گرمی پیدا کر دی تھی۔ مولانا مجلس عاملہ کی تجویز کی حمایت میں بول رہے کچھ حضرات اس میں رد و بدل چاہتے تھے دونوں طرف سے تقریریں ہو رہی تھیں۔ جب سب حضرات بول چکے تو مولانا نے نہایت اختصار کے ساتھ عاملہ کی تجویز کو واضح کیا۔ گفتگو صاف تھی، دلائل معقول تھے۔ ہاؤس کا رنگ بدل گیا اور رائے شماری ہوئی اور اکثریت نے عاملہ کی تجویز کے حق میں فیصلہ کر دیا۔ میں اور میرے چند ساتھی جہاں عاملہ کی تجویز سے مطمئن نہیں تھے وہاں اس ترمیم کو بھی کافی نہیں سمجھتے تھے جو پیش تھی اس لئے ہمارا خیال تھا کہ بہتر ہو کہ دونوں ترمیمیں ایک سب کمیٹی کے حوالہ کر دی جائیں لیکن مولانا نے اس سے اتفاق نہیں کیا اور ہمیں رائے شماری میں غیر جانبدار رہنا پڑا۔

ہمیں مولانا سے بہت قریب سمجھا جاتا ہے اس لئے رائے شماری میں ہماری غیر جانبداری ان دوستوں کے لئے تعجب کا باعث ہوئی۔ ممکن ہے انہوں نے اپنے دل میں یہ سمجھا ہو کہ مولانا ان لوگوں سے ناراض ہو گئے ہوں گے۔ بات ختم ہو گئی۔ کھانا کھا کر ایک دوست سے ملاقات ہوئی۔ اجلاس کی گرما گرمی کا ذکر چھڑا۔ وہ بولے مولانا سے ایک صاحب کہہ رہے تھے۔ فلاں۔ فلاں صاحب نے جو اصلی ترمیم کے خلاف ووٹ دیا مولانا نے فرمایا یہ بہت خوشی کی بات ہے اس سے جماعتی زندگی کے ساتھ دلچسپی کا اظہار ہوتا ہے یہ جماعتی زندگی کے استحکام کی علامت ہے ان جملوں کو اُن دوستوں نے بڑے غور سے سنا اور ہنس کر کہنے لگے اپنوں اور غیروں کی مخالفت کے باوجود جمعیۃ العلماء کے دن دگنی رات چوگنی ترقی کرنے کا اصل راز یہی ہے۔

حقیقت بھی یہی ہے کہ دوسروں کی رائے کا احترام کرنا اجتماعی زندگی میں ہر شخص کو اظہار رائے کی آزادی دینا وہ عالی ظرفی اور بلند حوصلگی ہے جس کے بغیر جماعتوں کا چلنا اور کسی نصب العین کی طرف بڑھنا مشکل ہوتا ہے جماعت کے ارکان میں جب یہ روح پیدا ہو جاتی ہے تو عوام میں بھی یہ ایثار ابھر آتا ہے کہ وہ ذاتی مفاد کو جماعتی مفاد پر قربان کرنے کے لئے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ آج کے حالات بہت نازک ہیں جس دور سے ہم گذر رہے ہیں اس کے تقاضے بہت پیچیدہ ہیں۔ ایسے لوگ بہت کم ہیں جو اس صورت حال کو اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ اگر ایک طرف اقلیت کی مشکلات ہیں اور اس کا تقاضہ ہے کہ حکومت پر نکتہ چینی ہو تو دوسری طرف آزاد ہندوستان کی تعمیر کے لئے ہر شخص کا تعاون اور محنت درکار ہے اور اس کا تقاضہ ہے کہ مسلمانوں میں وطن اور اہل وطن کی محبت کے جذبہ

کو بڑھایا جائے اور انہیں یقین دلایا جائے کہ ملک کی ہر ترقی میں ان کا حصہ ہے۔ ان دونوں صورتوں کو سامنے رکھ کر زبان سے کوئی بات نکالنا ہی دانشمندی ہے جس کی اس وقت ملک کو ضرورت ہے۔

ہمیں اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ مجاہدِ ملت کو قدرت نے اس کمال پر قابو عطا فرمایا ہے۔ ان کی پُر وقار خطابت میں حکومت کے لئے تنبیہ اور للکار بھی ہوتی ہے اور عوام کے لئے محبت وطن کا پیغام بھی۔ وہ ارکان حکومت کو بتاتے ہیں کہ کسی حکومت میں ایک مظلوم انسان کا وجود بھی اس کے لئے خطرناک ہوتا ہے اور وہ عوام کو بھی ہشیار کرتے ہیں کہ ملک میں تماشائی کی حیثیت سے رہنے والوں کو بھی ملک کی فلاح و بہبود میں سے کچھ حصہ نہیں ملتا۔ وہ نکتہ چینی کرتے ہیں لیکن ایک بھونڈے اور جذباتی مقرر کی طرح نہیں بلکہ ایک دُور اندیش مدبر کی طرح تعمیری نکتہ چینی نہ کہ تخریبی۔ کلکتہ کے اجلاس میں بڑے بڑے نازک مسئلے زیر بحث آئے۔ کسٹوڈین کے عملہ کی تم رانیاں، مساجد کی تباہ حالی، مغربی بنگال کے برباد مسلمانوں کی آبادکاری وغیرہ۔ ان سب تجویزوں پر مجاہدِ ملت نے جس اثر انگیز وضاحت اور پُر زور استدلال کے ساتھ عوام کو خطاب کیا وہ مولانا ہی کا حصّہ تھا۔

از بسم اللہ العزیز العظیم الرحمن الرحیم
۱۹　ع　۶۲

اعوذ باللہ العلی الغفار من الشیطان الرجیم
۱۹　ع　۶۲

چند جامع قطعاتِ تاریخ

۱۹　ع　۶۲

آہ شمع خاموش ہے آج
۱۳　ھ　۸۲

آہ۔ غروب مہ کامل
۱۳　ھ　۸۲

ذکرِ صدمہ شدیدہ
۱۳　ھ　۸۲

مجاھدِ دین و حق کے اوپر　　قرآن پڑھ کر سلام کہہ کر
قمر نے سالِ وصال پایا　　”حبیبِ ذی احترام“ کہہ کر
۱۳　ھ　۸۲

اے مجاہد اے محبِّ مُلک اے سالارِ قوم　　شق ہے عالم کا کلیجہ چشمِ دل ہے اشکبار
سالِ رحلت یوں قمر لکھتا ہے باحزن و ملال　　ایک عالم غم نشین ہے ”اے محبِّ غم گسار“
۱۳　ھ　۸۲

رقیمہ کمترین سلطان الدین قمر الحمیدی سنبھلے

۱۹　ع　۶۲

مسٹر ریاض الدین احمد۔ پرنسپل مجیدیہ اسلامیہ کالج۔ (الہ آباد)۔

وہ بھی ہم سے جُدا ہو گئے

انیسویں صدی افق ہند پر پونیاں بکھیر رہی ہے۔ کوئی میدان نہیں جو گہرباری سے خالی ہو حکمت و فلسفہ۔ علم و دانش۔ سیاست و حکمرانی۔ روحانیت اور مادیت ہر ہر سطح پر ایک نہیں کئی کئی گہر ہائے آبدار درخشاں نظر آتے ہیں۔ صدی اپنے اختتام پر ہے مشیت کی گہرباری کا یہ تاریخی موڑ ختم ہو رہا ہے۔ مگر ابھی ایک ستارہ سرزمین ہند سے اُبھرنا باقی ہے۔ قوم و ملت کا ایک بے مثال رہنما۔ دین حق کا ایک زبردست محافظ۔ جنگ آزادی کا ایک سربلند قائد۔ حرص و ہوا سے مُبرّا۔ خلوص و محبّت کا مجسمہ۔ اسلام کا پاسبان اور اللہ کا مجاہد ابھی آ رہا ہے۔ مبارک ہے وہ گھرانا جس نے انہیں جنم دیا۔ مبارک ہے وہ سرزمین جس نے انہیں پالا اور پوسا۔ مبارک ہے وہ دور جس میں اُس کی صلاحیتوں نے ضوفشانی کی۔ دیوبند میں وہ چمکے۔ پارلیمنٹ ان کی گرم گفتاری سے سرفراز ہوئی۔ خاص و عام دل کی گہرائیوں میں انہوں نے جگہ پائی۔ ملک کا گوشہ گوشہ آن کی بے لوث خدمت سے منور ہوا۔ ہم خیال اُن کے دوست ہوتے مخالفوں نے ان کی محبت میں پناہ لی۔ مجاہدوں نے ان کی قیادت قبول کی۔ حق پرستوں نے ان کا دامن پکڑا جو بھی اُن سے ملا ان کا گرویدہ ہوا جس نے ان کو سنا ان کا دم بھرنے لگا

یہ ہیں جنہیں اللہ نے اپنی مشیت کے ارادوں کو پورا کرنے کے لئے پیدا کیا اور اسی مناسبت سے نام حفظ الرحمٰن رکھا۔ یہی آزادیٔ ہند کی آخری جنگ کے سپاہی ہیں اُن کی جنگ اِس وقت بھی جاری رہی ہے جب ملک قید فرنگ سے آزاد ہو کر قید حرص و ہوس میں مبتلا ہے۔ ہر ستم شعار سے مورچے رہے ہیں، قوم و ملک کے ہر دشمن کے خلاف وہ آواز بلند کر رہے ہیں۔ مظلوموں کی حمایت کر رہے ہیں پستیوں میں گرنے والوں کو ابھارنا اُن کا مشغلہ ہے۔ ملک کے دشمنوں سے وہ برسرپیکار ہیں۔ زبان کے حق پر وہ لڑ رہے۔ اللہ کے سپاہی پیدا ہوتے۔ اللہ کے سپاہی زندہ رہے اللہ کے سپاہی مرے۔

انگریز کی غلامی ختم ہو گئی ہے۔ لال قلعہ پر آزادی کا پرچم لہلہا رہا ہے۔ شادیانے بج رہے ہیں۔ سڑکیں سجائی جا رہی ہیں۔ فوجیں آراستہ کی جا رہی ہیں توپیں سلامیاں دے رہی ہیں اور وہی جو جیلوں کی سلاخیں چوم رہے تھے محلوں کی زینت بن چکے ہیں۔ کوئی وزارت کے لئے بھاگا جا رہا ہے۔ کوئی ملازمتوں پر قبضہ جما رہا ہے کوئی تجارت و صنعت و حرفت کا میدان سر کئے ہوتے ہے غرض کہ قربان گاہ آزادی کا ہر مہرہ بڑھ چڑھ کر قربانی کی قیمت وصول کر رہا ہے۔ مگر اللہ کا ایک بندہ وقت کی اس گرم بازاری سے دور تماشائے جنوں کے مشاہدوں میں تو اُسے وزارت کی تمنا ہے نہ عہدوں کی طلب۔ نہ جاہ و حشمت کی خواہش ہے نہ دولت کی ہوس۔ اس کے لئے تو وہی قاسم جان کی گلی جو پہلے تھی اب بھی ہے۔ وہی کمرہ۔ وہی فرش وہی لباس وہی غذا۔ ہاں قربانیوں کا کوئی صلہ ملا تو یہ کہ دل کا درد بڑھ چکا ہے۔

جمعیۃ العلماء ہند کا دفتر ریلوے اسٹیشن کا پلیٹ فارم بنا ہوا ہے۔ جدھر دیکھئے پھیلے ہوئے بستر اور لپٹے ہوئے ہولڈال نظر آ رہے ہیں لوگ ہیں کہ جوق در جوق آ رہے ہیں اِس کو آبادکاری والوں نے اجاڑ دیا ہے۔ گھر بیٹھے ہوئے لوگ ملک بدر قرار دے دئے گئے ہیں یہ مسجدوں اور قبرستانوں کی بحالی پر جان نثار کر رہے ہیں یہ اردو کے مرحوم کے نوحہ خوان ہیں۔ یہ کافرانہ نصاب تعلیم پہ ماتم کر رہے ہیں یہ ان شہیدوں کے اہل و عیال ہیں جو جبل پور اور ساگر کے حادثات میں جاں بحق تسلیم ہوئے۔ یہ مدھیہ پردیش کے نکالے ہیں جو یوپی کے ہیں۔ یہ بہار اور بنگال کے ہیں جو بھی ہیں ان کا وہی ہمدرد و غم گسار ہے۔ انہی کے یہاں اس کے غم کا علاج اور درد کا درماں بھی ہے۔ انکے علاوہ اور کس میں یہ ہمت ہے کہ جواہر لعل کا ہاتھ پکڑ کر کہہ دے کہ ”میری قربانیاں تم سے کم نہیں ہیں اس لئے کسی کو یہ حق حاصل نہیں ہوتا کہ وہ مجھے دوسرے درجہ کا شہری بنا سکے“ انکے علاوہ کس میں یہ دم ہے کہ سرکار کے بارے میں پارلیمنٹ میں اعلان کر دے کہ آج کی حکومت میں انسانوں کی جانوں کے مقابلے میں ایک چیونٹی کی جان بھی زیادہ قیمت رکھتی ہے۔ اس کے علاوہ کون ایسا سر پھرا ہے جو ہر گ اردو کی حمایت میں بگتا حکومت کو جھنجوڑنے سے باز نہ رہے۔ کون ہے جو خدمت خلق کے پیچھے اپنی جان کی پرواہ نہ کرے اپنے آرام و آسائش سے کنارہ کش ہو جائے اور اپنی زندگی کو اسی طرح قربان کر دے اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔

تاریخ کے اوراق ۱۹۴۷ء کی داستان خون لکھ رہے ہیں اور لکھتے ہی رہینگے بے لبسوں پر مشق ستم کی کہانیاں سُنی جا رہی ہیں اور لکھی جاتی رہیں گی۔ غریبوں۔ یتیموں اور بیواؤں کی پکاریں دامن عرش کو چھو رہی ہیں مگر اس دور سیہ بخت کے

مجاہد اعظم کے ذکر سے آج ملک کا گوشہ گوشہ معمور ہے ۔ وہ پرکیف شخصیت روئے زمین سے اوجھل ہو چکی ہے مگر اس کی روحانی بلندیاں اب بھی موجود ہیں۔ اس کی مجاہدانہ طاقتیں آج بھی گرتوں کو اٹھا رہی ہیں مجبوروں کو سہارا دے رہی ہیں ۔ دشمنوں کے خلاف سپر ہیں اور حکومت کو جھنجوڑ رہی ہیں ۔ آج . . . ، . . . . ہر پیچیدہ مسئلہ ۔ اُن کی یاد تازہ کر رہا ہے اور محفل عمل کا گوشہ گوشہ انہیں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر تلاش کر رہا ہے

دستور کے بیں السطور کو پڑھنا اور اس کی روشنی میں دینی تعلیم کے مسئلہ کو منظر عام پر لانا انہی کی دور رس نگاہوں کا کرشمہ ہے ۔ یہ انہی کی پیش بینی کا نتیجہ ہے کہ ابھی آزاد ہندوستان اپنے نظام تعلیم کی روپ ریکھا مرتب نہیں کر سکا کہ دینی تعلیمی بورڈ وجود میں آجاتا ہے اور ملک کے سنجیدہ اور دین پرور طبقے کو دعوت عمل پیش کرتا ہے ۔ انہی کی ہمت ہے کہ عام بے حسی اور پست ہمتی کی سطح پر ارتعاش پیدا کر دیتی ہے ۔ عالم جمود میں زندگی کا نکھار نظر آنے لگتا ہے اور مایوسی کے افق پر آس کا تارہ چمکنے لگتا ہے ۔ کوئی مانے یا نہ مانے مگر حقیقت یہی ہے کہ سونے والوں کا آنکھیں مل کر اٹھنا ، بے عملوں کا کمر کسنا ۔ بھٹکے ہوئے راہی کا ایمان کی ڈگر پر قدم جما لینا اسی مرد مجاہد کے جذبہ عارفانہ کا کرشمہ ہے ۔

وہ علیل ہیں دنیائے اسلام ان کے لئے بے چین ہے ۔ دعائیں ہو رہی ہیں ۔ منتیں مانی جا رہی ہیں ۔ خیر و خیرات کے دروازے کھول دئے گئے ہیں ۔ منتیں غلاف کعبہ سے لپٹی ہوئی ہیں اور آرزوئیں عرش کا دامن پکڑ رہی ہیں لوگ اسی مرد مجاہد کو پھر چاہتے ہیں ۔ اسی سے دامن مہر و اخلاص کے پھر متلاشی ہیں ۔ اسی نطق گہربار کو پھر ڈھونڈ رہے ہیں ۔ اسی نکتہ سنج اور معاملہ فہم ذہانت کی پھر ضرورت محسوس کر رہے ہیں ۔ شیخ الاسلام کا غم ابھی تک تازہ ہے آزاد کے لئے آنکھیں آج بھی پرنم ہیں ۔ حفظ الرحمٰن کی جدائی کیسے گوارا ہوتی !

مگر آہ ! کہ دعاؤں میں اثر نہ رہا ۔ دواؤں کی طاقتیں سلب ہو گئیں ۔ طبیبوں کی عقل گم ہو گئی ۔ تیمار داروں کی شب بیداریاں کام نہ آئیں ۔ مخلصوں کا دامن خلوص آنسوؤں سے تر ہو گیا مگر قدرت کا فیصلہ اٹل ہے اللہ کا حکم غالب اور مشیت کے ارادے غیر متزلزل ہیں ۔ وہی ہوا جس کو یقین کرنے کے لئے آج بھی دل تیار نہیں ہوتا ۔ کیسے مان لیں کہ ایک قومی اثاثہ چھین گیا اور ملی خزانہ لٹ گیا کیسے یقین کریں کہ وہ بھی ہم سے جدا ہو گئے ۔

"جن گھاٹیوں میں شیر بھی جھجکتا/ٹھٹکتا بھول جاتا ہے وہاں مولانا سر سے کفن باندھ کر مردانہ وار گزر گئے اور کامیابی انکے قدم چومے"

"حصولِ آزادی کے بعد جس لیڈر نے عمل کے ناہموار میدانوں میں طوفانوں کا مقابلہ کیا وہ صرف مجاہد ملت تھے"

"مولانا کی ذات حبِّ وطن، اور خدمت و عمل کا جلی عنوان تھی، وہ حال و مستقبل کی امید گاہ تھے!"

"ابھی سال بھر کی بات ہے ۔ مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب (جنوری ۱۹۶۲ء میں) امروہہ پارلیمانی سیٹ سے الیکشن میں کھڑے ہوئے تھے ۔ (کسے معلوم تھا کہ یہ زندگی کا آخری الیکشن ہے ۔) حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے حق میں پورے ملک کے اردو ۔ انگریزی مسلم و غیر مسلم اخبارات و جرائد نے بڑی قوت کے ساتھ اپنے اداریے نوٹ لکھے اور حضرت مولانا کی عظیم الشان خدمات کو برملا خراج تحسین پیش کیا ۔ اسی سلسلہ میں دہلی کے مشہور ہفتہ وار پیام مشرق نے بھی اپنے اداریہ میں مولانا کی شخصیت پر اظہار خیال کیا تھا، جو آج بھی اس عظیم اور دور آفریں شخصیت کے لئے زبردست خراج عقیدت کہا جا سکتا ہے ۔ ملاحظہ فرمائیے !" (انیس الحسن)

اپنے پرانے حلقۂ انتخاب سے مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب پارلیمنٹ کے امیدوار ہیں اور امیدوار ہونا چونکہ ایک مخصوص اصطلاح ہے اس لئے یہ اصطلاح لکھنا پڑتی ہے ورنہ وہ پارلیمنٹ کی بہت بڑی ضرورت ہیں ۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے حال اور مستقبل کی امید و یقین

ہیں اور مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے بعد کس کا نام لیا جا سکتا ہے، جسے وہاں ہونا چاہیئے، جہاں ہندوستان کا جمہوری اقتدار کارفرما ہے۔ شاید انتخابی مہم کی یہ بھی رسم ہے کہ مولانا کا مقابلہ کیا جائے اور مسلم کنونشن کی آڑ میں جن سنگھ تو پورا زور صرف کر دے گا کہ معرکہ سر کرے۔ لیکن ہم پوری ذمہ داری کے ساتھ اعلان کرتے ہیں کہ مولانا کے خلاف جو ووٹ دیا جائیگا وہ گاندھی جی کے خلاف ووٹ ہوگا۔ اور اس دیش بھگتی اور حب وطن کے خلاف ہوگا جس کا جلی عنوان مولانا حفظ الرحمٰن ہیں۔ یہی نہیں بلکہ ہم بلا خوف تردید کہتے ہیں کہ حصول آزادی کے بعد جس لیڈر نے عمل کے ناہموار میدانوں میں طوفانوں کا مقابلہ کیا اور صحیح معنوں میں مجاہد وطن اور مجاہد ملت ہونے کا ثبوت دیا، وہ مولانا حفظ الرحمٰن اور صرف حفظ الرحمٰن ہیں۔ بڑی بڑی قیادتوں کے قصر ڈول گئے، لیکن مولانا کے پائے ثبات میں لغزش نہیں آئی جن گھاٹیوں میں شیر بھی جھنگھاڑنا بھول جاتا ہے وہاں مولانا سر سے کفن باندھ کر مردانہ وار گئے۔ گولیوں کی بوچھار میں سینہ تان کے گئے اور کامیابی نے اُن کے قدم چومے۔ ذاتی زندگی میں مقاصد و عمل کی مطابقت کوئی مولانا سے سیکھے۔ سیکولر ہندوستان میں ایک سچے ہندوستانی اور سچے مسلمان کا جو کردار ہونا چاہیئے وہ مولانا کا کردار ہے جو بالکل بے ریا، نہایت پاک، نہایت استوار ہے۔ جن سنگھ کا ارشاد ہے کہ مولانا فرقہ پرستی سے ساز باز کر رہے ہیں۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ یہ ارشاد جن سنگھ ہے، جنکی فرقہ پرستی کا اژدھا پورے ملک میں منڈلا رہا ہے۔

مسلم کنونشن شاید مولانا کا سب سے بڑا گناہ ہے۔ لیکن جن لوگوں نے چودہ برسوں میں فرقہ پرستی کے ہزار ہا کنونشن کر ڈالے، انھیں زمین کی تہوں میں دفنانے کا اہتمام صرف دو نے کیا ہے۔ ایک کا نام پنڈت جواہر لال نہرو اور دوسرے کا نام مولانا حفظ الرحمٰن ہے۔

مسلم کنونشن کے بارے میں دو رائے ہو سکتی ہیں۔ لیکن اس رائے سے کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا کہ مسلم کنونشن نے جمہوری ہندوستان کی ان بنیادوں کو مضبوط کیا ہے جسے رجعت پسند اور فرقہ پرست کمزور کر رہے ہیں۔ مولانا کا یہ عظیم کارنامہ ہے کہ مسلمانوں میں انھوں نے جمہوریت پسندی اور ترقی پسندی کو ایک بار پھر نئی زندگی بخشی اور گمرہی کی بروقت روک تھام کی۔

مولانا کی راہ چلنے کے لئے بڑی ہمت درکار ہے۔ صحت بگڑ رہی ہے قویٰ مضمحل ہو رہے ہیں۔ اعصاب میں تشنج ہے۔ کھانسی دم نہیں لینے دیتی۔ لیکن آج بمبئی میں، کل کلکتہ میں، پرسوں لکھنؤ میں اترسوں پٹنہ میں۔ اور یہ کوئی ایک دن کی بات نہیں، زندگی کا ایک لگا بندھا معمول ہے جو پورا ہوتا ہے۔ ہمیں مولانا حفظ الرحمٰن کو دیکھ کر اندازہ ہوا کہ قیادت کا سودا اس قدر مہنگا بھی ہو سکتا ہے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد قیادت جتنی آسان ہو گئی ہے، مولانا کے لئے اتنی ہی مشکل ہے۔ نہ کوٹھی ہے نہ چپراسی، نہ وزارت کی آن بان، بس وہی تکی قاسم جان ہے۔ وہی بے سروسامان قافلہ ہے اور زندگی مجاہدوں کے لئے وقف ہے۔ مولانا چاہتے تو ایک ذرا سا پینترا بدل کر ایک دنیا کو خوش کر سکتے تھے، لیکن یہ کیسی فرض شناسی ہے کہ مقاصد پر بھی زخم نہ آئے، وطن کا نام بھی اونچا رہے اور مسلمانوں کو بھی حال و مستقبل کے زندگی بخش ہنگاموں میں حصہ لینے کے قابل بنایا جائے۔ یہ پیارا انداز کسی جن سنگھی کا انداز نہیں، کسی مسلم لیگی کا انداز نہیں، مجاہد وطن کا مخصوص انداز ہے جسے ہندوستان کی تاریخ انقلاب بہت اونچا درجہ دے گی۔ دنیا نے مولانا آزاد کی عظمت کے سامنے سر جھکا دیا، لیکن مولانا حفظ الرحمٰن کے اخلاص کے آگے ابھی سر جھکانا باقی ہے۔

مولانا حفظ الرحمٰن کا پارلیمنٹ میں جانا عوامی زندگی کے اس توازن کا جانا ہے جس کے بغیر ہندوستان، ہندوستان نہیں رہ سکتا ہمیں یقین ہے کہ مولانا حلقہ انتخاب امروہہ سے صرف کامیاب ہی نہیں ہونگے بلکہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی غالب اکثریت کے نتیجے کامیاب ہونگے۔ مولانا کی کامیابی ہندوستان کے بلند مقاصد کی کامیابی ہے۔

روحِ مجاہد سے خطاب

از: مولانا محمد اسرائیل صاحب فرحت قاسمی رکن ادارہ زینت المعارف نبا بھوجپور

آج کیوں ہیں ملتِ بیضا کی آنکھیں اشکبار؟ روح کو ہے صدمۂ جانکاہ دل ہے سوگوار
شاعرِ رنگیں بیاں بھی ہوگیا ہے تار تار تیرے اُٹھ جانے سے ہے محفل کی محفل بیقرار

کارناموں کو ترے دُنیا بھلا سکتی نہیں
دل سے تیری یاد کوئی شئے مٹا سکتی نہیں

تیرے دَم سے آبروئے ملتِ بیضا بھی تھی جرأتِ رندانہ کی قائل تری دُنیا بھی تھی
ترے ماتھے پر کلاہ سروری زیبا بھی تھی تیری رفعت دہر میں پنہاں بھی تھی پیدا بھی تھی

چشم ظاہر بیں سے لے جانِ جہاں پنہاں ہے تو
یاد تیری عنبر فانی اور حرزِ جاں ہے تو

آندھیوں میں شمع حق لے کر کے اب آئیگا کون راہ سے بھٹکے ہوؤں کو راہ دکھلائے گا کون
روز و شب ملت کی خاطر فکر فرمائیگا کون چوٹ کھا کر، مسکرا کر، پھول برسائے گا کون

اَب کسے ڈھونڈھینگی آنکھیں اَب کسے پائے گا دل
غم میں خود روئیگا، اوروں کو بھی رُلوائے گا کون

ہائے کتنا جلد بدلا میکدے کا یہ نظام وائے حسرت! کیوں ہوئے یہ خون سے لبریز جام
آہ رندو! خوں برستا ہے فضا میں صبح و شام داستانِ زندگانی رہ گئی ہے ناتمام

انجمن میں کیف پرور وہ فضا باقی نہیں
ساغر و مینا سے کیا مطلب ہے جب ساقی نہیں

آسمانِ علم کا اک نیرِ تاباں بھی تھا حسن سیرت، حُسن صورت میں مہِ کنعاں بھی تھا
مہرِ نظارہ جمال جلوۂ یزداں بھی تھا پیکرِ صبر و رضا تھا مخزنِ ایماں بھی تھا

حشر تک شاید نہ ہوگا حفظ رحمٰن پھر کوئی
گُل کرے پیدا، ہے ناممکن گُلستاں پھر کوئی

خطۂ سی پی بنا جس دم تھا اک آتش فشاں نالۂ و شیون بپا تھا دل میں اُٹھتا تھا دھواں
گر رہی تھیں بجلیاں اور جل رہے تھے آشیاں خون روتی تھی زمیں، تھا محوِ حسرت آسماں

کس نے ایوان کو ہلایا گرمئ تقریر سے
فتنہ و شر کو مٹا ڈالا عجب تدبیر سے

انشا پردازی میں تھا وہ بے نظیر و بے مثال واعظِ جادو بیاں وہ اک خطیب باکمال
پختہ تر کردار میں گفتار میں شیریں مقال کارنامے حشر تک اس کے رہیں گے لازوال

غم میں ہر اک ذرہ خاک ہند کا نمدیدہ ہے
آج پہلوئے محدث[1] میں وہ آرامیدہ ہے

[1] (حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ)

میر مشتاق احمد صاحب (دہلی)

(مولانا) حفظ الرحمن = ایک عظیم انسان

انسانی سماج میں کچھ شخصیتیں اس طرح چمکتی ہیں جیسے آسمان پر آفتاب۔ ایسی شخصیتوں کو یہ عظمت کیوں حاصل ہوتی ہے۔ اس کا اندازہ کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیا جائے تاکہ صلاحیت رکھنے والے انسان اس سے سبق حاصل کرکے بڑھ سکیں اور اس عظمت کو پانے کی کوشش کریں۔

۲؍اگست کو ۳ بجے صبح ایک عظیم انسان ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہوگیا گویا علم و عرفان کی ایک لائبریری تھی جو دفن ہوگئی لیکن اُن کی عظمت اُن کے مسلسل اور متواتر عمل میں تھی۔ مولانا حفظ الرحمٰن مرحوم ایک دردمند دل کے مالک تھے جن کو ابتدائی زندگی میں انقلاب دین کے مجاہدین علماء کی صحبت نصیب ہوئی۔ شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن، حضرت مولانا حسین احمد مدنی، حضرت مولانا انور شاہ جیسے بزرگوں کی صحبت نصیب ہوئی وہ خود کیسے انقلاب کی چنگاریوں سے بچتا۔ وہ تو شعلوں میں پلا تھا شاید اُن کی تربیت ایک خاص دور کی رہبری اور رہنمائی کے لئے ہوئی تھی ہندوستان کی جنگ آزادی میں ایک نمایاں حصہ لیا۔ یہ حصہ تو ہندوستان کے اور بہت لوگوں نے بھی اُن کی شخصیت کو عظیم بنانے والی خصوصیت تو اُن ہی کی تھی۔ وہ بمشکل ہی انسان میں ہوتی ہے۔

بہت دور جانے کی ضرورت نہیں صرف گزشتہ پندرہ سال یعنی آزادی کے بعد جب ملک کی تقسیم پر دستخط ہوئے اور انسانوں کی آبادیاں بے خانماں قافلوں کی صورت میں ہندوستان سے پاکستان کی طرف اور پاکستان سے ہندوستان کی طرف روانہ ہوئیں جب انسان وحشی بن گئے اور پاگل پن سوار ہوگیا۔

آبادیوں کے تبادلہ کی وجہ سے شمالی ہندوستان پر اس کے تباہ کن اثرات پڑے جب سرکاری مشین بھی اس جنون کے سامنے مفلوج ہوگئی کچھ دانستہ اور کچھ بے بسی میں ہندوستانی مسلمان عالم مایوسی کا شکار ہوگیا۔ احساس کمتری کے بادل جیسا اس کی زندگی کے گوشوں پر چھاگئے۔ مسلم لیگ پیچھے جھاڑ کر اپنا بستر بوریا گول کرکے روانہ ہوگئی۔ ہندو فرقہ پرستی نے جارحانہ روپ اختیار کیا۔ اچھے ہوش مند لوگوں نے دماغی توازن کھو دیا۔ جارحیت کا اس سے زیادہ اور کیا ثبوت ہوسکتا ہے کہ مہاتما گاندھی کو گولی کا نشانہ بنایا گیا۔ اس دور میں مردے از پردہ برو آید وکارے بکند کا صحیح مصداق مولانا حفظ الرحمٰن تھے۔ جرأت دلیری اپنی ذات سے لاپرواہی کے ساتھ صبر واستقامت ہوش مندی کی سخت ضرورت تھی یہ سب خصوصیات مولانا کی ذات میں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ ان نامساعد حالات کے اندر گلی کوچوں محلوں سے لے کر سرکاری ایوانوں تک گھومتے رہنا لوگوں کی ڈھارس بندھانا اُن کی دلجوئی کرنا اور اُن کے اندر ہمت پیدا کرنا۔ پاکستان بن جانے کے بعد جو واقعات رونما ہوئے اور ہوا نے جو رُخ اختیار کیا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ مسلمانوں کے اندر احساس کمتری پیدا ہو۔ پانچ کروڑ انسانوں کو اس احساس سے نکالنا ایک بڑی قومی خدمت تھی جو مولانا نے اپنے مذہبی تقدس اور سیکولر کیریکٹر کو قائم رکھتے ہوئے انجام دی۔ زبانی اور تحریری طور پر ہمدردی کا اظہار کرنے والے تو بہت ہوتے ہیں لیکن عملی طور پر اپنی جان کو خطرہ میں ڈال کر صحیح خدمت انجام دینے والے مولانا ہی تھے کوئی شخص جو مظلوم ہو یا کوئی فرقہ جو بے انصافی کا شکار ہو اُس کے جذبات سے کھیلنا اُسے اور زیادہ مشتعل کرنا نہایت آسان کام ہے یہ کام کچھ غیر اندیش خود غرض لوگ اس عرصہ میں بھی کرتے رہے اور کر رہے ہیں۔ تقسیم کے بعد محب وطن مسلم لیڈر کے سامنے دوہری مشکل تھی ایک تو مسلمانوں کے طرز فکر کو بدلنا دوسرے جارحانہ فرقہ پرستی کا مقابلہ۔ اس کام کو مولانا نے خوش اسلوبی سے ادا کیا۔ اس میں غلط فہمیاں بھی پیدا ہوئیں۔ مگر وہ عزم ویقین کے ساتھ ڈٹے رہے وطنیت متحدہ اور مشترکہ قومیت اور اسلامی تعلیم اور روایات ایک ساتھ لے کر چلنا مولانا ہی کا کام تھا۔

ہر ہوسناکے نداند جام وسنداں باختن

تحریک آزادی کے دور میں لیڈری پھر بھی آسان تھی۔ غیر ملکی حکمرانوں کے خلاف تقریر کی جیل گئے لیڈر بن گئے۔ آزادی کے بعد تعمیر وترقی کا کام جب کہ سماج میں انسانی اور اخلاقی قدروں کا جنازہ نکل گیا۔ ان انسانی اور اخلاقی قدروں کو بحال کرنے کے لئے ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑنے کے لئے اتحاد اور ایکتا قائم کرنے کے لئے اُن کی زندگی کا ہر لمحہ وقف تھا۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ ہندوستانی مسلمانوں کا ہندوستانی سماج میں ایک مقام ہے یہ مقام اُن کو حاصل ہونا چاہئے۔ اس کے حاصل کرنے کا طریقہ محبت مروت شرافت ہی ہے اس کے لئے مختلف مذہبی فرقوں کے افراد کے درمیان باہمی اعتماد ضروری ہے اس کے لئے وہ ہر دم کوشش کرتے رہتے تھے۔ اگر آزادی سے پہلے انہوں نے مسلم لیگ کی فرقہ پرستی کے خلاف دلیرانہ جنگ کی تو آزادی کے بعد جارحانہ ہندو فرقہ پرست عناصر کے خلاف اسی دلیری سے جنگ کرتے رہے بے غرض بے لوث انسان تھے جن کی نظر وسیع تھی ان کے دامن میں پھول اور کانٹے ملے [illegible]

آہ حفظ الرحمٰن!

مولانا قاری فخر الدین صاحب گیا

رہبرِ حلقۂ احرار تھے حفظ الرحمٰن
ملت و قوم کے سردار تھے حفظ الرحمٰن

جس سے حبّ الوطنی سب کی پرکھ لی جائے
دیش بھگتی کے وہ معیار تھے حفظ الرحمٰن

داعیِ امن و اماں، حامیِ عدل و انصاف
ماحیِ فتنۂ اشرار تھے حفظ الرحمٰن

فتنہ پرور تھے ادھر در پئے تخریبِ وطن
اور ادھر دیش کے معمار تھے حفظ الرحمٰن

ابتری ملک میں پھیلاتے تھے اگر فرقہ پرست
سالمیّت کے علمدار تھے حفظ الرحمٰن

پوچھو آزاد سے، گاندھی سے جواہر سے ذرا
ملک کے کیسے وفادار تھے حفظ الرحمٰن

ظلم پہ ظلم کئے جاتے تھے ظالم جو ادھر
تو ادھر ظلم سے بیزار تھے حفظ الرحمٰن

اپنے ہی ملک میں جن لوگوں پہ ہوتے تھے ستم
ایسے مظلوموں کے غمخوار تھے حفظ الرحمٰن

اُن کا دل دُکھتا تھا ہر ایک دُکھی کے دُکھ سے
دردمندوں کے مددگار تھے حفظ الرحمٰن

سرفروشانِ وطن کے تھے وہ دیرینہ رفیق
جنگِ آزادی کے سالار تھے حفظ الرحمٰن

وہ مجاہد کہ، نہیں غازیِ گفتار فقط
بالیقیں غازیِ کردار تھے حفظ الرحمٰن

ان کی خدمات پہ نازاں تھے محبّانِ وطن
موردِ طعنۂ اشرار تھے حفظ الرحمٰن

کانگریس کے بھی ممبر تو وہ ام، پی، بھی تھے
ہند کے واقفِ اسرار تھے حفظ الرحمٰن

اُن کے اُپدیش میں اس دیش کی خیریت تھی
قائدِ حلقۂ ابرار تھے حفظ الرحمٰن

ایک ہی ذات تھی جس کا نہ تھا ثانی کوئی
کیا کسی قوم میں دوچار تھے حفظ الرحمٰن

قوم کی یک جہتی کے لئے کوشاں ہر دم
وحدتِ قوم کے مینار تھے حفظ الرحمٰن

کوئی فرقہ ہو، دُکھی کوئی رہے کیوں آخر
دیش میں سُکھ کے سماچار تھے حفظ الرحمٰن

علماء ملک میں آزادی کے ہیرو جو رہے
ان کے ہی ناظم و سردار تھے حفظ الرحمٰن

فخرؔ اس بات پہ جلتا تھا ہر اک خارِ وطن
کیوں وطن کے گل و گلزار تھے حفظ الرحمٰن

مجاہد ملت کا ایک دورہ

مولانا شاہ نصیر الحق رضوی صاحب

جنوری ۱۹۵۷ء کی بات ہے کہ مولانا سید انیس الحسن صاحب کا گرامی نامہ احقر کے نام آیا کہ مجاہد ملتؒ کلکتہ سیرت کے جلسہ میں تشریف لے جارہے ہیں۔ مولانا کے پاس دو روز کا وقت ہے تم مولانا سے مل کر بہار میں دورہ کرا سکتے ہو۔ اسی وقت مجاہد ملت کی خدمت میں دہلی بذریعہ تار کلکتہ سے واپسی میں بہار کے لئے استدعا کی۔

دھن باد۔ گریڈیہہ کی جمعیۃ کو مطلع کر دیا گیا کہ مولانا کی تشریف آوری کلکتہ کے اجلاس کے بعد ممکن ہے۔ دھن باد سے احقر کو بلایا گیا۔ وہیں گریڈیہہ سے بھی حضرات آگئے اور پروگرام بن گیا۔ دوسرے روز دھن باد سے میں کلکتہ پہنچا اور مجاہد ملت سے گزارش کی اور ہر دو جگہ کا پروگرام سامنے رکھ دیا۔ فرمایا کہ یہ دو روز تو میں نے آرام کے لئے رکھے تھے، اب آپ پہنچ گئے۔ میں نے عرض کیا حضرت بہار کے دفتر کی حالت آپ کو معلوم ہے۔ آپ کے جانے سے ممکن ہے دفتر کو کچھ فائدہ پہنچ جائے۔

مجاہد ملت اپنے ساتھ خان بہادر صاحب کی کوٹھی سے یوسف صاحب کے یہاں کولوٹولہ مجھے لائے اور فرمایا کہ اچھا منظور ہے۔ ناظم جمعیۃ علماء ہند مولانا اسمٰعیل صاحب سنبھلی کو بھی مدعو کرو۔ مولانا اسمٰعیل صاحب پہلے چلے جائیں گے۔ میں عین جلسہ کے وقت پہنچوں گا۔ مجاہد ملت کی منظوری کی اطلاع دھن باد اور گریڈیہہ کو دے دی۔ دھن باد میں دو پروگرام ہوئے پہلے بعد ظہر کتراس گڑھ میں۔ دوسرا بعد عصر دھن باد میں۔ شب میں قیام دھن باد۔ دوسرے روز روانگی گریڈیہہ بعد فجر ستر میل کی مسافت

گریڈیہہ میں بعد ظہر جلسہ تقریر۔ بعد عصر ملاقات اور عصرانہ وغیرہ۔ بعد عشا روانگی بذریعہ ریل مدھوپور اور مدھوپور سے ۲ بجے رات کو پنجاب میل سے لکھنؤ، مرادآباد ہوتے ہوئے دہلی۔

میں نے دھن باد واپسی کی اجازت چاہی، فرمایا کل چلے جانا۔ آج سیرت کے جلسہ میں شریک ہو لو۔ یہ ایک تاریخی اجتماع تھا۔ جمعیۃ علماء کلکتہ کی جدوجہد سے محمد علی پارک میں انتظام تھا۔ کلکتہ کے شایان شان بہت ہی شاندار پنڈال، روشنی کے اعتبار سے دیوالی کی روشنی سے کہیں زیادہ، دور دور تک انسانی سمندر راستہ بند۔ کل ہند اکابرین ڈائس پر جلوہ افروز خصوصاً حضرت شیخ نور اللہ مرقدہٗ۔ حضرت قاری طیب صاحب، مجاہد ملت، مفتی عتیق الرحمٰن صاحب، مولانا شاہد فاخری، حامد الانصاری غازی۔ مولانا ابوالوفا مولانا قاسم شاہجہان پوری، مولانا عبد العلیم صدیقی وغیرہم۔

شب میں تقریباً دو بجے مجاہد ملت جلسہ گاہ سے اٹھ کر جناب یوسف فیروزی صاحب کی قیام گاہ کولوٹولہ تشریف لے گئے پیدل استنجا کے واسطے۔ سردی شباب پر تھی۔ فاصلہ دو فرلانگ سے کم نہ ہوگا۔ مجاہد ملت کو شبہ ہوا کہ پیشاب کے قطرے نہ آگئے ہوں۔ آپ نے پائجامہ کے اوپری حصہ کو دھو لیا اور نچوڑ کر گیلا ہی پہن کر واپس جلسہ میں آگئے۔ آپ کی تقریر آخر میں تھی۔ ایک بجے کے بعد جلسہ ختم ہوا اور آپ قیام گاہ پر تشریف لے گئے، سرکار روڈ پر خان بہادر جان محمد صاحب کے یہاں۔ دوسرے روز کولوٹولہ میں مجاہد ملت کی خدمت میں حاضر ہوا۔ دیکھا کہ حضرت کمبل اوڑھے لیٹے ہیں، آنکھیں سرخ ہیں، معلوم ہوا بخار ہو گیا ہے۔

فرمایا تم آج واپس دھن باد جاؤ۔ مولانا اسمٰعیل صاحب کو میں رات کی ٹرین سے بھیج دوں گا۔ کل صبح ان کو اسٹیشن پر ملنا پروگرام کے مطابق مولانا اسمٰعیل صاحب وقت پر کتراس گڑھ میں تقریر کریں گے۔ میں طوفان ایکسپریس سے بعد ظہر پہنچوں گا اور سیدھا اسٹیشن سے جلسہ گاہ جاؤں گا۔

احقر رخصت ہو کر واپس دھنباد آگیا۔ دوسرے روز صبح مولانا اسمٰعیل صاحب دھن باد پہنچ گئے۔ دوپہر میں مولانا اسمٰعیل صاحب کتراس گڑھ تشریف لے گئے۔ مولانا محمد یحییٰ صاحب صدر جمعیۃ علماء دھن باد کے ہمراہ ۲ بجے محترم عبد الحی صاحب انصاری ناظم جمعیۃ علماء کے ساتھ احقر دھن باد اسٹیشن آیا۔ طوفان ایکسپریس وقت پر پہنچا۔ مجاہد ملت، حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب کے ساتھ ٹرین سے اترے

مفتی صاحب نے مجھ سے کہا کہ رضوی صاحب مولانا کو سخت بخار اور بے چینی ہے اور زبردستی دھن باد اترے ہیں ان کو تقریر نہ کرنے دینا۔ انھیں قیام گاہ پر لے جاؤ۔ یہ فرما کر حضرت مفتی صاحب ٹرین پر سوار ہو گئے اور ٹرین روانہ ہو گئی

مجاہد ملت نے کہا جلسہ گاہ چلو۔ عرض کیا گیا جلسہ گاہ یہاں سے دس میل دور کتراس گڑھ میں ہے جہاں پروگرام عصر تک ہے۔ بعد میں دھنباد میں دوسرے جلسہ کا انتظام ہے آپ یہیں ٹھہر کر آرام فرمایئے اور دھن باد کے جلسہ میں شرکت کیجئے آپ کو تیز بخار ہے۔ مسکرا کر فرمایا کہ سب ٹھیک ہے کتراس چلو مجبوراً کتراس کو روانگی ہو گئی۔

کتراس میں ہزاروں ہزار مشتاق منتظر تھے۔ مجاہد ملت کی آمد روانگی کی اطلاع کتراس پہنچ چکی تھی۔ پہنچنے پر زندہ باد کے نعروں سے استقبال ہوا۔ مولانا اسمٰعیل صاحب تقریر فرما رہے تھے۔ مجاہد ملت کے پہنچتے ہی تقریر ختم کر دی۔ مجاہد ملت نے فرمایا کہ مولانا اسمٰعیل صاحب کو دھن باد لے جاؤ۔ یہ وہاں جلسہ شروع کریں گے اور پہلی تقریر ان کی ہوگی، جب تک

میں یہاں سے پٹنہ پہنچ جاؤں گا۔ مولانا تقریر کے لئے اٹھے اور فرمایا کہ ایک کرسی لے آؤ کھڑا نہیں ہوا جاتا۔ کرسی آگئی۔ مجاہد ملت نے بیٹھ کر ۲۰ منٹ تقریر کی۔ تقریر پر مزاج کی ناسازی، بخار وغیرہ کا کوئی اثر نہیں تھا۔

روانگی سے قبل لوگوں کا اصرار ہوا کہ عصرانہ میں شرکت چند منٹ کے لئے ہو منظور فرمایا اور جناب تسنیم الدین صاحب کے ہمراہ تشریف لے گئے۔ مسجد میں نماز عصر پڑھی اور عصرانہ میں شرکت فرما کر دھن باد کے لئے روانہ ہو گئے۔ دھن باد میں ریلوے گراؤنڈ میں جلسہ تھا۔ حاضرین سے جلسہ گاہ بھری تھی۔ مولانا اسمٰعیل صاحب تقریر فرما رہے تھے مجاہد ملت کی آمد پر مولانا نے اپنی تقریر ختم کر دی اور ایک صاحب جو کمیونسٹ خیال کے تھے ایک نظم پڑھنے لگے جس میں اشتراکیت کی مدح تھی۔ مجاہد ملت نے اختر سے کرسی منگانے کو کہا۔ میں نے عرض کیا حضرت آپ کی تقریر نہیں ہوگی آپ کو بخار تیز ہوتا جا رہا ہے۔ اعلان بھی ہو چکا ہے کہ آپ بخار کی وجہ سے تقریر نہیں فرمائیں گے۔

مجاہد ملت نے کچھ سختی سے فرمایا: آپ کرسی تو منگائیے۔ بہر حال کرسی آئی حضرت نے اٹھنا چاہا مگر اٹھ نہیں سکے۔ بخار کی شدت سے پاؤں میں لرزش تھی پھر بھی کرسی پر بیٹھ گئے اور تقریر شروع کر دی۔ ایک گھنٹے سے زائد تقریر جاری رہی اشتراکیت کی تردید میں، مغرب کا وقت ہو چکا تھا، اس لئے تقریر ختم کی اور قیام گاہ تشریف لے گئے قیام گاہ پہنچ کر تیمم سے نماز مغرب پڑھی اور لیٹ گئے۔ کرب و بے چینی بہت بڑھ گئی دیکھنے پر پتہ چلا کہ ہاتھ کی انگلیاں پھول گئی ہیں۔ گردن کی رگیں تنی ہوئی ہیں اور جوڑ جوڑ میں درد ہے اسی وقت ڈاکٹر آئے۔ دوائیں آئیں، انجکشن لگے۔ مگر تکلیف میں کوئی کمی نہ ہوئی۔

مولانا محمد یحییٰ مرحوم، عبد المجید صاحب، حافظ سندی والے، عبد الرشید صاحب دیگر حضرات کثرت سے گرد کے تمام رات جاگتے بیٹھے رہے۔ کوئی مالش کر رہا ہے کوئی سینک رہا ہے۔ بخار کم نہیں ہوتا۔ ڈاکٹر بھی آتے رہے۔ مجاہد ملت کی بے چینی بشرہ سے عیاں ہے مگر خاموش ہیں، لبوں پر مسکراہٹ

۲ بجے شب میں گرڈیہہ سے لوگ کار لے کر آگئے۔ انھوں نے مجاہد ملت کی بے چینی اور بخار دیکھا تو وہ بھی پریشان ہوئے۔ فجر ہوئی۔ مجاہد ملت نے فرمایا روانگی ہونا چاہئے۔ عرض کیا گیا حضرت اس حالت میں سفر مناسب نہیں، مبادا راستہ میں ہوا لگ جائے تو مرض میں اضافہ ہوگا۔

فرمایا کچھ ہو جاتا تو ہوگا۔ ضرور سختی سے کہا تیاری کرو اور مجھے صرف چار پانچ مجبوراً روانگی ہوئی۔ ۔۔ میل کا سفر بخیریت گزرا۔ ایک بجے گرڈیہہ پہنچ گئے ڈاک بنگلہ میں قیام ہوا اور ہم خادموں نے طے کر لیا کہ یہاں ان کو جلسہ گاہ میں نہیں لے جائیں گے۔ ۲ بجے جلسہ کا وقت تھا۔ مولانا اسمٰعیل صاحب جلسہ گاہ تشریف لے گئے اور تقریر شروع کر دی۔ ایک گھنٹے کے بعد مجھ سے فرمایا کہ رضوی صاحب یہاں کوئی ہے میں نے پوچھا حضرت کوئی کیا ہوگا۔ فرمایا جلسہ میں چلنا ہے عرض کیا کہ آپ نہیں جائیں گے جس کو ملنا ہوگا وہیں آتے رہیں گے۔ یہ سنتے ہی بگڑ گئے اور غصہ میں فرمایا رضوی صاحب آپ نہیں جانتے کہ جماعت پر اس کا کیا اثر پڑے گا۔ یہ دور دور سے آئے ہوئے عوام کیا اثر لیں گے۔ کیا خیال کریں گے کہ مولوی آرام طلب ہیں ذرا سے بخار میں لیٹ گیا۔ تم موٹر دیکھو۔

میں باہر آیا، ڈرائیور موجود تھا۔ آکر عرض کیا گاڑی تیار ہے۔ فرمایا مجھے شیروانی پہنا دو۔ میں شیروانی کی آستین ہاتھوں میں حضرت کے ڈال رہا تھا مگر خود حضرت کے ہاتھ کام نہیں کر رہے تھے۔ ہاتھوں کی جنبش سے درد ہوتا تھا اور حضرت اُف کر کے خاموش رہتے۔ میں رونے لگا۔ غرض کسی طرح شیروانی پہنا دی۔ ڈرائیور کی مدد سے موٹر میں بٹھا کر جلسہ گاہ جو قریب ہی تھا لے گیا۔

مجاہد ملت کو دیکھتے ہی لوگ ٹوٹ پڑے اور موٹر کو گھیر لیا۔ اچھی خاصی تعداد طلباء کی آگئی اور آٹوگراف کی خواہش مند ہوا۔ حضرت نے "حب الوطنی از ملک سلیماں خوشتر" لکھتے ہوئے دستخط کر دیئے۔

جلسہ گاہ سے مولوی عبد الرزاق صاحب آئے اور کہا کہ مجاہد ملت صرف جلسہ میں تشریف رکھیں تقریر کی ضرورت نہیں۔ جلسہ ختم کر دیا جائے گا۔ حضرت مسکرائے، معاً آواز آئی کہ مجاہد ملت تشریف لا رہے ہیں، آپ تقریر نہ کر سکیں گے۔

مولانا اسمٰعیل صاحب کی تقریر ختم ہوئی اور مجاہد ملت موٹر سے اترے لوگوں کا سہارا لے جلسہ گاہ پہنچے اور کرسی طلب کی۔ کرسی رکھ دی گئی۔ تشریف رکھی اور تقریر شروع کر دی۔ تقریباً ایک گھنٹہ مسلسل بولتے رہے۔ جلسہ ختم ہوا۔ پھر ڈاک بنگلہ میں لوگ جمع ہو گئے ان سے بھی حضرت گفتگو فرماتے رہے جس سے تکان بڑھتی گئی۔

شب میں صرف دلیہ۔ سرخ تیل کی مالش جوڑوں پر کرائی اور کرب سے کروٹیں بدلتے رہے ۳ بجے شب میں ٹرین سے دھنباد کے لئے روانہ ہوئے۔ ایک گھنٹہ میں دھنباد پہنچ گئے دریافت پر معلوم ہوا کہ سیٹ پنجاب میل میں ریزرو ہو گئی ہے جو دو پہر میں ٹیلی گرام سے کرائی گئی تھی۔ ۱۰ بجے میل ٹرین آگئی اور حضرت مجاہد ملت مولانا اسمٰعیل صاحب کی معیت میں عازم لکھنؤ ہوئے۔ محترم حافظ ابراہیم صاحب وزیر حکومت یوپی کو مجاہد ملت کے لکھنؤ پہنچنے کی اطلاع ایکسپریس ٹیلی گرام سے دے دی گئی۔

بعد میں معلوم ہوا کہ مجاہد ملت مرض گٹھیا (وجع المفاصل) میں عرصہ تک مبتلا رہے۔ یہ تھی مجاہد ملت کی مجاہدانہ سرگرمی، جس نے جمعیۃ علماء ہند کو زندہ رکھا۔



مولانا حفظ الرحمن کی تربت پر

عقیدت کے چند پھول

ابوالبقا ندوی

علم والے علم کا دریا بہا کر چل دیئے
واعظانِ قوم سوتوں کو جگا کر چل دیئے
کچھ سخنور تھے کہ سحر اپنا دکھا کر چل دیئے
کچھ مسیحا تھے کہ مُردوں کو جگا کر چل دیئے

محفلِ دوشیں کا وہ چراغِ سحر جو کئی ماہ سے ضعف و مرض کے جھونکوں سے بجھ بجھ کر سنبھل جاتا تھا بالآخر ۲؍اگست ۱۹۶۲ء کو ٹھیک صبح صادق کے وقت اس گلستان نما خزاں آباد کی باسٹھ بہاریں دیکھ کر اس عالمِ آب و گل کو خیرباد کہہ گیا اور دہلی کی خاک نے جہاں ولی اللّٰہی خاندان آسودۂ خاک ہے۔ اس قیمتی گوہر کو ہمیشہ کے لئے اپنے آغوش میں لے لیا۔ ع

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی تھی، سو وہ بھی خموش ہے

دیارِ فرنگ سے واپسی پر اخباروں اور رسالوں میں تری آخری تصویر دیکھی تھی، دل نے کہا یہ ماہِ درخشاں اب ہلال بن کر رہ گیا ہے اور اب یہ ہلال بھی محاق ہو کر دنیا کی نگاہوں سے چھپ گیا۔

انا للّٰہ وانا الیہ راجعون

ذاتِ معبود جاودانی ہے   باقی جو کچھ ہے وہ فانی ہے

ہندوستان کی جنگ آزادی میں تو نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور گاندھی اور نہرو کے کاندھوں سے کاندھا ملا کر چلا۔ مگر اس کے باوجود اپنی انفرادیت کو قائم رکھا، اور اس حسن کی تکمیل میں ترے ارادوں اور قدموں میں لغزش نہ آنے پائی، جسے سید احمد شہیدؒ اور شیخ الہندؒ نے پورا کرنے کے لئے میدان عمل میں قدم رکھا تھا، آزادی کے حصول کے بعد بھی تیری جدوجہد میں کوئی فرق نہ آیا، کل تو ہندوستان کی آزادی کا ایک مرد سپاہی تھا تو آج ملک اور قوم کا ایک مردِ مجاہد تھا، ۴۷ء کے ہلاکت خیز اور اندوہناک فسادات میں کتنے دلوں کو تو نے تھاما اور گرتے ہوؤں کو سنبھالا، اور کتنے گھروں کو ویران ہونے سے تو نے بچایا، اور کتنے یتیموں اور بیواؤں کی تو نے دادرسی کی، پنجاب میں کتنے اکھڑتے ہوئے خیموں کو تو نے دوبارہ نصب کرایا، لٹتے ہوئے سہاگ صرف تیری وجہ سے رک گئے۔ غرض ملک اور قوم کے ہر غم کو تو نے اپنا غم سمجھا اور آخر اسی غم میں تو نے جان جان آفریں کے سپرد کر دی ع

خدا جانے یہ دنیا جلوہ گاہِ ناز ہے کس کی
ہزاروں اٹھ گئے رونق وہی باقی ہے مجلس کی

مگر آج اس "جلوہ گاہِ ناز" کا سارا طلسم ٹوٹ چکا ہے۔ بزم کی ساری رونق ماند پڑ چکی ہے، ساری مجلسیں ماتم کدہ بنی ہوئی ہیں، اور کیوں نہ ہو جب تیرا گھر دوسروں کے لئے ماتم کدہ بن سکتا ہے اور تیری مجلس دوسروں کی وجہ سے بے رونق ہو سکتی ہے، تو آج کیوں نہ ساری مجلسیں ترے لئے ماتم کدہ بن جائیں؟ آج دنیا سے تو تنہا رخصت نہیں ہوا ہے، بلکہ آج ایک قوم رخصت ہو گئی ہے۔

فما کان قیسٌ هُلکُهٗ هُلكَ واحدٍ
ولکنہ بنیانُ قومٍ تهدّما

مولانا حفظ الرحمن کون تھے؟ لکھنے والے ان کے محامد صفحوں میں لکھیں گے اور بیان کرنے والے گھنٹوں بیان کریں گے، کہنے والے کہیں گے

- "سنتِ یوسفی کا جلیل القدر پیرو اٹھ گیا۔"
- "وہ ہمارے قافلے کے سالار تھے، یہ قافلہ پہلے ہی مٹ چکا تھا، اب یتیم ہو گیا۔"
- "ان کا دل و دماغ قدرت کا معجزہ تھا۔"
- "وہ ایک نڈر اور بہادر سپاہی تھے۔"
- "وہ قومی یکجہتی کے سچے علمبردار تھے۔"

قرار دیا کہ دشمنوں کا مقابلہ طاقت کے ساتھ کیا جائے۔ اور اب "صبر" اور "اعراض" کافی نہیں ہے۔ لیکن اگر کسی زمانہ میں تمام مسلمانوں کے لئے یا مسلمانوں کی کسی ایک جماعت کے لئے ایسی حالت پیش آجائے کہ اس وقت آیت جہاد پر عمل کرنا خاص اُن حالات میں ممکن نہ ہو اور ایسا کرنے سے خود مسلمانوں کے استیصال کا اندیشہ ہو تو اُس وقت آیات صبر و اعراض عن المشرکین یعنی منسوخ آیت واجب العمل ہوگی۔

البتہ ان ناسخ و منسوخ کا فرق مراتب اس طرح نمایاں ہوتا کہ اب شارع علیہ السلام کا مقصد عظمیٰ یہ قرار پائے گا کہ ہم کو ہر حالت اور ہر صورت حال میں یہ سعی کرتے رہنا ضروری ہے کہ ناسخ آیت پر عمل کرنے کا ماحول پیدا کریں اور منسوخ آیت کے ماحول کو ختم کرنے کی سعی کریں۔ گویا کہ دونوں کے درمیان یہ امتیاز رہا کہ اس صورت میں منسوخ آیت میں مذکور حکم خاص وقت کے لئے ایک علاج و تدبیر ہے تاکہ مسلمان اس وقت ضیق اور تنگی میں نہ پڑیں اور وقت کے مناسب علاج سے محروم نہ ہو جائیں اور ناسخ آیت میں حکم مذکور صاحب شریعت کا مقصد قرار پائے گا اور جب تک آیت ناسخ کا نزول نہیں ہوا تھا اس وقت تک ہماری نگاہیں اور ہمارا قلب بھی یقین رکھتا تھا کہ صاحب شریعت کا مقصد عظمیٰ یہی ہے۔ اور اس وقت تک کے لئے حقیقۃً بات بھی یہی ہوتی ہے کہ وہ حکم صاحب شریعت کا مقصد ہی کہلاتا ہے۔

کسی آیت کے نسخ کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اس حکم کی تمام جزئیات ختم ہو گئی ہیں۔ اور اب ایک جزئی بھی معمول بہا نہیں ہے جیسا کہ عام کتب اصول اور کتب تفسیر سے مترشح ہوتا ہے اور جو حقیقتاً صحیح نہیں ہے بلکہ نسخ کے معنی یہ ہیں کہ ناسخ آیت کا جو مقصد ہے۔ جن جن مقامات پر اس آیت کا حکم منسوخ آیت کے حکم سے متصادم ہوتا ہو اُن جزئیات کے حق میں ناسخ آیت ناسخ ہے باقی جزئیات آیت منسوخ اپنی جگہ پر اُسی طرح قائم ہیں۔ اور کہیں واجب العمل اور کسی مقام پر مندوب العمل ہوتی ہیں مثلاً قرآن عزیز میں جس جس مقام پر مشرکین اور کفار کے مقابلہ میں آیات صبر موجود ہیں۔ مفسرین عام طور پر ان سب کے لیے یہ فرما دیتے ہیں انہا نسخت بآیۃ الجہاد اور بآیۃ السیف۔ حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے بلکہ صاحب شریعت کا منشا یہ ہے کہ جماعتی زندگی کی بقا کے لئے اب صبر اور اعراض کی صورت حال ختم کر دی گئی اور جہاد کا حکم فرض قرار دیا گیا لیکن انفرادی زندگی میں اور روزمرہ کی معاشرتی زندگی میں ایذاء مشرکین اور کفار کے مقابلہ میں اگر صبر کو معمول بہا بنایا جائے تو یہ احسن اور بہتر قرار دیا گیا ہے۔ بلکہ بعض جزئیات میں جبکہ مثلاً کسی کافر اور مشرک کو اس طرز عمل سے اسلام کی جانب مائل کیا جانا مقصود ہو یا یقین ہو کہ اس طریق عمل سے کسی کافر جماعت کا اسلام قبول کرنا ارجح ہے تو اس وقت تلوار کے جہاد کے مقابلہ میں اُن کو صبر و اعراض کے ذریعہ مسلمان بنانا واجب ہوگا۔ اور اس صبر کو آیت جہاد سے منسوخ نہیں کہا جائے گا۔

دعاگو ابوالقاسم

اُن کی شفقت

از: محمد عبداللہ القاسمی

دارالعلوم دیوبند کی زندگی کا ایک واقعہ ہے کہ ایک ذی استعداد طالب علم صرف شیخ الاسلام حضرت مولانا مدنی علیہ الرحمۃ سے دورہ حدیث پڑھنے کی امید پر دیوبند آگئے۔ مگر تقدیر کا کرشمہ کسی ایک کتاب کی ناکامی دورہ حدیث کی راہ میں ایسی حائل ہوئی کہ وہی ایک کتاب لے کر ایک سال پڑھتا ہو گا تب دورہ مل سکے گا ورنہ دارالعلوم دیوبند کے ضابطہ کی رو سے دورہ حدیث نہیں ملیگا وہ سخت حیران، رفقائے کرام کی جو کوششیں تھیں سب ناکام ہو گئیں۔ آخرکار یہ طے ہوا کہ مجاہد ملت صاحب کو دہلی لکھا جائے۔ ہو سکتا ہے کہ ان کی سفارش حضرت (ناظم تعلیمات جو حضرت شیخ الاسلام تھے) کی خدمت میں مسموع ہو۔ اتفاق سے وہ زمانہ دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کا زمانہ تھا تمام اراکین شوریٰ اور حضرت مجاہد ملت بھی دو چار دن کے لئے پہونچ گئے۔ موقع غنیمت سمجھ کر وہ بیچارے اور راقم الحروف حاضر ہوئے سلام کے بعد سلسلہ گفتگو شروع ہو گیا، ہماری عجز و انکساری دیکھتے ہوئے وعدہ فرمایا کہ یاد رہا تو حضرت شیخ سے زبانی تذکرہ کرونگا۔ اگلے روز چار بجے یا پانچ بجے کے فرنٹیر میل سے آپ دہلی جا رہے تھے۔ مولوی صاحب اور راقم سیدھا اسٹیشن چلا گیا۔ ہمیں دیکھکر مسکرائے اور فرمایا آپ بڑے عجیب طالب علم ہیں میرا پیچھا نہیں چھوڑتے۔ ہم نے عاجزانہ درخواست کی حضرت ہماری مجبوری حد سے تجاوز کر چکی ہے ورنہ یہ ضابطہ ہی سہی آپکو تکلیف نہ دیتے، فوراً قلم ہاتھ میں لیا اور ہماری درخواست کے ایک کونے پر لکھدیا

"سیدی ملاذی مولائی حضرت الشیخ، یہ طالب علم واقعی صاحب عذر معلوم ہوتا ہے، امید ہے کہ انکی درخواست منظور فرمائینگے"۔ والسلام حفظ الرحمٰن کان اللہ لہ۔

خوش خوش دعا دیتے ہم دارالعلوم کی طرف دوڑے تمام رفقاء و ہمنشین دعائیں دیتے رہے۔ حضرت کی سفارش مسموع ہوئی اور غریب مولوی مقصود الرحمٰن سال بھر کی محنت سے بچ گئے۔

زندگی انساں کی ہے مانندِ مرغِ خوش نوا
شاخ پر بیٹھا کوئی دم چہچہایا اُڑ گیا

اقبال

از :۔ قاضی محمد سفیان ۔ علیگڈھ

محترمی سلامت السلام علیکم ۔

مجاھد نمبر کے لئے جو آپ دیر سے کوشش کر رہے ہیں اور اس کو مولانا مرحوم کی بلند خدمات کی مثل بلند پیمانہ پر شائع فرمانے کی سعی کر رہے ہیں بڑا اعتماد ہے کہ آپ کی ان مبارک خدمات کے عوض مولانا مرحوم کو ایک نئی زندگی ملے گی، انشاءاللہ ۔ اور وہ ہم سے دور ہونے کے باوجود آئندہ آنیوالی نسلوں کے لئے مشعلِ راہ بنیں گے ۔ ہمارے لئے بھی ان کی جدوجہد مسلسل چراغ راہ تھی ہی، آنے والوں کے لئے بھی انشاءاللہ مزید روشنی کا سبب ہوگی۔ خدائے برتر آپ کی پُر خلوص کوششوں کو مزید بار آور اور مفید بنائے ۔

مولانائے مغفور سے میرا تعلق خاطر شروع سے تھا ۔ دیکھئے جب جمعیۃ علمائے ہند نے ۱۹۳۵ء غالباً فلسطین کانفرنس منعقد کی، میں بھی اُس میں بحیثیت خصوصی مہمان شریک تھا ۔ علی گڈھ سے دو آدمی شریک ہوئے تھے میں اور مولوی عبدالقیوم صاحب ۔ میں تین روز دہلی رہا ۔ مولانائے مرحوم کے علاوہ بہت سے نامور علماء حق سے شرف ملاقات رہا ۔ چند کے نام یہ ہیں ۔

مولانا شوکت علی ۔ مولانا ظفر علی خاں ۔ مولانا محمد عرفان ۔ مولانا حبیب الرحمٰن ۔ مولانا احمد سعید ۔ مولانا مفتی کفایت اللہ ۔ ڈاکٹر سید محمود ۔ ڈاکٹر ذاکر حسین وغیرہ وغیرہ ۔

جلسہ مولانا سید سلیمان ندوی کی زیر صدارت تھا ۔ تقریریں تین روز تک رات کو ہوئیں ۔ مولانائے مرحوم کی بھی تقریر تھی، خیر یہ تو کوئی خاص بات نہ تھی ۔ دوسرے دن صبح کو مجلس منتظمہ کی خصوصی نشست تھی ۔ خاص ارکان جمعیۃ اس میں سب موجود تھے ۔ غالباً ۵۰ آدمی ہوں گے، مگر سب خواص ۔

مولانا حفظ الرحمٰن نے کوئی تجویز فلسطین کے مظلوم مسلمانوں کے لئے رکھی ۔ چونکہ وہ انگریز کے خلاف تجویز تھی ۔ اور یہاں کے مسلمان سے بڑی قربانی اور مجاہدہ چاہتی تھی، اکثر ارکان نے اس کی دشواریاں بیان کیں، کہ یہ کام یہاں کا مسلمان کر نہ سکے گا، اور اس میں مولانا شوکت علی پیش پیش تھے ۔ اس کی مخالفت میں ــــ اب مولانا اپنی تجویز کی حمایت میں کھڑے ہوئے ۔ میں برابر بیٹھا ہوا یہ سب دیکھ رہا تھا ۔ مولانا اُس وقت چہرے بدن کے اور لانبے نظر آ رہے تھے ۔ اب جو حمایت حق کے جوش میں انھوں نے تقریر شروع کی ہے، میں حیران تھا کہ ایک دریا تھا جو ٹھاٹھیں مار رہا تھا ۔ میرے پاس مولانا احمد سعید بیٹھے ہوئے تھے ۔ سر جھکائے چپکے چپکے کہہ رہے تھے کہ اب ان سے بچ کر کوئی نہیں جائے گا ۔ ہماری ساری کمزوریاں سامنے رکھ دیں گے ۔ مگر یہ خیالات بھی کسی احترام اور ادب کے ساتھ تھے اور سب ہی شرکا لاجواب بنے ہوئے بیٹھے تھے ۔ اور آخر میں تجویز سب ہی کو منظور کرنی پڑی ۔

وہ اکثر علیگڈھ سیرت نبوی کی مجالس میں آتے اور ان کی تقریر سننے کا موقع ملتا رہا ۔ اب آگیا ۱۹۴۷ء سیاست کا رُخ تعمیر کی جگہ تخریب نے لیا ۔ کیا کیا بربادیاں آئیں ۔ کہاں کہاں مولانا ہوا کا غلط رُخ موڑنے کیلئے پھرتے رہے علی گڈھ میں دس دفعہ اس سلسلہ میں آنا ہوا ۔ دو سال ہوئے وہ علی گڈھ بُلائے گئے ۔ سیرت پر تقریر کے لئے نہیں بلکہ ملک کی فضا میں جو زہر گھول دیا گیا اور مسلمان روز روشن میں اُس کا نشانہ تھا ۔ اس پر لوگوں نے پوچھا کہ مسلمان باوجود تمام احتیاطوں اور دستور کی پابندی کے نشانہ ستم کیوں ہے ؟ اس پر مولانا نے تقریر میں نہایت شافی جواب دیئے ۔ سب سے زیادہ فائدہ کی بات اُن کی تقاریر اور مشوروں میں یہ ہوتی تھی کہ باوجود فضا کے سیاہ ہونے کے، وہ ناامید نہ ہوتے تھے، بلکہ حوصلہ اور جوانمردی کی بات کرتے تھے، یاس اور قنوط سے ہمیشہ مسلمانوں کو بچاتے تھے اور اللہ پر بھروسہ رکھنے کی بات کرتے تھے، یہ نہیں کہ حالات خلاف ہیں تو ہاتھ پیر توڑ کر ایک طرف بیٹھ جاؤ یا کہیں اور بھاگ کھڑے ہوں ۔ یہ بات دوسرے کسی بڑے سے بڑے لیڈر اور رہنما کے اندر نہیں ملتی تھی ۔ یہ تقریر قاضی پاڑہ علی گڈھ میں ہوئی ۔ عصر سے مغرب تک، اس میں نواب چھتاری

چھتاری وغیرہ بھی شریک تھے۔ پھر بعد مغرب چار پر دیر تک تبادلہ خیال رہا۔ پھر بعد عشاء میرے مکان کے برابر ہی کھانا ساتھ ساتھ کھایا۔ اس میں بھی ایک گھنٹہ سے زیادہ تبادلۂ خیال رہا۔ کھانے میں مولانا سعید احمد اکبرآبادی بھی شریک تھے۔ بڑی پرلطف صحبت اور نشست رہی اور اس شعر کا مصداق سامنے تھا ؎

ہمت بلند دار کہ پیش خدا و خلق — باشد بقدر ہمت تو اعتبار تو

اکتوبر ۱۹۶۱ء میں علیگڈھ میں یکطرفہ فساد ہوا، مولانا آئے، آپ بیمار تھے مگر آپ بیماری میں بھی مسلمان کی تکلیف سن کر کہاں کہاں تک نہیں پہونچے۔ یہاں تک کہ زیادہ بیمار ہو کر امریکہ ہی چلے گئے۔

مولانا کا مشن تو یہ تھا کہ آزادی ملنے کے بعد سب مل کر رہنا سیکھیں، مَن و تُو کا فرق نہ ہو، مگر ملک کے سب ہی لوگ تو عقل و سمجھ کی بات نہیں سمجھتے۔ کچھ لائق ہوتے ہیں تو کچھ غنڈے بھی، جو عافیت اور عزت کا راستہ چلنا نہیں جانتے۔ مولانا سے زیادہ پنڈت نہرو خود کہتے کہتے تھکے جاتے ہیں، مگر سب کہاں سمجھتے ہیں اور سنتے ہیں۔

غرض کہ مولانا کو اللہ نے بلا لیا اور اُن کا خواب امن و عافیت ملک میں آنکے سامنے پورا نہ ہوا۔ یہاں تک کہ اب جارح دشمن آگیا اور سب کا رُخ اُدھر مڑ گیا۔ ملک کے اندر دنگا فساد اب نہیں۔ اب صرف ایک نعرہ ہے کہ سب ایک ہوں اور افتراق کو خیرباد کہیں۔ خدا کرے کہ اب ہی ہم دوست اور دشمن کو سمجھیں اور بے معنی جنگ و جدال کو خیرباد کہیں جس سے مولانا کی روح کو سرور ابدی حاصل ہو۔

آخر میں یہ بات بھی ملحوظ خاطر رہے کہ میرے والد ماجد قاضی مولوی محمد عثمان کبھی تحریک ترک موالات اور کانگریس میں شریک نہیں ہوئے ہمیشہ علیحدہ رہے۔ اکثر خواجہ عبدالمجید تشریف لاتے تھے، اصرار تھا۔ کہ مولانا کانگریس کے ممبر بن جائیے۔ والد صاحب فرماتے رہے کہ میں شریک نہیں ہو سکتا۔ ایسے ہی مولانا تصدق احمد خاں شروانی آتے تھے کہ مولانا ممبر بن جائیے، والد ماجد انکار کر دیتے تھے۔ میں نے ایک دفعہ رات کو پوچھا تھا اس کو ۳۰ سال ہو گئے اور اب ان کے انتقال کو بھی ۲۵ سال ہو گئے . . . . کہ اباجی سب لوگ اس تحریک میں شریک ہیں، آپ شریک کیوں نہیں ہوتے۔ لوگ ہم کو ٹوڈی کہتے ہیں اور کیا کیا کہتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ میرا اپنا فیصلہ ہے، میں شریک نہیں ہوتا۔ کوئی مجبور نہیں کر سکتا۔ اچھا تم سے کہتا ہوں تم اپنے دل و جگر ہو۔ گاندھی جی اور مولانا ابوالکلام آزاد کہتے ہیں کہ انگریز چلا جائے، ہم حکومت کریں گے۔ تم بتاؤ کس ہندو میں صلاحیت ہے کہ سارے ملک کا انتظام کرے گا۔ ہندو نے کبھی سارے ملک پر آج تک حکومت کی، مسلمان اس قابل ہوتا تو اپنی ہی کیوں کھوتا۔ اول تو انگریز جائے گا نہیں، چاہے قیامت ہو جائے۔ اگر کسی حادثہ سے چلا گیا، خیر تم دیکھو گے کہ وہ بدنظمی ہوگی کہ تم کو اپنے گھر میں چین اور سکون نہ ہوگا۔ یہ بات ہو گئی ۳۰ سال کی۔ ۲۵ سال ہوئے کہ وہ اللہ سے مل گئے ۱۹۳۷ء . . . . میں میرے بھائی کو جن کا نام محمد سلمان تھا، سول لن پُرودری پٹیالہ میں اسٹیشن ماسٹر تھے، پہلی فرصت میں دوستوں نے اُن کو ہی شہید کیا۔ ان کی معصوم بی بی کو۔ ایک لڑکے کو۔ والد ماجد نے تو یہ صدمہ نہیں دیکھا، لیکن ہمارے قلوب تو اپنی جگہ پر اُن سے زیادہ زخمی ہیں۔ بس خدا سے یہ دعا ہے کہ ہمارے ملک کے رہنے والوں کو سمجھ دے جو چیزیں غارت کرنے والی ہیں اُن کے نقصان کو سمجھیں، اور جو ملک کی عزت بڑھانے والی ہیں ان پر عمل پیرا ہوں، خدا سے امید ہے کہ وہ ہم سب کو اچھی سمجھ دے گا اور بس!

قطعۂ تاریخ

صادق بستوی

بر وفات حسرت آیات مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمان برّد اللہ مضجعہ

ضیغم ہندوستاں جاتا رہا — بجھ گیا اس دیس کا روشن چراغ
آہ صادق فوت ہم سے ہو گیا — "غم کشانِ قوم" اک شاہی دماغ

۱۳۸۲ھ

آہ مردِ حق پرست و حق نواز — پاک باز و پاک سیرت نیک نام
جنت الفردوس ہاں خلد بریں — ہو یہی جنت ترا عالی مقام

۱۳۸۲ھ

شیخ مدنی و ابوالکلام کے بعد — رہبرِ دین و میرِ جمعیت
تھے جہانِ خراب میں صادق — ایک حضرت مجاہد ملت

۱۹۶۲ء

خطیب وقت تری موت سے ہی — دلِ انسانیت سوزاں و گریاں
لکھو یہ مصرعۂ تاریخ صادق — امام قوم و امت حفظ رحمان

۱۹۶۲ء

مولانا وجدی الحسینی۔ شہر قاضی بھوپال

نقوش قلب و ذہن

اس وقت جبکہ مولانا حفظ الرحمٰن مرحوم کی سیرت و شخصیت کی تذکار و یادآوری کے سلسلہ میں ہم کو اپنے تاثرات اور قلبی احساسات کا اظہار مقصود ہے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ علمائے حق کی ان مساعیِ جمیلہ کی طرف ہلکا سا اشارہ کر دیا جائے جنہوں نے ہندوستان کی آزادی و ترقی کے نقشے تیار کئے تھے اور خونِ دل سے اس میں رنگ بھرا تھا اور بالآخر میدان جہاد میں اتر کر بکمال سرخروئی اپنے خدا سے جا ملے۔

یوں تو مسلمانوں کے فاتحانہ داخلہ سے صوفیائے کرام اور فقرائے اسلام کا ہراول دستہ اسلام کے اس فطری معاشرتی نظام کے قیام کے لئے زمین کو ہموار کرتا رہا۔ جس کے اندر نہ ذات پات کی تفریق ہے نہ چھوت چھات کی لعنت جہاں نہ رنگ و نسل کا امتیاز ہے نہ خاندانی امتیازات کی برتری کا تصور۔ ہندوستان کی اس سنگلاخ سرزمین کو نرم کرنے میں ان کو جن دشواریوں کا مقابلہ کرنا پڑا تھا اُن کو حیطۂ خیال میں بھی نہیں لایا جا سکتا۔

حضرت شاہ ابو علی سندھی المتوفی سنہ ۲۷۰ھ اور حضرت سید سالار مسعود غازی المتوفی سنہ ۴۲۴ھ سراج ابدال حضرت شاہ عبداللہ چنگال المتوفی ۵۴۲ھ (دھار مالوہ) اور قطب الاقطاب علی دا تا گنج بخش ہجویری لاہوری المتوفی سنہ ۴۶۵ھ (لاہور) کی سالہا سال کی تبلیغی سرگرمیوں کے بعد جب حضرت خواجہ خواجگاں سلطان الہند حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری نے قدم رکھا ہے تو زمین سخت آسمان دور ہے۔ کا مصداق ہمارا ملک بنا ہوا تھا۔ لیکن ان بزرگوں نے اپنی سچی روحانیت اور مخلوق خدا کی شفقت کے جذبہ بیناہ سے سرکش اور راکھشس انسانوں کو رام کیا۔ پھر ان کے خلفائے عظام حضرت قطب الدین بختیار کاکی بابا فرید الدین شکر گنج، حضرت محبوب الٰہی۔ خواجہ نظام الدین اولیا، حضرت شیخ المشائخ علی احمد صابر کلیری وغیرہم نے مسلمان بادشاہوں سے یکسو ہو کر علی الرغم خدا پرستی اور خلق خدا کی ہمدردی کا نصب العین اختیار کیا اور تاریخ اسلامی ہند میں ایسے روشن نقوش مرتسم کئے کہ جن کی درخشانی و تابانی کو زمانہ کے حوادث اب تک متو ماند نہ کر سکے۔

اس کے ساتھ وہ علمائے کرام جو دربار شاہی سے وابستہ رہے ان کے اندر بھی ایسے علمائے حق پیدا ہوتے رہے کہ شاہی کر و فر، اور حکومتی اقتدار، اور بادشاہوں کا رعب و داب اظہار حق میں کبھی مانع نہ ہوا۔

سلطان علاؤ الدین خلجی، شہنشاہ محمد تغلق جیسے زبردست جابر اور طاقتور حکمرانوں کے مقابل قاضی جلال الدین اور علامہ شہاب الدین کے واقعات اس پر شاہد عدل ہیں۔ مغل شہنشاہیت کے روشن عہد میں شہنشاہ اکبر جہانگیر کے دنیادار علماء اور پیشہ ور صوفیاء کے مدمقابل سچے عالموں اور پاک نفس بزرگوں کا ایک طبقہ ہمیشہ موجود رہا کہ مادیت کے دوش بدوش ان کی روحانیت کا غلغلہ ہر جگہ بلند رہا اور بسا اوقات وقت کے شہنشاہوں کو ان کے آگے گردن عقیدت کو خم کرنا پڑا۔

ان بزرگان دین، ارباب یقین کے سامنے اسلام کا وہ روحانی نظام رہا جس کے ماتحت دنیوی مادی نظام اگر قائم رہے تو انسانیت فلاح و کامیابی، بہبودی و کامرانی سے ہمکنار ہو جائے۔ مادی فلسفوں، دنیوی نظاموں کی ناکامی کا واحد راز انسانیت کی مادی اور روحانی تقسیم کے اندر مضمر ہے۔ جب بھی سیاست اور طریقہ حکمرانی اخلاق و روحانیت سے آزاد ہو گی دنیا کو بے چینی، بدامنی اور اضطراب و انتشار کے طوفان سے دوچار ہونا پڑے گا۔ اسلام نے دیانت و سیاست کو اس خوبی و خوش اسلوبی سے باہم آمیز کیا ہے کہ اس سے جو معجون مرکب تیار ہوتا ہے وہ انسانیت کے جملہ امراض کا واحد علاج ہے۔ جہاں اس کے اندر تفریق پیدا کی گئی وہاں روحانی سکون غائب، دلوں کا اتحاد مفقود، اور عمومی امن و امان رخصت ہو جاتا ہے۔ مغرب نے روحانیت کو زندگی سے نکال کر قومیت کو اس کا نعم البدل تجویز کیا تھا جس کے نتیجہ میں ایک ہی صدی میں دنیا کو دو عالمگیر جنگوں سے دوچار ہونا پڑا ہے اور تیسری ہمہ گیر جنگ کا منحوس سایہ ہمارے سروں پر منڈلا رہا ہے۔

بہرحال ہمارے ملک کے راجے مہاراجے، بادشاہ و شہنشاہ ملک گیری کی ہوس کی آگ کو سلگاتے رہے اور یہ مذکور الصدر انسانیت کے خدام اخلاق و روحانیت کی تعلیم سے اس کو بجھاتے رہے اس طرح اس ملک کی سیاست کی

کاٹی جاتی رہی اور اُس خونخواری وخونریزی سے بحد امکان بچاتے ہوئے اُس کو آگے بڑھاتے رہے جو خاص مادیت کا خاصہ ہے جس کے پیش آنے والے نتائج بد سے عالم انسانیت اس وقت لرزہ براندام ہے۔ جب شہنشاہ اکبرؔ نے اپنے سیاسی اقتدار کے بل بوتہ پر اس روحانیت کو کچلنا چاہا تو حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی (متوفی) نے اس طوفان کا رخ موڑ دیا اور جب مغلیہ حکومت کے زوال کے وقت پیشہ ور علماء صوفیہ نے اسلام کے چہرہ کو مسخ کرنا چاہا تو حضرت حجۃ الاسلام امام الہند شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ نے اپنی تصانیف مبارکہ کے ذریعہ روحانیت کے نورانی چہرہ کو برافگندہ نقاب کیا۔

مذکورۃ الصدر حقانی علماء کے سلسلہ نے مسلمانوں کے حکومتی سیاسی زوال کو اسلامی تعلیمات کی شکست نہیں مانا بلکہ اسکو بادشاہت وملوکیت کی غلطیوں کا خمیازہ قرار دیا اس لئے وہ مغل شہنشاہیت کے زوال پر دل شکستہ ہو کر ہاتھ رکھ کر نہیں بیٹھے بلکہ پہلے سے زیادہ سرگرم ومستعد چاق وچوبند ہو کر ان روحانی اصول اور روحانی نظام کو قائم کرنے کے لئے میدان جہاد میں اتر پڑے۔ چنانچہ ابتک اس ولی اللہی جماعت نے اپنے مؤسس اعلیٰ حضرت شاہ ولی اللہ کے قائم کردہ ہدایات وخطوط پر بار بار اس روحانی واسلامی انقلاب برپا کرنے کی مساعی کا سلسلہ جاری رکھا جو باہمی اختلاف، سروسامان کی کوتاہی اور احوال زمانہ کی ناسازگاری کی وجہ سے مشیت ایزدی کے مطابق منزل مقصود کو نہ پہنچ سکا۔ سب سے پہلے حضرت امیر المومنین سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا اسمٰعیل شہید قدس سرہما کی سرکردگی میں مجاہدین کی جماعت قائم ہوئی جس نے اس ملک سے ہجرت کر کے بیرونی سرزمین سے محاذ جہاد قائم کیا اور ایک عرصہ تک کامیابیوں اور ناکامیوں سے دوچار ہوتے ہوتے معرکہ بالاکوٹ میں سنہ ۱۲۴۶ھ میں ایک منزل پوری کر کے یہ دعوت سرد ہو گئی۔

دوسری بار حضرت شیخ الآفاق شاہ محمد اسحٰق رحمۃ اللہ علیہ اور شاہ محمد یعقوب رحمۃ اللہ علیہ کی ہجرت مکہ معظمہ کے بعد جنگ آزادی کا ایک مشترکہ میدان تجویز ہوا جو ۱۸۵۷ء کی ناکامی سے غدر جیسے رسوا کن نام سے مشہور کیا گیا۔ اس تحریک کی پشت پر علمائے حق کا زبردست ہاتھ تھا اور اس کی سخت پاداش بھی ان کو اٹھانی پڑی جس پر تاریخ ہند کے صفحات شاہد ہیں

تیسری انقلابی تحریک وہ ہے جس کو گورنمنٹ برطانیہ کی روپہلی سنہری مصلحتوں نے ریشمی سازش کے نام سے رسوائے زمانہ کیا۔ اگر تحریک مذکور حسب اسکیم کامیابی سے ہمکنار ہوتی تو ایشیا کی تاریخ بدلی ہوئی ہوتی۔ اس تحریک کی ناکامی، اور عالم اسلام کے زوال، اور خلافت ترکیہ کے خاتمہ پر علمائے حق کے ایک گروہ نے ہندوستان کی آزادی کے بوجھ کو تنہا اپنے شانہ پر اٹھانا حالات زمانہ کے خلاف سمجھا۔ اور ملکی ووطنی تحریک کے ساتھ اشتراک عمل کو اپنی حکمت عملی کا نشانہ بنایا۔

تحریک خلافت اور تاسیس جمعیت اسی دور کی یادگار رہے۔ خلافت کی اس تحریک نے ملک بھر میں جو ہلچل پیدا کی اور مسلمانان ہند میں ایثار وقربانی کی جو عظیم لہر پیدا کی اور برادران وطن میں جس قسم کے اتحاد کی عملی کھلبلی کی تھی وہ تاریخ آزادی ہند کی زریں یادگار ہے۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ملک نے زبردست کروٹ بدلی ہے اور ایسی انگڑائی لی ہے کہ اس کے نتیجے میں آزادی کا پھل بہت جلد ہی ملک کی گود میں ٹپک پڑیگا۔ اس دور میں خلافت جمعیۃ العلماء اور کانگریس کے اجلاس دوش بدوش ہوتے تھے اور علماء وعوام، ہندو مسلمان سب شانہ بہ شانہ چل رہے تھے یہی وہ زمانہ ہے جس کے اندر ملک وملت کے ہردلعزیز مشہور ومقبول زعماء اور لیڈر پیدا ہوئے اور وہ ہندوستان گیر شہرت سے نیکنام ہوئے۔

حضرت مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰنؒ کی عملی زندگی کا آغاز بھی اسی عہد سے ہوتا ہے جمعیۃ العلمائے ہند کے اجلاس منعقدہ امروہہ سنہ ۱۹۳۰ء سے ان کی شخصیت سیاسی وملی پلیٹ فارم پر منظر عام پر نمودار ہوئی۔ اس جلسہ میں مولانا مرحوم کی قرارداد شرکت کانگریس نے سرگرمی اور بڑی ہماہمی اس لئے پیدا کی کہ اجلاس مذکور کے صدر مولانا معین الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہ اور صدر استقبالیہ مولانا ابو النظر رضوی مرحوم اس کے مخالف تھے۔ لیکن شیخ الاسلام مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ اور مفتی اعظم مولانا کفایت اللہ رحمۃ اللہ علیہ اور علامہ سید سلیمان ندویؒ وغیرہم نے اس تحریک کی پرزور تائید کر کے تجویز مذکور کو منظور کرالیا۔

مولانا مرحوم نے سنہ ۱۹۳۰ء میں جو راستہ اپنے لئے تجویز کیا تھا وہ نہایت پختگی کے ساتھ اس پر قائم رہے اور حالات کی سخت آندھیاں، مخالفتوں کے شدید طوفان بھی سنہ ۱۹۶۲ء تک ان کو اپنی جگہ سے نہ ہٹا سکے۔ مولانا ہندوستان کی آزادی اور مسلمانان ہند کا آزادانہ مذہبی وملی موقف، اور اس آزادیٔ ہند کے ذریعہ عالم اسلام اور ایشیا بھر میں بیداری کی نئی لہر پیدا کرنے کی تحریک کے نہایت گرم جوش اور پرزور وکیل تھے۔ شیخ الاسلام مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ اور امام الہند مولانا آزاد رحمۃ اللہ علیہ کے بعد ان سے زیادہ اس نصب العین کا داعی ترجمان کوئی نہ رہا تھا وہ علمائے ہند کی اس آخری تحریک کے جس کے نتیجہ میں ہمارا ملک آزادی سے ہمکنار ہوا گویا آخری نشانی تھے۔ انھوں نے گاندھی جی کی ہمراہی میں سنہ ۱۹۳۰ء کے اندر ملک کی ستیہ گرہ میں بڑھ کر حصہ لیا اور پھر اس

راستہ میں ان کے قدم آگے بڑھتے ہی رہے لیکن کسی وقت بھی ملی نصب العین سے عام قوم پرور زعماء کی طرح چشم پوشی اختیار نہیں کی۔ کیونکہ حضرت مرحوم نے آزادی ہند کے نصب العین کو ایک دینی و ملی فریضہ کی حیثیت سے منتخب کیا تھا۔ ان کے نزدیک مذہب اور سیاست میں علیحدگی کا کوئی تصور ہی نہ تھا کہ ایک دامن پکڑنا اور دوسرے کو چھوڑ دینا ممکن ہو۔ وطن پہلے یا مذہب جیسے نو سوالات کی گنجائش انکے فراخنائے ذہن و فکر میں نہ تھی۔ عام ارباب سیاست کی طرح پبلک و پرائیویٹ لائسنس کی تقسیم ان کے احاطہ خیال سے باہر تھی۔ ایک عالم دین اور ولی اللّٰہی تحریک کے ایک مخلص رضاکار کی حیثیت سے اس میدان میں گامزن ہوئے تھے اور ملکی زندگی کی وحدت کے سچے عقیدہ سے ان کا قلب سرشار تھا اس لئے مذہب و وطن کے مقام اور ان کے فرائض کی ادائیگی میں کبھی تضاد کے شکار نہ ہوئے مولانا مرحوم روحانیت کے اس مثل اعلیٰ کے قائل تھے جس کے وسیع دائرہ میں حیات انسانی کا ہر گوشہ آجاتا ہے۔ جب میدان سیاست میں ہوش و شعور کی ان کی آنکھیں کھلی تھیں اس وقت بھی فضا یہی ماحول عمومی طور پر چھایا ہوا تھا لیکن دیکھتے دیکھتے مخالف ہوائیں چلنے لگیں اور آناً فاناً زمین پاؤں کے نیچے سے نکل گئی۔ زبردست جھکڑ چلے اور بڑے بڑے تناور درخت جڑوں سمیت اکھڑ گئے، دریاؤں نے راستے بدل لئے، اور پرانے نقشے یکسر بدل کر رہ گئے۔ لیکن مذہب وملت کے اس مجاہد کے پائے ثبات میں ذرہ برابر لغزش پیدا ہوئی نہ تذبذب یا لڑکھڑاہٹ، جس نصب العین کی تکمیل کا عہد و پیمان انہوں نے اپنے بزرگوں سے کیا اس کے لئے جان کی بازی لگانے کے لئے آخر دم تک قائم رہا بلکہ راہ حق میں جان دیدی اور بقول غالب زمزمہ سنج رہا ؎

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

یقیناً جو دشوار گزار جاں گسل راستہ اختیار کیا گیا تھا وہ ہر ایک کے بس کا نہ تھا۔ ایک طرف فرائض ملی کا مضبوطی سے دامن تھامے رہنا دوسری طرف وطنی تقاضوں کو ان فرائض ملی کے ماتحت رکھ کر تکمیل کرنا کوئی معمولی کارنامہ نہیں۔ بقول مولانا مرحوم کے ایک ہاتھ میں شریعت کا جام نازک تھامنا اور دوسرے ہاتھوں میں عشق کی ہتھوڑے کا رکھنا اور اس کو آپس کے ٹکراؤ سے بچائے رکھنا اور ان سے کھیلنا ہر آدمی کا کام نہیں ہے ؎

در کفے جام شریعت، در کفے سندان عشق
ہر ہوسناکے نداند جام و سندان باختن

اس شعر کی واقعی عملی تفسیر ان کی زندگی میں نظر آتی تھی بے شمار ایسے خطرناک مرحلے در پیش آتے تھے کہ اندیشہ ہوتا تھا کہ یہ نازک جام پاش پاش نہ ہو جائے لیکن ان کے حسن تدبر نے حیات ملی کے قافلہ کو ہمیشہ بچا لیا۔ اور سیاست کے اس خارزار سے دامن بچا کر نکل گئے۔ راقم السطور کو مولانا مرحوم کی زندگی کو سنہ ۴۱-۱۹۴۰ سے بہت قریب سے مطالعہ کرنے کی عزت حاصل ہوئی حالات کی خوفناکی، ماحول کی برہمی اور مسلم عوام کے احساسات و جذبات کے مدوجزر کا عالم نہ پوچھئے جوں جوں جنگ کے شعلے بلند، اور اس کا حلقہ متاثرہ وسیع ہوتا جا رہا تھا ہندوستانی سیاست آتش فشاں پہاڑ بنتی جارہی تھی۔ خصوصیت کے ساتھ یہ پہاڑ ملت اسلامیہ ہند پر پھٹ پڑا تھا۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دلی میں خانہ جنگی کی آگ بھڑک اٹھے گی اور مسلم عوام کو جھلس کر بھسم کر دے گی کیونکہ ہندوستان کی راجدھانی ہونے کی وجہ سے ہر سیاسی جماعت یہاں اپنا اثر و رسوخ بڑھانا چاہتی تھی۔ لیگ و کانگریس کی کش مکش نقطۂ عروج پر پہنچ رہی تھی۔ پاکستان کی قرارداد منظور ہو کر زبردست تہلکہ مچاتے ہوئے تھی۔ سیاست کا سارا زور و شور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مسلمان قوم کے اندر مرکوز ہو کر رہ گیا ہے۔ نت نئی جماعتیں۔ نئے نئے نعروں کے ساتھ نمودار ہو کر مسلمانوں کے جذبات سے کھیلنا چاہتی تھیں اور یہ جوشیلی قوم ہر زوردار نعرہ کے بہاؤ میں بہنا چاہتی تھی اور مسلمانان دہلی پر ہر جماعت کی یورش بڑھتی جارہی تھی، اور دلی مرحوم کے قدیم باشندے اپنی روایاتی مہمان نوازی سے کسی کو محروم یا مایوس نہ کرنا چاہتے تھے لیکن پلہ قوم پرور جماعتوں کا بھاری تھا۔ اس وقت دہلی میں آل مسلم پارٹیز کانفرنس منعقد ہونا طے پایا یہ تمام جماعتیں قوم پرور اصولوں کی حامی تھیں غالباً مولانا حفظ الرحمٰنؒ اس کے صدر استقبالیہ چنے گئے تھے یا سیکریٹری بہرحال اس کانفرنس کے اہم داعیوں میں سے تھے۔ اس کانفرنس میں تمام مسلم زعماء بجز لیگی لیڈران کے دلی میں سمٹ کر جمع ہو گئے تھے۔ بے شمار تجاویز پیش ہوئیں لیکن سب سے اہم قرارداد جس پر بڑی گرما گرمی پیدا ہوئی تھی وہ کانگریس کے ساتھ بلا شرط جنگ آزادی میں شمولیت کی تھی۔ ۱۹۳۵ء کی کانگریسی وزارتوں اور ان کی کارروائیوں کی تلخیاں عامۂ مسلمین کو شرکت کانگریس سے برگشتہ بنائے ہوئے تھیں جس کے اثرات مسلم رہنماؤں تک وسیع تھے جذبات مشتعل اور احساسات تند و تیز تھے۔ احرار اسلام اپنے زاویہ نگاہ کو عوام میں گرم گفتاری کے ساتھ پیش کر رہے تھے اور دیگر زعماء اپنے اپنے مطمح نظر کو لئے ہوئے میدان عمل میں سرگرم تھے۔ اس شعلہ فشاں تجویز کے محرک مولانا مرحوم رح تھے اس قدر ترمیموں کی بوچھاڑ کی گئی کہ یقین ہو گیا تھا کہ دب کر یا الجھ کر رہ جائے گی ہر مقرر نے زور خطابت سے اس کو دبانا چاہا اور ہر زعیم نے اپنی سحر البیانی سے اس کی روح کو اڑانا چاہا لیکن سب سے آخر میں مجاہد ملت بحیثیت مجیب کھڑے ہوئے

اور ہر ترمیم کو رد اور ہر تقریر کا جواب اس خوبی سے دینا شروع کیا کہ تھوڑی دیر میں ایک محشر بدلنے لگی۔ مولانا کی زبان کی قینچی نے ترمیمات کی دھجیاں بکھیرنا شروع کر دیں۔ ایک ایک ترمیم ہوا میں اڑنے لگی۔ خطابت کا جوش و خروش، معقول دلائل کا زور، شوخی، روانی و سحر البیانی کا تموج اہل مجلس کو بہا لے گیا۔

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے۔

مولانا مرحوم کی خطابت، بیانی بے پناہ صلاحیت اور ٹھوس علمیت کا یہ نقش تھا کہ نیاز مند کے قلب میں مرتسم ہوا۔ جو استعداد زمانہ سے گہرا اور پائدار ہوتا گیا۔ اس سے پہلے ان کی علمی قابلیت اور تصنیفی استعداد کا اعتراف دل میں تھا لیکن تقریر و خطابت کے میدان میں فرد ہونے کا یقین نہ تھا کیونکہ علامہ شبیر احمد عثمانی رحمتہ اللہ علیہ، مولانا عطاء اللہ شاہ بخاریؒ، سبحان الہند مولانا احمد سعید رحمتہ اللہ علیہ کی تقاریر کے آگے کسی کا چراغ جلتا ہوا نظر نہ آتا تھا۔ اور نہ کوئی نگاہ میں سماتا تھا

پھر حضرت مرحوم سے جو رشتہ خلوص و عقیدت قائم ہوا وہ برابر استوار ہوتا گیا اور مولانا کے کمالات کے جوہر کھلتے گئے بے پایاں فراست، گفتار و کردار کی یکسانی، ملی ہمدردی، وضعداری، خلق خدا کی نفع رسانی اور وفاداری بشرط استواری کے تو مجسمہ تھے۔ جس جس قدر قریب کے مواقع ملے اندازہ ہوا کہ ان کا باطن ظاہر سے زیادہ اُجلا اور روشن ہے۔ اس دور میں فراغت علمی کے بعد بھی طالب علمانہ کج بحثی کی عادت خاکسار میں کافی تھی۔ اس لئے جب بھی حاضری ہوتی اس قسم کے مباحث کا دفتر مولانا کے سامنے کھول دیتا جو زیادہ تر سیاسیات حاضرہ سے متعلق ہوتا۔ مولانا مرحوم برجستہ ہر شک و شبہ کا جواب دے کر صاف کرتے بہت جلد جوش میں آجاتے اس وقت جب تیغ زباں بے نیام ہوتی تو پھر اس کا کاٹ نہیں ہو سکتا تھا معلوم ہوتا کہ اس مبحث کے لئے پہلے سے تیار ہو کر بیٹھے ہیں اور ایک ایک مسئلہ نگاہ میں ہے اس طرح کی بحث بازیوں کی وجہ سے کبھی کبھی تفریح بھی فرماتے جب حاضری ہوتی تو فرماتے کہئے لیڈر صاحب کچھ اور فرمانا ہے؟ اس جملہ کے اندر شفقت و محبت جلوہ گر ہوتی اور اپنے قیمتی اوقات کو بچانا مقصود ہوتا۔ لیکن اگر پھر بھی سوال کر دیا جاتا تو جز بز نہ ہوتے بلکہ خندہ پیشانی سے مطمئن کرنے کی کوشش فرماتے۔

دلی کی اس تین چار سالہ زندگی کا اختتام ۱۹۴۲ء کی تحریک پر ہوا اور فقیر اپنے وطن بھوپال پہنچ کر تدریسی زندگی میں مصروف ہو گیا۔ مولانا قید و بند کو دعوت دیتے رہے ان کی زندگی کا یہ پرشور عہد تھا جبکہ اپنے مضبوط عقیدہ کی بنا پر خود اپنی قوم کی اکثریت سے ٹکرانا پڑا۔ ان کے ظلم و ستم سہنے پڑے۔ اپنوں اور بیگانوں کے طعن و تشنیع کا نشانہ بننا پڑا مگر پائے ثبات میں ذرہ برابر لغزش نہ پیدا ہوئی۔ پھر ۱۹۴۷ء میں آزادی کی صبح اپنے خونی افق کے ساتھ تقسیم ہند کی شکل میں نمودار ہوئی جس کی مخالفت کانگریس کی جنرل کونسل میں انہوں نے واشگاف انداز میں فرمائی تھی اور برملا اس اندیشہ کو ظاہر کیا تھا کہ بظاہر یہ پرامن انتقال اختیارات خانہ جنگی کے واقعات سے زیادہ خونریز حوادث کو اپنے دامن میں لئے ہوئے ظاہر ہو گا۔ مولانا مرحوم نے واضح الفاظ میں اپنے اس عقیدہ کو ظاہر کیا تھا کہ تقسیم کے بغیر ہندوستان کی آزادی جملہ اہل ملک کو لڑ بھڑ کر صحیح موقف و مقام تک پہنچا دیگی جو اغیار کے کٹھو سے ہوئے فارمولے کے مقابلہ میں زیادہ مفید اور پائدار اور ملک کے مستقبل کے لئے نایاب ہوگی۔ مولانا مرحوم کی فراست ایمانی اور بصیرت سیاسی کا قائل ہونا پڑتا ہے کہ مذکورہ بالا اندیشہ خوفناک حقیقت کی شکل میں نکلا جس کی تلخی و ناگواری کے اثرات سے کام و دہن ابھی تک متاثر ہیں۔

رگ و پے میں جب اترے زہر غم پھر دیکھئے کیا ہو
ابھی تو تلخی کام و دہن کی آزمائش ہے

۱۹۴۷ء اور اس کے بعد جو خوفناک واقعات اس ملک کی سرزمین پر ظاہر ہوئے اور وحشت و بربریت کے جس ہولناک اور گھناؤنے حادثات سے ہمارے ملک کی تاریخ داغدار ہوئی اور پورے ہندوستان کا سر ندامت اور شرمندگی سے جھک گیا تباہی و بربادی کے داغوں کو دھونا ممکن نہیں ان تمام واقعات و حادثات میں بحیثیت ایک محب وطن اور مظلوموں کے حامی و مددگار ہونے کے حضرت مجاہد ملت نے جو اعلیٰ کردار، سچی انسانی ہمدردی و دلسوزی اور جابر و ظالم قوتوں کے مقابلہ میں اعلاء حق کا جو زبردست فریضہ انجام دیا ہے ان کو مصلحین عالم کی صف میں لاکر کھڑا کر دیتا ہے۔

ان قیامت خیز حوادث و فسادات میں فرشتۂ رحمت بن کر مصیبت زدوں، ستم رسیدوں اور مظلوموں کے درمیان پہنچے اور ان کی ہر طرح کی امداد و معاونت فرماتے، زخموں پر پھائے رکھتے، دل جلوں کو تسلی و تشفی دیتے اور ظالموں کے خلاف بلا خوف لومۃ لائم اعلان حق فرماتے۔ جس طرح آزادی سے پہلے حضرت مولانا مرحوم نے حصول آزادی کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دی۔ اسی طرح آزادی کے بعد اس کے بقاء و استحکام کے لئے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ وہ جس ولولہ و حوصلہ کے مرد حق تھے افسوس ہے کہ حوادث زمانہ اور یہاں کے رہنے والوں کے باہمی اختلاف نے اس کا موقع نہیں دیا کہ وہ کل بنی نوع کی خدمت کے فریضہ کو انجام دے سکتے بارہا اس کا اظہار فرماتے۔ چیدہ سالہ حیات مبارکہ

[illegible]

مجاہد ملتؒ کی یادیں

مولانا صدرالدین صدر، انصاری صدر جمعیۃ علماء بھوپال

سالکِ راہ ہدایت، واقفِ سرِّ حیات
ماہرِ رمزِ سیاست، راز دارِ کائنات

عاملِ شرعِ متیں و باغبانِ علمِ دیں
رہروِ راہِ طریقت یادگارِ صالحیں

ذاکر و عالم، خطیب و واعظِ شعلہ مقال
زاہدِ شب زندہ دار و اہلِ دل صاحب کمال

ناظمِ جمعیت ہند و ستاں عالی نہاد
اہلِ فکر، اہلِ نظر، اہلِ قلم، خوش اعتقاد

خوش مزاج و خوش مذاق و خوش خیال و خوشخصال
نیک فطرت، نیک طینت۔ نیک خصلت، نیک چال

باغبانِ گلشنِ اردو، مصنف با کمال۔
ناقدِ جادو بیاں تھا، وہ خطیبِ بے مثال

ناخدائے کشتیِ ملت، امیرِ کارواں
اتحادِ قوم کا حامی زعیمِ نکتہ داں

مردِ میدانِ سیاست یادگارِ رفتگاں
افتخارِ ملک و ملت، عظمتِ ہندوستاں

محملِ لیلائے آزادی کا یکتا سارباں
آسمانِ حریت کا آفتابِ ضوفشاں

فرد میں شانِ جماعت یہ خدا کی دین تھی۔
دیدۂ بینا میں اس کی بات فرضِ عین تھی

زندہ دارِ عظمتِ علمِ رشیدؒ و قاسمیؒ
نازبردارِ محمدؐ، حاملِ وصفِ علیؓ

یادگارِ احمد و محمود و سجاد و ولی
نورِ دیں، مفتی کفایت کی ذہانت کا ولی

مظہرِ انوارِ شیخ و حاملِ اطوارِ شیخ
تھے نمایاں اس کے ہر کردار سے کردارِ شیخ

حضرتِ علامہ انور کے شاگردِ رشید
بوالکلامِ دہلوی کے فیض سے تھے مستفید

اُٹھ گیا ساقی مذاقِ جشنِ مے نوشی گیا
وہ سرورِ جانفزا وہ کیفِ مدہوشی گیا

مے کدہ باقی ہے، لیکن روحِ میخانہ گئی
وہ نشاطِ زندگی وہ شانِ رندانہ گئی

اب کہاں دیکھیں گی آنکھیں وہ جمالِ دلنواز
اب کہاں ہو گی میسر لذتِ راز و نیاز

مولوی حفظ رحمٰنؒ وہ مجاہد بے مثال
باغِ جنت میں ہے اب اے خدائے لایزال

زندہ جاوید تھی ذاتِ گرامی بالیقیں
صدر وہ اس شعر کے مصداق تھے کچھ شک نہیں

در کفے جامِ شریعت در کفے سندانِ عشق
ہر ہوسناکے نداند جام و سنداں باختن

ناگپور میں حضرت مجاہد ملّت کا ورُود

مولانا عبدالحق عارف

غالباً ۱۹۳۵ء میں کُل ہند سیرت کمیٹی پٹی لاہور کی صوبائی سیرت کمیٹی صوبہ متوسط و برار ناگپور کی دعوت پر مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمان صاحب نور اللہ مرقدہم کلکتہ سے سیرت النبیؐ کے جلسہ میں خطاب کرنے کے لئے ناگپور میں پہلی بار تشریف لائے تھے، ناگپور کے رئیس الحاج نواب محی الدین خاں صاحب مرحوم نے اپنے دولتکدہ پر ٹھہرایا اور اس میں حضرت مولانا کو اپنا مہمانِ خصوصی بنایا۔ مجاہد ملت اُس زمانے میں مولانا حفظ الرحمان سیوہاروی کے نام سے عوام و خواص میں متعارف تھے، جوانی کا عالم تھا، چہرے پر کھنی اور سیاہ داڑھی بھوؤں کے ابرو جیسے تیغ براں، نہایت دُبلا پتلا جسم مگر چال ڈھال اور گفتگو سے مجاہدانہ زندگی کی نشاندہی کا پتہ چلتا تھا، علاوہ اس کے ہر آن و ہر لمحہ علم و عمل کے اعتبار سے اُس ذاتِ گرامی کی زندگی میں نمونۂ سلف کے فضل و کمال کا نمایاں اظہار ہوتا تھا۔

رحمت اللعٰلمین کے موضوع پر حضرت مولانا نے اپنے مخصوص اندازِ بیان میں ناگپور کے مشہور میدان چٹنویس پارک میں جہاں پر ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی اور دیگر مذاہب کے ہزاروں انسانوں کا مجمع تھا مسلسل ڈھائی گھنٹہ تک نہایت دلکش، کیف آور اور ایمان افروز تقریر سے سامعین کو محظوظ فرماتے ہوئے سرکارِ دو عالم کی سیرتِ مقدسہ کے ہر پہلو کو اُجاگر کرکے اس بات کو ثابت کیا کہ انسانی زندگی کے ہر طبقہ کو اُسوۂ رسول کی پیروی اس لئے لازم اور ضروری ہے کہ وہ انسان کی مثالی زندگی کا معیار ہے۔

اس تقریر کے بعد عوام و خواص کی خواہشوں اور درخواستوں پر حضرت مولانا نے ناگپور کے وینکٹش تھیٹر میں اپنی دوسری تقریر نہایت مبسوط اور پُرکیف اندازِ بیان میں فرمائی، ہندوستان کی آزادی کامل اور جنگِ عالمگیر کے عنوان پر اپنے سیاسی خطاب میں ۱۹۳۹ء کی عالمگیر جنگ ہونے کے امکان، اسباب و علل اور جنگ عالمگیر کے نتیجہ میں یورپی دنیا کی عبرتناک تباہی اور دنیا کا سیاسی نقشہ اور اسی کے ساتھ ساتھ اتحادیوں اور جرمنی کی جنگی تیاریوں کے خدوخال، عالمگیر جنگ میں اتحادیوں کی کامیابی کے ساتھ ہی ہندوستان کی آزادی کے آغاز کے دلائل و براہین پر بہت سی پیشینگوئیوں کا اظہار فرماتے ہوئے دورانِ تقریر میں نہایت واضح اور صاف الفاظوں میں بیان فرمایا تھا کہ اس غلام ہندوستان کی غلامی کے سبب ہی آج تک ممالک اسلامیہ کا ہر ملک برطانوی سامراج کا غلام بنا ہوا ہے، حالاتِ حاضرہ میں روزانہ کے تغیر و تبدل یہ ظاہر کرتے ہیں کہ مستقبل قریب میں ہندوستان اپنی غلامی کی زنجیر کو توڑ دے گا۔ ظاہر ہے جب زنجیر کی ایک کڑی زنجیر سے جدا ہوتی ہے تو اس کی ساری کڑیاں خود ڈھیلی ہو جاتی ہیں۔ اس لئے ہندوستان کی آزادی کا مسئلہ ہر ہندوستانی کی قربانیوں اور دلوں کے موالات کے ساتھ ہی حل ہوگا۔ سامعین میں اربابِ سیاست اور اصحابِ علم و فہم کے یہ تاثرات تھے کہ مولانا کی ہر دو تقاریر بڑی بلند پایہ اور یادگار رہ کے علاوہ ملک و ملت کے لئے نہایت سبق آموز اور سودمند تھیں۔

۱۹۴۷ء کے آخر دسمبر کے وسط میں امدادی کانفرنس میں شرکت کے لئے دوسری بار ناگپور میں مجاہد ملت تشریف فرما ہوئے تھے، جبکہ ہندوستان آزاد ہوتے ہی ملک بھر میں قتل و خونریزی کے علاوہ مسلمانوں میں شدید خوف و ہراس اور عام طور پر بھگدڑ کا سلسلہ در سلسلہ پیدا ہو چکا تھا، اُسی کے اثرات تھے جس سے صوبہ متوسط و برار اور ناگپور کے مسلمانوں میں بھی عام بے چینی و اضطراب اور بھگدڑ مچی ہوئی تھی۔ کانفرنس میں حضرت مجاہد ملت نے اس موقع پر نہایت پُرجوش اور ولولہ انگیز تقریر سے بھگدڑ اور عام اضطراب و بے چینی کی فضا اور ماحول کی کایا پلٹ کر دی۔ بتدریج دلوں سے خوف و ہراس ختم ہوتا گیا۔

۱۹۴۹ء میں صوبائی جمعیۃ علماء متوسط و برار کانفرنس کے عظیم الشان اجتماع کے موقع پر تیسری بار حضرت مجاہد ملت نے ناگپور میں اس کانفرنس کے دس ہزار کے مجمع کو خطاب کرتے ہوئے مسلمانوں کو وحدت کلمہ پر جمع ہونے، اتحاد و اتفاق والی کتاب و سنت کی زندگی کو عملاً اختیار کرنے، باہمی چپقلش سے پرہیز کرنے اور اللہ سے اپنا مضبوط تعلق جوڑے رکھنے کی پُرکیف انداز میں تلقین و ہدایت،

فرمائی تھی۔ نیز اسی کے ساتھ ساتھ فرمایا تھا کہ وطن عزیز اپنی دیرینہ غلامی سے آج آزاد ہے۔ آزادی جیسی نعمت عظمیٰ کو حاصل کرنے کے لئے جدوجہد اور ہر طرح کی قربانی پیش کرنے میں ہم کسی سے پیچھے نہیں تھے۔ لہٰذا آزادی کی ہر نعمت و دولت سے استفادہ اٹھانے میں برادران وطن کے ساتھ ہم بھی برابر کے شریک و سہیم ہیں۔ مسلمانوں کو اپنے دل و دماغ سے احساس کمتری نکال دینا چاہیئے جس سے اُن کے دلوں میں یہ غلط خیال پیدا ہو چکا ہے کہ ہم یہاں پر کسی کے غلام اور محکوم ہیں اور اکثریت ہماری آقا اور بادشاہ ہے۔ آقائی اور بادشاہی کے راج کو ہم نے ختم کر کے دیش کو آزاد کرایا ہے۔ اب اس ملک میں سیکولرازم کا نظام جمہوری قائم ہے ہر بالغ ہندوستانی کی رائے اور ووٹوں سے سیکولرازم کی جمہوری حکومت کا نظام بنتا ہے۔ یہ ہماری ڈیوٹی ہے کہ ملک کی تعمیر میں اپنی پوری پوری محنت اور جانفشانی سے ملک کو بام عروج پر پہونچائیں اور اپنے کردار و عمل سے یہ ثابت کر دکھائیں کہ ہم اپنے پیارے وطن کو جنت نشان بنا کر رہیں گے تاکہ ہر ہندوستانی امن و چین کی زندگی بسر کر سکے۔

انقلاب ۱۹۴۷ء نے صوبہ متوسط و برار اور اس کی راجدھانی ناگپور میں بسنے والی بڑی تعداد کے مسلمانوں میں خوف و ہراس، پراگندگی، انتشار اور بھگدڑ کا ایک ہولناک سیلاب عظیم پیدا کر دیا تھا۔ اُس سے شبانہ روز تباہی و بربادی کی بھیانک شکل شہر سے لے کر قریہ تک کے مسلمانوں میں پیدا ہوتی جا رہی تھی۔ حالانکہ شمالی ہند کے شہروں کی طرح سے قتل و خونریزی اور مار کاٹ کا ایک واقعہ بھی اس صوبہ میں کہیں بھی نہیں ہوا تھا۔ لیکن دلی اور دیگر شہروں کی مار کاٹ کی خبروں اور واقعات نے صوبہ میں ہر طرف کے مسلمانوں کو اس سے زیادہ سے زیادہ متاثر بنا کر خوف و ہراس، پراگندگی اور بھگدڑ میں مبتلا کر دیا تھا دوسرے ۱۹۴۷ء سے پہلے کے وہ رہنما اور قائدین جو اس صوبہ میں مسلمانوں کی قیادت و رہنمائی فرما رہے تھے اُن میں سے زیادہ تر نے اپنے کو روپوش کر لیا تھا۔ بہتیروں نے اپنے اپنے مقامات سے سب سے پہلے راہِ فرار اختیار کرنے میں پیش قدمی کر کے مسلمانوں میں ہولناکی اور خوف و ہراس پیدا کر دیا تھا۔ انہیں وجوہات سے صوبہ متوسط و برار اور ناگپور میں شبانہ روز بھگدڑ کا لامتناہی سلسلہ مسلمانوں میں پیدا ہوتا گیا۔ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۴۹ء کے آواخر تک کم و بیش صوبہ بھر میں یہی حالت مسلمانوں میں جاری و ساری رہی۔

ان ناگفتہ بہ حالات و ماحول کے پیش نظر صوبہ متوسط و برار اور ناگپور کی مایہ ناز بزرگ ترین اور عابد شب زندہ دار ہستی حضرت مولانا محمد یٰسین نور اللہ مرقدہٗ صدر جمعیۃ علماء متوسط و برار ناگپور نے صوبہ کے کل جماعتی رفقاء کار کو اپنے مدرسہ عربیہ اسلامیہ رائپور میں جمع کیا۔ کافی غور و خوض کے بعد طے کیا گیا کہ ناگپور میں جلد سے جلد صوبائی جمعیۃ کانفرنس طلب کی جائے۔ چنانچہ نومبر ۱۹۴۹ء کے اواخر میں ایک عظیم الشان کانفرنس صوبہ جمعیۃ علماء متوسط برار ناگپور کا سہ روزہ اجلاس نہایت عظمت و شوکت کے ساتھ انعقاد پذیر ہوا جس میں مرکزی جمعیۃ علماء ہند کے کم و بیش تمام اکابرین نے اور حضرت مجاہد ملت نے اپنی تشریف آوری سے سہ روزہ کانفرنس کے اجلاس کو بارونق بنایا۔ خود حضرت مجاہد ملت اور تمام اکابرین کے کانفرنس سے متعلق یہ تاثرات تھے کہ "اگر ہمیں یہ معلوم ہوتا کہ یہ کانفرنس اتنی عظیم الشان اور وسیع پیمانہ پر ہوگی تو اس کو آل انڈیا جمعیۃ کانفرنس بنا دیتے" مجاہد ملت نے دوسرے دن کے اجلاس میں اپنے خطاب خصوصی سے کانفرنس کے دس ہزار شرکا سنکے سہمے ہوئے اور خوف زدہ قلوب و اذہان کی کایا پلٹ کر رکھ دی جس نے صوبہ بھر کے دور دراز سے آئے ہوئے مسلمانوں میں زندگی کی نئی اُمنگ و ترنگ پیدا کر دی۔ حضرت مجاہد ملت کے خطاب کا یہ کھلا ہوا اعجاز مسیحائی تھا کہ اکھڑے ہوئے قدم اپنی اپنی جگہ پتھر کی چٹان سے زیادہ مضبوط جم گئے اس طرح صوبہ میں ہر جگہ مسلمان مستقبل کے لئے کچھ سوچنے اور کرنے کے لئے آمادہ اور مستعد نظر آنے لگے۔ کانفرنس کے اختتام کے بعد صوبہ کے ہر ہر شہروں اور قریوں میں تنظیم جمعیۃ کا نہایت زور و شور کے ساتھ کام شروع ہو کر مضبوط اور متحرک جمعیۃ قائم ہو گئی تھی۔

شومئی قسمت ۱۹۵۲ء میں حضرت مولانا محمد یٰسین صدر جمعیۃ علماء صوبہ متوسط برار ناگپور نے اچانک اس دار فانی سے رحلت فرمائی۔ مولانا مرحوم کی اسی سالہ عمر عزیز کے چالیس سال اس صوبہ میں صرف دو اہم کاموں کے لئے شبانہ روز وقف رہے ہیں۔ پہلا کام جمعیۃ علماء کی سربلندی کے لئے جان توڑ کوشش، دوسرا کام مدرسہ عربیہ اسلامیہ رائپور میں فن تجوید کے ساتھ قرآن کریم کا ناظرہ، حفظ قرآن کی تعلیم کے علاوہ درس نظامیہ کی تکمیل کا مشغلہ بہت عزیز تھا۔ اپنی ضعف و نقاہت کے سبب اپنے دیرینہ رفیق محترم حافظ جمیل الرحمٰن صدیقی اعظمی کو اپنی حیات ہی میں مولانا محمد یٰسین نے جمعیۃ [illegible] کی زعامت [illegible] پر متعین فرما دیا تھا۔ مذکورہ ہر دو بزرگوں کو حضرت مجاہد ملت سے نہایت گہرا قلبی تعلق اور قرب حاصل رہا ہے۔ چنانچہ ان بزرگوں نے صوبہ کے پریشان اور ستم رسیدہ مسلمانوں کی زیادہ سے زیادہ منیبت و خانماں بربادی کے زمانے میں

حضرت مجاہد ملت کی قیادت و رہنمائی سے مسلمانان صوبہ کو نجات دلائی، خصوصاً ناگپور اور رائپور کے دو اہم کسٹوڈین کے معاملات قیامت تک حضرت مجاہد ملت کی قیادت و رہنمائی کا دم بھرتے رہیں گے۔

نومبر ۱۹۵۳ء میں چوتھی بار حضرت مجاہد ملت صوبائی تنظیم اور اس کے انتخابی اجلاس کی رہنمائی کے لئے ناگپور تشریف لائے اور اپنے پرانے میزبان نواب محی الدین خانصاحب مرحوم کی بیگم صاحبہ کے اصرار و خواہش پران کے دولتکدہ بھاؤڑا ہاؤس میں قیام فرمایا تھا، صوبہ کی خصوصی مجلس، نمائندگان صوبہ کو علیحدہ علیحدہ اپنے دلپذیر خطاب سے نوازا تھا شب میں صوبہ جمعیۃ کے جلسۂ عام میں شہر ناگپور کے ۶۵ ہزار مسلمانوں کو واعتصمو بحبل اللہ جمیعا کے خطاب سے حرارت ایمانی پیدا فرماتے ہوئے جماعتی تنظیم کی زندگی کے پروگرام کی صداقت کے پرچم کے نیچے جمع کر کے مومن والی زندگی کا سبق پڑھایا تھا۔ ناگپور کے دو اہم اور بڑے تعلیمی اداروں انجمن برانچ مڈل اسکول اور انجمن حامئ اسلام کے طلبا اساتذہ اور کارکنان انجمن کو خطاب فرماتے ہوئے موجودہ ماحول کی تبدیلی کے ساتھ تعلیم کی اہمیت خصوصاً دینی تعلیم کو زیادہ سے زیادہ عام کرنے کے موضوع پر دو گھنٹہ تک مسلسل سامعین کو محظوظ فرماتے رہے۔

۵۴ء، ۱۹۵۵ء میں پانچویں بار ناگپور سے کھنڈوہ تک سیرت مقدسہ کا پروگرام اور مرکزی جمعیۃ علماء ہند کی مالی اعانت کے تحت صوبہ کے متعدد مقامات سے موصولہ دعوت نامہ میں مسلمانوں کے اصرار و خواہش کے پیش نظر حضرت مجاہد ملت کامل اٹھارہ دنوں کے لئے تشریف لائے۔ یہ راقم الحروف کی خوش قسمتی کہئے یا حسن اتفاق "چہ نسبت خاک را با عالم پاک" کے مصداق حضرت مجاہد ملت کے ہر دو اسفار و دوار میں ہم سفر بننے کا شرف حاصل ہو گیا مسلسل اٹھارہ دن میں چالیس کے قریب تقاریر کی پرکیف مجلسوں میں لطیف، وجمیل، حکمت و دانائی، علم و فضل و کمالات کی بلند ترین خطابت و سیاست کی دولت و نعمت سے سرفراز ہونے کا زرین و بے بہا موقع ملتا رہا۔ شاید دوبارہ ایسی پرکیف اور ایمان پرور صحبت سفر والی زندگی نہیں حاصل ہو گی ؎

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

۱۹۵۶ء میں چھٹی بار ناگپور کو حضرت مجاہد ملت نے اپنی تشریف آوری سے رونق بخشی تھی، صوبائی جمیعۃ کا انتخاب تھا جس کی قیادت اور رہنمائی فرمانے کے بعد شب کو جلسۂ عام سے خطاب ولنبلونکم بشیئ من الخوف والجوع ونقص من الاموال والانفس والثمرات وبشر الصابرین پر فرمایا تھا۔

۱۹۵۹ء میں آل انڈیا نیشنل کانگریس کمیٹی کے اجلاس میں شرکت کے لئے ناگپور کی زمین کو ساتویں بار اپنی تشریف آوری سے مزین فرمایا تھا۔ یہ آخری سفر ناگپور کے لئے تھا اور اجلاس سے فارغ ہو کر مومن پورہ میں نیرت پر خطاب کے لئے سامعین سے مخاطب ہونے اور اپنی آخری تقریر پر مہر لگا کر الوداع ہی کہنے آئے تھے ؎

خدا بخشے حقیقت میں مجاہد تھا وہ ملت کا
عیاں تھا اس کے کردار و عمل سے درد ملت کا
وطن کے معاملے ہوں یا مسائل دین و مذہب کے
بیاں کرنا ہمیشہ اُس کا شیوہ تھا حقیقت کا

نذرِ عقیدت بیادگار شہیدِ ملت

مولانا نجم الدین اصلاحی

مجاہد ملت کو علمی بصیرت وقت کی اہم ترین علمی شخصیت فقیہ العصر حضرت مولانا محمد انور شاہ نور اللہ مرقدہ وانار اللہ مضجعہ کی میسر آئی، سوجھ بوجھ اور سیاسی آثار چڑھاؤ حضرت شیخ الہند قدس سرہ کی تحریک اور امام الہند مولانا آزاد رحمۃ اللہ علیہ کی صحبتوں سے اخذ فرمایا۔ گاندھی جی کی خوبیوں کو اپنایا۔ اور شیخ الاسلام حضرت مولانا مدنی قدس سرہ کی روحانیت نے سونے پر سہاگہ کا کام دیا۔ کیونکہ پیغمبرانہ دعوت جس عزیمت اور حوصلے کی محتاج ہے وہ بدون تعلق مع اللہ کے ناممکن ہے۔ اس تعلق مع اللہ سے جس مرد مجاہد نے اپنا رشتہ اور ناتہ قائم کر لیا وہ ظاہری وسائل اور ذرائع سے بھی بسا اوقات بے نیاز ہو جایا کرتا ہے اور غیر مرئی طور پر دست قدرت میں وہ گردش کرتا رہتا ہے۔ ایسا شخص نفسی اور نام آوری خود بینی اور شہرت پسندی کی لعنت سے بمراحل دور رہا کرتا ہے۔ ایسے بلند ہمت اور صاحب عزیمت شخص کی ایک دن کی زندگی تخت و تاج سے زیادہ قیمتی ہوتی ہے۔ لاریب مجاہد ملت کی زندگی اسی طرح کی تھی اس لئے اُن کی موت پر پوری دُنیا متاثر ہے اور کتنی آنکھیں ہیں کہ اب تک ماتم کناں بالخصوص ہندوستان کے بوڑھے اور جوان، بچے اور عورتیں اپنی قسمت کو رو رہے ہیں کہ آگ کے شعلوں سے کھیلنے والا اور فرقہ پرست دراز دستیوں کو چیلنج کرنے والا مرد مجاہد ہمیشہ کے لئے ہم سے روٹھ گیا۔ آج مجاہد ملت رحمۃ اللہ کے اٹھ جانے سے ایک ایسی بساط زندگی لپیٹ کر رکھ دی گئی کہ جس کے ساتھ ۱۸۰۳ء سے جو تحریک آزادی ہند قائم ہوئی تھی دفعتہً رک گئی اور ختم ہو گئی اور اس میں دو رائیں نہیں کہ آج تمام مرحومین کی جدائی بالخصوص مولانا آزادؒ اور مولانا مدنیؒ کی دائمی مفارقت کا احساس پورے طور پر ہر قدم پر محسوس ہو رہا ہے مگر بقول عرفیؔ ؎

عرفیؔ اگر بہ گریہ میسر شدے وصال
صد سال می تواں بہ تمنا گریستن

مجاہد ملت اور خدمتِ خلق

انبیاء علیہم السلام کے نقش قدم پر چلنے والے مصلحین اُمت اور مجاہدینِ ملت کے لئے ضروری ہے کہ وہ "الخلق عیال اللہ" کے بین الاقوامی اصول اور "الناس کلھم اخوۃ" کے ہمہ گیر دستور کی روشنی میں امر بالمعروف والنہی عن المنکر کے فریضہ کو حدود شرعیہ کی رعایت کے ساتھ انجام دیتے رہیں اور "وَاصْبِرْ عَلٰی مَا اَصَابَکَ" کی عملی تصویر بن کر پوری جرأت حق اور خداداد فراست کو مشعلِ راہ بنا کر درمیان کارزار کفر دیں ترکشِ ما را خدنگ آخریں کا رجز خواں بن جائیں کیونکہ خدمتِ خلق کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو حجروں اور ان خانقاہوں اور علمی اداروں کے اندر ہی جہاں ہوا اور روشنی کا گزر نہ ہو اور جہاں صدیوں تک جنتری کا ورق نہ پلٹے اس کا منتہائے نظر اور نیابت کار کی آخری سرحد ہو۔ بلکہ یہ وہ ہفتخوانِ رستم ہے کہ جس کی لمحہ بھر زندگی کے مقابل برسہا برس کی عبادت و ریاضت کو اس کے آگے شرمندہ ہونا پڑتا ہے۔ آج تصوف و سلوک کے نام پر شریعت و طریقت وغیرہ کے چند بے معنی الفاظ صرف زبانوں پر دماغی عیاشیوں کی پیداوار بن کر رہ گئے ہیں حالاں کہ شریعت اور شریعت کی پابندی کے اندر ہی سے خدمت خلق اور تمام اولاد آدم کی خبر گیری، ہمدردی کا سراغ اللہ والوں نے پایا کہ ہر زمانہ میں انبیاء کرام کی لائی ہوئی تعلیم و تہذیب سے متصادم قوتوں کا ببانگ دہل مقابلہ کیا اور تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ ایسے مٹھی بھر افراد ڈانواڈول کشتی کے ناخدا ثابت ہوئے اور ظلمت اور تاریکیوں کے پردوں کو انوار صبح سے درخشاں و تاباں کر دیا۔ انھیں روشن دماغ اور زمانہ کی ضرورتوں سے بھرپور علم و عرفان رکھنے والے حفظ الرحمنؒ نے اپنی چشم حقیقت نگر سے ہندوستانی قوم کے دکھ درد کو بھانپ لیا۔ اور پھر سر بکف اور کفن بردوش یکہ و تنہا انتہائی بے خوفی اور بے باکی کے ساتھ قوم و ملت کی ہر ممکن صورت سے ترجمانی اپنا فریضہ سمجھا اور رجعت پسندانہ عناصر اور فرقہ وارانہ رجحانات کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور زندگی کے آخری لمحہ تک یہ مرد مجاہد ہر محاذ پر جنگ لڑتا رہا۔ اور کبھی اس کے ماتھے پر شکن اور ابروؤں پر بل نہیں آیا۔ بلکہ ایک تبسم آمیز مسکراہٹ سے ہر حوادث زمانہ کا جواب دیا۔ اس کا جسم بظاہر مشت خاک تھا مگر حقیقت میں ایک آہنی پیکر تھا جو قصر و ایوان کے اندر گرجتا اور اپنی شعلہ بار تقریروں سے اپنا لوہا منواتا رہا اور ساتھ ہی خون دل سے چمنستان وطن کی آبیاری کر کے اپنے ناخنِ تدبیر سے پیچیدہ گتھیوں کو برابر سلجھاتا رہا۔ اس لئے قدرتی طور پر ہندوستان کا ذرہ ذرہ سوگوار اور اداس ہے۔

رحمۃ اللہ علیہ وعلیٰ اتباعہ الیٰ یوم الدین

آزادی ہند کا مفہوم اور مجاہد ملت کا پیغام

ہندوستان کی آزادی کا مفہوم یہ تھا اور ہے کہ ہندوستان کی تمام بسنے والی قوموں کو اس نقصان کی تلافی کا موقع مل جائے

جو انگریزی حکومت کے تسلط سے ان کی تہذیب اور قومیت کو پہنچا ہے۔ ہمارے اکابر نے آزادی کی جنگ اس لئے لڑی تھی کہ آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کو اتنا اقتدار حاصل ہو کہ وہ خالص اسلامی اصولوں پر اپنے نظام اجتماعی کو از سر نو مرتب کر سکیں۔ قوانین شرعی کو اپنی قوم کے افراد پر نافذ کر سکیں اپنی جماعت میں احکام اسلامی سے انحراف اور غیر اسلامی خیالات اور طریقوں کی اشاعت کو روک سکیں۔ تعلیم کے اس نظام سے جو سراسر مخالف اسلام ہے اور جس کی بدولت مسلمانوں کو بتدریج یا قساط مرتد بنایا جا رہا ہے نجات حاصل کریں اور اپنے اصولوں کے مطابق اپنی قوم کی تعلیم کا انتظام کر سکیں یا بالفاظ دیگر مسلمان کی آزادی سے مراد یہ ہے کہ آزاد ہندوستان کے نظام حکومت میں دوسری قوموں کے ساتھ مسلمانوں کو بھی پنا اختیار تمیزی استعمال کرنے کا پورا موقع حاصل ہو تاکہ خارجی اور داخلی معاملات میں قانون سازی اور اس کے نفاذ میں نظم مملکت اور اس کے متعلق شعبوں میں ہندوستان کی حکومت کبھی کوئی پالیسی اور طریق کار استعمال نہ کر سکے جو مسلم قوم کے اصولی تہذیب کے خلاف ہو یا جس سے مسلمانوں کو من حیث القوم نقصان پہنچتا ہو۔ خلاصہ یہ کہ آزاد ہندوستان میں اس کے باشندوں کو ترقی کے جتنے وسائل حاصل ہوں ان سے فائدہ اٹھانے میں مسلمان بھی سب کے ساتھ برابر کے شریک ہوں اور کوئی طاقت ان کے ساتھ امتیازی سلوک کرنے کی جرأت نہ کر سکے۔

مجاہد ملت خوب سمجھ چکے تھے کہ ہوا کا رخ کدھر ہے۔ اس لئے ماتم اور نوحہ خوانی ان کا کردار نہ تھا۔ بلکہ مرحوم کا آخر دم تک یہ پیغام رہا کہ جب ہم اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں تو ہماری زندگی کا نصب العین بھی تو اسلامی ہونا چاہئے۔ بالخصوص ایسے وقت میں جب کہ ہم محسوس کر رہے ہیں کہ ہماری قومیت اور تہذیب کو فی الواقع عظیم الشان خطرے کا سامنا ہے۔ یہ وہ وقت ہے کہ جو کچھ جس کے بس میں ہو آزادی ہند کی متاع گراں مایہ کی حفاظت کے ساتھ ساتھ اپنی تہذیب اور اپنے اسلامی نصب العین کے لئے کر گزرے ہو سکتا ہے کہ ہم اس آنے والے سیلاب کا مقابلہ پوری طرح نہ کر سکیں۔ لیکن جب اس کا مقابلہ کرتے کرتے ہمارے ہاتھ شل ہو جائیں گے اور ہمارے بازوؤں میں قوت نہ رہے گی جب ہمیں موجوں کے تھپیڑے بالکل نیم مردہ کر کے ساحل کی ریت پر پھینک دیں گے تو اس آخری وقت میں کم از کم اتنا اطمینان تو ضرور ہوگا کہ بزدلی کی زندگی سے یہ مردانگی کی موت ہزار درجہ بہتر ہے۔

مجاہد ملت رحمۃ اللہ علیہ نے عروس آزادی ہند کے گیسو سنوارنے میں کمال درجہ مشاقی کا مشاہرہ فرمایا اور یہ پیغام دیتے ہوئے رخصت ہوئے کہ ہندوستان کو اپنا ملک سمجھ کر اس کی تعمیر اور ترقی میں متحدہ قومیت کے نظریہ کے مطابق سرگرم عمل رہنا ایک سچے اور مخلص آدمی کا فریضہ ہے ہم جس طرح مسلمان ہیں اسی طرح ہندوستانی بھی ہیں۔ احساس کمتری مومن اور مسلم کی شان کے منافی ہے اور جمعیۃ علماء ہند کی مضبوطی مسلمانوں کی مضبوطی اور ہندوستان کی بہبودی کے مرادف ہے۔ مجاہد ملت اپنی جذبات ہی کی وجہ سے شہید ملت کے سب سے اونچے مقام پر پہنچے کیونکہ ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق۔

مجاہد ملت کے سیاسی مقام کو جاننا سب کے بس کی بات نہیں۔ تاہم اتنا تو ہر اخبار بیں طبقہ اور سیاسی دلچسپی رکھنے والے ہر فرد کو اعتراف کرنا ہوگا کہ جہاتما گاندھی آپ پر سب سے زیادہ بھروسہ کرتے تھے اور وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو مرحوم کو اپنے برابر کا سمجھتے رہے اور امام الہند مولانا آزاد آپ کی ذہانت اور تدبر سے متاثر تھے یہی وجہ تھی کہ جب بھی فرقہ پرستوں نے سر اٹھایا مولانا نے پوری جرأت حق سے پارلیمنٹ کے در و دیوار تک میں زلزلہ ڈال دیا۔ آج کون ہے جو اعلاء کلمۃ الحق کے لئے اپنی قربانی پیش کرتا ہے؟ اور کون ہے جو افضل الجہاد کلمۃ صدق عند سلطان جائر اپنا شعار بناتا ہے؟ مجاہد ملت کا یہ وصف ان کے تمام اوصاف پر غالب تھا۔ یہ قدرت کی دین تھی کہ اسی صفت کو لے کر وہ جہان سے گئے کامیاب رہے اور ان کو ملک و ملت کی جو خدمت میسر آئی ان کے معاصرین میں کسی کو نصیب نہیں ہو سکی۔ ذالک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء۔ سچ فرمایا سعدیؒ نے ؎

طریقت بجز خدمتِ خلق نیست
بہ تسبیح و سجادہ و دلق نیست

قوم اور ملّت کے فدائی

جناب امین سلونوی لکھنؤ

مولانا حفظ الرحمٰنؒ۔ وہ مجاہد ملت، وہ عظیم انسان جنھیں آج ہماری آنکھیں ہر جگہ تلاش کرتی ہیں اور ہمیشہ تلاش کرتی رہیں گی۔ لیکن اب وہ نہیں مل سکیں گے۔ البتہ ان کی خوبیاں زندہ، ان کی نیکیاں باقی، ان کے اعمال اور کردار کی روشنی، ان کی پرخلوص رہنمائی ہمیشہ زندہ رہے گی۔ ابھی پچھلے سال کی بات ہے کہ وہ ہماری مشکلات میں اپنے نیک مشوروں سے مدد کرتے تھے۔ وہ رہیں یا نہ رہیں، دہلی ہوں یا لکھنؤ ان کا لطف وکرم ان کی مہربانیاں اور ان کی خدمات محدود نہیں تھیں۔ لیکن لوگ اپنے سکون اور اپنے اطمینان قلب کے لئے اُن کے پاس تک پہنچنے کی کوشش کرتے تھے۔ میں بھی برابر ان کی خدمت میں پہنچتا رہتا تھا اور یہ سلسلہ عرصہ سے جاری تھا آج وہ ہم سے جدا ہیں۔ مگر ان کی خدمت، ان کے خلوص کے گہرے نقوش دلوں میں موجود ہیں اور موجود رہیں گے ان کی شخصیت اور ان کی بلندی قامت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ جس مسئلہ میں وہ ہاتھ رکھدیتے اس کی اہمیت میں اضافہ ہوجاتا تھا اور ان کی زندگی کے ہر گوشہ سے انکا اخلاق، ان کا اخلاص، ان کی صداقت نمایاں ہوتی تھی۔ ایک میں ہی نہیں ان کے ملنے والے، ان کے چاہنے والے ہر طبقہ اعلیٰ وادنیٰ میں موجود ہیں اور آج ان کی کمی کو سبھی محسوس کر رہے ہیں اور بار بار ذہن میں یہ سوال ابھرتا ہے کہ اب ان کی جگہ کو کون پُر کرنے والا ہے۔ اور کون ان کے اس پروگرام کو جو انھوں نے ملت کی ترقی اور خوش حالی کے لئے اپنے سامنے رکھا تھا پورا کرے گا۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

مولانا حفظ الرحمٰن انھیں شخصیتوں میں تھے اور انھیں دیدہ وروں میں تھے۔ جن کے واسطے ایک دو نہیں، ہزاروں آنکھیں روتی رہیں گی اور زندگی کے ہر موڑ پر خواہ وہ مذہب ہو، خواہ قانون کی موشگافی ہو خواہ سیاست کا میدان ہو، خواہ پارلیمنٹ کا ایوان یا علم وفن کا پلیٹ فارم، ہر جگہ ان کی یاد، ہر محل پہ ان کا خیال ان کے فکر وعمل کی رسائی۔ ہر محفل میں ان کے تذکرے اور ان کے کارناموں پر فخر ومباہات جاری رہیں گے۔

میں نے ان کے مخالفین کو بھی دیکھا ہے۔ ان سے ملا ہوں۔ لیکن یہ بھی عجیب بات تھی کہ ان لوگوں کے متعلق خود مولانا نے کبھی اپنے رویہ میں تبدیلی نہیں کی، بلکہ کہا کرتے تھے کہ ان کی باتوں کے سننے کا موقع ہی کہاں ہے۔ جو ایسے لوگوں کا جواب دیا جائے۔ ان کی یہ سب سے بڑی خوبی تھی۔ اپنے کام سے کام تھا۔ ہر وقت ملت کا مفاد، ہر وقت قومی خدمت کا جذبہ انھیں سارے ملک میں لئے لئے پھرتا تھا۔ انھیں اسی خدمت میں سارا لطف زندگی حاصل ہوتا تھا۔ نہ اس پر انھوں نے کبھی فخر کیا، نہ اُسے اپنی طرف منسوب کیا، بلکہ ہمیشہ جمعیۃ علماء کی کارکردگی بتائی۔ نہ فخر تھا نہ کسی پر طنز تھا۔ ہر شخص کے درد میں شریک۔ ہر شخص کی مشکلات میں فکرمند۔ اور پوری قوم وملت کے لئے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ وقف، حد یہ ہے کہ جب بستر علالت پر تھے۔ بیماری بھی سنگین ہوچکی تھی اور ہر شخص آپ کے لئے فکرمند تھا۔ صحت وتندرستی کی دعا کرتا تھا مگر خود آپ کی آخری تمنا یہ تھی کہ کاش وہ ملت کو خوش حال دیکھ سکتے۔ کچھ کام کیا تھا اور بہت کچھ باقی ہے اسے کون پورا کرے گا۔ دریافت حال کرنے والوں سے پوری سنجیدگی اور اطمینان سے کہتے تھے کہ موت اور زندگی پر کسی کا بس نہیں ہے اور نہ انھیں کسی اور بات کی فکر ہے اگر کوئی چیز ہے تو صرف یہ کہ قوم اور ملت کا سکون اس کی خوش حالی۔ اپنی فکر نہ تھی۔ اپنے تیمار داروں کے سامنے یہی کہتے کہ انسانیت تباہ نہ ہو۔ ملت کا شیرازہ منتشر نہ ہو اتحاد اور یک جہتی پیدا ہو۔ بتایئے کہ ان کی اس آخری آرزو کو پورا کرنے والا کون ہے بجز ذات خدا کے کہ وہی مولانا علیہ الرحمۃ کا کوئی نعم البدل پیدا کرے اور وہ ان کے ادھورے کام کی تکمیل کرے۔

مجھے اس عظیم انسان کی خدمت میں عرصہ سے نیازمندی حاصل تھی، تقسیم سے پہلے نہ جانے کتنی مرتبہ جمعیۃ علماء ہند کی مجالس اور کانفرنسوں میں طلب فرمایا جاتا اور میں ایک اخباری نمایندہ کی حیثیت سے ان مجالس میں شریک ہوتا اور پھر ایسا محسوس ہوتا کہ جیسے مولانا محترم کی مہربانیوں کا مرکز تنہا میں ہی ہوں اور ایسے موقع پر اور دو چار اخباری نمایندوں کی موجودگی سے مولانا کی خواہش ہوتی کہ ایک "نیشنلسٹ پریس" بھی ہونا چاہئے۔ اس لئے کہ آپ کو ہمیشہ سے فرقہ پرستی سے نفرت رہی۔ مولانا کی تحریک پر ایک نیشنلسٹ صحافتی ادارہ کی تشکیل پہلے پہل جمعیۃ علماء سہارنپور کی ایک کانفرنس میں ہوئی تھی اور ان کی بے پایاں نوازش کی بدولت ملک کے ایسے اکابرین سے ملنے کا موقع ملا جنھوں نے ہمیشہ برطانوی سامراج کے خلاف انقلابی تحریکات میں حصہ لیا تھا۔ میں نے ان کے خیالات سنے معلوم کئے اور اپنے قلب میں ایک سکون سا محسوس کیا۔ تقسیم ملک کے بعد

تو میں مولانائے محترم سے اور بھی قریب ہوگیا تھا۔ اس لئے کہ اجتماعی زندگی کے سینکڑوں ایسے مسائل تھے جن میں ان کی رہنمائی اور مشورہ کے بغیر قدم اٹھانا مشکل تھا۔ چنانچہ میں اکثر خدمت میں حاضر ہوتا رہتا۔ کبھی اپنی ضرورت دلّی لے جاتی کبھی ان کا طلبیہ ہوتا۔ تقسیم ملک سے پریشانی اور اِدھر سے اُدھر آبادی کے تبادلے نے تو ایسا ہولناک دور پیش کردیا تھا کہ خدا کی پناہ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہر شخص میدان حشر میں ہے۔ اس پریشانی اور انتشار سے نہ ہندو بری تھا نہ مسلمان لیکن مسلمانوں پر قدرتاً اس کا بہت زیادہ اثر تھا اور ان میں ایک حد تک زبردست جمود پیدا ہوگیا تھا۔ کوئی شخص بھی اپنے مستقبل کے متعلق کوئی صحیح فیصلہ نہ کرسکتا تھا۔ دلّی میں جو عالم پریشانی اور انتشار کا تھا آج اس کے بتانے کی ضرورت نہیں۔ چاروں طرف ہولناک اور بھیانک منظر، انسان ہی نہیں تباہ ہو رہا تھا بلکہ انسانیت برباد ہو رہی تھی۔ اور یہ سب کچھ انسانوں ہی کے ہاتھوں ہو رہا تھا۔ اور ایسا وقت بھی آگیا تھا کہ جب شہید قوم مہاتما گاندھی نے مولانا سے کہا "مولانا اب میں آپ کی کوئی مدد نہیں کرسکتا۔ آپ کوئی راستہ اپنے لئے خود پیدا کیجئے" اس وقت مجاہد ملت نے انھیں جواب دیا "آپ میرے لئے فکرمند نہ ہوں، میرا بھروسہ خدا پر ہے۔ آپ اپنی حکومت کو متوجہ کیجئے کہ دنیا میں اس کے متعلق کیا کہا جائے گا" اور بس۔ اور پھر اس ہولناک دور میں کون تھا کس نے اپنی جان کی بازی لگائی۔ کس نے سر سے کفن باندھا۔ دن کا آرام اور رات کی نیند اپنی کس نے حرام کی۔ کس نے اکھڑے ہوئے قدموں کو روکا۔ کس نے جلتے ہوئے گھروں کی آگ بجھائی کس نے گرتے ہوؤں کو اٹھایا اور سہارا دیا۔ دلّی میں سبھی موجود تھے۔ ان کے موافقین تو ان کے ساتھ ہی تھے۔ البتہ ان کے مخالفین کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ مسلمانوں کی قیادت کا زبردستی دم بھرنے والے خدا اور رسول کے نام پر اپنا فائدہ اٹھانے والے معلوم نہیں اس وقت کس تہ خانہ میں چھپے ہوئے تھے۔ جمعیۃ پر نکتہ چینی کرنے والے اور دوسری جماعتیں سبھی موجود تھیں۔ لیکن ان میں سے کون نکل کر باہر آیا۔ کس نے اپنا سر ہتھیلی پر رکھ کر لوگوں کی خدمت کی۔ وہ صرف مولانا حفظ الرحمٰن تھے۔ ان تمام واقعات پر جب اطمینان کے ساتھ لکھنے والا لکھے گا تو ان کی خدمات پر روشنی پڑسکے گی۔ اور جب یہ سب کچھ ہوچکا اور دلّی میں فتنہ و فساد کی آگ سرد پڑچکی اور دلوں کی بھڑاس نکل چکی تو پھر ہندوستان کے مسلمانوں کے اور مسائل سامنے تھے جو یہاں رہ گئے تھے یا جو واپس آرہے تھے۔ ان کے مکان اور جائیدادوں کا سوال تھا۔ ان مسائل کا حل کرنا ان کے سوالوں کا جواب لینے والا بھی ایک انسان تھا۔ یہ موقع ان واقعات کے بیان کرنے کا نہیں ہے جو میں نے ان کی زبان سے سُنے بلکہ دوسروں کی آنکھوں دیکھی بہت سی باتیں ایسی ہیں جن کے متعلق لوگوں کو علم نہیں۔ مگر ان سے مولانا کی بلندی اور ان کے کردار کی پختگی کا پتہ چلتا ہے۔ انھیں مہاتما گاندھی، پنڈت جواہر لال نہرو اور ان کی حکومت کا بھی اعتماد حاصل تھا اور یہ حضرات مولانائے محترم کو خود بھی اپنا معتمد سمجھتے تھے۔ دوسری طرف عام مسلمانوں کے علاوہ لٹے پٹے پناہ گیروں نے بھی اپنی مشکلات میں مولانا کی رہنمائی حاصل کی تھی۔ مولانا نے اگر ایک طرف میواتی مسلمانوں کے مسائل سے حکومت کو آگاہ کیا تو دوسری طرف دلّی کے مسلمان اور ان مسلمانوں کے مسائل کی طرف بھی توجہ دلائی جو پریشانی کے عالم میں بھاگ گئے تھے اور اب پھر واپس آرہے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ فرقہ پرستی کے اس بحران میں جو تقسیم کی بنیاد بنی تھی اور اس دور کے کتنے ہی مسلمان مولانا کی ذات پر کتنے رکیک حملے کرچکے تھے۔ تقسیم کے بعد شرمندہ اور شرمسار مولانا کی خدمت میں اپنی پریشانیوں کو لے کر حاضر ہوتے اور مولانا سے اپنے درد کی دوا مانگتے تھے۔ لیکن اس نیک نفس انسان کے چہرے پر کسی قسم کی علامت نفرت یا حقارت کی نہیں پیدا ہوتی تھی بلکہ خندہ پیشانی سے ان کے مسائل، ان کی باتیں سنتے، انھیں تدابیر بتاتے اور خود ہی کھڑے ہوجاتے کہ وہ ان کی خدمت کریں گے۔

ملک کی تقسیم کا اثر سارے ملک پر تھا نہ ہندو اس سے بری تھا اور نہ مسلمان۔ ہر چھوٹے بڑے شہر میں کچھ نہ کچھ پریشانی پیدا ہوئی۔ لیکن لکھنؤ ان خوش قسمت شہروں میں ہے جہاں عوام و خواص کی جدوجہد، کانگریس کے رہنماؤں اور حکومت کے ذمہ داروں کی حکمت عملی سے یہاں کسی قسم کے ہولناک واقعات پیش نہیں آئے۔ پھر بھی عام طور پر لوگ پریشان تھے اور خاص طور پر مسلمان بے حد خوف زدہ ہراساں ہی نہیں بلکہ ایک زبردست جمود سے دوچار تھا اسی دور میں انجمن فردوس ادب نے یوم عید میلاد النبیؐ کی تقریب کا آغاز کیا۔ یہ تقریب اس سے پہلے امین آباد میں ہوتی تھی۔ لیکن تقسیم نے ایسا ماحول بنا دیا تھا کہ کوئی اٹھتا ہی نہیں تھا۔ خدا کا نام لے کر ہمارے ساتھ اور کارکنان اٹھے اور انھوں نے اس تقریب کا اعلان کردیا۔ ہر طرف مسلمانوں نے اس کا خیر مقدم کیا۔ اس تقریب میں سیرت رسولؐ پر تقریر، ایک مشاعرہ نعت اور صبح ہوتے ذکر ولادت اور درود و سلام پر تقریب کا اختتام یہ پروگرام بنایا گیا انجمن کے ممبران کے وفود شہر کے گوشے گوشے میں دوڑے اور ہر ہندو مسلمان کو شرکت کی دعوت دی، مگر فکر یہ تھی کہ اس تقریب میں کسی ایسے مقرر کو بلایا جائے جو سیرت پاک پر ایسے انداز میں تقریر کرے جس سے ایک طرف مسلمان سکون حاصل کریں دوسری طرف تمام شرکاء ایک اثر لے کر اٹھیں ــ ہماری نگاہیں مولانائے علیہ الرحمۃ کی طرف گئیں۔ کیونکہ امین آباد میں بھی پچھلے دور میں آپ تقریریں کرچکے تھے اور لوگ بے حد متاثر تھے۔ اس وقت ہم مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے اگرچہ یہ دور آپ کی بے حد مصروفیت کا تھا سینکڑوں مسائل

کسٹوڈین کے معاملات، دلی اور دوسرے مقامات کے مسلمانوں کے مختلف مسائل کا پورے عزم سے مقابلہ کررہے تھے اور جب بھی میں ان کی خدمت میں پہنچا ہندوستان بھر کے مختلف گوشوں کے وفود دفتر جمعیۃ میں موجود ہوتے۔ مگر میں مولانا کے سامنے بیٹھ جاتا تو پھر کبھی وہ میری دعوت کو رد نہیں کرتے تھے حالاں کہ میں نے دیکھا کہ انھیں ملک کے دور دور مقامات کے پروگراموں میں ترمیم و تنسیخ کرنا پڑتی۔ اور میری دعوت کو شرف مل جاتا اور یہ سلسلہ گزشتہ دس سال سے برابر جاری تھا۔ مولانا لکھنؤ کی اس تقریب میں شرکت کرنے پر خوشی محسوس کرتے اور عام طور پر لوگوں سے بھی کہتے کہ لکھنؤ میں جیسی یہ تقریب ہوتی ہے میں نے کہیں نہیں دیکھی۔ ہزاروں انسانوں کا پرہجوم اجتماع اور اس قدر پرسکون اور سنجیدہ۔ اور بار بار میری درخواست پر ربیع الاول کی گیارہ اور بارہ کی رات کے لئے لکھنؤ تشریف لاتے اور جب تک یہ سلسلہ رہا انھوں نے ایک پیسہ بھی انجمن کا قبول نہیں کیا۔ حالاں کہ اکثر آپ کو دور دراز سفر سے لکھنؤ پہنچنا پڑتا۔ اکثر ایسا بھی ہوا کہ انتہائی مجبوری کی بدولت حاضر نہیں ہوسکتے تھے تو کوئی دوسرا انتظام بھی کردیتے تھے۔ اب میں کیا کہوں، گزشتہ سال بھی جب وہ بستر علالت پر تھے میں اس موقع پر حاضر ہوا تھا اور یہ اُن سے آخری ملاقات تھی۔ ان کے قریب تیمار داروں کا مجمع، ان سے ملنے والوں کا اجتماع امریکہ سے علاج کے بعد واپس آچکے تھے۔ میں حسب معمول خدمت میں حاضر ہوا۔ ایسے نازک وقت میں میں خود کیا کہہ سکتا تھا۔ وہ خود ہی دریافت حال فرماتے رہے۔ میرے اوپر کتنا گہرا اثر تھا۔ میں یہ سمجھتا تھا کہ امریکہ میں علاج سے کوئی خاص فائدہ ہوا ہوگا اور چند ہی روز میں پورے طور پر صحت یاب ہوجائیں گے لیکن میں نے کیا دیکھا۔ مولانا نے خیریت پوچھی، میں نے جواب دیا اور زبان سے صرف اتنا ہی کہہ سکا کہ ہم سب لوگ خدا سے دعا کررہے ہیں۔ لیکن میں نے دیکھا کہ ہر چہرہ پر افسردگی اور ہر آنکھ میں نمی تھی اور جس دن کے ملنے کی سب لوگ دعائیں کررہے تھے۔ ہونے والی بات ہوکر رہی مشیت کے سامنے سب بے بس ہوگئے اور پھر لکھنؤ آکر یہ خبر سنی کہ مجاہد ملت نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ یہ خبر کتنی تکلیف دہ تھی۔ آج جب میں ہر طرف اپنے خیال کو دوڑاتا ہوں اور اپنے اردگرد دیکھتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ اس نوع کی درخواست اب کس کے سامنے پیش کی جائے گی اور کون مہربانیوں کے ساتھ اس کا حسب منشا جواب دے گا۔ اللہ تعالیٰ مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن کی روح کو سکون عطا کرے۔ انھوں نے لاکھوں انسانوں کے سکون کا انتظام کیا۔ نہ جانے کتنے پریشان حالوں کے لئے وہ فکرمند رہے۔

تقسیم ملک کے بعد انھیں نہ معلوم کتنے خوش و ناخوش حالات میں گزرنا پڑا کتنی دشوار منزلیں ان کے سامنے آئیں۔ مگر انھوں نے ایک حقیقی مجاہد کی طرح بہادری سے مشکلات کا مقابلہ کیا۔ وطن عزیز کے لئے قربانیاں کیں۔ اتحاد اور یک جہتی کے لئے بڑی صبر آزما راہوں سے گزرے۔ ملک میں کہیں بھی فساد ہوتا اور لوگ اخباری بیان دیتے اور وہ خود وہاں پہنچ جاتے اور روک تھام کی تدابیر اختیار کرتے۔ مسلمانوں کی آواز ایوان حکومت تک پہنچاتے۔ ایک بڑی باعزم شخصیت تھی جس نے باوجود ہزاروں بدنامیوں کی مخالفتوں کے دلی میں آل انڈیا مسلم کنونشن کرکے سیاست کے پلیٹ فارم سے اتحاد اور یک جہتی کا نعرہ دیا۔ حکومت اور قوم کے واسطے ایک متوازن پروگرام پیش کیا۔ افسوس اس کے نتائج کا دیکھنے والا وہ مجاہد ملت نہیں ہے۔ مگر ان کی عملی زندگی آنے والی نسلوں کے لئے شمع ہدایت کا کام کرے گی اور ہمیشہ ان کے کردار سے سبق لیتی رہیں گی۔ ان کے بتائے ہوئے راستے سامنے ہیں۔ ان کی قیادت ایک ایسی روشنی تھی جس سے ہم ہمیشہ فائدہ اٹھاتے رہیں گے۔

سنہ ۱۹۴۶ء کی یاد

مولانا عبد الحمید الاعظمی

سنہ ۱۹۴۶ء کا واقعہ ہے، جگہ جگہ فرقہ وارانہ فسادات کے شعلے بھڑک رہے ہیں۔ وطن عزیز کی فضا، حد درجہ ناخوشگوار ہو چلی ہے، قوم پرور مسلمانوں پر طرح طرح کی یورشیں ہیں اور ان کے لئے اپنے نظریات پر قائم رہنا آگ کے انگاروں کو پکڑنا ہے۔ نواکھالی میں فرقہ وارانہ فساد ہو گیا ہے اس سلسلہ میں ملک کے بعض ذمہ داروں کے غیر ذمہ دارانہ اور مبالغہ آمیز بیانات سے اس کے اثرات غلط اور گمراہ کن انداز میں دور دور تک پھیل چکے ہیں۔ گاندھی جی امن کا پیغام لے کر نواکھالی جا چکے ہیں کہ اتنے میں مسلمانان بہار کو سخت ترین آزمائش میں مبتلا ہونا پڑا اور اس کے اضلاع پٹنہ، مونگیر، بھاگلپور، اور گیا وغیرہ میں شدید قسم کا فرقہ وارانہ فساد برپا ہو گیا، کئی ہزار مکانات جلائے گئے۔ بے شمار خانۂ خدا مسمار کئے گئے۔ شہیدوں اور مقتولین کی صحیح تعداد کا تو اندازہ لگانا بھی دشوار ہے، ہزاروں زخمی اسپتالوں اور ریلیف کیمپوں میں پڑے ہیں، مسلمان بے گھر اور بے در نظر آرہا ہے اور اس کو محسوس ہو رہا ہے کہ آج آزادی کے ساتھ اپنے علاقہ میں چلنا پھرنا دشوار ہے مختلف جماعتوں کے رہنما اور رضا کار ریلیف اور بحالی امن کے لئے میدانِ عمل میں سرگرم ہیں۔ فساد کی خبر پاتے ہی دو ہی تین دنوں کے بعد عارضی حکومت (انٹریم گورنمنٹ) کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو اور مسلم لیگی وزیر سردار عبد الرب نشتر مرحوم فساد زدہ علاقہ کا مشترکہ دورہ کر چکے ہیں مشہور رہنما خان عبد الغفار خاں سرحدی گاندھی بھی اپنے چند رفقاء کے ساتھ مظلوموں کی خدمت کے لئے سرحد سے بہار آچکے ہیں جمعیۃ اور احرار کے باضابطہ کیمپ قائم ہیں، جمعیۃ علماء ہند کا ایک وفد موجودہ ناظم اعلیٰ حضرت مولانا محمد میاں صاحب کی قیادت میں فساد زدہ علاقہ کا دورہ کر کے حالات کا سرسری جائزہ دے چکا ہے۔ گاندھی جی کو نواکھالی میں بہار کے اس حادثۂ عظیم کے بارے میں سرکاری اور غیر سرکاری دونوں ذرائع سے طرح طرح کی اطلاعات مل رہی ہیں۔ راقم الحروف ان دنوں جمعیۃ کے ریلیف آفس کا خادم تھا مولانا منت اللہ صاحب رحمانی نے اخباری بیان کی ایک نقل اپنے عریضہ کے ساتھ گاندھی جی کی خدمت میں نواکھالی بھیج کر ان سے درخواست کی کہ آپ کو بہار آکر حالات پر قابو پانے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

چنانچہ گاندھی جی نے نواکھالی سے بہار آکر قیام امن کے لئے اپنی مہم شروع کر دی میں نے گاندھی جی کو اردو زبان میں خط لکھا تھا اس لئے انہوں نے مجھ کو اردو ہی میں حسب ذیل جواب دیا دستخط خود مہاتما جی کے اردو میں اپنے لکھے۔

رام گنج نواکھالی

۱۴-۲-۴۶ء

بھائی عبد الحمید اعظمی صاحب!

آپ کا خط اور اخباری بیان کی نقل مجھے ملی۔ آپ جو لکھتے ہیں وہ سب ٹھیک ہے تو میرے لئے بہت سوچنے کے لائق بات ہو گی۔ لکھ کر آپ نے مجھ پر احسان کیا ہے اتنا تو آپ جانتے ہیں نا کہ میں نے بہار گورنمنٹ کو صلاح دی ہے کہ بہار میں جو کچھ ہوا ہے اس کے بارے میں تحقیقاتی کمیشن مقرر کرنی چاہیئے۔

آپ کا

م۔ک۔ گاندھی

اس سے اندازہ کیجئے کہ بہار کے حالات کتنے سنگین تھے اور یہاں خدمت کا میدان کس قدر وسیع اور کتنا پرخطر رہا ہو گا۔

مجاہد ملت کی تشریف آوری

ان ہی حالات میں مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب ناظم اعلیٰ جمعیۃ علماء ہند اپنے چند رفقاء جمعیۃ کے ساتھ صوبہ بہار تشریف لائے اور سب سے پہلے پٹنہ میں بہار گورنمنٹ کے وزیر اعلیٰ اور وزیر مالیات وغیرہ سے ابتدائی ملاقات کے بعد بہت تفصیل سے فساد زدہ علاقہ کا دورہ کر کے اصل حالات کو براہ راست معلوم کرنا ضروری سمجھا اس دورہ میں تقریباً ایک ہزار میل کی طویل مسافت حضرت مرحوم نے طے فرمائی جمعیۃ علماء بہار کے محترم صدر مولانا نور اللہ صاحب مستقل طور پر اور موجودہ امیر شریعت بہار مولانا منت اللہ صاحب کہیں کہیں شریک سفر رہے۔ مجاہد ملت نے مجھ خادم کو فساد کی رپورٹ مرتب کرنے، خاص کر جانی اور مالی نقصانات کا صحیح اندازہ لگانے اور اس ذیل کے اعداد و شمار جمع کرنے کے لئے اپنی ہمرکابی میں رکھا اس طرح جہاں فساد سے متعلق مجھ کو ہر قسم کی معلومات حاصل ہوئی وہیں

میں نے حضرت مجاہد ملت کی انتہائی جرأت، بے باکی اور اعتماد علی اللہ کے مشاہدات کے ساتھ مظلوموں کے ساتھ بے پناہ ہمدردی اور شفقت و محبت کے نہ جانے کتنے واقعات دیکھے۔ آج جبکہ حضرت مرحوم اللہ تعالیٰ کو پیارے ہو چکے ہیں ممکن ہے کہ ان واقعات کی اشاعت سے ہمیں اپنی زندگی بنانے کا موقع ہاتھ آجائے۔ یہ چند سطریں اسی جذبہ کے ماتحت لکھی جا رہی ہیں۔

خدا پر بھروسہ اور مخلوق خدا کی خدمت

اس سفر سے پہلے نہ جانے کتنی بار میں نے قرآن پاک کی یہ آیت پڑھی تھی:۔

ان الذین قالوا ربنا اللہ ثم استقاموا تتنزل علیهم الملائکة ان لا تخافوا ولا تحزنوا الخ

پارہ ۲۴ رکوع ع۔

لیکن یہ کیسے عرض کروں کہ فساد زدہ علاقہ میں جہاں خطرہ ہی خطرہ تھا نہ پولیس ہے، نہ کوئی غیر مسلم رہنما اور نہ رضا کار ساتھ ہے صرف خدا پر بھروسہ ہے اور مظلوموں سے ملاقات اور ان کی خدمت کا جذبہ حضرت مولانا کی جرأت بے خوفی اور اعتماد علی اللہ کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ آیت مذکورہ بالا کی عملی تفسیر آج ہی سامنے آگئی ہے حضرت مجاہد ملت جب پُر خطر راستوں سے پورے اطمینان کے ساتھ گذر کر فساد زدہ بستی میں پہونچتے تو ہر جگہ مظلوم مسلمانوں کو صبر و استقامت کی تلقین فرماتے ہوئے عجیب ناصحانہ انداز میں فرماتے:۔

میں نے آپ کی تباہیوں اور بربادیوں کے بھیانک نقشے دیکھے ہیں۔ شہداء کی لمبی لمبی قبریں اور ان کی لاشوں کی بچی کھچی ہڈیاں اور ان کے کہیں کہیں ڈھانچے بھی دیکھے گئے ہیں۔ آپ کے جلے اُجڑے ہوئے مکانات اور ان کے ملبے تو میرے سامنے ہی ہیں یقیناً آپ کے لئے طرح طرح کی پریشانیاں ہیں اور ہمارے سامنے بھی بہت سے نئے سوالات آگئے ہیں مگر دیکھو! خدا زندہ ہے وہ سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ اس کی حکومت میں دیر تو ہو سکتی ہے اندھیر نہیں ہو سکتا۔ بس خدا پر پورا بھروسہ کرتے ہوئے اپنی جگہ پر پہاڑ کی طرح جمے رہو، اور اپنی نیک عملی، بلند اخلاقی اور پاکیزہ زندگی کے صاف اور ستھرے پانی سے نفرت اور عداوت کے ان بھڑکتے ہوئے شعلوں کو بجھانے کی کامیاب کوشش کرو۔ یاد رکھو! ہندوستان ہمارا وطن ہے ہمیں اس کی خاک سے بھی محبت ہے۔ ہم اپنے وطن میں اپنے پیروں پر کھڑے ہو کر عزت سے رہیں گے ورنہ شہادت کو گوارہ کریں گے۔ اس طرح کے حالات سے گھبرا کر وطن سے بھاگنا گوارہ نہ کریں گے۔ میں امداد و بحالیات کے بارے میں گورنمنٹ کو توجہ دلاؤں گا کہ وہ اپنی ذمہ داری کو محسوس کرے۔ ہماری جماعت بھی جان کی بازی لگا کر آپ کی مدد کرے گی حضرت مولانا کی اس دلنشیں اور مؤثر تقریر کے بعد ہم نے ان مسلمانوں کو یہ کہتے ہوئے سُنا جن کے خاندان اُجڑ گئے تھے اور ایک ایک گھر کے آٹھ آٹھ دس دس افراد شہید کر دیئے گئے تھے:۔

کہ حضرت مولانا! ہم آپ کی نصیحتوں پر عمل کریں گے۔ آج بھی ہمیں اپنے گاؤں کے کتے دوسرے گاؤں کے کتوں سے زیادہ پیارے لگتے ہیں، آپ کی تشریف آوری سے ہماری بڑی ڈھارس بندھ گئی ہے ہمارے مکانات جلد بنوا دیئے جائیں تاکہ ہم گرمی، سردی اور بارش سے محفوظ رہ سکیں۔

مجاہد ملت کی غضب ناکی اور ہماری انتہائی بے بسی

غالباً سفر کا تیسرا یا چوتھا دن تھا پٹنہ، بھاگلپور اور مونگیر کے اضلاع کا تفصیلی دورہ ختم کرنے کے بعد اب ہمیں ضلع گیا کی سرحد میں داخل ہونا تھا سورج غروب ہو رہا تھا اور رات بھی غالباً اندھیری تھی بعض مقامی کارکن جو راستہ بتلانے کے لئے شریک سفر ہو گئے تھے انہوں نے چپکے سے کہا:۔

اب جہاں چلنا ہے وہاں کا راستہ بہت خطرناک ہے
بغیر پولیس کی مدد کے جانا مناسب نہیں ہے۔

بس اب کیا تھا، ان کلمات کو سنتے ہی حضرت مجاہد ملت کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ مقامی کارکنوں کی طرف مخاطب ہونے کی بجائے کہ ان سے مولانا کا تعارف نہیں تھا مجھ خادم کی طرف انتہائی غصہ آمیز لہجہ میں فرمایا:۔

اعظمی صاحب! تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ میں نے تین دن سے آپ کے بہار میں منافقانہ تقریریں کی ہیں یعنی میں برابر مسلمانوں کو یہ کہتا آرہا ہوں کہ خدا پر بھروسہ کرو، جرأت اور بہادری کے ساتھ اپنی جگہ جمے رہو اور جب میری باری آئی ہے تو پولیس کا سہارا لیا جا رہا ہے۔ میں اس بزدلی کا قائل نہیں ہوں۔ ان لوگوں سے کہہ دیجئے کہ یہ اپنا راستہ لیں ہم لوگ وہاں چلیں گے، موت لکھی ہوگی تو خندہ پیشانی سے اس کا استقبال کریں گے۔ ہم اس موقع پر پولیس کی مدد ہرگز نہیں لیں گے۔ سچ ہے کہ دو ایک آدمی کی بزدلی پورے قافلہ کو نکما بنا دیتی ہے۔

تب ان مقامی حضرات کو چھوڑ کر ہمارا قافلہ کچھ دور آگے بڑھا اب دیہات میں جانے کا راستہ کون بتائے۔ مولانا کی فوجی جیپ گاڑی کا ڈرائیور خود دوسرے صوبہ کا آدمی تھا۔ ہم سب ہی لوگ راستہ سے ناواقف، چاروناچار افسوس کے ساتھ واپس آنا پڑا۔ حضرت مولانا پر اس واقعہ کا بہت گہرا اثر تھا صدمے سے چور تھے غصہ اتر نہیں رہا تھا مگر انہیں ہم لوگوں کی مجبوری بھی معلوم تھی بہت

دیر تک ساکت اور صامت بیٹھنے کے بعد دریافت فرمایا۔

خیر جو کچھ ہونا تھا ہوا۔ یہ تو بتلاؤ یہ رات کہاں گذاری جائے گی عرض کیا گیا کہ چند میل پر نوادہ سب ڈویژن آرہا ہے وہاں ڈاک بنگلہ ہے وہاں قیام کیا جائے تو اچھا ہے مسکرا کر فرمایا! بھئی پیٹ بھر کھانا کھانے اور رات بھر سونے کے لئے اچھی جگہ کا انتخاب کیا گیا ہے۔ یاد رکھو! آج کی رات میں حفظ الرحمٰن کے لئے سونا تو کیا مجھ کو حق نہیں کہ میں آج رات کو کھانا کھا سکوں یقین فرمایئے کہ بڑی مشکل سے حضرت کو رات میں کھانا کھلایا گیا۔ اس واقعہ سے تمام رات مولانا کو بے چینی رہی اور بار بار یہی فرماتے رہے کہ افسوس کہ اگلے پروگرام کی وجہ سے اب اس جگہ جانے کی کوئی شکل نہیں بن رہی ہے۔

حضرت مولانا کو اس سفر میں جہاں کہیں یہ خبر ملتی کہ فلاں غیر مسلم بھائی نے کچھ مسلمانوں کو اپنے گھر میں پناہ دی ہے اور ان کی حفاظت کے لئے اپنے کو خطرہ میں ڈال دیا ہے تو مولانا اس شریف انسان سے ملنے کے لئے بے چین اور بیقرار ہو جاتے اور فرماتے کہ اس کے گھر چل کر نہ صرف ملنا بلکہ اس کا شکریہ ادا کرنا ضروری ہے۔

فسادزدہ علاقہ میں باوضو رہنے کی تلقین

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب جیسے سیاسی رہنما کی ظاہری زندگی کو دیکھ کر بعض لوگوں کو یہ شبہ ہوتا تھا کہ مولانا مستحبات کی طرف زیادہ توجہ نہیں دیتے ہوں گے۔ لیکن میں نے اس دورہ میں اور بعض دوسرے مواقع میں حضرت مولانا کو اس کے بالکل برعکس دیکھا۔

بہار کے اس فساد میں مونگیر ضلع میں سقاوہ تاراپور کے حالات بہت ہی دردناک تھے جب علاقہ کی ایک کوٹھری میں تین سو لاشوں کے ڈھیر کا اندوہناک واقعہ پیش آیا تھا اسی علاقہ کی بات ہے کہ ایک جگہ معلوم ہوا کہ کھیتوں میں اب تک لاشوں کی ہڈیاں نظر آرہی ہیں اور اس کا سلسلہ سامنے پہاڑی تک تقریباً ۳/۴ فرلانگ تک چلا گیا ہے حضرت مولانا نے مجھ کو ساتھ لیا اور سڑک پر گاڑی چھوڑ کر بڑی تیزی سے کھیتوں کی اونچی اونچی مینڈوں کو پھاندتے ہوئے بات کی بات میں متعلقہ مقام تک پہونچ گئے۔ میری جوانی کا عالم تھا۔ پیدل چلنے کا میں عادی بھی تھا مگر مجھ کو مولانا کے پیچھے باضابطہ

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب اور میں

(مولانا شرافت علی سیوہاروی فاضل دیوبند)

۱۹۲۱ء میں جبکہ سیوہارہ میں خلافت کمیٹی کا بڑا جلسہ ہوا تھا اسکی کچھ دھندلی سی یاد مجھے اب بھی باقی ہے ـــــ اس وقت مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی (علی برادران) کی قیادت و سیادت کے شباب کا دور تھا۔ بیسیوں عورتوں نے اپنے بچوں کے نام شوکت علی اور محمد علی رکھے ـــــ بچے بچے کی زبان پر تھا:-

کہہ رہی ہیں، یہ اماں محمد علی کی ـ
جان بیٹا خلافت پہ دے دو

سیوہارہ کے اس جلسہ کے روحِ رواں مولانا بشیر بھٹہ تھے۔ اس وقت میری عمر مشکل سے آٹھ، نو سال کی ہوگی۔ سمرنا اور بروصہ کے فتح ہونے اور کمال اتاترک مرحوم کی سرگرمیوں کے تذکرے سُنا کرتا تھا۔ لیکن جانتا نہ تھا کہ یہ کیا چرچے ہیں اور کیوں ہو رہے ہیں۔ البتہ ہلالی نشان کا ایک سبز پرچم ہر وقت میرے ساتھ ضرور رہتا تھا۔

بہت سی شخصیتیں نگاہوں کے سامنے آتی تھیں اور گزر جاتی تھیں، یہ وقت تھا جب مسلمانوں میں لیڈر شپ کے خانہ میں قحط الرجال نہ تھا، بہت سے لیڈر تھے، لیکن اس بہتات کے باوجود اپنی نظر جس شخصیت پر جا کر جمتی تھی، وہ مولانا حفظ الرحمٰن کی ذات گرامی تھی۔

لانبا قد، چھریرا بدن۔ جاذب نظر چہرہ۔ دلکش آواز۔ مخصوص اندازِ بیان۔ انوکھا لب ولہجہ۔ دورانِ تقریر میں جب کوکھ پر ہاتھ رکھ کر کھڑے ہوتے تھے تو کمر میں بل پڑ جاتا تھا۔

بس میری نگاہ انتخاب، عالموں۔ صوفیوں۔ لیڈروں ـــ مقتداؤں اور رہنماؤں کے انبوہ کثیر میں کسی پر جا کر جمتی تھی تو وہ یہی انوکھی شخصیت تھی، جو اس وقت نہ ناظم عمومی تھی، نہ ایم ایل اے نہ ممبر پارلیمنٹ، نہ مجاہد ملت۔ نہ مولانا۔ بلکہ صرف مولوی حفظ الرحمٰن ـــ مگر

بالائے سرش زہوشمندی
می تافت ستارۂ بلندی

مجھے خوب یاد ہے۔ میں بچوں کی محفل میں بھی اور یکہ وتنہائی کی حالت میں بھی مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی چال ڈھال۔ اندازِ گفتگو۔ طرزِ ادا۔ اور لب ولہجہ کی نقالی کیا کرتا تھا۔ اگرچہ نسبت چراغ سحر اور نور آفتاب جیسی بھی نہ تھی، لیکن طبیعت ان کی نقالی کی جانب نہ معلوم کیوں راغب تھی کچھ کہہ نہیں سکتا۔

پھر میں مقامی مدرسہ اسلامیہ فیض عام سیوہارہ میں تعلیمی مشاغل میں لگ گیا اور مولانا ملک کی سیاسی و مذہبی رہنمائی کی بلندیوں میں مصروف پرواز ہو گئے۔ مگر مجھے یاد ہے کہ مولانا جب بھی سیوہارہ تشریف لاتے تھے، ضرور تقریر کیا کرتے تھے۔ اپنا خاندان اور محلہ چھوڑ کر زیادہ وقت ہم لوگوں ہی میں بسر فرمایا کرتے تھے۔ مدرسہ فیض عام کے مہتمم حضرت مولانا الحاج حافظ احمد حسن صاحبؒ مولانا کے خاص شفیق استاد تھے اور بہت محبت کرتے تھے اور مدرسہ کی شورائی مجالس میں بھی مولانا کو ذی رائے، صائب ہونے کی بنا پر شریک کیا کرتے تھے حالانکہ سب ہی لوگ عمر میں مولانا سے بڑے تھے کوئی ایک بھی ہم عمر نہ تھا۔ مدرسہ فیض عام کی مجلس شوریٰ میں جب کوئی تجویز ہو جاتی تھی تو حضرت حافظ صاحب موصوف مولانا ہی کے حوالہ کیا کرتے تھے اور شفقت بھرے انداز میں فرمایا کرتے تھے، حفظ الرحمٰن، تم تفصیل سے سب کو سمجھا دو۔ کون جانے جو مٹھاس اور خالص محبت کے سوتے ان سیدھے سادے الفاظ سے پھوٹتے تھے، وہ آج مولانا۔ مولوی۔ حضرت۔ قبلہ۔ محترم۔ مکرم۔ کسی بھی لفظ میں محسوس نہیں کئے جا سکتے۔

مولانا مدرسہ فیض عام سیوہارہ کی تعلیم و تربیت، یہاں تک کہ دورۂ حدیث شریف سے بھی فراغت پاکر ملک کی واحد دینی درسگاہ دارالعلوم دیوبند کی جانب متوجہ ہوئے۔ جہاں اس وقت علوم اسلامیہ کا خورشید

خاور اپنی پوری تابناکیوں کے ساتھ جلوہ افروز تھا۔ یہ تھی ذاتِ گرامی حضرت علامہ مولانا انور شاہ صاحب کشمیریؒ کی۔

حضرت کے جلال کا یہ عالم تھا کہ دورانِ درس میں بہت کم لوگوں کو بولنے کی جرأت ہوا کرتی تھی۔ کیونکہ حضرت موصوف مہمل اور سبک سوالات کے جوابات سے قصداً گریز فرمایا کرتے تھے۔ جس پر طالب علم کو بہت خفت ہوتی تھی۔ بہت کم طلبہ بولنے کی جرأت کرتے تھے اور بولنے سے پہلے اپنی بات کو تول لیتے تھے۔ لیکن سنا ہے کہ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی ذکاوت و ذہانت کے پیشِ نظر حضرت علامہ نے مولانا کو یہ شرف بخشا تھا کہ خود دریافت فرمایا کرتے تھے کہ حفظ الرحمٰن تمھیں کچھ معلوم کرنا ہے۔

دوسرا خاص شرف جو حضرت نے مولانا کو ارزانی فرمایا وہ یہ ہے کہ حضرت العلام رات کو جس حجرے میں مصروف مطالعہ ہوتے تھے اسی کے بیچ میں پردہ ڈالکر مولانا کو بھی جگہ عطا فرمائی۔ ایسا قرب یگانگت طلبہ تو طلبہ کسی مدرس کو بھی حضرت نے نہیں بخشا۔ ظاہر ہے یہ سب کچھ مولانا کی اصابتِ فکر، ذہانت اور طبعِ رسا کی اعلیٰ صلاحیتوں ہی کی وجہ سے تھا۔ حضرت العلام سے پورے ایک سال دورۂ حدیث کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد مولانا کو دارالعلوم کے زمرۂ اساتذہ میں شامل کرلیا گیا۔

لیکن ابھی درس و تدریس کے مشاغل کو صرف ایک ہی سال نہیں ہوا تھا کہ وہ فتنہ کھڑا ہوگیا جس کو علم والے اسٹرائک سنہ ۱۳۴۴ھ کے نام سے جانتے ہیں۔

اس اسٹرائک کی روحِ رواں مکمل مخلصانہ جذبات کے ساتھ جن شخصیتوں میں کارفرما تھی ان کے گل سرسبد تو علامہ کشمیری تھے، اور گل مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ کی ذات ستودہ صفات۔

بہرحال ایک والہانہ جذبۂ عقیدت و خلوص کے ساتھ مولانا نے حضرت علامہ کشمیریؒ کا ساتھ دیا۔ اور نہ صرف ساتھ بلکہ ان کے ہمراہ بادیہ پیمائی کے فرائض بھی انجام دیئے۔ جب یہ آفتاب و ماہتاب سرزمین دیوبند سے سیاروں کے ایک قافلہ کے ساتھ ڈابھیل روانہ ہو رہے تھے تو کون کہہ سکتا تھا کہ یہ نورانی ستارے اپنی علمی و روحانی ضیا باریوں سے اس تاریک علمی تہی دامن وادی کو ایک تابندہ بقعہ نور بنا سکیں گے اور جہالت کی اندھیری بستیوں میں علوم نبوت و روحانیت کی شمعیں جلا سکیں گے ——

— مگر جو قدرت کو منظور تھا وہ ہوا۔ اس معرفت کی پیاسی سرزمین کو اسی جماعتِ دیوبند نے جاکر علوم نبوت سے سیراب کیا۔ اور مدتوں کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام لوگوں تک پہنچاتی رہی لیکن مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی ذات ایسی نہ تھی جو مقام و مکان کی حدبندیوں میں محبوس ہوکر رہ جاتی۔ مولانا نے وہاں بھی تبلیغی اور تنظیمی دورے فرمائے اور اللہ اور اس کے رسولؐ کا پیغام اس کی مخلوق کو پہنچانے میں ایک لمحہ ضائع کئے بغیر تدریسی ذمہ داریوں کو بھی پورے انہماک کے ساتھ پورا کیا۔ جس سے نہ صرف عام پبلک بلکہ اہل علم طبقہ پر بھی مولانا کا اثر و رسوخ بے حد بڑھ گیا۔ لیکن چند سال بعد ہی آب و ہوا کی عدم مساعدت نے اس دور دیس کے باسیوں کو مولانا کی سرگرمیوں سے پورے طور پر مستفید ہونے کا تادیر موقعہ نہ دیا۔ بہرحال مولانا وہاں سے تشریف لے آئے۔ اور اپنی سیاسی و علمی سرگرمیوں میں مصروف ہوگئے۔ مولانا اس وقت بھی قصص القرآن نامی تالیف کا ارادہ رکھتے تھے اور بارہا مختلف مجالس میں اس کا اکثر ذکر فرمایا کرتے تھے۔

جب مولانا سیوہارہ تشریف لائے۔ یہی وہ وقت ہے جب مجھے شرف تلمذ کی عزت سے سرفراز فرمایا۔ ہوا یہ کہ مولانا اکثر اوقات اپنے مشفق استاذ محترم حافظ احمد حسن صاحب مرحوم مہتمم مدرسہ فیض عام اسکول سیوہارہ کی خدمت میں آیا کرتے تھے۔ یہ وہ وقت تھا جب میں مقاماتِ حریری مختصر المعانی اور تلخیص المفتاح وغیرہ کتابیں پڑھتا تھا۔ کچھ اسباق مولانا جمیل الرحمٰن صاحب سیوہاروی (الحال نائب مفتی دارالعلوم دیوبند) اور کچھ اسباق مولانا محمود علی صاحب اوجہاروی پڑھایا کرتے تھے۔ لیکن اس وقت یہ جگہ مولانا محمود صاحب کے انتقال سے خالی ہوچکی تھی۔ عجیب سعادت تھی کہ جس روز مولانا محمود صاحب کا وصال ہوا، اس دن مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہارہ میں موجود تھے۔ غسّال کو بلایا جارہا تھا۔ مولانا نے فرمایا کوئی ضرورت نہیں، یہ خدمت میں خود انجام دوں گا۔ چنانچہ انجام دی اور نہایت سنت کے مطابق۔ کیونکہ حامل شریعت سے زیادہ کون آدابِ غسل سے واقف ہوسکتا ہے؟

بہرحال مولانا کے انتقال کے بعد حضرت حافظ صاحب موصوف نے مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ سے یہ خواہش ظاہر کی کہ یہیں مدرسہ میں

پڑھانے لگو —— ظاہر ہے کہ ایک مرغ زریں بال کو بھلا اس ویرانہ سے کیا نسبت ہو سکتی ہے، جہاں نہ سحر گاہی بلبلیں چہچہاتی ہوں نہ پرندے لاہوتی صدائیں لگاتے ہوں۔ ایک گلستاں جہاں صرف چند پھول اور معدودے چند کلیاں —— !!!

مولانا مرحوم کی روح نے شاید دل دل میں کہا ہو ——"

بروایں دام برمرغ دگرنہ
کہ عنقا را بلند است آشیانہ

لیکن نہیں —— ہوا وہ جو خلاف امید تھا، شاید حافظ صاحب کو بھی امید نہ تھی۔ لیکن ایک لائق شاگرد کی شان یہ نہ تھی جو اپنے استاذ محترم کا حکم ٹال دیتے۔ قبول کیا اور بسر وچشم قبول کیا۔

مدرسہ فیض عام سیوہارہ کے کتب خانہ کے اوپر داہنی جانب جو بالا خانہ ہے جس میں آج سے پہلے زانوئے تلمذ تہ کی تھی آج اسی جگہ استاد محترم کی حیثیت سے رونق افروز ہونے کے لئے تشریف لارہے تھے۔

نہ پوچھئے کتنی مسرت ہوئی، جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ حضرت مولانا حفظ الرحمن صاحب مجھے پڑھانے کے لئے تشریف لا رہے ہیں۔ خوشی کا یہ عالم تھا کہ دل بلیوں اچھل رہا تھا اور پاؤں زمین پر جمتے نہ تھے۔ میں اور میرا ایک کشمیری ساتھی (نہیں معلوم وہ اب کہاں ہے اور یہ کہ زندہ بھی ہے یا نہیں) خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے ——

بہرحال مولانا نے تلخیص المفتاح اور مقامات حریری کا سبق بیک وقت پڑھایا اور ایسا پڑھایا کہ آج تک یاد ہے۔ انداز گفتگو، وہ دلربایانہ طرز ادا، ہاتھوں کے واضح اشارے اور مشکل ومغلق الفاظ کی مکمل تشریح اب تک دماغ میں محفوظ ہے، جس کا کیف دماغ اس وقت بھی محسوس کر رہا ہے۔ لیکن۔ ایک ہی روز پڑھانے کے بعد اگلے روز فرمایا میں تو حافظ جی کے کہنے کی وجہ سے یہاں بیٹھ گیا ہوں پڑھ لو جب تک میں یہاں ہوں۔ ورنہ درحقیقت میرا یہاں کا کام نہیں ہے ——

مولانا کے اس بیان سے دل پر جو غم والم کے جو پہاڑ ٹوٹے ان کو الفاظ کے جامہ میں نہیں لایا جا سکتا۔ بے حد رنج ہوا۔ پھر سوچا واقعی مولانا کی ذات سیوہارہ کی تنگنائیوں میں محصور ہونے کے لئے پیدا نہیں ہوئی گلاب اس لئے نہیں ہے کہ آپ اس کو ڈبیہ میں بند کرلیں، بلکہ اس لئے ہے کہ اس کی خوشبوئیں پھیلیں اور دور ونزدیک کو معطر کردیں۔ اور بات تو اصلی یہ ہے کہ کسی پھول کی قدر وقیمت چمن کے اندر نہیں جانچی جا سکتی صحیح قدر وقیمت کا اندازہ چمن سے باہر ہی ہوتا ہے

سرِ پھول وہ چڑھا جو چمن سے نکل گیا
عزت اسے ملی جو وطن سے نکل گیا

یہی شان تھی مولانا حفظ الرحمن کی۔ بھلا وہ کس طرح اپنی عالمگیر صلاحیتوں کو سیوہارہ کے ایک مقامی مدرسہ کی محدود پہنائیوں میں محبوس کر سکتے تھے۔ اور کس طرح ان کی رفعت پسند طبیعت ارض وطن (جائے پیدائش) کی خاک پر قناعت کر سکتی تھی؟

دو چار ہی دن گزرے تھے کہ وہ وقت آگیا جب مولانا نے ہمیں پڑھانا بند کر دیا۔ ایک دن اچانک یہ معلوم ہوا کہ مولانا نے مجھے اپنے مکان پر طلب فرمایا ہے۔ گم شدہ مسرت کا سرمایا پھر لوٹا۔ دل میں طرح طرح کے خیالات موجیں مارنے لگے۔ لیکن سب پر غالب خیال یہ تھا کہ مجھے اپنے مکان پر پڑھانے کے لئے بلایا ہے۔ کیونکہ ایک طالب علم کی زندگی طلب علم ہی سے لبریز ہوا کرتی ہے۔ لیکن علی الرغم وہاں جاکر یہ معلوم ہوا کہ مولانا اپنی تصنیف کا مسودہ صاف کرانا چاہتے ہیں۔ اور یہ شرف مجھے اس لئے بخشا گیا ہے کہ میں کچھ عربیت سے بھی واقف ہوں اور خط بھی صاف ہے۔ میرے لئے یہ خدمت بار نہیں بلکہ شرف تھا کہ میرے استاد محترم نے مجھے ایک خدمت کے لئے یاد فرمایا:—

چنانچہ رسول کریم، المعروف بہ نور البصر فی سیرت خیر البشر جو غالباً مولانا کی پہلی مشہور تصنیف ہے۔ اس کا مسودہ اسی ناچیز نے صاف کیا تھا

فی الجملہ نسبتے بتو کافی بود مرا
بلبل ہمیں کہ قافیہ گل بود بس است

اس کے بعد مولانا امروہہ مدرسہ جلیلہ وجامع مسجد کے مشترکہ بورڈ کے بحکم حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنیؒ صدر بنائے گئے۔ لیکن یہ طائر لاہوتی ان خاکنائیوں پر کب صبر کرنے والا تھا۔ پھر حالات ایسے بنے کہ تھوڑے ہی دنوں بعد مولانا کو امروہہ کی صدارت ترک کرنی پڑی جس پر حضرت شیخ الاسلام نے مولانا کو کلکتہ بھیج دیا۔ جہاں قرآن حکیم کا درس فرمایا۔

لیکن چند روز ہی بعد صلاحیت کار اور دماغی اعلیٰ اپج نے اس پر بھی قانع ہونے سے انکار کر دیا۔ بلند سیرت انسان کا اونچا کردار پھر

اس کو لے کر سربلندیوں کی طرف مائل پرواز ہوا۔
بالآخر حضرت مولانا کفایت اللہ صاحب مفتیٔ اعظم ہند کے ایماء سے جمعیۃ علماء ہند کی جملہ ذمہ داریوں کا بارگراں اس نحیف الجثہ مرد مومن کے دوش توانا پر ڈال دیا گیا، جن ہاتھوں نے اس بھاری بوجھ کو لادا تھا۔ ان کی مومنانہ بصیرت نے پہلے ہی سے کارکردگی اعلیٰ سوجھ بوجھ اور جودتِ طبع کی بھرپور صلاحیتوں کا اندازہ لگالیا تھا۔

چنانچہ جب قافلہ سالار بنے تو قافلہ کو اس تیزی کے ساتھ لے کر چلے کہ پیش رووں کی روش گرد بن کر راہ میں رہ گئی۔
اس زمانہ کی مذہبی و سیاسی رہنمائی کی تاریخ اس قدر روشن ہے جس پر مستقل تصنیف کی ضرورت ہے اور جو مجھ بے تجی مایہ کی بساط سے باہر ہے۔

اللھم ارحمہ رحمۃ واسعۃ

کچھ یادیں

مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصر کے قلم سے

مظہرالدین صاحب مالک اخبار الامان دہلی سے دیوبند آ گئے۔ دارالعلوم کے ادارۂ اہتمام کی حمایت میں جامع مسجد میں ان کی تقریر ہوئی۔ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے وہیں دوبدو انھیں جواب دیا۔ اور ان کی شعلہ بار تقریر سے مجمع کا رنگ بدل گیا دیوبند کے بعد مولانا جامعہ ڈابھیل ضلع سورت علاقہ بمبئی میں پروفیسر کی حیثیت سے کئی سال رہے۔ بعد میں قیصر بھی اپنے والد مرحوم کے ساتھ پڑھنے کے بہانے سے اس درسگاہ میں گیا۔ اور وہاں دو سال مولانا کے کمرے کے بالکل قریب رہنے کا اتفاق ہوا۔ چار پانچ سال کا یہ عرصہ جو ڈابھیل میں بسر ہوا۔ مولانا کی زندگی کا عجیب زمانہ تھا کہ بظاہر پرسکون مشاغل صرف تعلیم و تدریس۔ تصنیف، تالیف اور اپنے استاذ مرحوم علامہ کاشمیری سے افاضہ و استفادہ تھے۔ مگر باطن پرشور وہی سیاسی مذاق کی گہرائیاں ملک کی تباہ حالی کا رنج قوم کی بربادی کا فکر اور مستقبل کی تعمیر کا جنون۔ دراصل اس زمانے سے بہت پہلے خلافت کی تحریک میں وہ باقاعدہ سیاسی میدان میں آچکے تھے اور اس وقت تو انھیں دنیا اس زمانہ کی مقبول عام جمعیۃ علماء ہند کے نوجوان گروپ کے ایک سربرآوردہ رکن کی حیثیت سے جانتی تھی ڈابھیل کی زندگی بھی عجیب تھی۔ کھانے پر سب حضرات ساتھ بیٹھتے۔ ملکی معاملات و مسائل پر بحث ہوتی۔ مفتی عتیق الرحمٰن اور مولانا حفظ الرحمٰن کی ایک رائے ہوتی۔ اور مولوی بدر عالم صاحب کا کچھ اور خیال۔ بعض وقت بحث طویل ہوجاتی۔ اور مولانا مخصوص انداز میں برس پڑتے۔ بگڑ اٹھتے۔ بے تکان بولتے اور بحث و مذاکرہ کا یہ سلسلہ جاری رہتا۔ استاذ مرحوم کے یہاں دن میں کئی بار ان کی حاضری کا معمول تھا۔ جب آتے علمی مسائل پر سوالات کرتے اور جب جاتے تو بہت کچھ لے کر جاتے۔ ان کے استاذ کو خود ان کے ساتھ اتنی محبت تھی کہ باید شاید۔ استاذ کا دربار وہ تھا کہ فراست و ہوشمندی کو وہاں دامن سنبھال کر بیٹھنا پڑتا تھا۔ اور علم و فضل چوکنے ہو کر آتے تھے اور شرمندہ ہو کر جاتے تھے۔ ایسے کے دل میں جگہ پیدا کرنا بہت مشکل تھا۔ مگر استاذ کے تعلق کا یہ عالم تھا کہ شاید ۱۹۳۲ء کے آخر میں مولانا گرفتار ہو کر جب میرٹھ جیل گئے تو استاذ یہ خبر سن کر تڑپ اٹھے۔ ہائے وہ شفقت بھرے الفاظ کہ یہ صاحب عجیب قسم کے آدمی ہیں۔ اب وہاں جا پڑے ہیں۔ خبر نہیں وہاں کیا گذرے اور کس طرح بسر ہو، جب تک جیل میں رہے استاذ کے دل سے نہیں اترے، برابر پوچھتے رہے خط لکھتے رہے دعا میں یاد کرتے رہے۔ مولانا میرٹھ سے چھٹے تو دیوبند آئے۔ یہاں استاذ تھے ان کی قدم بوسی کی۔ پھر آگے گھر گئے۔ میرٹھ جیل سے ان کا رہا ہو کر دیوبند آنا نگاہوں میں پھرتا ہے۔ سردی کا موسم تھا شام کا جھٹپٹا سا وقت جب مولانا پوری متانت و سنجیدگی کے ساتھ تانگہ سے اترے اور استاذ نے آگے بڑھ کر ان کا خیر مقدم کیا۔ سیاسی رہنما اور مقرر و مصنف کی حیثیت سے وہ آج ہزاروں پر بھاری ہیں۔ مگر درس و تدریس میں بھی ان کا اپنا خاص رنگ تھا۔

حدیث و تفسیر کی اعلیٰ کتابیں ان کے زیر تدریس تھیں اور یہ خاص شفقت و محبت پڑھاتے تھے۔ طلباء کی بڑی جماعت ہوتی تھی اور سب اس شیوا

بیان مدرس کی تقریر پر فدا تھے۔

مولانا حفظ الرحمٰن کا تصور آتا ہے تو ڈابھیل کی اس زندگی کے سارے اوراق ذہن میں گھوم جاتے ہیں۔ کھانے پینے کا کوئی اہتمام حسب عادت یہاں بھی نہیں تھا۔ کھدر کے دو چار جوڑے ان کے لئے بہت تھے۔ البتہ صاف ستھری شیروانی اور اچھا سا پمپ ان کی پسندیدہ چیزیں تھیں۔ کھانے میں کوئی خاص ذوق نہیں رکھتے تھے۔ کبھی اگر مانگتے بھی تھے تو کھانے کے بعد کوئی میٹھی سی چیز۔ اڑد ان کے ضلع بجنور کی خاص غذا ہے۔ یہ ہی انھیں بھی مرغوب تھی۔

مولانا نے ڈابھیل کے بعد کئی سال امروہہ ضلع مرادآباد اور کلکتہ میں بسر کئے۔ کلکتہ میں تبلیغی خدمت پیش نظر تھی۔ اور امروہہ میں درس تدریس کا شغل اور پھر ۳۸ء سے دہلی میں مستقل طور سے قیام رہا۔ یہاں وقت کا ایک حصہ ندوۃ المصنفین کی نذر ہوتا رہا۔ اور باقی جمعیۃ علماء اور کانگریس کی۔ ندوۃ المصنفین کے وقت میں دس بارہ اعلیٰ درجہ کی کتابیں لکھ ڈالیں اور جمعیۃ و کانگریس کے کاموں میں ہزاروں میل کا سفر کیا۔ ہزاروں تقریریں ہوئیں۔ مسلمانوں سے برسہابرس تک گالیاں کھائیں۔ قاتلانہ حملوں کا مقابلہ کرنا پڑا، غداری کے طعنے سنے، ہندوؤں کے ہاتھ بک جانے کی تہمت دھری گئی۔ اخباروں نے ہزاروں صلواتیں سنائیں۔ مخالفین نے تکلیف دینے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔

وقت ایسے بھی گذرے کہ عزت و آبرو تو الگ رہی جان کی سلامتی بھی مشکل تھی . . . . پورا ملک پوری قوم مخالف تھی مگر ان کی زندگی میں مطلق فرق نہ آیا۔ جو رائے کل تھی وہ آج تک رہی اور جس طرح کل اس کا اظہار ہوتا تھا اسی طرح آج بھی ہوا۔ سچائی ہمیشہ ان کی زندگی کا اصول رہا۔ طبیعت سچائی کی اس لائن سے ہٹنے پر قادر ہی نہیں رہی۔ وقت نے کتنے ہی دھکے دیئے۔ مگر ان کے قدم میں لغزش نہیں آئی قوم نے کتنا ہی برا بھلا کہا مگر یہ قوم کا ساتھ نہ چھوڑ سکے قوم اور اسکے ہر فرد سے محبت و خلوص کا یہ عالم تھا کہ ایک لیگی کارکن نے جلسہ میں برملا ان پر حملہ کیا۔ مگر جب یہی لیگی لیڈر مجبور و حاجت مند بن کر ان کے سامنے آیا تو ادھر سے محبت و شفقت سے اس کا استقبال کیا۔ اور دو سخت لفظوں سے بھی اس کا دل توڑنا گوارہ نہیں کیا۔ درآنحالیکہ رائے اور مسلک کا اختلاف پہلے سے زیادہ مسلط ہوچکا تھا۔ جلسوں میں کتنی مرتبہ قدرشناس قوم نے ان کو گالیاں دیں۔ اسٹیشنوں پر کہاں کہاں حملے ہوئے۔ چلتے پھرتے کتنے برس انھیں دل خراش آوازے سننے پڑے، اخبارات نے ان پر کیا کیا گند اچھالا۔ اور اس معصوم فطرت انسان پر جسے یقیناً گناہ کا سلیقہ بھی نہیں آتا تھا جھوٹے الزامات لگائے، ان کی تفصیل تو ان لوگوں کو معلوم ہوگی جو سیاسی کاموں میں ان کے شریک رہے ہیں۔

گذشتہ پندرہ برس، مولانا حفظ الرحمٰن نے دفتر جمعیۃ میں چٹائی پر بیٹھ کر گذار دیئے۔ جو کھانا اس وقت مل گیا تو شام کو ناغہ، شام کو ملگیا تو صبح کو غائب۔ جو سامنے آگیا اسی پر قناعت اور جو مل گیا، اس پر صبر شکر، بیس بائیس سال کی مدت اپنوں کے مظالم اور غیروں کے مصائب میں گذر گئی۔ مگر پیشانی پر بل نہیں پڑا۔ راستہ کی صعوبتوں اور سفر کی تکلیفوں سے گبھرا کر بڑوں بڑوں نے ساتھ چھوڑ دیا۔ مگر حفظ الرحمٰن نے منزل مقصود ہی پر دم لیا۔ چاہتے تو امیرانہ زندگی گذار سکتے تھے۔ رزق کے لئے حیلہ و کوشش کی ضرورت ہے۔ ان امور پر توجہ ہوتی تو کم از کم ان کے بیوی بچوں کے لئے تو اچھی زندگی پیدا کردیتے۔ مگر یہاں امارت و غربت کا امتیاز ہی کوئی نہیں۔ بقدر لایموت رزق حاصل کرنا اور وقت کا بڑا حصہ مسلمانوں کی خدمت میں بسر کرنا ہی مقصود زندگی تھا۔ بیوی کوئی اللہ کی نیک بندی پلے بندھ گئی تھی اسی طرح اولاد بھی شریف ہے جس نے مولانا حفظ الرحمٰن کی ان تمام عادتوں میں ان کا ساتھ دیا۔ اور سارے مصائب میں ان کے شریک حال رہے۔ ورنہ یہ ہی اولاد اور کنبہ اور گھر گرہستی اکثر انسان کو ہوس پرستی کا شکار کردیتی ہے۔

ہند کا مجاہد جلیل

اپنے مکتوب اور اقوال و اعمال کی روشنی میں

دارا و سکندر سے وہ مردِ فقیر اولیٰ ہو جس کی فقیری میں بوئے اسد اللہی

(از مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب، بجنور)

بآلاخر ۲ اگست ۱۹۶۲ء کو ۸ بجے صبح سے قبل ہی وہ خبر سن لی جس کے سننے کو کان کسی قیمت پر آمادہ نہیں ہوتے تھے۔ اور جس کے تصور سے دل و دماغ غیر معمولی طور پر پریشان ہوجاتے تھے یعنی

آج شب کو سوا تین بجے جبکہ ہر سو رحمت کا نزول ہوتا ہے اور قدسیوں کے پرے کے پرے ہر سو شب زندہ داروں کی تلاش میں پھرا کرتے ہیں۔ ایک ۶۲ سالہ مجاہد اعظم جو ۴۳ سال سے برابر جہاد کر رہا تھا جس کی سیف ہمت نے فرنگیوں کو ناک چنے چبا دیئے تھے اور جو ۱۹۴۷ء سے فرقہ پرستوں کے خلاف صف آرا اور مظلوموں کا پشت پناہ بنا ہوا تھا۔ اور جو فروری ۱۹۶۲ء سے موت سے لڑ رہا تھا۔ اس کی مقدس روح کو فرشتے رحمت کے سایہ میں اپنے ساتھ لے گئے اور ہمیشہ کیلئے جوارِ رحمت کا ہم نشیں بنا دیا۔

انا للہ و انا الیہ راجعون

موت سے کس کو رستگاری ہے

آج وہ کل ہماری باری ہے

آخر کیا کہیں؟ اور کس سے کہیں؟ سب یہی کہہ رہے ہیں اور سب یہی سن رہے ایک ہی آواز ہے جو بالاتفاق سب کی زبانوں سے نکل رہی ہے سب ایک ہی غم میں مبتلا ہیں۔ پھر کہیں تو کس طرح کہیں؟ کہاں سے زبان لائیں اور کہاں سے قلم، تاہم ملک و قوم کی ایک امانت یعنی حضرت مجاہد ملت رحمہ کے کچھ خطوط اور نجلت صحبتوں کی کچھ باتیں میرے پاس ہیں ان کو ملک و قوم کے حوالہ کرتا ہوں ؎

نہ سکون ہے نہ قرار ہے نہ غم و الم کی شمار ہے

یہ نظر جو آتا مزار ہے وہ حبیب اس میں سما گئے

چند مکتوباتِ گرامی

ادھر کچھ عرصہ سے مجھے ہندوستان کی مقتدر ہستیوں کے مکتوبات جمع کرنے کی عادت ہوچلی ہے۔ اس سے بیشتر بہت سے قیمتی خطوط لاپرواہی سے ادھر ادھر ڈال دیئے۔ حضرت مجاہد ملت رحمہ سے بھی عرصہ سے مکاتبت رہی۔ موصوف کے کچھ خطوط محفوظ ہیں جن کو پیش کرتا ہوں۔

جون ۱۹۶۱ء میں موصوف بجنور تشریف لائے تھے۔ درمیان تقریر یا نجی مجلس میں ایک صاحب نے کاروبارِ حکومت میں اشتراک کے سلسلہ میں سوال کرلیا تھا حضرت مجاہد ملت نے حضرت یوسف ع کی وزارت سے استدلال کیا تھا۔ اس وقت تو بات رفع دفع ہوگئی، لیکن میں نے ایک عریضہ موصوف کی خدمت میں بھیجا۔ وہ عریضہ اور اس کا جواب ملاحظہ فرمایئے۔

حضرت اقدس زید مجدکم، سلام مسنون

مزاج گرامی

یہ عریضہ ڈرتے ہوئے لکھ رہا ہوں کیونکہ میرا یہ مقام نہیں ہے تاہم ایک غلطی سے مطلع کرنا بھی ضروری ہے۔ اس سے اعتراض مقصود نہیں ہے بلکہ سہواً جو بات آپ نے بیان کردی ہے۔ اس کی اطلاع دینا مقصود ہے۔

بجنور میں آپ نے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا کہ حضرت یوسف ع جو مصر میں فرعونی حکومت کے وزیر اعظم تھے انھوں نے بن یامین کو فرعونی دستور کے مطابق روک لیا تھا۔ اطلاعاً عرض ہے کہ قرآن شریف میں اس طرح مذکور ہے۔ کذالک کدنا لیوسف ما کان لیاخذ اخاہ فی دین الملک الا ان یشاء اللہ۔ اس سے معلوم ہوا حضرت یوسف ع نے شریعت یعقوبی کے مطابق روک لیا تھا جب ہی تو اپنے بھائیوں سے سوال کیا تھا اور انھوں نے یہ جواب دیا تھا۔

قالوا جزاءہ من وجد فی رحلہ فہو جزاءہ — اس کے بعد یہ آیت ہے :- کذالک کدنا لیوسف معلوم ہوا کہ یہ معاملہ شریعت یعقوبی کے مطابق ہوا تھا نہ کہ فرعونی دستور کے مطابق، اطلاعاً عرض ہے گستاخی کی معافی چاہتا ہوں۔ دعا کرتا ہوں اور دعا کا طالب ہوں۔ والسلام

عزیز الرحمٰن غفرلہ بجنور: ۲۰ جون ۶۱ء

محترم مفتی صاحب زیدت معالیکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ عنایت نامہ موصول ہوا۔ میں مسلسل سفر میں تھا جواب نہ دے سکا۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ کو میں نے جس غرض سے دلیل بنایا تھا (اپنی بجنور والی تقریر میں) اس کی ادا اور غالباً تعبیر میں مجھ سے غلطی ہوئی اور میں اپنے مافی الضمیر کو صحیح طور پر پیش نہ کر سکا۔ آپ کا یہ فرمانا صحیح ہے کہ قرآن عزیز کی آیت

میں یہ ذکر ہے کہ فرعون کے قانون کے مطابق تم اپنے بھائی بن یامین کو اپنے پاس نہیں رکھ سکتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کا انعام تھا کہ اس نے حضرت یعقوب علیہ السلام کے اسلامی قانون کے مطابق ان کے بھائیوں سے ایسی بات کہلا دی کہ تم اپنے بھائی بن یامین کو اپنے پاس روک سکتے ہو۔

میرے اس استدلال کا مبنیٰ یہ ہے کہ قرآن عزیز کی آیت میں دلالۃ النص کے طور پر یہ بات واضح کر دی گئی کہ حضرت یوسف علیہ الصلوٰۃ والسلام بزمانہ وزارت مصر فرعونیوں کے بنائے قانون مصر کے مطابق احکام جاری کرتے ہوں گے تب ہی تو بن یامین کے مسئلہ میں خاص طور پر اللہ تعالیٰ نے فی دین الملک کہہ کر اپنے احسان وفضل کا ذکر کیا ہے۔ جو دین ملک سے جدا پیش آیا۔ ورنہ فی دین الملک کہنے کی کوئی خاص ضرورت نہ تھی۔ یہ تو ظاہر ہے کہ دین سے یہاں قانون مراد ہے ملت نہیں اگر اس سلسلہ میں جناب محترم کو کوئی اعتراض ہے تو اس سے براہ کرم مطلع فرمائیں، کیونکہ یہ ایک علمی بحث ہے۔ جو ایک طالب علم کی حیثیت سے مجھے ہر وقت دلچسپی کا باعث ہے۔

والسلام - آپکا مخلص :- محمد حفظ الرحمٰن

۲۲ جولائی ۱۹۶۱ء

حضرت مجاہد ملت ؒ کے مکتوب سے دو باتیں خاص طور سے ظاہر ہوتی ہیں ۱۔ اعتراف حق اور یہ بڑے کمال کی بات ہے ۲۔ دلالۃ النص کہہ کر طریق استدلال اور قوت استدلال ساتھ ہی یہ بھی ظاہر ہو رہا ہے کہ موصوف کو محض سیاست ہی میں مہارت نہیں تھی بلکہ علوم دینیہ بھی ہر وقت مستحضر رہتے تھے۔

ایک مرتبہ دیوبند میں ایک واقعہ پیش آگیا جس پر مجھے اور میرے ساتھیوں کو کچھ افسوس ہوا، اور کچھ غصہ آگیا۔ اسی حالت میں حضرت مجاہد ملت کی خدمت میں ایک عریضہ ارسال کر دیا، موصوف نے اس کے جواب میں تحریر فرمایا۔

مولانا المحترم زید مجدکم السلام علیکم ورحمۃ اللہ

مزاج گرامی!

عنایت نامہ پہونچا۔ دارالعلوم دیوبند میں جو بات پیش آئی جس کی طرف آپ نے اشارہ فرمایا ہے۔ میں اس کے انسداد کے لئے جو کچھ کر سکتا تھا کر آیا۔ امید ہے کہ اب کوئی ایسی بات انشاء اللہ پیدا نہ ہوگی۔ آپ کی خدمت میں یہی گزارش ہے کہ آپ صاحب باطن ہیں۔ اور حضرت شیخ رح کے ساتھ نسبت رکھتے ہیں۔ اس لئے آپ کو اتنا مشتعل نہیں ہونا چاہئے۔

تجربہ یہی بتاتا ہے کہ ہمیشہ کشمکش اور مخالفت کا فتنہ ان درمیانی لوگوں سے اٹھتا ہے جو ادھر کی ادھر اور ادھر کی ادھر لگاتے رہتے ہیں۔ آپ خود عالم ہیں۔ جانتے ہیں کہ اگر سچ بات بھی فتنہ کا باعث بنے تو اس کی نقل نہ کرنا کرنے سے بہتر ہے۔ مطمئن رہئے کہ اس قسم کی باتیں انشاء اللہ آہستہ آہستہ خود ختم ہو جائیں گی اور کہنے والوں کو خود ندامت ہوگی۔ اس لئے ہمارا اور آپ کا اشتعال۔ اس کا علاج نہیں ہے۔ والسلام - آپکا مخلص

محمد حفظ الرحمٰن۔ یکم اگست ۱۹۵۸ء

اس مکتوب سے یہ بات ظاہر ہو رہی ہے کہ اس کے پس منظر میں جو واقعہ رونما ہوا ہے۔ اس کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے حضرت مجاہد ملت نے کاتب کے عریضہ سے پیشتر ہی اس کا علاج کر دیا تھا۔ یہ مولانا رح کی دور بینی کی دلیل ہے۔

ضلع بجنور میں جمعیۃ علماء کا کام خاطر خواہ نہ ہونے کی وجہ سے مولانا کو بہت زیادہ شکایت تھی۔ آپ چاہتے تھے کہ اس ضلع کا کام سب اضلاع سے آگے ہونا چاہئے۔ چنانچہ مرحوم نے میرے ایک خط کا جواب دیتے ہوئے فرمایا!

محترم مفتی صاحب! زاد مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ مزاج گرامی!

مکتوب مُاحسن ظن کا شکریہ۔ خدا کرے آپ جیسے ذی علم اور ذی عمل شخصیتوں کی بدولت بجنور کے ضلع میں جمعیۃ کے مقاصد بروئے کار آسکیں اور جمود ٹوٹ سکے۔ برادر عزیز سعید اختر صاحب نے بھی مولانا محمد میاں صاحب کو خط لکھا ہے اور اسی کا چرچا کیا ہے۔ میں مئی کے مہینہ میں زیادہ تر دہلی میں ہی حاضر رہوں گا ضرور تشریف لاکر زبانی گفتگو کریں۔

آپکا مخلص :۔ محمد حفظ الرحمٰن ۔ ۹ مئی ۱۹۶۱ء

قابل رشک اسوۂ حسنہ

اکیلا لحد میں ہے کون کہتا نعش حاتم کو
ہزاروں حسرتیں مدفون ہیں دریا کے پہلو میں

۱۹۴۷ء کے بعد کی بات ہے کہ مجلس میں اپنے اکابر میں سے کسی کو حضرت شاہ عبد القادر صاحب رائے پوری کا یہ مقولہ نقل کرتے ہوئے سُنا تھا یا خود حضرت موصوف سے سُنا۔

"حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ اپنی ۱۹۴۷ء کی خدمات کے عوض اگر عبد القادر کے تمام عمر کے مجاہدات لینا چاہیں تو میں خوشی سے اس کے لئے تیار رہوں۔

اس زمانہ میں تو عجیب اور بہت عجیب ہے کہ کوئی آدمی بیک وقت متضاد امور اور افعال کو انجام دیتا ہو۔ قرون سابقہ ہی میں ایسے حضرات بکثرت ملتے تھے کہ وہ شب کو عابد اور دن میں مجاہد ہوں آجکل بہت کم ایسے ملتے ہیں۔ لوگ حضرت مجاہد ملت رحؒ کو ایک سیاسی لیڈر سمجھتے تھے چنانچہ ہندوستان کے تنگ نظر اور اسلام نا آشنا زاہدان خشک تو موصوفؒ کو خدا معاف کرے کیا کیا سمجھتے تھے۔ ان کی خدمت میں گزارش ہے کہ اسلام یہ ہے جو مجاہد ملت کے مندرجہ ذیل اسوہ سے ظاہر ہو رہا ہے اسلام کبھی بھی محض مسجد کی چہار دیواری میں محصور نہیں رہا۔ اسلام مرد مجاہد کی شمشیر اور پیشانی سے مساوی ضو فشانی کے ساتھ چمکتا ہوا ملے گا۔ چند نمونے ملاحظہ فرمائیے۔

۱۹۶۱ء میں خادم حضرت مجاہد ملت رحؒ کو لینے کے لئے گجرولہ اسٹیشن پہونچا۔ صبح کا وقت تھا۔ آفتاب نکل آیا تھا۔ گرمیوں کے دن تھے۔ میں صبح کی نماز راستے ہی میں پڑھ چکا تھا۔ جا کر کیا دیکھتا ہوں کہ حضرت مجاہد ملت گرمی میں انٹر ویٹنگ روم میں قرآن کی تلاوت میں مشغول ہیں۔ اس کے بعد کچھ اور وظیفہ پڑھا بعد میں مجھ سے مخاطب ہوئے اور فرمایا۔ "آپ کے یہاں آنے کا مجھے بہت احساس ہے میں تو آہی رہا تھا بیکار تکلیف اٹھائی۔

(از جناب رحمت نجمی میرٹھی نمائندہ خصوصی روزنامہ الجمعیۃ دہلی)

حضرت مجاہد ملتؒ کا میرٹھ سے خصوصی تعلق

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

اس عالم فانی میں مجاہد ملتؒ خطیب جادو بیان حضرت مولانا محمد حفظ الرحمان صاحب قدس اللہ سرہٗ و نور مرقدہٗ کا وجود علامہ اقبالؒ کے مندرجہ بالا شعر کا صحیح معنوں میں آئینہ دار تھا، وقت ضرورت کے اعتبار سے قدرت مجاہد پیدا کرتی ہے جو پورے عزم و ہمت اور پورے صبر و استقلال کے ساتھ ملت اسلامیہ کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو منجدھار سے نکال کر سلامتی کے کنارے پر لگاتے ہیں، اٹھتے ہوئے طوفانوں اور بڑھتی ہوئی لہروں کے تھپیڑوں کا سینہ سپر ہو کر مقابلہ کرتے ہیں۔

حضرت مجاہد ملتؒ کی زندگی کے آخری پینتالیس سال انگریزی سامراج اور ملک میں بڑھتی ہوئی فرقہ پرستی کے طوفانوں سے مسلسل جہاد کرتے ہوئے گزرے اس دوران میں ایک لمحہ بھی ایسا نہیں آیا کہ حضرتؒ کو مایوسی کا سامنا کرنا پڑا ہو یا ان کی قوت ارادی اور صبر و استقلال نے ان کو جواب دے دیا ہو۔ آپ پوری مجاہدانہ شان کے ساتھ ملک دشمن عناصر کا مقابلہ کرتے رہے۔

مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمان صاحب قدس اللہ سرہٗ کا یوں تو پورے ملک سے خاص تعلق تھا اور ملک کے گوشہ گوشہ میں ان کی سرگرمیاں برابر جاری رہیں، وہ موسم کی گرمی و سردی اور اپنی صحت کی بحالی و بیماری کی پرواہ کئے بغیر ہندوستان کے ہر حصہ میں تشریف لے جاتے تھے اور وہاں کے عوام کی مشکلات میں ان کی خاطر خواہ مدد کرتے اور ہاتھ بٹاتے تھے، لیکن موصوف کو میرٹھ سے ایک خصوصی لگاؤ آخری وقت تک جاری رہا اور آپ میرٹھ کو اکثر اپنا گھر فرمایا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ دہلی و میرٹھ میرے لئے دو نہیں ہیں اور ہم لوگ بھی حضرتؒ کو اپنی ہر مشکل کے وقت یاد کرتے اور ان کو تکلیف دیتے رہتے تھے۔ وہ باوجود اپنی انتہائی مصروفیات اور بیماری کے بھی ہماری درخواست کو رد نہ فرماتے تھے، یوں تو حضرت مجاہد ملتؒ کو میرٹھ سے یہ خصوصی تعلق ۱۹۳۰ء سے ہوا جبکہ آپ جیم خانہ میدان میرٹھ کے ایک عظیم الشان جلسہ عام میں جمعیۃ علماء ہند کی امروہہ کانفرنس کی کانگریس میں غیر مشروط شرکت کی تجویز کی وضاحت فرمانے کے واسطے تشریف لائے تھے سحبان الہند حضرت مولانا احمد سعید صاحبؒ اس جلسہ کے خاص مقرر تھے، کہتے ہیں کہ یہ جلسہ مولانا محمد اسد اللہ خاں صاحب بدایونی کی صدارت میں منعقد ہوا تھا، اس جلسے کی تقریروں پر حضرت مجاہد ملتؒ اور صدر جلسہ کو گرفتار کر لیا گیا تھا، حضرت مجاہد ملتؒ کو قصبہ سیوہارہ سے گرفتار کر کے لایا گیا تھا، چنانچہ میرٹھ ہی کی جیل میں آپ نے اسیری کے دن گزارے اور میرٹھ کے سیاسی دوستوں سے خصوصی رابطہ پیدا ہوا۔ حضرت مجاہد ملت اپنی خوش مزاجی کے علاوہ وضع کے بہت پابند تھے جن حضرات سے آپ کے مراسم قائم ہو جاتے تھے ان کو کبھی فراموش نہ فرماتے تھے، چنانچہ آپ جب بھی میرٹھ تشریف لاتے تو یہاں کے مخصوص حضرات سے ملنے ضرور تشریف لے جاتے تھے، اور میرٹھ کے حضرات کو بھی آپ کی ذات سے بے حد وابستگی قائم رہی اور وہ مولانا کی ذات پر فخر کرتے تھے، آپ جس وقت تشریف لاتے تو احباب و دوستوں میں اچانک مسرت کی لہر دوڑ جاتی اور جو بھی سنتا وہ آپ کی جانب غیر اختیاری طور پر کھنچا چلا آتا اور آپ کو دیکھ کر اس کے چہرے پر مسرت و شادمانی رقص کرنے لگتی، اور حضرت مجاہد ملتؒ بھی ایک ایک کو دیکھ کر خوش ہوتے اور ہر ایک کا مختصر حال معلوم کرتے حاضرین سے غائبین کی کیفیت مزاج معلوم فرماتے

حق تو یہ ہے کہ میرٹھ کے تمام لوگ آپ کو اس طرح عزت و عظمت کی نظروں سے دیکھتے تھے جس طرح ملک کے نوجوان پنڈت نہرو کو دیکھتے ہیں۔ اور ان کو موجودہ دور میں ہندوستان کا واحد مسلم رہنما سمجھتے تھے۔ حضرت مجاہد ملتؒ جب بھی یہاں تشریف لاتے تو اپنی وضع کے مطابق اپنے احباب و دوستوں پر خصوصی کرم فرماتے اور جس قدر بھی موقع ملتا اکثر سے ملنے ان کے مکانوں پر جاتے اور خیریت معلوم کرتے، حضرت مولانا سید محمد اسحٰق صاحب مرحوم کٹھوری تاحیات دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے ممبر رہے حضرت مجاہد ملتؒ حکیم صاحب مرحوم کی حیات تک برابر ان کے مکان پر قیام فرماتے تھے، حضرت مولانا مبارک حسین صاحب مرحوم مدرسہ دارالعلوم اندر کوٹ میرٹھ کے بانی تھے حضرت مجاہد ملتؒ کو موصوف مدرسہ کے سالانہ جلسوں میں بلایا کرتے تھے چنانچہ اسی زمانہ سے آپ جب بھی میرٹھ تشریف لائے تو مدرسہ دارالعلوم بھی تشریف لے گئے اور حضرت مولانا سید لائق علی صاحب قاسمی وغیرہ حضرات

سے ملاقات فرماتے اور یہاں بھی اکثر قیام فرماتے تھے۔

حضرت مجاہد ملتؒ کے مخصوص احباب میں جناب حافظ عبدالحمید صاحب قریشی کو بھی یہ سعادت حاصل ہے، کہ آپ اکثر و بیشتر موصوف کے مختصر سے بالاخانہ پر بے تکلفانہ قیام پذیر ہوتے یہ قیام اپنی نوعیت اور وضع داری کی ایک عظیم مثال ہے، حضرت مجاہد ملتؒ کو میرٹھ کے کباب بہت مرغوب تھے حافظ صاحب کے یہاں آپ اکثر کباب تناول فرماتے تھے، آپ کبھی کبھی حکیم ظہور الحسن صاحب کے یہاں لال کرتی میں بھی قیام فرما لیتے تھے حکیم ظہور الحسن صاحب مولانا حکیم محمد میاں صاحب مرحوم کے داماد ہیں حکیم صاحب مرحوم کے تعلق سے اکثر حضرت مجاہد ملتؒ ان کے انتقال کے بعد بھی مکان پر تشریف لے جاتے رہے، ویسے آپ کے مخصوص احباب میں خان بہادر بھیا مظفر الدین صاحب رئیس لال کرتی بھی شامل ہیں اور ان کے یہاں بھی اکثر تشریف آوری ہوا کرتی تھی، شیخ محمد اصغر صاحب چاندی والوں سے بھی حضرت کے تعلق کا ایک سبب یہ بنا، کہ اگست ۱۹۴۷ء کے خونی انقلاب کے بعد پنجاب کی تباہ حال اور اپنوں سے بچھڑی ہوئی تین مسلمان لڑکیاں انسانی درندوں کے ظلم و ستم سہتی ہوئی محافظ انسانیت حضرت مجاہد ملتؒ کے سایہ عاطفت میں آکر رہنے لگیں، حضرت مجاہد ملتؒ نے ان تینوں لڑکیوں کو اپنی اولاد کی طرح پرورش کیا اور یہ لڑکیاں حضرت مجاہد ملتؒ کی شفقت سے اس قدر متاثر ہوئیں، کہ بے اختیار "اباجان" کے باعظمت نام سے مخاطب کرنے لگیں وہ مجاہد اعظمؒ نے جو کہ پوری ملت کی باپ اور محسن تھے۔ ان لڑکیوں کے بخوشی باپ بن گئے جو ان لڑکیوں کے باپ کو جو فکر ہوتا ہے وہ ہی اس پیکر اخلاص کے قلب پر طاری ہو گیا۔ ان ہی دنوں آپ کی میرٹھ تشریف آوری ہوئی ایک مخصوص نشست میں ان لڑکیوں کے نکاح کے لئے آپ نے اپنے فکر کا اظہار فرمایا۔ ڈاکٹر نظام الدین صاحب وغیرہ نے اس سلسلہ میں کوشش کا وعدہ فرمایا اور کچھ ہی دنوں بعد تینوں لڑکیوں کے نکاح ہو گئے، حضرت مجاہد ملتؒ نے حقیقی باپ کی طرح پوری دیکھ بھال اور اطمینان کرنے کے بعد اپنی نگرانی میں ان کی شادیاں کرائیں اور تاحیات ایک مشفق باپ کی طرح برابر خیریت معلوم کرنے اور ان کو دعائیں دینے کے لئے ان کے یہاں جاتے رہے ان لڑکیوں میں سب سے چھوٹی لڑکی حلیم بانو کا نکاح شیخ محمد اصغر صاحب چاندی والوں سے ہوا تھا حضرت مجاہد ملتؒ ضلع میرٹھ کے جماعتی معاملات میں مولانا سید لائق علی صاحب قاسمی، مفتی عبدالخالق صاحب صدیقی۔ ڈاکٹر نظام الدین صاحب وغیرہ حضرات کے مشوروں کو زیادہ اہم تصور فرماتے تھے، حضرت مجاہد ملتؒ کا قاضی شہر میرٹھ حضرت الحاج قاضی زین العابدین صاحب سجاد سے بھی خاص تعلق تھا۔

اہل میرٹھ کو حضرت مجاہد ملتؒ کی جس قدر جادو اثر تقریریں سننے کا شرف حاصل ہوا ہے میں سمجھتا ہوں، کہ ہندوستان کے کسی اور خطہ کو یہ فخر حاصل نہیں ہوا ہوگا۔ میرٹھ شہر کے علاوہ قصبات و دیہات اور وہاں کے عربی مدارس بھی حضرت کی ذات سے برابر فیض حاصل کرتے رہے ہیں۔ حضرت مجاہد ملتؒ نے میرٹھ میں متعدد کانفرنسوں کو خصوصیت سے شرکت فرما کر نوازا ہے، جن میں سے آل انڈیا مسلم نیشلسٹ کانفرنس منعقدہ ۱۹۳۲ء یہ کانفرنس ڈاکٹر سید محمود صاحب کی صدارت میں موجودہ نگار سینما کی بلڈنگ کی جگہ پر ہوئی تھی اور جس میں خان عبدالغفار خاں سرحدی گاندھی۔ ڈاکٹر خان صاحب مرحوم خان عبدالصمد خاں، شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی نور اللہ مرقدہٗ اور امام الہند حضرت مولانا ابوالکلام آزادؒ جیسے رہنمایان ملت نے بھی شرکت فرمائی تھی ۱۹۳۶ء میں فلسطین کانفرنس جس کی صدارت رئیس الاحرار حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ لدھیانوی نے فرمائی اور ٹاؤن ہال کے میدان میں حضرت مجاہد ملتؒ نے اس کانفرنس کو خطاب فرماتے ہوئے اپنی جادو بیان تقریر میں جس حرارت و جذبات کا اظہار فرمایا تھا وہ آج ماضی کی ایک یادگار ہیں جن کو کبھی بھلایا نہیں جا سکتا۔ ۱۹۴۱ء میں جمعیۃ علماء ضلع میرٹھ کی تبلیغی کانفرنس جو کہ کڈھ کٹیشر میں حضرت مولانا مفتی محمد نعیم صاحب لدھیانوی کی صدارت منعقد ہوئی تھی اور حضرت مجاہد ملتؒ اس کانفرنس کے خاص مقرر تھے، ۱۹۴۶ء میں آل انڈیا کانگریس سیشن جو کہ وکٹوریہ پارک میرٹھ میں منعقد ہوا تھا اور اسی دوران کے فرقہ وارانہ فسادات پر حضرت مجاہد ملتؒ نے بہت ہی اہم تقریر فرمائی۔ ان کانفرنسوں کے علاوہ حضرت میرٹھ کی جمعیۃ علماء، انجمن تبلیغ الاسلام، مدرسہ عربیہ دارالعلوم جامع مسجد میرٹھ، اور شہر و صدر اور ربین و موتی گنج کے مسلمانوں کے قائم کردہ سیکڑوں جلسوں کی روح حضرت مجاہد ملتؒ کا وجود سمجھا جاتا تھا۔

تقسیم وطن کے بعد پہلی بار آپ نے ۱۹۴۸ء کے شروع میں میرٹھ ٹاؤن ہال کے میدان میں ایک نہایت اہم اور تاریخی تقریر فرمائی جس میں مقامی کانگریس نیتاؤں کے علاوہ ہندو مسلمان اور سکھ تقریباً بیس پچیس ہزار کی تعداد میں موجود تھے۔ یہ وہ وقت تھا، جبکہ ملک میں شر و فساد کے طوفان اٹھ رہے تھے قتل و غارت گری کا بازار ابھی سرد نہیں پڑا تھا، انسانی خون

سے ہولی کھیلی جا رہی تھی، مسلمان ان خونی ڈراموں سے سہمے اور ڈرے ہوئے تھے اور ان پر مایوسیوں کے بادل چھائے ہوئے تھے، حضرت مجاہد ملتؒ نے اس جلسے میں ایک کامل مرد مومن کی طرح بڑے مجاہدانہ انداز و جوش میں فرقہ پرستوں کو للکارتے ہوئے فرمایا، کہ میں "مسلم لیگی" کے نام پر مسلمانوں کا خون نہیں بہانے دوں گا اور اگر مسلمانوں کے خون سے ابھی تمہاری پیاس نہیں بجھی ہے تو میں مسلم نیشنلسٹوں کو تمہارے سامنے پیش کرنے کو تیار ہوں تم ان کے خون سے اپنی پیاس بجھا سکتے ہو اور اگر تمہاری پھر بھی پیاس نہ بجھے تو مجھے بتاؤ میں سرحد سے خدائی خدمت گاروں کو بلا کر تمہارے سامنے پیش کر دوں گا ان کے خون سے اپنی پیاس بجھا لینا، لیکن اب یہ نہیں ہو سکتا کہ تم مسلم لیگی کا نام لے کر کسی مسلمان کا خون بہاؤ، یہاں اب کوئی مسلم لیگی نہیں مسلم لیگی پاکستان جا چکے، یہاں جتنے مسلمان ہیں وہ سب ہندوستانی ہیں اور ہندوستان ہی کو اپنا وطن سمجھتے ہیں دوسری جانب حضرت مجاہد ملتؒ نے نیشنلسٹ مسلمانوں کو تنبیہ فرمائی کہ اب وہ کسی بھی مسلمان کو لیگی نہ کہیں اور نہ ان سے کوئی غیریت برتیں اس طعنے کو اب میں ہرگز برداشت نہیں کر سکتا میں نے مراد آباد کے ایک صاحب کو بھی یہی بات کہی ہے جبکہ وہ کسی کو لیگی لیگی کہہ کر طعن کر رہے تھے، آپ نے فرمایا، کہ لیگی لیڈروں نے کچھ سیدھے سادے مسلمانوں کو جھوٹے نعرے لگا کر گمراہ کر دیا تھا وہ اب ان نعروں کی حقیقت کو خوب سمجھتے ہیں۔"

اس کے بعد جمعیۃ علماء ضلع میرٹھ کی ایک عظیم الشان سیرت کانفرنس میں حضرت مجاہد ملتؒ نے ۱۹۵۹ء میں شرکت کی یہ کانفرنس بھی میرٹھ کی تاریخ میں خاص اہمیت رکھتی ہے کیونکہ تقسیم ملک کے بعد میرٹھ میں مسلمانوں کا یہ سب سے بڑا اور عظیم الشان اجتماع تھا۔ حضرت مجاہد ملتؒ نے جس اجلاس کو خطاب فرمایا اس کی صدارت سعودی عربیہ کے سفیر برائے ہندوستان آنریبل شیخ یوسف الفوزان نے فرمائی تھی۔ حضرت مجاہد ملتؒ نے اپنی زندگی کی آخری تقریر بھی اسی میرٹھ ہی میں کی ہے آپ سیرت النبی کے ایک جلسہ میں تقریر کرنے کے لئے ۲؍جنوری ۱۹۶۲ء کو موضع سسنہ ضلع میرٹھ تشریف لے گئے۔ وہاں سے واپسی پر ۳؍جنوری کو میرٹھ تشریف لائے اول میرے غریب خانہ پر ہمشیرہ کی وفات کے سلسلہ میں عیادت کے لئے تشریف لائے کچھ دیر قیام فرما کر اور تسلی و تشفی کی باتیں فرما کر فیض عام کالج میں مجھے ہمراہ لے گئے جہاں آپؒ نے سیرت پاک پر مدلل تقریر فرمائی بعد ازاں کالج کی جانب سے آپ کو عصرانہ دیا گیا جس میں معززین شہر موجود تھے۔ آپ کو اس وقت نزلہ اور کھانسی کے علاوہ معمولی حرارت بھی تھی آپ کی پسندیدہ غذا میرٹھ کے مشہور کباب بھی پیش کئے گئے جن کو آپ نے بڑے شوق سے تناول فرمایا۔ حضرت مجاہد ملتؒ کی میرٹھ میں یہ آخری تقریر جو مفتی عبدالخالق صاحب ناظم اعلیٰ جمعیۃ علماء ضلع کی صدارت میں ہوئی بطور یادگار رہے گی۔

حضرت مجاہد ملتؒ نے میرٹھ والوں پر بڑے احسانات کئے ہیں۔ میرٹھ کے مسلمانوں پر جب بھی کسی ظلم یا زیادتی کی خبر آپ کو ملتی تو بے چین ہو جاتے تھے اور ان کی مشکلات کو اپنی مشکل جان کر بڑے عزم اور ہمت کے ساتھ میرٹھ پہونچ جاتے اور حالات کا مقابلہ جواں مردی اور صبر و شکر کے ساتھ کرنے کی تلقین فرمانے کے ساتھ ساتھ ہی ہر ممکن امداد فرماتے تھے۔ چنانچہ ۱۹۴۶ء میں گڑھ مکتیشر کے فساد کے موقع پر اور جبکہ پنجاب سے آئے ہوئے فسادیوں نے کوتانہ تحصیل باغپت میں مسلمانوں پر اچانک آفت نازل کر دی تھی۔ اس وقت آپ نے نیچے سے اوپر تک ذمہ داران حکومت کو مظلوموں کی فریاد پہونچانے کا حق ادا کر دیا تھا اور اس سلسلہ میں آپ بار بار میرٹھ تشریف لائے، اور مظلوموں کے نئے اور مظلوموں کے لئے امدادی مشن کو جاری کرایا مرکزی جمعیۃ علماء ہند سے ہزاروں روپے کی امداد دلائی۔

۵؍اکتوبر ۱۹۶۱ء کو علیگڈھ کے واقعہ پر طلباء نے ایک جلوس یہاں بھی نکالا اور بے گناہ مسلمانوں کی دوکانوں کو لوٹا اور نذر آتش کیا گیا۔ فیض عام انٹر کالج کو بھی برباد کیا گیا میں نے جس وقت حضرت مجاہد ملتؒ کو فون پر اس واقعہ سے باخبر کیا تو آپ علیگڈھ سے اسی روز واپس لوٹے تھے بخار کی شکایت تھی، اس کے باوجود آپ فوراً ہی میرٹھ تشریف لے آئے اور سب سے پہلے دارالعلوم تشریف لے گئے اور حالات و خیریت معلوم کی۔ دارالعلوم میں مفتی عبدالخالق صاحب اور شہر کے دوسرے حضرات سے واقعات معلوم کئے۔ اس کے بعد آپ دفتر جمعیۃ علماء شہر تشریف لائے اور وہاں سے مجھے ساتھ لے کر متاثرہ علاقوں کا دورہ فرمایا بعد میں افسران سے مل کر دہلی واپس تشریف لے گئے۔ ۶؍اکتوبر ۱۹۶۲ء کو بڑے پیمانے پر فساد ہوا اور شہر میں کرفیو نافذ کر دیا گیا۔ دوپہر کے وقت میں نے پھر حضرت مجاہد ملتؒ کو فون پر تازہ صورت حال سے مطلع کیا۔ آپ کو اس وقت بخار تیز تھا۔ آپ نے فون پر فرمایا کہ مجھے کافی تیز بخار ہے میں یہاں سے جنرل شاہنواز خاں کو بھیج رہا ہوں۔ لیکن شام کو کیا دیکھتے ہیں

کرشاہنواز خاں سے پہلے حضرت یہاں تشریف لے آئے اور طبیعت کی انتہائی ناسازی کے باوجود حالات کا پورے طور پر جائزہ لے کر مقامی حکام اور مرکزی حکومت کے ذمہ داروں کو آگاہ فرمایا، اس کے بعد دوران فساد حضرت موصوف اپنے دل میں انتہائی کرب و بے چینی لئے ہوئے بار بار میرٹھ تشریف لائے اور مسلمانوں کو صبر و شکر کی تلقین فرمائی اور ان کو ہر طرح دلاسا دیا تو دوسری طرف پنڈت نہرو۔ لال بہادر شاستری اور جنرل شاہنواز کو حالات سے آگاہ کر کے ان کو متحرک کرتے اور حکومت کی ذمہ داریوں کی جانب توجہ دلاتے رہے۔ مقامی کانگریسی نیتاؤں سے بھی تبادلہ خیالات کیا حضرت مجاہد ملتؒ کی یہ سرگرمیاں جو محض مظلوموں کی حمایت اور حکومت کو بدنامی سے بچانے کے لئے تھیں مقامی فرقہ پرستوں کو ایک آنکھ نہ بھائیں اور ایک حقیقت شناس مرد مجاہد پر بھی فرقہ پرستی کا الزام لگائے بغیر نہ رہ سکے دوران فساد کرفیو کے اوقات میں آپ میرٹھ کے سرکٹ ہاؤس پہونچے جہاں یو۔پی کے وزیر اعلیٰ چندر بھان گپتا ہوم منسٹر یو۔پی چودھری چرن سنگھ نائب وزیر ریلوے جنرل شاہنواز خاں، کیلاش پرکاش وغیرہ ٹھہرے ہوئے تھے۔ مولانا نے ان سے ملاقات کی۔ حضرت مجاہد ملتؒ کی چودھری چرن سنگھ سے جھڑپ ہوگئی جس کے بعد چودھری چرن سنگھ نے اپنا رنگ بدل دیا اور حضرت مجاہد ملتؒ و جمعیۃ علماء ہند کے خلاف اخبارات میں بیانات دیئے جن کے ترکی بہ ترکی ہندوستان بھر کے اخبارات نے جوابات دیئے اور بعض اونچے رہنماؤں نے بھی چودھری چرن سنگھ کے بیان کی مذمت کی۔

حضرت مجاہد ملتؒ نے فساد کے دوران میرٹھ کی شہید کی ہوئی مسجدوں کی تعمیر کے لئے حکومت یو۔پی سے مطالبہ کیا اور وزیر اعلیٰ یو۔پی شری چندر بھان گپتا سے ان مسجدوں کو دوبارہ تعمیر کرایا۔ اس کے علاوہ آپ نے میرٹھ کے فساد میں شہید ہونے والے مسلمانوں کے وارثان کو چار چار سو روپے کی امداد دلائی اور مجروحین و لٹے ہوئے مظلوموں کو بھی حکومت سے روپیہ دلایا۔ جمعیۃ علماء ہند کی طرف سے بھی آپ نے کئی ہزار روپیہ مقتولین کے وارثان مجروحین و مظلومین میں تقسیم کرایا۔

ملت کے محبوب رہنما سے میری آخری ملاقات

امریکہ سے واپسی پر حضرت مجاہد ملت مولانا محمد حفظ الرحمان صاحب قدس اللہ سرہٗ و نور مرقدہٗ سے میری آخری ملاقات ۱۲ر جولائی ۱۹۶۲ء کو صبح ۹ بجے حضرت کی نئی دہلی کی قیام گاہ پر ہوئی، کوٹھی کے باہر ملاقاتیوں کا ہجوم تھا حضرت مفتی عتیق الرحمان صاحب نے فرمایا کہ حضرت مجاہد ملتؒ کافی کمزور ہیں مصافحہ کی کوشش نہ کرنا اور زیادہ دیر گفتگو نہ کرنا چنانچہ میں اور میرے ساتھی اس کمرہ میں داخل ہوئے جہاں ملت اسلامیہ کا محبوب رہنما مجاہد اعظم بستر علالت پر دراز تھا، حضرت مجاہد ملتؒ کو میں نے سلام کیا آپ نے مجھے دیکھتے ہی اشارے سے اپنے قریب بلا کر چارپائی پر بٹھا لیا۔ اشارہ سے ہی خیریت معلوم کی اور ساتھ ہی اہل میرٹھ کی خیریت بھی معلوم فرمائی اور آہستہ سے فرمایا کہ سب سے میرا سلام کہہ دینا۔ یہ فرماتے وقت حضرت کی آنکھیں نم ہوگئیں۔ جن کو دیکھ کر میرے دل پر بے حد اثر ہوا۔ اور میرے اندر ایک بے چینی سی پیدا ہوگئی۔

۲ر اگست کی صبح کو آفتاب کی پہلی کرن نکلنے کے ساتھ ہی میرٹھ والوں نے اپنے محسن اور محافظ انسانیت و شرافت مجاہد ملتؒ کی وفات کی اندوہناک خبر سنی تو جو جس جگہ تھا کچھ دیر کے لئے وہیں ساکت ہوگیا بازار بند ہوگئے اسکول اور کالج بند کر دیئے گئے۔ ایصال ثواب کی مجلسیں شروع ہوگئیں اور اسپیشل بسوں کے ذریعے ہزاروں شہریوں نے پہونچ کر اپنے محبوب رہنما کے آخری دیدار کئے اور آغوش رحمت کے سپرد کرنے کے بعد واپس لوٹے۔

آہ! حضرت مجاہد ملتؒ کی شخصیت، آپ کی شفقت، آپ کا خلوص و ہمدردی، آپ کی ملک و ملت کے لئے مسلسل جد و جہد، ایثار و قربانی اور مجاہدانہ جرأت و ہمت یہ ایسی چیزیں ہیں جن کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ حضرت مجاہد ملتؒ کی ذات اس دور میں ملت اسلامیہ کے لئے ایک آخری سہارا تھی افسوس کہ قدرت کے ہاتھ نے ہم سے اس کو بھی چھین لیا۔ اس قحط الرجال کے دور میں ہماری نگاہیں سارے ملک میں تلاش کر رہی ہیں۔ لیکن ایسے شخص پر نظر نہیں پڑتی جس کو حضرت مجاہد ملت مولانا محمد حفظ الرحمان صاحب قدس اللہ سرہٗ و نور مرقدہٗ کا صحیح جانشین سمجھا جائے۔

منشی عیسیٰ بھائی ابراہیم۔ کاوی ضلع بھروچ

حضرت مجاہد ملت قدس اللہ سرہٗ کی یاد

مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب قدس سرہٗ سے جمعیۃ علماء ضلع بھروچ کے ناظم کی حیثیت سے خط وکتابت کا سلسلہ ۱۹۴۲ء سے شروع ہوچکا تھا مگر ملاقات کا شرف آزادی کے بعد جمعیۃ علماء ہند کے (بمبئی) کے تاریخی اجلاس کے موقع پر ہوا۔ اس اجلاس کی مجلس مضامین میں حضرت مجاہد ملت کی شخصیت اور خطابت کے جوہر بہت قریب سے مطالعہ میں آئے جب ہم بوری بندر اسٹیشن پر مولانا کو الوداع کرنے گئے تو حضرت ہمیں دیکھ کر پلیٹ فارم پر تشریف لے آئے بہت محبت سے ملاقات سے نوازا اور رفیع احمد قدوائی رحؒ سے بھی ملاقات اور تعارف کرایا، پھر لکھنؤ، حیدرآباد اور سورت کے سالانہ اجلاسوں میں بھی مسلسل ملاقاتیں ہوتی رہیں علاوہ ازیں بمبئی، ایلوک، پالنپور، احمدآباد، رآندیر، سورت بھروچ، ریکھیر، کوسنبہ، کاوی کے جلسوں اور کانفرنسوں میں بھی بار بار ملاقاتیں ہوئیں بہرحال ان ملاقاتوں کے ذریعے آپ کی شخصیت کو دیکھنے اور سمجھنے کے مواقع میسر آتے رہے۔ نیز اہم ملی اور ملکی مسائل کے بارے میں حضرت کے خیالات وخدمات سے واقفیت ہوتی رہی کئی مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ جہاں گھنٹوں حضرت کی خدمت میں حاضری کا اتفاق ہوا کئی مرتبہ قیام گاہ پر نماز فجر اس طرح ادا ہوئی کہ حضرت امام تھے اور میں تنہا مقتدی۔ ایک مرتبہ سورت میں جناب محسن بھائی حضوری کے مکان پر قیام تھا وہاں ڈابھیل کے اطراف سے ایک صاحب نے آکر اطلاع دی کہ حضرت فلاں صاحب کو سانپ نے کاٹا ہے مجاہدؒ نے فوراً پانی پر دم کرکے اس کو پلایا پھر وہ چلا گیا ہم نے دریافت کیا تو فرمایا کہ ڈابھیل کی مدرسی کے زمانے سے یہ عمل میرے پاس ہے سینکڑوں مارگزیدہ صحت یاب ہوچکے ہیں۔ ہم نے عرض کیا کہ آپ ہمیں یہ عمل سکھائیں گے؟ تو فرمایا کہ یہ عمل محض دو ہی آدمیوں کو سکھایا جاتا ہے اور میں حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی اور حضرت مولانا انور شاہ رحؒ کو سکھا چکا ہوں۔ پھر ہنس کے فرمایا کہ یہ دونوں بزرگ دنیا سے رحلت فرما چکے ہیں نہ معلوم انھوں نے کسی کو سکھایا بھی ہے یا نہیں میرے وطن کاوی میں غالباً حضرتؒ تین بار تشریف لائے۔ ایک مرتبہ مجھ سے پروگرام طلب فرمایا میں نے عرض کیا عصر کی نماز کے بعد بڑی مسجد میں جمعیۃ علماء کے بارے میں تقریر فرمائیں اور شب کو آزاد چوک میں سیرت پر تقریر فرمائیں۔ فرمایا بہت اچھا عصر کے بعد بڑی مسجد میں۔ جب میں نے ابتداءً ہماری دعوت پر تشریف لانے اور شدید گرمی اور گرد میں تکلیف اٹھانے پر حضرت کا شکریہ ادا کرکے سامعین کو بتایا کہ حضرت مجاہد اس وقت تو جمعیۃ علماء کی اہمیت پر تقریر فرمائیں گے۔ اور رات کو آزاد چوک میں سیرت مقدسہ پر تقریر فرمائیں گے۔ پھر جب حضرت مائیک پر تشریف لے آئے تو ابتدا ہی ان الفاظ سے کی کہ مجھے عیسیٰ بھائی پر تعجب ہوتا ہے کہ شاید یہ جمعیۃ علماء کو کوئی دینی جماعت اور اس کی خدمات کو دینی کام نہیں سمجھ رہے ہیں ورنہ یہ امتیاز کیسا؟ واللہ اگر ہم جمعیۃ علماء کے کام کو دینی کام نہ سمجھتے تو یہ در در اور گھر گھر کی خاک کیوں چھانتے۔ الحمد للہ مسند حدیث پر بیٹھ کر احادیث ہم پڑھا سکتے ہیں اور اس میں بڑا لطف آتا ہے۔ حضرت شیخ الاسلام قدس سرہٗ نے بھی ابتداء میں اپنے شفیق استاد حضرت شیخ الہندؒ سے یہی عرض کیا تھا کہ حضرت درس حدیث چھوڑ کر آپ کس کام میں لگے ہیں۔ تو حضرت شیخ الہند نے فرمایا تھا کہ تم اپنے ان الفاظ کو یاد رکھنا اور دیکھنا کہ تم کیا کروگے۔ پھر جب رات کو سیرت مقدسہ پر تقریر فرمائی تو جمعیۃ علماء کا نام تک نہیں آنے دیا مگر جب تقریر کے اختتام پر ساڑھے گیارہ سو کی تھیلی پیش کی گئی تو ہنس کے فرمایا کہ کاوی جمعیۃ علماء کا شکریہ ادا کرتا ہوں میں نے جمعیۃ علماء کا نام اس شکریہ کے ضمن میں لیا ہے ورنہ عیسیٰ بھائی نے تو سیرت پر ہی بولنے کو فرمایا تھا۔

سورت میں ایک مرتبہ مقامی کانگریسیوں نے آپ کو ٹیبل ٹوک کی میٹنگ میں مدعو فرمایا میں بھی ساتھ تھا وہاں حضرت مجاہد ملت سے سوال کیا گیا کہ کیا وجہ ہے کہ کانگریس اور کانگریسی حکومتوں کا اثر عوام پر وہ نہیں جو آزادی سے قبل تھا؟ آپ نے فرمایا کہ آزادی سے قبل کانگریسی احباب جب دیہاتوں میں گھومتے تھے اس وقت ان کے سینوں میں خدمت خلق کا جذبہ موجزن تھا اور آج محض کھدر کی پوشاک ہے وہ جذبۂ خدمت نہیں رہا اس کی مثال یوں سمجھئے کہ ایک تو ہوتا ہے گلاب کا اصل پھول اور ایک ہوتا ہے گلابی کاغذ کا پھول۔ کاغذی پھول دیکھنے میں اصل پھول سے بھی زیادہ دلکش ہوگا مگر اس میں وہ خوشبو کہاں جو اصل پھول میں ہے یہی وجہ ہے کہ عوام پر سے کانگریس کا اثر زائل ہو رہا ہے کیوں کہ ان میں وہ اصلیت اور جذبۂ خدمتِ خلق کی خوشبو نہیں رہی۔

دوسرا سوال یہ تھا کہ گجرات کے مسلمان کانگریس سے دور کیوں رہتے ہیں۔
حضرتؒ نے یہ جواب دیا تھا کہ گجرات کے مسلمان جنگ آزادی میں بھی بہت قلیل تعداد میں کانگریس میں شریک تھے البتہ آزادی کے بعد وہ کانگریس کے قریب آرہے تھے مگر افسوس ہمارے اکثریتی بھائیوں نے انھیں اپنانے میں کوتاہی کی وہی شکوک وشبہات اور اکثریت کا پندار سنگ راہ بن گیا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان مایوس اور بددل ہوکر بدک گئے البتہ آپ یوپی میں آئیں اور دیکھیں وہاں کا مسلمان کانگریس سے لڑے گا مقابلہ ہوگا مگر کانگریس کو چھوڑے گا نہیں۔
حضرتؒ کے جوابات سے کانگرسی احباب بہت متاثر ہوئے۔

تذکیر ضلع سورت میں غالباً ۱۹۴۳ء یا ۱۹۴۴ء میں شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی قدس سرہٗ تشریف فرما تھے۔ حضرت مجاہدؒ نے بھی تشریف آوری کا وعدہ فرمایا تھا مگر اچانک تاریخ میں تبدیلی ہوجانے کی وجہ سے تشریف نہ لاسکے مجلس میں گفتگو کے درمیان حضرت شیخ نے فرمایا کہ مولانا حفظ الرحمٰن آزادی وطن کے لئے ایسے بے چین اور بے قرار رہتے ہیں جیسے سیماب۔

ایک مرتبہ احمد آباد میں ٹیل لوک کی میٹنگ رکھی تھی شہر کے مشہور مسلمان وکلا، سیاسی لیڈران اور سربرآوردہ حضرات کا بہت بڑا اجتماع تھا وہاں ایک سوال کیا گیا کہ محکمہ کسٹوڈین کی چیرہ دستیوں کے خلاف جمعیۃ علماء نے کیا خدمت انجام دی؟ حضرت مجاہدؒ نے فوراً جواب دیا آزادی کے بعد مسلمانوں کی کروڑوں اربوں روپوں کی املاک پر بلا قانون کے حکام نے قبضہ شروع کیا تو ہم خدام جمعیت نے وزیراعظم سے ملاقات کی۔ اور کہا کہ دنیا کی کوئی حکومت بھی ایسی نہیں ہے کہ جہاں لاقانونیت جاری ہو اور بلا قانون کے رعایا کے املاک پر قبضہ کیا جائے اس کے فوراً بعد حکومت کی جانب سے ایک قانون بنایا گیا۔ یہ قانون یقیناً غیر منصفانہ تھا پھر ہم ذمہ داران جمعیۃ نے ارباب حکومت سے کہا کہ یہ قانون دیکھ کر دنیا کیا کہے گی؟ یہ تو صریحاً بے انصافیوں کا مرقعہ ہے اس کے بعد قانون میں تبدیلی کرکے منصفانہ اور عادلانہ قانون بنایا گیا جو آج آپ لوگوں کے ہاتھ میں ہے اس پر ایک وکیل صاحب نے سوال کیا کہ فلاں دفعہ قابل اعتراض نہیں ہے؟ جواب دیا گیا کہ اس کا تدارک حاشیہ پر ہی کیا گیا ہے ان صاحب نے حاشیہ دیکھ کر ہنستے ہوئے سر تسلیم خم کیا پھر حضرت نے فرمایا کہ اب یہ مرحلہ باقی رہ گیا ہے کہ اس قانون پر پورا عمل درآمد کرایا جائے جمعیۃ علماء اس کے لئے کوشاں ہے پھر ایک صاحب نے سوال کیا کہ جمعیۃ علماء آزادی سے قبل تو سیاست میں حصہ لیتی تھی کیا وجہ ہے کہ اب جب کہ لیگ بھی نہیں رہی جمعیۃ بھی سیاست سے کنارہ کش ہوگئی؟ حضرتؒ نے جواب دیا کہ آزادی سے قبل مجالس قانون ساز میں مسلمانوں کے لئے نشستیں محفوظ تھیں اور انتخاب جداگانہ تھے مگر آزادی کے بعد انتخاب مشترکہ اور سیٹیں ریزرو نہیں رہیں اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج اکثریتی فرقہ کی بعض فرقہ وارانہ جماعتیں بھی مجالس قانون ساز میں اپنے نمائندے کامیاب نہ کرا سکیں تو اقلیتی فرقہ کی سیاسی جماعت کس طرح کامیاب ہوسکتی ہے دوسرے یہ کہ اگر جمعیۃ سیاست میں حصہ لے بھی تو کل مسلمانوں میں سے دوسری جماعتیں بن کر سیاست میں حصہ لینا شروع کردیں گی اور مسلمان Divide in Minority کا شکار ہوکر رہ جائیں گے۔ اس جواب کو مسلمانان احمد آباد نے بے حد پسند کیا اور ان کی پوری تشفی ہوگئی۔ اب سے کوئی تین سال قبل الیول ضلع سابر کانٹھا میں ایک جمعیۃ کانفرنس ہوئی تھی وہاں جمعیۃ علماء صوبہ گجرات کی انتخابی میٹنگ بھی رکھی گئی تھی حضرت مجاہدؒ نے اس میٹنگ میں بھی ایک پرزور پر اثر تقریر فرمائی تھی ذمہ داران جمعیۃ میں ایثار وکردار اور قوت عمل پیدا کرنے کی غرض سے حضرت مجاہدؒ نے نہایت دردناک لہجہ میں یہاں تک فرمادیا تھا۔ کہ افسوس آج پورے ہندوستان میں احباب اس بات کے خواہاں رہتے ہیں کہ ہر کانفرنس میں خواہ چھوٹی ہو یا بڑی حفظ الرحمٰن کو ضرور شریک ہونا چاہئے آخر یہ صورت حال کہاں تک رہے گی۔ اب تو ہم نے قبر میں پیر لٹکا دیئے ہیں جمعیۃ کے ہر خادم کا فرض ہے کہ وہ اپنی ذمہ داریوں کی ادائیگی میں ہرگز ہرگز تساہل نہ کرے اس وقت میٹنگ پر سناٹا اور ایک رقت خیز کیفیت طاری ہوگئی۔ ۔ ۔

بہرحال حضرت مجاہدؒ جہاں کہیں بھی تشریف لے گئے وہاں اپنی صداقت وامانت بصیرت ومحبت وخلوص وہیبت ایثار وکردار متانت وخطابت تدبر وتفکر بے باکی وبے لوثی اور اپنی خداداد قابلیتوں نیز صلاحیتوں کے گہرے نقوش چھوڑ آئے ہیں جنھیں ہر وہ شخص ہمیشہ یاد رکھے گا جسے حق تعالیٰ نے محاسن ومحامد کے ادراک اور حضرت مجاہدؒ کی جان بازانہ خدمات کا شعور حاصل ہے۔
میرے خیال میں ہندوستان کی دوسری اقلیتیں ہی نہیں بلکہ اکثریتی فرقہ بھی حضرت مجاہد ملت جیسے سراپا درد اور جامع الصفات شخصیت پیدا نہیں کرسکا۔ آہ ۲ اگست ۱۹۶۲ء کو یہ آفتاب دین وسیاست غروب ہوگیا ملت اسلامیہ ایک لاثانی مفکر ومدبر ایک لاجواب خطیب مصنف اور ایک عظیم رہنما سے محروم ہوگئی سردست کانگریس ایک شجر بے سہارا پارلیمنٹ ایک جسد بے زبان مسلمانان ہند ایک پراگندہ ریوڑ، اور جمعیۃ علماء ایک تن خستہ جان اور نیم بسمل کی حیثیت سے رہ گئی ہے لہٰذا حضرت شیخؒ اور حضرت مجاہدؒ سے محبت رکھنے والوں کا فرض ہے کہ ان دو اکابر کی محبوب ۴۲۵

ص۴۲۵ جماعت جمعیۃ علماء کے ساتھ ہر معاملہ میں تعاون فرمائیں اور ان بزرگوں کی اس محبوب یادگار کو تقویت پہنچائیں۔

آہ مجاہد ملت

از:- کوثر بھارتی (نوساری)

حفظ رحمٰن' مجاہد ملت — تجھ پہ نازاں خدا کی رحمت ہو
تو ہی باندھے ہوئے کفن آیا — حفظ رحماں تری ہی تھی ہمت

وقف تھی جاں تری وطن کیلئے — زندگی بھر کی قوم کی خدمت
عزم تھا تیرا کوہ کی مانند — حوصلہ آسمان کی صورت

بات ڈنکے کی چوٹ کہتا تھا — ہاں تری بے مثال تھی جرأت
دشمنی تھی خلوص پر مبنی — دوستی کی نہیں کوئی قیمت

تجھ کو شہرت کی تھی نہ کچھ پروا — تجھ کو حاصل نہ تھی کوئی دولت
عالم باعمل، سیاستداں — لائق احترام شخصیت

دوست دشمن تھے معترف تیرے — سب کے دل میں ہی تری وقعت
فن تقریر ہو کہ ہو تحریر — تھی ہر اک بات کی صلاحیت

درد دنیا کا تھا تیرے دل میں — مقصد زندگی تھا بس خدمت
تو مقرر بھی تھا تو شعلہ بیاں — بڑھتی جاتی تھی دم بدم حیرت

وہ جبلپور ہو کہ سیندوسی — ہو کہیں بھی فساد کی صورت
آہ تیری زبان کا جادو — جس میں تسخیر قلب کی قوت

گھر میں آرام سے نہ بیٹھا تو — تو سراپا تھا پُرزۂ حرکت
اے کہ تو تھا مصنف قابل — تیری تصنیف لائق عظمت

یاد ہم کو ہے ملک کی تقسیم — اور اس کا نتیجہ برکت
تو نے لکھے قصص ہیں قرآں کے — تو نے لکھا صحیفۂ سیرت

چھوڑیئے دوسری جگہ کی بات — راجدھانی کی تھی یہ کیفیت
اے محب وطن کہاں ہے تو — تجھ کو روتی ہے آج جمعیت

گرم تھا قتل و خون کا بازار — آج غنڈوں کے پاس تھی قوت
اب تجھے ڈھونڈنے کہاں جائیں — رہبر قوم خادم ملت

تھے درندوں کی شکل میں انساں — بھیڑیئے کی لئے ہوئے خصلت
تجھ سا رہبر کہاں سے لائیں ہم — مرد میدان جنگ حریت

شہر دہلی تھا بیاباں میں — آدمیت کی تھی نہ اصلیت
رو رہے ہیں تجھے زمیں والے — تو نے کی سوئے آسماں ہجرت

لٹ رہا تھا متاع مال و زر — چور اچکوں کو دی گئی مہلت
زندگی میں تجھے نہ پہچانا — ہم نے جانی نہ تھی تری قیمت

بربریت کا ناچ ہوتا تھا — ہر طرف ایک عالم وحشت
قوم مردہ پرست ہے تیری — بعد مرنے کے ہے تری عزت

آج یلغار تھی علی الاعلان — تھی یہ تقسیم ملک کی برکت
ڈھونڈتی ہے تجھے نظر میری — تک رہا ہے یہ دیدۂ حیرت

کتنا مکروہ بدنما چہرہ — آہ دلی تو اتنی بدصورت
لب پہ کوثر کے ہے دعا ہر دم — تجھ کو پروردگار دے جنت

دم بخود تھے ابوالکلام آزاد — اور نہرو تھے دیدۂ حیرت
روح پر ہو تری ہزار سلام — تجھ پہ ہر دم ہو سایۂ رحمت

تا قیامت ہو نور کی بارش
شعلۂ طور ہو تری تربت

عبدالصمد صارم الازہری

فخرِ وطن

یادش بخیر! مولانا حفظ الرحمان سیوہاروی کا اصلی نام معزّ الدین تھا اور وہ بلاشبہہ دین کی عزت تھے۔ ان کے پدر بزرگوار کا نام شمس الدین تھا جو بھوپال میں انجنیر تھے، ان کے بڑے بھائی فخرالدین ڈپٹی کلکٹر میرٹھ تھے جو اب بھی بقیدحیات ہیں اور ان سے بارہ چودہ سال بڑے ہیں۔ حفظ الرحمان صاحب سے بڑے ایک اور بھائی بھی بڑے تھے جن کا نام بدرالدین تھا یہ ایڈوکیٹ تھے عرصہ ہوا انتقال کر چکے۔ ان کے سب سے چھوٹے بھائی حکیم صلاح الدین ہیں جنھوں نے ان کی بڑی تیمارداری کی۔ ان کی ہمشیرہ جو ان سے بڑی ہیں، حافظ محمد ابراہیم کی بیوی ہیں۔ ایک بہن اور ان سے بڑی تھیں جن کا چند سال ہوئے انتقال ہوگیا۔ مولانا کے ایک لڑکا محمد اسلم اور پانچ لڑکیاں ہیں جن میں سے دو کی شادی ہو چکی ہے۔ ایک کی شادی حافظ محمد ابراہیم کے بڑے لڑکے عزیز سے ہوئی۔ دوسری کی حاجی محمد ایوب سے۔ تین جوان لڑکیاں اور ہیں۔

حفظ الرحمان نام ان کی والدہ نے رکھا اور وہ اسی نام سے مشہور ہوئے۔ مولانا نے ابتدائی اور انتہائی تعلیم مدرسہ "فیض عام" سیوہارہ میں پائی۔ دورۂ حدیث کے لئے دیوبند تشریف لے گئے اور وہیں مدرس ہوگئے۔ مولانا انور شاہ کشمیریؒ کے ساتھ اسٹرائک میں وہاں سے ڈابھیل چلے گئے۔ مگر وہاں صحت اچھی نہ رہی، لہٰذا کلکتہ چلے گئے اور رلو رجیٹ پور روڈ کی ایک مسجد میں قرآن پاک کا ترجمہ سنانے لگے یہاں بھی صحت اچھی نہ رہی تو پھر امروہہ میں صدرالمدرسین ہو کر چلے آئے۔ پھر انھوں نے اور مفتی عتیق الرحمٰن صاحب نے شیخ فیروز الدین صاحب کی مدد سے ندوۃ المصنفین قائم کیا۔ یہاں سے کئی قابل قدر کتابیں شائع کیں۔ تقسیم ملک کے بعد سیاست نے انھیں مہلت نہ دی اور وہ جمعیۃ علمائے ہند ہی کے ہو رہے۔ سیاسی زندگی نے انھیں علمی زندگی ترک کرنے پر مجبور کر دیا۔

نوجوانی میں انھوں نے تحریکِ خلافت میں کام کیا اور رہنمائی پھر کانگریسی تحریکات میں کئی بار جیل جانا ہوا۔ ایک بار سول نافرمانی کے سلسلہ میں وہ جمعیۃ علماء ہند کی طرف سے ڈکٹیٹر بنائے گئے اور گرفتار ہوئے۔ یہاں سے ان کی شہرت کو چار چاند لگ گئے۔

مولانا نے سب سے پہلے ایک رسالہ "مالابار میں اسلام" لکھا۔ پھر اور چھوٹی چھوٹی کتابیں لکھیں۔ ندوۃ المصنفین میں آنے کے بعد انھوں نے بڑی معیاری کتابیں لکھیں جن میں بلاغ المبین فی مکاتیب سیدالمرسلین"۔ "اسلام کا اقتصادی نظام"۔ "قصص القرآن" اور "اخلاق و فلسفۂ اخلاق" مشہور ہیں۔

حفظ الرحمان دیوبند گئے تو مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی کی خدمت میں رہے اور انھیں کے رنگ میں تقریر کرنے لگے۔ وہ مولانا انور شاہ کشمیریؒ کے شاگرد رشید تھے۔ بلا کے ذہین اور بولنے والے تھے۔ درس و تدریس اور تقریر و تحریر دونوں کے مرد میدان تھے۔ ہر فن کی کتابیں پڑھا لیتے تھے اور ہر فن میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے۔ اپنی خداداد قابلیت کی بنا پر وہ بہت جلد دارالعلوم دیوبند کے اونچے مدرسین میں ہو گئے تھے۔

ایسے عالم کبھی کبھی پیدا ہوتے ہیں۔ جو قلم کے بھی بادشاہ ہوں، اور تقریر اچھی کر سکیں۔ حفظ الرحمان تحریر و تقریر دونوں کے ماہر تھے۔ ان کی تحریریں بہت سلجھی ہوئی ہوتی تھیں اور ان کی تقریر بھی اس قدر سلجھی ہوئی اور دلچسپ ہوتی تھی۔ کیا مجال جو کوئی اٹھ کر چلا جائے۔ وہ سات۔ آٹھ گھنٹے بے تکان بول لیتے تھے۔ نہ صرف سیاست پر بلکہ مذہبی عنوانات پر خصوصیت سے وہ بہت اچھا بولتے تھے۔

حفظ الرحمان بڑے مرد مجاہد تھے تھکنا جانتے ہی نہ تھے۔ جہاں کہیں فساد ہوتا، پہنچ جاتے اور بڑے نڈر ہو کر کام کرتے۔ وہ مسلمانوں کو اپنی پناہ میں لئے ہوئے تھے۔

مولانا بچپن ہی سے بڑے مہماں نواز تھے۔ یہ بات اُن کے تمام دوستوں میں مشہور تھی۔ بڑے ملنسار اور خلیق تھے انکی ازدواجی زندگی بے غل و غش نہایت صاف ستھری گزری خلیق ایسے کہ دشمن بھی آنکے

اخلاق کے مدّاح تھے۔ وہ ہر شخص کے کام آتے تھے اور کبھی کسی کام میں عذر نہ کرتے تھے۔ عزیزوں، دوستوں کے مقدمات بڑی خوش اسلوبی سے سلجھا دیتے۔ اللہ نے انھیں معاملہ فہمی کی بڑی قوت عطا کی تھی۔

مولوی حفظ الرحمان جہاں تک ہو سکتا کسی کی بُرائی نہ کرتے، ہر ایک کی تعظیم کرتے اور ہر ایک سے پیار و محبت سے پیش آتے وہ جائے۔ سگریٹ یا تمباکو، غرض کسی چیز کے عادی نہ تھے۔ البتہ کھانے کے شوقین تھے۔ کبھی سیو ہارے آتے اور بیروں کا زمانہ ہوتا تو ایک ہی نشست میں کچے کھٹے بیر ڈلیا بھرے کھا جاتے۔ شاید یہی چیز ان کی موت کا باعث ہوئی۔ کیونکہ انھیں چند ماہ پیشتر انفلوئنزا ہوا تھا اور ابھی کھانسی باقی تھی کہ انھوں نے ایک دعوت میں خوب چٹنی، اچار اور مربے کھائے اور پھر علاج کی طرف زیادہ توجہ نہ دی۔ کیونکہ وہ دوا بہت کم کھاتے تھے۔

حفظ الرحمان بڑے سخی اور فیاض تھے۔ میرے پھوپی زاد بھائی تھے۔ وہ مجھ سے بہت ہی محبت کرتے تھے۔ ہمیشہ عید، بقرعید کو وہ میرے لئے کپڑے بناتے اور میری پسند کا جوتا ٹوپی لوا کر دیتے۔

جب کبھی میں لاہور سے آتا تو وہ مجھ سے ملنے ضرور آتے۔ ایک دفعہ میں لاہور سے صرف ایک ہفتہ کے لئے آیا اور یہ سوچ کر انھیں اطلاع نہ دی کہ میری وجہ سے انھیں خرچ کرنا اور تکلیف اٹھانی پڑتی ہے۔ اتفاق بات کہ انھیں بھی میرے آنے کا پتہ نہ چلا اور میں واپس چلا گیا۔ تین ماہ بعد پھر آیا تو وہ مجھ سے ملنے کے لئے آئے اور کہنے لگے۔ پچھلی دفعہ تم آئے تو مجھے اطلاع تک نہ دی۔ میں نے کہا کہ مجھے شرم آئی کہ آپ میری وجہ سے خرچ کرتے ہیں اور تکلیف اٹھاتے ہیں، اس لئے اطلاع نہ دی۔ پھر یہ کہ تین ماہ پہلے جب میں آیا تھا تو آپ سے ملاقات ہو بھی چکی تھی۔ تو وہ مجھ پر بہت خفا ہوئے اور کہا، جب بھی آیا کرو، مجھے فوراً اطلاع دیا کرو، تکلیف کی کیا بات ہے۔

میں مولوی صاحب کا گود کھلایا بچہ تھا، اور ان کے، میرے خیالات میں بڑا اختلاف تھا۔ مذہبی بھی اور سیاسی بھی۔ دونوں ایک گھرانے کے فرزند، مگر کبھی بھی ایسا نہیں ہوا کہ میں نے ان کی محبت میں کوئی کمی دیکھی ہو یا کبھی کسی معاملے میں ان کی میری تلخ گفتگو ہوئی ہو۔ کئی بار ایسا ہوا کہ کسی سیاسی یا مذہبی معاملہ پر گفتگو ہو گئی اور بات بڑھ گئی، مگر کبھی کوئی تلخی پیدا نہیں ہوئی۔ ہمیشہ نہایت سنجیدگی اور پیار محبت کے ساتھ گفتگو ہوئی۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ مولوی صاحب میں تعصب نہ تھا۔ اور وہ بڑی حد تک روشن خیال تھے۔ وہ قدیم و جدید کے جامع تھے اور ایک بڑے عالی ظرف عالم تھے

حضرت مجاہد ملت کی آخری تمنا

ابو صالح محمد عبد الجلیل الخطیب
مدیر
"روشنی" بنگلور

حادثۂ تقسیم ہند کے بعد جہادِ آزادی کے عظیم مجاہد حضرت مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب نور اللہ مرقدہٗ ہندوستانی مسلمانوں کے بیشمار مسائل کے لئے پریشان و کوشاں رہے۔ ملک کی آزادی کا وہ تصور جو حضرت امام الہند شاہ ولی اللہ محدث دہلوی قدس سرہٗ، حضرت مولانا شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ، حضرت شاہ سید احمد شہیدؒ، حضرت مولانا شاہ محمد اسمٰعیل شہیدؒ، حضرت شاہ امداد اللہ تھانوی مہاجر مکیؒ، حضرت امام ربانی مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، حضرت مولانا حجۃ الاسلام محمد قاسم نانوتویؒ، حضرت مولانا شیخ الہندؒ مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ، مفتی اعظم حضرت مولانا کفایت اللہؒ، حضرت مولانا ابو الکلام آزاد اور شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے پاک و شفاف ذہنوں میں تھا۔ افسوس وہ اپنوں کی ریشہ دوانیوں کے باعث عمل میں نہ آسکا اسی لئے اس آزادی کو ہم اپنے اکابر کے مبارک اور مضبوط عقیدہ کی بنیاد پر حادثہ کہنے پر مجبور ہیں۔ اس حادثہ کا شکار زیادہ تر شمالی ہند کے مسلمان تھے۔ پورے ملک میں ہر طرف دہشت، خوف اور ہیبت طاری تھی۔ ان حالات میں ایک تنہا شخصیت اپنی شبانہ روز انتھک جد و جہد کے ساتھ مسائل کی پیچیدگیوں کو حل کرنے میں مصروف تھی۔ انہی قربانیوں کے باعث حضرت مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب مرحوم مجاہدین کی صف میں داخل ہو کر مجاہد ملت کے کامیاب خطاب سے نوازے گئے۔ گو جنوبی ہند مثلاً مدراس، میسور، آندھرا اور کیرالا کے مسلمان اپنی دوری اور بے حسی کی وجہ سے شمال کی آفتوں اور مصیبتوں سے محفوظ تھے۔ پھر بھی جو کچھ اخبارات کے ذریعہ یا فطری اثرات دماغوں پر مسلط تھے ان سے متاثر ضرور تھے اور مسائل کا چونکہ پورے ملک سے تعلق تھا اس لئے خدشہ سے تو خالی نہیں۔ آزادی کے پہلے کے تمام لیڈر یا اڑ گئے تھے یا سو گئے تھے۔ میدان میں ایک بھی موجود نہیں تھا۔ ساری چیخ و پکار سارا جوش و خروش، تمام آسمان شگاف نعرہائے تکبیر و زندہ باد گویا کافور ہو چکے تھے، مردہ دلی اور بزدلی کا یہ عالم تھا کہ آزادی کیا آئی اپنے ساتھ مسلمانوں کے لئے بدحواسی، غلط فہمی، اور نادانی کے سبب ملک کے اندر رہنے کے باوجود انگریزی دور سے زیادہ غلامی اور بے بسی کا تصور دماغوں پر مسلط کر لینے کا المیہ لے کر آئی۔

ان حالات سے متاثر ہو کر ۱۹۵۳ء میں مسلسل تقاضوں پر پہلی بار وقت نکال کر حضرت مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب نے جنوبی ہند کا دورہ کیا اور ان کے بصیرت افروز پیغام و تقاریر سے متاثر ہو کر عوام و خواص ایک ایک کر کے گھروں سے نکل پڑے اور حضرت مجاہد ملت کے اطراف جمع ہو گئے۔ جمعیۃ علماء ہند کی شاخ کا بنگلور میں قیام عمل میں آگیا۔ یہ ایک ہنگامی اور محدود سفر تھا اور مسائل کے باعث جوش بھی ہنگامی تھا۔ مولانا کے تشریف لے جانے کے بعد ختم سا ہو گیا۔ پھر مولانا محمد اسماعیل صاحب سنبھلی اور مولانا عاقل صاحب الہ آبادی کو مستقل تنظیم اور ترویج کے لئے مرکز سے روانہ کیا گیا۔ مختلف اضلاع کے دورے ہوئے۔

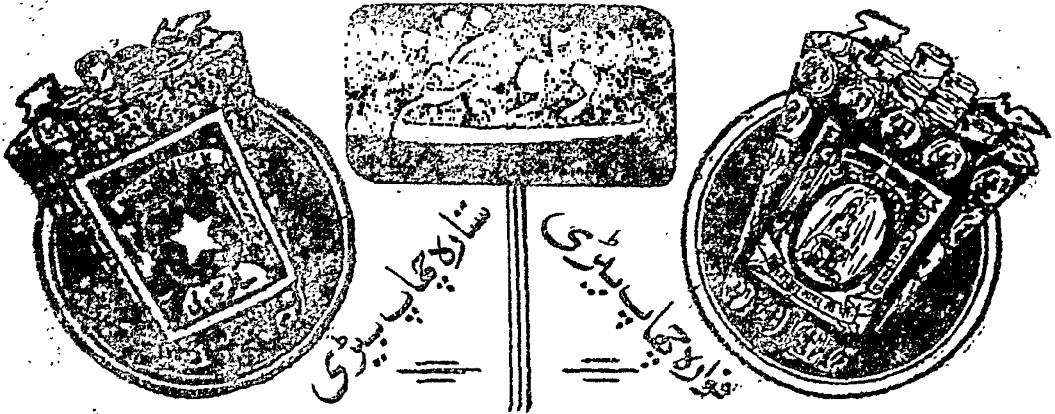
قیام جمعیۃ کے بعد حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی نور اللہ مرقدہٗ ان علاقوں میں تین مرتبہ لائے گئے۔ حضرت اقدس کو سیاسی حیثیت اور جہاد آزادی کے کامیاب مجاہد کے اسٹیج سے کسی نے سمجھا نہیں۔ بلاشبہ علوم و معارف اسلامیہ کی بڑی شخصیت کے مالک اور اسلاف عارفین کے قبیل کے بزرگ کی حیثیت سے تعارف ہوا اس طرح بیعت و ارشاد کا ہنگامی تعلق قائم ہو گیا۔ سلسلۂ صوفیہ متعارفہ کے اوراد و ارشادات کی لہر دوڑ گئی۔ اگر ان علاقوں کے مسلمانوں کے روبرو حضرت اقدس کی زندگی کا وہ رخ بھی آجاتا جس میں وہ درسِ حدیث کو چھوڑ کر دن رات مصروفِ جہاد تھے اور اپنے معلم و مربی کامل حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن نور اللہ مرقدہٗ کی معیت میں مالٹا کے اسیر کی حیثیت سے تاریخ میں نامور تھے تو شاید متوسلین و متعلقین کے اندر اس کی اہمیت پیدا ہوتی۔ دار العلوم دیوبند کے سفراء اور مبلغین اپنے مختلف اوقات میں تشریف لائے۔ مگر ان حضرات نے کبھی جہادِ آزادی کی داستان کو کماحقہ مستقل تربیتی اور معلوماتی انداز میں نہیں پیش کیا۔ ان تمام باتوں کے لئے رکاوٹ ان علاقوں کا وہ غلط ماحول تھا جس میں مغربی ذہنیت کے سبب لیگ اور اسی قبیل کی تحریکوں نے اپنے اثرات چھوڑ رکھے تھے ملک آزاد ہوا اور افسوس کہ تقسیم کے ساتھ آزاد ہوا مسلمانوں کے اندر جو لوگ انگریزی دورِ حکومت میں کارندے تھے۔ آزادی کے بعد ان کا وہ پارٹ موجودہ اقتدار کی نذر ہو گیا۔ مسلسل غلامی کے باعث ان میں سے بعض کی آنکھوں سے شرم و حیا کا پانی سوکھ چکا تھا۔ دل و دماغ کے اندر بے غیرتی پیدا ہو چکی تھی۔ کانگریسی حکومت میں اپنی ملازمتوں، عہدوں اور اثر و رسوخ کو باقی رکھنے کے لئے تعلقات کی راہیں تلاش کرنے میں مصروف تھے۔ جمود و بے حسی، بزدلی و بے بسی یہ ایسے انسانیت سوز اوصاف تھے جو ان کا اوڑھنا بچھونا بن چکے تھے۔ عوام کا مزدور، ملازم اور تاجر طبقہ انہی لوگوں کو پہلے بھی دیکھتا تھا اب بھی دیکھ رہا تھا۔ عوام بے چارے ہر زمانے میں ان کی تاریخ گواہ ہے کہ ہر محفل کا شکار ہو جاتے ہیں۔

شمال کے اندر مسلمانوں کے سامنے سرکاری مدارس میں رائج شدہ نصاب کا مسئلہ درپیش

قدم ملا کے چلو

جب سب ایک دیس میں رہتے ہیں۔ تو سب کو ترقی کرنے کے لئے قدم ملا کر چلنا ضروری ہوتا ہے

بہترین تمباکو سے تیار کردہ



بیڑیاں پینے سے آپ کو قدم ملا کر چلنے میں مدد ملے گی۔ کیونکہ ہندو مسلم سب بھائی ان کا شوق سے استعمال کرتے ہیں

یہ مشہور بیڑیاں

اپنی بہترین کوالٹی کی وجہ سے تمام ہندوستان میں بہترین مانی گئی ہیں

کالے خاں [illegible] کمپنی

برانچ: باڑہ ہندو راؤ دہلی

ہے اسکے اندر جو زہر تریاق کی صورت میں بھیجا گیا ہے۔ اس سے وہاں کا ہوشمند طبقہ ہرگز غافل نہیں ہے۔ اس کے تدارک کی مختلف صورتیں اختیار کی جا رہی ہیں اور ایک حد تک اُن کو عملی جامہ پہنا دیا گیا ہے۔ اس عملی صورتِ حال سے خود حکومت بھی ایک حد تک مطمئن ہو چکی ہے برخلاف جنوب کے ان چار صوبوں کے یہاں ابھی تک اس قسم کا نصاب رائج نہیں ہوا ہے۔ اگر خدا نخواستہ ایسی صورتِ حال یہاں بھی پیش آجائے تو اس کو ہماری بدقسمتی پر محمول کرنا چاہیئے کہ اس کے تدارک کی کوئی صورت اور شکل نہیں ہے۔ انڈین یونین مسلم لیگ کا عام شہرہ ہے۔ اگر اس کے اندر گھس کر دیکھا جائے تو واقعہ یہ ہے کہ کوئی جان نہیں کوئی زندگی نہیں ہے۔ در اصل وہ ملکی سیاست کے شطرنج کا ایک مہرہ ہے جو مختلف صوبوں میں اپنی مختلف صورتوں کے ساتھ پھیرا یا جا رہا ہے۔

ان تمام حالات کے پیشِ نظر ۱۹۶۰ء میں دہلی پہونچ کر حضرت مجاہد ملت مرحوم سے راقم الحروف نے ملاقات کی اور یکے بعد دیگرے اکابرین جمعیۃ مثلاً حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب وغیرہ سے مل کر اس بات کی طرف آمادہ کیا، کہ جمعیۃ علماء ہند کا سالانہ اجلاس جنوب کے کسی بڑے شہر میں کیا جائے تاکہ وہاں جمعیۃ کے لئے راہ ہموار ہوسکے اور وہاں کے خواص کے اندر جمعیۃ سے متعلق جو غلط فہمیاں موجود ہیں، وہ دور ہوں اور پھر تفصیلی حالات دیوبند پہنچ کر حضرت مولانا صاحبزادہ صاحب کے روبرو رکھے غرض یہ دن بھی گذر گئے۔

اسی رمضان کے آخری عشرہ کی بات ہے جس کو میں اپنی خوش نصیبی پر محمول کرتا ہوں یعنی کانگریس کے انتخابات کے آخری اجلاس میں مولانا حامد الانصاری غازی صاحب سے ملاقات ہوگئی۔ اجلاس سے فارغ ہو کر وہ حضرت مجاہد ملتؒ کی خیریت پرسی کے لئے جا رہے تھے میں بھی ساتھ ہو گیا۔ حضرت مرحوم سے ملاقات ہوئی۔ غازی صاحب نے میرا نام لیکر تعارف کرایا ایک بزرگ جو پہلے سے وہاں تشریف فرما تھے۔ کہنے لگے ڈاکٹروں کی تاکید ہے کہ مولانا سے بات چیت نہ کی جائے اُن کا جواب خود مولانائے مرحوم نے دیا "یہ ہو سکتا ہے کہ بستر پڑا رہوں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اعضاء کو حرکت نہ دوں مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ کوئی میری زبان پر پابندی عائد کر سکے، اَمْوَاتٌ غَیْرُ اَحْیَاءٍ کی زندگی سے خدا کی پناہ ہے" پھر راقم الحروف سے مخاطب ہو کر مدراس اور بنگلور کے حالات اور انتخابی دور میں مسلمانوں کی پوزیشن اور جو مسلم افراد مدراس کے اضلاع میں کانگریس کی سیٹ سے انتخاب کی کوشش میں تھے غرض جملہ حالات کو دریافت فرمایا۔ راقم الحروف نے ایک ایک کا جواب اپنی معلومات کے مطابق دینے کی کوشش کی پھر فرمایا

" اللہ تعالیٰ اگر مجھے زندہ رکھے تو جمعیۃ کا سالانہ اجلاس بنگلور میں کراؤں گا۔ میں نے کہا وہاں حالات جمعیۃ کے موافق نہیں ہیں۔ بارہا کوششوں کے باوجود خود وہاں کے خواص نے جمعیۃ کو مضبوط نہیں کیا ہے۔ جواب میں فرمایا۔

میں خود آکر پندرہ دن بنگلور میں بیٹھ جاؤں گا اور ایک ایک کو آواز دے کر ان کے گھروں پر جا کر بلاؤں گا پھر یہ کام ہوگا۔ پھر فرمایا اگر زندگی نے میرا ساتھ نہ دیا تو میرے نائب یہ فریضہ انجام دیں گے۔

اللہ تعالیٰ مولانائے مرحوم کی اس آخری تمنا کو پورا ہونے کی راہیں آسان فرمائے۔ یہ کوئی معمولی تمنا نہیں ہے بلکہ ایک وسیع علاقہ کی بقا اور زندگی کا مسئلہ ہے جس کے لئے مولانائے مرحوم بستر مرض الموت پر بے چین تھے

الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن
مُلّا کی اذاں اور مجاہد کی اذاں اور

نہیں رہا

از
اکرم نعمانی شیرکوٹی

وہ پیکرِ خلوص و مروّت نہیں رہا
گنجینۂ کمال و صداقت نہیں رہا
نازاں تھی جس پہ بزمِ ثقافت نہیں رہا
روشن نگاہ نجمِ صحافت نہیں رہا
وہ صاحبِ ذکاء و فراست نہیں رہا
وہ عالمِ کتابِ سیاست نہیں رہا
عالم کو جس پہ ہوتی تھی حیرت نہیں رہا
کھولے تھے جس نے عقدۂ حکمت نہیں رہا
حاصل تھی سب کو جس کی حمایت نہیں رہا
ہم کو تھی آج جس کی ضرورت نہیں رہا
وہ دوستدارِ شیخ و برہمن کہ جس سے تھی
قائم اساسِ خلق و مروت نہیں رہا
ظاہر یہی ہے تیرگیِ شامِ غم سے آج
کہ آفتابِ صبحِ مسرت نہیں رہا
یہ کہہ رہی ہے خامشیِ عرصۂ جہاد
افسوس وہ مجاہدِ ملت نہیں رہا
سالِ وصال از سرِ افسوس بر ملا
"اکرم لکھو علیِ خطابت نہیں رہا"
۱ ۳ ۸۲ھ

کویراج ہرنام داس بی اے کا ہدیہ نیاز

وہی انسان جو جہاد کرتے ہیں ملک وقوم کی سربلندی اور دین وایمان کی ترقی کے لئے وہی ہیں مجاہدانِ عظیم ۔ بیسویں صدی کے مجاہدین میں مولانا حفظ الرحمٰن کا درجہ بہت بلند ہے ۔ لاہور سے دہلی آ قیام پذیر ہونے پر ۱۹۴۷ء کے آخر میں مولانا صاحب موصوف کا نیاز میں نے حاصل کیا ۔ میں نے انہیں بہت مخلص ۔ وضعدار ۔ ممدو معاون ۔ طبیعت کا فرشتہ سیرت انسان پایا ۔ پہلی ملاقات ہی میں مجھ نیاز مند کو سر آنکھوں پر بٹھالیا اور فرمایا! آپ سے غائبانہ تعارف تو کافی پہلے سے خواجہ حسن نظامی صاحب کی معرفت ہوچکا ہے جنھوں نے اپنے اخبار منادی میں آپ کے ہدایت ناموں کی بہت دلچسپ تنقید شائع فرمائی ۔ موصوف خواجہ صاحب سے ٹیلی فون پر آپ کی بابت پوچھا تو فرمایا ۔ بہت دلچسپ مفید اور سبق آموز تصانیف ہیں ۔ کویراج صاحب کی ۔ مگر بڑی بات یہ ہے کہ ہندو ہوتے ہوئے مجلسی و جسمانی و حکیمی تعلیمات میں مسلمانوں کو روزانہ تلاوت قرآن مجید کی تاکید فرماتا ہے ۔ مگر کتب دینیات کے علاوہ مسلمان مصنف اس قسم کی تعلیم اپنے ناظرین کو کم ہی دیتے ہیں ۔" مزید فرمایا! کویراج صاحب میں آپکا معترف بھی ہوں اور احسانمند بھی ۔ آپ کہئے کیا خدمت ہے میرے لائق ؟ کیسے تشریف آوری ہوئی ۔ میں نے مدعا عرض کیا تو دل وجان سے امداد کا وعدہ فرمایا ۔ ساتھ چل پڑے ۔ دوران گفتگو یہ بھی پوچھا کہ کویراج صاحب آپکو اسلام کی صوم وصلوٰۃ اور شریعت کے متعلق اتنی واقفیت کہاں سے حاصل ہوئی ۔ میں نے عرض کیا کہ میری ابتدائی تعلیم مسجد میں ایک بہت ہی شفیق اُستاد اور عالم مولوی صاحب کے قدموں میں ہوئی ۔

اس کے بعد جب جب بھی مولانا موصوف سے ملنا ہوا پرانے وقتوں کے مولوی صاحبان کی قابلیت موضوع گفتگو رہی ۔ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب بہت خوبیوں کے مالک تھے اور رب العالمین پاک پروردگار کے جوار رحمت کے کلیتاً حقدار ۔ خداوند ہم سب کو ان کے اوصاف حمیدہ کی پیروی کی توفیق بخشے ۔

خاک نشین

کویراج ہرنام داس



جناب عبدالعظیم خاں عزمی۔ بنگلور۔

کاش کچھ دن اور آپ جئے ہوتے

۳ر اگست ۱۹۶۲ء کو صبح نئی دہلی ریڈیو نے دنیا بھر میں یہ اندوہناک خبر پھیلائی کہ مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نئی دہلی میں اپنی قیام گاہ میں انتقال فرما گئے۔ مولانا ۶۲ سال کی عمر میں ہم سے جدا ہوتے ہیں تو ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ آپ نے بے وقت انتقال فرمایا۔ لیکن جب ہم یہ سوچنے لگتے ہیں کہ اس پر آشوب دور میں جبکہ مسلمان چاروں طرف سے خوف وہراس میں گھرے ہوتے ہیں مرعوبیت کا شکار بن چکے ہیں۔ ملک کے بدلے ہوتے حالات کے مطابق ان کی صحیح رہنمائی کرنے والا کوئی نظر نہیں آرہا ہے تو وحشت سی ہونے لگتی ہے اور ہم محسوس کرنے لگتے ہیں کہ کاش آپ ہماری رہنمائی کے لئے کچھ اور دن جئے ہوتے!

مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ کی ساری زندگی ایثار قربانیوں کا ایک مرقع رہی ہے۔ ملک کی آزادی کے لئے بڑی بڑی قربانیاں پیش کرنے والے مسلمانوں کی آج بھی کمی نہیں ہے۔ لیکن ان تمام میں مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ نے جس بے باکی، اولوالعزمی اور بہادری کا ثبوت دیا ہے اس کی مثال موجودہ دور میں کسی اور مسلم لیڈر میں مشکل ہی سے مل سکے گی، مولانا نے سیاسی حیثیت سے اپنی ساری زندگی صرف کانگریس ہی میں گذار دی مہاتما گاندھی کو آپ پر مکمل اعتماد تھا۔ وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو بھی دل سے آپ کی عزت کرتے تھے پارلیمنٹ کے مسلم ممبروں میں بھی آپ ہی کی ایک ایسی شخصیت تھی جس کی ایک للکار پر سارے ایوان کے کان کھڑے ہوجاتے اور حکومت کی ساری مشنری حرکت میں آجاتی تھی۔

۱۹۴۷ء تک مولانا حفظ الرحمٰن نے بعض جلیل القدر لیڈروں کے ساتھ ملک کو انگریزوں کی غلامی سے نجات دلانے کی جدوجہد کے لئے اپنی زندگی وقف کردی تھی۔ لیکن ۴۷ء کے انقلاب کے بعد ملک کی ترقی اور اتحاد کی کوشش میں جب آپ ہمہ تن مصروف ہوگئے تو آپ کی دوررس نظروں نے اس بات کا اندازہ لگالیا تھا کہ مسلمانوں کو اگر اس ملک میں باوقار زندگی بسر کرنا ہے اور اپنا مستقبل روشن بنانا ہے تو انہیں دو اہم ذمہ داریوں کا بوجھ برداشت کرنا ہوگا۔ ایک یہ کہ مسلم عوام کو ملک کے نئے سانچے میں ڈھالا جائے اور پھر انہیں اپنی مذہبی روایات اور اسلامی تہذیب کو برقرار رکھنے کے لئے غیر سیاسی بنیادوں پر متحد کیا جائے۔ ایک طرف آپ ان مقاصد کے حصول کے لئے جدوجہد کرنے لگے تھے تو دوسری طرف ملک کے فرقہ پرستوں کی سرکوبی اور مظلومین کی حمایت کے لئے بھی دوڑ دھوپ کر رہے تھے۔

اس سلسلے میں حق کی آواز بلند کرنے میں نہ تو حکومت کی ہیبت اور چاپلوسی ان کی راہ میں رکاوٹ بن سکی اور نہ فرقہ پرستوں کی تلواریں اور جان کا ڈر انہیں اس جدوجہد سے ہٹا سکا۔ حصول آزادی کے ساتھ ملک کے اندر جب غارت گری اور خونریزی کا دور دورہ شروع ہوا تو آپ نے دہلی کے گلی کوچوں تک میں مظلومین کی حمایت میں جس بے جگری اور عزم وہمّت کا ثبوت دیا اس کا ہر شخص معترف ہے۔ کچھ دن بعد خونریزی اور فسادات کا زور ٹوٹا تو قانون املاک متروکہ کی زد بہت سارے معصوم اور بے گناہ مسلمانوں پر بھی پڑنے لگی تھی۔ ان بے گناہوں کی تائید ومدد کے لئے نہ تو آپ دن بھر کسی بھی وقت چین سے بیٹھتے تھے اور نہ ساری رات نیند بھر کر سوتے تھے۔

جدید حالات کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے مسلمانوں کو متحد اور منظم کرنے کی غرض سے آپ ملک کے مختلف مقامات کے دورے کرتے رہے حالات اور فضا کو سازگار بنانے کے لئے اہم مقامات کو جمعیۃ علماء کے سفیر اور نمائندے بھی بھیجتے رہے۔ زندگی کے آخری لمحے تک بھی آپ کی یہی خواہش اور کوشش رہی کہ کسی نہ کسی طرح جمعیۃ علماء کو ملک بھر میں مضبوط کیا جائے اور اس کے تحت مسلمانوں کو متحد و منظم کیا جائے۔

مولانا مرحوم کو جنوبی ہند میں مدراس اور بنگلور سے بڑی توقعات وابستہ تھیں آپ کی یہ خواہش رہی کہ جنوب کے لئے بنگلور کو جمعیۃ علماء کا مرکز بنایا جائے چنانچہ آپ کئی دفعہ خود بھی بنگلور تشریف فرما ہوتے اور پھر مولانا محمد عاقل۔ مولانا محمد اسمٰعیل سنبھلی اور مولانا اخلاق حسین صاحب قاسمی جیسے حضرات کو بھی محض اسی تنظیمی مقصد کی خاطر بنگلور بھیجتے رہے۔

جنوب میں جمعیۃ علماء کی تنظیم کیوں جڑ نہیں پکڑ سکی؟ یہ علیحدہ سوال ہے لیکن مولانا مرحوم اپنی ان کوششوں میں بار بار ناکام ہونے کے باوجود مایوس نہیں ہوتے تھے۔ آپ نے جنوب کے بہت سارے حضرات سے ذاتی طور پر جو گفتگو کی ہے اور جن حضرات کے نام آپ خطوط لکھتے رہے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ

آپ پھر بنگلور تشریف لانے والے تھے اور عملی طور پر جمعیۃ علما کی بنیاد مضبوط کرنے کے ارادے کر رہے تھے۔

افسوس ہے کہ سرطان جیسے موذی مرض نے آپ کے ان عزائم میں رکاوٹ پیدا کر دی۔ اس کی وجہ سے آپ کا بنگلور کا سفر بار بار ملتوی ہوتا رہا۔ آخرکار زندگی نے آپ سے وفا نہیں کی۔ علاج کے سلسلہ میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا گیا۔ اس کے باوجود ۲ر اگست کو صبح کے چار بجے آپ اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اب ہم مولانا کی قیادت سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو چکے ہیں مولانا نے گو ہم سے منہ موڑ لیا لیکن یہاں سے جاتے ہوئے آپ اپنے نقش قدم چھوڑ گئے ہیں جن پر چل کر ہم اپنی منزل مقصود تک پہنچ سکے۔

مولانا کی رحلت کے بعد اس وقت ہم آپ کی کوئی یادگار قائم کرنے پر غور کر رہے ہیں اگر مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ کی کوئی حقیقی یادگار قائم ہو سکتی ہے جو آپ کے شایان شان ہو تو صرف ایک ہی چیز ہے جمعیۃ علماء اور اس کی ہندوستان گیر تنظیم۔ اس کے ذریعہ ہم مولانا حفظ الرحمٰن کے نقش قدم پر چل کر ان کی روح کو خوش کر سکیں گے بلکہ ان بزرگوں کے مقاصد کو پورا کرنے اور ماضی کی طرح مسلمانوں کے مستقبل کو روشن بنانے میں بھی ہم کامیاب ہو سکیں گے۔ وما توفیقی الا باللہ

اُن کی جُدائی

جناب مطرب سلطان صاحب نظامی لکھنوی

فرطِ احساس سے گلزار کی فطرت ہے اُداس　　کیا جُنوں خیز تبسّم ہے نکہت ہے اُداس
خلوتِ غم کی قسم شیشۂ ساعت ہے اُداس　　ہند کے جام میں صہبائے سیاست ہے اُداس

مہر چمکا ہے شعاعوں میں مگر رنگ نہیں
پرتوِ شام میں بھی عکسِ شب آہنگ نہیں

باغِ اُمید میں کیا ساعتِ تاراج آئی　　چھپ کے پردے میں بہاروں کے خزاں آج آئی
جو گھڑی آئی وہ سر برہنہ بے تاج آئی　　آہ بھی آئی تو تاثیر کی محتاج آئی

موت نے تیری عجب رشتۂ غم جوڑ دیا
جیسے کونین کی ہر چیز کا دل توڑ دیا

رنگِ غم گہرا ہوا رنگ تغیّر کی قسم　　عالمِ ہوش کہاں حسنِ تحیّر کی قسم
فکرِ فردا کی قسم کیف تفکّر کی قسم　　تری تصویر ہے آنکھوں میں تصور کی قسم

ہر نفس عشرتِ بے کیف ہوا جاتا ہے
پھول ہنستے ہیں مگر رنگ اُڑا جاتا ہے

مہر شبنم کدۂ یاس میں ہے سرگرداں　　برق کے سینے میں ہے شعلۂ خاموش نہاں
مضمحل ہو گئی خود گردشِ نبضِ دوراں　　نفسِ زیست ہوا جاتا ہے اب بارِ گراں

جوئے خوں می چکد از حسرتِ دیرینۂ ما
می تپد نالہ بہ نشتر کدۂ سینۂ ما

سید قسیم الحق گیاوی - ناظم کتب خانہ مدرسہ قاسمیہ - گیا۔

آہ! حضرت مجاہد ملت

میں یہ کیسی خبر سن رہا ہوں کہ مسلمانوں کا آخری رہبر، آخری سہارا چھن گیا وہ ہم سے جدا ہو گیا جو ہماری ذرا سی تکلیف پر بے چین ہو جایا کرتا تھا جب ہم پہ مصیبتیں نازل ہوتی تھیں تو وہ ہمارے لئے اپنے اوپر خواب و خور حرام کر لیا کرتا تھا کاش! ہمارے کان یہ خبر سننے سے پہلے بہرے ہو جاتے کہ ہندوستان کی جنگ آزادی کا مجاہد، جمعیۃ العلماء ہند کا روح رواں، کانگریس کا قوت بازو، دارالعلوم دیوبند کی گتھیوں کو سلجھانے والا، ندوۃ المصنفین کا بانی، شعلہ بیان مقرر، جادو نگار مصنف، قوم کے لئے جان و مال لٹانے والا لیڈر، پارلیمنٹ کو اپنی مؤثر تقریروں سے ہلا دینے والا ممبر پارلیمنٹ، جبل پور کے مصیبت زدوں کے دلوں کی ٹھنڈک، علی گڑھ اور دوسرے فساد زدہ علاقوں کے آفت زدوں کا آنسو پونچھنے والا، وہ شخص جسے لوگ مجاہد ملت کہتے ہیں، مولانا حفظ الرحمن صاحب ایم، پی کہتے تھے۔ افسوس صد افسوس کہ وہ ہم سے جدا ہو کر اپنے محبوب حقیقی سے جا ملے ؎

آہ اس دنیا سے آج اک عالم دیں اٹھ گیا
عالم اسلام جس کی موت سے غمناک ہے

وائے حسرت کہ ہماری دنیا تاریک ہو گئی، ہمارے دماغ کی روشنی ختم ہو گئی، ہمارا دل سرد پڑ گیا، ہمارے ارادے پست ہو گئے۔

حیف صد حیف! کہ وہ شخص جو شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کے بعد لوگوں کے درد کا درماں تھا، وہ عظیم المرتبت انسان جسے دیکھ کر امام الہند رحمۃ اللہ علیہ کی جدائی کا غم کم ہو جایا کرتا تھا، وہ بلند پایہ مقرر جس کی تقریریں دلوں میں جوش بھر دیا کرتی تھیں، جس کے جوشیلے پر حکمت کلمات ایسے ہوا کرتے تھے کہ ہر سننے والے کے دل میں جوش عمل پیدا ہو جایا کرتا تھا، جس کی تقریروں کو سن کر سحبان الہند رحمۃ اللہ علیہ کی تقریروں سے محرومی کا صدمہ ہلکا ہوا کرتا تھا، آہ! کہ سیوہارہ کا وہ فرزند، دارالعلوم دیوبند کا وہ نامور فاضل، دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کا وہ مدبر ممبر، جمعیۃ العلماء ہند کا وہ سالار اعظم ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گیا۔ ہمارا کلیجہ یہ سوچ کر ٹکڑے ٹکڑے ہوتا ہے کہ شیخ الاسلام رحمہ

کے انتقال پرملال سے جو بے پایاں نقصان ہوا اس کی تلافی نہ ہو سکی امام الہند کی وفات حسرت آیات سے جو خلا پیدا ہوا اسے کوئی پُر نہ کر سکا اب وہ شخص بھی جس نے مسلم کنونشن کے ذریعہ ایک طرف حکومت کے سامنے مطالبات پیش کئے، ارباب اقتدار کو مسلمانوں کی طرف متوجہ کیا اور دوسری طرف مسلمانوں میں قوت عمل کی روح پھونکی مسلمانوں کو بیدار کرنے کی کوشش کی، جس کی پوری زندگی مجاہدہ و قربانی، خدمت قوم وملت، اور قوم کی ترقی و بہبودی کے لئے وقف تھی، جس کی پوری زندگی ایک کھلی ہوئی کتاب تھی، ہم سے روٹھ گیا، ہم سے جُدا ہو گیا۔

حسرتا واحسرتا کہ اب مائیں ہزاروں بچے جنیں گی لیکن مجاہد ملت پیدا نہ کر سکیں گی۔ ع ایک دل ہے اور طوفان حوادث اے جگر

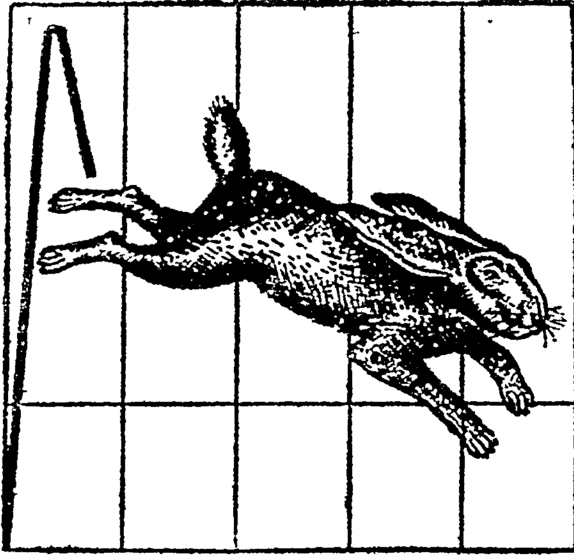
آہ صد آہ! کہ اب وہ ہماری مدد کرنے نہ آسکے گا ہم اب اُسے اس دنیا میں کبھی نہ دیکھ سکیں گے۔ وادریغا واحسرتاہ! کہ اس کی جدائی سے جمعیۃ العلماء پر ویرانی چھا گئی، دلّی کی گلیاں سونی ہو گئیں، دارالعلوم دیوبند میں صف ماتم بچھی ہوئی ہے، اس کی تقریروں کے شیدائی گریہ کناں اور اس کی تصنیفات کے دلدادہ چاک گریباں ہیں، اُس کی خدمات کے بوجھ سے لدے ہوئے ہندوستانی اس کے لئے اُٹھ اُٹھ کر آنسو بہا رہے ہیں، اس کی یاد میں مسلمانوں کا جگر پانی ہو رہا ہے، علماء، طلباء، اہل سیاست، جمعیۃ العلماء ہند کی تمام شاخوں اور تمام شعبوں، عام مسلمانوں اور تمام ہندوستانیوں پر افسردگی و مردنی چھائی ہوئی ہے۔ ع۔ کوئی ہے خستہ جگر کوئی گریباں چاک ہے۔

انکی وفات حسرت آیات کی خبر وحشت اثر لوگوں پر بجلی بن کر گری ہے اور لوگ تڑپ رہے ہیں رو رہے ہیں، سر پیٹ رہے ہیں۔ ماتم کر رہے ہیں

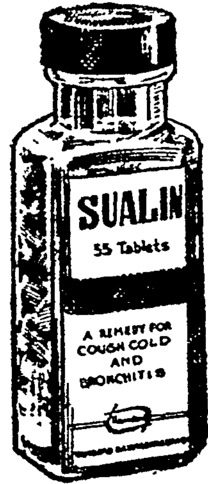
ع۔ نہ تھمتے ہیں آنسو نہ رکتی ہیں آہیں۔

لیکن چاہے جتنا بھی رو یا جائے، جتنا سوگ منایا جائے، جتنا واویلا کیا جائے اب مجاہد ملت واپس نہیں آسکتے۔ قدرت خداوندی میں کسی کو دخل نہیں۔ اس لئے اب ہمارا فرض ہے کہ ان کی روح پاک کے سکون و قرار کے لئے کوششیں کریں، زیادہ سے زیادہ ایصال ثواب اور ان کی مغفرت کے لئے دعائیں کریں

اور اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہم میں سے پھر کوئی مجاہد ملت پیدا ہو تو ہمارے لئے لازم ہے کہ ہم ان کی زندگی کو مشعل راہ بنائیں، ان کی زندگی سے ہم سبق حاصل کریں



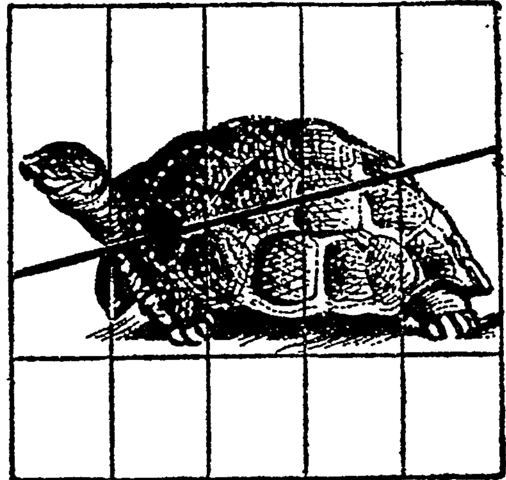
FASTER initial action...



سُعالین

سُعالین فوراً بے چینی کو دور کرتی ہے۔ خراش کو روکتی ہے اور تسکین پہنچاتی ہے۔
یہ سانس کی نالیوں کو صاف کرتی ہے۔ کھانسی کو دُور کرتی ہے۔ اور مکمّل اور دیرپا شفا بخشتی ہے۔

... Followed by prolonged relief





دہلی - کانپور - پٹنہ


جاذبیت پیدا کرنے کے لئے
AFGHAN SNOW
ESP

اسکول و کالج

مدارس و مکاتب

اور

دوسرے ادارے

اُن مختلف تعلیمی اداروں اسکولوں
وغیرہ کی فہرست جن میں
حضرت مجاہد ملت رحمۃ اللہ
علیہ کی وفات حسرت آیات پر
انتہائی حزن و ملال محسوس
کیا گیا۔ اساتذہ وطلبہ
نے ایصال ثواب اور
دعائے مغفرت کی۔ اور
تعزیتی قراردادیں بھیجکر حضرت
مجاہد ملت رحمۃ اللہ علیہ
کے ساتھ اپنی گہری عقیدت و
وابستگی کا اظہار کیا۔

مدرسہ عالیہ عربیہ مسجد فتحپوری۔ دہلی۔
مدرسہ اسلامیہ درگاہ حضرت مخدوم صاحب پانی پت
مدرسہ اسلامیہ۔ باب نگر
مدرسہ معین الغربا۔ ناصری گنج۔
مدرسہ صدیقیہ۔ شہنا پور دگونڈہ۔
مدرسہ شریفیہ۔ نواب گنج۔ دہلی۔
مدرسہ تعلیم القرآن۔ رام پور۔ منہاران۔
مدرسہ کمال اسلام۔ کوسمبہ
مدرسہ انجمن تعمیرات۔ ریٹرا ضلع بلیا۔
مدرسہ عثمانیہ پھلکا۔ پٹنہ۔
مدرسہ اشرف المدارس۔ گلٹی
دارالاسلام حقانیہ۔ اکوڑہ۔ خٹک
مدرسہ اسلامیہ۔ سونس
مدرسہ بدرالاسلام۔ شاہ گنج
دارالعلوم۔ بانسکنڈی۔ (آسام)
مدرسہ تعلیم القرآن۔ احمدگڈھ
مدرسہ محمدیہ۔ گوگری۔ (مونگیر)
مدرسہ فیض العلوم۔ کانٹھ
مدرسہ ناصر العلوم۔ کانٹھ
خانگی پنچائت۔ مدرسہ اسلامیہ پنج گاہ۔ ہوشیارپور۔
مدرسہ نعمانیہ ڈومریا عیدگاہ پورنیہ
مدرسہ اصلاح المسلمین۔ کاندھلہ
مدرسہ اسلامیہ قاسمیہ عارفپور۔

جامعہ اسلامیہ ڈابھیل۔ (سورت)
مدرسہ تعلیم القرآن پھاٹک حبش خاں۔ دہلی
مدرسہ ریاض العلوم۔ دہلی۔
مدرسہ فیض القرآن۔ سہارنپور۔
مدرسہ رحمانیہ۔ ہاپوڑ
مدرسہ جامع الہدیٰ۔ مرادآباد
مدرسہ محمودیہ۔ چھتاری۔
مدرسہ فیض الاسلام۔ دہلی۔
مدرسہ عبدالرب۔ دہلی۔
مدرسہ امینیہ۔ دہلی۔
مدرسہ فیض الاسلام۔ کٹرہ نظام الملک۔ دہلی
دارالعلوم خلیلیہ۔ ٹونک۔
مدرسہ احیاء العلوم۔ ہلدوانی۔
مدرسہ اسلامیہ عربیہ۔ ابراہیم پورہ۔ بھوپال۔
مدرسہ دارالعلوم۔ چھاپی۔ کانٹھا۔
دارالعلوم چلّہ۔ امروہہ۔
مدرسہ خادم القرآن۔ سردھنہ
شاہی مسجد۔ سیوہارہ
مدرسہ قاسمیہ اسلامیہ۔ گیا۔
مدرسہ امارت شرعیہ۔ بہار۔
مدرسہ اسلامیہ۔ دھام پور۔
مدرسہ اسلامیہ فتح پور
جامعہ عربیہ احیاء العلوم۔ مبارکپور

دارالعلوم معینیہ۔ اجمیر شریف
دارالمبلغین۔ لکھنؤ۔
انجمن اسلامیہ۔ بھوپال
مدرسہ قاسمیہ۔ شاہی مسجد۔ مرادآباد۔
مدرسہ اسلامیہ عربیہ۔ قصبہ اجراڑہ
دارالعلوم ندوۃ العلماء۔ لکھنؤ
خانقاہ مجیبیہ۔ پھلواری شریف۔ پٹنہ۔
مدرسہ عالیہ۔ کلکتہ۔
مدرسہ حسینیہ۔ رانچی۔
میوات پنچایت۔ نگینہ۔ میوات۔
مدرسہ ضیاء العلوم۔ احمدآباد
مدنی مکتب جھانسی۔
جماعت اسلامی ہند۔ سوائی مادھوپور۔
مدرسہ مسعودیہ۔ بہرائچ
مدرسہ کاشف العلوم۔ چھٹمل پور۔
مدرسہ فیض عام۔ سہسوان۔
جامعہ حسینیہ۔ گریڈیہ
مدرسہ مصباح العلوم۔ قصبہ کوپا گنج
مدرسہ آزاد۔ ڈھاکہ چمپارن۔
مدرسہ جامع العلوم۔ کانپور۔
جامعۃ الرشاد۔ اعظم گڈھ
مدرسہ تعلیم القرآن۔ رانی گنج
مدرسہ سراج العلوم۔ نوتنوانی بازار

مدرسہ محمدیہ۔ رایاراگ
دار القرآن۔ رانچی
مدرسہ ضیاء العلوم۔ بالی۔ رانچی
مدرسہ رشیدیہ۔ ڈنگرا گیا
مدرسہ مشکوٰۃ العلوم۔ بنگلور
مدرسہ حمیدیہ۔ گودنا
مدرسہ کنز العلوم۔ ٹانڈہ
مدرسہ انوار العلوم۔ گیا
مدرسہ جامعہ امدادیہ۔ اہر یا سرائے
مدرسہ خادم العلوم۔ کرنیل گنج
مدرسہ نوریہ اونڈ دل۔ بنگال
مدرسہ فاروقیہ۔ صبر حد
مدرسہ حسینیہ۔ احمد آباد
مدرسہ اسلامیہ پانڈولی۔ ضلع سہارنپور
مدرسہ اشرفیہ۔ راندیر
مدرسہ محمدیہ۔ سوپول
مدرسہ عظیمیہ۔ غازی پور
مدرسہ محمودیہ۔ شیر گھاٹی۔ گیا
مدرسہ احمدیہ۔ ابوبکر پور
مدرسہ حسینیہ اسلامیہ۔ جیسولہ۔ افغانان
مدرسہ ریاض العلوم۔ ساٹھی چمپارن
مدرسہ بدر الاسلام۔ بیگوسرائے
مدرسہ ضیاء العلوم۔ تنکویا
مدرسہ عربیہ منبع الاسلام۔ گلادھی
مدرسہ انوار العلوم۔ اسلامپور
دار العلوم عربی۔ ضلع پشاور
دار العلوم ناصریہ۔ ٹونک
دار العلوم۔ اننت پور۔ آندھرا
مدرسہ اشرف العلوم۔ گنگوہ
مدرسہ محمدیہ لیشن پور۔ ضلع پورنیہ
مدرسہ اسلامیہ۔ ہنج

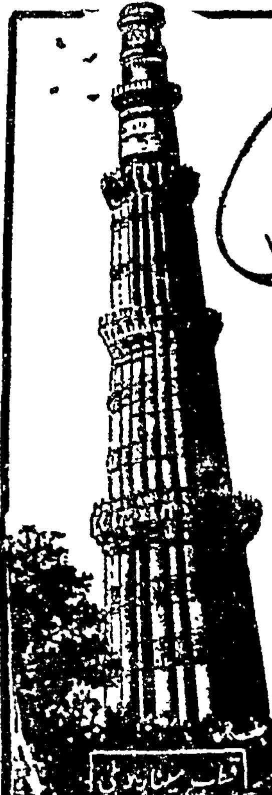
ادارہ اسلامیہ۔ جوہانسبرگ
مدرسہ رشیدیہ۔ منٹگمری
مدرسہ قوت الاسلام۔ کٹھور۔ (سورت)
مدرسہ دار العلوم۔ اٹکی۔ رانچی
شفیق میموریل اسکول
دار العلوم عربک کالج میرٹھ
سوشل ایجوکیشنل سینٹر لال کنواں دہلی
پنجابی جونیر ہائی اسکول۔ مراد آباد
مسلم قدرت انٹر کالج۔ سیوہارہ
حمیدیہ کالج۔ بھوپال
مڈل اسکول۔ سرائے خلیل۔ دہلی
اینگلو عربک ہائیر سکنڈری اسکول۔ دہلی
حافظ محمد ابراہیم کالج۔ نہٹور
اکیڈمی۔ بنارس
ابو الکلام آزاد اسٹیڈی فورم۔ دہلی
اسلامیہ انٹر کالج۔ مظفر نگر
اسلامیہ ہائیر سکنڈری اسکول۔ دیوبند
کرشک ڈگری کالج۔ مورنہ ضلع میرٹھ
اسلامیہ انٹر کالج۔ اٹاوہ
ایسوسی ایشن اردو ہائی اسکول۔ امراوتی
مولانا ابو الکلام ہائی اسکول۔ ناگپور
مسلم یونیورسٹی یونین۔ علی گڑھ
شبیر گرلز اسکول۔ اٹاوہ
ہندو انٹر کالج۔ امروہہ
شیروانی انٹر کالج۔ صلاپور۔ الہ آباد
مسلم انٹر کالج۔ فتح پور
اسلامیہ جونیر ہائی اسکول۔ لکھیم پور۔ کھیری
اسلامیہ انٹر کالج۔ بریلی
مسلم ہائی اسکول۔ جے پور
ایم۔ اے۔ جونیر ہائی اسکول۔ آگرہ
اینگلو اردو ہائی اسکول۔ ہانسوٹ (گجرات)

اسلامیہ انٹر کالج۔ فیروز آباد
فیض عام انٹر کالج۔ میرٹھ
تکمیل ادب کالج۔ لکھنؤ
اسلامیہ ہائی اسکول۔ سوپور۔ کشمیر
مسلم اسکول۔ مغلسرائے
قادریہ سائنس کالج۔ برہان پور
مہر النساء اسکول۔ الہ آباد
مسلم جاٹ انٹر کالج۔ اساڑہ ضلع میرٹھ
مظہر الاسلام مڈل اسکول۔ دہلی
ایم۔ آر۔ انٹر کالج۔ دلداز نگر
ڈگری کالج۔ کانٹھ
رحمانیہ کالج۔ مودھا (یو۔ پی)
فتح پوری ہائیر سکنڈری اسکول۔ دہلی
ابو الکلام گرلز اسکول امروہہ
نئی پردیش کانگریس دہلی
دفاتر ماہنامہ شمع۔ دہلی
ہندوستانی ادبی سوسائٹی۔ دہلی
ہمدرد دواخانہ دہلی
جوہر میموریل کمیٹی۔ الہ آباد
انجمن دائرہ ادب۔ دہلی
ہول سیل کلاتھ پرنٹرس ایسوسی ایشن۔ دہلی
ینگ مینس مسلم ایسوسی ایشن الہ آباد
بیخود اکیڈمی۔ دہلی
نشاط اکیڈمی۔ دہلی
احمدیہ کمیونٹی۔ دہلی
جماعت اہلحدیث۔ کراچی
جنتا سیوک سوسائٹی محلہ شاہ گنج۔ کوچہ پنڈت۔ دہلی
بھارتیہ خدائی خدمتگار جرگہ
انجمن اتحاد تاجران جامع مسجد۔ دہلی
انجمن تعمیر اردو۔ دہلی
انجمن تکمیل ادب۔ دہلی

آل انڈیا انجمن سلیمانیہ
فرینڈز ایسوسی ایشن - فراشخانہ - دہلی -
پورٹ حج کمیٹی - بمبئی
انجمن تہذیب البیانی - مدرسہ شاہی مراد آباد
مجلس تحقیق ونشریات اسلام ندوۃ العلماء لکھنؤ
اسلامک یوتھ آرگنائزیشن - رام پور -
وکلاء محرر اہلکاران مظفر نگر -
نگر کانگریس کمیٹی - سنبھل -
نگر کانگریس کمیٹی - امروہہ
داؤدی بوہرہ مرچنٹس ایسوسی ایشن - کلکتہ
بیڑی ورکس یونین - امروہہ
کمیونسٹ پارٹی فیروز پور جھرکہ -
انجمن حامیٔ اسلام - ناگپور - کامٹی -
قریش برادری - دہلی
انجمن ترقی اردو شاخ دہلی -
انجمن فیض ادب - میرٹھ -

تعلیمات عامہ کمیٹی - دہلی -
انجمن اسلامیہ دارجلنگ -
مجتبائی لٹریری یونین - امروہہ
سوشل ریلیف کمیٹی - نئی سرائے میرٹھ -
اجملی شفاخانہ دہلی -
انجمن تعمیر اردو - دہلی -
قومی ایکتا کمیٹی - ترکانوال سادات -
مکتبہ جامعہ - دہلی
جامعہ اردو علی گڑھ
مسلم وقف بورڈ - دہلی -
مسلم وقف بورڈ - یو - پی
مسلم وقف بورڈ مدھیہ پردیش
مسلم وقف بورڈ - پنجاب -
مسلم وقف بورڈ - آندھرا -
میونسپل کارپوریشن - دہلی -
میونسپل کارپوریشن - کلکتہ

جوہر میموریل کمیٹی - الہ آباد -
آزاد ہند لائبریری - چناران - (آگرہ)
جمعیۃ الانصار امروہہ -
ضلع مومن کانفرنس - مراد آباد -
احرار خدام خلق - دہلی
سکینڈ ہینڈ موٹر پارٹس ڈیلرز ایسوسی ایشن جامع مسجد دہلی
کتب خانہ امینیہ - دینا - جے پور -
طیبہ لائبریری - پیچھ -
ملایا اسٹوڈینس ایسوسی ایشن - دیوبند -
انجمن مرکز اردو - جے پور -
انجمن خدام الدین - لاہور -
مسلم پبلک لائبریری - مراد آباد -
بھٹکل مسلم جماعت - کالی کٹ - (ربالاباد)
مسلم ایجوکیشن انسٹی ٹیوٹ - سملک ضلع سورت -
منتظمہ کمیٹی درگاہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلی
انڈیا لائبریری - سہارنپور -



اترپردیش مومن کانفرنس۔ الہ آباد۔
انجمن تعلیمات دینی۔ فتح پور۔ بارہ بنکی۔
فرینڈز سوسائٹی۔ آگرہ
آزاد لائبریری۔ بیجاپور۔
فرید بک ڈپو۔ میرٹھ۔
انجمن اصلاح المسلمین۔ بکرانہ۔
انیس لائبریری۔ بھوپال
اراکین ترجمہ کمیٹی۔ شاہجہاں پور۔
جمعیۃ الطلبہ ۔ دیوبند
سوشل ویلفیر ایسوسی ایشن۔ بجنور۔
فرینڈز لائبریری کلب۔ بلند شہر
انجمن اسلامیہ۔ باراں۔ ضلع کوٹہ۔
انجمن تبلیغ الاسلام۔ سری نگر۔
پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس۔ کراچی۔
آل انڈیا اہلحدیث کانفرنس ۔ دہلی۔

میونسپل کارپوریشن۔ بمبئی۔
میونسپل بورڈ۔ مرادآباد
میونسپل بورڈ۔ امروہہ
میونسپل بورڈ۔ سنبھل ۔
منڈل کانگریس کمیٹی۔ نگینہ
میونسپل بورڈ سیکر۔ راجستھان
میونسپل بورڈ۔ بھان پورہ۔ مدھیہ بھارت
میونسپل بورڈ۔ پٹنہ۔
میونسپل بورڈ۔ چاند پور۔ بجنور۔
منڈل کانگریس کمیٹی ناگور۔ راجستھان
انجمن ترقی اردو۔ مدھیہ پردیش۔
جمعیت تبلیغ الاسلام۔ کانپور۔
انجمن اسلامیہ۔ دیوریا۔
انجمن محافظ اسلام۔ ہلدوانی
مجلس اصلاح بھٹکل۔

انجمن پنجابی سوداگران۔ دہلی
انجمن ہدایت الاسلام خضرآباد (انبالہ)
دینی تعلیمی بورڈ۔ سردھنہ۔
جمعیۃ پنجابی سوداگران۔ کراچی۔
مدرسہ حنفیہ۔ جھریا۔
مدرسہ تعلیم القرآن۔ نکرہ۔ (جھانسی)
جمعیۃ حلقہ بڈیر۔ ضلع گوڑگانوہ۔
مدرسہ انوار القرآن۔ نعمت پور (سہارنپور)
محمد علی میموریل ہائی اسکول (بیاور)